نظر ثانی شدہ ایڈیشن

بولتے نقشے

مفتی ابو لبابہ شاہ منصور

السعید
0313-9264214 کراچی پاکستان

بولتے نقشے

مختلف معلوماتی موضوعات پر لکھے گئے مقبول عام کالموں کا مجموعہ

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

0321-2050003, 0313-9266138

کتاب .... بولتے نقشے
مصنف .... مفتی ابولبابہ شاہ منصور
طبع اول .... جمادی الثانیہ 1429ھ / جون 2008ء
طبع دوم .... جمادی الثانیہ 1430ھ / جون 2009ء
باہتمام .... سید محمد انظر شاہ

ملنے کے پتے
پاکستان کے تمام مشہور کتب خانوں سے دستیاب ہے
رابطہ: 0313-9264214

ناشر

0321-2050003, 0313-9266138

مقدمہ

سرگوشیاں

نقشے عموماً بولا نہیں کرتے، لیکن خدا کی شان کہ بہت سے قارئین نے بتایا کہ ان کالموں میں چھپنے والے نقشے نہ صرف یہ کہ سرگوشیاں کرتے ہیں بلکہ بولتے بھی ہیں۔ اس زعم میں ان کا نام ''بولتے نقشے'' ایسا پڑ گیا کہ اب یہ بولیں یا نہ بولیں بلکہ ان میں کوئی نقشہ چھپے یا نہ چھپے، ان کا نام بولتے نقشے ہی لیا اور پکارا جاتا ہے۔

اردو ادب کے دیگر شعبوں کی طرح صحافت کی مختلف اصناف میں بھی جدت پسندی اور اختراعی شوق اپنا رنگ دکھاتا رہتا ہے۔ ان کالموں کے ساتھ نقشے، گراف، چارٹ اور جدول وغیرہ، قارئین کی دلچسپی اور جاندار کی تصویر کے متبادل کے طور پر شروع کیے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا رنگ جما کہ یہ نقشے ہی ضرب مؤمن کی پہچان اور اس کے ہر شمارے کو دستاویزی حیثیت دینے کا ذریعہ بن گئے۔ کچھ نقشے تو ایسی جاندار، دلچسپ اور تہلکہ خیز معلومات پر مشتمل تھے کہ بہت سی بڑی شخصیتیں فون کر کے پوچھتی رہیں کہ اس نقشے کی ''سورس'' کیا ہے؟ نقشوں کی سورس جو بھی ہو لیکن اسلامی صحافت کا جو اصل مقصد ہے کہ مستند معلومات کی فراہمی کے ساتھ تعمیری ذہن سازی، اس کے لیے یہ نقشے ایسے کارآمد اور مؤثر ثابت ہوئے کہ پہلے کالموں کی بنیاد پر نقشے بنائے جاتے تھے، اب نقشوں کی بنیاد پر کالم لکھے جاتے ہیں۔

اس عنوان کے تحت کئی طرح کے مضامین آیا کرتے تھے۔ ان سب کو الگ الگ کر کے ان کے مخصوص موضوع کی مناسبت سے اکٹھا کیا گیا ہے مثلاً: حرمین میں غیر مسلم افواج کی موجودگی کے متعلق مضامین ''حرمین کی پکار''؛ ارضِ مقدس فلسطین پر لکھے گئے کالم ''اقصیٰ کے آنسو''؛ یہود اور یہودی سازشوں کے حوالے سے لکھے گئے کالم ''عالمی یہودی تنظیمیں'' میں شامل کیے گئے۔ اسی طرح ''امت مسلمہ کے نام''، ''ہسپانیہ سے امریکا تک'' (مسلم ہسپانیہ کے سقوط اور صہیونی امریکا کی دریافت کے باہمی تعلق پر لکھے گئے مضامین) اور ''جغرافیۂ قرآنی کا ایک ورق'' نامی کتابیں بھی اسی عنوان کے تحت آنے والے مضامین سے تیار ہوئی ہیں۔ ان سب عنوانات سے ہٹ کر عمومی موضوعات پر لکھے گئے کالم اپنے اصلی نام ''بولتے نقشے'' سے چھپ رہے ہیں۔

نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی افادتی حیثیت کیا ہے؟ لیکن جب ضربِ مؤمن میں چھپنے والے کالموں کی کتابی صورت میں اشاعت شروع ہوئی تو یہ نقشے بھی اس کی ''زد'' میں آ گئے۔ اللہ کرے کہ جس مقصد کے لیے یہ ساری محنت ہوئی وہ پوری ہو اور ہم سب کے لیے دنیا میں سرخروئی و کامیابی اور آخرت میں اجر و ثواب کا سبب بنے۔ آمین

شاہ منصور

آغاز رمضان: 28ھ

پیش لفظ

پہلا تعارف

صحیح یاد تو نہیں پڑتا کہ وہ کون سا سال تھا؟ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ گرمیوں کی ایک روشن اور چمکتی دمکتی دوپہر تھی جب ''ضربِ مؤمن'' سے پہلا تعارف ہوا۔ بندہ کراچی کی مشہور مسجد ''جامع مسجد بیت المکرّم'' سے جمعہ کی نماز پڑھ کر نکل رہا تھا کہ دروازے کے قریب ایک آواز لگانے والے کو سنا ایک دینی اخبار بیچ رہا ہے۔ آگے چلنے سے پہلے یاد دلاتا چلوں کہ بندہ یہ روداد ایک مرتبہ پہلے بھی مختصراً لکھ چکا ہے جو'' پہلی دوستی'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے (یہ کالم برادر جناب مفتی محمد صاحب کی کتاب ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کی پہلی جلد کی اشاعت پر شائع ہوا تھا) یہ ان دنوں کی بات ہے جب جامعہ دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث اور ملک کے مایہ ناز عالم دین جناب مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ مذکورہ بالا مسجد میں جمعہ کا وعظ کہا کرتے تھے۔ پھر جمعہ ہی کے دن اسی مسجد میں عصر کی نماز کے بعد عالمِ اسلام کے نامور مفکر، استاد محترم، شیخ الحدیث حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (اللہ ان کی عمر اور صحت میں غیبی برکت عطا فرمائے) اصلاحی بیان کے طور پر درسِ حدیث دیا کرتے تھے۔ اس طرح ایک ہی دن میں اس مسجد میں دو انتہائی اعلیٰ درجے کے علمی، اصلاحی اور معلوماتی بیانات ساکنان عروس البلاد کراچی کو نصیب ہو جاتے تھے۔ اہلیانِ کراچی کا ایک بڑا حلقہ تھا جو ہفتہ بھر بے چینی سے ان روحانی محفلوں کا انتظار کرتا تھا اور جمعہ کو باقاعدگی سے یہاں حاضری دیتا تھا۔ سچ تو یہ ہے جو سماں ان محفلوں میں بندھتا تھا اس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کا صحیح لطف انہی سے پوچھیے جنہیں یہاں حاضری دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

جمعہ کی وعظ والی مجلس تو جنت مکانی جناب حضرت سحبان محمود نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال سے سوگوار ہو گئی مگر عصر کا بیان جو درسِ حدیث کے ضمن میں تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ باطن کے نادر طرز پر مشتمل ہے، تا حال جاری ہے البتہ اتنا فرق پڑا ہے کہ مسجد بیت المکرّم کے صحن سے جامعہ دارالعلوم کراچی کے سبزہ زار پر منتقل ہو چکا ہے اور صاحبِ ذوق و باسعادت شائقین فاصلوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کشاں کشاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ خوشبو وہی جو اپنے آپ کو خود منوالے اور کمال وہ جس کا بے ساختہ اعتراف کیے بغیر رہا نہ جا سکے۔

دیکھیے! بات ضربِ مؤمن سے پہلے تعارف سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ ہم چند ساتھیوں کا معمول تھا کہ جمعہ کا بیان شروع ہونے سے پہلے تیار ہو کر اگلی صفوں میں پہنچ جاتے تھے اور شستہ اردو میں بیان کیے گئے عالمانہ نکات سن سن کر دل و جان کی تسکین کا سامان کرتے تھے۔ جمعہ کے بعد قریب واقع ایک جھونپڑا ہوٹل میں فقیروں کے ٹولے کی نشست جمتی تھی۔ یہ ہوٹل مری

کی عباسی برادری میں سے ایک صاحب کا تھا۔ ہوٹل کا سارا عملہ بھی اسی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ ہم لوگ انڈا ٹماٹر اور دال گھوٹالہ منگواتے تھے (اس طرح کے ہوٹلوں میں یہی کچھ دستیاب ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ غریب غربا لوگوں کی یہ خوراک مہنگے ہوٹلوں کے قیمتی کھانوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے) جس سے ظاہر ہے ان بے چاروں کو کیا یافت ہوتی ہوگی لیکن ہوٹل کے مالک اور دیگر عملے کو ہم سے اُنس ہو گیا تھا۔ دوڑا دوڑا آتا تھا اور بچھا جاتا تھا۔ ہم نے بھی ہوٹل کے ایک کونے میں دھرے دو تختوں کو جوڑ کر اسے ''فقیری تھلّے'' کا نام دے دیا تھا اور باقاعدگی سے اس ''چوبی تھڑے'' پر ہفتہ واری نشست جماتے تھے۔ اس ''شاہانہ ظہرانے'' سے فارغ ہو کر ہم قریب کی ایک مسجد (یہ چھوٹی سی مسجد تھی جس میں ان دنوں جمعہ نہ ہوتا تھا) میں دریوں کا تکیہ اور رومال کا بستر بنا کر قیلولہ کر لیتے تھے اور عصر کو واپس بیت المکرّم میں پہنچ جایا کرتے تھے جہاں علمیّت اور روحانیت، خلوص اور دردِ دل؛ اردو ادب کی چاشنی میں گھل کر ہمارے رویں رویں کو سیراب کر دیا کرتا تھا۔

اب یہاں تک پہنچ کر میں واپس پلٹتا ہوں۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد ہم باہر نکل رہے تھے کہ دارالافتاء والارشاد سے متعلق ایک ساتھی کو دیکھا کہ اخبار کی آواز لگا رہا ہے۔ ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا...... یا رب العزت! دارالافتاء اور اخبار...... یہ تو ایسا ہے جیسے تبلیغی بھائی اور اجتماع کا اشتہار...... جس طرح تبلیغی حضرات فرد بہ فرد زبانی دعوت دینے کے قائل ہیں اور اخبار وغیرہ کے ذریعے اپنے کام کی تشہیر کا مزاج نہیں رکھتے...... حالانکہ ان کی اصلاحی اور تعمیری کاوشوں کا وزن اور حجم، امت میں جاری رجوع الی اللہ کی محنتوں میں بہت بڑا اور عظیم الشان حصہ رکھتا ہے...... اس طرح دارالافتاء والے حضرات بھی خالص علمی مزاج رکھتے تھے اور اخبار وغیرہ کو رسوخ فی العلم کے لیے درکار یکسوئی کے منافی سمجھتے تھے۔ خیر! اللہ رب العزت نے جب کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو اس طرح کے عجائبات ظہور میں آ ہی جاتے ہیں۔ میں پیچھے پلٹا اور رفقا کو بتایا کہ اس ساتھی کی حوصلہ افزائی کے لیے سب وقفے وقفے سے جا کر ایک ایک دو دو شمارے خرید لیں۔ یہ ہمارا ضربِ مؤمن سے پہلا ٹاکرا تھا۔ اس وقت ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کبھی ضربِ مؤمن سے باقاعدہ تعلق ہو جائے گا، اس لیے بھی کہ ہمارا لکھنے لکھانے سے کبھی تعلق ہی نہ رہا تھا اور اس لیے بھی کہ ہم بھی دوسرے طلبہ کی طرح اخبار بینی کی مشغولیت کو علم سے دوری کا سبب بلکہ ''سمِ قاتل'' سمجھتے تھے۔ بالکل ایسے جیسے ہمارے نوجوان فضلا صحافت کو غیر علمی مشغلہ سمجھتے ہیں...... البتہ اب یہ رجحان اصلاح پذیر ہے اور جامعۃ الرشید کے صحافت کورس کے شرکاء نے جب سے خبر نگاری، مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کی تربیت پا کر میڈیا کے میدان میں خدمات انجام دینا شروع کی ہیں، تب سے تو مدارس کے ماحول میں نئی روایات جنم لے رہی ہیں۔

ضربِ مؤمن کے ایک خریدار سے اس کے ایک خادم؛ اور خاموش لفظوں سے بولتے نقشوں تک فلسطین کے ایک عاشق کا سفر کیسے طے ہوا؟ یہ مستقل داستان ہے۔ گزشتہ سالوں میں جب مشکلات کچھ زیادہ ہی خوفناک ہو جایا کرتی تھیں تو بندہ تنہائی میں کئی بار سوچتا تھا کہ یہ ساری باتیں جو دل پر خوں کی اک گلاب کی شکل میں ہیں، قلم کی سیاہی کے ذریعے یادداشتوں کے محفوظ ہاتھوں کے سپرد کر دے۔ ممکن ہے ہم اللہ کی بارگاہ میں ''سرخ رو'' ہو جائیں اور یہ روداد ہمارے بعد چھپتی رہے اور دلچسپ و بامعنی یادگار رہے۔ یہ ارادہ اب تک تشنہ تکمیل ہے لیکن یہ مکمل ہو کر عملی شکل دھار گیا تو امید ہے کہ باذوق قارئین کے لیے خاصے کی چیز ہوگا اور ہمارے بعد یاروں کو فقیروں کی یاد دلاتا رہے گا۔

اب جبکہ ضرب مؤمن اپنے عمر کے دسویں سال کو پہنچنے کے بعد ذرا دم لے کر* آگے کا سفر شروع کر رہا ہے تو ہمیں اپنی نیتیں دوبارہ سے پرکھنی چاہییں، کارکردگی کو پھر سے جانچنا چاہیے اور اللہ اور اس کے بندوں سے کیے گئے عہد کو پھر سے تازہ کرنا چاہیے۔ سوہنے ربا! ہم کبھی تجھ سے نہ پھریں گے، تجھے تیری شان کریمی کا واسطہ! ہم سے اپنی رحمت کی نظر نہ پھیرنا۔

ناکام ہے تو کیا ہے، کچھ کام پھر بھی کرجا
مردانہ وار جی، مردانہ وار مرجا
اس بحر بیکراں میں ساحل کی آرزو کیا
کشتی کی جستجو کیا، ڈوب اور پار کر جا

* حکومتی پابندیوں کی طرف اشارہ ہے۔

پہلا باب

عشقیّات

مکتبِ عشق کا نصاب

قبولیت کی سند:

جولوگ اسلام کا ''دہشت گردی'' اور مسلمانوں کا ''شدت پسندی'' سے رشتہ جوڑ کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کی نفسیات کو سمجھ لیا ہے، وہ مناسک حج پر ایک نظر ڈال لیں۔ محبت و عشق اور ایثار و وفا کے پُر کیف مناظر اور محبوبِ حقیقی کے لیے اپنا سب کچھ مِٹانے، قربان کرنے اور لُٹا دینے کے بعد اپنے آپ کو بھی فنا کر دینے کی روح پرور یادگاریں انہیں بتا دیں گی کہ انہوں نے اسلام کو سمجھنے اور مسلمانوں پر تبصرہ کرنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔ ایک لباس پہنے، ایک قطار میں کھڑے اور ایک جیسی محبتی اداؤں کی نقل کرتے دنیا بھر کے مسلمانوں کو دیکھ کر انہیں اپنا تجزیہ غلط محسوس ہوگا کہ یہ قوم لطیف جذبات سے عاری اور عشق و محبت کی اعلیٰ روایات سے غافل ہے۔ حج کی صورت میں اللہ ربّ العزت نے مسلمانوں کو وہ عبادت عطا فرمادی ہے جو دین و دنیا کے بے مثال فوائد اور مادی و روحانی انعامات کی حامل ہے۔ ایک عابد کے لیے اس کے معبود کی طرف سے اس سے بڑھ کر کیا انعام ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے لیے ایک مرکزی عبادت گاہ تجویز کر دے جہاں پہنچ کر وہ اس سے راز و نیاز اور مناجات کر سکے۔ عاشق صادق کے لیے اس کے محبوب کی طرف سے اس سے زیادہ کوئی حسین تحفہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اسے اپنے دَر پر آنے، اپنی چوکھٹ چومنے، اپنے گھر کے پردوں، دیواروں سے لپٹنے، گرداگرد دیوانہ وار چکر لگانے اور عشق و محبت کی یادگاروں پر سچے بےلوث عاشقوں کی طرح دل کا ارمان نکالنے کی اجازت دیدے۔ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا امتِ محمدیہ پر احسان ہے کہ اس نے محبوبِ ربّ العالمین کے دامن سے وابستہ ہونے والوں کو اس عظیم نعمت سے نوازا جو اُن کے لیے باعث فخر و شکر بھی ہے اور عنداللہ ان کی قبولیت کی سند و تمغہ بھی۔

نصیبوں والی ملت:

ذرا تصور تو کریں اقوام عالم میں اور کس کا نصیب ہے کہ اسے پوری دنیا میں ایک مرکز ایسا میسر ہو جو ہزارہا سال سے امن و امان، سکون و اطمینان، خوش حالی و فراوانی سے مالا مال ہو۔ جہاں صدیوں پرانے مستند ترین روحانی آثار قدیمہ موجود ہوں۔ جہاں وہ ایک متعینہ وقت، مخصوص لباس اور مخصوص ہیئت کے ساتھ دنیا بھر سے کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہوں، اپنے روحانی آباء و اجداد کے مبارک طریقوں کو زندہ کر کے اپنے قلب کو آباد اور روح کو شاد کرتے ہوں اور اپنے رب کی رضا و رحمت اور جنت و مغفرت کا پروانہ لے کر واپس ہوتے ہوں۔ دیگر مذاہب کی تو بات ہی نہ کیجیے۔ دنیا کے بڑے مذہبوں پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں: عیسائی حضرات کا تو سرے سے کوئی مخصوص قبلہ ہی نہیں، وہ تو ایک سمت (مشرق) کی طرف رخ کر کے گزارا کرتے ہیں۔ یہودی ایسے محروم ہیں کہ ہزاروں سال سے ''ارضِ موعود'' میں واپسی اور نامعلوم و ناموجود ''ہیکل سلیمانی'' کے خیالی ماڈل کو حقیقی صورت دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ بدھ مذہب کی چند یادگاریں دنیا میں یہاں وہاں بکھری ہوئی ہیں لیکن ان کی اتنی نقلیں بنائی گئی ہیں کہ

اصل اور نقل میں امتیاز مشکل ہے۔ گوتم بدھ تک ان کی نسبت اور ان کی تعلیمات کی رو سے ان کی حیثیت تو ایسی مشکوک ہے کہ اسے استناد اور تحقیق کی دنیا میں کوئی مقام ملنا مشکل ہے۔ ہندومت کو تو رہنے ہی دیجیے۔ ایسی داستانوں پر مشتمل ہے کہ پڑھے لکھے ہندو انہیں سنجیدہ محفلوں میں بیان کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ دنیا بھر کی اقوام اور مذاہب میں سے صرف...... اور صرف مسلمانوں کو یہ امتیاز اور اعزاز حاصل ہے کہ ان کے پاس ایک مرکزی نقطۂ اتصال ہے، جس سے وہ ایک طاقتور روحانی کشش کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ مرکز مستند ترین آثار و مقامات مقدسہ سے معمور ہے جہاں آنے والوں کو ایک مخصوص حد سے آگے بغیر خاص لباس اور شرائط کے آنے کی اجازت نہیں۔ یہ مقدس مقام روزِ قیام سے لے کر آج تک کبھی اپنے پروانوں سے خالی نہیں ہوا۔ یہاں پہنچنے والے دنیا و مافیہا سے ہی بے خبر نہیں ہوتے، اپنے آپ سے بھی لاتعلق ہو جاتے ہیں اور ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں گنہگار بندے اور عظمت والے پروردگار کے درمیان فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔

کرۂ ارض کے تین دائرے:

مناسک حج کیا ہیں؟ مکتبِ عشق کے نصاب کا خاکہ ہیں۔ اللہ کی محبت میں خود کو فنا کر دینے والوں کی یادگاریں اور اللہ تعالیٰ سے وفاداری نبھانے میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے اور بار بار ایسا کرتے چلے جانے والوں کے طور طریقوں کی نقل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان قدسی نفوس شخصیات جیسے اعمال کون کر سکتا ہے؟ لیکن ان کے ساتھ مشابہت بھی بہت بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سچے عاشقوں جیسی ادائیں اپنانے کی مشق کرتے کرتے بندہ عشق مجازی سے ہوتے ہوتے عشق حقیقی کے مقامات کو پا لیتا ہے اور اسے اپنی اس بلند بختی کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ قدرت و عظمت والے بادشاہ کے گھر سے ذرا دور ایک مخصوص حد سے آگے گزرتے ہی کیفیات و انوارات کا نزول شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تو انسان کسی اور عالم میں پہنچ جاتا ہے جب رب العالمین کے گھر پر پہلی نظر پڑتی ہے۔ ان مخصوص حدود کا قیام بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ کرۂ ارض کو تین دائروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا اور مرکزی دائرہ ''حرم'' کہلاتا ہے۔ یہ احکم الحاکمین کے دربار کے گرداگرد قائم اولین حدود ہیں۔ یہاں کی نیکی کئی گنا زیادہ ثواب اور گناہ کئی گنا زیادہ عذاب کا سبب ہے۔ یہاں کسی جانور کو بھی تکلیف دینا یا گھاس، پودے اور درخت وغیرہ توڑنا منع ہے۔ بیت اللہ سے چاروں طرف مختلف فاصلوں پر موجود یہ حدود حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نشاندہی پر سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے قائم فرمائی تھیں اور پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی تجدید فرمائی۔ ان میں سب سے قریب ترین ''تنعیم'' ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عمرہ کے احرام کے لیے ان کے بھائی کے ساتھ بھیجا تھا۔ ان کی اتباع میں اکثر عازمین یہیں سے عمرے کا احرام باندھتے ہیں۔ دوسرے دائرے کو ''حل'' اور اس کے باشندگان کو ''اہلِ حل'' کہتے ہیں۔ یہ گویا حرم مکی کے پڑوسی ہیں۔ اس کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے اسے ''میقات'' کہتے ہیں۔ میقات پانچ ہیں اور ان کو ملانے سے ایک پانچ کونوں والی مخمس شکل بنتی ہے۔ اس کے رہنے والے تو حرم شریف کی حدود میں بغیر احرام کے جا سکتے ہیں لیکن اس کے باہر تیسرے دائرے ''آفاق'' سے آنے والے جنہیں آفاقی کہتے ہیں، وہ اگر حرم شریف جانا چاہتے ہیں تو احرام کے بغیر یہاں سے آگے نہیں جا سکتے۔

ایک لمحے میں:

دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کو تقویٰ و دیانت اور غیرت و حیا سے محروم کر کے دنیاداری اور دنیا پرستی میں مبتلا کرنے کے

لیے مسلم معاشروں میں فحاشی وعریانی کا طوفان برپا کیا تھا لیکن مغرب کے اس طوفان نے مسلمانوں کو حیران کر دیا ہے۔ سقوط کابل وقندھار کے دنوں میں جب ہم جیسے لوگ رضا بالقضاء پر دل کڑا کے جی رہے تھے، بندہ نے ایسے لوگ بھی دیکھے جن کا بظاہر دینداری سے کوئی تعلق نہ تھا مگر مسلمانوں کے غم اور مجاہدین کی بے بسی پر لگتا تھا ان کا دل پگھل جائے گا۔ نوجوان نسل کو گمراہ کرنے اور بلند نگاہی، عالی حوصلگی اور جہادِ زندگانی کی تیاری میں مشغولیت سے ہٹانے کے لیے طاغوت کے گماشتوں نے کیا کچھ نہیں کیا، مگر ان کی مسلسل ذہنی وفکری یلغار کے باوجود رمضان المبارک میں سماع قرآن اور اعتکاف میں انہی نوجوانوں کی رغبت اور انہماک قابل دید ہوتا ہے۔ سرمایہ داریت کے ہوشربا مناظر نے مسلمانوں کو حلال وحرام کی تفریق تقریباً بھلا دی ہے لیکن رمضان اور حج کے موقع پر حرمین کی حاضری میں روز افزوں اضافہ اور مسلمانانِ عالم کا والہانہ پن اور ذوق وشوق دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھیر رہا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے گھر اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری کا عاشقانہ جذبہ مسلمانوں کی من کی دنیا کو میل کچیل سے دھو دھا کر اجلا اور نکھرا بنا دیتا ہے۔ ایسے ایسے گنہگار مسلمان جن کی حالت بعض حوالوں سے قابل رحم ہوتی ہے، حرمین پہنچتے ہی ایسی نورانی فضاؤں میں محو پرواز ہو جاتے ہیں اور ایمان ویقین کا ایسا درجہ پا لیتے ہیں کہ کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دیتے ہیں۔ یوں تو حرمین حاضری کے تاثرات ہمارے بہت سے اکابر نے دل نشیں انداز میں قلم بند کیے ہیں مگر آج آپ کو پاکستان کے ایک مشہور بیوروکریٹ اور بلند پایہ ادیب کے تاثرات سنواتے ہیں۔ پڑھئے اور سر دھنئے کہ اللہ کے گھر کا دیدار کرنے والے صاحبِ ایمان لوگ ایک لمحے میں کہاں سے کہاں جا پہنچتے ہیں۔

حق الیقین کی دولت:

''نالے کے کنارے میرے بالکل قریب بہاول پور کے ایک خاندان نے ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ ایک بوڑھے میاں بیوی کے ساتھ ان کی بہو تھی۔ بڑے میاں تو خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے لیکن ساس اور بہو میں بات بات پر بڑی طویل لڑائی ہوا کرتی تھی۔ لڑائی میں ہار اکثر بہو کی ہوتی تھی اور ہر شکست کے بعد وہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور ساس سے کہتی تھی: ''اچھا! تم نے جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لو۔ میں بھی ابھی جا کر طواف کرتی ہوں اور اللہ میاں کے پاس اپنی فریاد پہنچاتی ہوں۔'' یہ دھمکی سنتے ہی اس کی ساس فوراً پسیج جاتی تھی اور بہو کا دامن پکڑ کر بڑی لجاجت سے کہتی تھی: ''نہ بیٹی نہ! تُو تو میری بیٹی ہے۔ ایسی غلطی نہ کرنا، خواہ مخواہ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکال بیٹھنا۔ طواف میں جو منہ سے نکل جائے وہ پورا ہو کے رہتا ہے۔''

اس خاندان سے ذرا ہٹ کر ایک جوڑے کا بسیرا تھا۔ یہ میاں بیوی بے اولاد تھے اور بچے کی آرزو لے کر حج کرنے آئے تھے۔ اپنا پہلا طواف کر کے یہ واپس آئے تو بیوی نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب ان کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی کیونکہ طواف کے دوران اس نے اللہ تعالیٰ سے بچہ کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگا۔

''لڑکا مانگا تھا یا صرف بچہ مانگا تھا؟'' خاوند نے وکیلوں کی طرح جرح کی۔

''لڑکے کی بات تو میں نے کوئی نہیں کی۔ فقط بچے کی دعا کرتی رہی۔'' بیوی نے جواب دیا۔

''رہی نہ اُوت کی اُوت'' خاوند نے بگڑ کر کہا: ''اب اللہ کی مرضی ہے، چاہے تو لڑکا دے، چاہے تو لڑکی دے۔ اب وہ تجھ سے پوچھنے تھوڑی آئے گا۔ اس وقت لڑکے کی شرط لگا دیتی تو لڑکا ہی ملتا۔ یہاں کی دعا کبھی نامنظور نہیں ہوتی۔''

یہ سن کر بے چاری بیوی بھی کفِ افسوس ملنے لگی۔ پھر چہک کر بولی: ''کوئی بات نہیں تم کچھ فکر نہ کرو، ابھی بہت سے طواف باقی ہیں۔ اگلی بار میں اپنے خدا کو لڑ کے لیے راضی کرلوں گی۔''

ان سیدھے سادے مسلمانوں کا ایمان اس قدر راسخ تھا کہ خانۂ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہی وہ کوہِ طور کی چوٹی پر پہنچ جاتے تھے اور اپنے معبودِ حقیقی سے راز و نیاز کر کے نفسِ مطمئنہ کا انعام پاتے تھے۔ ان سب کو حق الیقین کی دولت حاصل تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اپنی اپنی فرمائشیں ربِ کعبہ کے حضور پیش کر کے قبولیت کی مہر لگوا لیتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس لڑکا ساس اور بہو اور اس بے اولاد کے پاؤں کی خاک تبرک کے طور پر اپنے سر پر ڈالوں تاکہ کسی طرح مجھے بھی ان کے یقینِ محکم کا ایک چھوٹا سا ذرّہ نصیب ہو۔

منیٰ کے لیے روانگی کا دن مقرر ہوتے ہی مجھے شدید کپکپی کے ساتھ بخار آنے لگا اور ساتھ ہی بڑے زور کی نکسیر چلنے لگی۔ معلم نے مجھے اس حالت میں منیٰ اور عرفات لے جانے سے انکار کیا۔ یہ دیکھ کر میرے بعض ساتھیوں نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، بعض نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں، زندگی رہی تو ان شاء اللہ حج پھر بھی نصیب ہو جائے گا۔ بعض نے تاسفانہ سر ہلایا اور خاموش رہے، لیکن بہاولپوری خاندان کی لڑکا کا ساس کڑک کر بولی: ''تم جوان آدمی ہو۔ یہاں ڈھیری ڈھا کر لمبے کیوں پڑے ہو؟ جاؤ! اٹھ کر طواف کرو۔ اللہ میاں یہاں تک لایا ہے تو اب خالی ہاتھ واپس بھیجتے اسے شرم نہ آئے گی؟''

یہ آخری جملہ اپنے رب پر جس اعتماد اور ناز سے کہا گیا ہے اس کی حقیقت اور اس میں پوشیدہ لطف کا ادراک کوئی غیر مسلم بلکہ کیفیاتِ محبت اور وارداتِ عشق سے ناواقف مسلمان بھی نہیں کر سکتے۔

وفورِ محبت کی بے خودیاں:

پھر جب مرحلہ محبوب رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شہر اور روضۂ مطہرہ پر حاضری کا آتا ہے تو سبحان اللہ! قلب کا گداز، روح کا سوز، وفورِ محبت میں ہونے والی بے خودیاں، اظہارِ عقیدت کے والہانہ انداز، ایسے عجیب و غریب مناظر اور واقعات کو جنم دیتے ہیں کہ تاریخِ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور قیامت تک قاصر و عاجز رہے گی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقامِ محبوبیت عطا ہوا ہے اور مسلمان آپ کے لیے جس طرح کی مجنونانہ اور مجذوبانہ اداؤں کے ذریعے اظہارِ محبت کرتے ہیں، آئیے اس کی بھی کچھ جھلکیاں دیکھتے ہیں:

''ہمارا قافلہ بھی رات بھر چلتا رہا اور صبح دس بجے کے قریب مدینہ منورہ سے چار پانچ میل اس طرف رک گیا۔ یہاں پر ایک کنواں تھا جس پر رہٹ چل رہا تھا۔ قافلے والوں نے یہاں اتر کر غسل کیا اور نئے کپڑے پہنے۔ کچھ عقیدت مند بسوں پر دوبارہ سوار ہونے کے بجائے یہاں سے احتراماً پیدل چلنے لگے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر خیال آیا کہ دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں جوتے پہن کر داخل ہونا بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے، میں نے فوراً اپنے چپل کھول کر ہاتھ میں اٹھا لیے اور برہنہ پا چلنے لگا۔ دھوپ میں تپتے ہوئے سنگریزوں میں آگ کے شعلے لپکے اور حرارت کی لہریں بجلی کے کرنٹ کی طرح میرے جسم میں پھیل کر دماغ سے ٹکرانے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے اپنے چپل دوبارہ پہن لیے۔ اپنے جذبۂ احترام کے اس بودے پن پر مجھے اس قدر جھنجلاہٹ اور ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے چپل پھر کھولے اور انہیں

اٹھا کر سڑک سے دور جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اب ننگے پاؤں چلنا ایک مجبوری تھی لیکن میری خود فریبی اس مجبوری کو احترام کا نام ہی دیتی رہی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد ایک موڑ آیا جس کی گولائی پر چند گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور بہت سے لوگ سڑک پر کھڑے والہانہ انداز میں درود وسلام پڑھ رہے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان حضرات کو اپنا گوہر مقصود نظر آ گیا ہے۔ میری عمر اس وقت 32، 33 برس تھی۔ اس طویل عرصہ میں میری آنکھوں نے زندگی کی کثافت، رذالت، رکاکت اور خباثت کے علاوہ اور کچھ بہت کم دیکھا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ گنبدِ خضرا پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان گناہگار آنکھوں کو کسی قدر صاف کرلوں۔ اس مقصد کے لیے شاہراہِ مدینہ کی خاک سے بہتر اور کیا چیز ہوسکتی تھی؟ میں نے اضطراراً چلتی ہوئی سڑک سے خاک کی ایک چٹکی اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالیا۔''

''واپسی میں نصف راستہ طے کرنے کے بعد ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک سیاہ فام افریقی نوجوان ننگے سر دھوپ میں پیدل چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ بیوی کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ اس شدید دھوپ میں بھی یہ جوڑا بڑے اطمینان سے پا پیادہ مدینہ شریف کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیور رحم دل آدمی تھا۔ بس روک کر اس نے ان مسافروں کو اپنی صراحی سے پانی پلایا۔ پانی دیتے ہوئے ڈرائیور نے انہیں بتایا کہ یہ پانی مدینہ سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھے۔ انہوں نے ایک گھونٹ اپنے بچے کے منہ میں بھی ٹپکایا۔ پانی کے کچھ قطرے زمین پر گر گئے تھے۔ میاں بیوی نے جھک کر بھیگی ہوئی ریت اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔''

سبحان اللہ! ہے کسی قوم کے پاس اپنے پیغمبر سے فدائیانہ عشق کا ایسا جذبہ جو مسلمانوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت اور انوارات و برکات سے تمام مسلمانوں کو مالا مال فرمائے۔ آمین۔

سوہنے ربّا!

ماضی قریب کے مشہور مبلغ اور خطیب جناب قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہ اللہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی پنجابی کو بیت اللہ کی چوکھٹ سے لپٹے دیکھا اپنے مولا سے راز و نیاز کر رہا تھا: ''سوہنے ربا! ہمارے ہاں قانون ہے کہ اگر کسی نے ہمارا اجھگا ساڑ دیا ہو، منجاں (بھینسیں) کھول لے گیا ہو، فصل جلا ڈالی ہو یا بندہ ہی مار دیا ہو لیکن ایک مرتبہ ہمارے دروازے پر آجائے تو ہم اسے کچھ کہنا اپنی غیرت کے خلاف سمجھتے ہیں اور دل سے معاف کر دیتے ہیں۔ پروردگار! میں نے عمر بھر جو کچھ کیا مگر اب میں تیرے دروازے پر آ گیا ہوں، تجھے تیری عزت کا واسطہ! میری لاج رکھ لے۔''

جناب قاضی صاحب (اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے) فرماتے تھے کہ میں پیچھے کھڑا سن رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا: ''حرمین کی میری ساری حاضری لے لے، یہ دُعا مجھے بخش دے، میرا بیڑا پار ہو جائے گا۔''

قاضی صاحب مغفور و مرحوم نے تو محبت اور اخلاص میں اس سے یہ بات کہہ ڈالی ورنہ وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ جو بھی پروردگار کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر یہ باتیں کر لے تو اس کا بیڑا ان شاء اللہ پار ہی ہے۔ پنجاب کے بہت سے علاقوں میں مثلاً جھنگ اور گرد و پیش میں یہ دستور ہے کہ اگر کوئی کسی کو قتل بھی کر ڈالے لیکن اپنی عورتوں اور بچوں کو لے کر مدعی کے دروازے پر پہنچ جائے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور دعویٰ باقی رکھنے میں اپنی بے عزتی سمجھتا ہے کیونکہ علاقے میں یہ چیز اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔ پیر طریقت مرشدی حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب دامت برکاتہم اپنی دُعا میں اسی چیز کا واسطہ دے کر دُعا مانگتے ہیں تو بڑا سماں بندھتا ہے، روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

حج کے دوران حجاج کرام کے پاس دُعاؤں کی کتابیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک حاجی صاحب کے پاس عربی میں ایک تحریر لکھی دیکھی۔ بڑے سائز میں کمپوز کرا کر پاس رکھی تھی۔ مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

''الٰهي! لستُ للفردوس أهلاً، ولا أقدر على نار الجحيم

فهب لي توبة؛ إنك أنت غافر الذنب العظيم.''

''پروردگار! میں جنت کا مستحق تو ہوں نہیں اور جہنم کی آگ برداشت کر نہیں سکتا۔ بس اب ایک ہی صورت ہے کہ تو مجھے بخش دے کہ صرف تو ہی وہ ذات ہے جو بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر دیتی ہے۔''

حج میں ویسے تو تقریباً ہر زائر ہی مجذوب ہو جاتا ہے اور بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں کہ اسے خود احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ مجذوبانہ باتیں کر رہا ہے۔ مثلاً: ایک شخص جو چہرے مہرے سے ٹھیک ٹھاک ''روشن خیال'' تھا، کافی دیر سے دُعا کر رہا تھا: ''اللّٰهم تُب علينا اللهم تُب علينا.'' اے اللہ! معاف کر دے، اے پروردگار! بخش دے۔'' یہ دُعا کرتے کرتے

اس نے مفلر نکال کر گلے میں لپیٹ کر پھندا سا بنالیا اور ایک ہاتھ سے اس کو کھینچ کر کہتا تھا:"وإلا تغفر لي فاسحب! فاسحب!"

یعنی اگر معاف نہیں کرتا تو ابھی مجھے کھینچ لے، ابھی اوپر اُٹھا لے۔ آس پاس والے مبہوت ہوکر یہ سارا منظر دیکھتے رہے۔

☆ایک شخص بار بار یہ کہتا تھا:"اللهم أنت أنت، وأنا أنا."

''پروردگار! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تو تو ہے اور میں میں ہوں۔''

مشکل یہ ہے کہ ایسے مجذوبوں سے آدمی بات چیت کا بہانہ آسانی سے تلاش نہیں کر پاتا۔

☆ایک مائی کو اور کچھ نہ آتا تھا۔ بس خانۂ کعبہ کی طرف اشارہ کر کے ''اللہ، رسول، مدینہ'' کہتی اور منہ پر ہاتھ پھیرتی رہتی۔

☆لوگوں نے کالے بھائیوں کو ویسے ہی بدنام کر رکھا ہے۔ ہم نے میدانِ عرفہ میں بچشمِ خود دیکھا کہ دو کالے بھائی قبلہ رُخ کھڑے دُعا اور مناجات میں مصروف تھے۔ قریب ہی ایک ٹرالر سے قسما قسم سامان تقسیم ہو رہا تھا۔ مفت بٹ رہا تھا، مگر قسم لے لیجیے کہ انہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا ہو۔ بس اپنے آپ میں مست تھے۔

☆ایک باباجی منیٰ میں ہمارے خیمے میں تھے۔ 1967ء سے حج کر رہے تھے۔ کہنے لگے پہلا حج تو فرض کی ادائیگی کے لیے کیا تھا اس کے بعد سے شہادت کی تلاش میں آتا ہوں لیکن مل کے نہیں دیتی۔ جب رمی کا وقت آتا ہے تو میں سب سے پہلے عین رش کے وقت ہجوم میں گھس جاتا ہوں کہ شاید رب تعالیٰ اس بہانے اپنے پاس بلا لے مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کئی مرتبہ جب حبس اور رش سخت ہوا تو ایسا لگا کہ اب کام ہو جائے گا مگر کچھ بھی نہیں نہ ہوا۔ صحیح سالم نکل آیا۔ میں ہر حج پیدل کرتا ہوں، منیٰ تک اپنے پاؤں پر پھر دوسرے حاجیوں کے کندھوں پر۔ پہلا حج ایوب خان کے زمانے میں بحری جہاز سے کیا تھا۔ تب سے اب تک متواتر بلاناغہ حاضری دیتا ہوں۔ کل ان شاء اللہ! پھر کمر باندھ کے جاؤں گا۔ شاید امید بَر آئے۔ اگلے دن دیکھا کہ نہایت شکستہ دل مرجھائے چہرے کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ ان کا گوہرِ مقصود اس سال بھی حاصل نہ ہوسکا تھا۔

☆ایک باباجی کو طواف زیارت کا بہت اہتمام تھا کہ صحیح صحیح ہو جائے، کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے اور یہ طواف نہ ہونے سے بیوی حرام نہ ہو۔

☆منیٰ میں انڈیا کی ایک معمر خاتون نے راستہ چلتے روک کر پوچھا:''قتل خانہ کدھر ہے؟''

''کیوں اماں! کس کو ٹھکانے لگانا ہے؟''

''ارے بوے! مجاق نہ کر! قربانی دینی ہے قربانی۔''

اور اب آخر میں حاجی حضرات کی چند مشکلات اور ان کا ممکنہ حل:

ایک مرتبہ لکھا تھا کہ چھوٹے تقاضے کے لیے اگر نلکی والی تھیلی بنائی جائے تو بیت الخلا پر رش بہت کم ہو جائے گا، یہ کوئی ایسی مشکل چیز نہیں، ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔

☆ پاکستان کی خواتین پردہ نہیں کرتیں۔ بعض تو گھر میں پہنے جانے والے کپڑوں میں حرم شریف نماز کے لیے چلی جاتی ہیں۔ نہ اوپر کوئی عبا نہ چادر، بس چھوٹا سا ڈوپٹہ گلے میں لپیٹ لیا۔ کرتے کی کلیاں اوپر تک کھنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستانی گروپ لیڈروں کو چاہیے اپنے گروپ کی خواتین کے لیے عبا سلوائیں اور اتنی بہترین اور اچھی سلوائیں کہ خواتین اسے خوشی خوشی پہنیں۔ مردوں کو چاہیے عورتوں کو پردے کا اہتمام کروائیں ورنہ اہلِ وطن کی بہت بے عزتی ہوتی ہے اور بڑی شرم آتی ہے۔

☆ ایک مسئلہ راستہ بھول جانے والے حجاجِ کرام کا ہوتا ہے۔ حجاج کے ہاتھ میں جو کڑے یا پٹے ہوتے ہیں وہ ان کی رہائش گاہ کی نشاندہی کے لیے ہرگز کافی نہیں ہوتے۔ ان پر صرف معلم کا نام اور فون ہوتا ہے جبکہ حاجی کے گروپ اور رہائش کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ گم شدہ حجاج کو ان کے ڈیروں تک پہنچانے کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام بھی نہیں ہوتا۔ مکہ مکرمہ میں حرم شریف کے قریب ایک چھوٹا سا مرکز بنا ہوا ہے جو اس مقصد کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ اس شعبے کو خوب فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ اگر:

1 ...... مشہور زبانوں کے ترجمان مہیا ہوں۔

2 ...... اسکوٹر والے چند رضا کار موجود ہوں۔

تو بھولے بھٹکے حاجیوں کو بآسانی ان کی جگہ تک پہنچایا جا سکتا ہے ورنہ بندہ نے بچشمِ خود ایسے حاجی دیکھے جو دو دن سے راستہ بھول کر حیران پریشان پھر رہے تھے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔

تین دائرے

آج کی مجلس میں مسلمانوں کو اسلام کی عطا کردہ ایک اہم خصوصیت اور مسلمانوں کے ایک منفرد اعزاز و امتیاز کا تذکرہ ہے جس سے اکثر عامۃ المسلمین واقف نہیں۔

سیاست شرعیہ کی رُو سے کرۂ ارض تین حصوں پر مشتمل ہے۔ آپ انہیں تین دائرے بھی کہہ سکتے ہیں جو اہمیت، فضیلت اور احکام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ قائم کیے گئے ہیں۔ یہ دائرے بیت اللہ کے گرداگرد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے قائم کیے گئے ہیں۔

حرم اور اہلِ حرم:

پہلے کا نام ''حرم'' ہے اور اس کے اندر رہنے والے ''اہلِ حرم'' کہلاتے ہیں۔ یہ سب سے اہم ترین، مقدس ترین اور سب سے زیادہ برکت اور فضیلت والی جگہ ہے۔ اس میں انسان تو انسان، نباتات اور حیوانات کا حکم بھی یہ ہے کہ نہ کسی درخت، پودے یا گھاس کو کاٹا جاسکتا ہے نہ کسی جانور کو مارا جاسکتا ہے۔ اس کی حدود میں شکار ممنوع ہے بلکہ کسی جانور کو اس کے گھونسلے یا آشیانے سے بھگانا، پریشان کرنا یا اس کے انڈے توڑنا بھی جائز نہیں۔ البتہ چند موذی جانور ایسے ہیں جن کو مارنے کی اجازت ہے مثلاً: بھیڑیا کتا، چیل کوّا، سانپ بچھو، چوہا گرگٹ وغیرہ۔ اس دائرے کی حدود سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام کی نشان دہی پر جناب سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے متعین کی تھیں۔ اس کے بعد جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نشانات کی تجدید فرمائی۔ ان میں سے تین مشہور یہ ہیں:

❶ تنعیم: یہ حدود حرم میں بیت اللہ سے قریب ترین جگہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو یہاں سے احرام نہیں باندھا...... آپ نے عمرہ کا احرام ''جعرانہ'' نامی جگہ سے باندھا تھا جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے...... لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیج کر یہاں سے احرام باندھنے کا حکم فرمایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول آپ کے فعل سے زیادہ واجب العمل اور تاکید والا ہوتا ہے۔ ''والدلیل القولی مقدم عندنا علی الفعلی.'' (شامیہ: 3/555)

لہٰذا حدود حرم میں مستقل یا عارضی قیام رکھنے والوں کے لیے عمرے کا احرام ''تنعیم'' سے باندھنا ہی افضل ہے۔ اس جگہ علاماتِ حرم کے قریب ''مسجدِ عائشہ'' کے نام سے عظیم الشان اور خوبصورت مسجد قائم ہے جس میں زائرین کو احرام باندھنے کی جملہ سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ البتہ حج کا احرام یہ حضرات (جو حرم کی حدود میں مستقل یا عارضی رہائش رکھتے ہوں) اپنے گھر سے باندھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے عمرہ اور حج میں یہ فرق .... کہ عمرے کے لیے حدود حرم سے باہر جا کر احرام باندھنا پڑتا ہے اور حج کے لیے اپنی جائے رہائش ہی سے باندھ سکتے ہیں .... اس لیے ہے کہ عمرہ و حج کے لیے ہر قسم کے زائر کو تھوڑا

بہت سفر تو کرنا چاہیے۔ اب عمرہ تو بیت اللہ میں ہی ادا ہوگا اس لیے اس کی خاطر کچھ نہ کچھ سفر کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ حرم شریف سے باہر جا کر وہاں سے احرام باندھ کر آئیں لیکن حج کا رکن اعظم یعنی اہم ترین عمل ''وقوفِ عرفہ'' حرم کی حدود سے باہر واقع میدان عرفات میں ادا کیا جاتا ہے لہٰذا اگر اہلِ حرم گھر سے بھی احرام باندھ کر چلیں تو حج کے لیے تھوڑا بہت سفر ہو جائے گا۔ بس اس حکمت سے شریعت نے اہل حرم کے لیے حج و عمرہ کی جائے احرام کا یہ فرق رکھا ہے۔

❷ جعرّانہ: یہ وادی حنین کی سمت میں مکہ مکرمہ سے شمال مشرق کی جانب تقریباً 16 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین سے واپسی پر مالِ غنیمت یہیں جمع فرمایا تھا اور پھر عمرے کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے۔ یہاں بھی ''مسجد جعرّانہ'' کے نام سے مسجد موجود ہے اور سڑک کے دونوں طرف آغاز حدود حرم کے نشانات لگے ہوئے ہیں۔

❸ حدیبیہ: یہ مکہ مکرمہ سے شمال مغرب کی جانب 24 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ''مسجدِ شمیسی'' کے نام سے نوتعمیر شدہ جامع مسجد قائم ہے جس کے قریب پرانی تاریخی مسجد کے آثار اب تک موجود ہیں۔ مسجد کے قریب سڑک کے کنارے جہاں حدودحرم کی علامات ہیں، قدیم کنواں آج تک موجود ہے۔ حدیبیہ دراصل اس کنویں کا نام تھا جس کے قریب گاؤں آباد تھا جو اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ اس گاؤں کا اکثر حصہ حرم میں ہے اور کچھ حرم سے باہر ہے۔

صلح حدیبیہ والے سال عمرہ کے لیے تشریف لاتے وقت جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسم کو خبر ملی کہ قریش مکہ نے مقابلہ کی ٹھان لی ہے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (جو اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) دو سو سواروں کے دستہ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے باہر نکل کر کہیں گھات لگائے ہوئے ہیں جبکہ مسلمانوں کا لشکر جنگ کے لیے اسلحہ ساتھ لانے کے بجائے احرام کی حالت میں بغیر جنگ کی تیاری کے آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاندار حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند افراد آگے معروف راستے پر بھیجے جس سے حضرت خالد بن ولید یہ سمجھے کہ مسلمان اسی راستے سے آئیں گے، وہ وہیں انتظار کرتے رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر راستہ بدل کر حدیبیہ پہنچ گیا جہاں سے حدودحرم کا آغاز ہوتا تھا۔ یہیں ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیعت رضوان یعنی ''فتح یا شہادت'' تک لڑنے کی بیعت ہوئی تھی۔ یہ درخت اب موجود نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرک و بدعت پھیلنے کے خطرے سے اسے کٹوا دیا تھا۔

ان تینوں جگہوں پر حدودِ حرم کی علامات نصب ہیں اور مساجد تعمیر کی گئی ہیں۔ بقیہ حدودِ حرم غیر مشہور ہیں اور اس طرف حجاج کا جانا بھی بہت کم ہوتا ہے۔

حل اور اہلِ حِلّ:

پہلے دائرے سے کچھ فاصلے پر دوسری قسم کی علامات ہیں۔ یہاں جو نشانیاں لگائی گئی ہیں انہیں ''میقات'' کہا جاتا ہے۔ یہ علامات پانچ ہیں اس لیے یہ حصہ ''مخمس'' (پانچ کونوں والا) ہے۔ ان میں سے چار علامتیں تو عراق، شام، نجد اور یمن کی جانب سے آنے والوں کے لیے ہیں اور پانچویں مدینہ منورہ سے آنے والے زائرین کے لیے ''ذوالحلیفہ'' نامی جگہ کے قریب ہے (جس کو اب ''ابیارعلی'' یا ''بئر علی'' کہتے ہیں یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کنواں، عوام میں مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

یہاں جنات سے کشتی لڑی تھی، جو بالکل غلط اور من گھڑت بات ہے) ان پانچوں مقامات کا محلِ وقوع اور مکہ مکرمہ سے ان کا فاصلہ دیے ہوئے نقشے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دنیا بھر سے کوئی بھی آدمی حرم شریف جانا چاہے تو اسے ان علامات میں کسی ایک سے گزرنا ہوگا، باہر والا کوئی بھی شخص یہاں سے آگے بغیر احرام کے نہیں جاسکتا۔ مثلاً: پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور مشرق بعید کے تمام ممالک کے رُخ پر "یلملم" نامی میقات پڑتی ہے...... اس دائرے کی حدود میں آنے والی جگہ کو ''حِل'' اور یہاں کے باشندوں کو ''اہلِ حِل'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ گویا ''حرم'' کے پڑوسی ہیں۔ یہ لوگ حج وعمرہ کے لیے جانا چاہیں تو پہلے دائرے کے آغاز سے پہلے پہلے کہیں سے بھی احرام باندھ کر جاسکتے ہیں۔

آفاق اور اہلِ آفاق:

تیسرے دائرے میں کرۂ ارض کا وہ پورا حصہ آتا ہے جو میقات سے باہر دنیا کے کناروں تک ہے۔ اس حصے کو ''آفاق'' اور یہاں کے رہنے والوں کو ''اہلِ آفاق'' یا ''آفاقی'' کہتے ہیں۔ یہ حضرات گویا اللہ تعالیٰ کے گھر کے مہمان ہوتے ہیں۔ یہ حضرات اگر بیت اللہ کے ارادے سے جائیں گے تو مذکورہ بالا پانچ میقاتوں سے پہلے پہلے ان کو حج وعمرہ میں سے کسی ایک کا احرام باندھ کر جانا ہوگا۔ برصغیر سے جانے والے حجاج کو جدہ سے پہلے یمن کی میقات ''یلملم'' سے گزرنا پڑتا ہے، اس لیے علمائے کرام تاکید کرتے ہیں کہ اس جگہ سے پہلے پہلے احرام باندھ لیا جائے۔ جہاز کا عملہ میقات آنے سے پہلے اس کا اعلان بھی کر دیتا ہے۔

آج کل حرم، حِل اور آفاق کا یہ فرق کتابی تحقیق ہو کر رہ گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کرۂ ارض کی یہ تقسیم اور مقامات مقدسہ کے ادب واحترام اور تحفظ کا یہ نظام مسلمانوں کا وہ طرّۂ امتیاز اور باعث اعزاز وافتخار ہے جس پر وہ بلاشبہ رشک کر سکتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ شکست خوردگی اور پست حوصلگی کے اس دور میں خودی اور خود اعتمادی بلند کرنے والی ان کتابی باتوں کو منظرِ عام پر لانا قطع نظر دیگر فوائد کے بجائے خود ایک ایسا کام ہے جسے مقصد کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

حدودِ حرم ومیقات

حدودِ حرم:

اس قسط میں اسلامی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں کا ذکر روک کر حج کی مناسبت سے حدودِ حرم اور میقات کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ بیت اللہ شریف، اللہ رب العالمین کا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت وتقدس کی حفاظت کے لیے کچھ احکامات دیے اور کچھ حدود مقرر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے آس پاس کچھ دور تک کی جگہ کو ''حرم'' قرار دے کر صرف اللہ کے دوستوں (مؤمنین) اور مہمانوں (حجاج کرام) کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس میں کوئی کافر یا مشرک داخل نہیں ہوسکتا۔ قرآن شریف میں مُسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کسی ناپاک شخص (کافر یا مشرک) کو ''مسجد حرام'' کے قریب نہ آنے دیں اور اگر اس ممانعت سے انہیں کسی معاشی نقصان پہنچنے یا اقتصادیات کے متاثر ہونے کا خطرہ ہو تو ہرگز اس کی پروا نہ کریں بلکہ اللہ کے حکم اور اس گھر کی عظمت کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے موقف پر جمے رہیں، اللہ تعالیٰ غیب سے ایسے اسباب پیدا کردے گا کہ انہیں کسی طرح کی تنگی لاحق نہ ہوگی۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد سے آج تک مُسلمان اس حکم الٰہی کی لاج رکھتے آئے ہیں اور زمین کا یہ ٹکڑا اللہ کے دُشمنوں کے وجودِ نامسعود سے آلودہ ہونے سے محفوظ ہے۔

میقات پانچ ہیں:

حدودِ حرم سے کچھ فاصلے پر ایک اور حد بندی ہے۔ یہ کچھ جگہیں ہیں جنہیں میقات کہا جاتا ہے۔ حجاج کرام اور عُمرہ و زیارت کا قصد رکھنے والوں کو یہاں سے گزرنے سے پہلے پہلے احرام باندھنے کا حکم ہے۔ گویا کہ حرم کی اصل حدود شروع ہونے سے کچھ پہلے ہی زائرین کرام کو حاضری کے آداب وشرائط پورا کرلینے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ جب مولائے کریم کے دربار کی خاص حدود شروع ہوں تو اس کی طرف توجہ ودھیان میں کوئی چیز مخل نہ ہو اور اس وقت اس کی محبت وشوق کے والہانہ جذبات کے علاوہ احساسات وخیالات کسی اور فکر سے مکدّر نہ ہوں۔ میقات نامی یہ جگہیں پانچ ہیں اور انہیں حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے پانچ مختلف سمتوں سے آنے والوں کے لیے متعین فرمایا تھا۔ جو شخص زمین پر ان سے یا سمندر وفضا میں ان کی محاذات (متوازی حدود) سے گزرے، اسے احرام کے بغیر آگے جانے کی اجازت نہیں۔ یہ میقات چونکہ پانچ ہیں اس لیے یہ دوسری حدود ''مخمس'' (پانچ کونوں والی) ہیں۔ دیے گئے دونوں نقشوں میں ان کو وضاحت سے دکھایا گیا ہے۔ حجاج کرام اور حدیث وفقہ کے طلبہ کی معلومات میں علی وجہ البصیرت اضافے کے لیے یہ نقشے عرق ریزی اور محنت سے تیار کیے گئے ہیں۔ نقشوں میں دیے گئے چوکھٹوں میں مزید معلومات درج ہیں۔

باشندگان زمین کی تین قسمیں:

ساکنان ارض تین قسم کے ہیں:

(1) پہلی قسم دنیا کے ان خوش قسمت ترین لوگوں کی ہے جو حدودِ حرم میں رہتے ہیں۔ انہیں "اہلِ حرم" کہتے ہیں۔ یہ حضرات حج کا احرام تو اپنے گھروں سے باندھتے ہیں لیکن عمرے کے احرام کے لیے انہیں حرم شریف سے باہر جانا ضروری ہے۔ حرم سے باہر آسان اور قریب ترین مقام "تنعیم" ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ اپنی ہمشیرہ کو تنعیم لے جائیں تاکہ ام المؤمنین وہاں سے احرام کی حالت میں آ کر عمرہ کرسکیں۔ اس مقام پر مسجد عائشہ تعمیر کردی گئی ہے اور زائرین کے لیے غسل واحرام کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ جو شخص باہر سے آ کر مکہ مکرمہ میں مستقل یا عارضی طور پر مقیم ہو اس کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ حج کا احرام تو اپنی جائے رہائش سے باندھے لیکن عمرے کے احرام کے لیے حرم سے باہر جا کر باندھ کر آئے۔ اہل مکہ اور ان حضرات کے لیے حج وعمرہ کے احرام میں فرق کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ حاجی یا عمرہ کرنے والا اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر کچھ نہ کچھ سفر کرے۔ اب حج کا رکنِ اعظم میدانِ عرفات میں وقوف کرنا ہے اور میدان عرفات چونکہ حدودِ حرم سے باہر ہے (دیکھیے دونوں نقشے) اس لیے یہ حضرات گھر سے احرام باندھ کر حرم سے باہر عرفات تک جائیں گے تو "لبیک" کہتے ہوئے کچھ نہ کچھ سفر کا موقع مل جائے گا اور عمرہ چونکہ مسجد حرام اور صفا ومروہ میں کیا جاتا ہے اس لیے عمرے کے لیے سفر اس وقت ہوگا جب حرم سے باہر جایا جائے۔

(2) دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو حرم سے باہر اور میقات کے اندر رہائش پذیر ہیں یہ بلند نصیب افراد "اہلِ حِل" کہلاتے ہیں۔ ("حِل" حرم شریف سے خارج جگہ کو کہتے ہیں) یہ لوگ حج وعمرہ دونوں کے لیے حدودِ حرم سے احرام باندھتے ہیں۔ جو حضرات باہر سے آ کر یہاں ٹھہر جائیں، ان کے لیے بھی یہی حکم ہے۔

(3) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو میقات سے باہر رہتے ہیں۔ اس میں زمین پر بسنے والے وہ تمام افراد آ جاتے ہیں جو میقات سے ورے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کے درمیان کرۂ ارض پر رہ رہے ہیں۔ انہیں "آفاقی" کہتے ہیں۔ ان حضرات کے لیے شریعت میں جو حکم ہے وہ پہلے گذر گیا کہ جب یہ بیت اللہ شریف کا قصد کریں تو میقات سے پہلے پہلے احرام باندھ لیں پھر رب ذوالجلال کے حضور حاضری دیں۔

حرم کی پاسبانی:

قارئین کرام! حرم کی پاسبانی اور اس کی عظمت وتقدس کے تحفظ کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فریضہ اور بھی عائد ہوتا ہے۔ یہ وہ اہم حکم ہے جس کی وصیت حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے آخری لمحات میں امت مسلمہ کو کی۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آخری وقت وہی بات کہی جاتی ہے جو اہم ترین ہو اور اس پر پیچھے رہ جانے والوں کی فلاح ونجات کا مدار ہو۔ اس حکم کی یہ نوعیت سمجھنے کے بعد اب سنیے کہ ہمارے اور آپ کے آقا، جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل تاکیدی نصیحت فرمائی کہ "یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔" گویا کہ آپ نے سرزمین عرب کو سرزمینِ اسلام قرار دیتے ہوئے حرم و میقات کی حدود کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے گرد اگرد ایک اور حد بندی قائم فرمائی اور اسے غیر مسلموں خصوصاً یہود ونصاریٰ سے خالی کرانے کا حکم دیا۔ جس طرح غیرتمند بیٹے اپنے والد کی آخری وصیت کو ہر قیمت پر پورا کرتے ہیں اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کے فرمان مبارک کی تعمیل میں یہود ونصاریٰ کو سمیٹ کر جزیرہ عرب کو ان سے خالی کردیا تھا۔ پھر ان

کے جانشینوں نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر سختی سے عمل کرتے ہوئے اس روایت کو برقرار رکھا اور کسی غیر مسلم کو یہاں اقامت کی اجازت نہ دی۔

دعویداران محبت کی نالائقی:

موجودہ دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تعمیل کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار تو کچھ زیادہ ہی کیا جا رہا ہے لیکن عملاً ایسی نالائقی اور نااہلی کا مظاہرہ ہو رہا ہے کہ خدا جانے ہم روزِ قیامت کس طرح شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ دکھائیں گے؟ ایک دلدوز حقیقت جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ حیلے اور چالبازیوں سے جزیرۂ عرب میں وارد ہو کر مستقل ٹھکانے قائم کر چکے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ سرزمین عرب میں ان کی مستقل رہائشی کالونیاں تعمیر ہو چکی ہیں بلکہ بڑے بڑے تجارتی مراکز اور وسیع وعریض صنعتی ادارے قائم ہیں۔ بعض خلیجی ممالک میں مسلم ممالک سے آنے والے افراد کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہود وہنود معزز قرار پاتے ہیں اور بعض تجارتوں پر تو ان کا اچھا خاصا بلکہ مکمل تسلط ہے۔ اور اسی پر بس نہیں، ہمت ہو تو سن لیجیے کہ سرزمین عرب میں کفار کو تمام تر جدید سہولتوں سے آراستہ فوجی مستقر بھی میسر ہو چکے ہیں جہاں ان کی مکمل عملداری ہے۔ ان میں ان کی افواج کثیر تعداد میں موجود ہیں اور جدید ترین اور بھاری اسلحے سے لیس ہو کر آزاد اور خود مختار حیثیت سے رہ رہی ہیں۔ کویت، دبئی اور شارجہ کا رونا نہیں، نہ ہی بحرین، قطر یا عمان کی بات ہو رہی ہے، عین سعودی عرب میں ان کی فوجی چھاؤنیاں دیکھی جاسکتی ہیں جو حرمین شریفین (حرسهما اللّٰہُ تعالٰی و زادهما شرفًا و کرامةً) سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ جزیرۂ عرب کے چاروں طرف پھیلے سمندر ان کے جنگی جہازوں کے حصار میں ہیں اور خلیج کے کسی حکمران یا صحافی کو مجال نہیں کہ اس سنگین صورتحال پر لب کشائی کر سکے۔ عرب ممالک میں دنیا پرست اور یہود نواز سربراہان مملکت کا تسلط ہے، علمائے کرام پر سخت پابندیاں عائد ہیں، اخبارات اور جرائد پر آئینِ زبان بندی لاگو ہے، لے دے کے چند ایسے لوگ ہیں جو اس ظلم سے دنیا کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن امریکا بکمال ہوشیاری دہشت گردی کے الزامات کی بوچھاڑ تلے ان کی آواز کو دبا دیتا ہے اور ان کے موقف پر پردہ ڈال کر دُنیا والوں کے ذہن کا رُخ دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔

عصر حاضر کا چیلنج:

اس وقت منظر نامہ یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کی نمائندہ عالمی طاقتوں (امریکا، برطانیہ، فرانس) کا خلیج کی دولت، وسائل اور حکمرانوں پر کلّی تسلط ہے، دانش وروں اور راہنمایان ملّت کی اس طرف توجہ ہی نہیں، جن مسلمان نوجوانوں میں امریکا سے نفرت پائی جاتی ہے ان کے پیش نظر بھی دوسرے اسباب ہیں، امریکا کے مذکورہ بالا کردار کا ان کو بھی علم نہیں۔ جو علماء اور مجاہدین امریکا کی اس عیّاری سے عالمِ اسلام کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں، امریکا ان کے خلاف ایسی فضا بنا دیتا ہے کہ انہیں اپنے ہی ملک میں جائے امان نہیں ملتی، حال ہی میں خبر آئی ہے کہ نئی امریکی حکومت ایشیا سے مشرق وسطیٰ تک مجاہدین کے کردار کو محدود کرنے اور جہاد کی تیزی سے پھیلتی ہوئی دعوت کا سدّباب کرنے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کر رہی ہے، شاید اسی کا شاخسانہ ہے کہ ہمارے ملک میں بھی مجاہدین کو مختلف حیلے بہانوں سے ہراساں کیا جا رہا ہے۔ عطیات، کھالیں وغیرہ وصول کرنے اور اسٹال لگانے پر

پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دین کی خاطر جان دینے والوں کی حوصلہ شکنی ہوگی، جہادی سرگرمیوں کے لیے اخراجات میسر نہ ہوں گے تو یہ آواز خود ہی دم توڑ جائے گی۔ ایسے حالات میں اُمت مسلمہ فریضۂ جہاد کو کس طرح زندہ رکھتی ہے؟ یہ عصرِ حاضر کا بہت بڑا چیلنج ہے جس کا کامیابی سے سامنا کرنے پر ہی مسلمانوں کی فلاح و بقا کا دار و مدار ہے۔

قلق اور تلافی

اسلامی عبادات کی مختلف حیثیتوں سے کئی تقسیمیں کی جاسکتی ہیں۔ پہلی تقسیم وقت کے لحاظ سے، دوسری محنت کے لحاظ سے اور تیسری اجتماعیت کے لحاظ سے۔

پہلی تقسیم:

وقت کے لحاظ سے اسلام نے تین طرح کی عبادات مسلمانوں پر فرض کی ہیں۔ پہلی قسم ان عبادات کی ہے جو روز کی جاتی ہیں جیسے نماز، دوسری وہ جو سال میں ایک مرتبہ فرض ہیں جیسے روزہ اور زکوٰۃ، اور تیسری وہ جو عمر میں ایک مرتبہ ہی فرض ہوتی ہے۔ حج کو اسی قسم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان ''یومیہ''، ''سالانہ'' اور ''عمریہ'' عبادات کے بعد ایک چوتھی قسم ہے جس کی تیاری تو عمر بھر جاری رہنی چاہیے لیکن فرض وہ مخصوص ہنگامی حالات میں ہوتی ہے۔ اس مقدس عبادت کا نام ''جہاد'' ہے۔ جی ہاں! وہی متبرک لیکن مظلوم عبادت جو پہلی چاروں عبادتوں کے تحفظ، اشاعت اور ترقی کا ذریعہ اور ہنگامی حالت میں مسلمانوں کی معاون وسرپرست اور اسلامی عبادات وعبادت گاہوں کی محافظ ہے لیکن اس کے معنی ومفہوم سے لے کر مصداق تک ہر چیز اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔۔

دوسری تقسیم:

دوسری تقسیم جسمانی اور مالی محنت کے اعتبار سے ہے۔ اللہ پاک نے اپنے بندوں پر خصوصی فضل وکرم فرماتے ہوئے انہیں اپنی بندگی کے کچھ ایسے انداز سکھائے ہیں جن میں اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے استعمال کرنا پڑتا ہے اور کچھ ادائیں وہ ہیں جن میں مالی قربانی دے کر اپنے مولیٰ کو خوش کیا جاتا ہے اور تیسری قسم وہ ہے جس میں بندہ اپنے خدا کو راضی کرنے کے لیے جسم بھی کھپاتا ہے اور مال بھی خرچ کرتا ہے۔

پہلی قسم کو جسمانی عبادات کہہ سکتے ہیں جیسے: نماز، روزہ۔ دوسری کو مالی عبادات کا نام دیا جاتا ہے جیسے زکوٰۃ اور عشر...... جی صاحب! اسی عشر کی بات ہورہی ہے جس کا دنیا بھر میں سب سے زیادہ بہترین اور منظم ترین نہری نظام رکھنے والے اسلامی ملک کے زرخیز ترین صوبے میں کوئی قابلِ ذکر تصور ہی نہیں۔ ہمارا ملک بنیادی طور پر ایک زرعی ملک کہلاتا ہے اور اس کی زمین دنیا کی چند بہترین زرعی پیداواریں دیتی ہے...... لیکن اس میں زکوٰۃ المال (تجارتی پیداوار کی زکوٰۃ) کا نظام تو جیسے تیسے چل رہا ہے، زکوٰۃ الارض (زمین کی زکوٰۃ یعنی عشر) کے خدائی حکم پر عمل کا کہیں اہتمام ہے نہ ذوق وشوق......۔

تیسری قسم کی عبادتیں جسمانی ومالی عبادات کا مجموعہ کہلاتی ہیں۔ اس قسم میں حج اور جہاد دونوں آتے ہیں۔ حج میں جسمانی مشقت بھی ہے اور مالی اخراجات بھی۔ اس طرح جہاد جان سے بھی ہوتا ہے اور مال سے بھی۔ جتنی مشقت زیادہ ہوگی اسی حساب سے اجر وثواب ملے گا اور جتنی قربانی زیادہ لگے گی اسی بنیاد پر مغفرت ونجات کا فیصلہ ہوگا۔

تیسری تقسیم:

اسلامی عبادات کے حسن اور افادیت کا ایک رُخ اجتماعیت کے حوالے سے ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ چند گھروں یا گلیوں کے نمازی محلے کی مسجد میں، ہفتے میں ایک مرتبہ چند محلوں کے نمازی جامع مسجد میں، سال میں ایک مرتبہ شہر بھر کے مسلمان عیدگاہ میں اور عمر میں ایک مرتبہ دنیا بھر کے عازمینِ حج، بیت اللہ میں جمع ہوتے ہیں۔ یہ حکیمانہ ترتیب، حسنِ انتظام کے علاوہ جس طرح کی شان وشوکت اور سماجی وسیاسی مصلحتوں نیز معاشی ومعاشرتی فوائد پر مشتمل ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آج کل ہر محلے والے جامع مسجدیں بناتے ہیں۔ اب غیر جامع مسجد کا تصور قصبوں، بستیوں میں بھی خال خال ہی ہے اور عیدگاہ کی نماز بڑے میدانوں میں پڑھنے کا رواج بھی کم ہوگیا ہے۔ البتہ شمالی افریقہ کے ملکوں مثلاً: تیونس، الجزائر اور مراکش میں پنج وقتہ نماز، جمعہ کی نماز اور عید کے اجتماع کا یہ فرق آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

پہلے اور اب:

حج میں جسمانی محنت خوب ہوتی ہے اور جسم کو اللہ کے لیے تھکانے کا لطف بھی اچھی طرح لیا جاسکتا ہے لیکن کرنا چونکہ عمر بھر میں ایک مرتبہ ہوتا ہے اس لیے بغیر سیکھے کرنے کی وجہ سے اور اسلامی آداب واخلاق سے آراستہ نہ ہونے کی وجہ سے عازمینِ حج کو مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔

دوسری طرف ہمارے ہاں آمدنی میں پاکیزگی کا تصور بھی خاصا دھندلا گیا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ حج کے لیے الگ سے پائی پیسہ جوڑ کر رکھتے تھے جس میں حرام یا حرام کا شبہ بھی نہ ہو۔ آج کل جس طرح کی کمائی سے حج کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ منیٰ کے تین ستونوں کے گرد جمع کنکریوں کے ڈھیر کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"من قبلت حجته رفعت جمرته." (جس کا حج قبول ہوجاتا ہے اس کی کنکری اُٹھالی جاتی ہے۔)

غیر شرعی آمدنی سے ماری گئی کنکری تو شیطان کو رسوا کرنے کے بجائے اسے خوش کرتی ہے اور اس وقت تک وہیں پڑی رہتی ہے جب تک میونسپلٹی والے اسے ٹرکوں میں بھر کر لے نہیں جاتے۔ اللہ تعالیٰ حرام مال سے نفرت اور اس سے بچنے کی فکر نصیب فرمائے۔ آمین۔

حج تربیت پروگرام:

نقشوں اور تصویروں کی مدد سے حج تربیت کے پروگرام اس سال جب کراچی اور اسلام آباد میں کروائے گئے تو بہت سے حضرات نے (جن میں حجاج کرام کے علاوہ عام شائقین بھی شامل تھے) انہیں پسند کیا اور مزید کے لیے وقت مانگا۔ لاہور، کوئٹہ، پشاور اور ملتان کے درس طے کیے جانے کے باوجود مصروفیات کی کثرت کی وجہ سے منسوخ کرنے پڑے جس کا قلق رہے گا...... لیکن اس کی تلافی اس طرح ہوسکتی ہے کہ اگر ان شہروں کے محترم حجاج کرام ادارہ کی طرف سے شائع کردہ جناب مفتی محمد صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "حج سنت کے مطابق کیجیے" سے استفادہ کرلیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے لیے کافی ہوگا۔ اس میں تقریباً سب ہی اہم تصویریں اور نقشے دے دیے گئے ہیں۔

اگلے سال کے لیے یہ ترتیب سوچی گئی ہے کہ حج کے دن آنے سے پہلے مدرسین کی تربیت کی جائے اور پورے پاکستان

کے جن شہروں سے حج پروازیں جاتی ہیں ان سب میں بڑی مساجد یا عوامی اجتماع گاہ میں یہ پروگرام منعقد کیے جائیں۔ ان میں مقدس مقامات کی نایاب تصاویر کے علاوہ تاریخ اسلام سے تعلق رکھنے والے مشہور مقامات کی زیارت بھی فل سائز اسکرین پر کروائی جاتی ہے۔ چونکہ ایسی مجالس میں سیرت و تاریخ کی اہم و دلچسپ معلومات حاضرین کو دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں، اس لیے عام شائقین بھی اس میں ذوق وشوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ یہ نیک ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

مناسک حج کی تفہیم کے لیے دو ایسے جامع نقشے تیار کیے گئے ہیں جن میں حج کے پانچ دنوں میں چار مختلف جگہوں پر کیے جانے والے نو اعمال کو سمویا گیا ہے۔ اس طرح کے تقریباً دس مزید نقشے اور چالیس تصویریں، رفیق محترم جناب حضرت مفتی محمد صاحب حفظہم اللہ کی مسائلِ حج پر لکھی گئی کتاب کا حصہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اس طرح کی مزید مفید خدمات کو ادارے کے لیے آسان فرمائے۔ آمین۔

ٹرننگ پوائنٹ

ایک مسلمان کی زندگی میں دو ایسے موڑ آتے ہیں جو اس کی زندگی میں انقلاب برپا کرسکتے ہیں لیکن ان سے کماحقہ فائدہ نہ اُٹھانے کی وجہ سے انسان ویسے کا ویسا رہ جاتا ہے جیسا کہ ان سے گزرنے سے پہلے تھا اور بلاشبہ یہ بڑی بدنصیبی ہے۔

پہلا موقع نکاح کا ہے اور یہ ایسا مبارک موقع ہے کہ اگر اس کو مسنون طریقے سے ادا کیا جائے تو فی الواقع انسان کی زندگی کا رُخ تبدیل کرنے اور اسے درست سمت دینے میں اکسیری تاثیر رکھتا ہے۔ انسان کی فطری خواہشات کو جب حلال ذریعے سے تسکین مل جاتی ہے تو حرام سے بے رغبتی اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سکون سے بقیہ زندگی ایک سلجھے ہوئے، شریف اور معقول انسان کی طرح گزارتا ہے۔

مسنون نکاح ایک نہایت آسان اور سستا عمل تھا لیکن رسوم کی بھرمار نے (جن میں سے اکثر ہندوانہ اور جاہلانہ ہیں) اسے اتنا مشکل اور مہنگا بنا دیا ہے کہ آج کے دور کا انسان پریشانیوں کی وادی میں بھٹک کر گناہ در گناہ کی شیطانی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر آپ کسی بھی ایسے انسان سے جو مالی بدعنوانی میں مبتلا ہو، کھوج لگانے کے لیے سوال کریں کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ کیوں جہنم کے انگارے سمیٹ کر دامن بھر رہا ہے؟ تو کرپشن کی اس رسی کے دوسرے سرے پر آپ کو شادی کے اخراجات کھڑے شیطان کی طرح دانت نکال کر مکروہ انداز میں مسکراتے نظر آئیں گے۔

ہر وہ آدمی جو کرپشن کو ناگزیر قرار دے، وہ اپنی یا بچوں کی شادی کے اخراجات (جہیز، بری، بارات، شاندار گھر) کا مسئلہ بیان کرے گا، گھر میں بیٹھی جوان بیٹیوں کی رخصتی کے بوجھ کا رونا روئے گا۔ گویا کہ معاشرے میں دو خطرناک ناسوروں...... جنسی اور مالی کرپشن...... کے پیچھے ایک ہی چیز کارفرما ہے یعنی مسنون طریقہ کے بجائے رسوم والی شادی۔ مسنون نکاح میں دو ہی تقریبات ہیں: نکاح کی تقریب جو جامع مسجد میں ہونی چاہیے اور ولیمہ کی تقریب جو سادہ اور تکلف کے بغیر ہو۔ اب آپ بتائیے کہ اس میں مشکل کیا رہی؟ لیکن بُرا ہو ان رسوم کا جنہوں نے ہماری دنیا و آخرت پریشانیوں اور مصائب کی نذر کر رکھی ہے اور ہم سے یوں چمٹ گئی ہیں کہ چھڑائے نہیں چھوٹ رہیں۔

دوسرا موقع حج کا ہے۔ یہ ایسی بابرکت عبادت ہے کہ اگر قبول ہو جائے (اگر قبولیت کی شرائط یعنی حلال مال اور آداب کی رعایت کے ساتھ کی جائے تو ضرور قبول ہوتی ہے) تو انسان کی زندگی بدل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ نوزائیدہ بچے کی طرح گناہوں سے پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے بلکہ آئندہ بھی اسے نیک اور اچھے انسان کی طرح زندگی گزارنے کی توفیق مل جاتی ہے۔ بڑوں بزرگوں میں مشہور تھا کہ جس کی حاضری قبول ہو جائے، اسے حضوری نصیب ہو جاتی ہے اور گناہوں سے شرم آنے لگتی ہے اور جس کی صدائے لبیک میں کھوٹ ہو، اس کی شیطان کو ماری ہوئی کنکریاں اسی کی طرف لوٹ آتی ہیں کہ بڑا شیطان تو اس کے نفس میں چھپا بیٹھا ہے۔

ہدایہ کے مشہور شارح علامہ کمال الدین ابن الھمام رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد مجاہد نے جب یہ بات سنی کہ مقبول حج والے حاجی کی کنکریاں امرِ الٰہی سے فرشتے اُٹھالے جاتے ہیں تو انہوں نے اپنی کنکریوں پر نشان لگایا اور شیطان والے ستون کے چاروں طرف مختلف جگہوں پر کھڑے ہوکر سات کنکریاں ماریں۔ ان کا فرمانا تھا میں نے بعد میں بہت تلاش کیں، اس نشان کی ایک کنکری بھی نہیں ملی۔'' (فتح القدیر مع الھدایہ: 2/384)

شادی اور حج کے فوائد سے صحیح معنوں میں استفادہ کرنے کی اہم اور بڑی وجہ غیر ضروری تاخیر ہے۔ ان دونوں کاموں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں جوانی میں کرنے کے کام ہیں، جب کہ ہمارے ہاں رواج یہ چل پڑا ہے کہ دونوں کو ادھیڑ عمری کا قضیہ سمجھا جاتا ہے۔ شادی میں ...... خصوصاً بچیوں کی شادی میں ...... مناسب رشتہ مل جانے کے بعد تاخیر انتہائی نامناسب، مہلک اور نقصان دہ ہے لیکن ہمارے ہاں اس دِین جلدی باعث تعجب و حیرت سمجھی جاتی ہے۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن بندہ کی مادرِ علمی ہے۔ وہاں ہر جمعہ کے دن عصر کے بعد اوسطاً سات آٹھ نکاح پڑھائے جاتے ہیں۔ طالبعلمی کے دوران سالہا سال تک ہر ہفتے ''دولہا'' نامی مخلوق کی زیارت ہوتی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ کل بھی اور آج بھی کسی نوجوان دولہا کو دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔ حاضرین کے مجمع میں آپ کو جو سب سے زیادہ پژمردہ، تھکا ماندہ، بوجھل قدموں والا شخص نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ یہ وہی مظلوم ہے جس کو اس کے عزیز و اقارب کھینچ کھانچ کر دولہا بنا کر لائے ہیں۔

اسی طرح حج کا لطف جوانی میں لوٹنے کی چیز ہے، بڑھاپے میں تو حسرت ہی رہ جاتی ہے کہ وہ نشاط و چستی اور ذوق وشوق کہاں سے لائیں جو تجلّیاتِ محبوب سے دامنِ دل بھر سکے۔ طرح طرح کے من گھڑت اعذار ہیں، جنہوں نے ہمارے پاؤں میں وہ زنجیر ڈال رکھی ہے جو مقدس گھر کی زیارت سے ہمیں روکے ہوئے ہے۔ کسی کو گناہوں کے چھوٹ جانے کا خوف ہے تو کسی کو بچیوں کی شادی یا چھوٹے بچوں کے مسئلوں نے اس فرض کی ادائیگی سے روک رکھا ہے۔ کسی کے والدین نے حج نہیں کیا وہ پہلے ان کو حج کروانا چاہتا ہے اور کوئی بیوی کے بغیر حج پر نہیں جانا چاہتا۔ کسی نے اب تک نماز، روزہ اور دیگر فرائض کی ادائیگی شروع نہیں کی یا گھر میں ایسا ماحول نہیں کہ حج پر جانے کی حوصلہ افزائی کی جائے اس لیے اس کی ہمت پست ہوگئی ہے ...... وغیرہ وغیرہ ...... قسما قسم کی رکاوٹیں نفس اور شیطان نے کھڑی کر رکھی ہیں اور لاعلمی کے سبب ہم اس جال سے نکل نہیں پاتے۔

ملائیشیا کے مسلمانوں نے یہ قابلِ تحسین مثال قائم کی ہے کہ حج اور شادی کو انسانی زندگی کے اس دور میں ادا کرنے کو رواج دیا ہے جوان دو اہم مرحلوں کا اصل وقت ہے۔ وہاں حج سے پہلے شادی کی جاتی ہے نیز حج کے احکام و آداب سیکھنے سکھانے اور شادی کو کم خرچ اور کم سے کم بوجھل بنانے کا رُجحان ہے۔

ہم میں سے باہمت لوگوں کو اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ کرسمس ڈے اور نیو ایر نائٹ جیسی چیزیں ہم نے مغرب سے سیکھ کر کافی ''ترقی'' کرلی ہے، اب باہم ایک دوسرے کی اچھی روایات لینے کی جسارت بھی کرلینی چاہیے۔ نفع و نقصان کا معاملہ اس ذات پر چھوڑ دینا چاہیے جو اپنے کمزور بندوں کی لاج رکھتا ہے اور انہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔

گھنٹیاں

☆ مفتی صاحب! آپ نے جن دو باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی ان سے بڑا فائدہ ہوا۔

O کون سی باتیں اور کیسا فائدہ؟

☆ آپ نے فون پر انتظار کے دوران موسیقی لگانے اور خاتون کو آپریٹر مقرر کرنے پر جو تنبیہ کی تھی اس کی بات کر رہا ہوں۔

O ہاں! مجھے آپ کے ادارے میں ان چیزوں کی موجودگی بہت کھلی تھی، جہاں جہاں انسان کا بس چلتا ہے وہاں وہاں اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی چیزیں نہ ہونے دینی چاہییں۔

☆ آپ نے جس انداز سے اس بارے میں توجہ دلائی تھی میں نے اسی وقت عزم کر لیا تھا کہ ان چیزوں کو ختم کرنا ہے لیکن ان سے ہمیں دنیاوی اعتبار سے بھی بہت فائدہ ہوا۔

O اچھا!

☆ جی ہاں! جب ہم نے خاتون آپریٹر کی جگہ مرد بٹھایا تو ہمارے ادارے کا بہت سا وہ وقت جو ملازمین کے بلاوجہ وہاں منڈلانے، چکر لگانے اور وقتاً فوقتاً انٹرکام کا بٹن دبانے پر ضائع ہوتا تھا، بچ گیا۔ تب سے ہم ایک عجیب سی راحت اور آسانی محسوس کر رہے ہیں۔

O اور موسیقی؟

☆ پہلے ہمیں بتایا گیا کہ اس آلے کے اندر کمپنی نے موسیقی اس طرح ڈالی ہے کہ اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا...... مگر ہمیں اس لمحے سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ جب دوبارہ آپ سے بات ہوگی...... اس لیے ہم کوشش میں لگے رہے، بالآخر اپنے ایک ساتھی کے تعاون سے اس کی جگہ تقریر اور نظمیں لگا دیں۔

O ہاں! یہ اچھا کیا۔ تلاوت لگائی جائے تو آیتِ کریمہ بیچ میں منقطع ہو جانے سے بے ادبی سی ہو جاتی ہے۔

قارئین کرام! یہ مکالمہ دو وجہ سے نقل کیا گیا۔ دوسری تو آپ کو مضمون کے آخر میں پہنچ کر سمجھ میں آئے گی پہلی ابھی سن لیجیے۔ اس مکالمے میں "بلاوجہ منڈلانے اور چکر لگانے" کا جو لفظ ہے، طواف کی حکمت و فلسفہ اس سے سمجھ میں آتا ہے۔ جب انسان کو محبتِ الٰہیہ کا ذوق اور عظمتِ الٰہیہ کا استحضار نصیب ہو جائے تو وہ طواف کا صحیح مزہ لے سکتا ہے۔ عاشقوں کے گروہ میں چند چیزیں معروف ہیں۔ محبوب...... فرضی ہو یا حقیقی...... کے گھر کے بلاوجہ چکر کاٹنا، اس کی گلی کے پھیرے لگانا، اس کے خیال میں مگن مست بیٹھے رہنا اور تصور تصور میں اس کا دھیان جما کر مزے لیتے رہنا، اس کو اپنی سچی وفاداری اور اس کی محبت میں مر مٹنے کا یقین دلانے کے لیے طرح طرح کے جتن کرنا وغیرہ وغیرہ...... حج میں عشقِ حقیقی کا لطف لینے والوں کی یہ ادائیں اپنے جوبن پر نظر آتی ہیں۔ کبھی بیت اللہ کے گرد پھیرے لگ رہے ہیں، کبھی صفا مروہ کے درمیان دیوانہ وار چکر پورے کیے جا رہے ہیں، کبھی

عرفات ومزدلفہ کے وقوف میں راز ونیاز ہورہے ہیں، کبھی دو کپڑوں میں کھلے چہرے اور ننگے سر لبیک لبیک کی پے در پے مکرر صدائیں لگارہے ہیں۔ غرضیکہ ہر وہ ادا جو عشق کا گھاؤ کھائے ہوئے محبت کے مارے، اپنے محبوب کو متوجہ یا راضی کرنے کے لیے کرتے ہیں...... حج میں ان سب کا نمونہ اور نقل موجود ہے۔

ان میں سے ہر ادا ایسی ہے جو انسانی تاریخ کی مقدس ترین ہستیوں سے منسوب ہے اور رب تعالیٰ کو ایسی پسند آئی ہے کہ قیامت تک کے لیے حکم ہے کہ جو ہمارے ابر کرم کے سائے میں آنا چاہتا ہے وہ یہاں آکر وہی کچھ کرے جو سچے عشق سے حصہ پانے والوں نے کیا۔ چونکہ یہ شیوۂ عاشقی نہیں کہ محبوب سے نسبت رکھنے والوں کی لاج نہ رکھی جائے اس لیے یقینِ کامل رکھنا چاہیے کہ زائرِ حرم کی نیت سچی ہے تو اس کی منزل کھوٹی نہیں ہوسکتی اور چونکہ یہ بادشاہوں کی شان سے کم تر ہے کہ کسی کو در پر بلا کر بھی محروم رکھیں اس لیے اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ جو صاف ستھرا آئینۂ قلب لے کر حج کے لیے جائے گا بامراد ہو کر آئے گا۔

''جب تم کسی حاجی سے ملو تو اس کے گھر پہنچنے سے پہلے اس سے سلام کرو، مصافحہ کرو اور اس سے اپنے لیے دُعائے مغفرت کی درخواست کرو اس لیے کہ وہ بخشا بخشایا ہے۔'' (معارف الحدیث 2/142 بحوالہ مسند احمد)

طواف کا طریقہ سمجھانے کے لیے ایک نقشہ پیشِ خدمت ہے۔ طواف کے دوران لایعنی باتیں کرنا، حال احوال پوچھنا، آداب کا خیال نہ رکھنا، یا کسی کو تکلیف دینا ایسی چیزیں ہیں جن سے بات خراب اور راستہ کھوٹا ہوتا ہے۔ خصوصاً اس مبارک جگہ میں موبائل کی گھنٹیاں کھلی رکھنا اور پھر محبوبِ حقیقی سے راز ونیاز اور مناجات وزاری کے وقت کسی اور کی طرف متوجہ ہونا سخت بے ادبی اور محرومی والی بات ہے۔ یہ گھنٹیاں اس دور کا فتنہ ہیں۔ طاغوت کے پیروکاروں نے موسیقی پر مشتمل یہ شیطانی آوازیں دنیا بھر میں پھیلانے اور خواہی نخواہی ہر بندہ بشر کے کان میں ان کو ڈالتے رہنے کے لیے کمر باندھ رکھی ہے، لہٰذا ہمیں سخت احتیاط لازم ہے۔ انٹر کام میں انتظار کے دوران موسیقی کی تانیں لگا کر دوسروں کو بلاوجہ گنہگار کرنے کا وبال سر نہ لینا چاہیے اسی طرح موبائل میں سادہ گھنٹی رکھنی چاہیے جیسی کہ عام فون میں ہوتی ہے۔ نیز مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتا اُتارنے اور دُعا پڑھنے سے پہلے فتنے کی اس ڈبیا کو بند کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ خانۂ خدا ان شیطانی آوازوں سے آلودہ اور لوگوں کی نماز خراب نہ ہو۔

فون کرنے والوں کو بھی یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں یہ نماز کا وقت تو نہیں، اگر جواب نہ آرہا ہو اور نماز کا وقت ہو تو بلا تامل گھنٹیاں دے مارتے رہنا اچھی بات نہیں۔ حجاج کرام کو ان چیزوں میں اور زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کہ وہ بادشاہوں کے بادشاہ کے مرکزی دربار میں حاضری دینے جارہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے ہماری حفاظت فرمائے جو نمازِ مقبول اور حجِ مبرور کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ آمین۔

بابا جی کا حج

''بابا جی کیا بات ہے؟ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟''

یہ تقریباً چند سال قبل کی بات ہے، بندہ ویش باڈر پر طالبان کے سرحدی دفتر کے باہر کھڑا تھا کہ ایک عمر رسیدہ افغان بابا اور آفس کے عملے کے دوران دلچسپ بات چیت سن کر بیچ میں مداخلت کرنی پڑی۔ بابا جی کے ہاتھ میں قدیم زمانے کا بوسیدہ سا پاسپورٹ تھا، اس کے صفحوں کا رنگ اڑا ہوا اور کنارے مُڑے ہوئے تھے۔ خدا جانے وہ کب سے بابا جی کی زنبیل میں دھرا ہوا تھا اور وہ اسے دکھا کر عملہ والوں سے اصرار کر رہے تھے کہ انہیں حج پر جانا ہے وہ ان کی روانگی سے متعلقہ کارروائی پوری کریں۔ بابا جی کے مطابق وہ قانونی دستاویز کی اس رونمائی کا تکلف بھی عملہ کی دل جوئی کی خاطر کر رہے تھے ورنہ انہیں حج پر بہرحال جانا تھا اور وہ اس بارے میں کسی قاعدے قانون کی خاص پرواہ کے قائل نہ تھے اور بات صرف قانون تک محدود نہ تھی آگے چل کر معلوم ہوا کہ انہیں وسائل سفر کی فراہمی کی بھی مطلق پرواہ نہ تھی۔ وہ خانۂ خدا کی زیارت کو ان تکلفات کے اہتمام سے مکدر نہ ہونے دینا چاہتے تھے بلکہ کوئی اگر کا غذاتِ سفر کی طرف توجہ دلاتا یا وسائل کی عدم موجودگی پر ان سے ہمدردی کا اظہار کرتا تو وہ اس کی طرف ایسی حیرت اور افسوس سے دیکھتے تھے گویا اس نے کلمۂ کفر کہہ دیا ہو۔ اللہ کے مقدس گھر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے آدمی جانا چاہے اور اس کا دل ان رکاوٹوں میں الجھا ہو، اس کو وہ محبتِ الٰہی اور توحید خالص کے خلاف سمجھتے تھے۔ خیر! یہ قصہ آگے چل کر، ابھی تو میں آپ سے ان کا حلیہ بیان کرتا ہوں۔

بابا جی سفید ریش، نورانی صورت بزرگ تھے۔ جھریوں سے بھری ہوئی چوڑی پیشانی، گول گول آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت داڑھی، متناسب اعضا اور اچھی صحت، کمر خمیدہ تو نہ تھی لیکن خمیدگی کی طرف کچھ مائل نظر آتی تھی۔ بڑے سر پر عمامہ خوب سج رہا تھا۔ لباس مخصوص افغانی طرز کا تھا جس کے اوپر گرم لمبا چغہ ان کے متناسب قد و قامت پر بہار دے رہا تھا۔ ان کی کل کائنات وہ زنبیل نما گٹھڑی تھی جو انہوں نے بغل میں لٹکا رکھی تھی۔ اس بوسیدہ گٹھڑی کو میں زنبیل اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ وہ حسبِ موقع ہاتھ ڈال کر اس میں سے ضرورت کی ہر چیز برآمد کر لیتے تھے جبکہ باہر سے دیکھنے میں وہ اتنی ''وسیع الظرف'' نہ لگتی تھی کہ اس سے نمودار ہونے والی برآمدات اس میں سما سکیں۔ بابا جی جب دائیں ہاتھ میں عصا تھامے، بائیں بغل میں گٹھڑی لٹکائے، سر کو ذرا سا جھکائے چھوٹے چھوٹے نپے تلے قدم اٹھائے چلتے تھے تو ان کا ردھم دیکھنے والا ہوتا تھا۔ بہرحال بندہ کو ان کی دلچسپ شخصیت سے زیادہ ان کی عجیب و غریب گفتگو نے متوجہ کیا تھا اور یہ جاننے کے باوجود کہ میں ان کی مقصد براری میں کسی قسم کے تعاون سے قاصر تھا، ان کی گفتگو میں مداخلت کر بیٹھا تھا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو اور ملی جلی فارسی میں ان سے گپ شپ کا آغاز ہو چکا تھا۔

''میں حج پر جانا چاہتا ہوں اور یہ لوگ کبھی نیا پاسپورٹ بنوانے کا کہتے ہیں، کبھی اخراجات کا پوچھتے ہیں۔ ان کو سمجھاؤ کہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی ان تمام چیزوں کے بغیر حج کر چکا ہوں۔ اب بھی ان کو دکھانے کے لیے کسی زمانے کا بنا ہوا یہ پاسپورٹ

اٹھالایا اور نہ اس سے مجھے کوئی خاص مطلب نہیں۔''

باباجی کا استغنا، دنیا و مافیہا سے بے نیازی اور خود اعتمادی دیکھنے کے قابل تھی اور ہم پر ان کی دلچسپ اور تہہ در تہہ شخصیت کے پرت دھیرے دھیرے کھل رہے تھے۔

''آپ ان چیزوں کے بغیر حج پر کیسے چلے گئے تھے؟''

''یہاں سے اسی طرح کے کپڑے پہن کر گیا تھا۔ جب عربستان پہنچا تو ان کے اوپر عربی جبہ پہن لیا پھر میقات سے احرام باندھ لیا۔''

باباجی کا جواب دلچسپ اور خاموش کُن تھا۔ ہمیں بھی ان مجذوبانہ باتوں میں مزا آ رہا تھا۔

''اب کی مرتبہ کیا پہن کر جائیں گے؟''

''وہی جو پہلی مرتبہ اللہ پاک نے نصیب کیا تھا۔'' یہ کہہ کر باباجی نے ''زنبیل'' میں ہاتھ ڈالا اور ایک پرانا عربی جبہ نکال کر دکھایا۔ زنبیل کا منہ کھلتے دیکھ کر ہم نے اندر جھانکا تو اندر کئی مختلف چھوٹی بڑی پرانی چیزیں دکھائی دیں جو سفرِ حج میں کام آتی ہیں۔ گویا باباجی کی تیاریاں مکمل تھیں۔ بس وہ رسمی طور پر پاسپورٹ آفس کا چکر لگانے اور رسمی سلام دعا کا تکلف کر رہے تھے۔

اب ہمیں ایسی باتیں کرتے کافی وقت گزر گیا تھا جن کا دفتری کارروائی سے کوئی تعلق نہ تھا لہٰذا دفتری امور پر مامور طالب کی اکتاہٹ فطری امر تھی۔ اس نے باباجی کو ایک پھر مرتبہ نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ پاسپورٹ پرانا ہو چکا ہے۔ آپ کوئٹہ قونصلیٹ میں جا کر نیا پاسپورٹ بنوالیں تاکہ آگے کی کارروائی آسان ہو۔

''کوئٹہ قونصلیٹ کہاں ہے؟''

''آئیے! ہمارے ساتھ چلیے، ہم آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔''

ہم نے چونکہ کوئٹہ کے لیے گاڑی بک کروائی ہوئی تھی اس لیے باباجی کو ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ غرض یہ تھی کہ بزرگوں کی خدمت بھی ہو جائے گی، ان کی صحبت سے سفر خوشگوار رہے گا اور ممکن ہے معرفت کی کچھ باتیں سننے کو ملیں۔ باباجی نے تھوڑی دیر ہمارے چہرے کی طرف دیکھا پھر ہمارا کندھا تھپتھپا کر بولے: ''چلو! ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔''

اس سفر کی روداد بڑی دلچسپ ہے اور اس مختصر سفر کو ہم زندگی کے یادگار اسفار میں شمار کرتے ہیں۔ باباجی نہ صرف یہ کہ بولتے ہوئے موتی بکھیرتے تھے بلکہ نہایت بلند حوصلہ اور متوکل و قانع شخصیت کے مالک تھے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ وہ کئی روز قبل گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور اب شوال کے آغاز میں افغان سرحد پار کر رہے تھے تاکہ ذوالحجہ تک عربستان پہنچ جائیں جہاں ان کی امیدوں اور ارمانوں کا مرکز ہے۔ ہم نے ان کے درویشانہ حلیے اور فقیرانہ سامان کو دیکھ کر سوچا کہ نہ جانے اس سخت سردی میں راتوں کو باباجی کہاں ٹھہرتے ہوں گے اور کیا کھاتے پیتے ہوں گے؟ ہم سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھے:

''باباجی! آپ گزشتہ رات کہاں ٹھہرے تھے؟''

''مسجد میں۔''

''اتنی سردی میں نیند آ گئی تھی؟''

اس کے جواب میں بابا جی نے جس جلالی انداز میں گھور کر دیکھا وہ ہمیں آج تک یاد ہے۔

''رات سونے کے لیے ہوتی ہے؟''

''تو کیا آپ رات بھر نہیں سوئے؟''

''رات تو ملاقات کے لیے ہوتی ہے، ملاقات کا وقت شروع ہونے سے پہلے مصلّے پر بیٹھ کر اونگھ آ گئی تو اونگھ لیے۔ دماغ اور جسم کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ جب محبوب ہماری خاطر پہلے آسمان پر آ جاتا ہے پھر تو کوئی کم بخت ہی سوئے گا۔''

''اچھا یہ بتایئے! آپ کوئٹہ سے آگے کیسے جائیں گے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اخراجات، ذرائع، وسائل کیسے پورے ہوں گے؟''

اب کی مرتبہ بابا جی کی جدت، استعجاب اور جلال میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

''تم صورت سے تو صاحبِ ایمان لگتے ہو مگر باتیں ساری بے ایمانی والی ہیں۔ کیا حج کے لیے جاتے ہوئے بھی مؤمن کامل کو ان چیزوں کی ضرورت ہے؟ اس کائنات میں کون سی چیز ہے جس کے بغیر اللہ ربّ العزت کسی مشتاقِ دید کو اپنے در پر آنے نہ دیں یا کائنات کی کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ بن سکے۔''

بابا جی کا لہجہ بہت جما ہوا اور آواز بارعب اور کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ ان کی آنکھیں یوں تو خاموش تھیں مگر گفتگو کے دوران کبھی ان میں ایسی چمک ابھرتی تھی کہ آدمی کو ان کی نظریں اپنے اندر اترتی محسوس ہوتیں۔ راستے میں ہمیں خشک میوے کی دکان نظر آئی۔ ضرورت تو نہ تھی لیکن اس خیال سے کہ کچھ بابا کو پیش کر دیں گے اور باقی ان کی زنبیل میں ڈال دیں گے تا کہ سفر میں کام آتا رہے، ہم نے گاڑی رکوائی اور ہم سفروں کی ضرورت سے کافی زیادہ مختلف قسم کے خشک میوہ جات خرید لیے۔ جب بابا جی کو میوہ پیش کیا گیا تو انہوں نے زنبیل سے ایک سنگترہ نکالا اور بندہ کو دیا۔ اس وقت بابا جی کی آنکھوں میں ایسا حکم پوشیدہ تھا کہ ہم سے انکار نہ ہو سکا۔ بابا جی کہنے لگے: ''ہم رات کو کھانے پینے کی چیزیں بچا کر صبح کے لیے نہیں رکھتے لیکن یہ سنگترہ شاید تمہاری قسمت میں تھا۔ سو چومت، کھاؤ۔''

سفر کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ گاڑی میں خموشی چھا جاتی ہے۔ سب دھیرے دھیرے اونگھنے لگتے ہیں۔ اس دوران بات بھی ناگوار گزرتی ہے۔ ''خلوت در انجمن'' کا منظر ہوتا ہے۔ بابا جی پر بھی غنودگی طاری تھی۔ میں نے چپکے سے ان کی زنبیل کھولی اور سارے میوہ جات اندر رکھ دیے۔ اپنی طرف سے ہم نے بہت احتیاط کی تھی لیکن بابا نے چپکے سے آنکھیں کھولیں، ہماری حرکت دیکھ کر ہنکارا ابھرا، گویا کہہ رہے ہوں چل بچہ! تو بھی اپنی جی کی پوری کر لے۔ پھر دوبارہ آنکھیں موندلیں۔ بابا جی کی ایک بات یہ تھی کہ جلال و جمال کا حسین امتزاج تھے، مجھے ساتھیوں نے بتایا کہ جب آپ گاڑی سے اتر کر باہر گئے ہوئے تھے ہم نے بہت سوچا کہ بابا سے گپ شپ لگائیں مگر نہ ہمیں ہمت ہوئی نہ انہوں نے کچھ بولا۔

کوئٹہ پہنچ کر بندہ نے قندھاری بازار میں ایک جگہ کچھ امانت سپرد کرنی تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا کہا اور ساتھیوں کو اونگھتے سوتے چھوڑ کر گاڑی سے اتر پڑا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ آپ کے اترتے ہی بابا جی چونک کر نیند سے اٹھ بیٹھے اور

مکرر...... پوچھا "مُلاّ صاحب کدھر گیا؟" ساتھیوں نے بتایا کہ ابھی آتا ہے تو پھر سو گئے۔ امانت کی حوالگی کے بعد ہم نے بابا جی سے رخصت ہونا تھا لہٰذا ارادہ ہوا کہ کسی اچھی جگہ چل کر اچھا سا کھانا کھایا جائے۔ ڈرائیور نے ایک طعام گاہ کے باہر گاڑی لے جا کر روکی اور اس کے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "یہاں نواز شریف اور دیگر کئی شخصیات بھی کھانا کھانے آ چکی ہیں۔" ہم نے فرشی نشست والی اس طعام گاہ میں محفل جمائی اور خود کھانے سے زیادہ بابا جی کو مختلف چیزیں پیش کرتے رہے جو انہوں نے رغبت سے قبول کیں اور سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فراغت پر جہاز کا وقت ہو چلا تھا واپس جانے والے ساتھیوں کو ہم نے یہیں سے رخصت کیا اور آخر میں بابا جی سے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہی۔ بابا نے انتہائی شفقت سے گلے لگایا اور نم آنکھوں سے ہمیں رخصت کیا۔ مجھے اگرچہ بہت فکر لگی ہوئی تھی کہ اس اجنبی شہر میں بابا جی کہاں رہیں گے؟ کیا کھائیں گے؟ آگے کا سفر کیسے ہوگا؟ مگر ان کے سابقہ جلالی قسم کے جوابات کی وجہ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بادل نخواستہ ہم اس حال میں جدا ہوئے کہ ان کی شخصیت کا گہرا نقش بندہ کے دل پر تھا۔ کراچی پہنچ کر کافی دن گزر گئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک دن میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا کسی کام میں مصروف تھا کہ انٹر کام پر اطلاع آئی کوئی بزرگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بندہ نے نام اور کام پوچھا تو جواب ملا کہ نام کچھ نہیں بتاتے اور کام کے بارے میں کہتے ہیں کہ فقط زیارت اور ملاقات مقصود ہے۔ بندہ کو کچھ شبہ گزرا۔ جب نیچے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بابا جی اپنی مخصوص ہیئت میں استغنا کی ایک خاص کیفیت کے ساتھ رکشہ میں بیٹھے ہیں۔ بندہ نے علیک سلیک کی۔ خیر خیریت پوچھی اور اندر تشریف لا کر بیٹھنے کو کہا۔ انہوں نے منع کیا اور کہا کہ وقت کم رہ گیا ہے، حج کے لیے جلدی پہنچنا ہے۔ ماحضر نوش کر کے رخصت ہوگئے۔ بندہ نے رکشہ والے سے پوچھا کہ انہوں نے آپ سے کہاں جانے کا کہا ہے؟ اس نے بتایا کہ ساحلِ سمندر پر جانے کے لیے بیٹھے تھے۔ بندہ حیرت و استعجاب میں غرق ہوگیا۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ کوئٹہ سے رخصت ہونے تک نہ ان کو بندہ کا نام پتہ معلوم تھا نہ میں نے بتایا، پھر خبر نہیں وہ کیسے سیدھا بندہ کے پاس کراچی آ پہنچے۔

قارئین کو اس داستان میں شاید کوئی دلچسپی محسوس نہ ہو لیکن بندہ نے جس بات کی خاطر یہ نقل کی، اب اسے درج کرتا ہوں۔

بابا جی سے میں نے پوچھا: آپ جیسے لوگ حج کے اجتماع میں موجود ہوتے ہیں پھر مسلمانوں کی دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ ان کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اجتماع کی کمیت (یعنی مقدار) بڑھ گئی ہے، کیفیت باقی نہیں رہی۔

"اس کی کیا وجہ ہے؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو حرام کی کثرت ہے، ناجائز ذرائع آمدن سے حاصل شدہ رقومات سے حج کیا جاتا ہے۔ احکم الحاکمین کے دربار میں پہنچ کر بھی بے دھڑک لایعنی باتوں اور کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حج کے اعمال سیکھ کر ٹھیک ادا نہیں کیے جا رہے۔ پہلے وقتوں میں لوگ خالص حلال آمدنی سے تھوڑا تھوڑا بچا کر حج کے لیے جمع کرتے تھے اور چونکہ دور دراز سے آ کر محنت مشقت جھیل کر حج کرتے تھے اس لیے ہر چیز میں نہایت احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ خدا جانے پھر آنا نصیب ہو یا نہ؟ اب وہ بات نہیں رہی۔ ان وجوہ سے "لبیک" کا وہ کیف جاتا رہا جسے سن کر فرشتے بھی وجد میں آ جایا کرتے تھے۔"

حجاج کرام اور عامۃ المسلمین کی خدمت میں یہی دو باتیں عرض کرنی مقصود تھیں۔ اللہ تعالیٰ حرام غذا سے بچنے اور تمام آدابِ حج کی رعایت کی توفیق دے تاکہ وہ حج مقبول و مبرور نصیب ہو جس کا بدلہ صرف جنت ہوتا ہے۔

دو پتھر ایک چٹان

اس وقت دنیا میں تین ایسی متبرک چیزیں ہیں جو حدیث شریف کے مطابق جنت سے آئی ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو پتھر ہیں اور ایک چٹان۔ ایک پتھر اور چٹان کا ذکر تو ان شاء اللہ اگلے کسی شمارے میں آئے گا۔ آج ایک پتھر کا ذکر مقصود ہے جسے ''حجرِ اسود'' کہتے ہیں یعنی کالا پتھر۔ یہ پتھر جب جنت سے آیا تو سفید اور صحیح سالم تھا۔ آج یہ سفید نہیں کالا ہے اور صحیح سالم نہیں، تیرہ ٹکروں میں تقسیم ہے۔ اس کو کالا تو بنی آدم کے گناہوں نے کیا لیکن اس کو توڑا کس نے؟ اس کے تیرہ ٹکڑے کیوں ہوئے؟ اس مقدس پتھر کو ٹکڑے کرنے والے ''مہربان'' آج پھر کس طرح ہم پر مسلط ہو کر تعلیم اور فلاح و بہبود کے نام پر ہمارے نظریات کی دھجیاں بکھیرنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور ہم ان کو بخوشی راستہ فراہم کر رہے ہیں۔ آج کی مجلس میں ہم تاریخ کے اس ورق کو کھنگالنے کی کوشش کریں گے۔ پہلے اس مبارک پتھر کی اصلیت اور رنگ و خاصیت۔

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک روایت ہے: ''یہ پتھر جب جنت سے آیا تو دودھ سے زیادہ سفید تھا، بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔'' (ج 1، ص 107)

ترمذی ہی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: ''حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم جنت کے دو یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی چمک ختم کر دی ورنہ مشرق و مغرب ان سے روشن ہوتے۔''

شامیہ میں علامہ ابن عابدین نے حجرِ اسود کے متعلق نقل کیا ہے: "ھو یمین اللہ یصافح بہ عبادہ." یعنی یہ گویا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں سے مصافحہ کرتا ہے۔ (مطلب فی دخول مکۃ: 3/587)

مشہور حنفی فقیہ علامہ کمال الدین عبدالواحد ابن الھمام السیواسی (جن کو مجتہد کے درجہ پر تسلیم کیا گیا ہے) نے ہدایہ کی مایۂ ناز شرح ''فتح القدیر'' میں مستدرک حاکم کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے تمام ارواح بنی آدم سے اپنی خدائی کا عہد لیا اور تمام روحوں نے اقرار کیا کہ وہ بندے ہیں اور حق تعالیٰ ان کے رب ہیں تو اس عہد کو ایک ورقے میں لکھ کر اس پتھر میں ڈال دیا گیا۔ روزِ قیامت یہ پتھر اس شخص کے حق میں گواہی دے گا جس نے یہ عہد پورا کیا ہو۔ پس اس عہد نامہ کے حوالے سے یہ پتھر اللہ تعالیٰ کا امانت دار ہے۔ [کہ وہ میثاق نامہ اس کے پاس امانت رکھوا دیا گیا ہے] (ج 2، ص 353، 354)

یہ تو حجرِ اسود کے فضائل، اس کی اہمیت اور اس کی اس چمک دمک و خوبصورتی سے متعلق باتیں تھیں جو گناہوں کے سبب سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ اب آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ کئی ٹکڑوں میں کیسے تبدیل ہوا؟

اسماعیلیوں (آغا خانیوں) کی، دنیا میں تین حکومتیں رہی ہیں۔ یہ تینوں ان سے بالآخر چھن گئیں اور اب وہ چوتھی کی تلاش میں ہیں۔ پہلی افریقہ اور مصر میں جو 296ھ سے 567ھ تک تقریباً دو سو ستر سال قائم رہی۔ اس کو عام طور پر خلافتِ فاطمیہ

کہا جاتا ہے جو جہالت اور سخت غلطی ہے۔ یہ نہ معروف معنوں میں اسلامی خلافت تھی اور نہ اس کے بانی فاطمی یعنی سید تھے۔ اس کو دولت عبید یہ کہنا چاہیے کیونکہ اس کا بانی اول عبید اللہ مہدی تھا۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے...... اور بقیہ تمام تاریخ دان اور نسب دان حضرات نے ان کی تصدیق کی ہے...... کہ عبید اللہ مہدی نامی یہ شخص مذہب سے مجوسی اور ذات سے لوہار تھا۔ اس نے شمالی افریقہ کے بربروں میں جو مذہبی اعتبار سے پختہ نہ تھے، پہنچ کر فاطمی ہونے کا دعویٰ کیا مگر عرب جو غضب کے نسب شناس ہیں، انہوں نے اسے کبھی ''سیّد'' تسلیم نہ کیا اور نہ اسے کوئی تاریخ دان تسلیم کر سکتا ہے لہٰذا انہیں باطنیہ تو کہنا چاہیے، فاطمی کہنا درست نہیں۔ باطنیہ اس لیے انہیں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے مذہب کو چھپا کر رکھتے تھے، اپنے ارادوں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے اور اس کو اپنا امتیاز قرار دیتے تھے۔

ان کی دوسری حکومت ایران میں قزوین کے قریب مشہور زمانہ زیر زمین قاتل گروہ کے سربراہ حسن بن صباح المعروف بہ شیخ الجبل نے قلعہ ''اَلموت'' میں قائم کی تھی جسے فدائیوں کی سلطنت، سلطنتِ اسماعیلیہ اور سلطنتِ حشاشین بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ اَلموت ہے، اس میں الف اور لام دونوں پر زبر ہے۔ یہ عربی کا لفظ موت نہیں بلکہ ایک قلعے کا مقامی نام ہے جس پر 35 سال تک وہ شخص حکمران رہا جو مسلمانوں کا امام ہونے کا مدعی تھا اسے اس کے مرید ''سیدنا'' کہتے تھے (سیدنا برہان الدین کی طرح) لیکن اس نے مولانا روم کے شیخ و مرشد جناب شمس تبریز رحمہ اللہ، نظام الملک طوسی اور فاتح ہند سلطان شہاب الدین غوری جیسے نامور لوگوں کو شہید کروایا اور فرزندِ اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی اور امام فخر الدین رازی رحمہما اللہ تعالیٰ جیسی شخصیات کو قتل کرنے کی ناکام کوششیں کیں۔

اس شیخ الجبل سیدنا کا پورا نام حسن بن علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح الحمیری تھا۔ یہ 90 سال کی عمر پا کر 28 ربیع الثانی 518ھ کو اس دنیا سے سدھارا۔ بندہ کو باوجود کوشش کے اس کے قلعے کی تصاویر اور حدود ریاست کا نقشہ تا حال دستیاب نہیں ہو سکا ورنہ قارئین کی ضیافت طبع کا سامان ہوتا۔

اسماعیلیوں کی تیسری حکومت موجودہ بحرین کے قریب ''ہجر'' نامی جگہ اور موجودہ سعودی عرب میں ''الاحساء'' نامی مقام میں قائم ہوئی تھی (جہاں آج کل پیٹرول کے وہ چشمے ہیں جن پر امریکی و برطانوی لٹیروں کی رال ٹپکتی رہتی ہے) اور یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔ یہ حکومت ابوسعید حسن بن بہرام جنابی نامی ایک شخص کے ہاتھوں قائم ہوئی۔

اس نے بحرین کے گرد و پیش میں بدوؤں کو باور کرایا کہ وہ امام زمان المنتظر کا نمائندہ ہے۔ جب اس کے گرد اس زمانے کے لوگ (جنہیں قرامطہ کہا جاتا تھا) جمع ہو گئے تو اس نے ''ہجر'' نامی جگہ میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی، اس کے بعد اس کا بھائی ابوطاہر سلیمان بن الحسن اس سے ناراض ہوا اور اسے قتل کر کے خود ''قرامطہ'' کا حکمران بن گیا اور مسلمانوں کے خلاف خوب ہاتھ دکھائے اور دل کا بغض نکالا۔ 311ھ میں اس نے بصرہ پر حملہ کر کے اسے اُجاڑ دیا۔ شہر کی جامع مسجد منہدم کر دی۔ بازاروں کو لوٹ کر خاک سیاہ کر دیا اور جب ہمت بڑھی تو 312ھ میں حاجیوں کے قافلے لوٹنے شروع کر دیے۔

اس کے شر سے خدا کے مہمان بھی محفوظ نہ رہے حتیٰ کہ 317ھ میں اس نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ بہت سے نہتے حاجیوں کو شہید کیا۔ مکہ مکرمہ کو بھی لوٹا۔ نہتے شہریوں اور حاجیوں نے کعبہ کی حفاظت میں جان لڑا دی۔ بہت ساروں نے تسبیح و تہلیل کرتے

ہوئے جان قربان کی۔ صرف بیت اللہ میں سات سو طواف کرنے والے حاجی شہید ہوئے۔ خانہ کعبہ کا دروازہ جہاں ماتھا ٹیکنا مسلمان اپنی خوش نصیبی کی معراج سمجھتے ہیں، اس بدبخت نے اسے اکھیڑ ڈالا اور حجرِ اسود نکال کر اپنے ساتھ ''ہجر'' لے گیا اور جاتے وقت اعلان کر گیا کہ آئندہ سال حج ہمارے ہاں ہوا کرے گا۔ انہوں نے ''دارالہجرہ'' کے نام سے اپنا کعبہ بنایا اور وہاں حجرِ اسود لٹکا کر بہت کوشش کی کہ حجاج وہاں جانا شروع کر دیں۔ حج کے دنوں میں مکہ مکرمہ جانے والے راستے بھی انہوں نے بند کر دیے مگر لوگ خانہ کعبہ میں حجرِ اسود کی جگہ کو چوم لیتے تھے، وہاں نہ جاتے تھے۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ ہم مسلمانوں کے ہاں حج کرنے نہ جائیں، مسلمان ہمارے ہاں آیا کریں لیکن اس سے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا۔ اسماعیلیوں کی دہشت گردی کا انہیں اندازہ تھا لیکن معاملہ حجرِ اسود کا تھا حتیٰ کہ مصر کے عبیدی حکمران اسماعیل عبیدی نے بار بار اس سر پھرے کو لکھا کہ حجرِ اسود خانہ کعبہ واپس بھیج دو...... ورنہ اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ تب یہ 339ھ میں حجرِ اسود واپس بھیجنے پر مجبور ہوا مگر وہ ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا جن کو چاندی کی کیلوں سے جوڑا گیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے چاندی کے حلقے میں جوڑ کر دوبارہ اپنی اصل جگہ نصب کیا۔

جن لوگوں نے حجرِ اسود جیسی مقدس و متبرک جنتی سوغات کا یہ حشر کیا آج انہی کے ہاتھوں میں ہمارے ہاں کا تعلیمی نظام سپرد کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس اقدام کے بھیانک نتائج کیا ہوں گے؟؟؟

سات ریال

''مولانا صاحب! آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' محلے کے ایک معزز نمازی، امام صاحب سے مخاطب تھے۔

''جی حاجی صاحب! ضرور'' حاجی صاحب مسجد کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور نہایت وضع دار اور ملنسار انسان تھے۔

''میں نے پہلا حج 1972ء میں کیا تھا۔''

''اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔''

''اس وقت میں دکانداروں کی تنظیم کا صدر ہوتا تھا اور بازار کی مسجد کی حسبِ توفیق خدمت کرتا تھا۔ وہاں کے حافظ صاحب کو بھی اس حج میں ساتھ لے گیا تھا۔''

''ماشاءاللہ!''

''پھر 1984ء میں مَیں نے دوسرا حج کیا، اس وقت بھی مجھ سے اکیلے نہ جایا گیا، میں اپنی مسجد کے امام صاحب کو ساتھ لے گیا۔''

یہاں پہنچ کر حاجی صاحب خاموش ہو گئے...... وہ بات کرنا بھی چاہتے تھے لیکن امام صاحب کی خودداری اور استغنا کا بھی ان کو پاس تھا جس کی وجہ سے حجاب محسوس کر رہے تھے۔ آخر کار ہمت کر کے وہ گویا ہوئے:

''اب 96ء میں میرا پھر حج کا ارادہ ہے...... (تھوڑا سا ٹھہر کر)...... جی چاہتا ہے اگر آپ منظور فرمائیں تو میرے ساتھ حج پر چلے چلیں، مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''آپ کی نیک نیتی اور خیر خواہی کا بہت شکریہ حاجی صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ کے گھر بار اور رزق و کاروبار میں برکت دے۔ میرے لیے یہ بات بہت مشکل ہے۔''

''مجھے اسی کا اندیشہ تھا۔ بہر حال میری پیشکش ختم نہیں ہوئی۔ آپ جب چاہیں اپنا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ میرے پاس بھجوا دیں۔ میں آپ کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھوں گا۔''

حاجی صاحب کے جانے کے بعد جب یار دوستوں کو اس واقعے کا پتہ چلا تو انہوں نے مولوی صاحب سے خفگی کا اظہار کیا کہ اتنے نیک دل انسان کی پیشکش کیوں قبول نہ کی؟

''بس یارو! بات یہ ہے کہ ہمارے ایک استاذ تھے، نہایت عالم و فاضل، عوام و خواص میں بے حد مقبول...... حج ان کی بڑی خواہش تھی لیکن وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی کی پیش کی ہوئی رقم سے حج کے لیے کبھی نہ جاؤں گا۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کا سفر کسی کے دیے ہوئے پیسے سے کروں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری حاضری مقبول ہے تو وہ

ہمیں خود توفیق دے گا۔'' میں چونکہ اپنے ان استاذ کی شخصیت، علمیت اور عادات و اخلاق سے بہت متاثر تھا اس لیے ان کی یہ بات ایسی دل میں بیٹھی کہ میرے بس میں نہیں کہ فرض حج کے لیے اپنے جیسے کسی انسان سے رقم لے کر جاؤں۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو حاضری نصیب ہو جائے گی ورنہ فقیروں کا کیا ہے، ہر نماز بھی تو حاضری ہی ہوتی ہے۔''

''لیکن اگر کوئی کسی کو حج پر بھیجتا ہے تو دونوں کو ثواب ملتا ہے۔ کسی کو حاضری کا کسی کو اس کی خدمت کا، ایسے نیک بخت لوگوں کی بات ٹالنا بھی تو اچھا نہیں۔''

''ہاں! یہ بات ٹھیک ہے بلاشبہ ایسے نیک مصرف پر پیسے لگانے والے خوش قسمت ہیں۔ پر کیا کریں ان استاذ صاحب کی بات دل میں ایسی کھب گئی ہے کہ نکالے نہیں نکلتی پھر چونکہ وہ حج کیے بغیر فوت ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں عین عالم جوانی میں شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس لیے بندہ کی نیت ہے کہ ایک حج ان کی طرف سے بھی کروں۔ پلّے تو کچھ نہیں لیکن ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔''

حاجی صاحب کی پیشکش برقرار رہی، وہ منتظر تھے کہ مولوی صاحب اپنے فلسفے سے رجوع کر لیں تو ان کی خدمت کا موقع مل سکے پَر مولوی صاحب بھی اپنی بات کے پکے تھے۔ یہ کشمکش چلتی رہی حتیٰ کہ مولوی صاحب کی غیرت رنگ لائی اور غیب سے کچھ سامان ہو گیا اور حج پر جانے کا دن آ گیا۔

☆......☆......☆

''مولوی صاحب! سنا ہے آپ حج پر جا رہے ہیں۔'' ایک بڑھیا مولوی صاحب سے ملنے آتی ہے۔

''جی ہاں اماں جی! اللہ پاک کی مہربانی ہے۔''

''تو بیٹا! میرا ایک کام کر دو گے؟''

''ہاں! اماں کیوں نہیں؟ اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے؟''

اس پر اماں دوپٹے میں لگی ہوئی گرہ کھولتی ہیں اس میں سے سات ریال نکالتی ہیں۔ ان کو دوبارہ احتیاط سے گنتی ہیں اور مولوی صاحب کے حوالے کر کے کہتی ہیں: ''بیٹا یہ پورے سات ریال ہیں، میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ یہ آپ رکھ لو، میری مرحوم بیٹی کی طرف سے عمرہ کر لینا۔''

مولوی صاحب کو سات ریال کا قصہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کا اصرار ہے کہ وہ اماں کی طرف سے بھی عمرہ کریں گے اور ان کی مرحوم بیٹی کی طرف سے بھی۔ لیکن ایک پائی اس سلسلے میں قبول نہ کریں گے مگر اماں جی کو کسی نے بتا دیا ہے کہ سات یا گیارہ ریال کے بغیر عمرہ نہیں ہوتا۔ اب اگر مولوی صاحب ریال لینے سے انکار کرتے ہیں تو اماں سمجھیں گی کہ مولوی صاحب انہیں ٹرخانا چاہتے ہیں۔ چار و ناچار انہیں یہ ریال رکھ کر اماں جی کو تسلی دینی پڑتی ہے کہ وہ ضرور ان کی خواہش کے مطابق ایک عمرہ کر کے اس کا ثواب ان کی مرحومہ بیٹی کے لیے بخشیں گے۔ یوں سرمایہ داروں کے سامنے ڈٹے رہنے والے مولوی صاحب بڑھیا مائی کے سامنے ہتھیار ڈال کر شکست قبول کر لیتے ہیں۔

بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ماں جی کی بیٹی مدرسۃ البنات میں پڑھتی تھی۔ نیک، سگھڑ اور خدمت گار۔ بس بیٹھے بٹھائے

طبیعت خراب ہوئی، ڈاکٹروں کو دکھایا، حکیموں کے پھیرے لگائے، پر وقت آچکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوگئی۔
اماں جی نے اپنے بیٹے کو کافی ساری رقم دی تھی کہ ریال میں تبدیل کرالائے۔ حج کے لیے تو وہ خود نہ جاسکتی تھیں مگر عمرہ کے لیے تو ہر حاجی کو کہا جاسکتا ہے۔ بڑی بڑھیاں کفایت شعار تو ہوتی ہی ہیں۔ بیٹا ذرا ماڈرن تھا اس نے بقیہ رقم ٹھکانے لگائی اور سات ریال ماں جی کو لا دیے کہ ان سے چھوٹا حج ہو جاتا ہے۔

مولوی صاحب حرمین کی زیارت کر کے واپس آگئے۔ سات ریال ان کے پاس یادگار کے طور پر محفوظ ہیں۔ اماں جی خوش ہیں کہ ان کی خواہش پوری ہوگئی۔ ان کی مرحوم بیٹی جنت میں اس ہدیے سے خوش ہوگی۔ مولوی صاحب مطمئن ہیں کہ ان کا اصول بھی نہیں ٹوٹا اور یہ سات یادگاریں بھی محفوظ رہ گئیں۔ یہ سب قدرت والے کے کرشمے ہیں۔ اس کی مہربانی شامل حال ہو جائے تو مشکلیں آسان، رکاوٹیں دور اور بظاہر ناممکن نظر آنے والی چیزیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔

جدہ ایئرپورٹ پر

احرام بھی عجیب لباس ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لباس سے انسان کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے، اس کا تشخص قائم ہوتا ہے مگر احرام ایسا لباس ہے کہ اسے پہنتے ہی آدمی ہر طرح کے دنیاوی تشخص اور تعارف کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دو یک رنگی بلکہ بے رنگی چادریں اوڑھتے ہی تشخص کے تمام سابقے لاحقے ختم ہو جاتے ہیں اور انسان کو گمنامی، لاتشخصی اور شناخت سے آزادی کی وہ نعمت میسر آجاتی ہے جس کو تلاش کرتے کرتے یوگی، ہپی اور لاما دنیا سے سدھار جاتے ہیں مگر یہ انہیں ہاتھ لگ کے نہیں دیتی۔

تلبیہ کا معاملہ تو اس سے زیادہ عجیب ہے۔ یہ چند الفاظ لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کرا دیتے ہیں اور انہیں زبان پر لاتے ہی انسان براہِ راست خالق کائنات کے حضور جا پہنچتا ہے۔ وہ طویل فاصلہ جو نفس اور شیطان نے عابد اور معبود کے درمیان قائم کر رکھا تھا اور جسے پاٹتے پاٹتے عام حالات میں عمر طے ہو جاتی ہے مگر وہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا، ایک جست میں طے ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے بابرکت جملے ہیں کہ گنہگار سے گنہگار بندے کو بغیر کسی واسطے وسیلے کے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ربط ضبط قائم کرا دیتے ہیں۔ یہ الفاظ زبان پر لانے کی دیر ہوتی ہے کہ بندہ کی رسائی فوراً احکم الحاکمین کے دربار تک ہو جاتی ہے۔ اب یہ آگے اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنے معبود سے کس طرح کا راز و نیاز کرتا ہے، اس سے کیا مانگتا ہے اور کس چیز سے دامن بھر کے لوٹتا ہے؟

☆......☆......☆

مسلم امہ نے جس طرح مشینی دور کے آغاز کے بعد سائنسی تحقیق اور ایجادات میں اپنا حصہ خاطر خواہ شکل میں نہیں ملایا اسی طرح ان سے استفادہ میں بھی قابلِ ذکر شعور یا تدبر کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کا ایک مشاہدہ جدہ ایئرپورٹ پر ہوتا ہے۔ جدہ ایئرپورٹ کو ہر سال لاکھوں زائرین کے استقبال کا شرف حاصل ہوتا ہے مگر وہاں کاغذات کی پڑتال اور مسافر کو کلیئر کرنے کا جو نظام فی الوقت رائج ہے وہ اس اعتبار سے خاصا ''تسلی بخش'' ہے کہ اس کو جدت پسندی سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ جہاز سے اُترنے کے بعد ایئرپورٹ کی گاڑی آپ کو لے کر ایک عمارت کی طرف بڑھے گی اور راستے میں کئی جگہ ٹھہر کر سانس لیتے ہوئے دھیرے دھیرے چلے گی۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عمارت میں حجاج کے کاغذات کی چیکنگ کے لیے جو کمرے بنے ہوئے ہیں وہ خالی نہیں، اس لیے گاڑی بان آہستہ روی کا خصوصی خیال رکھنے پر مامور ہے۔ ان کمروں کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں ایک فلائٹ کے حاجی داخل ہو جاتے ہیں تو اس وقت تک کوئی اور داخل نہیں ہوتا جب تک پوری فلائٹ رخصت نہ ہو جائے۔ اب ایک فلائٹ کے حاجیوں کی تعداد کوئی اتنی زیادہ نہیں کہ ان کے کاغذات، سامان وغیرہ کی جانچ پڑتال اس کمپیوٹرائزڈ دور میں کچھ زیادہ وقت لے مگر خدا جانے کیوں اس مرحلے کو طویل تر رکھنے کے لیے کافی کچھ ''انتظامات'' کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے حجاج کو ایک کمرے میں پہنچایا جاتا ہے جس کے دوسری طرف والے دروازے پر دو اہلکار کھڑے پاسپورٹوں پر اسٹیکر لگاتے ہیں۔ یہ اہلکار بالکل یوں کھڑے ہوتے ہیں جیسے سرکاری ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے نمائندے۔ ان کے لیے بیٹھنے کی باوقار مناسب جگہ ہوتی ہے نہ ان کے کام میں تیز رفتاری۔ اسٹیکر بھی انہوں نے پینٹ کی جیب میں رکھے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے اطمینان سے اسٹیکر نکالتے ہیں، تسلی سے پاسپورٹ کے صفحات کھولتے ہیں اور سکون سے ان پر اسٹیکر چپکاتے جاتے ہیں۔

اب یہ کام کوئی اتنا ٹیکنیکل نہیں کہ اس کے لیے ہنرمند افراد مناسب تعداد میں دستیاب نہ ہوسکیں نہ اتنا خطرناک ہے کہ تیز رفتاری کے ساتھ انجام دینے سے کسی حادثے کا خطرہ ہے لیکن جو چیز چند منٹوں میں ہوسکتی ہے اس کو اوسطاً ڈیڑھ دو گھنٹے میں نمٹانے کی مصلحتیں سمجھ سے بالاتر ہیں۔

ایک فقیر منش قسم کا عربی دان حاجی اس سست رفتاری سے اُکتا کر قریب جا کر ان دو اہلکاروں کو دیکھتا ہے اور ان کے کام کی نوعیت سے واقف ہو کر ان سے پوچھتا ہے:

''آپ بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ کیوں نہیں بنا لیتے جہاں سامنے میز پر پاسپورٹ رکھ کر آپ فٹافٹ اسٹیکر لگاتے جائیں؟''

''حجاج کی خدمت ہمارے لیے سعادت ہے۔'' جواب ملتا ہے۔

''شاید آپ اس لیے اسے طویل تر بنا رہے ہیں کہ اس ''سعادت'' سے خوب جی بھر کے بہرہ ور ہوں مگر یہ سعادت سلیقے سے بیٹھ کر تیز رفتاری سے کام نمٹانے سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔'' حاجی زیرِ لب بڑبڑاتا ہے۔

اس سست رفتاری سے حاجیوں کو بلاوجہ جو دقت ہوتی ہے اس کا حل پرانے حاجی جن کو پہلے بھی ایسے سعادت مند خدام سے واسطہ پڑا ہوتا ہے، تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک حاجی صاحب نے پانی کی بوتل، بسکٹوں کا پیکٹ اور دوائیوں کا ڈبہ نکالا اور ایک کونے میں چادر بچھا کر باقاعدہ ٹھیا بنا لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''تھوڑی دیر بعد ہمیں ترغیب دے کر یہاں سے رُخصت کیا جائے گا کیونکہ جب تک ہم یہ کمرہ خالی نہیں کرتے اس وقت تک نئی فلائٹ کے حاجی اندر نہیں آسکتے۔ وہ باہر بس میں کھڑے دھواں سینکتے رہیں گے۔''

اس کمرے سے نکلیے تو اگلے کمرے میں نئی قطار میں لگ جائیے۔ یہاں قطار کے سرے پر کمپیوٹر مین بیٹھے ہیں جو آپ کا پاسپورٹ چیک کرتے ہیں۔ یہ کام ترقی یافتہ ملکوں میں چند لمحوں سے زیادہ وقت نہیں لیتا۔ دبئی پڑوس میں واقع ہے، وہاں ایسا تیز رفتار نظام ہے کہ بغیر کسی کوفت کے مسافر تمام مراحل سے گزرتا چلا جاتا ہے مگر خدا جانے کس مصلحت سے جدہ ایئرپورٹ پر سسٹم کی فرسودگی بتمام وکمال قائم ہے۔ شاید حاجی کو صبر کی تربیت دینا مقصود ہے۔ اہلکاروں کی روایتی سست روی اس پر مستزاد ہے۔ یہ حضرات جلدی کو شیطان کا کام سمجھتے ہیں اس لیے تحمل اور آہستہ روی کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ دیکھنے والا سر کر رہ جائے۔ بیچ میں اہلکاروں کی باہمی گپ شپ یا اُٹھ کر بلاوجہ دوسرے کے پاس چلے جانا تو نہایت ہی حوصلہ افزا منظر ہوتا ہے۔ اس تمام عرصے میں حاجی جو گھر سے نکلنے کے بعد خود کو قابلِ احترام سمجھنے لگا تھا یکایک اپنے آپ کو ایسی ہلکی مخلوق محسوس کرتا ہے جو کسی خاص توجہ

کے قابل نہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ اس کے لیے سجایا گیا تھا اور یہ ساری رونقیں اس کے دم سے تھیں۔

حج گروپ لے جانے والوں کو اس کا چونکہ علم ہوتا ہے اس لیے وہ پہلے سے حاجی کا ذہن بناتے ہیں کہ جدہ ایئرپورٹ پر کم سے کم چھ گھنٹے گزارنے کی نیت لے کر جائیں۔ سعودی حکومت ذرا سی توجہ کرے تو اس صبر آزما مرحلے کو مختصر اور سہل بنا سکتی ہے۔ آج کے دور میں دنیا کے بڑے ایئرپورٹوں پر ہوائی ٹریفک کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز چیل کوؤں کی طرح چڑھتے اُترتے اور مسافر برساتی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہیں، وہاں کے حکام کو سیکورٹی کا مسئلہ سعودی عرب سے زیادہ درپیش ہے مگر انہوں نے مسافروں اور ان کے کاغذات کی چیکنگ کا نظام نہایت سہل بنا رکھا ہے۔ اگر اس سے استفادہ کر لیا جائے تو حجاج کرام کے اولین استقبال کو بیزاری اور کوفت کا شکار ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

ایئرپورٹ سے نکلیے تو مکہ مکرمہ روانگی کے لیے بس کی دستیابی بھی کچھ اس قسم کی چیز بن گئی ہے جسے انسان قسمت پر چھوڑنے اور صبر و توکل کر کے راضی بہ رضا رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فلائٹوں کی آمد کا وقت اور ان میں سوار مسافروں کی تعداد طے ہے۔ معلم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آج کس فلائٹ سے اس کے کتنے حاجی پہنچ رہے ہیں جو بسوں کا پورا پورا کرایہ دے چکے ہیں مگر جس سے پوچھیے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون سی مشکل ہے جو 49 آدمیوں کو لے کر چلنے والی بس کو درپیش آ گئی ہے جس کی بنا پر وہ آنے اور روانہ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

آخر کار اللہ اللہ کر کے جب بس آنے کا اعلان ہوتا ہے تو اس کو اتنی بڑی خوشی کی بات سمجھا جاتا ہے جیسے کوئی گم شدہ قیمتی چیز تلاش بسیار کے بعد اچانک مل جائے۔ ہم لوگ اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں تو آخر خود اپنے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟

فراخ دلی کا تقاضا

جدہ ایئر پورٹ پر آپ جیسے ہی داخل ہوں گے آپ کو مسائل حج سے متعلق سرکاری طور پر چھپی ہوئی چند کتابیں ملیں گی اور پھر مختلف کتابوں اور کتابچوں کی تقسیم کا یہ سلسلہ واپسی تک وقتاً فوقتاً جاری رہے گا۔ دیگر مسائل کی طرح حج سے متعلقہ احکام میں بھی ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے اور دیگر علمی و تحقیقی اختلافات کی طرح یہ اجتہادی اختلاف بھی امت کے لیے سراسر رحمت ہے۔

قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط میں اختلافِ نظر پیدا ہونا ایک فطری امر ہے اور اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس میں شریعت کا حسن پوشیدہ ہے لہٰذا امت مسلمہ کے تمام طبقات ان فقہی اختلافات کا احترام کرتے چلے آئے ہیں اور ہر مسلک سے متعلق آدمی کو یہ حق دیتے رہے ہیں کہ وہ اس امام کی تحقیق کے مطابق عمل کرے جس کی دو چیزوں یعنی علم وتقویٰ پر اسے زیادہ اعتماد ہے اور جس کی تحقیقات پر عمل اس نے اپنے لیے منتخب کرلیا ہے...... لیکن موجودہ سعودی حکومت کا طرزِ عمل امت کے اب تک چلے آرہے طرزِ عمل کے خلاف ہے۔

ان حضرات کی طرف سے پاک وہند کے زائرین میں جو کتابچے تقسیم کیے جاتے ہیں ان میں درج مسائل واضح اور کھلے طور پر فقہ حنفی کی مستند تحقیقات کے خلاف ہوتے ہیں۔ سعودی حکومت کو اچھی طرح علم ہے کہ پاک وہند و بنگلہ دیش اور افغانستان وترکی سے آنے والے حجاج کرام سو فیصد تک حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور حنفی فقہ میں سلطانی قوانین والی جو شان پائی جاتی ہے اور جیسا شاہی نظم وضبط اس کے مزاج میں ہے اس کے تحت بہت سے مسائل میں کوتاہی یا ترتیب کی خلاف ورزی سے "دم" واجب ہوجاتا ہے یا حج ناقص رہ جاتا ہے لیکن پھر بھی نہ صرف یہ کہ ان سرکاری کتابچوں میں جو جابجا تقسیم ہوتے ہیں، ان مسائل کے برخلاف بتایا گیا ہے بلکہ منیٰ میں حکومت کی طرف سے موقع بہ موقع ایسے پوسٹر لگائے گئے تھے جو صراحۃً مسلک حنفی کے خلاف تھے اور ان پر عمل سے حج کے ناقص رہ جانے کا شدید خطرہ تھا۔

یہ طرزِ عمل ایسے حضرات کو قطعاً زیب نہیں دیتا جو سارے عالم اسلام کے میزبان ہیں اور جن کے پاس آنے والے مہمانوں کی اکثریت ان پر اعتماد کرتی ہے اور انہیں اپنا مخلص اور خیر خواہ سمجھتی ہے۔ ان حضرات کا منصب ان سے جس وسیع النظری اور فراخ دلی کا تقاضا کرتا ہے انہیں اس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

مطبوعہ لٹریچر کے علاوہ زبانی طور پر مسائل بتانے یا بیانات کرنے کا جو اہتمام حکومت کی طرف سے ہے اس میں بھی یہ حضرات اپنے زائرین کی رعایت کرنے کے بجائے وہابی علماء کی تحقیقات پر زور دیتے ہیں اور امت کے اجماعی عمل کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسرے مسلک والوں کو اپنے مسلک کا مسئلہ بتاتے ہیں۔ حرمین اور حجاز پر جب تک آلِ عثمان کی حکومت تھی جو حنفی سلاطین تھے، انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ان کی رواداری ضرب المثل تھی۔ مگر آل سعود ساری دنیا پر اپنا نظریہ مسلط کرنے

میں جو فخر و مسرت محسوس کرتے ہیں یہ ان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا۔

جدہ ایئرپورٹ سے بس پر سوار ہونے کے بعد ایک صاحب نے آ کر عمرہ کا طریقہ اور دیگر مسائل بیان کیے۔ اول تو لب و لہجے سے ہی وہ عالم نہ لگتے تھے انہیں مسائل پر بیان کرنا ہی نہ چاہیے۔ دوسرے عمرہ کے علاوہ انہوں نے خواتین کے لیے حجاب کا جو مسئلہ بتایا وہ نہایت افسوسناک طور پر غلط تھا...... ایسے مسائل بیان کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شریف زادیاں جن کا چہرہ ان کی پیدائش کے بعد سے کسی غیر محرم نے نہیں دیکھا، وہ بھی حرمین کی مقدس سرزمین پر پہنچ کر بے پردہ چہرے کے ساتھ گھومتی ہیں۔ بس کے ہمسفر اس شعلہ بیانی پر چیں بہ جبیں تھے لیکن وہ صاحب رٹے رٹائے ہوئے الفاظ تھکے تھکے انداز میں بیان کر کے اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی جلدی میں تھے۔ ان سے کچھ کہنا بے سود تھا۔

اسی طرح منیٰ کے دنوں میں ریڈیو اور ٹی وی پر مسلسل اعلان کیا گیا کہ رمی چوبیس گھنٹے میں جس وقت چاہے کر سکتے ہیں حالانکہ آخری تین دنوں کی رمی کا متعین وقت ہے اور اس سے پہلے یا بعد میں رمی کرنا درست نہیں۔ نجانے یہ اجتہادی فیصلہ کس بنیاد پر ہوا؟ اور اس کی مقامی ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس قدر تشہیر کیوں کی گئی؟ جس سے پوچھیے کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ نجدی علماء تو ایسا لگتا ہے سر پر لٹکتی تلوار تلے دم سادھے بیٹھے ہیں۔ ساری دنیا کو عدم تقلید کا درس دیتے ہیں اور خود ایسے جامد مقلد ہیں کہ جو فرمان شاہی علماء کی طرف سے صادر ہو گیا، وہ ان کے لیے حرفِ آخر ہے۔

حرم شریف میں درس دینے کے لیے جو صاحب مقرر کیے گئے ہیں، ان کی شان تو سب سے نرالی ہے۔ جو حضرات عربی میں درس دیتے ہیں ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مقامی زائرین یا عرب ممالک کے مہمانوں کے لیے مقرر ہیں لہٰذا ان کے نظریات کے مطابق بات کر سکتے ہیں لیکن جن صاحب کو مطاف میں اردو میں درس دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے ان کے بیانات سنیں تو سعودی اربابِ اقتدار کی سنگدلی پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح وہ زائرین کی اس دلآزاری کا سرکاری اہتمام کیے ہوئے ہیں۔ یہ صاحب سلفی عالم ہیں۔ انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں اور نام کے آخر میں مکی کی نسبت لگاتے ہیں۔ چونکہ ان سے پہلے مطاف میں مولانا محمد مکی حجازی صاحب مشہور سکہ بند واعظ رہے ہیں اس لیے نام کے اس تشابہ اور بیت اللہ کے واعظین سے عقیدت و محبت کے تحت پاکستانی اور بھارتی مسلمان ذوق وشوق سے ان کے درس میں بیٹھتے ہیں...... لیکن وہ کیا درس ہوتا ہے؟

ایسا لگتا ہے کہ اس مبارک جگہ میں خدا و رسول اور دین و آخرت کی بات کرنے اور توبہ و اصلاح کی ترغیب دینے کے بجائے حنفیت مخالف مشن جاری کر دیا گیا ہے۔ ان صاحب کی گفتگو کا اول و آخر یہ ہوتا ہے کہ تقلید خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید چھوڑ دی جائے اور جس فقہ کی جو چیز راجح معلوم ہو اسے لے لیا جائے۔ راجح کی تعیین کون کرے گا؟ اور اس تعیین میں اختلاف ہوا تو چار کے بجائے چار ہزار مسلک بننے سے کون روک سکے گا؟ اس سے انہیں کوئی غرض مطلب نہیں۔ ان صاحب سے کچھ سوال و جواب کا ارادہ ہوا مگر جب انہوں نے ایک سائل کو جواب دیا کہ ''قبلہ کی طرف پاؤں کر کے بیٹھنا، لیٹنا یا سونا بے ادبی نہیں، اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔'' تو پھر دل ہی نہ چاہا کہ اس سرکاری رضا کار سے کوئی بات کی جائے۔ جس کی علمیت کی یہ شان ہے اس کا تقرر کرنے والوں کی نظر انتخاب اس پر کیوں پڑی ہے؟ کچھ سمجھ نہ آیا۔

اکثر پاکستانی حجاج کو دیکھا کہ اس کے بیانات میں بیٹھنے کے بعد پریشان پریشان اور سعودی حکومت سے شاکی نظر آئے

کہ ایسے ملاّ جی کو کس خاطر عین مطاف میں بٹھایا ہے جو تقریر کے آغاز و اختتام میں تو یہ کہتا ہے کہ آپ لوگ بیت اللہ شریف سے میرا بتایا ہوا نظریہ لے کر جائیں جو اصل دین ہے لیکن خود اس کی دینداری کا یہ عالم ہے کہ تمام سلف امت اور ائمہ مجتہدین کے متعلق بے بنیاد باتیں اور ان کی غیبت خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر کرتا ہے۔

ایک مرتبہ جب ان محترم نے عثمانی سلاطین کو امت کا ''خائن'' اور حرم شریف میں چار مصلّوں کو امت کی پیشانی پر ''کلنک کا ٹیکہ'' بتایا تو بے ساختہ دل چاہا کہ پوچھا جائے: آلِ عثمان کی جب تک حجاز پر حکومت تھی انہوں نے ایک مشرک یا کافر کو اس مقدس سرزمین پر قدم نہ رکھنے دیا، اب حال یہ ہے کہ اس پاک سرزمین کا کوئی اہم حصہ، عالمِ اسلام کے بدترین دشمنوں کے محفوظ مورچوں سے خالی نہیں۔ ذرا ارشاد فرمایے کہ حرمین سے متعلق اس خیانت کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور امت کی پیشانی سے کلنک کا یہ ٹیکہ کس طرح ختم ہوگا؟ مگر ان عالم صاحب کی علمیّت کی طرح ان کی بے بسی بھی واضح تھی کہ وہ تو اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے تھے۔ دو مسائل کو تو انہوں نے اس کثرت سے بیان کیا گویا دیا گیا ہدف پورا کر رہے ہیں۔ جس پاکستانی زائر کو دیکھیے یہی دو مسائل پوچھتا نظر آیا۔ اگلے کسی مضمون میں ان شاء اللہ ان کا تفصیلی ذکر ہوگا۔

تعصب سے بالاتر ہو کر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو درحقیقت یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اردو سمجھنے والے حجاج کی نوے پچانوے فیصد اکثریت کے لیے ہونے والے وعظ میں ایسی باتوں کو چھیڑا جائے جو ان کے متفقہ عقیدے اور نظریے کے خلاف ہیں۔ اختیارات کا یہ جانبدارانہ استعمال سعودی حکومت کو جو تمام مسلمانوں کی نمائندہ حکومت سمجھی جاتی ہے، کسی طور زیب نہیں دیتا۔ انہیں تمام مسلمانوں کی رعایت کرنی چاہیے اور کسی ایک نظریے کے عالم کو دوسرے نظریے کی اکثریت پر عقیدت کے لبادے میں ملبوس کر کے مقرر نہ کرنا چاہیے۔

پاک و ہند کے علمائے کرام اور زعما و عمائدین کو سعودی قونصلیٹ، سفارت اور حکومت تک یہ بات دوٹوک انداز میں پہنچانی چاہیے کہ اگر ایسے کتابچوں اور ایسے واعظین کے ذریعے اردو دان طبقے میں بے چینی اور تشویش اسی طرح پھیلتی رہی تو یہ سعودی مملکت کے لیے نہایت نقصان دہ بات ہوگی، اس سے جو منفی تاثر میزبان حکومت کے بارے میں پوری اسلامی دنیا میں پھیلے گا وہ کسی کے حق میں خیر نہیں۔ نہ میزبانوں کے لیے اور نہ مہمانوں کے لیے۔

حجاج کرام جس طرح سعودی حکومت کی خدمات کی تعریف کرتے ہیں اسی طرح ان چیزوں سے شاکی رہتے ہیں اور ایسے شکووں کے فوری ازالے میں ہی سب کی بہتری ہے۔

چھتریوں کے سائے تلے

جو حضرات پی آئی اے سے جدہ جاتے ہیں ان کی پرواز یمن والوں کی میقات ''یلملم'' کی متوازی فضا سے گزرتے وقت آتی ہے۔ (میقات کی تشریح، اس کی تین اقسام کا بیان اور اسلام کا یہ عظیم نظام اور انفرادی اعزاز ''تین دائرے'' نامی مضمون میں پہلے آ چکا ہے۔ بعد میں خیال آیا کہ اس مضمون کا نام ''تین منطقے'' ہونا چاہیے تھا) جو لوگ سعودی ایئر لائن سے جاتے ہیں تو وہ چونکہ آبنائے ہرمز اور پھر امارات سے ہوتے ہوئے دمام جاتی ہے پھر وہاں سے نجد کے علاقے پر سے گزرتے ہوئے جدہ پہنچتی ہے اس لیے ان کے راستے میں نجد والوں کی میقات ''قرن المنازل'' آتی ہے۔ میقات کے قریب آنے کا اعلان اونگھتے سوتے جہاز میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتا ہے۔

یہ لہر زائرین پر بجلی کے کرنٹ کی طرح اثر کرتی ہے اور دم بھر میں سب حاجی فضا سے بھی آگے کسی اور جہاں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ایسا جہاں جس میں بندے اور معبود کے درمیان فاصلے ختم ہو جاتے ہیں اور لبیک کا ترانہ بے اختیار زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے جہاز آگے بڑھتا ہے، لبیک کے ورد میں سرور اور وجد کی آمیزش بڑھتی جاتی ہے اور سرزمین مقدس کے قریب آ پہنچنے کا سرور انگیز اور روح افزا احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔

جہاز کے دروازے سے نکلتے ہی حجاز کی خوشگوار ہوا حاجی کا استقبال کرتی ہے۔ اس ہوا میں نجانے کتنی مقدس ہستیوں کے انفاس قدسیہ کی برکات رچی بسی ہیں۔ ہوا کے دوش پر سوار محبت وعقیدت کے سندیسے حاجی کا منہ چومتے محسوس ہوتے ہیں۔ بعض حجاج زمین پر قدم رکھتے ہی سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ تک رسائی کا شکرانہ اس سے بہتر اور کس انداز میں ادا ہو سکتا ہے؟ اس درویشانہ سجدے سے جو لطف آتا ہے بیان سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مہربانی اور خاص فضل ہے کہ مسلمان کائنات میں جس جگہ ہو، اسے سجدہ کی اجازت ہے۔ بنی اسرائیل کی طرح پابندی نہیں کہ صرف عبادت کے لیے مخصوص جگہوں میں عبادت ہوگی لہٰذا انسان زمین پر ہو یا فضا میں، سمندر میں ہو یا خلا میں جہاں چاہے، بس سر جھکائے اور رب کے قدموں میں سجدہ ریز ہونے کا مزہ لوٹے۔

ہمارے ایک دوست بیرون ملکوں کا سفر کرتے رہتے تھے، ان کو ایسی جگہوں پر اذان و اقامت کہنے اور نماز پڑھنے میں خاص لطف آتا تھا جہاں قرائن سے یوں معلوم ہوتا کہ یہاں آج تک پاک پروردگار کو پوجا نہیں گیا۔ ان کا کہنا تھا روزِ قیامت یہ جگہ میرے حق میں گواہی دے گی تو کیوں نہ یہاں اپنے حق میں گواہی ثبت کروا لوں۔

ایئرپورٹ کی عمارت کے باہر صحن میں بلند و بالا دیوہیکل چھتریاں نصب ہیں جن کے سائے تلے مختلف ممالک سے آنے والوں کے لیے الگ الگ انتظار گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں قسماقسم کے لوگ، طرح طرح کی بولیاں اور عجیب عجیب لباس (بعض حاجی اس وقت احرام میں نہیں ہوتے) دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کلمے کے رشتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے دامن سے وابستگی نے سب کو ایک لڑی میں پرویا ہوا ہوتا ہے اور ان کو باہم اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ ان چھتریوں تلے زوردار ہوا چلتی ہے اور احرام میں ملبوس حجاج کو ٹھنڈ بھی لگتی ہے مگر وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ حجازِ مقدس کی ہوا بڑی قسمت سے نصیب ہوئی ہے لہٰذا جی بھر کے مزے لوٹو۔

انتظار بسیار کے بعد جب یہ خبر ملتی ہے کہ مکہ مکرمہ جانے کے لیے بس آگئی ہے تو وہ لمحہ نہایت مسرت افزا اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ اس اطلاع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دیدار کے جس لمحے کی طلب میں گھر سے نکلے تھے، وہ قریب آپہنچا ہے اور قسمت نے یاوری کی تو زندگی کا وہ خوش نصیب لمحہ بھی جلد آجائے گا جب بلد الحرام میں داخل ہوں گے اور بیت اللہ کی دید سے پیاسی نگاہوں کو ٹھنڈک ملے گی۔

''مکتب نمبر ٹونٹی تھری، کرسی بیٹو (کرسی پر بیٹھو)، پاسپورٹ کدھر۔'' یہ چار پانچ لفظ تھے جو ہمارے معلّم کے کارندے نے یاد کیے ہوئے تھے۔ خیر ''کرسی بیٹنے'' (کرسی پر بیٹھنے) کے تھوڑی دیر بعد پاسپورٹ ہاتھ میں لے کر لائن بنانے کا حکم ہوا۔ حاجی صاحبان پاسپورٹ لے کر جب دروازے کے قریب پہنچے تو وہ ان سے وصول کر کے جمع کر لیا جاتا اور بس میں سوار ہونے کا اشارہ ملتا۔

......''کیوں بھئی! پاسپورٹ ہم سے کیوں لیے جارہے ہیں؟'' ایک نو وارد حاجی صاحب پاسپورٹ رکھ لیے جانے سے کچھ اکھڑا سا جاتا ہے۔

......''بس اب تو یہ وطن واپسی کے وقت ہی ملیں گے۔'' ایک واقف کار حاجی صاحب جواب دیتے ہیں۔

......''کیا مطلب! ہماری لگام کوئی اور تھام کر ہمیں ہنکائے گا۔ یہ بات تو وحشت ناک معلوم ہوتی ہے۔ آخر ہمیں اس طرح بے دست و پا کرنے کا مطلب کیا ہے؟''

حاجی صاحب پاسپورٹ لے لیے جانے سے کچھ حواس باختہ سے تھے جیسے ان سے شناخت چھین لی گئی ہو یا ان کی شناخت پاسپورٹ کے طوطے میں بند کر کے یہ پنجرہ معلّم کے پاس رکھوا دیا گیا ہو۔ ویسے معلّم کا یہ پنجرہ نہایت مضبوط ہے اور حاجی کو ہر لمحے احساس دلاتا رہتا ہے کہ آپ کسی کی نگرانی میں ہیں۔

گاڑی میں سوار ہونے اور گنتی کیے جانے کے عمل سے گزرتے گزرتے مغرب کی نماز کا وقت قریب ہو جاتا ہے۔ کچھ حجاج بس سے اُتر پڑتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ظہر سے اس وقت تک یہاں انتظار کیا تو تین چار منٹ میں سورج ڈوب جائے گا تب نماز پڑھ کر یہاں سے روانہ ہوں گے کیونکہ راستے میں بس نہ رکے گی اور مغرب کا وقت نکل جائے گا۔ بس کے مصری ڈرائیور سے بات کی تو اس نے معلّم کے کارندے کی طرف اشارہ کیا کہ ان سے منظوری لو۔ اس کے پاس پہنچے تو اس کا کہنا تھا کہ آپ بس میں اشارے سے نماز پڑھ لیں یا مکہ مکرمہ پہنچ کر جمع بین الصلوٰتین کر لیں۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ جب ہم مغرب کے اصل وقت میں رکوع وسجدے کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں تو پھر بس میں اشارے سے کیوں پڑھیں؟ ایسا تو غیر مسلم ملکوں میں بھی نہیں ہوتا۔'' ایک حاجی تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ بحث سن کر معلّم کا سینئر ایجنٹ ٹہلتا ہوا آپہنچتا ہے اور سارا ماجرا سن کر کہتا ہے: **"الدین یسر ولیس بعسر"** ''دین

میں آسانی ہے تنگی نہیں۔''

''ہم نے اس بحث میں تین چار منٹ لگادیے ہیں۔ اگر دو منٹ اور ٹھہر کر یہیں بس کے قریب نماز پڑھ لیں تو کون سی تنگی لازم آجائے گی؟''

پاکستانی قافلے کا ایک عالم معلّم کو عربی میں یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر ساری بحث بے سود۔ معلّم کا کارندہ اپنی بات پر ڈٹا رہتا ہے۔ ان حضرات کے مزاج میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ توحید اور شریعت پر ہم قائم ہیں بقیہ دنیا (یعنی مسلم دنیا) شرک اور جہالت میں مبتلا ہے۔ ان کو ہماری تحقیق پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ مزاج اچھا نہیں، اس سے خود پسندی کی بُو آتی ہے۔

جدہ سے روانہ ہوں تو راستے میں حدیبیہ کا گاؤں اور کنواں آتا ہے۔ یہ گاؤں آدھا حرم میں ہے اور آدھا اس سے باہر۔ یہ وہی تاریخی مقام ہے جہاں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انوکھے اور غیر متوقع طرزِ عمل سے امت کو ایک خاص سبق دیا تھا مگر اس کو اتنے مختلف معانی پہنائے جاتے ہیں کہ اصل بات اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔

متبادل کی تلاش

جب آدمی حج کے لیے روانہ ہوتا ہے اور سلے ہوئے کپڑوں کی جگہ دو بے سلی چادریں پہن لیتا ہے تو یہ فقیرانہ لباس...... جسے پہن کر بالآخر ہر مسلمان کو سفرِ آخرت پر روانہ ہونا ہے...... پہنتے ہی ایک ہلکا پن، ایک عجیب طرح کی آزادی اور بے نام سی بے فکری کا احساس انسان کے دل کی گہرائیوں میں جنم لیتا اور رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ سال گزشتہ جب جدہ ایئرپورٹ سے روانہ ہو کر ہمارا قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا تو شہر مقدس میں داخلہ سے پہلے حجاج کے لیے بنائے گئے ایک مرکز میں پہنچے جہاں کچھ اندراجات وغیرہ اور ضابطے کی کارروائی ہونی تھی۔ یہیں عشا کی نماز کا وقت بھی ہو گیا۔ حجاج جو چپلیں پہنتے ہیں وہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہوتی ہیں اس لیے جماعت کے بعد جب نمازیوں کا ریلہ نکلتا ہے تو چپلیں عموماً تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اب وہاں کا عُرف (رواجِ عام) یہ ہے کہ آخر میں نکلنے والے نمازی بچی کھچی چپلیں پہن کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ یہ چپل اتنی کم قیمت اور بے حیثیت ہوتی ہیں کہ ہر کوئی اس تبادلے پر ہنسی خوشی راضی ہوتا ہے اور مڑ کر سوچتا بھی نہیں۔ بندہ کو اس عُرف کا پتا نہ تھا اور اس پر دل آمادہ نہ ہوا کہ ایسی چپل پہن لوں جس کے متعلق علم ہے کہ اپنی نہیں، اس لیے مسجد کے نرم گرم قالین سے اتر کر ڈامر کی نئی نویلی سڑک پر چل پڑا...... اب صورت حال یہ تھی کہ سر تو پہلے سے ننگا تھا، اب پاؤں میں بھی کچھ نہ رہا تھا، سامان وغیرہ بریف کیس میں تھا اور جسم پر دو چادروں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اجنبیت اور پریشانی سی محسوس ہوئی کہ اتنے میں وادی بطحا کی طرف سے چلنے والی خوشگوار اور جانفزا ہوا کے جھونکے آئے۔ ان جھونکوں کا جسم سے ٹکرانا تھا کہ ایک نشہ سا پورے جسم پر چھا گیا اور ایسی سحر آفریں سرشاری کی کیفیت طاری ہوئی کہ نہ پوچھیے! زندگی بھر بھلائی نہ جاسکے گی۔ غمِ دنیا، غمِ جاں اور غمِ جہاں سے ایسی آزادی، بے فکری اور بے نیازی پہلے تو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی، آیندہ خدا جانے ایسے لمحے پھر قسمت میں ہیں یا نہیں؟

حج تربیت کے دوران معلّم حضرات کی طرف سے جوتوں کو محفوظ رکھنے کے مختلف طریقے بتلائے جاتے ہیں۔ مثلاً: یہ کہ ایک مخصوص قسم کی تھیلی میں جوتے رکھ لیے جائیں۔ کچھ دکان دار حضرات احرام کی چادریں خریدنے پر جوتوں کی تھیلی اور طواف کی تسبیح مفت پیش کرتے ہیں...... لیکن اس تھیلی میں یہ مشکل ہوتی ہے کہ جب باہر نکل کر جوتے پہن لیے جائیں تو اس تھیلی کو کہاں نمٹایا جائے؟ بعض نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ پلاسٹک کی عام تھیلی میں چپل کو جگہ دی جائے اور جب چپل تھیلی سے برآمد ہو کر اپنی جگہ پہنچ جائے تو تھیلی کو جیب میں جگہ دے دی جائے۔ اس میں بھی کبھی یہ مشکل ہوتی ہے کہ چپل گیلی ہو تو تھیلی ناپاک ہو جاتی ہے اسے کہاں لیے پھریں گے؟ چپل انسان کو سردی گرمی، کنکر کانٹے، گندگی اور موذی چیزوں سے بچاتی ہے مگر استعمال کے بعد اسے بچانا مسئلہ بنا ہوا تھا۔

آخر اس کا حل ''اباحتِ عام'' (استعمال کی عام اجازت) کی شکل میں نکالا گیا کہ جب حرم شریف میں داخل ہونے لگیں تو پاؤں کی چپل اُتار کر قریب پڑے ڈھیر میں شامل کر دیں اور واپسی کے وقت اسی ڈھیر میں سے حسبِ ضرورت وحسبِ موقع

چپل لے کر پاؤں کو اس میں داخل کر دیں۔ چونکہ اس ڈھیر میں چپل ڈالنے والا ہر شخص یہ نیت کر لیتا ہے کہ اسے جو چاہے استعمال کرے، میری طرف سے اجازت ہے، اس لیے اس میں سے ہر شخص جب چاہے استعمال کے لیے ایک جوڑی بلا تکلف لے سکتا ہے۔ ایسے موج کہاں ہوں گے؟

حج کے سفر میں چپل پر ہی کیا موقوف، اور بھی جتنی مشکلیں ہوتی ہیں حاجی صاحبان نے ماشاء اللہ اس کے طرح طرح کے حل نکال رکھے ہیں۔ مثلاً: طواف کی تسبیح جس میں طواف کے سات دانے ہوتے ہیں عموماً گم ہو جاتی ہے یا طواف کے دوران گر جاتی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی اسے اُٹھانے کے لیے جھکے تو پتا ہی نہ چلا کہاں گئے؟ تھوڑی دیر بعد ذرا آگے جا کر ریلے میں سے برآمد ہوتے دکھائی دیے......

وہ تو خیر گزری کہ گرے نہیں ورنہ جنت المعلیٰ (مکہ مکرمہ کے قبرستان) سے پہلے ان کی خبر ہی نہ ملتی۔ خیر یہ بھی خوش نصیبی ہی ہے، ہر ایک کے نصیب میں کہاں؟ یہ ساتھی ہجوم میں سے بخیر و عافیت تو نکل آئے لیکن اب پریشانی یہ تھی کہ پچھلے چکر نہیں یاد تھے اور چونکہ بھلکڑ بہت تھے اس لیے اس بات پر پریشان تھے کہ بقیہ چکر بغیر تسبیح کے کیسے گنیں گے؟ قریب ہی ایک صاحب موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ طوافوں کا تو کوئی حل نہیں ہو سکتا البتہ آیندہ کی آسان ترکیب یہ ہے کہ ہر طواف پر گریبان کا ایک بٹن کھولتے جاؤ اور جب سارے بند بٹن کھل جائیں تو انہیں بند کرنا شروع کر دو۔ اس ''کھل بند'' میں بھول چوک کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ دیکھا آپ نے! کتنا آسان حل تلاش کر لیا گیا ہے۔

آج کل چونکہ سردی کے موسم میں حج کے دن آتے ہیں اس لیے جن زائرین کے کاغذات مکمل نہیں ہوتے اور انہیں کہیں رہائش دستیاب نہیں ہوتی وہ حرم شریف کے باہر تعمیر شدہ تین منزلہ ''دورات المیاہ'' (اس لفظ کا مطلب کسی حاجی سے پوچھ لیجیے، اور اگر آپ اشارے کی زبان سمجھتے ہیں تو اسی مضمون میں تلاش کر لیجیے) کی خوبصورت سیڑھیوں اور کھلی راہداریوں میں ٹھکانا لگا لیتے ہیں، گرما گرم فضا میں مفت رہائش کے علاوہ انہیں یہ سہولت بھی حاصل ہوتی ہے کہ جس چیز کے لیے دوسروں کو باقاعدہ قطار بنا کر انتظار کرنا پڑتا ہے وہ انہیں کروٹ بدلتے ہی سامنے چند قدموں پر دستیاب ہوتی ہے۔

ان حضرات نے چٹائی یا کاٹن کے گتے بچھا کر آرام دہ بستر لگایا ہوتا ہے اور بعض خوش مزاج تو موبائل بھی وہیں لگے ساکٹ سے چارج کر کے دنیا بھر سے مصروف گفتگو رہتے ہیں۔ یہ حاجی صاحبان جب منیٰ جاتے ہیں تو چونکہ کسی خیمے میں جگہ متعین نہیں ہوتی اس لیے چھوٹے چھوٹے موبائل خیمے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان ایگلو ٹائپ خیموں میں جو بید کی چار ڈنڈیوں کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں، دو ڈھائی بندے آسانی سے گھس سکتے ہیں۔ جن کے پاس یہ خیمے بھی نہ ہوں وہ منیٰ کے مرکزی شیڈ کے نیچے (جو مرکزی راستہ پر بنا ہوا ہے) جگہ بنا لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ مرکزی راستہ کھلے کیمپ میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ آخری دنوں میں راستے کی جگہ پگڈنڈی سی رہ جاتی ہے۔ ان حضرات کی رہائش کا مسئلہ تو یوں حل ہو جاتا ہے جہاں تک بات خوراک کی ہے تو زمزم پیتے اور ''وجبہ'' کھاتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔ ''وجبہ'' اس لنچ بکس کو کہتے ہیں جو سرکاری طور پر حجاج کو مفت ملتا ہے۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ قضائے حاجت کا رہ جاتا ہے۔ اس نوع کے حاجی صاحبان ضرورت طبعی کے لیے بلا تکلف اس حد بندی میں داخل ہو جاتے ہیں جو مختلف گروپوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ ایسے میں ان کی کامیابی اس پر موقوف ہوتی ہے کہ چہرے پر حاجت پورا کرنے کی عاجزی کے بجائے کیمپ کے اصل رہائشیوں کی طرح خود اعتمادی اور بے نیازی کا تاثر قائم رکھیں۔ بات متبادل کی ہو رہی تھی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ مرد و خواتین حاجی حضرات نے کئی مشکلوں کا دلچسپ حل تلاش کیا ہوا ہے۔ ایسے ایسے ٹوٹکے اور گُر کی باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ جمع کریں تو تگڑے حجم کا کتابچہ بن جائے۔ ان میں سے چند ایک آپ اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں گے، ان شاء اللہ۔

مشکلے نیست کہ آسان نشود:

لیکن ایک چیز ایسی ہے جو بہت تکلیف دہ ہے۔ اس کا متبادل آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے لیکن اس طرف شاید کسی کی توجہ نہیں گئی۔ وہ یہ ہے کہ چھوٹے تقاضے کے لیے بھی ''دورات المیاہ'' کے باہر لمبی قطار لگتی ہے چونکہ سردی کے موسم اور کمزور طبیعتوں کے سبب اس کی ضرورت بار بار پڑتی ہے اور رش کی وجہ سے خاصا وقت قطار میں کھڑے رہنا پڑتا ہے اس لیے ٹھیک ٹھاک بندے کا مثانہ بھی جلن برداشت کرتے کرتے ضعف کا شکار ہو سکتا ہے۔ منیٰ اور عرفات میں چونکہ سارا مجمع ایک وقت میں ایک جگہ اکٹھا ہوتا ہے تو یہ مسئلہ اور بھی گھمبیر ہو جاتا ہے۔ مزدلفہ میں تو بیت الخلا ویسے بھی کم ہیں، وہاں مجبور ہو کر بعض لوگ منرل واٹر کی خالی بوتلوں میں قضائے حاجت کرتے ہیں یا پھر پتھر کی اوٹ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

پہلی صورت میں چھینٹے پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے دوسری صورت میں میدان میں گندگی اور بوُ پھیلنے کا خدشہ ہے۔ یہ مسئلہ واپسی کے دن تک جب حجاج کا رش ٹوٹنا شروع ہوتا ہے، پریشان کرتا رہتا ہے جبکہ اس کا حل بہت آسان ہے کہ جس طرح مریض کو پیشاب کی تھیلی لگا دی جاتی ہے اس سے ملتی جلتی نلکی لگی ڈسپوزل تھیلی بنا کر مارکیٹ میں پھیلا دی جائے۔ اس کی بناوٹ اور پیکنگ ایسی ہو کہ قضائے حاجت کے بعد ڈبے میں پھینک دیا جائے تو بدبو نہ پھیلے۔ اگر کوئی کمپنی ایسی کوئی چیز تیار کر دے تو سیزن کے دنوں میں بیت الخلا کے باہر بننے والی یہ قطاریں آدھی رہ جائیں گی کیونکہ کم از کم چھوٹے تقاضے کے لیے انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

بعض زندہ دل لوگ اپنی جگہ کسی دوسرے کو قطار میں کھڑا کر دیتے ہیں اور جب وہ منزل مطلوب کے قریب پہنچ جاتا ہے تو موبائل پر گھنٹی مار کر اصل امیدوار کو بلا لیتا ہے۔ موبائل کا یہ استعمال کافی دلچسپ اور راحت افزا ہے لیکن ''ایکسٹرنل کیتھیڑ'' (یہ اسی طرح کی ایک تھیلی ہے جو ڈاکٹر حضرات ضرورت کے وقت تجویز کرتے ہیں) ٹائپ کی ایسی تھیلی بنالی جائے جو استعمال میں آسان ہو تو خود ''دورات المیاہ'' ہی موبائل ہو جائیں گے۔ سعودی حکومت کو کئی سال تک نئے بیت الخلا بنانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی اور زائرین کا دیرینہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

کرنے کا کام

یہ حج کے دنوں کا واقعہ ہے۔ صفا مروہ کے درمیان سعی کے دوران آتے جاتے دیکھا ایک بابا جی کافی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت تھکے تھکے، مضمحل، اداس اور شکستہ دل۔ جب کافی دیر اسی حالت میں گزر گئی تو رہا نہ گیا۔ شکل وصورت سے معلوم ہوتا تھا کہ پاکستانی ہیں اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ قریب جا کر پوچھا:

''چاچا! السلام علیکم! خیر تو ہے؟''

''وعلیکم السلام پتر! خیرای خیر اے۔''

چاچا ٹھیٹھ پنجابی بولتے تھے۔ اصل مزا تو ان کے اپنے الفاظ میں ہے لیکن یہاں اردو میں ہی ترجمانی پر اکتفا کیجیے۔

پوچھا:

''کچھ پریشان پریشان لگتے ہیں؟''

''بس پتر! نہ پچھ! اتھے تے کوئی ہورای مخلوق اے۔''

(بس بیٹا نہ پوچھو! یہاں تو کوئی اور ہی مخلوق ہے)

''کیوں چاچا! کیا ہوا؟''

''پتر میں گھیو پیتا اے گھیو۔''

(بیٹا میں نے جوانی میں گھی پیا ہے گھی)

''تو ٹھیک ہے چاچا اللہ خیر کرے گا لیکن اب کیا مسئلہ ہے؟''

آگے کی گفتگو ذرا لمبی ہے اور پنجابی سے ہمارا تعلق کافی کمزور اور سطحی سا ہے اس لیے اردو میں ہی خلاصہ سنیے:

''بیٹا میں صبح آیا تو یہ سارے لوگ یہاں چل رہے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا سعی یہاں کرنی ہے۔ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ میں میلوں میل پیدل چلتا رہا ہوں اور اب بھی چل سکتا ہوں۔ میں چلتا رہا چلتا رہا یہاں تک کہ ظہر کی اذان ہو گئی۔ نماز پڑھ کر دیکھا کہ لوگوں نے پھر چلنا شروع کر دیا ہے۔ میں حیران ہوا، عجیب لوگ ہیں تھکتے بھی نہیں۔ میں نے بھی چلنا شروع کر دیا۔ عصر ہوئی، اب یہ پھر چل رہے ہیں۔ میرا تو دم ختم ہو گیا ہے۔ نجانے یہ کیسی مخلوق ہے اور کب تک چلتی رہے گی؟''

''چاچا! یہ تو چودہ سو سال سے چل رہے ہیں اور قیامت تک چلتے رہیں گے، آپ گھی تو کیا یورینیم ملا ہوا کوئی محلول پی لو، تو بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔''

''یورینیم کی ہوندا اے؟''

''چھڈو جی! آؤ تساں کو تواڈی جاتے پہنچا آواں۔''

چاچا کو سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ اس کی سعی ہوگئی ہے۔ اب اس کو اس کی رہائش گاہ تک پہنچا آتے ہیں...... لیکن قارئین کرام! بات یہ ہے کہ حج چونکہ عمر بھر میں ایک مرتبہ کرنے کا موقع ملتا ہے اس لیے خوب اچھی طرح سیکھ کر کرنا چاہیے۔ مشہور یہودی دانشور لارڈ میکالے کے وضع کردہ نظام تعلیم نے جو اصل غضب ڈھایا وہ یہ کہ برصغیر کے پڑھے لکھے مسلمان بھی اسلام کے بنیادی احکام سے واقف نہیں ہوتے۔ اسلامی سلطنتوں کے سقوط سے پہلے مسلم معاشروں میں یہ رواج ہوتا تھا کہ اسلامی احکام کا خلاصہ (جسے عرفِ عام میں ''فقہ'' کہا جاتا ہے) طہارت سے لے کر میراث کی تقسیم تک (دوسرے لفظوں میں پیدائش سے موت تک) ہر خواندہ انسان کم از کم ایک مرتبہ پڑھ ہی لیا کرتا تھا یا نظر سے گزار لیتا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے ایم اے اسلامیات یا پی ایچ ڈی کیے ہوئے حضرات بھی احکامِ شریعت سے واقف نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے پہلی تا میٹرک اور میٹرک تا ایم اے کی اسلامیات میں عبادات یا معاملات کے احکام نہیں ہوتے، عبادات کا فلسفہ یا فوائد ہوتے ہیں لہٰذا آدمی پڑھ لکھ کر بھی وہیں کا وہیں رہتا ہے۔

پھر شریعت کا حکم ہے کہ جو کام کیا جائے، شروع کرنے سے پہلے اس کے متعلق لازمی شرعی ہدایات معلوم کر لی جائیں۔ مثلاً: ایک انسان کاروبار شروع کرتا ہے تو اسے خرید و فروخت کے بنیادی مسائل سے خود کو واقف کرنا چاہیے۔ شادی کرتا ہے تو یہ معلوم کر لینا چاہیے نکاح کن چیزوں سے منعقد ہوتا ہے اور کن وجوہ کی بنا پر فسخ ہو جاتا ہے؟ میاں بیوی کے ایک دوسرے پر کیا حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ...... لیکن ہمارے ہاں اس کا بھی رواج نہیں۔ باپ بیٹے کو دکان پر بٹھاتا ہے یا کاروبار کرا کے دیتا ہے تو اسے تجارت کے اسرار و رموز تو بتاتا ہے لیکن حلال و حرام کا فرق نہیں سمجھاتا، اس لیے کہ اس کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ماں باپ، بیٹی کو گھر سے رخصت کرتے وقت دنیا جہاں کی نصیحتیں کرتے ہیں لیکن شریعت نے ازدواجی زندگی کے جو سنہرے اصول بتائے ہیں ان کا کوئی تذکرہ، ان کی نصیحتوں میں نہیں ہوتا اور اس لیے نہیں ہوتا کہ ان کی اپنی زندگی ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گزر چکی ہوتی ہے۔

بات دور چلی گئی۔ حج کے دوران ناواقفیت کی بنا پر کی جانے والی غلطیوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ ایک صاحب بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ آج انہوں نے اتنی مرتبہ حجرِ اسود کا بوسہ لیا اور آج اتنی مرتبہ۔ وہ اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے تھے آپ لوگ اتنے محروم اور کم ہمت کیوں ہیں کہ اب تک مشکل سے ایک آدھ مرتبہ ہی بوسہ لے سکے ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے حجرِ اسود تک پہنچ جاتے ہیں تو انہوں نے بتایا وہ حجرِ اسود تک تو نہیں پہنچ سکے البتہ اس ''شیشے'' کو روز چوم لیتے ہیں جس میں ''حجرِ اسود'' بند ہے۔ ایک اور صاحب شکوہ کر رہے تھے لال رومال والے رضا کار عجیب ہیں میں جب بھی حجرِ اسود کا بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہوں وہ منع کرتے ہیں یہ بدعت ہے، سنت سے ثابت نہیں۔ یہ صاحب بھی شیشے کے خول میں بند ''مقام ابراہیم'' کو حجرِ اسود سمجھے ہوئے تھے۔ ایک اور صاحب کا واقعہ تو بہت ہی المناک ہے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے بیان کیا میں آج حرم شریف گیا تو رش نہ تھا۔ بس لال سفید رومال والے مقامی عرب بہت سارے تھے۔ امام صاحب نے خطبہ پڑھایا، نماز پڑھائی، پھر لوگ چھٹے تو مجھے موقع مل گیا حجرِ اسود کے قریب جانے کا...... رج کر بوسے لیے، دل ٹھنڈا کیا...... اب کوئی ارمان نہیں۔ یہ قابلِ رحم صاحب حج کے دنوں میں منیٰ و عرفات جانے کے بجائے مکہ مکرمہ ہی میں رہ گئے تھے اور وقوفِ

عرفہ بھی ان سے چھوٹ چکا تھا مگر وہ ناواقفیت کی بنا پر اپنے حال میں مست شاداں وفرحاں تھے۔

اس طرح کے دل دکھانے والے واقعات جمع کیے جائیں تو پوری کتاب بن جائے مگر کرنے کا کام یہ ہے کہ حاجی حضرات کو مناسکِ حج سکھا کر، تربیت دے کر بھیجا جائے تاکہ ان کے ''مقبول ومبرور حج'' کی وجہ سے ساری امت کی مشکلات دور ہوں اور ہمیں بھی اس خیر وبرکت میں سے کچھ حصہ مل سکے جو حرمین شریفین میں حاضری دینے والوں کے لیے رب تعالیٰ نے مقدر فرمایا ہے۔

سبق پھر پڑھ......

حج کا موسم قریب آ گیا ہے۔ دنیا بھر سے فرزندانِ اسلام حسبِ توقع وحسبِ معمول اس سال بھی دیوانہ وار بیت اللہ حاضری اور مدینہ شریف سلامی کے لیے پہنچیں گے۔ عالمِ اسلام کا وجود زخمی زخمی، دل دکھی دکھی، آنکھوں میں ادھورے خواب اور سوچوں میں تشنہ حسرتیں ہیں...... اپنوں کی بے وفائی، غیروں کی جفا کاری، زمانے کی سختیاں، حالات کی نیرنگیاں کیا نہیں جس نے ہمارا وجود تار تار اور دامن لیرالیرا نہیں کر رکھا؟

اللہ کی حدود محفوظ نہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس مبارک کا تحفظ نہیں۔ فلسطین کے تازہ زخموں کی کسک ابھی ختم نہیں ہوئی ہوتی کہ کشمیر کی جانب سے دلدوز صدائیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور ابھی کشمیر کے مستقبل پر چھائے تاریک بادلوں کے ورے سے اُمید کی کوئی کرن پھوٹنے نہیں پاتی کہ وطن عزیز میں کوئی نیا فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ کسی نئے شوشے کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔

پھر ساری آزمائشوں اور خونخوار فتنوں سے بڑھ کر سوالیوں کا ایک المیہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے تقریباً پچاس ساٹھ لاکھ افراد حرمین حاضری دیں گے مگر میرے ان سادہ لوح بھائیوں کو خبر نہیں کہ حرمین کے اردگرد طاغوتی طاقتوں کی کتنی بڑی قوت جمع ہو چکی ہے اور اگر مجاہدین کی بے مثال جانبازی نہ ہوتی تو خدا جانے ہمیں کیا دن دیکھنا پڑتے۔

ارضِ حرمین کے گرد موجود یہودی وعیسائی افواج کے مراکز پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ طاغوتی حصار کتنا مضبوط اور کس قدر مکمل ہے مگر اللہ پاک نے فدائی جانبازوں کے ذریعے اس کا زور توڑ رکھا ہے۔ بعض دانش وروں کا کہنا ہے کہ خلیج کا تیل اور بحیرۂ عرب کا پانی صرف عربوں کا ہے، ہم اس کی فکر میں کیوں گھلیں...... مگر یہ فوجیں صرف ان پر قبضے کے لیے تو نہیں آئیں، یہ تو معاذ اللہ حرمین کے گرد حصار تنگ کر کے عظیم تر اسرائیل کا قیام اور ارضِ حرم کے خلاف دجالی منصوبے کی تکمیل چاہتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پریشانیوں، صدموں، اداسیوں اور غموں کے اس موسم میں دکھوں کے مارے کلمہ گو برادرانِ اسلام کے لیے بیت اللہ کی حاضری اور روضۂ اقدس پر سلامی دکھوں کا مداوا بھی ہے اور درد کا علاج بھی...... لہٰذا اس موقع پر خوفناک اسلحے اور فوجوں کے اعداد و شمار سے بھرپور نقشوں کے بجائے تربیت حج کا نقشہ ہونا چاہیے مگر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو شوقِ زیارت کے ساتھ ذوقِ شہادت سے بھی آراستہ ہونا چاہیے لہٰذا اس مرتبہ اسی جنگی نقشے پر اکتفا کیجیے۔

دو سال قبل اس عاجز کو بھی اللہ ربّ العزت نے حاضری کی دولت سے نوازا تھا۔ اس دوران حبشہ کے دو حاجیوں سے ملاقات ہوئی۔ بندہ نے محسوس کیا کہ حبشہ کے لوگ بنسبت دوسرے کالے بھائیوں کے نرم مزاج اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اللہ نے ان کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پہلی میزبانی کے لیے چنا۔ ان سے گپ شپ ہوئی تو انہوں نے حسرت کا اظہار کیا کہ اگر ہم انصار مدینہ کی طرح ہمت دکھاتے اور ایثار و وفا کا مظاہرہ کرتے تو آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ہوتے۔

بندہ نے عرض کیا لیکن پھر ہم جیسے ناتواں بحر احمر پار کر کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو کیسے جاتے؟ ہر کام میں اللہ کی حکمت ہوتی ہے۔

آج کے مسلمانوں کو انصاری صحابہ جیسے ایمان و عزم اور غیرت و وفا کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جب ایک مرتبہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر زبان دے دی کہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے تو پھر گھر بار لٹا دیا، بیوی بچے کٹوا دیے مگر اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹے۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ''انصار جیسی جانی قربانی کسی نے نہیں دی۔ انہوں نے تین مرتبہ اپنے منتخب جوان ستر ستر کی تعداد میں شہید کروائے۔ پہلے غزوۂ اُحد میں، پھر بئر معونہ کے واقعہ میں اور پھر جنگ یمامہ میں۔'' بندہ عرض کرتا ہے کہ تاریخ عالم میں اپنا قول و قرار نبھانے کے لیے جتنی آزمائشوں سے انصار صحابہ کو گزرنا پڑا اتنا کسی کی آزمائش نہیں ہوئی لیکن آفرین ہے کہ انہوں نے جو عہد وفا باندھا تھا اسے ہر حال میں پورا کر دکھایا۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی وفا کا وہ بدلہ دیا جو شایانِ شان تھا۔ آپ نے فتح مکہ کے بعد اپنے آبائی وطن میں رہنے کے بجائے انصار کے ساتھ رہنے اور وہیں جینے مرنے کو ترجیح دی۔ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا کا سودا کرتا ہے اسے کبھی گھاٹے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ حرمین کے زائرین کو وہاں سے یہ سبق تازہ کر کے لوٹنا چاہیے۔

دوسرا باب

انوکھی مثال

قرآن شریف میں ایک جگہ ایک ''تکوینی حقیقت'' بیان کی گئی ہے اور اگر تاریخ انسانی کا مطالعہ یا گردوپیش پر غور کیا جائے تو یہ ''حقیقت'' روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ ''قرآنِ حقیقت بیان'' کے معجزانہ الفاظ اس موقع پر یہ ہیں: ''پس جھاگ تو یونہی اُڑ جاتا ہے اور لوگوں کو فائدہ دینے والی چیز زمین پر باقی رہتی ہے۔''

ضربِ مؤمن کے مایہ ناز کالم نگار جناب یاسر محمد خان کی تحقیق کے مطابق اس وقت دنیا میں 921 نظام تعلیم چل رہے ہیں۔ ان میں سرکاری بھی ہیں اور غیر سرکاری بھی۔ وہ بھی ہیں جنہیں اقوامِ متحدہ جیسے عالمی ادارے یا کروڑوں کا بجٹ رکھنے والی این جی اوز چلا رہی ہیں اور وہ بھی ہیں جن کے پیچھے دنیا کے ترقی یافتہ ترین ممالک کے بے تحاشا وسائل ہیں یا عالمی طاقتوں کی پشت پناہی انہیں حاصل ہے...... لیکن ان میں سے ایک بھی نظام ایسا نہیں جس پر بددیانتی، بدعنوانی یا غلط بیانی وفریب دہی کا الزام نہ ہو۔ اس کے برعکس وفاق دنیا کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جو کسی حکومت یا عالمی ادارے سے امداد نہیں لیتا، اس کے پیچھے کوئی منظم طاقت ہے نہ اسے مستقل وسائل کا سہارا حاصل ہے لیکن پھر بھی اسے چند صاحبانِ عزیمت، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرتے ہوئے اس خوبی اور سلیقے کے ساتھ چلا رہے ہیں کہ یہ ادارہ دیانت داری اور نظم وضبط میں اپنی مثال آپ ہے۔ دوسرے تعلیمی نظاموں کو اپنے اپنے ممالک یا حکومتوں کی طرف سے مکمل سرپرستی، حمایت اور حوصلہ افزائی اور طرح طرح کی قانونی وسماجی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن یہاں عالم یہ ہے کہ اپنے بھی خفا ہیں اور بیگانے بھی ناخوش، غیروں کی جفا کاری بھی پورے زوروں پر ہے اور اپنوں کی بے اعتنائی بھی، لیکن چند مردانِ خدامست وخدا آگاہ ہیں کہ ساری دنیا کی مخالفت، اعتراضات اور طعنوں کی بوچھاڑ کو سہتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک میں ایسا کوئی ادارہ نہیں جس کی ملک بھر میں اتنی کثیر تعداد میں شاخیں ہوں، ان سب شاخوں میں ایک ہی نصاب ونظام ہو، وہاں کے مدرسین ایک ہی نظامِ تربیت میں ڈھلے ہوئے ہوں، ان سب کا مشن، نظریہ اور مقصدِ زندگی ایک ہی ہو، وہاں ایک ہی دن امتحان شروع اور ایک ہی دن ختم ہوتے ہوں، ہزاروں طلبہ وطالبات کے لیے ایک ہی پرچہ بنتا، ایک ہی وقت کھلتا اور ایک ہی جگہ جوابی کاپیاں جمع ہوتی ہوں، ان کی چیکنگ اور نمبرنگ کا ایسا فول پروف نظام ہو کہ ممتحن کو بھی پتہ نہ چلے یہ پرچہ کس صوبے کے کس مدرسے کے کس طالب علم کا ہے؟ ایسا انوکھا نظام پورے ملک میں، پوری تیسری دنیا میں، بلکہ کہنے دیجیے کہ پوری جدید دنیا میں کہیں اور نہیں۔ یہ سب وفاق المدارس کے اکابر علمائے کرام کی کرامت ہے کہ وہ اس کسمپرسی، اس بے وسیلگی اور دنیا والوں کی اس بے رُخی کے باوجود وہ تاریخ رقم کررہے ہیں جو اہلِ حق کی قبولیت عنداللہ اور نصرت من جانب اللہ کی کھلی نشانی ہے۔

حقائق بلاشبہ حقائق ہوتے ہیں، وہ خود بولتے ہیں اور اپنا آپ منواتے ہیں۔ انہیں پروپیگنڈے کی گرد اُڑا کر دھندلایا تو جاسکتا ہے چھپایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ پروپیگنڈے کی گرد جب بیٹھ جاتی ہے تو اس کے پیچھے سے حقائق کا تابناک چہرہ پہلے سے زیادہ روشن، پہلے سے زیادہ اُجلا ہوکر اور پہلے سے کہیں زیادہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق		ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اُمید کی کرن

اس کے سر کے بال سامنے سے اُڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں عجیب وغریب تھیں، کچھ اندر اُتری ہوئی اور کچھ دور تک دیکھتی ہوئی۔ باتیں وہ ٹھہر ٹھہر کر کرتا تھا اور آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کا چہرہ تو بے نور تھا ہی، اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں تو بھی وہ بے جان معلوم ہوتی تھیں لیکن میرا خیال ہے یہاں بے جان کے بجائے ''غیر اثر پذیر'' کا لفظ زیادہ مناسب رہے گا کیونکہ نظر سے نظر ٹکراتے ہوئے کسی قسم کے انسانی احساسات اس کی آنکھوں میں پیدا ہوتے تھے نہ چہرے پر پڑھے جا سکتے تھے۔ وہ کافی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا لیکن ''تعلیم انسان کا مقصد زندگی متعین کرتی ہے''، اس مقولے کا کوئی اثر اس پر دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کی وجہ میں آگے چل کر بتا سکوں گا کہ دراصل آج کل مدارس کی تعلیم ہی وہ تعلیم ہے جو کردار سازی کرتی ہے، تعلیم کی دیگر شکلیں معلومات اور فن تو منتقل کرتی ہیں، لیکن اخلاقیات نام کی کسی چیز کا تذکرہ وہاں نہیں ملتا اور یہ موجودہ ''تعلیم یافتہ'' دنیا کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس کی اردو ویسی تھی جیسی فارن پلٹ لوگوں کی ہوتی ہے بلکہ ان سے بھی کافی زیادہ کمزور......اردو میں دخیل ہو جانے والے انگلش کے الفاظ سے بہت زیادہ انگریزی لفظ اس کی گفتگو میں شامل تھے۔ عموماً ایسے لوگوں کی اردو سننے اور ان سے باتیں کرنے میں اپنا ہی ایک لطف ہوتا ہے مگر اس سے گفتگو کچھ خوشگوار تجربہ نہ تھی۔ اس کی وجہ بھی میں تھوڑی دیر بعد آپ کو بتا سکوں گا۔ پہلے اس ہستی کا تعارف ہو جائے۔ یہ یاد رہے کہ کئی ماہ قبل ہونے والی اس گفتگو کو حافظے کے بل بوتے پر نقل کر رہا ہوں اور دیسی اردو میں اس لیے ڈھال دیا ہے کہ اس کی اینگلو اردو جس دردسری کا باعث تھی، قارئین کو اس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا......

''میں امریکی شہری ہوں، شکاگو کی ایک یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں اور مدارس پر تھیسس......''

''اوہ شکاگو......ریاست الی نوائس کا صدر مقام، مشی گن جھیل کے کنارے، کینیڈا کے پچھواڑے میں۔''

''کمال ہے! آپ عجیب وغریب مولوی صاحب ہیں۔''

''آپ کا شہر بھی تو عجیب وغریب ہے۔ کیا اس میں ایک ٹیڑھی ٹیڑھی سڑک بہت ہی عجیب وغریب نہیں۔ ویسے آپ نے عجیب وغریب انسان کے بجائے عجیب وغریب مولوی صاحب کیوں کہا؟''

''اس لیے کہ میں جتنے پاکستانی علما سے ملا انہوں نے مجھے ہی بولنے کا موقع دیا اور میرے سوالات کے جوابات پر اکتفا کیا۔ آپ کی باتوں سے لگتا ہے آپ جواباً میرے اور میرے ملک کے متعلق بہت کچھ بولیں یا پوچھیں گے۔''

مہمان ذہین تھا اور اعتماد سے گفتگو کرتا تھا۔

''تو آپ مقالہ لکھ رہے ہیں؟''

''میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں، میرے تھیسس کا موضوع پاکستانی مدارس ہیں۔''

''آپ کے نگران کا نام کیا ہے؟''

یہ سوال بھی اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس نے جو نام بتایا، بندہ کو یاد نہیں رہا، البتہ اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ ان نگران صاحب کے نام کے بعد ان کا شعبہ اور ان کے پسندیدہ موضوعات وغیرہ پوچھنے سے اتنا میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ موصوف کٹر یہودی ہیں۔ کٹر کا لفظ شاید بے جا استعمال کر گیا ہوں کیونکہ ہر یہودی کٹر بنیاد پرست ہی ہوتا ہے۔ ان میں لبرل، روشن خیال وغیرہ اقسام ناپید ہیں۔ احساسِ کمتری کی ماری یہ قسمیں صرف ہم میں ہی پائی جاتی ہیں۔

''پاکستانی مدارس یا دینی مدارس؟''

''کیا مطلب؟''

''دینی مدارس تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا مثبت کردار اور باوقار حیثیت وہاں کے معاشروں میں مسلّم ہے۔ آپ صرف پاکستانی مدارس کا مطالعہ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

مہمان نے شاید اس رخ پر پہلے سوچا نہ تھا اس لیے کوئی وضاحت کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس کو اس مخمصے سے نکالنے کے لیے بندہ نے بات بڑھائی: ''میرے اس سوال سے آپ کو مقالے کا عنوان اور اس کی حدود متعین کرنے میں آسانی ہو گی۔''

''میں دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے آپ کتنا وقت لگائیں گے؟''

''میں کچھ دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوں۔''

''کچھ دن اور ان میں سے بھی چند گھنٹے؟''

میں نے ''کچھ'' اور ''چند'' کے لفظ پر زور دے کر اس بات کی طرف توجہ دلانی چاہی تھی جو گورے صاحبان اور بابو لوگوں کی ایک بڑی مشکل ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے تھیسس لکھنے والے کو کیا چند گھنٹے میں اتنا کچھ معلوم ہو سکتا ہے جس کی بنیاد پر وہ واپس جا کر اپنی قوم کو علی وجہ البصیرت کچھ بتا سکے؟ لیکن کچھ دنوں بعد جب یہ مواد چھپ کر آئے گا تو اس کا ہر لفظ اس لیے مستند مانا جائے گا کہ یہ ایک ایسے امریکی تحقیق کار کا لکھا ہوا ہے جس نے اس غرض کے لیے پاکستان کا سفر کیا، علما سے ملاقاتیں کیں اور مدارس کا ''بغور'' مشاہدہ کیا وغیرہ وغیرہ...... جبکہ اس طرح کی چیزوں کے پیچھے چند گھنٹوں کی واجبی محنت کے علاوہ کچھ نہیں

ہوتا۔ اس طرح کی دیگر سرکاری وغیر سرکاری رپورٹوں کا حال بھی اسی سے ملتا جلتا ہوتا ہے کیونکہ خود ہمارے اہلِ وطن کی معلومات بھی مدارس کے اس بہت بڑے نظام کے بارے میں...... جہاں تک ہمارا تجزیہ ہے...... بالکل سطحی ہیں۔ آپ ہی خدا لگتی کہیے کیا مدرسے کا کوئی طالب علم امریکا جا کر چند گھنٹے وہاں کے کالجوں، یونیورسٹیوں میں گزارنے کے بعد اس چیز کا اہل مانا جاسکتا ہے کہ امریکی نظامِ تعلیم کے بارے میں کوئی معتبر تبصرہ لکھ سکے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو چند ھیائی ہوئی آنکھوں والے کسی نیم گنجے گریجویٹ کو کس طرح یہ حق مل سکتا ہے؟

امریکی مہمان کے ساتھ گفتگو اس لیے زیادہ اچھا تجربہ نہ تھی کہ آدھا وقت اس کے سوالات کی تصحیح میں گزر جاتا تھا۔ یہودی استاد نے اپنے شاگرد رشید کو اتنی ''دیانت وامانت'' کے ساتھ ''مستند'' معلومات فراہم کر رکھی تھیں کہ یہود کی تاریخی روایت اور مخصوص مزاج "من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعه" (یہود کہلانے والے کچھ لوگ لفظ کو اس کے موقع محل سے پھیر لیتے ہیں) کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ دانش ور حضرات عام طور پر تحقیق کا اصول یہ بتاتے ہیں کہ آپ خالی الذہن ہو کر مطالعہ کریں، معلومات جمع کریں، غیر جانبداری سے مشاہدہ کریں اور پھر کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں [بظاہر یہ اصول بڑا منصفانہ ہے لیکن کیا یہ عملاً کسی منصفانہ نتیجے تک پہنچا سکتا ہے؟ یہ انتہائی مخدوش بات ہے] لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس اصول پر زور دینے والے دانش وروں اور ان کے شاگردان رشید کے طرزِ تحقیق کی جانچ کی جائے تو وہ اس کلیے سے قطعاً متضاد سمت میں چوکڑیاں بھرتا نظر آتا ہے۔ بہر حال یہ گفتگو بندہ کے پاس قارئین کی امانت ہے، اسے مناسب موقع پر ضرور پیش خدمت کریں گے۔ یہاں میں ان دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جو اس کی گفتگو سے اخذ کیں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پہلے سے بندہ کے ذہن میں جھلملاتی تھیں البتہ ان پر مزید غور و فکر کا موقع اس مہمان کے جانے کے بعد ملا۔

دنیا میں سر بلندی کے تقاضے کیا ہیں؟ روئے ارض پر کون سی قوم غلبہ پاتی ہے اور کس قوم کا نظام غالب ہوتا ہے؟ فاتح عالم بننے یا اس منصب پر فائز رہنے کے موضوعی تقاضے کیا ہیں؟ اس سلسلے میں دو باتیں بہت اہم ہیں:

(1)...... وہ قوم دنیا میں غلبہ پا سکتی ہے جس کی قیادت...... حکمران، علما و مشایخ اور معاشرے کے زعما...... سابقہ تاریخ کا علم، عصرِ حاضر کا علم اور کثیر الفنون وکثیر الجہت معلومات رکھنے میں عامۃ الناس سے فائق ہو۔ اب میں دوسرے طبقات کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا کیونکہ امت کے سب سے بیدار اور باخبر طبقہ یعنی حکمرانوں کی ذہنی، فکری، علمی و درماندگی اور واماندگی کن حدوں کو چھو رہی ہے اس کا اندازہ صرف اس تجزیہ سے لگایا جاسکتا ہے جو ایک مشہور دانش ور نے کیا: ''ظہیر الدین محمد بابر (1483-1530) مسلمانوں میں وہ آخری حکمران گزرا ہے جو عصرِ حاضر کو جانتا تھا۔''...... البتہ اہلِ علم اور اربابِ مدارس کی توجہ کے لیے عرض کروں گا کہ عصرِ حاضر کا علم اور کثیر الجہتی معلومات میں اضافہ ہمارے فضلا کی انتہائی سخت ضرورت ہے۔

قومِ یہود میں فکری و علمی صلاحیتیں رکھنے کے اعتبار سے جو ترتیب قائم ہے وہ اس وقت ہماری ترتیب سے بالکل اُلٹ

ہے اور یہ تقریباً وہی ہے جو ہسپانیہ کے سقوط سے قبل مسلم معاشروں میں پائی جاتی تھی۔ یہود کے ہاں پوری قوم میں سب سے اعلیٰ وارفع اور کثیر الفنون معلوماتی سطح علما ومشائخ کی رہی ہے۔ اس کے بعد عصری علوم کے حامل دانش وروں کی اور اس کے کم تر زعما وعمائدین معاشرہ کی اور (1948ء میں قیام اسرائیل کے بعد) سب سے کم تر حکمرانوں کی۔ گویا یہود میں حکمران نسبتاً سب سے کم صلاحیت کے مالک افراد ہوتے ہیں جو فی الواقع "تعمیل حکم کے ماہر" ہوتے ہیں۔ تفکر وتدبر کا عمل علما ومشائخ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور قوم یہود میں ان سے زیادہ علم رکھنے والا عموماً کوئی دوسرا نہیں ہوتا جبکہ ہمارے ہاں یہ ترتیب اُلٹ چل رہی ہے اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے اس مشہور ومقبول عام مقولے: "من جهل بأهل زمانه فهو جاهل" (جو عالم اپنے زمانے کے لوگوں اور ان کے احوال ومزاج کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے) میں اشارہ کر چکے ہیں کہ خارجی مطالعہ (جسے مدارس کی اصطلاح میں غیر نصابی مطالعہ کہتے ہیں) اور حقائق کا مشاہدہ کس قدر ضروری ہے۔

ہمارے ہاں فراغت کے بعد غیر مدرسین تو برکت کے لیے ہی مطالعہ کرتے ہیں، مدرسین حضرات بھی نصابی کتب سے باہر نہیں جاتے جبکہ ایک عالم کے لیے عصرِ حاضر کا سب سے فائق اور ارفع علم انتہائی ضروری ہے اور اس کا حصول کچھ بھی مشکل نہیں۔ عربی، اردو اور انگلش علمی زبانیں بھی ہیں اور عالمی بھی۔ بالخصوص مؤخر الذکر زبان میں دنیا کے ہر خطے میں شائع ہونے والی علمی، تحقیقی اور فنی کتابوں پر تبصرے اور تلخیصات کم سے کم مدت میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مدارس میں ان زبانوں پر عبور اور مطالعے کا ذوق پیدا کرنے، معلومات کو بڑھانے اور تحریر وتقریر میں انہیں برمحل استعمال کرنے کا سلیقہ پیدا کرنے کی ازحد ضرورت ہے۔

جامعۃ الرشید میں اساتذہ کے لیے عربی زبان کا اور درجہ تکمیل کے فضلائے کرام کے لیے انگلش وکمپیوٹر کا مکمل کورس اہتمام سے جاری ہے۔ اگلے تعلیمی سال میں اس کو مزید وسعت دینے اور معیار کو بلند تر کرنے کی کوشش جاری ہے۔ دیگر مدارس کو اس پر بلاتاخیر غور کرنا چاہیے۔

(2)...... وہ قوم دنیا میں اپنے آپ کو منوا سکتی ہے جس میں تفکر وتدبر اور تعمیل میں حصہ لینے والے اہل افراد سولہ سے تیس سال کی عمر سے تعلق رکھتے ہوں۔ انہیں اس عمر کے درمیان سرگرمی سے تلاش کیا جاتا ہو۔ علما ومشائخ اور عمائدین علانیہ طور پر ایسے اہل افراد کی تلاش میں سرگرداں ہوں (میں نے سرگرداں کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے) اس جستجو کے لیے قوم میں ڈھانچہ (Infrastructure) موجود اور فعال ہو۔ ایسے افراد کی فوری نشان دہی کے لیے باضابطہ ذرائع اور ادارے قائم ہوں۔ ایسے نوعمر ذہین افراد سے بیگار نہ لیا جاتا ہو بلکہ ان کی خدمات وصلاحیتوں کا اعتراف اور بھرپور اکرام کیا جاتا ہو اور گودڑی کے یہ لعل تلاشِ معاش کی سختیوں سے ایسے بے جان نہ ہو جاتے ہوں کہ قوم کے کام کے نہ رہیں۔

عصر حاضر میں مسلم امہ کی بدحالی کی انتہا کے باوجود امید کی جو کرن قائم ہے وہ محض اس بنیاد پر ہے کہ بار بار کی ناشکریوں

کے باوجود عالمِ اسلام میں ایسے لوگوں کی پیدائش کم نہیں ہوئی جن پر توجہ دی جائے تو وہ قوم کا بیڑا پار لگا سکتے ہیں۔ خصوصاً پاکستانی قوم میں یہ پوٹینشل اتنا حیران کن ہے کہ باید وشاید...... قسم بخدا ہماری قوم صرف اس سرمائے کو صحیح استعمال کرے تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ محبِّ وطن قوتوں کو اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے اور اپنے اپنے میدان میں اس حوالے سے دل جمعی کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ مدارس کی حد تک ماہِ شعبان میں شروع ہونے والی سالانہ تعطیلات میں نوجوان فضلا کے لیے قضا کورس، اسلامک بینکنگ، فلکیات، تاریخ وجغرافیہ، ٹیچر ٹریننگ اور انگلش وکمپیوٹر کورس جیسی سرگرمیوں کو اعلیٰ پیمانے پر منعقد کرنا جامعۃ الرشید کا اہم اقدام ہے۔ دیگر مدارس اپنے اساتذہ کرام کو ان میں مبعوث کر کے ان کی اہلیت اور تجربے میں اضافہ کروا سکتے ہیں۔ اس سے وہ بآسانی اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنے ہاں یہ چیزیں متعارف کروا سکیں۔

کوشش بندوں کی طرف سے ہوتی ہے اور کامیابی کی نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے لہٰذا اپنی سی کوشش کرتے رہنا چاہیے تاکہ رب العزت کی عطا کا رُخ ہماری طرف ہو جائے۔

دینی مدارس میں اردو ادب کی تعلیم

مشفقم ومحسنم حضرت اقدس صدر وفاق المدارس دامت برکاتہم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج بتاریخ پندرہ رمضان طلبہ کو چھٹی ہوئی ہے تو آپ کو یہ عریضہ لکھنے بیٹھا ہوں، تاخیر اور غفلت کی بہت بہت معذرت اور معافی کے ساتھ۔

حضرت اقدس نے بندہ کو سال بھر کے لیے جمعہ کے لیے خطبات کی تیاری کے متعلق جو حکم فرمایا تھا اس کے بارے میں تفصیلی جائزہ بندہ پیش کر چکا ہے۔اس کے متبادل کے طور پر ایک تجویز بندہ کے ذہن میں آئی ہے جس کو کافی سوچ بچار کے بعد آنجناب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

جب ہمارے ہاں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے طلبا اچھے ادیب، خطیب یا کم از کم سلجھی ہوئی گفتگو کرنے والے اچھے شہری بنیں اور ان کے اظہار مافی الضمیر میں اجنبی تعبیرات اور نامانوس اسلوب راہ نہ پکڑے تو اس کی ابتدا ہمیں شروع سے کرنی چاہیے۔یعنی ہمارے طلبہ کرام کو اردو ادب کے رائج الوقت محاورے، ضرب الامثال، روزمرے، مترادفات ومتضادات، اساتذۂ فن کے کلام میں استعمال ہونے والی تعبیرات، جملوں کی بندش، اس سب کچھ کی تعلیم درجہ بدرجہ شروع سے ملنی چاہیے بلکہ اس سے بھی پہلے انہیں مشکل الفاظ کے معانی، کثیر الاستعمال معیاری ادبی الفاظ، مذکر مؤنث، واحد جمع، قواعد جملہ سازی اور اردو صرف ونحو کی بنیادی تعلیم دی جانی چاہیے۔یعنی ہم جس طرح عربی ادب کی تعلیم کے لیے صرف نحو اور ادب کو طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق شروع سے لیکر آخر تک پڑھاتے اور بڑھاتے چلے جاتے ہیں اسی طرح اردو ادب کا تعلیم وتعلم بھی ان مقاصد عالیہ میں سے ہے کہ جس کے لیے اس طرح کی منصوبہ بند تعلیم ہونی چاہیے۔

مدارس دینیہ، علوم دینیہ کی تعلیم وترویج کے لیے قائم ہوئے ہیں اور علوم دینیہ عربی زبان میں ہیں لہٰذا ان کے حصول کے لیے ہمارے یہاں عربی کی معیاری اور بہترین تدریس ہوتی ہے مگر جب انہی علوم کو معاشرے میں پھیلانے اور ان کا مغز کشید کر کے عوام الناس تک ان کی ذہنی سطح کے مطابق پہنچانے کے لیے اتنے ہی معیاری اردو ادب کی تعلیم وترویج کا مرحلہ آتا ہے تو اس سے کافی بے توجہی برتی جاتی ہے۔لہٰذا ہوتا یہ ہے کہ ہمارے فضلا عرصہ دراز تک عربی وفارسی تراکیب کے استعمال کے باعث ان کے معنی اوّلی کو فوراً اور بلاتوقف سمجھنے لگتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سامعین بھی ان تراکیب، اسلوب اور تعبیرات کو سماعت کی حدود میں آتے ہی ویسے سمجھ رہے ہیں جیسے کہ وہ خود...... حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا، علمائے کرام وطلبہ برادری کی تعبیرات جو ہمارے لیے مانوس اور قریب الی الفہم یا سریع الفہم ہیں، وہ ہمارے عوام کے لیے اتنی ہی اجنبی، نامانوس اور دوراز فہم ہیں جیسے کہ ہمارے لیے ان کے استعمال کردہ انگلش کے الفاظ یا بعض اوقات ان کا مخصوص اسلوب۔

اسی پر بس ہوتی تو اتنی مشکل نہ ہوتی کیونکہ عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے علمیت کا بھرم پھر بھی رہ جاتا ہے، مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سات آٹھ سال مدارس کے ماحول میں پشتو، پنجابی، بلوچی، بروہوی وغیرہ علاقائی زبانیں بولنے والے طلبہ کے ساتھ رہنے سے ایک اردو بولنے والے طالبعلم کے ذہن میں بھی وہ الفاظ تعبیرات اور اسلوب پختہ اور جاگزیں ہو جاتی ہیں جو یہ طلبہ اپنے علاقوں سے ساتھ لائے ہوتے ہیں اور معیاری ادب میں ان کی کوئی جگہ نہیں بنتی۔ مختلف دیہاتی اور مقامی تعبیرات کی آمیزش سے تیار شدہ یہ ملغوبہ عوام کے لیے قطعی نامانوس ہوتا ہے لہٰذا رفتہ رفتہ ہمارے اور ان کے درمیان حائل خلیج روز بروز وسیع ہوتی جارہی ہے اور اسی مناسبت سے ہماری ان پر گرفت بھی کمزور ہورہی ہے۔ اس امر کا زیادہ واضح احساس اس وقت ہوتا ہے جب کسی عام آدمی سے سوال سن کر اسے مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ سائل کسی اور دنیا کی زبان بول رہا ہوتا ہے اور ہم اسے کسی اور رنگ ڈھنگ اور لب و لہجے میں اپنا مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کررہے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام الناس مخصوص الفاظ کے تکرار اور نامانوس تراکیب کے استعمال کے باعث ہمارے بیانات اور گفتگو سے وہ ذہنی ہم آہنگی نہیں پیدا کر پاتے نہ انہیں اردو ادب کی وہ قدرتی چاشنی ہمارے یہاں ملتی ہے جو انہیں مولانا مودودی، امین احسن اصلاحی، نعیم احمد صدیقی، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر طاہر القادری، غلام احمد پرویز، جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر فرحت ہاشمی جیسے لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔ ایسے حضرات کی اکیڈمیاں ملک بھر میں جگہ جگہ کھل چکی ہیں اور ان کے وابستگان ''مترفین'' (معاشرے کے خوشحال لوگ) اور ''ملأ القوم'' کے قبیل سے ہیں۔ ان حضرات کو ٹھیٹھ علمیت سے کیا واسطہ؟ مگر تقاضائے حال کے مطابق گفتگو کے فن نے انہیں معاشرے میں یہ مقام دلوایا ہے۔ ہم نے نہ کبھی اردو کے سکہ بند استادوں کا کلام پڑھا، نہ کسی ادبی مجلس میں شریک ہو کر لب ولہجہ اور تلفظ و املا درست کیا، نہ کبھی الفاظ کی نشست و برخاست، باہمی ربط اور صوتی حسن پر توجہ دی تو ہمارے اور ان حضرات کے درمیان یہ فرق پیدا ہونا ہی تھا۔

جس طرح اردو ادب اور اردو زبان کے قواعد کی تعلیم ہمارے یہاں رائج نہیں اسی طرح اس کے مطالعے کا ذوق بھی نہیں۔ اگر ہم دور نہ جائیں، اس وقت کے بڑے کالم نگاروں کو اپنے طلبہ سے پڑھوائیں تو بھی زبان و بیان کی درستگی کی وقیع نعمت سے اپنا دامن قدرے بھر سکتے ہیں۔ مگر ایسا ذوق نہ ہونے کی وجہ سے ہماری طلبہ برادری کے لیے شستہ، بامحاورہ اور زبان و بیان کی صحت والی اردو بولنا مشکل ہو گیا ہے۔ جب ہمارا پشتون طالبعلم یہ کہتا ہے کہ ''آج میرے سر پر درد ہے'' یا ''کیا تمہارے ساتھ فلاں کتاب ہے؟'' تو وہ اپنی دانست میں قطعاً کوئی غلطی نہیں کررہا ہوتا، پشتو میں یہ دونوں جملے ایسے ہی ہیں، ہم نے اسے اس کی مادری زبان کے حصار سے نکال کر ملک میں بولی جانے والی زبان کے معیاری لب و لہجے، درست تلفظ و املا، برمحل محاوروں اور ضرب الامثال سے روشناس ہی نہیں کروایا تو لازماً یہی محرف زبان بول کر اردو دان ہم نشینوں یا اپنے مقتدیوں کی طبیعت اچاٹ کرتا رہے گا۔

اس کے برعکس اسکول و کالجز میں پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک طالبعلم کی ذہنی سطح کے مطابق نصاب مروج ہے۔ عصری تعلیمی ادارے کئی اعتبار سے تباہ حال ہیں مگر اردو کے نصاب کی تدوین میں ان کے منصوبہ سازوں نے قوم سے کسی نہ کسی حد تک وفا کی ہے۔ ان کا استاد پہلے طالبعلم سے بلند آواز میں سبق کا املا کرواتا ہے پھر مشکل الفاظ کے معانی اور نئی

تراکیب کا حل ہوتا ہے، بعدازاں سبق کے متعلق سوالوں کا جواب ہو جانے کے بعد خالی جگہیں پُر کرنے اور جملے بنانے کا مرحلہ آتا ہے، پھر سبق کی تلخیص ہوتی ہے یا اسے طالبعلم سے اس کے ''اپنے الفاظ میں'' لکھوایا جاتا ہے، پھر مضمون نویسی کے اصول پڑھوا کر چھوٹی سی کہانی لکھوائی جاتی ہے۔ پھر کسی مضمون کے نکات بتا کر اس پر ''کم از کم تیس سطریں'' لکھنے کا کہا جاتا ہے حضرت والا محسوس کریں گے کہ یہ کس قدر فطری اور عقلی و منطقی ترتیب ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں تعلیمی معیار کے ناقابل بیان انحطاط کے باوجود ادیبوں اور مقرروں کی کھیپ پیدا ہو جاتی ہے اور ہمارے ہاں اعلیٰ اور معیاری تعلیم کے باوجود ٹھیٹھ اردو ادب کے حوالے سے ایک ایسا خلا ہے جس کو صرف اور صرف آپ اپنی خصوصی توجہ سے پُر کر سکتے ہیں۔

حضرت والا اس موقع پر شاید فرمائیں گے کہ خوشامدانہ بقراطیت نہ بگھارو، سیدھے سبھاؤ بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟ تو میں عرض کروں گا کہ بندہ کے پاس بہت سے طلبہ اور نوجوان آتے رہتے ہیں کہ ''صحافی کیسے بنا جاتا ہے؟''

یہ سب حضرات مضمون کا عنوان طے کر کے آئے ہوتے ہیں بس اتنی راہنمائی چاہتے ہیں کہ پہلی سطر کھینچنے اور آخری سطر لپیٹنے کا طریقہ کیا ہے؟ بیچ کے سارے مراحل بھی وہ ایک ہی جست میں طے کرنے پر مصر ہوتے ہیں۔ حضرت محسوس فرما رہے ہوں گے کہ یہ کس قدر غیر فطری اور غیر حقیقی روِش ہے۔ گذشتہ دنوں جب ایسے کچھ طلبہ اسی غرض سے ملاقات کی خاطر آئے تو بندہ نے ان سے عرض کیا کہ آپ مضمون نویسی سے فی الحال صرف نظر کریں۔ آپ اردو کے ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق استاد کی خدمات حاصل کریں اور ان سے اردو کی دسویں کتاب سبقاً سبقاً تمرین کے سوالات کے حل کے ساتھ پڑھیں۔ تین ماہ بعد آپ دیکھیے گا کہ مضمون نویسی کا مرحلہ کتنا سہل ہو چکا ہوگا۔ پہلے بنیاد ڈالی جاتی ہے پھر چھت رکھی جاتی ہے ساتھ ہی عرض کیا کہ اپنے مدرسہ میں اردو ادب کی معیاری کتابیں ...... جن میں ہفوات و شہوات کم ہوں ...... لا کر رکھیں اور ان کو پڑھیں بلکہ ٹھہر ٹھہر کر پئیں، دھیرے دھیرے جذب کریں اور کوشش کریں کہ ان کو اتنا پڑھ لیا جائے کہ حدیث نفس بھی اسی کلام میں ہونے لگے تب دیکھیے تحریر کو کیا رنگ لگتا ہے؟

حضرت والا! بات بہت لمبی ہو گئی مگر اتنی اہم اور آپ کے تفویض کردہ کام سے اس قدر مربوط معلوم ہوتی تھی کہ بادل نخواستہ اس طوالت کی گستاخی کرنا ہی پڑی۔ بندہ کے خیال میں ہمارے عزیز طلبہ کے لیے اردو ادب کا صرف مطالعہ ہرگز کافی نہیں، اگر محض مطالعے سے تلفظ و لہجے کی نجابت اور زبان و بیان پر مطلوبہ قدرت حاصل ہو سکتی تو دنیا بھر کے ماہرین تعلیم اپنے ملکوں کی قومی اور مادری زبان کی تعلیم کو منتہی درجات تک لازم قرار نہ دیتے۔ پھر صرف و نحو کے قواعد کی تعلیم و تمرین تو مطالعے سے ممکن ہی نہیں خصوصاً جبکہ ہمارے ہاں اس کا ذوق اور بنیادی تعلیم ہی نہیں تو اس کے لیے مطالعہ (جس پر مداومت کی کوئی ضمانت نہیں) پر اکتفا کے بجائے کافی کام کرنا پڑے گا۔ اگر ہم فی الحال اپنے مدارس کے لیے الگ سے اردو کا نصاب مرتب نہ کریں تو عصری اداروں کا مروجہ نصاب ہی سہی، آخر ''ما صلی ولا صام ولا قرأ القرآن قط'' جیسا کردار رکھنے والے ادیب کا مجموعہ کلام ہمارے یہاں پڑھا پڑھایا جا سکتا ہے تو اردو کے عصری تعلیمی نصاب کے مدوّنین میں صالح افراد کے تلاش کی کیا ضرورت ہے؟ جب تک مدارس دینیہ کے لیے اپنا نصاب تیار نہیں ہوتا اس وقت تک اگر مثلاً دسویں کی کتاب ثالثہ میں [اسی طرح بارہویں اور چودہویں کی کتاب بعد کے درجوں میں] تجرباتی طور پر پڑھائی جائے تو کیا حرج

ہے؟ اردو زبان کے قواعد اور صرف ونحو کی مختلف کتب کا انتخاب بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ تخصص فی الدعوۃ والارشاد یا غیر وفاقی درجات میں ایسا تجربہ نسبتاً سہل اور زیادہ قابل عمل ہے۔

جہاں تک دینی مدارس کے لیے الگ سے اردو کا نصاب تیار کرنے کا مسئلہ ہے تو اس کے مواقع بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت دیے ہیں۔ سال بھر میں درجہ ثانیہ کی سطح کی کتاب تو تیار ہو ہی جائے گی۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر حضرت نے اس پر توجہ نہ دی تو شاید کوئی اور اسے قابل التفات نہ سمجھے گا اور اگر حضرت اس موضوع پر سوچیں تو کئی راہیں نکل سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی عمر و صحت میں برکت اور ترقی عطا فرمائے اور امت کے لیے آپ کا سایۂ رحمت تادیر صحت وعافیت کے ساتھ قائم رکھے۔

دعاؤں اور جواب کا منتظر

ابولبابہ

ضربِ مؤمن کراچی

(یہ خط لکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اردو ادب کی تدریس وتمرین کے لیے اردو تحریر کے آداب پر مشتمل مفصل کتاب ''تحریر کیسے سیکھیں'' مکتوب نگار کے قلم سے تیار ہو کر شائع ہوگئی۔ والحمد للہ علیٰ ذلک)

صدیوں کا قرض

بعض خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان انہیں حاصل زندگی سمجھتا ہے اور جب وہ پوری ہو جاتی ہیں تو اسے یقین نہیں آتا کہ وہ معرض وجود میں آچکی ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ بندہ کے ساتھ اس وقت ہوا جب مفکر اسلام شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بارک اللہ فی حیاتہ کے قلم معجز رقم سے لکھا ہوا قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ چھپنے کی اطلاع سنی۔

میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ نہ سکے ہوں گے کہ حضرت کے انگریزی ترجمے سے بندہ کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ میں آپ کو زیادہ دیر سسپنس میں نہیں رکھوں گا لیکن آپ کو مجھے تھوڑی دیر کے لیے تیس سال پہلے ماضی میں جھانکنے کی اجازت دینی ہوگی۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بندہ نو دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر رہا تھا۔ جس نسخے میں ہم حفظ کرتے تھے وہ تاج کمپنی کا چھپا ہوا مشہور زمانہ سولہ سطروں والا نسخہ تھا۔ اس کے آخر میں تاج کمپنی کی دیگر قرآنی مطبوعات کی فہرست بھی ہوتی تھی۔ اس میں ایک انگریزی ترجمے کے سامنے مترجم کا نام کچھ یوں درج تھا ''مارماڈیوک پکتھال''۔ بندہ کی جب بھی اس لفظ پر نظر پڑتی تو دو سوال ذہن میں اُبھرتے لیکن کبھی کسی سے یہ سوالات پوچھنے کی جرات نہ ہوئی۔ پہلا سوال تو بالکل بچگانہ تھا البتہ دوسرے سوال کی کبھی ہمت اس لیے نہ کی کہ ڈر لگتا تھا کہ ڈانٹ سننی پڑے گی یا سختی سے جھڑک دیا جائے گا۔ لہٰذا یہ سوال بندہ کے دل میں تقریباً ربع صدی تک دفن رہا۔ مقام شکر ہے کہ آج اس کا جواب مل گیا ہے اور صد شکر ہے کہ مرنے سے پہلے اسی زندگی میں مل گیا ہے۔

جب بھی قرآن شریف کھولتے بند کرتے اس لفظ پر نظر پڑتی تو یہ سوال ذہن میں کلبلاتا کہ اس نام میں ''مار'' کا لفظ دو مرتبہ کیوں آتا ہے؟ اب آپ جانیے کہ بچگانہ پن کے سوا اس سوال میں کیا رکھا ہے؟ دوسرا سوال یہ تنگ کرتا کہ ہماری محدود ذہنی سطح کے مطابق قرآن کریم کی دنیا ''تاج کمپنی'' پر شروع ہوتی اور اسی پر ختم ہوتی تھی۔ اس لیے کہ ہماری مسجد اور مدرسے میں سارے ہی قرآن شریف ''تاج کمپنی'' کے چھپے ہوئے رکھے تھے اور چونکہ اس عمر میں ہماری دنیا مسجد اور مدرسہ جو گھر سے ملحق تھا، تک محدود تھی، اس لیے ہم بجا طور پر یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ دنیا میں قرآن شریف چھاپنے کی توفیق (یا ذمہ داری) اللہ میاں نے صرف تاج کمپنی کو دی ہے۔ تب ہی تو وہ اتنے خوبصورت، من بھاتے اور اعلیٰ خطاطی والے قرآن شریف چھاپتی ہے جو جلدی سے یاد ہو جاتے ہیں اور ہمیں کھیلنے کا زیادہ سے زیادہ وقت مل جاتا ہے۔ تاج کمپنی کے سولہ سطر والے قرآن شریف کے علاوہ کسی قرآن شریف سے ہمارے فرسودہ ذہن کی مطابقت پیدا نہ ہو سکی۔ نجانے اس نسخے میں کیا بات ہے؟ خیر! دیکھیے بات دور چلی گئی۔ ذکر دوسرے سوال کا ہو رہا تھا۔ مارماڈیوک پکتھال صاحب کا نام دیکھ کر بندہ کو شاک سا لگتا تھا کہ تاج کمپنی جو (بندہ کے اس وقت کے ذہن کے مطابق) مسلمانوں کی واحد نمایندہ اشاعتی کمپنی ہے، اسے دنیا بھر میں کسی معروف عالمِ دین کا لکھا ہوا

انگریزی ترجمہ نہیں ملا کہ وہ ایک نومسلم مترجم کا ترجمہ چھاپتی ہے۔ یقین مانیے !اس بات سے سخت کوفت اور بہت تعجب ہوتا کہ کیا ایک مستند کمپنی کو کسی مستند عالم یا انگریزی خواندہ مسلمان کا ترجمہ دستیاب نہیں کہ اس کا نام قرآن شریف کے آخر میں چھاپے؟ کبھی کبھی یہ جواب خود سے ذہن میں آتا کہ علماء کے تراجم ضرور ہوں گے، لیکن پکتھال صاحب چونکہ انگریز ہیں اس لیے ان کا ترجمہ علماء کے ترجمے سے فائق ہوگا اور تاج کمپنی تو ہمیشہ بہترین چیز چھاپتی ہے۔ لیکن اس جواب سے جو چوٹ دل کو لگتی اور جو کسک محسوس ہوتی وہ آج تک بندہ کو یاد ہے اور اسی ارمان کو لیے ہم دنیا سے جاتے، اگر گزشتہ دنوں ''The Meanings Of The Nobel Qur`an'' پر نظر نہ پڑتی۔

یہ کسی مستند و معتبر عالم دین کے قلم سے نکلا ہوا پہلا انگریزی ترجمہ ہے اور عالم دین بھی وہ جو نہ صرف بیک وقت نکتہ رس مفسر، مستند محدث، فقیہِ وقت، اعلیٰ پائے کا ادیب و شاعر اور صاحب نسبت روحانی شخصیت و شیخ کامل ہے بلکہ عالم اسلام کی ایسی نامور اور ہمہ جہت شخصیت کہ اس کا نام ہی بذات خود سند ہے۔ عبقریت ایسی صفت ہے جو خود اپنا آپ منواتی ہے۔ یہاں بھی آپ دیکھیے کہ یہ ترجمہ محض ڈھائی سال کی مدت میں ایک ایسے شخص کے ہاتھ سے مکمل ہوا جو گونا گوں عالمگیر مصروفیات رکھتا ہے اور جو کبھی کسی عصری تعلیمی ادارے کے باقاعدہ طالب علم نہیں رہے۔ ان کی تمام تر تعلیم انہیں بے سرو سامان دینی مدارس میں ہوئی ہے جنہیں آج جہالت اور دنیا سے ناواقفیت کا طعنہ دیا جارہا ہے۔ لیکن جیسا کہ جینیئس لوگوں کے کام کی انفرادیت ہوتی ہے، روایتی اصولوں سے ہٹ کر کچھ ایسی چیزیں اس ترجمہ و تشریح میں اپنائی گئی ہیں جو مفید بھی ہیں اور ممتاز بھی۔ نیز یہ ترجمہ ایسی سلاست و نفاست اور شستگی و شگفتگی لیے ہوئے ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

آپ اس ترجمے کی اہمیت اور افادیت کو نہ سمجھ سکیں گے اگر آپ کو اہلِ علم کی اس حسرت اور تشنہ تمناؤں کا اندازہ نہ ہوگا جو اب تک ان کو بے چین کیے ہوئی تھی اور ان کے دلوں کو تڑپاتی اس بے چینی کی شدت کا احساس ممکن نہیں جب تک ایک نظر آج تک لکھے گئے انگریزی ترجموں پر نہ ڈال لی جائے۔ لہٰذا از راہ کرم آئیے! ذرا ایک اُچٹتی سی نظر آج تک قرآن کی انگریزی میں خدمت پر بھی ہو جائے۔

اس وقت بازار میں کئی انگریزی تراجم دستیاب ہیں جن میں تین زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تو پکتھال صاحب کا ترجمہ ہے جو کہ حیدرآباد دکن کے فرمانروا نظام دکن کے ایما پر کیا گیا اور ریاست حیدرآباد ہی سے پہلی دفعہ شائع ہوا۔ اس ترجمہ میں کچھ اشکالات ہیں جو اہلِ علم پر مخفی نہیں نیز اس کے ساتھ تشریحی نوٹس بھی نہیں جس کی وجہ سے انگریزی خواں طبقے کے لیے قرآن کی مراد تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرا معروف بلکہ غالباً سب سے زیادہ مشہور ترجمہ عبداللہ یوسف علی کا ہے۔ موصوف چونکہ بوہری داؤدی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے ترجمے کی ثقاہت کا کیا عالم ہوگا؟ یقیناً محتاجِ بیان نہیں۔ بہرحال ان کی وکٹورین اسٹائل کی انگریزی اور زبان دانی کے حوالے سے ان کی غیر معمولی مہارت کی بنا پر اس ترجمے کو عالمگیر شہرت ملی اور عام طور پر لوگوں کے ہاتھوں میں یہی ترجمہ نظر آتا ہے۔ تیسرا ترجمہ عرب دنیا میں ہوا ہے۔ مترجمین کی کمیٹی نے غالباً پکتھال صاحب کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر اس کے نقائص دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

الغرض اس سے قبل جو بھی انگریزی ترجمے ہوئے وہ یا تو غیر مسلموں کے تھے لہٰذا قلبی محبت کے اعجاز اور سوزِ عشق سے

جنم لینے والی بلند پایہ کاوشوں کی توقع ہی فضول ٹھہری...... یا ان مسلمانوں کے جو علوم دین میں رسوخ سے محروم اور خصوصاً علم تفسیر کی باریکیوں سے ناآشنا تھے۔ اس لیے ان سے ایسی غلطیاں بھی ہوئیں جن سے مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا یا مفہوم ہی الٹ گیا۔ اس کی کئی مثالیں مجھ جیسا سادہ مولوی بھی دے سکتا ہے لیکن یہ ایک مستقل مقالے میں جچیں گی۔ مختصر اخباری مضمون اس کا متحمل کہاں؟ پھر علوم دینیہ سے گہری واقفیت کو رہنے دیجیے کہ یہ وہ بحث ہے جس کا فیصلہ ہمارے عصری تعلیم یافتہ دوست یوں کرتے ہیں: ''ارے صاحب! بس رہنے دیجیے! مولوی صاحبان سے تو کسی کا کام دیکھا ہی نہیں جاتا۔''...... لہٰذا ہم اس بحث سے قطع نظر ٹھیٹھ زبان دانی کے لحاظ سے دوسرے ترجموں کو دیکھیں تو بعض میں بائبل کے ترجموں کی مخصوص زبان اور اسلوب ایسا گھا ہوا ہے کہ سورہ بقرہ کا ترجمہ پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم کی کتاب پیدائش یا خروج کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بعض تراجم معاصر زبان میں ہیں لیکن یا مکمل طور پر تحت اللفظ کی جکڑ بندیوں میں مقید ہیں یا بالکل ہی آزاد کہ فاصلہ رکھ کر گذرتے محسوس ہوتے ہیں۔ بعض میں یہ مسئلہ کہ علوم عربیت (صرف نحو، لغت؛ بیان، بدیع، معانی) کی باریکیاں نہ جاننے کی وجہ سے جہاں قرآن کا زور بیان، فصاحت و بلاغت کی معراج کو چھو رہا ہوتا ہے وہاں یہ تراجم گنگ اور مجسمۂ بے بسی دکھائی دیتے ہیں اور جہاں کلام الٰہی اپنی خصوصی شان و شوکت کی بلندیوں پر ہوتا ہے وہاں یہ مترجمین پرشکوہ الفاظ کے چناؤ سے قاصر و عاجز معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت مفکر اسلام دامت برکاتہم کا ترجمہ.......... جیسا کہ عنقریب دنیا گواہی دے گی.......... ایک طرف تو اعتقادی و نظریاتی طور پر زیغ و ضلال سے پاک، دوسری طرف اسلاف کے مخصوص اور مبارک طرز پر احتیاط و اعتدال اور سلامت طبع کا مرقع، خود بینی و خود رائے سے اتنا اجتناب کہ کہیں ایک جگہ بھی کسی چیز کی نسبت اپنی طرف نہیں کی، نہ تحدیث نعمت کے لبادے میں اپنے اوصاف گنوائے ہیں۔ زبان کی طرف آئیے تو نہ پوری طرح لفظی ہے کہ پیچیدگی اور الجھن محسوس ہو، نہ بالکل آزاد کہ دور دور سے حال پوچھتی گذر جائے، بلکہ جیسا کہ ان کی اردو تحریر سادگی و دل نشینی اور شیرینی و چاشنی لیے ہوتی ہے اسی طرح انگریزی بھی انتہائی سہل و سلیس ہے۔ اس کی سادگی و پرکاری کا صحیح لطف تو انگریزی خواں طبقہ ہی اُٹھا سکے گا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ عوام کے لیے ہی لکھا گیا ہے اور انہی کی ضروریات کو مدنظر رکھنے کی برکت سے یہ شاہکار وجود میں آیا ہے۔ قرآنی علوم پر حضرت کی دسترس اور گہری وابستگی کی ایک علامت یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ جا بجا مفید حواشی اور نکات ہیں خصوصاً جہاں کبھی قاری کو الجھن یا پیچیدگی محسوس ہونے کا اندیشہ ہو وہاں حضرت کے مخصوص دلنشین اسلوب پر مشتمل حواشی ذہن کی گرہیں کھولنے کا کام دیتے ہیں۔ پھر چھاپنے والوں نے طباعت کے عالمی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے حسن ذوق کا جو ثبوت دیا ہے وہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔

چونکہ انگریزی زبان سے ہم دیسی لوگوں کی واقفیت قابل لحاظ نہیں نہ ہی اتنے بڑے علمی کام پر کسی تبصرے کی اہلیت ہے لہٰذا اس ترجمے کے حقیقی فنی محاسن اور معنوی خوبیوں کو قرآن کے ان شائقین کے لیے چھوڑنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انصاف پسندی اور حقیقت شناسی کی رُو سے یہ سمجھتے تھے کہ آج تک انگریزی میں قرآن کریم کی خدمت تشنگی کا شکار اور ادھوری سی ہے...... البتہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں ہے کہ آج اس ترجمے کی اشاعت سے کئی صدیوں کا بوجھ اُتر گیا ہے اور اب کسی کو حق نہیں کہ علمائے حق کو زمانہ ناشناسی یا عامۃ المسلمین کی

توقعات پر پورا نہ اُترنے کا طعنہ دے سکے۔

حضرت کی عبقریت کا اندازہ تو کیجیے! ایک طرف اردو ادب کے حوالے سے زبان و بیان پر ایسی گرفت کہ "جہان دیدہ" اور "دنیا میرے آگے" جیسے شاہکار آپ کے نوک قلم کے مرہون منت ہیں۔ دوسری طرف ارشاد و اصلاح کا یہ عالم کہ مخلوق خدا آپ کے "اصلاحی خطبات" سے فیضاب ہو رہی ہے۔ تیسری طرف جب "فتح الملہم" کی تکمیل ہوئی تو ہم سمجھتے تھے یہ قدرت کی طرف سے حضرت کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والا سب سے بڑا اور اہم کام ہے۔ اس پر اور نہیں تو کم از کم اس کی جلدوں کے بقدر شکرانے کے اونٹ ذبح ہونے چاہییں۔ فقہ المعاملات یعنی جدید معیشت و تجارت اور اسلامی بینکاری کے حوالے سے حضرت کی خدمات کو بجا طور پر تجدیدی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

پھر جب معلوم ہوا کہ معارف القرآن کا انگریزی ترجمہ تکمیل کے قریب ہے تو ہم نے جانا کہ یہ تو حضرت کی حیات مجمع برکات کا اہم ترین سنگ میل ہے۔ اس دوران سنا کہ حضرت خود بھی انگریزی ترجمہ لکھ رہے ہیں تو دل نے کہا کہ اہل اللہ کی قبولیت کی ایک علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ اللہ رب العالمین ان کی تصنیفی و تبلیغی کاوشوں کے "ختام مسک" کے طور پر اپنی کتاب کی خدمت بھی لیتا ہے مگر یہاں ایک اور خوشخبری باقی ہے کہ خاکستر میں ایک اور خیرہ کن چنگاری چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت والا قرآن کریم کے اردو ترجمے پر بھی کام کر رہے ہیں [اپریل 2009ء میں یہ ترجمہ شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا] اسی دوران بغیر کسی پیشگی اعلان کے "فتاویٰ عثمانی" کے نام سے حضرت کے فتاویٰ کی پہلی جلد منصۂ شہود پر آئی اور اہل فتویٰ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اعتدال، حزم و احتیاط اور باریک بینی کا مرقع "فتاویٰ عثمانی" مدتوں حوالے کی کتاب کا کام دے گی۔ کیا اتنے سارے لافانی کاموں کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلم امہ خدانخواستہ بانجھ ہو چکی ہے اور ایسے سپوت نہیں جنتی جو ہر زمانے میں اس کا طرۂ امتیاز رہے ہیں؟ کیا آج بھی مسلمانوں میں ایسے سپر جینئس نہیں جو ساری امت کی کوتاہیوں کا کفارہ تن تنہا دے سکیں؟ فہم دین کورس کے دوران عوام کو کسی اردو ترجمے کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے ہم پر جو گذرتی تھی وہ ہمارا حسرت زدہ دل ہی جانتا ہے۔ اب نا آسودہ تمناؤں سے بھرے دل کو اطمینان ہے کہ اس کے کئی زخم بھر گئے ہیں۔ ہمیں دنیا سے جاتے وقت یہ حسرت نہ ہوگی کہ سوسوا سو کروڑ مسلمان مل کر دنیا کی دو بڑی زبانوں کو ایک ایک ترجمہ نہ دے سکتے تھے۔ البتہ ایک اندیشہ ضرور ہے کہ ہم کہیں اپنی المناک روایت کے مطابق ان دو شاندار خدمات کی ویسی قدر نہ کریں جیسا کہ ان کا حق ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دنیا میں کسی علمی خدمت کے اعتراف اور خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جتنے بھی طریقے معروف اور رائج ہیں...... تقریب رونمائی اور شاندار پذیرائی سے لے کر کسی مؤقر ایوارڈ تک...... وہ سب اداسیوں کے موسم میں ملنے والی اس غیر معمولی مسرت پر اپنائے جانے چاہییں۔ کرنے والے نے تو اپنے حصے کا کام کر کے ایک بڑا بوجھ تنِ تنہا اتار دیا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری سے ہم سب کو سبکدوش کر دیا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم اس کا سواگت کیسے کرتے ہیں؟ حقیقت ہے کہ جب تک انگریزی زبان و بیان کے انداز میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آتی ان شاء اللہ یہ مستند ترجمہ پڑھا جاتا رہے گا اور کسی بھی غیر مستند اور غیر ثقہ ترجمے کی احتیاج سے بچائے رکھے گا۔

گودڑی کے لعل

گزشتہ دنوں امریکا سے خبر آئی تھی کہ تین انجینئر دوستوں نے مل کر B-52 طرز کا ماڈل طیارہ ڈیزائن کیا ہے اور اس طیارے نے آزمائشی پرواز بھی مکمل کرلی ہے۔ ان دوستوں نے اس پروجیکٹ پر آنے والے اخراجات ذاتی ذرائع سے حاصل کیے اور اسے نجی ورکشاپ میں تیار کیا۔ میں اس طرح کی خبریں جب پڑھتا ہوں تو بے ساختہ ذہن ان دوستوں، ساتھیوں اور ہم وطنوں کی طرف چلا جاتا ہے جو قدرت کی طرف سے بے مثال صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اگر ان کو موقع ملتا تو وہ بہت کچھ کر سکتے تھے، ان کی اعلیٰ کاوشیں ملک وملت سے ناکامی کا داغ مٹا کر کامیابی کا تاج پہنا سکتی تھیں مگر اہلِ وطن نے ان کی قدر نہ کی، اہلِ اختیار کو ان سے استفادہ کی پروا نہ تھی اور اہلِ ثروت ان پر خرچ کرنے سے کتراتے رہے حتیٰ کہ زمانہ کی نیرنگیوں نے ان کو نظروں سے اوجھل کر دیا۔

چند ایک ہی ایسے تھے جو بیرون ملک پہنچ گئے یا کسی غیر ملکی جوہر شناس کی نظر میں آگئے وہ اس وقت مغربی دنیا میں کہیں نہ کہیں اہلِ مغرب کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ ایسے قابل جوہروں کے بغیر ہمارے چراغوں میں روشنی نہیں، دھواں ہی دھواں ہے۔ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے لیکن سنگدلانہ ناقدری کے سبب وہ اہلِ وطن سے ایسے نالاں ہیں کہ وطن واپسی ان کے پروگرام میں شامل ہی نہیں۔

مثلاً: میں دو ایسے بھائیوں کو جانتا ہوں جن کو قدرت نے کمپیوٹرائزڈ دماغ دیا تھا۔ کمپیوٹر جب نیا نیا آیا اور انہوں نے اسے چھوا تو انہیں یوں لگتا تھا کہ گویا کوئی مقناطیسی کشش انہیں اس کی طرف راغب کرتی اور اس سے کھیلنے پر اکساتی ہے۔ چند دنوں میں انہوں نے اس نئی ایجاد کو اندر باہر اچھی طرح چھان پھٹک لیا اور مزید جاننے کی پیاس اتنی بڑھی کہ پاکستان میں جو کچھ دستیاب ہوسکتا تھا وہ سب کچھ جلد ہی گھول کر پی گئے۔ ان کی آگے کی کارکردگی بہت تیز رفتار تھی۔

ان میں سے ایک تو جب ملو کچھ کھویا کھویا معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس پر کچھ وارد ہو رہا ہے اور وہ اسے سمیٹنے اور ضبط کرنے میں لگا ہوا ہے حتیٰ کہ انہوں نے کچھ ایسے پروگرام اور سافٹ ویئر بنائے جس سے دور دور تک ان کی شہرت ہوگئی۔ ایک ہم وطن سرمایہ دار سے ان کی بات چیت چلی کہ پیسہ وہ لگائے اور ایجادات ان کی ہوں گی مگر "بیل منڈھے نہ چڑھ سکی" حتیٰ کہ بیرونِ ملک سے ان کو آفر ہوئی اور ایسا دلکش پیکیج پیش کیا گیا کہ ان کے لیے انکار ممکن نہ رہا۔ وہ دن اور آج کا دن نجانے کس ملک میں بسیرا کیے ہوئے ہیں؟

پچھلے دنوں خبر آئی کہ ایک کم عمر پاکستانی طالبہ نے کمپیوٹر کی تاریخ میں نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے اور اس نے اس وقت ایم سی پی (مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل) ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے، جب اس کی عمر صرف نو سال نو ماہ اور گیارہ دن تھی۔ اس انتہائی غیر معمولی کارکردگی نے جہاں ساری دنیا کو چونکا دیا وہاں انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سافٹ ویئر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بل گیٹس بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے اپنے کارندے دوڑائے اور اس انوکھی بچی سے ملنے کے لیے خصوصی طور پر اسے امریکا بلوالیا۔ جب بل گیٹس کے کارندے پاکستان آئے اور اخبار میں اس بچی کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں تو اس وقت دل میں ہوک اٹھی کہ کیا پاکستان

کی چودہ کروڑ آبادی میں ایسا کوئی صاحب دل اور صاحب حیثیت نہ تھا جو اس بچی کی حوصلہ افزائی کرتا، اس نعمتِ خداوندی کی قدر کرتا۔ مانا کہ مولوی ملّا اور مدرسے کے خیراتی روٹیاں کھانے والے طالب جان آپ جناب کی نظر میں حقیر اور مبغوض ہیں، ان میں سے اگر کسی نے کم عمر ترین حافظ ہونے کا اعزاز حاصل کیا تو کیا تیر مارا (پچھلے سال کراچی کے ایک بچے نے اس حوالے سے انوکھی مثال قائم کی تھی) مگر یہ بچی تو آپ کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے، اس کا کارنامہ تو آپ کے نزدیک بھی کارنامہ ہے پھر اس کی قدر افزائی سے بدقسمتی کے علاوہ اور کیا چیز مانع ہے؟ ارفع کریم نامی اس بچی کے متعلق مزید معلوم ہوا کہ فیصل آباد کے نواحی گاؤں سے تعلق رکھنے والی یہ چھوٹی سی بچی شاعر بھی ہے اور انگریزی میں طبع آزمائی کرتی ہے۔ اس نے بل گیٹس کو اپنی انگریزی نظم جو اس نے جہاز کے سفر کے دوران لکھی تھی پیش کی تو دیکھنے والوں نے ان کی ملاقات پر تبصرہ کیا: ''ارفع کریم بل گیٹس سے اتنی متاثر دکھائی نہ دیتی تھی جتنا بل گیٹس اس ہونہار پاکستانی بچی سے متاثر نظر آتا تھا۔'' لیکن وطن میں اس کی حوصلہ افزائی کا کیا حال ہے؟ اسی کی زبانی سنیے:

''میں نے نومبر 2004ء میں یہ ریکارڈ قائم کیا۔ تمام دنیا کو پتہ چل گیا لیکن ہمارے ملک میں کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ جب بل گیٹس نے مجھے بلا کر ملاقات کی تو ایک دم میری اہمیت بڑھ گئی۔ گویا میرا اصل کارنامہ کوئی کارنامہ نہ ہوا بلکہ بل گیٹس سے ملاقات اصل کارنامہ ٹھہرا کہ اس جیسے شخص نے مجھے بلایا اور ملاقات کا اعزاز بخشا۔''

اس بچی کے شکوے کو دوبارہ پڑھیے۔ دکھ درد اور رنج کی لہر دل پر چھریاں سی چلاتی محسوس ہوتی ہے۔ قسم بخدا! اللہ رحیم وکریم کی نعمتوں کا ناشکرا ہم پاکستانیوں سے بڑھ کر کوئی کیا ہوگا؟

چند سال پہلے کراچی کی ایک یونیورسٹی میں تین طلبہ نے مل کر گاڑی بنائی۔ طلبہ کے ایک دوسرے گروپ نے گاڑی کی حفاظت اور چھننے سے بچانے کے لیے عجیب وغریب آلہ ایجاد کیا۔ پشاور کے ایک طالب علم نے دو نشستوں والا طیارہ بنایا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر اسے اخراجات دستیاب ہو جائیں تو وہ اس پر پورے پاکستان کا چکر لگانا چاہتا ہے۔ اس کا کارنامہ اور خواہش اخباروں میں چھپی لیکن مدارس کے طلبہ کو نا اہلی کا طعنہ دینے والے کسی بااقتدار ہستی نے اس کے لیے کچھ کیا نہ ''ناجی'' ٹائپ میٹرک پاس کسی منہ پھٹ صحافی کو توفیق ہوئی کہ اس باصلاحیت نوجوان کی زبانی کلامی صحیح، حوصلہ افزائی تو کرے۔

کینیڈا کے ایک اسکول میں پاکستان، صومالیہ اور موریطانیہ کے تین بچوں نے مل کر ایک ایسی ایجاد کی جس سے کسی بھی انجن کی کارکردگی کو کئی گنا بڑھایا جا سکتا ہے۔ کینیڈا والوں نے ان کے اعزاز میں شاندار تقریب منعقد کی اور پرکشش اسکالرشپ کا اعلان کیا۔ گویا انہیں مقید کر لیا کہ وہ اب عمر بھر انہی کے آنگن کو روشن رکھنے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرتے رہیں گے۔ کینیڈا میں متعین پاکستانی سفیر کو تو رہنے دیجیے، ہمارے وزیر تعلیم جاوید اشرف قاضی صاحب جب کینیڈا گئے اور ایک بے ہودہ موضوع پر تقریر کرنے والے پاکستانی بچے کو انعام دیا تو انہیں خیال بھی نہ آیا کہ اس پاکستانی بچے کو بھی کچھ پیش کرتے جس نے ایک بامعنی کام میں حصہ لیا تھا اور شاندار اور قابلِ فخر کامیابی حاصل کی تھی۔

پچھلے دنوں ایک صاحب کے ہاں جانا ہوا۔ وہ اپنے چھوٹے سے بچے کو اس بات پر ڈانٹ رہے تھے کہ اس نے ایک مرتبہ پھر ان کی گھڑی کھول کر پرزے بکھیر دیے ہیں۔ تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ یہ بچہ گھر میں آنے والی کسی مشینری کو جب تک کھول نہ لے اسے چین نہیں آتا۔ اس چھوٹی سی عمر میں پیچ کس پر اس کے ہاتھ اور مشین کے پرزوں کی فٹنگ پر اس کا دماغ اس

تیزی سے چلتا ہے کہ چھوٹا سا ''جن'' معلوم ہوتا ہے۔

بندہ نے ان صاحب سے عرض کیا: ''اس میں ناراض ہونے اور ڈانٹنے کی کون سی بات ہے؟ آپ کو خوش ہونا چاہیے آپ کے گھر میں بھی دیا جل اُٹھا ہے۔ اس بچے کو سائنس کی تعلیم دلوایے اور ساتھ ہی یہ بھی دماغ میں بٹھاتے رہیے کہ جب کام کا ہو جائے تو خدارا ملک وملت کو نہ بھولے۔'' کچھ دنوں پہلے ایک صاحب اپنی بچی کو لے آئے کہ اسے دم کر دیجیے۔ پوچھا کیا مسئلہ ہے؟ ارشاد ہوا: ''پڑھتی نہیں، سارا دن کمرے میں گھسی ہاتھ میں کاغذ لیے پنسل منہ میں چباتی رہتی ہے۔''

اس پر بندہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ بچی کو بلا کر پوچھا: ''بیٹا آپ کو سب سے اچھی چیز کیا لگتی ہے؟''

بولی: ''مجھ کو کہانیاں لکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔''

''کہانیاں لکھنے میں، ذرا دکھایے تو سہی کیا لکھا ہے؟'' بندہ نے جب سرسری سی نظر ڈالی تو یقین نہ آیا کہ ایسی جملہ بندی ومنظر نگاری اور ایسی مکالمہ نویسی سات آٹھ سال کی بچی نے کی ہوگی لیکن ''مجرم'' بھی سامنے تھا، ''جرم'' کا ثبوت (بچوں کی کہانیاں) اور آلۂ جرم (چبائی ہوئی پنسلیں) بھی ساتھ تھا اس لیے ان کے والد کو سمجھانا پڑا کہ جب بھی یہ بچی کوئی پنسل چبا کر ختم کرے، اس کی لکھی ہوئی کہانیاں ہمیں بھجوا دیا کیجیے۔ اس کے لیے دعا کریں گے ان شاء اللہ اسے شفا ہو جائے گی۔

حضرات محترم! ہمارے ملک میں جوہر شناسی اور قدر افزائی کی ایسی مثالیں اگر مزید لکھی جائیں تو کاغذوں کے انبار لگ جائیں گے مگر چھوڑیے ہم نے تازہ تازہ جشنِ آزادی منایا ہے، موسیقی، تھیٹر اور بسنت کو رواج دینے کا عہد کیا ہے، ان باتوں میں پڑ کر کیا مزا خراب کریں۔ یہ بات البتہ آخر میں کہنا چاہوں گا کہ مذکورہ بالا تمام مثالیں اگرچہ عصری علوم سے تعلق رکھتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدارس کی گودڑیوں میں لعل نہیں پائے جاتے۔ مدارس میں ان کا تناسب تو کہیں زیادہ ہے۔ سردست ایک مثال کافی ہوگی۔

اسلام آباد میں مری روڈ پر ایک مدرسہ ہے ''ادارہ علوم اسلامی'' اس مدرسے میں درسِ نظامی کے ساتھ بی اے تک مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بچوں نے پاکستان کی تعلیمی تاریخ کا ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے جو مٹی ڈمٹی یاد کرانے اور پینٹ ٹائی کسنے کا طریقہ سکھانے والے مہنگے ترین اسکول کبھی نہیں توڑ سکتے ...... میں دہراتا ہوں: کبھی نہیں توڑ سکتے ...... بلکہ وہ غریب گھرانے کے ان بچوں کا ریکارڈ سنیں تو انہیں پسینہ آجائے۔ بے سروسامانی کے عالم میں تعلیم حاصل کرنے والے یہ بچے فیڈرل بورڈ میں ہر سال ابتدائی تمام پوزیشنیں اس طرح سمیٹ لیتے ہیں جیسے کوئی بیری کے درخت کے نیچے گزرتے وقت پک کر گرنے والے بیر اٹھا کر جیب میں بھر لیتا ہے۔ گزشتہ سال میٹرک کی پہلی 14 پوزیشنیں انہی کی تھیں۔ اس سال میٹرک کے علاوہ انہوں نے ایف اے میں چار پوزیشنیں ہنستے کھیلتے حاصل کر لیں مگر ہوا کیا؟ یہ مدرسہ اب بھی کسمپرسی کا شکار ہے اور آیندہ بھی امید نہیں کہ اربابِ اقتدار یا اہلیانِ وطن اس کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

جوہر شناسی اور قدر افزائی میں ہم لوگ اتنے مستعد ہیں کہ اگر یہی حال رہا تو عالمِ اسلام سے بالعموم اور پاکستان سے بالخصوص کام کے لوگ کھچ کھچ کر باہر جاتے اور مغرب کے چراغوں کا ایندھن بنتے رہیں گے۔ قدرت ہماری جھولیاں بھرنے میں بخل نہیں کر رہی، مگر ہم کبھی خاندانی منصوبہ بندی، کبھی قومی غفلت ولا پرواہی اور کبھی دیدہ دانستہ خیانت وکام چوری کے سبب قدرت کی ان نعمتوں کو سنبھال نہیں رہے۔ جس طرح سوراخ والا مٹکا کبھی نہیں بھرتا اس طرح وہ قوم نہیں پنپ سکتی جو اپنی جھولی کا سوراخ رفو نہیں کرتی، اس سے گر کر ضائع ہونے والے قیمتی لعل وجواہر کی فکر نہیں کرتی۔

خونریز تھپڑ

محبّ علی آفریدی، سوات

ضربِ مؤمن کے گزشتہ شماروں میں چھپنے والے بولتے نقشے میں ''گودڑی کے لعل'' کو قارئین کے حلقے میں بہت پسند کیا گیا۔ اس حوالے سے مختلف خطوط اور مضامین وصول ہوئے جن میں سے صرف ایک کو یہاں اس امید پر شائع کیا جارہا ہے کہ ہمارے ملک کے اربابِ اقتدار، صاحبِ حیثیت افراد اور اساتذہ ومربی حضرات کو گودڑی میں چھپا ایسا لعل ہاتھ لگے تو وہ اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔

☆......☆......☆

شمارہ نمبر 36 میں مفتی ابولبابہ شاہ منصور کا مضمون ''گودڑی کے لعل'' پڑھا، بڑا اچھا لگا۔ ویسے سچ بتاؤں تو مجھے اپنا ماضی یاد آیا۔ بچپن سے ایک تجسس ہوا کرتا تھا کہ جس چیز کو دیکھتا، اس کو اندر سے سمجھنے کی کوشش کرتا کہ یہ مشین وغیرہ اندرونی طور پر کس طرح کام کرتی ہے؟ اسکول میں سائنس پسندیدہ مضمون تھا اس لیے استاد جب کوئی سبق پڑھاتے تو گھر میں تجربہ ضرور کرتا جس کی وجہ سے بعض اوقات مار بھی پڑتی۔

مجھے اب بھی یاد ہے کہ ہمارے گھر میں اس وقت بجلی نہیں تھی۔ ایک دوست کے گھر تجربہ کرنے گیا (بجلی کی مدد سے کوئی گیس بنانا تھی) گیس تو بن گئی لیکن بجلی کی تاریں کمزور ہونے کی وجہ سے جل گئیں، بھاگ کر جان بچائی۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب استاد سے اس بات پر سخت مار کھائی تھی جب انہوں نے کہا کہ زمین سورج کے گرد گول چکر لگاتی ہے تو میں نے پوچھا: ''استاد جی! پھر موسم کس طرح تبدیل ہوجاتے ہیں؟''

اس پر استاد نے کہا: ''بالکل گول نہیں بلکہ انڈے کی طرح چکر لگاتی ہے۔''

اس پر میں نے پوچھا: ''پھر تو دو موسم ہونے چاہیے تھے۔'' اس پر استاد کو غصہ آیا اور ڈنڈے سے خوب پٹائی کی۔

وہ دن بھی یاد ہے جب استاد نے کہا: ''آکسیجن آگ جلانے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ آگ بجھانے میں مدد دیتی ہے۔''

پھر جب انہوں نے کہا: ''ہم جب سانس لیتے ہیں تو آکسیجن اندر کھینچتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ باہر نکالتے ہیں۔''

تو میں نے پوچھا: ''میری ماں جب آگ کو پھونک مارتی ہے، وہ تو جل اُٹھتی ہے۔''

اس پر استاذ نے میرے منہ پر تھپڑ مارا، ان کے ہاتھ میں قلم تھا جس کی وجہ سے میرے منہ سے خون بہنے لگا اور فرمانے لگے: ''بڑا آیا سائنس دان!''

پھر میں کالج آیا اور ساتھ ہی ہمارا خاندان دوسری جگہ شفٹ ہوا۔ اس جگہ بجلی تو تھی مگر لوڈ شیڈنگ گھنٹوں رہتی تھی۔ اس پر میرے ذہن میں ایک خودکار جنریٹر بنانے کا خیال آیا لیکن اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی جو کہ میرے پاس تھے نہیں۔ اس اثنا

میں مجھے کالج سے ایک مرتبہ اسکالرشپ ملا جو 1450 روپے تھا۔ اس پر میں نے ابتدائی سامان خریدا جس پر 12، 13 سو روپے خرچ ہوئے لیکن کچھ اور سامان تھا جس پر تقریباً 5000 روپے لاگت آنی تھی۔ میں اس تگ ودو میں تھا کہ کہیں سے کچھ پیسے مل جائیں تو تھوڑا تھوڑا کر کے سامان خریدوں گا لیکن جب میں نے اس کا ذکر چند دوستوں سے کیا کہ ایسی چیز بنا رہا ہوں تو انہوں نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا: ''اگر ایسا ممکن ہوتا تو جاپان امریکا وغیرہ کب کے بنا چکے ہوتے لیکن یہ چونکہ ممکن نہیں اسی لیے وہ بھی نہیں بنا سکے۔''

یہ ایسا جنریٹر ہوتا کہ جس میں کبھی نہ تیل نہ پیٹرول وغیرہ کی ضرورت پڑتی بلکہ یہ خود کار نظام کے تحت بغیر کسی رکاوٹ کے بجلی دیتا رہتا۔ بس میں نے ارادہ ہی ملتوی کر دیا، وہ ادھورا سامان اب بھی گھر میں پڑا ہے۔

پھر میں نے ایک ٹیکنیکل ادارے میں داخلہ لیا (ریفریجریشن، ایئر کنڈیشن، الیکٹرک اور ویلڈنگ) میں نے وہاں لکڑی سے ایک فریج بنایا جو کہ اب بھی وہاں موجود ہے اور نئے لڑکوں کو اس پر پڑھایا جاتا ہے۔ وہاں میں نے تینوں کلاسوں کو ٹاپ کیا، پھر حکومت کو قرض کی درخواست کی لیکن 19 فیصد سود کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

بہرحال کچھ کرنے کی تمنا تھی جو تشنہ رہی۔ میں نے کمپیوٹر میں داخلہ لے لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا یہ مجھے پہلے سے آتا ہے کیونکہ میں نے پہلے سات دنوں میں تین کلاسوں کا کورس پڑھا اور استاد نے مجھے چوتھی کلاس میں بٹھایا۔ پھر اس سے بھی آگے نکل گیا اور چھ مہینے کا کورس 2 ماہ میں ختم کر دیا۔ پرنسپل سے سند مانگی تو کہا کہ چھ مہینوں کی فیس دے دو سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ میں نے سند چھوڑ دی اور دوسرے ادارے سے اور کورسز کر لیے۔

پھر مجھے نوکری مل گئی، ادارے کے لیے میں نے بہت سارے پروگرام بنائے اور جو کام پہلے Manual طریقے سے ہفتوں میں کئی لوگ مل کر کرتے تھے اب کمپیوٹر کے ذریعے ایک بندہ ایک گھنٹے میں کرنے لگا۔ (ٹرائل بیلنس، جنرل لیجر، ریکنسلیشن اور کمپیوٹر سے چیک بنانا وغیرہ) پھر ہمارے دفتر میں اسلام آباد سے ایک آفیسر آئے (ہمارا ادارہ بہت بڑا ہے پورے پاکستان میں 26 زون ہیں اور کراچی میں ہیڈ آفس کے علاوہ بیرون ملک بھی دفاتر ہیں) انہوں نے جب میرا کام دیکھا تو انہوں نے کہا یہ پورے پاکستان میں ہمارے دفاتر میں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے سالانہ اوورٹائم کی مد میں تقریباً پندرہ لاکھ روپے کی بچت ہونی تھی۔ انہوں نے کراچی بات کی اور کمپیوٹر ڈویژن کو میرے پروگرام بھجوائے۔ بس پھر کیا تھا وہاں سے لوگ میری جان کے پیچھے پڑ گئے کہ یہ پروگرام کیوں بنائے ہیں اور کیوں استعمال کر رہے ہو؟ بڑی مشکل سے جان چھڑائی لیکن شوق ابھی تک تھا کچھ کرنے کا۔ میں نے ایک اور پروگرام بنایا۔ وہ کام جو سینکڑوں آفیسر اور اسٹاف ہفتے لگا کر کرتے تھے، وہ کمپیوٹر خود بخود ایک گھنٹے میں کرتا (اس سے ہمارے ڈپارٹمنٹ کو سالانہ 18 سے 20 لاکھ روپے کی بچت کی توقع تھی) لیکن یہ تجویز دینی تھی کہ سب میری نوکری کے پیچھے پڑ گئے۔

یاد رہے میرے پروگرام اور تجویز سے 100 فیصد اگر نہیں تو 99 فیصد کرپشن ختم ہو جاتی۔ بڑی مشکل سے خدا خدا کر کے جان چھوٹی۔ آپ کا مضمون پڑھ کر ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے منہ پر استاد کا تھپڑ لگتا اور منہ میں خون آتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ چند سطریں اسی ''خونریز تھپڑ'' کی یاد میں لکھ کر آپ کو بھیج رہا ہوں۔

ایک عاجزانہ درخواست

(''تسہیل بہشتی زیور'' کی پہلی جلد کے مقدمے کے طور پر لکھا گیا)

بہشتی زیور سب سے پہلے دیکھنے کا موقع ہمیں اس وقت ملا جب ہم نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا۔ ہمارے والد صاحب کے پاس ایک موٹی سی کتاب تھی۔ قرآن شریف کے بعد ہمارے گھر میں کوئی مقدس چیز تھی تو یہی کتاب تھی۔ چمڑے کی جلد میں ملفوف اس کتاب کو والد صاحب انتہائی عقیدت واحترام سے اُٹھاتے۔ انہوں نے اسے قرآن کریم کی طرح غلاف میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اسے عقیدت سے اُٹھاتے، بہت احترام سے غلاف سے نکالتے، احتیاط سے اس کے بوسیدہ اوراق اُلٹتے اور جلد ہی مطلوبہ جگہ ایسے تلاش کر لیتے جیسے اس کا صفحہ صفحہ انہوں نے پڑھ رکھا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اوراق کو پلٹنے میں والد صاحب کی غایت درجہ احتیاط میں کتاب کی بوسیدگی کا اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ عقیدت واحترام کی وارفتگی انہیں اس آہستہ روی پر مجبور کرتی تھی۔ بہشتی زیور متعدد المقاصد کتاب تھی۔ والد صاحب نے ہم سب بہن بھائیوں کی تاریخ پیدائش اور دیگر اہم واقعات کی مختصر یادداشتیں اسی پر تحریر کر رکھی تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے بیچ بیچ میں آدھے سوائے خالی صفحات یا حواشی کو منتخب کر رکھا تھا۔

کوئی مسئلہ دیکھنا ہوتا یا تعویذ دینا ہوتا تو بھی بہشتی زیور ہی پہلا اور آخری مرجع تھا۔ تعویذ لکھنے میں کام آنے والے کاغذ کے لمبے یا مربع مستطیل ٹکڑے بہشتی زیور میں رکھے ہوتے تھے۔ یہ ٹکڑے کچھ تو لکھے ہوتے اور کچھ ان لکھے، لیکن بوقتِ ضرورت برآمد اسی کتاب سے ہوتے تھے۔ بہشتی زیور کے حوالے سے بچپن کی یادوں کو جتنا بھی کریدا جائے، گہرے عقیدت واحترام کے رویّوں کی تہیں ہٹتی چلی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے بعد اسی کا مقام ومنصب تھا اور یہ بات ایک ہمارے گھرانے پر ہی کیا منحصر، برصغیر میں کون سا گھر ہوگا جس کی دینی وروحانی ضرورت کا مرجع ومنبع اور عقیدت کا محور یہ کتاب نہ رہی ہو۔

حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کی کیا عجیب شان رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانانِ برصغیر پر خاص نظر رحمت فرمائی تھی کہ انہیں دیوبند جیسے علمی ادارہ اور اس ادارے سے وابستہ دیگر متبرک شخصیات کے ساتھ حضرت تھانوی جیسی جامع الکمالات علمی وروحانی شخصیت سے فیض اُٹھانے کا موقع دیا۔ ظاہری علم کی طرف جائیں تو کون سا فن ہے جس میں آپ کا شاندار تحقیقی کام نہیں اور علم باطن کی جانب نگاہ دوڑائیں تو اصلاح وارشاد اور تربیت وتزکیہ کی کون سی جہت ہے جس میں حضرت کی محیر العقول خدمات صدقہ جاریہ کے طور پر چہار سُو پھیلی نظر نہیں آتیں۔ تفسیر وحدیث ہو یا فقہ وفتویٰ، سیرت طیبہ کا دل گداز موضوع ہو یا منطق وفلسفہ کی سنگلاخ زمین، کوئی فن ایسا نہیں جس میں آپ کے عبقری الصفت قلم نے وقیع نگارشات یادگار نہ چھوڑی ہوں۔

ان بلند پایہ علمی کاموں کی کثرت اور تنوع کو دیکھ کر آپ کو مجددِ ملت کا خطاب بھی دیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر آپ کے علمی کاموں کو آپ کی زندگی کے بابرکت دنوں پر تقسیم کیا جائے تو فی دن کئی صفحات بنتے ہیں۔ یہ تمام تبصرے بجا طور پر درست اور برمحل ہیں لیکن بہشتی زیور کی شکل میں عوام الناس کو جو تحفہ آپ نے دیا وہ بلاشبہ ایک منفرد شاہکار اور لازوال یادگار ہے۔ علماء ہوں یا عوام، سات پردوں میں رہنے والی گھریلو خواتین ہوں یا جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے روشن خیال حضرات...... سب کے سب اس سے یکساں طور پر مستفید ہوتے رہے ہیں اور اس کتاب نے گھرداری کے اُصولوں اور گھریلو چٹکلوں سے لے کر پیچیدہ دینی مسائل میں محقق اور مستند اقوال تک راہنمائی میں وہ بے مثال کردار ادا کیا ہے کہ اگر پوچھا جائے: وہ کون سی کتاب ہے جس نے گزشتہ صدی میں اُردو خواں طبقے کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟ تو جواب میں بہشتی زیور کا مقابلہ شاید ہی کوئی کتاب کر سکے۔

بہشتی زیور بنیادی طور پر خواتین اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی گئی تھی لیکن اس کی مقبولیت اور اس سے استفادہ اس درجہ کا تھا کہ رفتہ رفتہ "عوامی دینی نصاب" بن گئی۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اُردو پڑھ سکتا ہو، اسے دین کی شُد بد ہو اور اس نے اس کتاب کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ "وقت بدل جاتا ہے مگر کتابیں زندہ رہتی ہیں۔" اس مقولے کا مصداق بہشتی زیور سے بڑھ کر کیا چیز ہوگی؟ خدا جانے اس کے کتنے ایڈیشن چھپے؟ کہاں تک یہ کتاب پہنچی اور کب تک اس کا فیض پہنچتا رہے گا؟

بہشتی زیور اُردو جیسی زندہ تابندہ زبان میں ہے اور زندہ زبانوں کو تعبیرات، محاورات اور اسلوب بیان کی تبدیلی نیا رنگ وروپ عطا کرتی رہتی ہے۔ یہی تبدیلی اور تغیر بولیوں اور زبانوں کا حسن ہے۔ اردو نے کچھ عرصے سے خصوصاً جب سے عربی وفارسی کی جگہ انگلش نے لے لی اور مختلف بولیاں سمٹ کر قریب کر آئیں، بھیس بدل کر نیا روپ دھار لیا ہے لیکن کچھ کتابیں ایسی لازوال ہوتی ہیں کہ زمان و مکان کی تبدیلی ان پر اثر نہیں کرتی۔ وہ فنی معیار اور قدرتی قبولیت کی ایسی آفاقی بلندیوں پر ہوتی ہیں کہ وقت ان کی گرد نہیں پا سکتا چہ جائیکہ ان پر اثر انداز ہو۔

بہشتی زیور بھی ایسا ہی لازوال شاہکار ہے البتہ چونکہ یہ بنیادی طور پر عوام کے لیے لکھی گئی ہے اور عوامی دینی نصاب کی پہلی اینٹ ہے اس لیے بہت سے علمائے کرام نے خصوصاً جن کو معاشرے میں دینی تعلیم عام کرنے اور عامۃ المسلمین کو دینی معلومات سے روشناس کرانے کا ذوق ہے، اس پر مختلف انداز سے تسہیل واضافات کے کام کیے۔ ان میں جناب مفتی عبدالواحد صاحب کی "مسائل بہشتی زیور" اور بیت العلم کراچی والوں کی "درسی بہشتی زیور" قابلِ ذکر ہے۔

دراصل ان کوششوں کے پیچھے یہ ذہن کارفرما رہا ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے خود اس کی تسہیل وترتیب کی اجازت دی تھی۔ دیکھیے: اصلاح خواتین: ص: 428 بحوالہٗ وعظ اصلاح الیتامیٰ ملحق حقوق وفرائض: ص402۔ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ علمائے کرام پر یہ چیز فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتی ہے کہ ہر مسلمان کو کم از کم ایک مرتبہ دین کے تمام مسائل از اول تا آخر پڑھا دینے چاہییں تا کہ اسے جائز و ناجائز، حلال وحرام کا علم ایک مرتبہ تو ہو جائے۔

دین کا اتنا بنیادی علم حاصل کرنے کے بعد بے دینی اور بدعملی کا وہ اندھیر نہیں مچتا جو آج جہالت کی وجہ سے مچا ہوا ہے اور نہ دین کی بنیادی اصطلاحات اور لازمی احکام سے واقف آدمی بے عملی اور بے راہ روی کا ویسا شکار ہوتا ہے جیسا کہ آج کل ہمارے نئی نسل اپنا حلیہ بگاڑ چکی ہے۔

تقریباً ایک عشرے سے اس بات کا احساس سخت ستاتا ہے کہ ہم نے اپنے عوام سے وفا نہیں کی۔ ہمارے مسلمان بھائی مساجد و مدارس پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں لیکن ہم ان کی بنیادی دینی ضروریات بھی ان کو فراہم نہیں کر رہے۔ اگر ہر مسجد میں درسِ قرآن کے ساتھ بہشتی زیور کا درس شروع ہو جائے تو کم از کم ہر مسلمان اپنے پروردگار کے فرامین اور شریعت کے قوانین کو ایک کم از کم ایک مرتبہ تو پڑھ لے گا اس کے بعد پھر ہر فرد کا نصیب ہے کہ اس کو عمل کی کتنی توفیق ملتی ہے۔

کم از کم علمائے کرام کو روزِ قیامت عامۃ المسلمین کی طرف سے اس شکوے کا سامنا نہ کرنا پڑے گا کہ وہ ان کی یہ معصوم سی خواہش پوری نہیں کر سکے کہ اللہ کا فرمان اور اس کے دین کا خلاصہ ایک مرتبہ ان کی نظر سے گزروا دیتے۔ تسہیلِ بہشتی زیور کا کام ''فہم دین کورس'' کے تقاضوں کے تحت شروع کیا گیا تھا اور اس پر جامعۃ الرشید کے اہلِ افتاء، اساتذہ کرام نے تین سال تک بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ بندہ نے اس کو دو مرتبہ اول تا آخر بالاستیعاب دیکھا ہے محض اس جذبے اور دلسوزی کے تحت کہ وہ فرض ادا ہو سکے جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ جیسی عظیم شخصیات کی اس عظیم کتاب اور ہمارے مسلمان بھائیوں کا ہم پر ہے۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو وہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے نسبت کی برکت سے ہے اور اگر کوئی کمی ہے تو وہ ہمارے نفوسِ امّارہ کی کم نصیبی ہے۔

کتاب کی جلد اوّل آپ کے ہاتھ میں ہے، دوسری جلد پر کام تیزی سے جاری ہے۔ اس کے بعد ہر جلد کی ورک بک بھی جدید انداز میں تیار کی جائے گی ان شاء اللہ العزیز۔ جلد اول پر کام کی نوعیت پشتی سرورق پر دی گئی ہے جسے تمام قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اہلِ اسلام میں سے جس کے ہاتھ میں یہ کتاب پہنچے، ہمارے معزز علمائے کرام، محترم دانش ور حضرات، عام قارئین، سب سے ہماری دست بستہ عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے ہمیں خیر خواہانہ مشوروں اور ناصحانہ تنقید سے محروم نہ رکھیے تا کہ اگلی طباعتوں میں اس کی اصلاح اور بہتری ممکن ہو اور ہم سب مل جل کر ایک نیک مقصد کے لیے پیش رفت کر سکیں۔

پہلی اینٹ

(''تسہیل بہشتی زیور'' کی دوسری جلد کے مقدمے کے طور پر لکھا گیا)

قرآن وحدیث سرچشمۂ ہدایت اور منبع روحانیت ہیں۔ جو ان سے چمٹا رہے گا اس کو گمراہی کی وادیوں میں چلنے والی شیطانی ہوائیں بھٹکا نہیں سکتیں۔ قرآن وسنت کے احکام کا نچوڑ ''فقہ'' ہے۔ علمائے اسلام نے جب عوام الناس کی آسانی کے لیے کتاب وسنت سے اخذ کیے گئے احکام کو مرتب کیا تو علم فقہ وجود میں آیا۔ فقہی مسائل پانچ بڑے عنوانات کے تحت جمع کیے گئے ہیں: عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات (لین دین) اور عقوبات (جرم وسزا)۔ علم فقہ کی تدوین کے پہلے دور میں چونکہ وہ ان پانچوں عنوانات پر مشتمل تھا، اس لیے اسے ''الفقہ الاکبر'' بھی کہا گیا۔ بعد میں دیکھا گیا کہ پہلے دو عنوانات اس قدر اہم ہیں کہ ان پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں شاخوں نے ترقی پا کر مستقل علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ عقائد سے متعلقہ مسائل ''علم الکلام'' کے نام سے اور اخلاق کی تربیت سے متعلق احکام ''علم تصوف'' کی شکل میں مدون ہو گئے۔ اب فقہ میں آخری تین عنوانات بچ گئے۔ ان تینوں میں سے ہر ایک کی پانچ پانچ قسمیں ہیں۔ گویا کہ ذیلی عنوانات پندرہ ہو گئے جن پر آج تک علمِ فقہ کی بنیاد کی حیثیت سے تحقیقی کام ہوتا چلا آیا ہے۔ زمانہ کی تبدیلی اور سماج کے بدلنے سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کی تلاش کا کام جاری وساری ہے اور فقہائے اُمت اپنی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے مسلمانوں کی راہنمائی کے ساتھ اس عظیم ذخیرے میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔

اچھے وقتوں میں یہ روایت ہوتی تھی کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان ''قدوری، کنز'' (فقہ کی ابتدائی دو کتابوں کا نام ہے) تک پڑھا ہوا ہوتا تھا لہٰذا اسے فرائض وسنن اور حلال، حرام کی اچھی طرح تمیز ہوتی تھی مگر مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی استعمار کے برصغیر پر قبضے کے ساتھ ہی یہ شاندار تاریخی روایت ختم ہو گئی۔ انگریز وائسرائے اور افسران کی شکل میں آئے ہوئے یہودیوں نے ہندوستان بھر کے اسکولوں کے لیے نصابِ تعلیم وضع کیا جس کی رُو سے مذہب کو معیشت وتجارت اور سیاست وعدالت میں کوئی دخل نہ رہے۔ چنانچہ آپ پہلی جماعت کی اسلامیات سے لے کر ایم اے تک کی کتابیں کھنگال ڈالیے آپ کو عبادت کے علاوہ فقہ کی دو اہم شاخوں: معاملات (بیع وشراء، مشارکہ ومضاربہ، مرابحہ واجارہ وغیرہ نیز نکاح وطلاق، وصیت ووراثت وغیرہ) اور عقوبات (حدود وقصاص، دیات وتعزیرات) کا ایک لفظ بھی نہیں ملے گا۔ یہ غیر شعوری طور پر اس بات کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے کہ مذہب کو ہماری تجارت، معیشت، عدالت اور سیاست میں کوئی دخل نہیں۔ ہمارے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) دیوانی قوانین (لین دین کے تنازعات کا حل) اور فوجداری قوانین (جرم وسزا سے متعلق تعزیراتی دفعات) کی بنیاد قرآن وسنت اور اس سے ماخوذ احکام یعنی ''فقہ'' پر نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے من گھڑت اُصول وضوابط پر ہو گی۔ چنانچہ اس نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اسکول وکالج کے طلبہ کو چند سورتیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی چند باتیں (جن میں جہاد، نیکی کے نفاذ اور برائی کے خاتمے کی کوشش کا کوئی ذکر نہ ہو) کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ عملی زندگی میں دینِ اسلام ایک مسلمان سے کیا چاہتا ہے؟ چنانچہ جس طرح کٹر عیسائی

ممالک میں بھی عیسائیت کو سیاست اور عیسائی پادریوں کو عدالت اور معیشت سے دیس نکالا دے دیا گیا ہے اور وہاں عیسائیت صرف چرچ تک اور چرچ اتوار کے دن کی ''سروس'' تک محدود ہے، یہی حشر مسلمان ممالک کا بھی ہوتا جارہا ہے۔

مثلاً: جب کوئی نوجوان یونیورسٹی سے فارغ ہوکر ملازمت شروع کرتا ہے اسے ملازمت کے شرعی قواعد (احکام اجارہ) معلوم ہونے چاہییں مگر آپ صبح کسی سڑک کے کنارے کھڑے ہوجائیں اور سوٹ بوٹ میں کسے ہوئے، تازہ شیو اور چمکتے سوٹ کیس کے ساتھ دفتر جانے والے کسی نوجوان سے پوچھیں کہ آجر ومستاجر کے لیے شریعت میں کیا ہدایات ہیں۔ ان کے باہمی تعلق کو اسلام کیسے سنوارتا ہے؟ تو ہونّقوں کی طرح آپ کا منہ تکنے کے علاوہ کچھ نہ کرسکے گا۔

آپ کو ایسے ایسے لوگ ملیں گے جو چھ چھ، آٹھ آٹھ بچوں کے باپ ہوں گے مگر یہ نہ بتاسکیں گے کہ نکاح کن چیزوں سے قائم ہوتا ہے اور کن باتوں سے ختم ہوجاتا ہے؟ ایسے معروف تاجروں اور بزنس مینوں کی بھی کمی نہیں بلکہ دین داری میں معروف بہت سے حاجی صاحبان بھی ایسے ملیں گے جو تجارت کے جائز وناجائز ہونے کے موٹے موٹے اُصول نہ بتاسکیں گے۔ سود اور جوا کیا چیز ہے؟ کن وجوہ سے سود حرام ہوجاتا ہے؟ مسجد کمیٹی کے صدر صاحب بھی ان سوالوں کا جواب نہیں جانتے۔ یہ سارا کمال لارڈ میکالے نامی اس یہودی دانش ور کے ترتیب دیے ہوئے نصابِ تعلیم کا ہے جس نے فارمی مسلمانوں کی کھیپ پیدا کرکے ایسی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ ہم پر مسلط کردی ہے جن کے اندر کی اسلامی روح فنا ہوچکی ہے اور وہ سامراجی استعمار کی خدمت کے علاوہ کسی کام کے نہیں۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ انگریزی سلطنت کو چلانے والے بابو (انگریز میں ببون، لنگور کو کہتے ہیں، مشہور ہے کہ اسی سے بابو بنایا گیا) مہیا کیے بلکہ نظامِ تعلیم کو مادیت پرستی پر استوار کرکے روحانیت کی بنیادوں پر تیشہ چلادیا۔ سامراج کی اس شیطانی یلغار کے سامنے دینی مدارس آخری چٹان ہیں، جنہوں نے علومِ قرآن وسنت کا چراغ روشن کررکھا ہے لیکن مدارس کی تنظیم وترقی کی کوششوں کے ساتھ عوام الناس کو بھی بنیادی دینی علوم سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مساجد میں قرآن وحدیث کے دروس کے ساتھ طریقۂ طہارت سے تقسیم میراث تک شریعت کے احکام آسان انداز میں سبقاً سبقاً پڑھائے جائیں۔ مسلمانوں کو حرام وحلال کی پہچان کروائی جائے اور ان میں جائز ناجائز کی تفریق کا شعور پیدا کیا جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ عام مسلمان ہوش سنبھالنے تک اسلامی احکام کے کئی مجموعے پڑھ لیتا تھا اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق مسائل سے واقف ہوتا تھا۔ آج فقہی مسائل کی آسان تعبیر وتشریح پر مشتمل عوامی درسی نصاب مروّجہ اسلوب میں تیار کرنے کی سخت ضرورت ہے ورنہ اسلامیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے والے اور سیرت پر کتاب کی تصنیف کا اعزاز پانے والے بھی نہ سمجھ سکیں گے کہ موجودہ بینکنگ میں سود اور مروّجہ انشورنس میں جوا کیوں ہے؟ مشارکہ ومضاربہ کسے کہتے ہیں اور سلم واستصناع ہماری بہت سی معاشی ضروریات کس طرح پورا کرتے ہیں؟ اُمید ہے کہ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پہلی اینٹ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ علمائے کرام کو اس میدان میں مزید معیاری اور اعلیٰ درجے کے مثالی کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

ہنگامی مکاتب کا مختصر نصاب

کہتے ہیں سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ سفر سے نہ صرف انسان کی صحت اور ذہنی کیفیت پر اچھا اثر پڑتا ہے بلکہ ہر شخص اپنے ظرف کے بقدر تجربات، معلومات اور عملی اسباق لے کر لوٹتا ہے۔ احوالِ زمانہ کو براہِ راست مشاہدہ کرنے سے سوچ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملنے سے انسان کو دنیا برتنے کا ڈھنگ اچھی طرح آ جاتا ہے۔ ہمیں بدین آنے جانے سے یہ سب کچھ حاصل ہوا یا نہ......... لیکن اساتذہ کرام اور بزرگوں سے سنی ہوئی چند نصیحتوں کے فوائد کھلی آنکھوں سے دیکھنا نصیب ہو گیا۔ مثلاً: اساتذہ سے سنا تھا کہ کبھی اپنی عقل کو حرفِ آخر نہیں سمجھنا چاہیے کہ کسی چیز کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا معیار اور مدار اپنی سمجھ کو بنا لیا جائے۔ بڑوں کی بات اگر ادراک کی گرفت میں نہ آئے تو بھی اسے تحقیقاً نہ سہی تقلیداً مان لینا چاہیے اور اپنی ناقص عقل کو ان کے کامل تجربے پر فوقیت دینے کی حماقت نہ کرنی چاہیے۔ زمانۂ طالب علمی میں بہت سے طلبہ کی طرح ہمیں بھی سمجھ نہ آتا تھا کہ ہم جیسے ناکارہ لوگ پڑھ کر کیا کریں گے۔ ہم دین اور اہل دین کے کسی کام کے نہیں۔ بلاوجہ اساتذہ اور مدرسے پر بوجھ ہیں۔ جب اس اشکال نے بہت ستایا تو ایک دن ڈرتے ڈرتے استادوں سے عرض کر ہی دی۔ دبنگ لہجے میں ارشاد ہوا: ''بس اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے پڑھتے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ غنی بادشاہ ہیں۔ اپنے در پر آ پڑنے والے کو محروم نہیں فرماتے۔ اگر تم نے اخلاص میں کھوٹ شامل نہ ہونے دیا تو رَبّ تعالیٰ قبولیت میں فرق نہ آنے دیں گے۔'' ہمارے نوجوان فضلا کو یہ نصیحت گرہ میں باندھ لینی چاہیے۔

کبھی کبھی یہ وسوسہ بھی آتا تھا کہ مدرسے والوں سے امت کو فائدہ کیا ہے؟ بس پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں۔ عوام کو تو ان سے کچھ حاصل وصول ہوتا نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ مرنے سے پہلے ان وساوس سے ''توبہ نصوح'' کی توفیق مل گئی اور اس کا ظاہری سبب بدین کے وہ اسفار ہوئے جو گزشتہ دنوں علمائے کرام کی رفاقت میں رفقائے کار کی کارکردگی دیکھنے کی غرض سے پیش آئے۔ جہالت زدہ دیہاتی علاقوں میں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ دعوت واقامتِ دین کے لیے جتنی کوششیں ہو رہی ہیں ان میں مدارس کا قیام ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں دی جانے والی تعلیم پر دین کا قیام اور بقا موقوف ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں ان مراکز میں پڑھنا پڑھانا، خدمت وتعاون کرنا یا کسی درجے میں تعلق نصیب ہے۔ آپ خود اندازہ لگایئے کہ بدین کراچی سے دور ہی کتنا ہے؟ چند گھنٹے کی مسافت ہے مگر وہاں مدارس ومکاتب نہ ہونے کے سبب حال یہ ہے کہ دیہاتی باشندوں کی اکثریت پہلا کلمہ بھی درست طریقے سے نہیں پڑھ سکتی۔ ایک صاحب آئے کہ ہمارے گاؤں کا سروے کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ امام صاحب ہیں۔ غسل کے فرائض سنانے کی خواہش کی گئی۔ فرمایا: ''غسل میں پانچ فرائض ہیں۔'' ان میں سے ایک وہ تھا جو شریعت اسلام میں ہے بقیہ چار وہ تھے جو دین سے ناواقف عوام سے سننے میں آتے رہتے ہیں۔ ایک بابا جی اپنے چار بیٹوں کو ختنہ کرانے لے کر آئے۔ سب سے چھوٹا 12 سال کا اور بڑا 22 سال کا تھا۔ یوں تو بڑی عمر کے بہت سے بچے آتے رہتے تھے لیکن ایک ہی گھر کے

چار جوان بیٹے اور کسی ایک کا بھی ختنہ نہیں ہوا تھا، نسبتاً زیادہ تعجب کی بات تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے نہ رہا گیا۔ پوچھ بیٹھے: بابا جی ان میں سے کسی کا ختنہ نہیں کروایا؟ بابا جی گویا ہوئے: ''ڈاکٹر صاحب! کیا بچوں کا ختنہ بھی کروانا چاہیے۔ وہ تو مُلّاں چاوڑا (علاقے کے معروف عالمِ دین اور جمعیت علمائے اسلام کے راہنما مولانا عبدالستار چاوڑا صاحب) نے بتایا کہ طبی کیمپ میں ختنہ بھی ہو رہا ہے آپ اپنے بچوں کو لے جاؤ۔ کیا میں بھی ختنہ کرالوں............؟'' اندازہ لگایے کہ مسلمانوں کا سا نام، ختنہ اور کلمہ وہ آخری علامتیں ہیں جو کسی انسان کا اسلام سے تعلق باقی رکھتی ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا کہ اندرونِ سندھ نہ نام مسلمانوں جیسا ہے اور نہ ختنہ ہی ہوسکا ہے۔ سمجھ نہیں آتا ان بے شمار لوگوں کا کیا بنے گا جو ہمارے پڑوس میں بستے ہیں اور اللہ کی رسی کا آخری سرا بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔ چونکہ علم اہل علم سے پھیلتا ہے اور دین کا قیام و نظامِ علمِ دین سے ہے اس لیے اہلِ علم ہی دین کی اشاعت و ترویج کا مستند، قابل اعتماد اور ٹھوس ذریعہ بن سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جن علاقوں میں دینی تعلیم کی طرف توجہ نہیں وہاں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور جہاں مکاتب و مدارس کا جال بچھا ہوا ہے وہاں بے دینی کے طوفان کے باوجود بہرصورت دین کی بنیادیں مضبوطی سے قائم ہیں۔ ممکن ہے کوئی صاحب اسے مدرسوں کے ٹکڑے کھانے والے ایک ''مدرسیے'' کا جانبدارانہ تبصرہ سمجھیں لیکن الرشید ٹرسٹ نے جو ہنگامی مکاتب قائم کیے ہیں ان میں سے کسی ایک میں دس منٹ گزار لینے کے بعد اہل مدارس کا بدترین مخالف بھی ان کی برکات و فوائد کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ یہ ہنگامی بنیادوں پر قائم کیے گئے ابتدائی بلکہ ابتدائی سے بھی پہلے کے مکاتب ہیں جو بالکل مختصر اور سادہ نصاب جن سے انسان کا مسلمانی طریقے سے جنازہ ہو جائے، کی تعلیم دیتے ہیں۔ قارئین میں سے اکثر ''دہشت گردی'' کے ان مراکز میں نہ جاسکیں گے لہٰذا آیئے! ان کی چند جھلکیاں ملاحظہ کرتے ہیں۔ بیچ میں چند دوسری باتیں جو مُلّا لوگوں کو پھرتے پھراتے دیکھنے کو ملیں، سنتے چلیں گے۔

☆☆☆☆☆

یہ بدین اور کڈھن کے درمیان ایک نہر کے پشتے پر قائم الرشید خیمہ بستی نمبر 3 ہے۔ اس نہر کے ساتھ جو گاؤں آباد تھا اس کی کچھ شکل وصورت اب آہستہ آہستہ اس پانی میں سے نمودار ہو رہی ہے جو نہر کا پشتہ ٹوٹنے سے گاؤں پر چڑھ دوڑا تھا۔ سڑک سے گاؤں کی طرف اترنے والے نشیبی راستے پر پہنچ کر نسبتاً بلندی پر واقع سڑک کی طرف دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پانی کس خوفناک حد تک چڑھ رہا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی آمد و رفت گاؤں میں شروع ہوگئی ہے لیکن ابھی کیچڑ کے سبب وہ اس میں رہ نہیں سکتے، بس نہر کے کنارے بیٹھ کر اپنے گھروں کو تکتے رہتے ہیں کہ چور، ڈاکو گلی سڑی چیزیں اور لکڑیاں وغیرہ اٹھا نہ لے جائیں۔

خیمہ بستی میں داخل ہوں (یعنی نہر کے بند پر چڑھیں) تو قطار سے لگے ہوئے خیموں کے درمیان سے گزرتے ہوئے دیہاتی زندگی کے مختلف مناظر نظر آتے ہیں۔ چھوٹی نسل کی خوبصورت بکریاں اٹھکیلیاں کر رہی ہیں۔ ایک بچی سر پر ''انوں'' (مٹکے کو سر پر جمانے کے لیے بنایا گیا گول کڑا) رکھ کر اس پر گاگر دھرے چلی آ رہی ہے۔ ایک خیمے کے باہر روٹیاں پکانے کے لیے چولہا جل رہا ہے۔ ایک جگہ مچھلیاں صاف کی ہوئی رکھی ہیں جو اپنے خیمے میں سے بیٹھ کر شکار کی گئی ہیں کیونکہ نہر خیمہ کے کھونٹے سے جڑی ہوئی گزر رہی ہے۔ کنڈی ڈال کر چارپائی پر بیٹھے رہو، مچھلی لگ گئی تو بسم اللہ، نہ لگی تو بھی پروا نہیں، کروٹ بدل کر سو جائیں گے۔ خیموں کے بیچ میں ایک جگہ چار لکڑیاں کھڑی کر کے چھپر اڈال دیا گیا ہے، نیچے چٹائی کے ٹکڑے بچھے ہیں،

لیجیے مکتب تیار ہو گیا۔ وہاں گوٹھ بھر کے بچے جمع ہو جاتے ہیں اور ''ذکر بالجہر'' کے حلقے قائم کر کے سیکھنے سکھانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ قاری صاحب کے پاس سونٹی کے بجائے ٹافیاں اور بسکٹ دھرے ہیں۔ جو جلدی یاد کرے گا انعام پائے گا جو دوسروں کو یاد کرائے گا اسے دگنا انعام دیا جائے گا۔ جو نصاب مکمل کرے گا۔ (وضو، غسل مکمل نماز، دعائے قنوت، نمازِ جنازہ اور آخری دس سورتیں) اسے خوراک کے مکمل پیکج کے ساتھ کپڑوں کا جوڑا بھی ملے گا۔

وفد کے ارکان ایک بچے کی طرف اشارہ کر کے چاہتے ہیں کہ یہ ہمیں غسل کے فرائض سنائے۔ بچے کی پوری بات تو سمجھ نہیں آئی، یہ چند الفاظ یاد ہیں: گوڙي ڪرڻ (کلی کرنا) نڪ ۾ پاڻي ڏيڻ (ناک میں پانی ڈالنا)

گاؤں کے مُلّاں صاحب بھی گاؤں والوں کے ساتھ نہر کے بند پر پناہ گزیں ہیں۔ 35 سال سے اس گاؤں کے امام ہیں لیکن ڈاڑھی کو ابھی 35 دن پورے نہیں ہوئے۔ یہ معلوم نہیں کہ خود انہیں پڑھنا آتا ہے یا نہیں، مگر اتنا معلوم ہے کہ بچوں کو پڑھا نہیں سکتے لیکن ہم ان سے انتہائی عقیدت سے ہاتھ ملاتے ہیں اس واسطے کہ اس شخص کی ہمت سے گاؤں کی مسجد کا دروازہ اب تک کھلا ہے اور ابھی اس کے فرش پر گھاس اور دروازے پر تالا نہیں پڑا۔ اس کا یہ احسان بہت ہے کہ اس نے گاؤں والوں کو اذان اور نماز سے مانوس رکھا ہے ورنہ ان کی نئی نسل ان آوازوں سے بھی آشنا نہ ہوتی۔

واپسی پر گاؤں کا پٹیل (سردار اور رئیس کو پٹیل کہتے ہیں) ملا۔ ''سائیں! ہمارے بچوں سے بھی سبق سنو۔''

''پہلے آپ خود سناؤ۔''

''چلو ہم سے سن لو لیکن یہاں الگ خیمہ لگا کر دو، ہمارے بچے اس میں سبق پڑھیں گے۔''

''الگ خیمہ کیوں؟ نہر پر جا کر کیوں نہیں پڑھتے؟''

''سائیں! سمجھا کرو! ہم وہاں نہیں جا سکتے۔''

معلوم ہوا کہ کسی قدیم دشمنی کے سبب ان کا وہاں جانا ممکن نہیں لیکن یہ بھی کیا کم تھا کہ گاؤں کا وڈیرہ نماز کا سبق یاد کر رہا تھا اور اپنے بچوں کو یاد کروا کے مُلّاں لوگوں کو سنوا کر اجرائے مکتب کی درخواست کر رہا تھا۔ اس کی یہ خواہش پوری کرنا الرشید ٹرسٹ کے نوجوان اور باہمت ساتھیوں کا فرض تھا جو انہوں نے اگلے دن پورا کر دیا۔

☆☆☆☆☆

بدین پاکستان کا واحد ضلع ہے جس میں چھ شوگر ملیں ہیں، اس واسطے اس کو ''شوگر اسٹیٹ'' بھی کہتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی شوگر مل جو ملک کے ایک معروف سیاسی خاندان کی ملکیت ہے، کے مرکزی دروازے کے سامنے الرشید ٹرسٹ کی پکی مسجد بن رہی ہے جو راہ گزر پر ہے۔ یہاں کی کچی مسجد گر چکی ہے اور الرشید ٹرسٹ کی تعمیر کردہ مسجد اب چھت تک جا پہنچی ہے۔ وفد کے ارکان پوچھتے ہیں:

''یہاں کشادہ اور پکی مسجد کی ضرورت سمجھ نہیں آئی؟''

''دراصل جب گنے کا سیزن ہوتا ہے تو ٹرکوں کے ساتھ پٹھان لوگ آتے ہیں۔ وہ پکے نمازی ہوتے ہیں۔ پھر اس مسجد میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ یہ مسجد اب بھی چھوٹی ہے۔ پیچھے نہر نہ ہوتی تو اسے اور بھی کشادہ بنانا چاہیے۔''

پٹھانوں کی بھی کیا بات ہے؟ انگریز کے دور میں تحریکِ مجاہدین کے مراکز، پھر طالبان کی حمایت، پھر مجلس عمل کے ووٹ، پھر شوگر مل کی مسجد جو اُن پر تنگ پڑ جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اب ہم بڈھمی گاؤں جا پہنچے ہیں۔ یہ وہی گاؤں ہے جس کی روداد گزشتہ سے پیوستہ شمارے میں ''قارئین کی نشست'' میں چھپ چکی ہے۔ ہم مرکزی جامع مسجد پہنچتے ہیں جو تمام علاقے والوں کے لیے پانی کے دنوں میں واحد پناہ گاہ تھی۔ سامنے وہ کھمبا ہے جس سے چمٹ کر ایک عورت بہت دیر تک مدد کے لیے پکارتی رہی لیکن اسے بچانے جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ جب اس نے وہ مجبور ہو کر کھمبے کو چھوڑا تو قریب ہی وہ چکی ہے جہاں جا ٹکی اور اس کی جان بچی۔ مسجد کے سامنے سڑک پار تین قبریں ہیں۔ ایک میں ماں بیٹا دفن ہیں، ماں نے بیٹے کو جسم سے باندھ لیا تھا۔ دوسری میں میاں بیوی ہیں۔ تیسری میں نامعلوم آدمی۔ گاؤں والوں کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ انہیں قبرستان تک لے جاتے یا الگ الگ قبریں کھودتے کیونکہ نیچے سے پانی نکل آتا تھا۔ سو یہیں دفن کر دیا۔ ''یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے۔''

بڈھمی سے پہلے کئی ایسے دیہاتوں میں جانا ہوا جہاں الرشید ٹرسٹ کی چھپرا مساجد تعمیر ہو رہی تھیں۔ وفد کے ارکان دیر تک اس کے طرزِ تعمیر کو سمجھتے رہے۔ یہ کچی مسجدیں بعض پہلوؤں سے پکی مساجد سے زیادہ مفید اور آرام دہ ہوتی ہیں۔ گرمی میں ٹھنڈی اور سردی میں گرم۔ ایک مستری صاحب کے پاس لکڑی کا بڑا ''سُوا'' تھا جس میں رسی ڈال کر دیوار کو ''سی'' رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ جوش و خروش سے مستری جی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

گوٹھ مٹھن میں جن قاری صاحب کی تشکیل ہوئی ہے وہ ماشاء اللہ چونکہ عالم دین بھی ہیں اس لیے ان کی کارکردگی نے مردہ زمین میں پھول کھلا دیے ہیں۔ اس علاقے میں آپ کو سفید ٹوپی والے بچے اور نوجوان لڑکے دور سے نظر آئیں گے۔ کوئی کھیت میں کام کر رہا ہوگا اور کوئی مچھلی پکڑنے میں مصروف ہوگا۔ آپ کو گمان گزرے گا کہ کسی مدرسے کے طلبہ کی جماعت آئی ہوئی ہے لیکن یہ سب قاری عبدالبصیر صاحب کی کرامت ہے۔ کئی نوجوان ملے جنہوں نے قاری صاحب کے ہاتھ پر ڈاڑھی مونڈنے سے توبہ کر لی تھی۔ ان کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی خوب سج رہی تھی۔ یہاں قریب کے گوٹھوں میں دیہاتی بچیاں مغرب کے بعد کورس کے انداز میں سہرا (شادی کے موقع پر گایا جانے والا منظوم کلام) گایا کرتی تھیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اندھیرا چھاتے ہی قرب و جوار کے گوٹھوں سے آواز میں آواز ملا کر نماز کے سبق کی ایمان افروز صدائیں گونجتی ہیں۔ قاری صاحب نے اپنی شاگردنیوں سے کہہ رکھا ہے کہ صبح جس کی آواز زیادہ اچھی آئے گی اسے اچھا انعام ملے گا۔ یہ سب کچھ اپنے دامن میں مسرت آمیز حیرت سمیٹے ہوئے تھا لیکن ہم جب گاؤں کے عقب میں واقع ریتیلے ٹیلے پر پہنچے تو فی الواقع حیرت زدہ بلکہ مبہوت رہ گئے۔ بھری دوپہر میں خیمے کے نیچے گرم ریت پر چٹائی ڈالے دائیں طرف تیں پینتیس بچے اور بائیں طرف قنات کے اس جانب بلا مبالغہ ستر، اسی بچیاں بیٹھی تھیں جنہوں نے نصاب یاد کر رکھا تھا۔ ہم نے چند بچوں سے اور ایک بچی سے نماز کا سبق سنا۔ ''گوڙي ڪرڻ'' یہاں بھی سننے میں آیا۔ قاری صاحب کراچی گئے ہوئے تھے لیکن جو ''پنیری'' انہوں نے یہاں لگا رکھی تھی

اس کو سنبھالنا انہی کا کمال تھا۔ رفقا کا کہنا تھا کہ اخبار میں اعلان کر کے مدارس کے نوجوان فضلا سے چلہ یا عشرہ کا وقت مانگا جائے تا کہ وہ یہاں آ کر کم از کم ایک جماعت کو نصاب یاد کروادیں۔ جامعۃ الرشید کے بڑے درجات کے طلبہ کو جمع کر کے ترغیب دی گئی تو 45 طلبہ نے چھٹیوں میں ایک ماہ کا وقت دینے کا ارادہ کیا ہے جو علاقے میں پھیل کر بچوں اور بڑوں کو مختصر ہنگامی نصاب یاد کروائیں گے۔

☆☆☆☆☆

اور یہ منظر تو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ الرشید ٹرسٹ کی طرف سے پکی پکائی روٹی پروجیکٹ میں کھانا تقسیم ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ سب بچے دائیں طرف قطار سے بیٹھے ہیں، ان کے پیچھے مرد ہیں۔ سب بچیاں بائیں طرف قطار سے بیٹھی ہیں، ان کے پیچھے گھونگھٹ اوڑھے خواتین ہیں۔ کھانے کے ٹوکن تقسیم ہونے سے قبل قاری صاحب بیچ میں کھڑے ہو کر کلمہ پڑھتے ہیں۔ سب بچے اور بڑے ان کے ساتھ مل کر کلمہ پڑھتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی شامل ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل عذر کیا: ''سائیں! ہم تو ہندو ہیں۔'' ساتھیوں نے کہا: ''تو کیا ہوا؟ کلمہ پڑھنے میں بڑی برکت ہے۔'' ایک بچی سے ملوایا گیا جو ہندو قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے بڑی خوبصورت آواز میں کلمہ سنایا۔ اب یہ تو علمائے کرام ہی بتائیں گے کہ اس سے کوئی مسلمان ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن ہمیں اتنا سمجھ میں آیا کہ جو آواز زمین والوں کو بھلی لگ رہی تھی وہ آسمان والے کو بھی یقیناً اچھی لگ رہی ہوگی۔

رخصت ہونے سے قبل ہم الرشید ٹرسٹ کے کنٹرول روم میں آتے ہیں۔ دیواروں پر الگ الگ قسم کے چارٹ لگے ہیں جن میں مختلف شعبہ جات کی تازہ تفصیلات درج ہیں۔ الماری میں دھری فائلوں میں سروے فارم ترتیب سے لگے ہوئے ہیں۔ فراہمی خوراک کا الگ، تعمیرِ مساجد و مکانات کا الگ، ہنگامی امداد، روٹی پروجیکٹ اور طبی مراکز کا فارم الگ ہے۔ رجسٹروں میں اب تک کے کاموں کی تمام تفصیلات منضبط انداز میں درج ہیں۔ ذمہ دار بتاتے ہیں اگلے دن ایس ایس پی صاحب ملے تھے۔ کہہ رہے تھے مولوی صاحبان جو کام کرتے ہیں خوب جما کر کرتے ہیں۔ ہمارا عوام سے رابطہ رہتا ہے۔ ہمیں سب خبر ملتی رہتی ہے۔ بھارت کی سرحد کے رخ پر آخری بڑی آبادی علی بندر کے پاس ٹرسٹ کے وفد کو دیہاتیوں نے بتایا کہ پاک فوج نے امداد کا اعلان کیا ہے اور فوج کے کیے گئے سروے کے علاوہ وہ شخص بھی مستحق سمجھا جائے گا جس کے پاس ''الرشید ٹرسٹ'' کی سروے ٹیم کا فراہم کردہ کارڈ ہوگا۔

لوگ کہتے تھے کہ مولوی لوگ حکومت نہیں چلا سکتے۔ اب پتہ نہیں کہ یہ حکومت چلا سکتے ہیں یا نہیں؟ لیکن جو کام انہیں مل جائے اسے ضرور چلا کر دکھا دیتے ہیں۔

چاند تاروں کی دنیا

فلکیات اس علم کا نام ہے جس میں اجرامِ فلکیہ کے احوال سے بحث کی جائے۔ اجرامِ فلکیہ میں ستارے، سیارے، سیارچے، چاند، دُمدار تارے، شہاب ثاقب اور نیزک شامل ہیں۔ ستارہ اسے کہتے ہیں جس کو قدرت نے اپنی ذاتی روشنی عطا کی ہو اور سیارہ وہ ہے جو دوسرے روشن جسم سے روشنی حاصل کرے جبکہ چاند وہ فلکی جسم ہے جو کسی سیارے کے گرد گھومتا ہو۔ چونکہ سورج کی روشنی قدرت کی طرف سے اسے بخشا ہوا عطیہ ہے اس لیے وہ اصطلاحی زبان میں ستارہ ٹھہرا اور ہماری زمین چونکہ سورج کے گرد گھومتی ہے لہٰذا یہ بھی ایک سیارہ ہے اور ہماری زمین کے گرد ایک انعکاسی روشن گولہ گھومتا ہے لہٰذا زمین کے باشندوں کا چاند ایک ہی ہے جبکہ بعض سیاروں کے گرد چار چار چاند بھی چکر لگاتے ہیں اور وہ منظر بڑا دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے لہٰذا زمین والوں کا یہ سمجھنا کہ دنیا میں ایک ہی چاند ہے جو ان کی زمین سے عاشقانہ لگاؤ رکھتا ہے، شاعری کی حد تک درست ہے، حقیقت کی دنیا میں اسے صحیح نہیں مانا جاسکتا۔

ستاروں　سے　آگے　جہاں　اور　بھی　ہیں
زمیں　اور　بھی　آسماں　اور　بھی　ہیں

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جن عبادات کی ادائیگی کا حکم دیا ہے وہ دو طرح کی ہیں: ایک یومیہ جیسے نماز اور دوسری سالانہ جیسے روزہ، حج، زکوٰۃ، فطرہ، قربانی، جہاد............ حج عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض اور باقی نفل ہے لیکن ادا سال میں ایک ہی مرتبہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اقدامی جہاد کے بارے میں فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ سلطان المسلمین پر لازم ہے کہ سال میں کم از کم ایک لشکر جہاد کے لیے روانہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یومیہ عبادات کے اوقات کو سورج سے متعلق کیا ہے۔ سورج کی ٹکیہ کا مشرقی افق سے ابھرنا طلوع ہے، مغربی افق میں چھپنا غروب ہے اور دونوں افقوں کے بیچ میں آسمان کے وسط میں پہنچ جانا نصف النہار ہے۔ نصف النہار سے جتنے گھنٹے پہلے طلوع ہوتا ہے اتنے ہی گھنٹے بعد غروب ہوتا ہے۔ اسی طرح سورج کے طلوع ہونے سے جتنا پہلے فجر کا وقت شروع ہوتا ہے اتنا بعد عشاء کے وقت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سالانہ عبادات کے اوقات چاند سے وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ، شوال کا چاند دیکھ کر عید، ذی الحج کے چاند کے نویں دن حج کا رکنِ اعظم وقوف عرفات اور دسویں، گیارھویں اور بارھویں دن قربانی ادا کی جاتی ہے۔ قمری سال پورا ہونے پر صاحبِ استطاعت شخص پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور روزوں کے اختتام پر فطرہ کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ ان عبادات کے لیے چونکہ مخصوص وقت کو شرط قرار دیا گیا ہے اس لیے سورج اور چاند کی گردش کا حساب اور اس سے استفادہ مسلمانوں کے لیے ضروری قرار پایا ہے۔ پھر چاند، ستاروں سے چونکہ سمتوں اور فاصلوں کا تعین، وقت یعنی دن، ماہ، شمسی و قمری سال کی تعین بھی ان سے متعلق ہے اس لیے تجارت اور جہاد کے لیے کرۂ ارض کے طول و عرض میں آنے جانے والے مسلمان "فلکیات" نامی اس علم سے انتہائی شغف رکھتے تھے اور انہوں نے اس کے لیے

گراں قدر تحقیقی اور اکتشافی خدمات انجام دی ہیں۔

علم فلکیات، کی دو قسمیں ہیں: نظری (تھیوروٹیکل اسٹرانومی) اور عملی (پریکٹیکل اسٹرانومی) نظری سے مراد اجرام فلکیہ کا حجم، وزن، سورج سے ان کا فاصلہ، ان کی محوری اور مداری گردش اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات وغیرہ کا مطالعہ ہے۔ اس مطالعے سے ایک اہم مقصد یہ حاصل ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات، احادیث کی چند روایات اور فقہ کے کچھ مسائل کو علی وجہ البصیرت سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً: وہ آیات جو سورج چاند کی گردش اور دن رات کے آنے جانے سے پیدا ہونے والے انقلابات اور موسمی تغیرات سے متعلق ہیں اور جن میں ان نشانیوں پر غور کر کے اس خالق و مالک کو پہچاننے کی دعوت وترغیب دی گئی ہے، ان کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ احادیث جن میں اوقاتِ نماز یا رؤیت ہلال کی مباحث ہیں، یا وہ مسائلِ فقہیہ جن میں سایۂ اصلی، اختلاف مطالع یا سمت قبلہ سے 45 درجے انحراف کے باوجود نماز ہو جانے کا ذکر ہے، ان کو کماحقہ سمجھا جاسکتا ہے۔

عملی فلکیات میں مقاصد ثلثہ سے بحث کی جاتی ہے یعنی تخریجِ اوقات صلوٰۃ، تخریجِ سمت قبلہ اور مباحث رؤیت ہلال۔ ان میں سے رؤیت ہلال کی مباحث ''نظری فلکیات'' کی تعلیم کے دوران ''فصل فی القمر'' یعنی چاند کے موضوع کو فلکی مباحث کے ساتھ شرعی مسائل کو جوڑ کر پڑھانے سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہیں اور علمی حلقوں میں اس بحث کے فنی اور شرعی دونوں اعتبار سے متعارف ہو جانے کے بعد اس نزاع کا کافی حد تک حل نکل سکتا ہے، جو ہر سال رمضان کے آغاز واختتام پر دیکھنے میں آتا اور عامۃ المسلمین کی تشویش کا باعث بنتا ہے۔ اوقاتِ صلوٰۃ اور سمت قبلہ کی تخریج درحقیقت نماز کی دو شرطوں کی تکمیل ہے۔ نماز کے درست ہونے کے لیے سات شرطیں ہیں: نمازی کے جسم، کپڑوں اور جگہ کا پاک ہونا اور ستر کا ڈھانپنا۔ یہ چار شرطیں نمازی خود پوری کرسکتا ہے۔ اسی طرح ساتویں شرط نیت کرنا بھی اس کے اپنے بس میں ہے لیکن پانچویں اور چھٹی شرط بغیر ایسے عالم دین کے جو فلکیات کا ماہر ہو، خود سے معلوم نہیں کی جاسکتیں۔ اس سے اس فن کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدارس میں اس فن کی طرف رغبت اور اس کے حصول کا شوق بہت زیادہ پایا جاتا ہے لیکن چونکہ عرصہ ہوا کہ وہ دو فن جو اس علم کے لیے مبادی اور لازمی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں خاطر خواہ دسترس کے بغیر فلکیات کے مقصودی مباحث کو اچھی طرح سمجھا نہیں جاسکتا، ناپید ہو چکے ہیں اس لیے یہ فن آہستہ آہستہ ''عقدہ لاینحل'' بنتا جا رہا ہے۔ فلکیات کی کئی ایسی باتیں جو فی الواقع اتنی مشکل نہیں ہوتیں مگر دو بنیادی علوم سے ناواقفی کی وجہ سے الجھن اور گنجلک پیدا کر دیتی ہیں اور اس فن کی تحصیل کے دوران بہت سی باتیں تشنہ رہ جاتی ہیں اور ہمارے طلبہ اور فضلائے کرام چونکہ اس طرزِ تدریس کے عادی نہیں جس میں ڈگری کے شوق میں فیس جمع کروائی جائے، پھر امتحان کے دن پستول میز پر رکھ کر پینٹ کی پچھلی جیب سے ''امتحانی چابی'' نکال کر اسے جوابی کاپی پر ''پوری دیانت'' کے ساتھ ''لفظ بلفظ'' منتقل کر دیا جائے، بلکہ وہ ہر بات کو سمجھ کر آگے چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور ادھوری سمجھ ان کو مطمئن نہیں کرسکتی، اس لیے وہ فلکیات پڑھنے کے دوران وہ اس چیز سے تسکین نہیں پاتے جس کی تلاش اور شوق میں آئے تھے اور زبانِ حال سے ''نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے'' کا شکوہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دو فن جو فلکیات کے لیے ''مبادی'' کی حیثیت رکھتے ہیں جغرافیہ اور ریاضی ہیں۔ ریاضی سے اس کی تینوں شاخیں حساب، الجبرا اور جیومیٹری مراد ہیں جبکہ جیومیٹری میں ذیلی

شاخ ٹریگنومیٹری (علم المثلث، تکونیات) اور اسفریکل ٹریگنومیٹری (علم المثلث الکروی، کروی تکونیات) پڑھنی بھی ضروری ہیں۔ جغرافیہ کے بغیر فلکیات پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے زمینی حقائق سے آگاہ ہوئے بغیر خلا کی وسعتوں کی پیائش شروع کر دی جائے اور ریاضی کے بغیر ان دونوں علوم کے درمیان کی کڑی گم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ تینوں علوم ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے کے لیے خادم ومعاون ہیں۔

جس طرح شریعت کے علوم عالیہ مقصودیہ سے پہلے علوم آلیہ پڑھنے ضروری ہیں۔ اسی طرح فلکیات سے قبل جغرافیہ اور ریاضی ازحد لازمی ہیں۔ ان کے بغیر فلکیات کا آغاز ایسے ہی ہے جیسے کہ صرف نحو اور ادب وبلاغت کے بغیر جلالین اور صحاح ستہ یا مشکوٰۃ شریف شروع کر دی جائے۔ اگر یہ دونوں فن مناسب حد تک آتے ہوں تو ''تخریجین'' یعنی تخریج اوقاتِ صلوٰۃ اور تخریج سمتِ قبلہ میں استاد کی راہنمائی کی ضرورت محض اتنی پڑتی ہے جتنی شرح جامی اور مختصر المعانی تک پڑھے ہوئے طالب علم کو قرآن کریم کے کسی مشکل صیغے یا قابلِ ذکر ترکیب، لغوی تحقیق اور استعارہ وتمثیل کے سمجھاتے وقت اشاراتی بیان کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت ان دونوں تخریجوں کا فن جس کتاب میں سب سے زیادہ تحقیقی اور ٹھوس علمی رسوخ کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ فقیہ العصر مفتی اعظم حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ''ارشاد العابد الی تخریج الاوقات وتوجیہ المساجد'' ہے، اس میں اوقات صلوٰۃ معلوم کرنے اور نمازوں کا نقشہ تیار کرنے کے 10 اور قبلہ معلوم کرنے کے 20 طریقے ہیں لیکن جغرافیہ اور ریاضی میں بصیرت کے بغیر اس کی ایک سطر بھی سمجھنا مشکل ہے۔ اس کتاب کے علمی مقام اور مصنف کے اس فن میں علمی رسوخ کا اندازہ اس کی چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہ کتاب مذکورہ بالا دو فنون میں بہترین استعداد کے بغیر سمجھی نہیں جا سکتی اس لیے علمی حلقوں میں زیادہ متعارف نہیں ہے۔

شنید ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے اکابر نے جغرافیہ اور فلکیات کو نصاب میں شامل کر لیا ہے، یہ انتہائی خوش آئند اور قابل مبارکباد فیصلہ ہے۔ اگر وہ دسویں جماعت کی سطح کی ریاضی کو بھی کسی درجے میں شامل کر لیں تو یہ ''مثلث'' پوری ہو جائے گی۔ سرحد اور سندھ بورڈ کی دسویں جماعت کی ریاضی کتابیں بالکل ایک جیسی ہیں، پنجاب اور بلوچستان کی کتابیں دیکھنے کا تاحال اتفاق نہیں ہوا، لیکن وہ بھی اس کے قریب قریب ہوں گی۔ بہرحال کسی بھی ایک کو داخلِ نصاب کیا جا سکتا ہے اور اس سے ایک اہم غرض پوری کی جا سکتی ہے۔ البتہ ان کتابوں میں کروی تکونیات کی ابحاث نہیں لیکن ان کو ایم ایس سی میتھ میٹکس کی کتب سے تلخیص کر کے بآسانی جزو نصاب بنایا جا سکتا ہے۔ فلکیات سے متعلق اہم مقاصد کماحقہٗ حاصل کرنے کے لیے ریاضی کی کم از کم دسویں کی سطح تک تعلیم لازمی ہے ورنہ مطلوبہ مقاصد تشنۂ تکمیل رہیں گے۔

الغرض مدارس سے علم ہیئت وہندسہ کی تدریس مفقود ہونے کے بعد اب دوبارہ ان فنون کا احیا اور ان سے متعلقہ فوائد کا حصول لازمی ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات انتہائی نامناسب ہے کہ نماز تو امام صاحب پڑھائیں لیکن مسجد کا قبلہ رکھنے کے لیے سروے ڈپارٹمنٹ کے افراد کو تلاش کرتے پھریں، اذان تو مؤذن صاحب دیں لیکن وقت معلوم کرنے کے لیے جو نقشے پیشِ نظر رکھیں وہ غیر علماء کے تیار کیے ہوئے ہوں، یہ تینوں فنون اپنی تمام شاخوں کے ساتھ ہماری جدی پشتی میراث تھے مگر افسوس کہ آج وہ دن آ گیا ہے کہ نماز سب مغرب کی طرف منہ کر کے پڑھتے ہیں کیونکہ قبلہ جو مغرب میں ہے لیکن کسی مبتدی سے پوچھا جائے کہ

سعودی عرب کس طرف واقع ہے تو اس کا جواب اس کے لیے اتنا ہی مشکل ہو گا جتنا کہ منتہی کے لیے اسطرلاب، رُبع مقنطر اور رُبع مجیب کو پہچاننا اور ان سے استفادہ کرنا...... حالانکہ یہ چیزیں کسی زمانے میں ہمارے طلبہ کے لیے اتنے متعارف، قریب الفہم بلکہ بدیہی تھیں جتنی کہ اسم فعل حرف کی علامات یا ماضی مطلق کی گردان۔ اللہ تعالیٰ ان علوم کو ہمارے مدارس میں پھر سے زندہ کر دے اور وہ دن دوبارہ آجائے جب نابینا طالبعلم ہاتھوں پر اقلیدس کی اشکال بناتے اور بینا طالب علم سورج کو دیکھ کر وقت، چاند کو دیکھ کر تاریخ اور بروج کو پہچان کر مہینہ بتا سکتے تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اسلام نے مسلمان کو جو اعلیٰ اقدار اور صفات سکھائی ہیں ان میں سے ایک ''حسن الظن باللہ'' ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنا اور انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آئے اس میں یہ سمجھنا کہ اسی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہے۔ اسی میں بہتری کا کوئی پہلو تلاش کر کے دل کو تسلی دینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ جو کچھ کریں گے ہمارے لیے بہتر ہی ہوگا مگر انہوں نے جب ہمیں اتنا نوازا ہے تو ایک آدھ آزمائش پر صبر اور ہمت سے اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے ان کی ایک مخصوص صفت کو بیان کیا ہے اور بندہ کا گمان ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے جو اتنا بڑا کام لیا اور ان کو بے مثال کامیابیوں سے نوازا اس میں ان کی اسی صفت کا بڑا دخل تھا۔ وہ صفت بھی ''حسنِ ظن'' ہے یعنی اپنے خالق و مالک کو مشفق و مہربان سمجھنا اور اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا گمان رکھنا کہ وہ ہم سے محبت اور تعلق رکھتا ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ سلطان کو اللہ تعالیٰ پر جو لازوال اعتماد تھا اور وہ کسی حال میں حوصلہ نہیں ہارتا تھا اس کے پیچھے اس کے فنافی الاسلام اور فنافی الجہاد کے بعد اسی اعلیٰ سوچ کی قوت کارفرما معلوم ہوتی ہے۔

زوال کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں محرومی کا عالم یہ ہے کہ اپنے ذاتی احوال تو رہے ایک طرف، اسلام کے احکام کے بارے میں ہمیں وہ اعتماد اور حسنِ ظن نہیں ہے جو ایک سچے اور کھرے مسلمان کو ہونا چاہیے۔ اُصولی طور پر اس بات کا تعلق ہمارے ایمان سے ہے کہ ہم شریعت کے ہر حکم کو بلا چوں و چرا مانیں، چاہے وجہ سمجھ میں آئے یا نہ...... اس کی علت و حکمت تک ہماری عقلیں پہنچ سکیں یا نہ...... برحق اور حرفِ آخر سمجھیں اور اس بات پر ہمارا اعتماد لازوال ہو اور ہر قسم کے شک و شبہہ سے پاک ہو کہ اس سے بہتر کوئی حکم، کوئی طریقہ کار ہے نہ ہو سکتا ہے...... یہ ایک بنیادی اور بدیہی سی بات ہے، مگر ناس ہو اس احساس کمتری کا جس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا اور بدقسمتی ہماری ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت سے لافانی تعلق کی دولت سے محروم ہیں۔ اس بدنصیبی کا مظاہرہ مختلف مواقع پر ہوتا رہتا ہے۔

رویت ہلال کے مسئلے کو لے لیجیے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی عبادات کو شمسی حساب سے جوڑ دیتے کیونکہ قمر کی طرح شمس بھی اللہ تعالیٰ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ شریعت میں عبادات دو طرح کی ہیں: یومیہ اور سالانہ۔ یومیہ عبادات کے اوقات کو اللہ تعالیٰ نے سورج کے ذریعے ظاہر ہونے والے مختلف حالات سے جوڑ رکھا ہے۔ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے کے بعد، سورج کے بلند ہونے، زوال پذیر ہونے کے بعد مختلف مراحل کے دوران نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ سالانہ عبادات کو اللہ تعالیٰ نے چاند سے وابستہ کر دیا ہے اور یہ شمسی کے بجائے قمری مہینوں کے حساب سے دن کا شرعی وقت طے کیا گیا ہے۔ مثلاً: روزہ، زکوٰۃ، حج، قربانی۔

اب ذرا ایک نکتہ ملاحظہ کیجیے: سورج سے مربوط عبادات میں شریعت نے اجازت دی ہے کہ مشاہدے کے بجائے حساب

کومدار بنالیا جائے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ تمام مساجد میں اوقاتِ نماز کے نقشے لگے ہوئے ہیں اور پوری دنیا کے نمازی سورج کا اُتار چڑھاؤ دیکھ کر اذان نماز کے بجائے ان نقشوں میں لکھے گئے گھنٹے ومنٹوں پر چلتے ہیں۔ اس پر شرعاً کوئی اشکال نہیں کہ سورج کی چال سے مشاہدے کے بجائے اس حساب کو کیوں بنالیا گیا ہے۔ البتہ چاند سے وابستہ عبادات کو چاند کے حساب سے ادا کرنے کو شریعت نے قطعاً تسلیم نہیں کیا اور واضح حکم دیا کہ چاند کے اُفق پر وجود کے بجائے آنکھوں سے دیکھنے کو مدار بنایا جائے۔ یہاں دو قسم کے شبہات خلجان پیدا کرتے رہتے ہیں: ایک تو یہ کہ اس طرح کرنے سے روزہ اور عید وغیرہ کا وقت پہلے سے متعین ہوسکتا ہے۔ دوسرے چاند کی پیدائش اور وجود کی نفی کرنے اور رویت کو مدار بنانے سے وہ انتشار اور تشویش پھیلتی اور جگ ہنسائی ہوتی ہے جس کا اہلِ وطن کئی برسوں سے مشاہدہ کررہے ہیں۔ دونوں اشکالات کے متعلق چند معروضات ترتیب وار سنیے:

(1) چھوٹی اور بڑی عید جسے میٹھی اور نمکین عید بھی کہتے ہیں، ہمارے سالانہ تہوار ہیں۔ ان کا وقت پہلے سے متعین نہ کیے جانے سے ان کے متعلق جو سنسنی خیزی اور ہیجان پیدا ہوتا ہے اور یہ چھوٹا بڑا چاند دیکھنے کی کوشش کرنا اور عید کی گھڑیاں جلد یا بدیر آنے کی خوشی سے جس سنسنی اور لطف میں مبتلا ہوتا ہے، یہ انوکھا لطف اس صورت میں قطعاً نہیں اُٹھایا جاسکتا جب کوئی چیز پہلے سے متعین ہو۔ رمضان کی ابتدا اور روزہ وتر اویح کا اہتمام بھی اس عدمِ تعیین کی بنا پر منفرد قسم کا ہیجان خیز احساس پیدا کرتا ہے۔ شمسی حساب میں یا چاند کی ولادت اور وجود والے حساب میں یہ سنسنی خیز کیفیت کہاں؟ معلوم نہیں بندہ یہ بات قارئین کو سمجھا سکا یا نہیں لیکن حقیقت اس کے قریب قریب ہے۔

(2) اس تشویش ناک اور بدنظمی وافراتفری کا تعلق چاند کی اُفق پر موجودگی کا اعتبار نہ کرنے اور رویت کو لازمی قرار دینے سے قطعی اور بالکل نہیں ہے۔ اس اختلاف اور المناک صورتِ حال کا تعلق ہمارے ہاں علمِ فلکیات کے عام نہ ہونے اور شرعی احکام کی اہمیت وحکمت واضح نہ ہونے سے ہے۔ اگر اسلامی مہینے کی ابتدا کو چاند کی ولادت (اپنے مدار پر نئے چکر کے نکتہ آغاز تک رسائی) یا وجود (نئے چکر کی ابتدا) سے مربوط کردیا جائے تو پوری اللہ کی عبادات چند حساب دانوں کے ہاتھوں میں محدود ہوجائیں گی۔ وہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ سال میں ایک مرتبہ کی جانے والی عبادات کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ بات ضروری ہے کہ ان عبادات کے اوقاتِ شرعیہ تک رسائی ہر ایک کی دسترس میں ہو اور چند نجومیوں یا فلکیات دانوں کے بجائے عامۃ المسلمین کی آنکھوں دیکھی حقیقت اسی اہم چیز کا فیصلہ کرلے۔ یہاں پہنچ کر محترم قارئین پر یہ فرق واضح ہوگیا ہوگا کہ نماز کے حوالے سے شفقوں کا حساب کیوں درست اور قابلِ اعتماد ہے اور روزہ وغیرہ کے لیے کیلنڈر پر مدار کیوں غلط ہے؟ سورج ایسی چیز نہیں جس کے متعلق کوئی حساب دان کسی ان پڑھ مسلمان کو بھی دھوکا دے سکے۔ اس کی کرنیں چمگادڑ سے بھی اپنا وجود منواتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرلے۔ وہ روز طلوع ہوتا اور اپنے پورے جسم کے ساتھ پورا دن روشنیاں بکھیرتا چلتا ہے۔ چاند مہینے میں صرف ایک مرتبہ طلوع ہوتا ہے اور پوری رات طلوع رہنے کے بجائے چند منٹوں کے بعد غروب ہوجاتا ہے۔ اس محدود مدت میں اس کی روشنی بھی کم ہوتی ہے اور حجم تو کھجور کی ٹہنی سے کچھ زیادہ ہوگا۔ اس کے متعلق حساب دانی کا دعویٰ کرنے والے (خصوصاً یہودی جو اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں) مسلمانوں کو بھڑکا کر چاند کی ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھی چاندنی کے بجائے جانے کس اندھیرے غار میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے چھوڑ دیتے اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرتے تو عام مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے

چاند دیکھنے اور خوشی؛ مسرت کے احساس سے محرومی تو بہر حال ہو ہی جاتی۔

اس انتشار اور انقلاب کے خاتمے کا حل فلکیات کے علم شرعی کو پھیلانا اور رائج کرنا ہے۔ افسوس کہ دینی مدارس جو علوم دینیہ کے واحد محافظ اور امین ہیں، ان میں بھی اس علم کی گرم بازاری نہیں۔ جامعۃ الرشید کا شعبہ فلکیات اس حوالے سے اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور ہر سال علمائے کرام کے لیے ایک جامع اور مکمل کورس کا انعقاد کرتا ہے۔ یہ محض موہوم اُمید یا خوش خیالی نہیں کہ اس کورس میں "فصل فی القمر" اور "فصل فی رویت الھلال" پڑھنے کے بعد شریعت کی اس اہم ہدایت (آنکھوں سے رویت ضروری ہے) کی افادیت کے متعلق کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ ایسی حقیقت ہے جو بار ہا کے مشاہدے سے درست ثابت ہو چکی ہے۔ یہ کورس جامعہ کے اسپیشل کورسز کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جامعہ کی اس اہم خدمت کو قبول و منظور فرمائے اور اس کو تنازع کے خاتمے اور فتنے کے تدارک کا ذریعہ بنائے۔ آمین

فضلائے کرام کو درپیش دو مشکلات

محترم استاد جی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، بندہ بھی اللہ کے فضل وکرم سے خیر وعافیت سے ہے اور آپ کی دعاؤں سے اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مقامی لوگوں کے ساتھ آہستہ آہستہ موافقت پیدا ہوتی جارہی ہے اور درسِ قرآن و حدیث کی طرف ان کا رجوع بڑھ رہا ہے۔ شروع شروع میں بندہ بعد نمازِ فجر ''معارف الحدیث'' سے ایک حدیث اور اس کے فائدے کی خواندگی کرتا تھا اور مغرب کی نماز کے بعد درسِ قرآن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اب یہ ترتیب بنالی ہے کہ بعد نمازِ مغرب دو دن قرآن کریم، دو دن حدیث شریف اور ایک دن مسائل فقہ کے لیے متعین ہے جبکہ جمعرات جمعہ کو ناغہ کیا جاتا ہے۔ آپ کے مشورے کے مطابق تینوں موضوعات درس کے طور پر نہیں بلکہ سبق کے طور پر پڑھائے جارہے ہیں۔ ہر نمازی کے پاس کتاب موجود ہوتی ہے اور لفظاً لفظاً معنیً سمجھا کر آگے پڑھا جاتا ہے۔ نیز ہر سبق کے بعد دس منٹ سوال وجواب کے لیے رکھے جاتے ہیں جس سے بہت دلچسپی پیدا ہورہی ہے اور لوگوں میں دین سیکھنے کے شوق کے ساتھ ساتھ عمل کی طرف رغبت بھی پیدا ہورہی ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس ٹوٹے پھوٹے کام کو قبول فرمائے اور فتن وشرور سے بچائے رکھے۔ آمین۔

ایک بات کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہورہی ہے۔ میں نے تکمیل کے دوران ''صرف ونحو'' پر خاصی محنت کی تھی پھر آپ نے ''بیان القرآن'' سے جس طرح درس کی تیاری کا طریقہ بتایا تھا اس کی بھی اچھی طرح سے مشق کی اور اب میرے جمعہ اور دیگر مجالس کے بیانات بھی کسی آیت کی تفسیر اور عصرِ حاضر کے کسی مسئلے پر اس کے انطباق پر مشتمل ہوتے ہیں، جس سے مجھ سمیت حاضرین کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اسلام کی حقانیت، قرآن کا اعجاز اور اس کے اسرار ورموز اور جامعیت کھلتی ہے......

لیکن ایک مسئلے نے بہت سخت پریشان کیا ہوا ہے وہ یہ کہ مقامی آبادی پوش طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہ لوگ اردو میں بھی اور اپنی مادری بولی میں بھی انگلش کے الفاظ اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ کسی اور سیارے کی مخلوق کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اب چونکہ آپ کی تاکید اور بار بار کی تنبیہ کے سبب میں اردو میں عربی وفارسی کی عالمانہ تراکیب استعمال نہیں کرتا اور میں نے مسلسل مشق اور محنت سے مشکل الفاظ کا متبادل تلاش کرلیا ہے اور انہیں تقریر وتحریر میں استعمال کرتا ہوں لیکن اول تو انگریزی نہ آنے کی وجہ سے انگلش کے الفاظ کبھی کبھی اٹکتے اٹکتے، ڈرتے ڈرتے بول دیتا ہوں اور وہ بعد میں تلفظ یا محل استعمال کے لحاظ سے غلط نکلتے ہیں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ دوم میرے مقتدی اور متعلقین انگلش کے الفاظ اتنی کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے سوالات کا سمجھنا اور ان کے اسلوب میں جواب دینا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

یہ تو اظہار کی مشکل تھی اس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھے آپ کی دعاؤں اور توجہ سے فنون میں تو خوب دسترس ہے لیکن یہاں وہ

سب بے کار ہیں، ان لوگوں کے لیے میری یہ صلاحیت جو میں نے بہت جان مار کر حاصل کی، قطعاً کسی طرح مفید نہیں، یہ تو مجھ سے شیئرز کی خرید وفروخت، کرنسی کے تبادلے، انشورنس کے حکم اور اس کے عدم جواز کی وجہ پوچھتے ہیں اور اس دوران ایسی مشکل اصطلاحات استعمال کرتے ہیں کہ میری ساری لغت شناسی اور فنون میں مہارت دھری رہ جاتی ہے۔ زیادہ کیا لکھوں بس ان دو باتوں نے اپنی کمزوری کا اس شدت سے احساس دلایا ہے کہ وہ خود اعتمادی جو رفتہ رفتہ مجھ میں پیدا ہوگئی تھی، ختم ہوتی جارہی ہے اور سمجھ نہیں آتا کہ اس کی تلافی کیسے کروں؟ از راہِ کرم راہنمائی فرمایئے اللہ تعالیٰ آپ کو اس عاجز پر مزید احسانات کا شایانِ شان اجر دے گا۔

باقی آپ کی دعاؤں سے یہاں سب خیریت ہے۔ مجھ عاجز کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد فرمانے کی التجا ہے۔

والسلام

آپ کا نالائق شاگرد

....

یہ اس خط کا مضمون ہے جو کچھ روز پہلے موصول ہوا۔ اس میں فضلائے کرام کو درپیش ان دو اہم مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، جو دعوتِ دین کے راستے میں حائل ہیں۔ ایک انگریزی زبان پر دسترس نہ ہونا اور دوسرے جدید سماجی و معاشی مسائل سے عدم واقفیت۔ اس خط کو اس غرض سے شائع کیا جارہا ہے کہ قابلِ صد احترام اربابِ مدارس ان دو امور پر غور فرمائیں کہ کیا واقعی یہ دو کمزوریاں ہمارے مشن اور مقصد زندگی میں رکاوٹ بن رہی ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ان کے ازالے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟ جہاں تک انگریزی سے ناواقفیت کا مسئلہ ہے تو کیا یہ طریقہ مفید ہوسکتا ہے کہ جس طرح مغلیہ سلطنت کے زمانے میں فارسی کے سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے مدارس میں فارسی کی تعلیم وتعلم پر زور دیا جاتا تھا، اس کے نتیجے میں فارسی میں دینی واصلاحی ادب کا شاندار ذخیرہ وجود میں آیا، اسی طرح آج کل عربی وفارسی کے ساتھ انگریزی پر ویسی ہی توجہ دی جائے۔ ہر درجہ میں یا کم از کم غیر وفاقی درجوں میں 45 منٹ کا گھنٹہ اس زبان کے لیے مختص ہو، عصر تا مغرب یا دیگر خارجی اوقات میں اس کے تین چار ماہ خصوصی کورس کروائے جائیں، سالانہ تعطیلات میں مدارس میں اس کے لیے 40 روزہ دورہ ہوا کرے وغیرہ وغیرہ۔ رہی بات جدید معاشی مسائل کے احکام سے آگاہ ہونے کی تو یہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے۔ اس میں ہمارے پیچھے رہ جانے کے اسباب کا مطالعہ کرنے کے لیے دو صدیاں پیچھے جانا ہوگا جب عالمِ اسلام پر یورپی استعمار اس طرح ٹوٹ پڑا تھا جیسے مفت خورے شکم پرست لوٹ کے دسترخوان پر ٹوٹتے ہیں۔ مسلمان بے علمی اور بدعملی کی وجہ سے زوال کا شکار ہورہے تھے اور یورپ کے قزاق اُمڈے چلے آرہے تھے۔

پھر غضب یہ ہوا کہ ہماری مغلوبیت اور یورپی استعمار کے غلبے کے دنوں میں ''مشین'' ایجاد ہوگئی۔ اس نے تو قیامت ہی ڈھادی۔ جو کام مہینوں اور سالوں میں ہوتا تھا، دنوں اور لمحوں میں ہونے لگا، پھر جب پہیہ کو بھی مشین نے گھمانا شروع کیا اور ہوائی، زمینی اور بحری سفر تیز تر اور مختصر ہونے لگے اور عسکری آلات کی کارکردگی خودکار مشینوں کے سبب طوفان خیز تک حد تک بڑھ گئی اور یہ ساری ایجادات یورپ کے ہاتھوں اور دماغوں سے انجام پائیں اور اس نے انہیں اپنے استعماری مقاصد اور ہوسِ ملک گیری کے لیے استعمال کیا تو مسلمان ممالک پر اس استعماری یلغار کا آغاز ہوا جس کے اثرات سے نکلنے کے لیے آج وہ سیاسی آزادی کے بعد

بھی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن کامیابی کی منزل تا حال کافی دور ہے۔ یہ المیہ اس وقت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جب خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ہوگیا، مسلم ممالک کا کوئی مرکز نہ رہا اور وہ بے آسرا ہوگئے۔ یورپی استعمار کے غلبے اور مسلمانوں کی مغلوبیت کے اس دور میں ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ علمی اور تحقیقاتی سرگرمیاں اور سرکاری سطح پر اسلامی احکام کا نفاذ تعطل کا شکار ہوگیا۔ دین صرف عبادات تک محدود رہ گیا اور سیاسی و معاشی میدان میں غالب اقوام کے نظریات کا چلن ہوگیا۔ مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ الٰہی قوانین کے بجائے کفریہ قوانین سے مانوس ہوگئی اور مسلم ممالک کے دستور بھی وحی الٰہی اور خدائی ہدایت سے اعراض پر مبنی قراردادوں کے تحت تشکیل پانے لگے۔ تجارت و معیشت کا حال اس سے بھی برا ہوا۔ ہر وہ نیا معاملہ اور عقد رائج ہوتا گیا جس کا یورپ کے بازاروں میں شہرہ تھا اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں لین دین کا جو بھی نیا طریقہ رائج ہوتا ہے یا جو بھی نئی اسکیم نکلتی ہے تو وہ لُنڈے کی مسلی ہوئی پتلونوں کی طرح ہماری طرف پھینک دی جاتی ہے اور ہم اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، راتوں رات رائج کرتے ہیں اور حلال و حرام کی پرواہ کیے بغیر دھڑا دھڑ اس کو پھیلاتے جاتے ہیں۔ سود، جوا، سٹہ اور معاملاتِ فاسدہ اس حد تک ہمارے بازاروں، مارکیٹوں اور سودوں میں داخل ہو چکے ہیں کہ ان کی بو سے شاید ہی کوئی چیز بچی ہو۔

پھر علمائے کرام اور عوام الناس کے درمیان ایسی خلیج حائل ہوتی چلی جا رہی ہے جس کی بنا پر ایک دوسرے کی بات سمجھنا سمجھانا مشکل ہو رہا ہے۔ دونوں طبقوں کے اسلوبِ تکلم اور اظہار مافی الضمیر کے انداز میں اتنا زبردست تفاوت ہوگیا ہے کہ افہام و تفہیم کا عمل بری طرح متاثر ہو رہا ہے اگر دوری اور اجنبیت کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو صورت حال کے مزید سنگین ہونے کا خطرہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عصرِ حاضر کی نابغۂ روزگار شخصیت، مفکرِ اسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کو، انہوں نے تجارت و معیشت کے میدان میں کام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے اس کو بہت خوبی کے ساتھ نبھا کر دکھایا۔ اس وقت جبکہ مسلمان سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد سماجی اور معاشی شعبے میں اسلامی تشخص کے احیا کی کوشش کر رہے تھے اور علمائے کرام سے یہ تقاضا ہو رہا تھا کہ وہ معاملات جدیدہ کا جائزہ لیں اور مغربی تہذیب کی طرف سے اسلام اور اہلِ اسلام کو درپیش چیلنج کا سامنا کر کے مسلمانوں کو اسلامی معیشت سے روشناس کرائیں، اس موقع پر حضرت دامتِ برکاتہم نے اس فرضِ کفایہ کو تقریباً تن تنہا انجام دیا اور ملکی و بین الاقوامی مارکیٹوں، اسٹاک ایکسچینج بینکوں اور مالیاتی اداروں میں رائج معاملات کا جائزہ لے کر ان کے شرعی حکم پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ اس وقت قدیم فقہی ذخیرے کے راسخ علم اور معاملاتِ جدیدہ کی حقیقت سے واقفیت میں شاید ہی کوئی بنی آدم آپ کے ہم پلہ ہو۔ اپنی اس علمی جامعیت اور طبیعت میں سلامتی واعتدال اور مزاج میں توازن کی بنا پر آپ نے ایک کارنامہ یہ انجام دیا کہ اپنی تحقیقات، نتائج فکر کو حتمی رائے اور فتویٰ قرار دینے کے بجائے آپ نے انہیں علمائے کرام کے سامنے پیش کیا، ان کو ''فقہ المعاملات المعاصرۃ'' سے آگاہ کیا اور اپنے شاگردوں کی ایک جماعت تیار کی جو اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت اور استعداد حاصل کر رہی ہے۔

اس موضوع پر آپ کی دو اعلیٰ پائے کی کتب شائع ہو چکی ہیں:

(1) اسلام اور جدید معیشت و تجارت۔

(2) اسلامی بینکاری کی بنیادیں۔

مقام اطمینان وتشکر ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے اکابرین نے پہلی کتاب کو وفاق کے نصاب میں شامل کرلیا ہے (اور اب ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی اس کا عربی ترجمہ شائع کر رہا ہے) لیکن اس پر غور ہونا چاہیے کہ اس میں بینکاری کی ابتدائی اور بنیادی مباحث ہیں، گویا وہ اس فن کی نحو میر ہے؟ اس موضوع پر کماحقہٗ کلام تو حضرت نے مؤخر الذکر کتاب میں فرمایا ہے۔ مثلاً: تمویل کی تین اقسام کے لیے پہلی کتاب میں عقود اربعہ، مشارکہ، مضاربہ، مرابحہ اور اجارہ بیان کیے گئے ہیں جبکہ دوسری کتاب میں ان چاروں کی مکمل بسط وشرح کے ساتھ دو مزید عقود ''سلم واستصناع'' کا ذکر ہے۔ نیز شروع میں کچھ تمہیدی مباحث اور آخر میں اسلامی ایکویٹی فنڈ کی بحث کا اضافہ ہے۔ کتاب کے اختتام پر ''اسلامی بینکوں کی کارکردگی کا جائزہ'' کے عنوان سے جو بحث ہے وہ بڑے خاصے کی چیز ہے۔ اس میں جس متوازن انداز میں اسلامی بینکوں کی خوبیاں اور خامیاں گنوائی گئی ہیں وہ حضرت ہی کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے یہ بینکاری کی ''شرح جامی'' ہے۔ اگر پہلی کتاب کو درجہ سابعہ کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے تو دوسری کو بھی اسی درجے میں یا پھر بھی تخصص فی الافتاء کے نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔ اگر درساً نہ ہو اور مطالعہ کے طور پر بھی رکھی جائے تو یہ اتنی جاندار کتاب ہے کہ فضلا اور متخصصین کو اس موضوع سے بہت اچھے طریقے سے متعارف کروادے گی۔ اس کے بغیر بات ادھوری رہتی ہے۔

بات جب چل پڑی ہے تو یہ بھی عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ دینی مدارس کی درسی کُتب کی تسہیل، تلخیص، توضیح اور تفہیم کے سلسلے میں استاد محترم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب دامت برکاتہم نے گراں قدر کام کیا ہے۔ ان کی کچھ ''تسہیلات'' تو بڑے پائے کی چیز ہیں۔ حضرات مدرسین اور طلبہ کرام کے لیے ان کی افادیت آزمائشی تجربے سے گذرنے کے بعد نکھر کر سامنے آچکی ہے۔ دینی نصاب کی جدید تشکیل میں ان سے استفادہ کیا جائے تو بہت سی تدریسی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے۔ وفاق المدارس العربیہ کے محترم اکابرین حضرات نے ان کی چند کتب کو نصاب میں شامل کرنے کی منظوری دی ہے۔ اگر ان سے کسی موضوع پر فرمائش کر کے درسی مواد تیار کرنے کو کہا جائے تو بھی بہترین مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ جن مدارس میں ''معہد اللغۃ العربیہ'' کے عنوان سے عربی زبان میں تعلیم کا آغاز ہوگیا ہے ان میں حضرت کی تیار کردہ تفسیر، مصطلح الحدیث، عقائد، فقہ، اصولِ فقہ، بلاغت، منطق اور فرائض وغیرہ کی تسہیلات، تلخیصات، توضیحات اور تفہیمات بہت مفید اور آموزش کے عمل میں زُثابت ہوسکتی ہیں۔ یہ ایسی محنت ہے جس پر اس کے استحقاق سے کم توجہ دی گئی ہے، اس کی قدردانی کا حق اس سے سوا کا تقاضا کرتا ہے۔

کوئی تو ''کیسے'' ہو؟

محترم مفتی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ سے ملاقات کو خاصے دن گزر گئے۔ مورخہ 26 اگست تک آپ کے موبائل پر رابطہ کیا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ مجھے آپ کی مصروفیت کا اندازہ ہے۔ ان سطور کے لکھنے کا باعث ''ضرب مؤمن'' کا شمارہ 10 تا 16 شعبان 1428ھ بنا ہے۔ پہلے صفحے پر حضرت مولانا اسلم شیخوپوری صاحب کا مضمون ''کوئی تو ہو'' موجود ہے۔ اس مضمون کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ پھر اسی وقت سے داعیہ تھا کہ اس مضمون کے حوالے سے اور علماء و مدارس کے ساتھ گزارے گئے وقت اور تجربے کی روشنی میں چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کروں لہٰذا یہ خط ارسال خدمت ہے۔

مولانا شیخوپوری صاحب نے اپنی تحریر میں جن باتوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں بالخصوص یہ بات کہی گئی ہے کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود میڈیا کے میدان میں ذی استعداد نوجوان علماء حسبِ توقع نہیں آرہے۔ اس نکتے پر ایک دو بار آپ کے ساتھ بالمشافہ ملاقاتوں میں بھی گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا آپ نے ایک نشست میں الیکٹرونک میڈیا کے حوالے سے کچھ تقاضوں اور رکاوٹوں کا اظہار فرمایا تھا۔ میں اس سلسلے میں اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ مسئلہ تصویر کے جواز یا عدم جواز سے زیادہ شدید ایسے رجال کار کا ہے جو ایک پلیٹ فارم یا چینل خواہ الیکٹرونک میڈیا کا ہو یا پرنٹ میڈیا کا...... مہیا ہونے کے بعد بھرپور اور مؤثر ترین مواد اپنے قارئین و ناظرین تک پہنچا سکیں۔

اس وقت جو صورتِ حال ہے، میرے خیال میں اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ درسِ نظامی کے دوران ہی طلبہ کے اندر ایسی فکری تبدیلی کا بیج ڈالا جائے کہ وہ خود کو عام ڈگر سے ہٹ کر کچھ اچھوتا کرنے کا سوچیں اور اس کی کوشش کریں۔ ہمارے مدارس میں یہ رسم بن چکی ہے کہ فراغت کے بعد درس و تدریس ہی کرنی ہے۔ یہ مزاج اس قدر رچ بس گیا ہے کہ اگر کوئی نوجوان فراغت کے بعد میڈیا یا کسی اور متعلقہ شعبے کی جانب جانے لگے تو اسے کہا جاتا ہے کہ تم نے تو مدرسے کی تعلیم ضائع کردی۔ حالانکہ جب مقصد دین کی دعوت اور خدمت ہے تو وہ یہاں بھی حاصل ہے پھر تعلیم ضائع کرنا چہ معنی دارد؟

اس صورتِ حال کی ایک اور وجہ طلبہ میں منزلِ سفر اور مقصدِ زندگی کے شعور کا فقدان ہے جیسا کہ اسی مضمون کے پانچویں پیراگراف کے نصف آخر میں بھی تحریر کیا گیا ہے: ''اکثریت ایسوں کی ہوگی جنہیں خبر ہی نہ تھی کہ ان کی منزل کیا ہے اور سفر کا نتیجہ کیا نکلے گا؟'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ فراغت کے بعد بھی اکثر فضلا کو منزل کا شعور نہیں ہوتا۔ گزشتہ دنوں آپ کے صحافت کورس کے طلبہ میں 7 Habits کی نشست کے دوران میں میں نے طلبہ سے The Creat Discovery کے نام سے ایک Exercise کرائی۔ یہ مشق اسٹیفن آر کوی نے نوجوانوں کے لیے ڈیزائن کی ہے جسے حل کرنے پر انہیں خود بخود محسوس ہوتا رہتا ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اس ایکسرسائز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ پورے بیچ میں چند ہی طلبہ ایسے ہیں جنہیں مطلوبہ شعور

حاصل تھا۔ اسی طرح ایک اور مشہور جامعہ میں ایک مرتبہ میں نے منزل اور مقصد کے حوالے سے بات کی تو معلوم ہوا کہ طلبہ کے اندر اس کا شعور ہی موجود نہیں ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ مسئلہ صرف مدارس کے طلبہ میں ہے۔ عصری علوم پڑھنے والے طلبہ وطالبات بھی ان مسائل سے بری طرح دوچار ہیں۔ تاہم اہم نکتہ یہ ہے کہ عصری علوم پڑھنے والے طلبہ کے پاس دیگر بے شمار ذرائع ہوتے ہیں جن سے وہ یہ شعور اور اعتماد آیندہ زندگی میں حاصل کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر انٹر یا پھر گریجویشن کی سطح پر انہیں لامحالہ ایسے مضامین کا انتخاب کرنا ہوتا ہے کہ جوان کے مستقبل کی منصوبہ بندی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن ہم چونکہ مدارس کے طلبہ کے حوالے سے بات کر رہے ہیں اور آپ کے دل میں یہ درد موجود ہے کہ کسی طرح جمود کی یہ کیفیت دور ہو، اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ درسِ نظامی کے آخری برسوں میں طلبہ وطالبات کی شعوری، فکری اور شخصی تعمیر کا بھی بندوبست کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ بہت سے میدان ایسے ہیں جن میں علماء کی غیر موجودگی کی وجہ سے زبردست اور خطرناک خلا پایا جاتا ہے۔

مجھے اکابر علمائے کرام کی نگرانی میں قائم شدہ ایک جدید مدرسے میں بعض ذمہ داریاں سنبھالنے کا حکم فرمایا گیا تو ان میں سب سے اہم کام یہ تھا کہ میں The School of Succes کے کورسز کے ذریعے پاکستانی نوجوانوں میں تعمیر شخصیت (Personality Develop) کا جو کام کر رہا ہوں، اسے مدارس سے فارغ ہونے والے ان حفاظ کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔ اس قسم کے Inspirational Course طلبہ میں آگے بڑھ کر کچھ کر گزرنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ الحمد للہ! یہ سلسلہ اس مدرسے میں جاری ہے۔

ایک اور بات جو اس حوالے سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تبدیلی کی ہوا اس وقت چلتی ہے جب کئی لوگ متحرک ہوں۔ جامعۃ الرشید کے سوا اور ادارہ میرے علم میں نہیں ہے جو اس انداز کی فکر رکھتا ہو۔ یہ بہت ضروری ہے کہ دیگر احبابِ مدارس بھی آپ کے تجربے سے فائدہ اُٹھائیں اور اس قسم کے کورسز شروع کریں مگر اس کے لیے سب سے پہلی شرط Passion ہے۔ آخری گزارش یہ ہے کہ آپ اگلے سال جب انگلش اور صحافت کے لیے طلبہ کو داخلہ دیں تو اس کا کوئی خاص Criteria مقرر کیجیے اور انٹرویو میں کوئی ایسا خود تشخیصی جائزہ (Self Assesment) بھی لیجیے کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ طالب علم واقعی دل سے اس میدان میں آگے بڑھنا چاہتا ہے یا بس ''ایک اور سند'' کا خواہش مند ہے۔

حضرت مولانا اسلم شیخوپوری صاحب کے مضمون کے حوالے سے یہ چند باتیں تھیں جو احقر کے ذہن میں تھیں۔ یہ دل کی باتیں ہیں جن کا ذکر کرنا آپ سے مناسب سمجھا کہ شاید کسی ایک ہی نکتے سے آپ کو کوئی نیا خیال، کوئی نئی تحریک مل جائے اور آپ کے ذریعے سے اُمت کے مفاد میں کوئی بڑا اور مؤثر کام ہو جائے اور میرے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہو جائے۔ تفصیلات تو بہت ہو سکتی ہیں لیکن فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ ایک ذاتی خط ہے، تاہم اگر آپ اسے ضربِ مؤمن میں مولانا اسلم شیخوپوری صاحب کے مضمون کے تسلسل میں شائع کرنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ تمام حضرات کو اخلاص، عافیت اور استقامت کے ساتھ مرتے دم تک دین کی محنت کے لیے قبول فرمائیں۔ آمین

والسلام...... سید عرفان احمد

محترمی جناب عرفان صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا اور فکر ونظر کی تازگی اور بالیدگی کا باعث ہوا۔ آپ جیسے اہلِ علم ودانش کے مشورے، تجاویز اور راہنمائی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے اور ہمارے حوصلوں اور ارادوں کے لیے مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ضرورت کا اظہار تو تقریباً ہر سنجیدہ محفل میں کیا جاتا ہے کہ میڈیا کے شعبے میں اہل علم وصلاح کی کمی بلکہ نایابی ہے لہٰذا یہ شعبہ تعمیر ملت کی جگہ تخریب وافساد کی مہم بڑی کامیابی سے اور پوری بے فکری کے ساتھ چلا رہا ہے...... لیکن جب اس تباہ کن صورتِ حال کے علاج وتدارک کے لیے ذی شعور طلبہ وفضلا کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس فن کو سیکھ کر اپنے اپنے حلقوں میں کام شروع کریں تو نجانے کیوں انہیں وساوس گھیر لیتے ہیں اور وہ ایسے مفید کورس میں شرکت سے ہچکچانے لگتے ہیں جس کا موقع انہیں ہزاروں روپے فیس دے کر بھی نہیں ملے گا۔ ہمارے ہاں کے کورس میں الحمدللہ جملہ اصناف صحافت کی تربیت کے ساتھ جو اضافی خصوصیت ہے وہ شاید ہی کہیں ہو کہ ہمارا اپنا ہفت روزہ اور روز نامہ ہے، دو تین میگزین ہیں اور ہر طالب علم کو ان میں عملاً مشق کے لیے بھرپور موقع دیا جاتا ہے اور اس کے لیے نہ صرف یہ کہ ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا بلکہ اُلٹا ان کے جملہ اخراجات برداشت کرنے کے ساتھ انہیں وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

ملک بھر کے دینی مدارس ہمارے صحافت اور انگلش کورس سے کئی طرح کے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے کسی استعداد فاضل کو جو کم از کم میٹرک کیے ہوئے ہوں، ہمارے ہاں بھیجیں اور اسے صحافت کی تربیت دلوانے کے بعد اپنے ہاں ماہنامے میں خدمت لیں۔ پندرہ روزہ یا ہفت روزہ کا اجرا کروائیں۔ نیز طلبہ کو مضمون نگاری وغیرہ کی مشق کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالیں۔ اسی طرح انگلش کورس کی تکمیل کے بعد اپنے مدارس میں انگلش لینگویج کی تدریس شروع کروائیں۔ ایک عالم جب دینی مدارس کے طلبہ کو درس نظامی کی کتب کی تدریس کے ساتھ انگلش بھی پڑھائے تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مدارس کے طلبہ کو مضمون نگاری اور انگلش سیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے لیکن انہیں ایسا استاذ نہیں ملتا جو ان کی برادری سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے مزاج کو سمجھتا ہو اور ان کے ہاں معروف طور طریقے کے مطابق انہیں ان دو فنون کی تعلیم دے سکے۔ ہمارے ہاں کا تربیت یافتہ فاضل جب دینی رسالے کی ادارت سنبھالتا یا انگلش پڑھاتا ہے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ذرا تصور کریں دینی مدرسے میں ایک کلاس لگی ہوئی ہے۔ عربی ادب کا سبق ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے وہی استاذ جو معلّم الانشا، نفحۃ العرب یا مقامات پڑھا رہا تھا۔ اب وہی انگلش کنورسیشن کروا رہا ہے یا گرامر کی کلاس لے رہا ہے اور عربی صرف نحو کے ساتھ انگلش گرامر کی تطبیق کر کے طلبہ کو انگریزی کے قواعد ذہن نشین کروا رہا ہے۔ کیا اس سے زیادہ خوش کن کوئی منظر ہو سکتا ہے؟ کیا اسکول کے ماسٹر حضرات اپنے مخصوص حلیہ میں مدارس میں آ کر متوسطہ والوں کو انگلش اچھی طرح پڑھا سکتے ہیں یا وہ علمائے کرام جو لینگویج کے ماہر ہوں اور ایم اے انگلش کیے ہوئے گریجویٹ سے زیادہ اچھی استعداد رکھتے ہوں؟ غرضیکہ ان کورسز سے دینی مدارس بے انتہا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ہم نے تو صلائے عام لگا دی ہے اور منتظر ہیں کہ کون بڑھ کر اس معرکہ فکر ونظر میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

عام طور پر دینی مدارس اپنے ہاں اس طرح کے کورس شروع کرنے میں دو رکاوٹیں محسوس کرتے ہیں۔ ایک تو انگلش یا

صحافت پڑھانے والے اساتذہ کی بھاری بھرکم تنخواہیں۔ دوسری ان کی وجہ سے مدرسے کے ماحول میں تبدیلی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دو مسئلے فی الواقع مسئلے ہیں لیکن الحمدللہ جامعۃ الرشید نے ان مسائل کو حل کر کے مدارس کے لیے آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ جامعہ نے یہ بوجھ خود پر اُٹھایا اور ان مسائل کا سامنا کر کے ایسے ساتھی تیار کرنا شروع کر دیے ہیں جو مدارس کی اپنی برادری کے لوگ ہیں اور تنخواہ سے زیادہ خدمت اور جذبے سے کی جانے والی محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے اساتذہ تیار کرنے کے بعد اگلا مرحلہ اپنا نصاب تیار کرنے کا ہے۔ انگلش کے نصاب پر کام ہو رہا ہے جبکہ صحافت کے لیے ایک حد تک کام ہو چکا ہے۔ راقم کی اس سے مراد وہ کتاب ہے جو گزشتہ سات سال کی عرق ریزی سے وجود میں آئی ہے۔ اس میں قواعد انشا، قواعد املا، علامات وقف و وصل یعنی رموز اوقاف اور مختلف اصناف صحافت کے اُصول وضوابط پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ آخری باب میں بیس عنوانات ہیں۔ مثلاً مضمون نگاری، کالم نگاری، مقالہ نگاری، خبر نگاری، اداریہ نویسی، مکالمہ نویسی وغیرہ وغیرہ۔ ان پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ صحافت کے طالب علم کی ضرورت کو کس حد تک پورا کرتی ہیں؟ الحمدللہ! یہ کتاب تیاری کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ دُعا فرمائیں اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں مقبول ومنظور فرمائے اور اس کے ذریعے طالبانِ کرام کو فنِ تحریر سیکھنے میں آسانی اور معاونت نصیب فرمائے۔ آمین۔ اس کتاب کے ساتھ ساتھ بندہ فن تحریر کی طرح فن تقریر پر بھی ایک کتاب لکھ چکا ہے جو ''راہنمائے خطابت'' کے نام سے حال ہی میں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے اور ملک بھر کے بڑے کتب خانوں سے دستیاب ہے۔ فنِ تحریر وتقریر کی یہ خدمت اُمید ہے کہ طلبہ کو کتابت وخطابت سیکھنے میں ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

جہاں تک مقصد زندگی کے تعین کی بات ہے تو الحمدللہ مدارس میں پہلے دن سے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ علم دین اللہ تعالیٰ کی رضائے کے حصول کے لیے سیکھا جائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا بڑا ذریعہ دین واہلِ دین کی خدمت ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنا اور خالق مخلوق کے درمیان ترجمانی کا فرض ادا کرنا انبیائے کرام کے بعد سب سے بڑا منصب ہے۔ ہمارے طلبہ یہ سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ بات ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بس مسئلہ یہ ہے کہ انہیں یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ معروف اور روایتی طریقوں سے ہٹ کر کوئی طریقہ اختیار کریں گے تو کہیں اس مقصد سے ہٹ نہ جائیں۔ ان کی یہ بات اپنی جگہ درست اور اچھی تربیت کی علامت ہے لیکن انہیں یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ نیک مقصد کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں وہ بھی نیک اور خیر ہوتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ ان کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ فرض کفایہ کے درجے کو پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کی قسم! جس نے قلم کو پیدا کیا، اس دور میں متذکرہ بالا دونوں شعبوں میں فرضِ کفایہ کی حد تک بھی رجال کار موجود نہیں۔ اب اس کی وجہ سے سب فرض کفایہ کے تارک ہیں یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ہر فاضل اور دینی مدرسے کے ذمہ دار خود کر لیں۔

پھر بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے شرکا کو محض اس لیے درسِ نظامی کی تدریس مل گئی کہ ان کے پاس صحافت یا انگلش کا اضافی فن تھا۔ اب وہ مختلف مدارس میں درسِ نظامی کی کتب کے ساتھ دینی رسالہ نکال رہے ہیں یا انگلش لینگویج پڑھا رہے ہیں۔ سال کے آخر میں مہتمم صاحبان ہم سے تقاضا کر کے ایسے فضلا کو اپنے مدارس میں لے جاتے ہیں۔ حال ہی میں بیرون ملک سے واپس آئی ہوئی تبلیغی جماعت کے تقاضے پر انگلش کورس کے ایک ساتھی کی بیرون ملک امامت وخطابت کے لیے تشکیل کی گئی۔ گویا ہمارا انگلش کورس الحمدللہ ثم الحمدللہ ایسے علمائے کرام پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو بیرون ملک جا کر

انگلش زبان میں خطابت، تدریس اور افتاء کی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا مشاہدہ اور آنکھوں دیکھا تجربہ ہے۔ الغرض یہ چیزیں ہمارے فضلا کے محبوب مشغلے (امامت وتدریس) میں رکاوٹ نہیں بلکہ اس کے حصول کا آسان اور مؤثر ذریعہ ہیں۔ اگر وہ یہ چیزیں سیکھ لیتے ہیں تو ہر مدرسہ انہیں خوش آمدید کہنے میں فخر اور خوشی محسوس کرے گا۔ اب آیندہ سال گریجویٹ حضرات کو بھی صحافت کورس میں داخلہ دینے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ یہ ہمارا اگلا ہدف تھا جو الحمدللہ اس سال میں ہی حاصل ہوگیا ہے۔ اس کی غرض یہی ہے کہ اس دائرے کو وسیع کیا جاسکے اور کالجز و یونیورسٹی کے وہ طلبہ جو دین کی خدمت کے جذبے سے بہرہ ور ہوں، وہ بھی اس میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکیں۔

قلم کی زباں سے یہ چند باتیں آپ کے دل کی باتوں کے جواب میں اس لیے ہوگئیں کہ یہ اس وقت آپ کی تو کیا ہر باشعور اہلِ ایمان کے دل کی آواز ہیں کہ اگر اب بھی ہمارے فضلا نے عصر حاضر میں اپنی ذمہ داریوں کی نئی جہتوں کو نہ سمجھا تو پھر مستقبل میں ایسا وقت آنے والا ہے کہ وہ کام جو آج ہنستے کھیلتے ہوسکتا ہے کل پلکوں سے کانٹے چن کر کرنا چاہیں تو بھی نہ ہوسکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کے حصول کی لگن اور اُمت مسلمہ کی خدمت کی تڑپ نصیب فرمائے۔ آمین۔

والسلام...... شاہ منصور

تیسرا باب

پاکستان سے پاکستان تک

نام تو ان کا نجانے کیا تھا مگر کہتے ان کو سب ''باباجی'' تھے۔ چھوٹا بڑا، اپنا پرایا سب ان کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ باباجی اپنی من موہنی شخصیت اور باکمال ہستی کے سبب ہر ایک کے لیے معزز، قابل احترام اور واجب العقیدت تھے۔ ان کا بنیادی پیشہ کیا تھا؟ یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن اتنا پتہ ہے کہ وہ ہرفن مولا تھے۔ کبھی گھڑی سازی کے ذریعے روزی کماتے تھے اور کبھی تالا چابی کا کام کر کے۔ کبھی خطاطی سے شغل کرتے تھے اور جب اس سے دل بھر جاتا تو حکمت سے وقت گذارتے۔ (یہاں میں حکمت کو ذو معنی استعمال کر گیا ہوں) مشین کسی طرح کی بھی ہو، سلائی مشین ہو یا موٹر سائیکل یا ریڈیو وغیرہ، ان کے ہاتھ میں آتے ہی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مریض کی نبض مسیحا کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ وہ جھٹ سے مشین کی خرابی تاڑ لیتے۔ لوہے کے پرزے ان کے ہاتھ میں موم کی مانند ہو جاتے اور مشین کے مختلف حصے کھلنے کے بعد اپنی اپنی جگہ پر یوں فٹ ہو جاتے جیسے ان میں کوئی مقناطیسی کشش ہے جو ان کو اصلی جگہ پر فٹ کرتی جارہی ہے۔

خطاطی میں ان کے کمال کا یہ عالم تھا کہ قریب کی مسجد تعمیر ہونے لگی تو اس کی دیواروں پر آیات کریمہ کی خطاطی انہوں نے اپنے ذمہ لے لی اور اس خوبصورتی اور مہارت سے بڑے بڑے حروف میں خوشخط کتابت کا مظاہرہ کیا کہ آج تک دیکھنے والے ان آیات کریمہ کو دیکھ کر ایمان تازہ کرتے ہیں۔ باباجی دم درود بھی کرتے تھے لیکن اس کو شغل نہیں بناتے تھے۔ کسی نے بہت اصرار کیا تو اسے دم کر دیا یا مقدس کلمات لکھ دیے مگر مستقل اس کے لیے بیٹھتے تھے نہ کسی سے نذرانہ وغیرہ لیتے تھے۔

باباجی صحیح معنوں میں ہرفن مولا تھے۔ اوپر بندہ نے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی ہیں، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے قطعاً متضاد ہیں اور ان سب میں سے کسی ایک میں مہارت حاصل کر لینا ہی بڑی بات ہے لیکن باباجی بیک وقت ان سب میں دسترس رکھتے تھے۔ باباجی کے پاس ایک عجیب ساخت کی موٹر سائیکل تھی۔ دیکھنے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ طبعی عمر پوری کر چکی ہے لیکن یہ باباجی کے کمالِ فن کا اعجاز تھا کہ وہ پوری روانی اور جولانی کے ساتھ چلتی تھی۔ بندہ نے خود دیکھا کہ چھٹی کے دن باباجی نے اس کے تمام پُرزے کھول کر اس طرح بچھا رکھے ہیں جیسے سردیوں میں کوئی گرم کپڑوں کو دھوپ لگاتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر موٹر سائیکل کا ڈھانچہ یوں کھڑا کر دیا جیسے بچوں کے جوڑ توڑ والے کھلونوں کے حصے بکھیرنے کے بعد چند لمحوں میں دوبارہ اصل حالت میں آ جاتے ہیں۔ جہاں تک باباجی کے فنِ حکمت کی بات تھی تو ایسا لگتا ہے فن طب کے روایتی اصولوں سے زیادہ ان کا وجدان کام کرتا تھا۔ وہ مریض کا (بلکہ آنے جانے والے افراد کا) چہرہ دیکھ کر قدرتی حس کے ذریعے بھانپ لیتے تھے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟

علامات کچھ اور ہوتیں مگر وہ بیماری کچھ اور بتاتے اور بعد میں وہی بات درست ثابت ہوتی جو انہوں نے کہی تھی۔ ان کے دم میں بھی غیر معمولی اثر تھا اور برسوں کے مریض معمولی سی توجہ سے شفایاب ہو جاتے تھے۔ دراصل یہ سب ان کے خلوص اور

تقویٰ کا کمال تھا۔ وہ کسی سے پائی پیسے لینے کے بجائے اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمانے میں فخر اور راحت محسوس کرتے تھے۔ مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے بچنے کا انتہائی اہتمام کرتے تھے اور ساری زندگی پاک صاف گزار کر اس دنیا سے جانا چاہتے تھے۔

بابا جی کو دو چیزوں سے بڑی محبت تھی: قرآن اور پاکستان۔ جس کسی کے متعلق معلوم ہوتا کہ قرآن اچھا پڑھتا ہے یا اچھا یاد ہے تو اس کی بے حد قدر کرتے تھے۔ قرآن سے انہیں صحیح معنوں میں عشق تھا۔ تراویح میں اچھے قاری کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور لمبی لمبی رکعتیں مزے لے لے کر پڑھتے۔ مدرسے کے طلبہ سے ویسے ہی بہت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے لیکن جس طالب علم کے متعلق معلوم ہوتا کہ اس کی منزل پختہ ہے یا پڑھتا اچھا ہے اس پر ان کی عنایات اور اس کے لیے دعا یا انعام کا اہتمام دیکھنے والی چیز ہوتا تھا۔ سفید ٹوپی اور سفید کپڑے والے طالبعلم کو دیکھتے ہی کھل اُٹھتے تھے۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ مدرسے کے طلبہ کو دیکھ کر ان کو دلی خوشی اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مدرسے میں استاد محترم کے پاس آکر بیٹھتے۔ ان کے بیٹھنے کا مخصوص پُروقار انداز تھا۔ استاد صاحب ان کو چائے پیش کرتے۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتے جاتے اور ہر طالبعلم کے بارے میں پوچھتے جاتے کہ اس کے کتنے سپارے ہوئے ہیں؟ کیسا جا رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ غرض قرآن اور اہل قرآن سے ان کا گہرا قلبی تعلق قابل رشک تھا۔ اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ ہر کسی کے پاس نہ ہوتا تھا۔ بابا جی کے کان میں اگر راہ چلتے ہوئے تلاوت کی آواز آجاتی تو دیر تک کھڑے سنتے رہتے تھے۔

قرآن کے بعد ان کی دوسری محبت پاکستان تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی دنیا ہی اول و آخر پاکستان تھی۔ کوئی چیز کسی بھی حوالے سے پاکستان یا پاکستانیت کی عزت و وقار سے تعلق رکھتی ہو، وہ اس بارے میں جذباتیت کی حد تک دلچسپی لیتے تھے۔ 65ء کی جنگ کے دنوں میں بندہ پیدا نہ ہوا تھا، 71ء کی جنگ میں چھوٹا سا تھا اس لیے زیادہ کچھ یاد نہیں، البتہ لوگ بابا جی کی پاکستان سے محبت اور پاکستانی فوج سے وارفتگی کی حد تک تعلق کے حوالے سے جو کچھ سناتے تھے وہ سب لکھا جائے تو کئی صفحات ہو جائیں، اس لیے صرف چشم دید واقعہ سنانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ جاپان کے پہلوان انوکی اور پاکستان کے اسلم پہلوان کا مقابلہ ہوا۔ بابا جی یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے ایک دو چورنگیاں دور ایک بیکری کے تھلّے پر گئے، جہاں بیکری کے مالک نے ایک چھوٹا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی مہیا کیا تھا۔ اس زمانے میں محلے بھر میں ایک آدھ ٹی وی ہی ہوتا تھا۔ ہر گھر میں اور گھر کے ہر کمرے میں ڈش میسر ہونے کی ترقی سے پاکستانی قوم آشنا نہ تھی اس لیے پاکستانی ثقافت سے بیزار بھی نہ تھی۔ اب تو غیر ملکی ثقافت کی یلغار نے پاکستان سے محبت باقی چھوڑی نہ پاکستانیت پر فخر۔ حب الوطنی کا لفظ تو مضحکہ بن کے رہ گیا ہے۔ (یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ٹی وی کے درست و نادرست ہونے کا ذکر قطعاً مقصود نہیں، فقط ایک واقعہ ذکر ہو رہا ہے کہ عمر بھر ٹی وی نہ دیکھنے والے شخص نے یہ اصول توڑ دیا تھا۔ اس اصول شکنی کی تائید بھی نہیں کی جا رہی۔) خیر بات اسلم پہلوان اور انوکی کے مقابلے کی ہو رہی تھی۔ بابا جی کا جوش و خروش دیکھنے والا تھا۔

حاضرین نے بتایا کہ جوانی میں وہ چونکہ خود بھی پہلوانی کرتے رہے تھے اس لیے مقابلے کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتے تھے اور حاضرین کو بھی اپنے تبصروں سے مستفید کرتے رہے۔ اسلم پہلوان کا کندھا اتر گیا تھا اس لیے جوابی مقابلے میں اس کا بھتیجا جھارا پہلوان آیا۔ بابا جی کی مجلس میں تبصرے ہوتے تھے کہ اسلم پہلوان کی جگہ گوگا پہلوان کو میدان میں اتارنا چاہیے تھا کیونکہ وہ دیسی

کشتی کی طرح فری اسٹائل ریسلنگ بھی جانتا ہے۔ ادھر ایک شخص لاہور میں جھارا پہلوان کی تیاریاں دیکھ کر آیا۔ دن رات اس کا تذکرہ ہوتا کہ جھارا پہلوان دریائے راوی میں زنجیریں پہن کر کشتی پار کھینچ لے جاتا ہے، اکھاڑے کی مٹی میں لیٹ کر لوہے کے گرز کی ضربات سہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس مقابلے کے لیے باباجی اور محلے کے دوسرے بڑے بزرگوں کا جوش وخروش ایسا ہی تھا جیسا آج کل پاک بھارت میچ کے دوران برمیوڈا شاٹس (لمبی نیکر) پہننے والے من موجیوں کا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ باباجی اور دوسرے بزرگ زیرِلب آیتیں اور دُعائیں پڑھتے تھے اور آج کی اچھلتی کودتی اور ادھ لباسی رنگ برنگی مخلوق ناچتی گاتی ہے۔ الغرض پاکستان کے حوالے سے ہر چیز سے ان کو بے ساختہ اور والہانہ محبت تھی۔ ان کی دنیا پاکستان سے شروع ہوکر پاکستان پر ختم ہوتی تھی۔ آزادی کے وقت دی گئی قربانیاں اور 65ء کی جنگ میں پاک فوج کے کارنامے ان کا خصوصی موضوع تھے۔ مشہور جنگی وقائع نگار، ماہنامہ حکایت لاہور کے مدیر عنایت اللہ اور مشہور عسکری ناول نگار نسیم حجازی کی کئی کتابیں بندہ نے پہلی بار باباجی کی چھوٹی سی لائبریری ہی میں دیکھی تھیں۔

افسوس کہ اسلام اور پاکستان سے محبت پیدا کرنے والی ایسی تحریریں اب نایاب ہوتی جارہی ہیں اور حب الوطنی اور قومی غیرت وافتخار کا جذبہ ایسا مفقود ہوتا جارہا ہے جس کے سبب ہر طرف بیزاری اور مایوسی ہے اور ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ نئی نسل میں وطن سے محبت اور قومی روایات پر فخر کا جذبہ اس قدر کمزور پڑتا جارہا ہے کہ سمجھ نہیں آرہا کہ نئی پود دنیا میں الگ شناخت کس طرح پیدا کرے گی اور ملّی غیرت کا پاس، قومی وقار کا تحفظ اس سے کیونکر بن پڑے گا؟

میں معذرت خواہ ہوں کہ دور چلا گیا۔ ''باباجی کا پاکستان'' ان کے لیے اس قدر معزز ومحبوب تھا کہ بقیہ چیزیں اس کے آگے ہیچ تھیں۔ اکثر کہا کرتے تھے: ''پاکستان کا اللہ وارث ہے۔ اس پر اللہ کی رحمت کا خاص سایہ ہے۔ پاکستانی لوگ اگر اللہ سے لَو لگائے رکھیں تو کبھی کسی میدان میں ناکام نہ ہوں گے۔'' پاکستان کے قومی دنوں پر افواج پاکستان کی پریڈ دیکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ پریڈ اور اسلحے کی نمائش سے ایسے خوش ہوتے جیسے ان میں سیروں خون بڑھ گیا ہے یا نئی روح دَر آئی ہے۔

اب تو یہ قومی تقریبات بھی حوادث زمانہ میں کہیں گم ہوتی چلی جارہی ہیں حالانکہ سال کے یہ ایک دو دن پاکستانیوں کو اپنا آپ پہچاننے میں وہ کردار ادا کرتے ہیں جو آبِ حیات بھی کیا کرے گا؟ آج کل باباجی جیسے لوگ نہیں رہے جو حب الوطنی اور غیرتِ قومی کی زندہ علامت ہوں۔ ایسے لوگ قوم کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ افسوس کہ ہم اس حوالے سے تہی دست ہوتے جارہے ہیں۔

کچھ تو مداوا کیجیے!

جس طرح دنیا 11 ستمبر کو نہیں بھول سکتی، اسی طرح پاکستانی قوم 6 ستمبر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی...... یہ وہ دن ہے جس کی یاد ہمیں ہمیشہ ایک نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ وہ ایمانی اور روحانی زندگی جسے چھیننے کے لیے دنیا بھر کا طاغوت جمع ہو کر زور لگا تا رہا ہے لیکن اسے ہم سے چھین نہ سکا اور جب تک رب العزت جو پاکستان کا والی وارث ہے، ہمیں سر بلند رکھنا چاہے گا کوئی بدنیت یہ مایۂ فخر ہم سے نہ چھین سکے گا...... اور کوئی یہ صفت ہم سے چھین بھی کیسے سکتا ہے جبکہ ہم میں قمر بھائی اور لالہ جان جیسے لوگ موجود ہیں۔

لالہ جان کا قصہ میں پھر کسی وقت سناؤں گا، آج کی مختصر تحریر قمر بھائی کے نام ہے۔ قمر بھائی کہنے کو تو محلے کے ایک رہائشی تھے لیکن درحقیقت وہ سارے محلے کی آبرو تھے۔ کسی کا کوئی بھی کام ہو، کسی قسم کی مشکل ہو، شادی بیاہ ہو یا فوتگی، جنازہ یا اور کسی قسم کی تقریب وغیرہ...... وہ ہر موقع پر پیش پیش ہوتے تھے۔ اسپورٹس سے لے کر اسکاؤٹنگ تک ہر چیز میں محلے کے نوجوانوں کے لیڈر وہی تھے۔ قمر بھائی کا بس ایک ہی ذوق تھا کہ آگے چل کر وہ کسی طرح فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ اس خاطر وہ طرح طرح کی ورزشیں کرتے، فوجی امتحانات کے سوالات، معلومات عامہ وغیرہ یاد کرنے کی کوشش کرتے۔ اکثر کہا کرتے کہ مجھے تو خواب میں بھی کپتان کی وردی اور کندھے پر لگے بیج نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا مدار ہی بھرتی کے امتحان میں کامیابی کو بنا رکھا تھا۔ ان کے کمرے میں جائیں تو دو چیزیں نمایاں نظر آتی تھیں۔ ایک وہ کپ جو انہوں نے تقریر وغیرہ اور کھیلوں کے مقابلے میں جیت کر لائے تھے اور دوسرے جہازوں، ٹینکوں اور توپوں وغیرہ کی تصویریں جو انہوں نے اخباروں اور رسالوں سے کاٹ کاٹ کر جمع کر رکھی تھیں۔ 6 ستمبر یا 23 مارچ کے دن کی پریڈ دیکھنے کے لیے محلے کے بچوں اور نوجوانوں کا جمِ غفیر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ قمر بھائی بے خُود ہو کر پریڈ اور مظاہرہ وغیرہ دیکھتے اور ہر دفعہ یہ عزم لے کر لوٹتے کہ جیسے بھی ہو فوج میں بھرتی ہونا ہے۔

آج جبکہ امریکا جیسے ملک میں فوج میں بھرتی ہونے کے لیے چڈی پہننے والے نوجوانوں کو طرح طرح کی ترغیبات کے ذریعے آمادہ کیا جاتا ہے، پاکستانی قوم میں قمر بھائی جیسے لوگوں کا وجود ہم لوگوں کے زندہ اور بیدار قوم ہونے کی علامت ہے...... لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ آج کل نہ تو پاکستان کے قومی دنوں کے موقع پر عسکری نمائشیں اس زور و شور سے ہوتی ہیں جیسا کہ پہلے ہوا کرتی تھیں (ان کی جگہ بھارتی ٹھمکے ماروں کے کرتبوں نے لے لی ہے) نہ نوجوانوں میں فوج کی وہ عزت وعظمت اور اس میں شمولیت کا وہ شوق وجذبہ باقی رہا ہے جو ہمارا سرمایۂ افتخار و امتیاز تھا۔ جسے دیکھو مائیکل جیکسن بننے کے شوق میں نیم برہنہ بھوتنا بنا پھر رہا ہے۔ یہ منفی رجحان بہت خطرناک ہے۔ اس کا مداوا کیے بغیر ہمارے ہاں پولیو کے قطرے پی کر جوان ہونے والی ٹوٹ بٹوٹ زنخا نما نسل تو پیدا ہوتی رہے گی، قمر بھائی جیسے لوگوں کو ہم ترستے ہی رہ جائیں گے۔

اے اہلِ وطن!

بزرگوں نے لکھا ہے کہ آدمی جب کسی مشکل میں مبتلا ہو جائے تو دیکھنا چاہیے کہ اس سے اس کی طبیعت میں پشیمانی اور عاجزی پیدا ہوئی ہے یا غفلت، شکوہ شکایت، مایوسی و بیزاری؟

اگر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نصیب ہو گیا اور نظر حادثے کی شدت کو قدرت کی طرف منسوب کر کے شکوہ شکایت پر جانے کے بجائے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی طرف گئی اور غصہ اپنے نفس پر نکالا یا اسے اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھ کر اس پر صبر کیا تو ان شاء اللہ خیر ہی خیر ہے۔ یہ آزمائش دھو دھا کر صاف کر دے گی: "لا بأس طهور ان شاء الله!" (کوئی حرج نہیں اللہ نے چاہا تو یہ گناہوں کا بوجھ اور آلودگی ختم ہونے کا ایک بہانہ ہے) اور اگر خدانخواستہ اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور بے احتیاطی پر نظر جانے کے بجائے بس یہی تذکرہ ہو کہ ایسا کیوں ہوا؟ اتنی شدت سے کیوں ہوا؟ اللہ کی بندوں سے محبت، ستر ماؤں سے زیادہ محبت، اس کی وسیع رحمت کا تصور ہی نہ کیا جائے اور دل و دماغ پر بس یہی سوار رہے کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اس بات کا خیال ہی نہ آئے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو جب آزمائش میں ڈالتا ہے تو یہ اس کی محبت کا ایک انداز ہوتا ہے تو پھر میں کس شمار قطار میں ہوں؟ مجھے تو اس تنبیہ پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آخری حد تک جانے سے پہلے مجھے واپس کھینچ لیا۔ اصلاحِ حال کا موقع دے دیا، ایک مرتبہ اور مہلت دے دی۔ اگر دل میں ایسے جذبات و خیالات نہ ہوں تو پھر یہ خطرے کی علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ مشکل اور مصیبت آزمائش نہیں، سزا تھی۔ تنبیہ نہیں، بڑے عذاب سے پہلے چھوٹا عذاب تھا۔

اے اہلِ وطن! سچ بتاؤ! تم کون سی بات سوچتے اور محسوس کرتے ہو؟ حدیث شریف میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کی بھلائی چاہتے ہیں تو اسے دنیا میں ہی تھوڑی بہت سزا دے دیتے ہیں اور اگر (بندہ اپنے آپ کو اس بھلائی کا مستحق ثابت نہ کرے وہ علانیہ فسق و فجور کرے پھر اس پر فخر و دکھلاوا کرتا پھرے) اس کے ساتھ خیر کا ارادہ نہ فرمائیں تو اس کے گناہوں کے باوجود اس پر گرفت نہیں کرتے یہاں تک کہ قیامت کا دن آئے گا پھر اس سے پورا پورا حساب لے لیں گے۔ اور مصیبت جتنی بڑی ہو اجر اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اور یاد رکھو! جب اللہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو (اس کی محبت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ) اسے آزمائش میں مبتلا کر کے ٹٹولتا ہے۔ پس جو اللہ کی رضا پر راضی ہو گیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی رضا کا انعام ہے اور جو (کم نصیب اپنے رب کے اس امتحان پر) ناراض ہو گیا اس کے لیے پھر رب کی طرف سے بھی ناراضگی ہے۔"

(ریاض الصالحین: 1/52 بحوالہ ترمذی)

اے میری قوم! یہ آزمائش واقعتاً بڑی سخت ہے اور جیسے جیسے موسم شدید ہوگا مزید سخت ہوتی چلی جائے گی۔ الائی میں بعض متاثرین کا حال یہ ہے کہ رات کو جب بارش ہو جاتی ہے تو ان کے پاس سر چھپانے اور سامان بچانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا

سوائے اس کے کہ گائے بکری کی طرح درختوں کے نیچے یا جھاڑیوں کے بیچ میں جا چھپیں اور جیسے تیسے بارش کے رکنے کا انتظار کرتے ہوئے ٹھٹھرتے رہیں۔ جس بچے کو اس دوران نمونیہ ہو جاتا ہے پھر اس کا بچنا مشکل ہے...... جبکہ شہری بھائیوں کی طرف سے امداد کی ترسیل دھیمی پڑتی جا رہی ہے۔ دوائیاں حسبِ حال وحسبِ ضرورت نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان کے لیے رہائش وغیرہ کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ دن نہیں ٹھہرتے۔ کچھ برادران تو جاتے ذوق وشوق سے ہیں لیکن صبح پہنچتے ہیں تو شام کو کہتے ہیں: ''ہم یہاں کب تک رہیں گے؟ آپ ہمیں واپس لینے کب آؤ گے؟''

برادرانِ اسلام! صبر وہمت کے ساتھ حالات کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان چند کارکن طلبہ کی طرح جنہوں نے دس دس دن تک کپڑے نہیں بدلے۔ ان کا رنگ بدل گیا تھا لیکن اندرونی جوش ومسرت سے چہرہ تمتما رہا تھا اور عب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ مادی تعاون کے ساتھ دینی نصرت ومدد بھی کی جائے۔ متاثرین کو کسی طرح احساس دلایا جائے کہ زلزلہ صرف زمین کی پلیٹیں ہلنے سے نہیں آتا، یہ دیکھنا چاہیے یہ پلیٹیں کس وجہ سے ہلیں؟ کس بوجھ تلے دب کر ہلیں؟ اگر ہم نے اب بھی اللہ کو راضی نہ کیا تو آیندہ ایسے ہلنے سے اور ہمیں لڑھکنے سے کون بچائے گا؟ ناس ہو اس مادہ پرست، عقل پرست میڈیا کا جس نے قوم کو باور کرا رکھا ہے کہ آیندہ سو سال تک اب کچھ نہیں ہوگا۔ چلیے مان لیا وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اب زلزلہ نہیں ہوگا لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اب کچھ اور بھی نہیں ہوگا؟؟

میرے دوستو! متاثرہ علاقوں کے دینی حالات قابلِ اطمینان نہیں۔ وہاں دینی رفاہی کاموں کی زبردست ضرورت ہے۔ تبلیغی جماعت کے ساتھی اور مدارس کے طلبہ مخصوص نظم وضبط کے پابند ہوتے ہیں۔ اطاعت اور خدمت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ محنت ومشقت بھی برداشت کر سکتے ہیں اور لوگوں کی حقیقی معنوں میں خدمت بھی کر سکتے ہیں۔ حقیقی معنی کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی حسبِ حال مدد دیانت کے ساتھ کرنے کے علاوہ انہیں اللہ طرف، آخرت کی طرف اور قبر وحشر کی تیاری کی طرف متوجہ کیا جائے۔

ایک آدمی نے جانا تو بہت دور ہے لیکن آپ اسے چند اسٹاپ تک کا کرایہ خرچہ دے کر رخصت کر دیں، یہ بھلائی تو نہ ہوئی۔ انسان کا اصل سفر تو آنکھیں بند ہونے کے بعد شروع ہوگا۔ ہم اسے صرف چند دنوں کی زندگی کا تھوڑا سا سامان مہیا کر دیں، یہ خیر خواہی تو نہ ہوئی۔

متاثرین کو حقیقی خیر خواہی کی ضرورت ہے، سچی اور حقیقی خیر خواہی کی! فائبر اور لکڑی کے زلزلہ پروف مکانات بنا دینے سے قبر کے جھٹکوں اور حشر کے زلزلوں سے تو آدمی نہیں بچ سکتا اور پھر بات یہ ہے کہ آفات کیا محض زلزلے کی شکل میں آتی ہیں؟ گوروں کے سیل بند کنٹینر سخت حفاظت میں کشمیر کی وادیوں میں پہنچ چکے ہیں۔ امریکا کی ''ہموی'' نامی مشہورِ زمانہ بکتر بند گاڑی ایمبولینس کے طور پر چل رہی ہے۔ نیٹو کی افواج کو ریلیف ایکسپیرینس بالکل نہیں، تو وہ وار ایکسپیرینس رکھتی ہیں لیکن ریلیف کے نام پر پانچ سال کے لیے پاک دھرتی پر آ چکی ہیں اور پکی پکی آ چکی ہیں۔ نیٹو کے رضا کار نہیں آئے فورسز آئی ہیں۔ دھڑلے کے ساتھ پاؤں جما کر آئی ہیں۔

غیر ملکی ہیلی کاپٹر چکلالہ ایئر بیس سے اڑتے ہیں۔ کہوٹہ کے قریب سے ہو کر گزرتے ہیں۔ زمین پر موجود مکھی مچھر کو بھی

تاڑ لیتے ہیں تو پھر کون سی راز کی چیز راز میں رہ جائے گی؟ پاک فوج کا اصول تھا کہ اپنے افسروں اور جوانوں کو غیروں کے ساتھ براہِ راست تعلقات نہیں بنانے دیتے۔ اب گورے فوجی عام جوانوں کے ساتھ گلے میں ہاتھ ڈال کر پھرتے اور دکانوں سے موبائل خریدتے نظر آتے ہیں۔ کشمیر سے لے کر چترال، گلگت، دیوسائی...... سب ہتھیلی پر رکھے چاول کے دانے ہیں۔ روکا بی بی (محترمہ کرسٹینا روکا) پاکستان میں تین دن رکی ہیں لیکن خلافِ دستور ان کی مصروفیات کا شیڈول جاری نہیں کیا گیا۔ شمالی علاقہ جات میں وہ پورا ایک دن کس شغل میں بسر کر کے گئی ہیں؟ اللہ ہی رحم کرے یہ حالات کس طرف جا رہے ہیں؟

ایبٹ آباد، ہری پور، مانسہرہ میں تمام گیسٹ ہاؤس وغیرہ غیر ملکیوں کے لیے بک ہو چکے ہیں۔ ان کے اخراجات کون پورے کرے گا؟ اور واپسی کا راستہ کون دکھائے گا؟ جبکہ قدرت کی غضب ناکی کا حال یہ ہے کہ کشمیر بارڈر پر انڈین فورسز کے مورچے قائم تھے۔ ہماری فوجوں کے گر چکے تھے یا دھنس چکے تھے جبکہ بیچ میں تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ ادھر ہماری اخلاقی گراوٹ اس درجے کو پہنچ چکی ہے کہ (بیان ریکارڈ پر ہے) جب زلزلہ آیا تو ہمارے ایک صاحب ناشتہ کر رہے تھے جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ان کی ذاتی مجبوری ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا بے ساختہ اظہار تو کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ چلیے ان کی ذاتی مجبوری ہی سہی لیکن مارگلہ ٹاور سے صرف وہی ٹاور کیوں گرا جس میں بیوٹی پارلر، مساج گھر اور غیر ملکیوں کے الم غلم کے علاوہ عجیب حالت میں لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔

مظفر آباد کے مشہور زمانہ فائیو اسٹار ہوٹل کے ٹاپ فلور پر لگی ہوئی خوبصورت ٹائلیں اور برقی قمقمے، یعنی بلند ترین بالا خانے کی چھت زمین پر کھڑے ہو کر بھی یوں نظر آ رہی تھی جیسے تجاوزات والوں نے لکڑی کے کیبن کو دھکا دے کر گرا دیا ہو جبکہ یہ سات منزلہ عمارت تھی۔ ساڑھے چھ منزلیں بشمول تہہ خانے کے زمین میں غائب تھیں۔ پڑوس میں متصل واقع پیٹرول پمپ کے شیشے بھی نہ چٹخے تھے۔

بالاکوٹ کے ایک مشہور ہوٹل کے بارے میں بتایا گیا کہ وہاں ناظم صاحبان نے (اللہ کی پناہ! سو مرتبہ پناہ!) جشن مناتے ہوئے افطاری میں شراب بھی مہیا کی تھی۔ (بندہ کو تو یہ کہا گیا کہ افطاری شراب سے کی تھی لیکن میں نے اس جملے کو بدل دیا ہے) ایک ہسپتال والوں نے بتایا کہ یہاں بارہ چودہ سال کی بچیاں ابارشن کے لیے آتی تھیں۔ ان کے والدین کے پاس ہسپتال کی فیس نہ ہوتی تھی لیکن فحاشی نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ یہ ہسپتال بھی زمین میں دھنس چکا تھا۔ ہم قریب سے ہو کر آئے۔

تفریحی مقامات میں ہائیکنگ کلب بنے ہوئے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں مخلوط گروپ بنا کر کیمپنگ کرتے تھے۔ کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی تھیں۔ کیبل، سی ڈیز کو تو رہنے دیجیے کہ فیل شدہ فارغ نوجوانوں کا مشغلہ ہی کچھ اور نہ تھا۔ سیاحت کو ترقی دینے کے نام پر وہ سہولتیں فراہم کی جا رہی تھیں جو ہمیں کبھی بھی راس نہیں آ سکتیں۔ بے بس عورتوں کی زمین پر قبضے کے کیس بہت زیادہ تھے۔

اے میرے مسلمان بھائیو! قلم میں ایسی تمام باتیں درج کرنے کی ہمت نہیں۔ یہ دل خراش واقعات اس لیے لکھنے پڑے کہ خدارا! اب بھی وقت ہے سدھرنے کا، سنبھلنے کا، کوتاہیوں کے ازالے کا، زیادتیوں کی تلافی کا...... قدرت کی بے پناہ طاقت کے سامنے کوئی چیز پروف نہیں ہوتی۔ پھر ہم کیوں سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہیں؟ ہم کیوں نہیں مان لیتے کہ ہمارا معاملہ کچھ اور

ہے۔ہم ''اہلِ میثاق'' ہیں۔ہم نے اللہ تعالیٰ سے عہد کے تحت یہ ملک لیا تھا۔اس عہد کی تکمیل کے بغیر ہمارے وجود کی ضمانت نہیں۔ہم نے اپنی تاریخ کا سخت ترین جھٹکا کھا کر بھی ہوش نہ سنبھالا تو ہمارے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو جائے گی۔

☆......☆......☆

مذاق نہ کریں جی!

زلزلے کے بعد ایسے ایسے لوگ بنگلوں سے فٹ پاتھ پر اور فٹ پاتھ سے خیمہ بستی میں آ چکے ہیں جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اللہ ہی ان کی مشکل آسان فرمائے۔ہم ایک خیمہ بستی میں گشت کر رہے تھے۔مسلم ایڈ، الخدمت فاؤنڈیشن، الرشید ٹرسٹ سب نے حسبِ حیثیت سو سو دو دو سو خیمے لگا رکھے تھے۔ایک خیمے کے باہر کھڑے بچے کو خیمے کے اندر سے انگلش میں پکار پکار کر کچھ کہا جا رہا تھا۔ہم قریب سے گزر رہے تھے۔ایک نوجوان کو بلا کر پوچھا:

''یہ بستی والے آپ کی خدمت بھی کرتے ہیں یا بس خیمہ دے کر بھول گئے؟''

''نہیں جی! ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں۔بس ہماری عزتِ نفس کی خاطر قریب نہیں آتے۔کھانا وقت پر ملتا ہے۔ڈاکٹر بھی بٹھا رکھا ہے۔زیادہ زخمی کو ایمبولینس میں ہسپتال لے جاتے ہیں۔''

''کھانا کتنے وقت ملتا ہے۔''

''صبح اور شام، دن کو بچوں کے لیے بھی دیتے ہیں۔''

''بڑوں کو نہیں دیتے؟''

''مذاق نہ کریں جی! بڑوں کا تو روزہ ہوتا ہے۔''

''اچھا! ہم کوشش کریں گے عید کے بعد ایک دن آپ لوگوں کو انگلش فوڈز پیش کریں۔''

''انگلش فوڈز! وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ انگلش جو بولتے ہیں۔''

''اوہ چھوڑیں جی! بس دعا کریں ہم جلد اپنے گھروں کو چلے جائیں۔''

☆......☆......☆

کام چل گیا

اسلام آباد کی خیمہ بستی کے سرکاری پورشن میں بہت سے محکموں کے آفیسرز جمع ہیں۔اپنے اپنے حصوں کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔فوجی بھی غیر فوجی بھی۔وزیر حضرات بھی اپنے سیکرٹریوں کے ساتھ چکر لگاتے رہتے ہیں۔ایک آفیسر، مولویوں کا جھمگٹا دیکھ کر گپ شپ کے لیے آتا ہے۔ایک اونچے لمبے گورے چٹے ساتھی سے پوچھتا ہے:

''آپ پٹھان ہیں؟''

اس کی جگہ دوسرا کہتا ہے: ''شکل اور وضع قطع میں تو یہ پٹھان سے بھی آگے ہیں لیکن ہے نیم پٹھان۔''

''نیم پٹھان؟ کیا مطلب؟''

''یہ چائے پیتا ہے نسوار نہیں کھاتا۔''

''اوہ!'' آفیسر، مولوی صاحب کی خوش طبعی پر دل کھول کر ہنستا ہے۔ یہ تو وہی غالب والی بات ہوئی جو اس نے انگریز سے کہی تھی:

''ہم آدھا مسلمان ہے، شراب پیتا ہے خنزیر نہیں کھاتا۔''

''ہاں تقریباً وہی بات ہے۔ آپ ادھر ڈیوٹی دیتے ہیں؟''

''ہاں! جب سے خیمہ بستی لگی ہے میں ادھر ہوں۔ جب شروع شروع میں آیا تھا تو یہاں چٹیل میدان تھا۔ پہلے ادھر تبلیغی اجتماع ہوتا تھا۔ میں ایک مرتبہ اس میں آیا تھا۔ میں نے سوچا کیا کروں؟ اتنے میں آپ جیسے مولوی لوگ آگئے۔ کوئی خیمہ لے آیا کوئی کمبل، کوئی دوائیاں، کوئی خوراک، آہستہ آہستہ پورا شہر بس گیا ہے۔ ہم نے بس اتنا کیا تبلیغی اجتماع والی سہولتیں فراہم کردیں۔ بس کام چل گیا۔''

☆......☆......☆

کیسے عجیب ہیں؟

شدید طور پر متاثرہ علاقوں میں بہت سے خاندان ایسے ہیں جن میں خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فوت ہو چکا ہے۔ کسی کی ماں ہے تو بہن نہیں۔ بہن ہے تو بیٹا نہیں۔ بہت سے خاندانوں میں تو کوئی بچا ہی نہیں سوائے اس کے جو دوسرے شہروں میں کام کاج کرتا تھا یا اور کہیں گیا ہوا تھا۔ یتیم بچوں کی تو بھرمار ہے۔ این جی اوز ان علاقوں میں پہلے سے تھیں۔ نوجوان بچیوں کو دستکاری سکھانے کے نام پر گھروں سے نکالنا اور انہیں مخصوص ذہن دے کر، آزاد مزاج کا عادی بنا کر دوسرے گھرانوں کی بچیوں پر ''محنت'' ان کا خاص مشن تھا۔ ان باکمال تنظیموں نے یہ لاجواب کام کر دکھایا تھا کہ ایسے ایسے گھرانوں کی بچیوں کو خطیر تنخواہ کا لالچ دے کر چار دیواری سے باہر نکالا جن کی نسلوں میں کسی نے بے پردگی نہ کی تھی اور مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ جن خواتین کی سات نسلیں سات پردوں میں عفت وعصمت والی زندگی گزار کر اس دنیا سے گئیں، ان کی اولادوں کے بھی دین و ایمان کو گھن لگانے والی ان سنڈیوں نے چٹ کر کھایا۔ اچھے اچھے لوگ ان کی پیش کشوں کے آگے گھٹنے ٹیک گئے۔ علمائے کرام ان کو سمجھاتے رہ گئے مگر لالچ نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔

اب یتیم بچوں کی باری ہے۔ این جی اوز ایک مرتبہ پھر ان علاقوں میں منڈلا رہی ہیں۔ یتیم بچوں پر ان کی خصوصی ''نظرِ شفقت'' ہے۔ یہ بچے بڑے ہو کر یہودی استادوں سے اسلام کا علم حاصل کریں گے تو ''مستشرق'' بنیں گے۔ عیسائی پادریوں کے ہتھے چڑھیں گے تو پاپائیت کے مبلّغ بنیں گے یا پھر کسی رضا کار فوج میں شامل ہو کر ''بدی کی طاقتوں'' کے خلاف ایکشن میں حصہ لیں گے اور آخر میں ان کی لاشیں کسی اندھیری رات میں کسی اندھے سمندر کے سپرد کر دی جائیں گی۔ یہ سب کچھ حاکمانِ وقت کے سامنے ہے مگر ان کا حکم ہے کہ متاثرہ علاقوں میں مدرسے نہ کھولے جائیں۔ شیخ سعدی نے ایک اجنبی مسافر کا شکوہ نقل کیا تھا: ''اس شہر کے لوگ کیسے عجیب ہیں کتے چھوڑ دیتے ہیں اور پتھروں کو باندھ دیتے ہیں۔''

☆......☆......☆

ننگا بابا

ایبٹ آباد شہر کے مرکزی بازار تھانہ کینٹ چوک میں ننگا بابا کا کیبن بھی دیکھا۔ موصوف ستر ڈھانکنے کا تکلف نہیں کرتے۔ ہر وقت ویسے رہتے ہیں جیسے اس دنیا میں آئے تھے۔ انگریز لوگ اس حالت کو فطری لباس کا نام دے کر شرم حیا، اعتراض واشکال سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر بابا کے مرید اتنے ایڈوانس نہیں، انہوں نے یہ عذر گھڑا ہے کہ بابا ایک رات جلوؤں سے ایسے مدہوش ہوئے کہ ہر طرح کا تکلف بھول گئے۔ اگر یہ بات درست ہے تو ایسے لوگ سب سے پہلے گرمی سردی، بہار خزاں کے اثرات سے بے نیاز ہو جاتے ہیں مگر جب ہم پہنچے تو باباجی رنگین لحاف اوڑھے ہوئے تھے۔ کیبن کے باہر آگ جل رہی تھی۔ یہ عذر دونوں ٹانگوں سے لنگڑا محسوس ہونے لگا۔

باباجی ایک وقت میں گولڈ لیف کے چھ چھ سگریٹ بڑے اسٹائلش انداز میں انگلیوں میں تھامتے ہیں اور ایسا جھوم جھوم کر پھونکتے ہیں کہ پرانے موالیوں کو بھی رشک آجائے اور ان کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ 35 سال سے پانی اور شلوار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بابا کے مریدوں میں 80 فیصد عورتیں ہوتی ہیں جو ان کی اس اعلیٰ اخلاقی ہیئت کے باوجود انہیں کرشماتی قسم کی روحانی شخصیت سمجھتی ہیں۔ ایک مشہور شخصیت جو وزیر بھی رہے ہیں، کی اہلیہ بھی ان کے حلقے میں شامل ہیں۔ وہ دس ہزار روپے ایک ڈرائیور کو ہر ماہ محض اس لیے دیتی ہیں کہ گاڑی لے کر ننگی زیارت گاہ کے قریب کھڑا رہے۔ تعجب ہے! باباجی دور بیٹھے مریدوں کے احوال جاننے کے لیے وہیں بیٹھے بیٹھے پرواز کر لیتے ہیں مگر سگریٹ لینے کھوکھے تک جانے کے لیے انہیں گاڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کہاں وہ بلند پروازی اور کہاں یہ پستی ومحتاجی!

توہم پرستی چیز ہی ایسی ہے کہ اتنے کھلے تضادات کے باوجود جب ذہنوں پر مسلط ہو جاتی ہے تو چنگے بھلے لوگوں کو اندھا کر چھوڑتی ہے۔

اے خدا! ہماری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نہیں جانتی ایسی توہم پرستی کا انجام کیا ہے؟

اور یاد کرو اس عہد کو......

سورۂ بنی اسرائیل کی ایک آیت میں اللہ پاک نے قوموں کی تقدیریں بدلنے اور زمانے کی گردش کو ان کے حق میں پلٹنے کا قانون بیان کیا ہے۔ یہ قانون درحقیقت عروج وزوال کا تکوینی قانون ہے اور اس میں قیامت تک کے لیے افراد اور اقوام کے بلندی وکمال تک پہنچنے کے اسباب اور پستی وزوال کا شکار ہونے کی وجوہ بیان کردی گئی ہیں۔ آج کی مجلس میں اس آیت کا مطالعہ اور اس میں بیان کی گئی کسوٹی اور قانون پر اپنے آپ کو پرکھنا مقصود ہے۔ آیت کریمہ کا ترجمہ یوں ہے:

''اور پھر پلٹا دیا ہم نے زمانے کی گردش کو تمہارے حق میں دشمن کے خلاف اور دیے تمہیں مال واولاد اور بنادیا تم کو بہت سی تعداد والا اگر تم بھلا کروگے تم اپنے حق میں کروگے اور اگر بُرا کیا تو وہ بھی اپنے لیے ہی کروگے۔'' (آیت: 6، 7)

تحریکِ پاکستان کے دوران زمانے کی گردش ہمارے حق میں ایک عہد کے تحت پلٹی گئی تھی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ باقاعدہ عہد باندھ کر اپنا وجود حاصل کیا تھا۔ وہ عہد یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں دُہری غلامی (انگریزوں کی عسکری سیاسی اور ریاستی غلامی اور ہندوؤں کی معاشی غلامی) کی لعنت سے آزاد کر کے خودمختار خطۂ زمین دے دے تو ہم دنیا کے سامنے ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا نقشہ پیش کر کے دکھائیں گے اور اس ملک کو تمام خلقِ خدا کے لیے روشنی کا مینار بنائیں گے۔ ہمارا یہ عہد بارگاہِ الٰہی میں ہمارے کچھ بزرگوں کی اس بے لوث قربانی کی برکت سے قبول ہوگیا جو سرحد کے کہساروں میں انہوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر دی تھی، جبکہ انہیں اس کے بدلے ملنا کچھ نہ تھا۔ سید بادشاہ کے قافلے کے ہاتھ عالمِ اسباب میں کچھ نہ آیا لیکن یہ قوم خدا کی نگاہ میں آ گئی اور آنے والے سالوں میں حیرت انگیز طور پر حالات اس قوم کے سیاسی اقتدار کے حق میں ہموار ہوگئے اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی قوم سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تنبیہ کی مخاطب بن گئی جو انہوں نے اپنی غلام قوم کو آزادی ملنے سے قبل کی تھی:

''قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تم کو ملک کا حکمران بنائے تاکہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔'' (الاعراف، 7:129)

زمین میں قوموں کا مقتدر ہونا قدرتِ خداوندی کا بہت بڑا انعام ہوتا ہے۔ قوموں کا مقتدر ہونا عطیہ ہے اور افراد کا مقتدرِ اعلیٰ ہونا اعزاز وآزمائش، لیکن مفاد پرستی اور کوتاہ نظری کے سبب ہم سے آغاز ہی میں ایسی غلطی سرزد ہوگئی کہ اس کا ازالہ ہی ہونے میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کے نام، نظام کے وعدہ پر حاصل کیے جانے والے خطۂ زمین میں ہم اپنی بداعمالیوں سے زیادہ بدعہدی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ اپنے بندوں کی بداعمالیوں پر تو اللہ تعالیٰ نظرِ کرم فرماتے رہتے ہیں مگر بدعہدی سے صرفِ نظر سچی توبہ کے بغیر............ نہیں فرماتے۔ سورۃ البقرہ میں ارشادِ ربانی ہے: ''و اوفوا بعهدی اوف بعهدكم و ایای فارهبون.'' (سورہ البقرہ)

ترجمہ: ''اور پورا کرو اس عہد واقرار کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں اس عہد واقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا

اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

ہم روزِ اول سے آج تک دنیا میں ہر چیز سے ڈرے لیکن اللہ تعالیٰ سے اور اس سے کیے گئے عہد کو توڑنے کی سزا سے کبھی نہ ڈرے۔ سب سے پہلی بڑی تاریخی غلطی اور اس کے نتیجے میں ہماری بدبختی کا آغاز اسی روز سے شروع ہو گیا تھا جب 11 / اگست 1947ء کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین سازی کے ارکان اس گتھی کو سلجھانے میں جان ہلکان کر رہے تھے کہ ''پاکستان میں طرزِ حکومت کیا اور کیسا ہو؟'' حقیقتاً وہ جس نکتے پر غور فرما رہے تھے، اس پر تو غور کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی کہ ہم آج تک جس کی سزا کاٹتے ہیں، کفارہ ادا کرتے ہیں مگر ہماری سیاہ بختی کا زور ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں۔ کچھ غلطیوں کا کفارہ نسل در نسل اور سال بہ سال ادا کیا جاتا ہے مگر پھر بھی ادا نہیں ہوتا۔ جس خطۂ زمین کو لا الہ الا اللہ کی اساس اور نظریاتی نعروں کے زور پر حاصل کیا گیا تھا وہاں پو پھٹتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ ابھی 14 / اگست کی صبح آئی بھی نہ تھی کہ ہماری سیاہ بختی، گمراہی اور سزا در سزا کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

11 / اگست 1947ء کو پاکستان کی پہلی مجلسِ آئین سازی کے سامنے یہ سوال، بحث و مباحثہ، غور و فکر اور دانشوری بالکل بے معنی اور لاحاصل تھی کہ ''نوزائیدہ پاکستان میں طرزِ حکومت اور ملکی نظام کیا ہو......؟ کیسا ہو......؟'' کیا یہ بات 1905ء سے 1947ء تک طرح طرح سے طے نہیں کر لی گئی تھی کہ پاکستان میں طرزِ حیات اور نظامِ حکومت کیا اور کس طرح کا ہوگا؟ جو بات نصف صدی میں باصرار کہی گئی اور پوری وضاحت اور سیاق و سباق کے ساتھ کہی اور منوائی گئی، اس طے شدہ بنیاد کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے پہلی مجلس آئین سازی میں نئے سرے سے قانونی و آئینی تجاویز پر جو موشگافیاں، تک بندیاں اور قیافہ آرائیاں شروع کی گئیں وہ نصف صدی گزر جانے پر بھی جاری ہیں۔ رب العالمین نے جس گردشِ زمانہ کو ہمارے حق میں پلٹایا تھا، ہم پہلے دن سے ہی اپنے حق میں پلٹنے والی گردش کو اپنے خلاف الٹنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ نصف صدی بعد بھی ہمارا پہلا سوال اور بنیادی مسئلہ وہی ہے جو 11 / اگست 1947ء کو زیرِ بحث تھا: ''پاکستان میں طرزِ حکومت کیا اور کیسا ہو؟'' اس تاریخی دن جب مجلس آئین سازی کو صرف اس ایک نکتے پر غور کرنا تھا کہ اللہ کا نام اور رسول کی شریعت کو کس قدر جلد نافذ اور جاری کیا جائے، اس دن اصولِ قانون، آئینی تجاویز اور طرزِ جہانبانی پر ایسے غیر ضروری مباحثے شروع کر دیے گئے، جو خیر سے تاحال جاری ہیں اور اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک ہم عہد شکنی سے توبہ کر کے اپنے قول و قرار کی طرف لوٹ نہیں جاتے۔ ورنہ...... خاکم بدہن...... اب اس کی جو سزا آئے گی وہ شدید اور حتمی ہوگی۔

ہمیں احکم الحاکمین سے باندھے گئے عہد کا کس قدر پاس رہا ہے؟ اس کا اندازہ اس شرمندگی سے لگایا جا سکتا ہے جو ہمیں اپنے ملک کے نام کے بارے میں تھی۔ ہمارے ایک نجات دہندہ اور فخرِ پاکستان صدر نے اقتدار سنبھالتے ہی اسلامک ری پبلک آف پاکستان سے اسلامک نکال کر صرف ری پبلک آف پاکستان کو ہی رائج کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جب ہم اسلامک ری پبلک آف پاکستان سے ری پبلک آف پاکستان بن جانے سے بال بال بچے تو فخرِ ایشیا اور قائدِ عوام نے ریپبلک آف پاکستان کے ساتھ سوشلسٹ کا لاحقہ لگانے کا ارادہ باندھ لیا۔ اپنے ملک کے نام کے ساتھ جو حشر ہم نے کرنا چاہا، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آئین کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہوگا چنانچہ ہماری آئینی تاریخ، بدنیتی اور بدعنوانی کی ایسی سیاہ عبارت اور شرمناک حوالہ ہے کہ جسے ہم خود بھی ماننے اور لکھنے سے کتراتے ہیں اور اس طرف کن انکھیوں سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

نام کے بعد کام کی طرف آیئے! اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلام سے اخلاص کا یہ عالم ہے کہ ہر نئے آئین کی بنیاد محمد علی بوگرہ آئینی فارمولا پر رکھی جاتی رہی ہے اور اس فارمولا کی سدابہار شق جو سب کے لیے یکساں اکسیر کا کام دیتی ہے، وہ یہ ہے: ''ملک میں کوئی بھی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔'' لیکن دورُخی اور بدنیتی کا معیار یہ ہے کہ اسی فارمولا میں یہ بھی موجود ہے: ''25 سال کے لیے مالیاتی امور پر اسلامی قوانین کا اطلاق نہیں ہوگا'' (حالانکہ ہمارے ہاں کسی بھی امور پر اسلامی قوانین کا نفاذ کبھی ہونے ہی نہیں دیا گیا) مالیاتی امور پر اسلامی قوانین کی اس شق سے ایسا تاثر اُبھارا گیا کہ جیسے باقی تو تمام امور اسلام کی زد میں آچکے ہیں مگر مالیاتی امور کو اس سے بچایا جائے۔ یہ سب لفاظی، حروف کی ہیرا پھیری اور نیتوں کا کھوٹ بالآخر رنگ لا کر رہا۔ 1954ء میں مالیاتی امور کو اسلامی قوانین سے بچائے رکھنے کی 25 سالہ مہلت قریب نصف صدی پر پھیل چکی ہے اور ہم آج بھی اسی آئینی منافقت کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اب اگر کوئی کہتا بھی ہے کہ مالیاتی امور شرع کے مطابق کرو تو اس راہ میں ہماری عدلیہ ہی پہلی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ گزشتہ سال اس روح فرسا منظر کا ہم سب نظارہ کر چکے ہیں کہ پاکستان کی ایک عہد ساز عالمانہ شخصیت جس کی اسلامی معاشیات میں مہارت پوری دنیا میں مسلّم ہے، اسے محض اس پاداش میں شریعت اپیلیٹ بنچ کی رکنیت سے معزول کر دیا گیا کہ وہ اس زمانے میں خدا کا نام لیتا اور سود کے خاتمے کی باتیں کرتا تھا۔

پاکستان کے دستور میں قراردادِ مقاصد پہلے ایک دیباچہ کی شکل میں تھی اور اب وہ دفعہ 2۔الف کی حیثیت سے دستور کا حصہ بن چکی ہے۔ پھر ایک موقع پر دفعہ 227 آئی تھی جس کے الفاظ ہیں:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and Sunnah"

یعنی ''پاکستان میں قرآن وسنت کے خلاف نہ کوئی قانون نافذ رہے گا نہ مزید بنے گا۔'' گویا Existing قوانین بھی اگر خلاف شریعت ہیں تو انہیں ختم کیا جائے گا اور مزید قانون سازی بھی قرآن وسنت کے خلاف نہیں کی جائے گی...... لیکن ایک چور دروازہ ایسا کھلا ہوا ہے کہ یہ دونوں آرٹیکل غیر مؤثر (Defunct) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قراردادِ مقاصد کو جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب نے یہ کہہ کر رَد کر دیا: ''یہ بھی باقی دفعات کی طرح دستور کی بس ایک دفعہ ہے، دستور کی باقی دفعات کے اوپر حاکم تو نہیں ہے۔''

ہمیں من حیث القوم اپنی کم علمی بلکہ لاعلمی اور اجتماعی عہد سے مکر جانے کے سبب یہ بات آج تک کبھی سمجھ نہ آسکی کہ اگر قرارداد مقاصد کے تحت پاکستانی آئین کو قانونِ قرآن وسنت کے منافی نہیں بنایا جاسکتا تو پھر موجودہ آئین وقوانین قرآن و سنت کے منافی کیوں ہیں؟ کیا اس بات کو سمجھنے کے لیے سقراط وبقراط سے راہنمائی چاہیے کہ جو ضابطہ عین قرآن وسنت نہیں ہے، وہ یقیناً قرآن وسنت کے منافی ہے۔ قانونی بازی گروں اور آئینی بچہ جمہوروں نے محمد علی بوگرہ فارمولا کے کھلے فریب اور چھپی منافقت کو جس طرح بھی حلال کیا ہو لیکن ہمارے ہر آئین میں ان دونوں شقوں کا بیک وقت استعمال مکروہ، بدنما، نازیبا اور منافقانہ طرزِ عمل ہے کہ ''ملک میں قانون تو قرآن وسنت کے منافی نہیں ہوں گے'' ''لیکن'' مملکت کو بہرحال اسلامی قوانین سے محفوظ رکھا جائے گا خصوصاً، حالانکہ حکم پورے کے پورے داخل ہو جانے کا ہے۔

ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہاں آزادی کی تحریک صرف اور صرف مذہب کی بنیاد پر چلی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے قائدین کے پاس کوئی نعرہ ہی نہ تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ہم سب ایک نظام جسے اسلامی کہا جاتا ہے اور ایک ضابطۂ حیات جو

ہمارے مذہب کے عین مطابق ہے، پر متفق تھے اور اسی کے نفاذ کے وعدہ پر ہی انہونی، ہونی میں بدل گئی تھی لیکن پھر ہماری نیت بدل گئی اور ہم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اب ہم جس عہد واقرار سے بھاگے ہوئے ہیں اس کی سزا مسلسل ہمارے تعاقب میں ہے۔ اگر اس کے وبال سے بچنا ہے تو بالآخر ہمیں وہ عہد واقرار پورا کرنا ہی ہوگا جس کا عہد ہم نے بیسویں صدی کے پہلے نصف میں باندھا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم وعدہ شکنی کی سزا سے بچ جائیں یا وعدہ پورا کرنے کی ذمہ داری سے بھاگے رہیں اور وہ بھی قوی، قہار، جبار اور ذوالجلال سے کیے گئے وعدے سے۔ آج کل تو اگر کسی نائب پٹواری سے بھی 100 روپے دینے کا قول باندھا ہو تو وہ ٹھڈّے مار مار کر دروازہ توڑ دیتا ہے، حتیٰ کہ 100 روپے بھی دیں اور تاخیر پر معذرت بھی کریں۔ عہد شکنی کی سزا سے بھاگتے بھاگتے ہم نڈھال، اور لیر لیر ہو چکے ہیں مگر سمجھ نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ہم سنبھلنے کے بجائے بحیثیت مجموعی دنیا کی منافق ترین قوم بن چکے ہیں۔ تنبیہ، بشارت اور نشانیاں بے اثر ہو چکی ہیں اور قطعی، حتمی اور آخری سزا سے کم پر کام چلتا لگتا نہیں۔ اگر سزا کے بغیر کام چل سکتا اور ہم سنبھلنے والے ہوتے تو سنبھل گئے ہوتے۔ تنبیہ اور سزا کی علامت کے طور پر ہم سے ایک بازو علیحدہ ہوا، ہمارے اوپر قسما قسم کے حکمران بنائے گئے۔ اور اگر ہم نے اب بھی عہد شکنی، خیانت اور منافقت سے توبہ نہ کی اور یہاں اسلام کا عادلانہ نظام قائم نہ کیا تو یقین جانیے! صاحبِ نظر حضرات کا کہنا ہے الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے، پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ چکا ہے۔ اس کی تقسیم کے نقشے بنائے جا چکے ہیں۔ قانونِ تکوینی کی رو سے ہمارا ملک اپنی وجہ جواز کھو چکا ہے کیونکہ یہ دنیا اس اصول پر قائم ہے کہ بے جواز چیز قائم نہیں رہا کرتی۔ ''اور اگر تم منہ موڑو گے تو وہ جگہ دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔'' (سورۂ محمد: 38)

یہ باتیں اپنی قوم کو وہ عہد یاد دلانے کے لیے لکھی گئی ہیں جو اسے یاد نہیں رہا، مگر یاد دہانی ہی ہمارا کام ہے۔ یاد دہانی (تذکیر) نبیوں اور رسولوں کی سنت ہے۔ ہمارے ہاں کی رِیت ہے کہ ایسی باتیں کہنے والے کا ایمان، حب الوطنی اور ملک وملت سے وفاداری بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں دنیا پرستی اور ذاتی مفاد نے ہر انسان کو بے حس بنا دیا ہو، جہاں اندھے راہ دکھانے والوں کا راج ہو، جہاں چونا پھری قبروں کا میلہ لگا ہو، جہاں علماء قتل ہوتے اور غنڈے کھلے پھرتے ہوں، جہاں ''دینداری'' تو بہت ہے مگر ''دین دار'' ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، جہاں مچھر چھانے اور اونٹ نگلے جاتے ہیں، وہاں خاموشی ہی میں عافیت ہے۔ اور ہم اس عافیت سے ضرور لطف اندوز ہوتے، اگر قیامت کے دن نے نہ آنا ہوتا۔ اگر ہمیں اپنے رَبّ کے حضور لوٹ کر نہ جانا ہوتا۔ لہٰذا جو حق سمجھا کہہ دیا اب تو یہی دعا ہے:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اِک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

نثار میں تری گلیوں کے......

یہ 6 ستمبر 1620ء ہے۔ برطانیہ کی پلے متھ نامی بندرگاہ پر معمول سے زیادہ گہما گہمی اور رونق ہے۔ گودی میں 120 ٹن وزنی مئے فلاور نامی جہاز اپنے مسافروں کو ایک ایسے سفر پر لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہے جس کی منزل غیر یقینی، راستہ بے اعتبار اور سفر مصائب سے بھرپور ہے۔ ان مسافروں کا مستقبل مخدوش، ماضی مشکوک اور حال بے حال ہے۔ زادِ راہ ناکافی، جسمانی صحت ناموزوں، حالات ناگفتہ بہ اور دل افسردگی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنے وطن اور مٹی سے فراق کی افسردگی، عزیز واقربا سے جدائی کا دکھ، آنے والے نامعلوم دنوں اور انجانی منزلوں کے خوف سے دل ہراساں اور نظریں سراسیمہ۔ مئے فلاور کے 102 مسافروں میں جہاز کے عملے کے سوا 38 مرد، 23 عورتیں، 15 نوجوان خدمت گار لڑکے اور 26 بچے شامل ہیں۔

ان مسافروں کے سامان میں کاشتکاری کے آلات، لکڑی کے کام کے اوزار، آریاں، آرے، رسیاں، کنڈے اور کانٹے، مچھلی پکڑنے کے جال، جانوروں کی چربی سے بھرے پیپے، کھانے پکانے کے لوہے کے بڑے بڑے برتن، شراب کے مٹکے، اجناس کے بیجوں کی بوریاں، بائبل کے بوسیدہ نسخوں سے لبریز صندوق، اشیائے خورونوش کی پوٹلیاں، عورتوں کے کھلے گھیرے والے لمبے لمبے فراک نما قمیصوں سے پھولے ہوئے تھیلے، دوہری کھال سے بنے ہوئے مردانہ پیش بند، بھیڑ، کتے اور کچھ توڑے دار بندوقیں شامل ہیں۔

روانگی کا منظر خاصا رقت آمیز، سنجیدہ اور کسی حد تک جبر اور لاچارگی سے معمور ہے۔ ماحول اور منظر پر مذہبی رنگ غالب ہے اور رنگ بھی ایسا کہ جس پر رجعت پسندی کی چھاپ صاف نظر آتی ہو۔ بچے سہمے ہوئے اور عورتیں خاموش ہیں۔ کچھ عورتیں مسلسل گریہ وزاری کر رہی ہیں اور کچھ رونے دھونے سے فارغ ہو چکی ہیں۔ جو فارغ ہو چکی ہیں وہ قدرے پُرسکون لگتی ہیں جیسے بعد از گریہ وزاری لذتِ پُرسکونی والی کیفیت طاری ہو۔ مردوں کے احکام کی چیخ و پکار اور مسلسل تکرار سے عاجز، ستائی ہوئی اور ستے ہوئے چہروں والی لڑکیوں نے چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ یہ شدت سے روانگی کی منتظر ہیں کہ جہاز روانہ ہو تو ان کا بوجھ بھی اترے۔

روانگی سے قبل مذہبی رسوم کی ادائیگی شروع ہو چکی ہے اور لیڈن (ہالینڈ) چرچ کے سربراہ و مذہبی راہنما جان رابنسن کا الوداعی پیغام اور ہدایت نامہ پڑھ کر سنا دیا گیا ہے جس سے ماحول میں مزید سنجیدگی اور مسافروں میں خاموشی چھا گئی ہے۔ واضح طور پر نظر آنے والی خستہ حالی اور بے یقینی کے پیشِ نظر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ افراد کی یہ مختصر سی جمعیت اور انتہائی غیر منظم جماعت ایک ایسی قوم اور ملک کی بنیاد رکھنے جا رہی ہے کہ جو محض قریب سوا دو سو برسوں (1776ء تا 2000ء) میں ہی اس کرۂ ارض پر ایسی قوت بن کر ابھرے گی کہ جسے اقوامِ عالم میں نمایاں امتیاز حاصل ہوگا۔ شکستہ، بُرے حال اور بانکے دیہاڑے ان مسافروں میں بظاہر تو ایسا کوئی وصف نظر نہیں آتا تھا کہ ایسی انہونی ان کے ہاتھوں ہو جائے۔ خوبیِ تقدیر، جفاکشی

اور بقائے ذات کی شدید فطری جبلت کے سوا یہ افراد تہی دست و تنگ داماں ہی نظر آتے تھے۔

مئے فلاور جہاز کے 102 مسافروں میں سے 35 افراد ہالینڈ کے شہر لیڈن سے آئے ہیں۔ یہ لوگ مذہبی علیحدگی پسند کہے جاتے ہیں اور 67 مسافر برطانوی باشندے ہیں۔ انہیں بھی مذہبی انتہا پسند خیال کیا جاتا ہے اور یہ ''پیوریٹنز'' کہلائے گئے۔ حقیقتاً یہ سب مسافر وہ معتوب لوگ ہیں جنہیں 1609ء میں چرچ آف انگلینڈ کے خلاف مذہبی تحریک چلانے کے جرم میں برطانیہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور کچھ کے خلاف پکڑ دھکڑ، مقدمات، پھانسیاں اور عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ لیڈن سے آئے ہوئے 35 افراد بھی سرکردہ مذہبی علیحدگی پسند راہنما ہیں جنہوں نے برطانیہ سے جلاوطنی کے بعد ہالینڈ میں ایمسٹرڈیم کے پاس لیڈن میں اپنا علیحدہ چرچ قائم کر لیا تھا جو بعد میں لیڈن چرچ کے نام سے بہت مشہور ہوا۔

انہوں نے اس خیال سے اپنا چرچ تعمیر تو کر لیا کہ وہاں انہیں اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہوگی لیکن برطانوی حکومت اور بادشاہ نے ہالینڈ کے شاہی خاندان پر اپنا دباؤ ڈالے رکھا کہ ان لوگوں کو ہالینڈ سے نکال دیا جائے۔ ویٹی کن سٹی (روم) میں ابھی تک ایسی دستاویز موجود ہیں جن میں ان غریب الوطنوں نے ان مصائب کا ذکر کیا ہے جو برطانیہ اور ہالینڈ کی حکومتوں نے ان پر روا رکھے۔ ہالینڈ میں برطانوی سفیر کی ایک ذمہ داری لیڈن میں مقیم ان بادشاہ مخالف افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور بادشاہ کو مطلع رکھنا بھی تھی۔ 1609ء سے 1620ء تک ان جلاوطنوں نے کڑے مصائب بھرے دن گزارے۔ ناموافق بدلتے ہوئے حالات اور برطانیہ کے ہالینڈ پر بڑھتے ہوئے سیاسی دباؤ کے پیشِ نظر ان مذہبی پناہ گزینوں کا مزید ہالینڈ میں رہنا قریب قریب ناممکن ہو چکا تھا۔ لیڈن چرچ کے سربراہ جان رابنسن نے 1618ء میں ہی یہ طے کر لیا تھا کہ اب ہالینڈ سے رختِ سفر باندھ لیا جائے لیکن جائیں کہاں؟ وطن یعنی برطانیہ واپسی ناممکن، کہیں اور اماں نہیں، کوئی لینے کو تیار نہیں۔ آخر طویل بحث مباحثے اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ نئے دریافت شدہ براعظم میں قسمت آزمائی کی جائے۔

ادھر 1617ء میں برطانیہ کا بادشاہ اور برطانوی حکومت یہ اصولی فیصلہ کر چکے تھے کہ نئے دریافت شدہ براعظم امریکا میں ان لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دی جائے گی جو برطانوی حکومت اور بادشاہ سے متصادم رہتے ہیں، ناقابلِ اصلاح ہیں، علیحدگی پسند، شورش آمادہ اور سازش فطرت ہیں۔ طویل مذاکرات کے بعد جلاوطنوں کے ہم خیال سرکردہ برطانوی خاندانوں نے بالآخر لیڈن کے جلاوطنوں کو بادشاہ سے نئے براعظم میں آبادکاری کا پروانہ لے دیا۔ برطانوی حکومت کے نکتۂ نظر سے تو یہ لوگ امریکا میں برطانوی آبادکاروں کی شرائط پر پورا اترتے ہیں لیکن حقیقتاً یہ لوگ انتہائی تعلیم یافتہ، رجعت پسند اور اپنے عقائد میں راسخ ہیں۔ برطانوی آبادکاروں کی یہ مختصر سی جماعت جو آج آمادۂ سفر ہے حقیقتاً آج کے امریکا کی معمارِ اول ہے۔ جدِ امجد ہے اور مائی باپ ہے۔ آبادکاری کی اجازت کا شاہی پروانہ جب اس جماعت کے حوالے کیا گیا جو اب زائرین کہلائے جاتے ہیں تو کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کاغذ کا یہ ایک ٹکڑا براعظم امریکا پر برطانوی استعمار کی راہ ہموار کر دے گا، مستقبل میں یہ اجازت نامہ کیسے کیسے رنگ بدلے گا اور کیسی خوش حال اور طاقتور قوم کو جنم دے گا؟

6 ستمبر 1620ء کو برطانیہ سے روانہ ہونے والا مئے فلاور نامی جہاز برطانوی مذہبی انتہا پسند جلاوطنوں کو لے کر 11 نومبر 1620ء کو اسی نو دریافت دنیا یعنی امریکا کے ساحل پر آن لگا۔ 65 دنوں کے پُر مصائب سفر کے بعد جب مئے فلاور امریکی

ساحل کیپ کوڈ پر لنگر انداز ہوا تو ایک نئے مسئلہ نے سر اٹھالیا۔ کیپ کوڈ کا ساحلی علاقہ موسم کی شدت اور اپنی جغرافیائی ساخت کی وجہ سے آبادکاری کے لیے موزوں نہیں تھا۔ مئے فلاور کے قریب آدھے مسافروں کی رائے تھی کہ قرب و جوار میں کسی دوسرے ساحل کو تلاش کیا جائے جو آبادکاری کے لیے موزوں ہو جبکہ آدھے مسافر فوری طور پر جہاز سے اتر جانے کے حق میں تھے۔ جہاز سے اتر جانے اور نہ اترنے کے بارے میں مشترکہ موقف کے نہ ہونے سے تنازعہ شدت اختیار کر گیا تو راہنمائی کے لیے لیڈن چرچ کے سربراہ جان رابنسن کے اسی خط کو دوبارہ پڑھا گیا جو برطانیہ سے چلتے ہوئے پڑھا گیا تھا۔ اس خط میں جان رابنسن نے نصیحت کی تھی: ''آخرکار تمہیں ایک سیاسی ڈھانچہ تشکیل دینا ہوگا اور تمہیں اپنے ہی لوگوں پر مشتمل شہری حکومت بنانا ہوگی جو ایسے لوگوں کی تشکیل کردہ نہیں ہونی چاہیے کہ جن کی دوسروں کے مقابلہ میں خصوصی اہمیت ہو۔ اپنے نمایندوں کو منتخب کرنے میں نہ صرف اپنی عقلمندی اور اچھائی کو اجاگر ہونے کا موقع دینا بلکہ اجتماعی مفاد کو فروغ دینے کی کوشش کرنا اور جن کو منتخب کرلو، ان کی عزت اور ان کے قانونی اختیارات کا احترام کرتے رہنا۔'' جان رابنسن کے پیغام کے مندرجات پڑھے جانے سے تنے ہوئے اعصاب اور مشتعل جذبات پر مفاہمت غالب آگئی۔ سب کا اتفاق ہوا اور دستخط کیے گئے۔ سرِ ساحل جہاز میں ہی ایک سول باڈی پالیٹک قائم ہوگئی۔ ''جان کارور'' کو گورنر منتخب کر کے فیصلہ اور قیادت کے اختیارات اسے تفویض کر دیے گئے۔ گورنر جان کارور کے فیصلہ کے مطابق کسی دوسرے موزوں مقام کی تلاش میں مئے فلاور ساحل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوا اور بالآخر خلیج پلےمتھ کے ساحل پر مناسب اور موزوں جگہ تلاش کر لی گئی۔ 11 دسمبر 1620ء کو مئے فلاور کا غیر یقینی سفر اختتام کو پہنچا اور گورنر جان کارور کے حکم پر اولین امریکی آبادکاری عمل میں آئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مئے فلاور پیکٹ کو قرارداد مقاصد کی دستاویز سمجھا جانے لگا اور اس پیکٹ کو اولین امریکی آئین کے مترادف قرار دیا جانے لگا۔ اس پیکٹ کو مرتب کرنے والے برطانوی جلاوطنوں پر برطانوی جمہوریت اور انسانی حقوق کی مشہور برطانوی دستاویز ''میگنا کارٹا'' کا گہرا اثر تھا۔ 1215ء میں برطانیہ کے کنگ جان کے شاہی مہر اور دستخطوں سے جاری ہونے والے میگنا کارٹا میں تعین کردہ انسانی و جمہوری حقوق کے امین، ان برطانوی نو آبادکاروں نے میگنا کارٹا اور برطانوی جمہوریت سے اخذ کردہ جس جمہوری عمل کے روح مئے فلاور پیکٹ میں سمودی تھی، وہ خوب پروان چڑھی۔ 1787ء میں امریکی آئین کے بننے تک مئے فلاور پیکٹ کی جمہوری پنیری ایک تناور درخت میں بدل چکی تھی۔

آج کرۂ ارض پر امریکا ایسا ملک ہے کہ جس کی اصل آبادی ناپید ہے اور باہر سے آنے والے آبادکار امریکی زمین پر قدم رکھنے سے پہلے ہی ایک معقول ضابطہ، تہذیبی رویہ اور انسانی میثاق پر متفق ہو چکے تھے لیکن اس کے برعکس جب ہم اس افتاد کا تجزیہ کرتے ہیں جو آئین، قانون، انسانی حقوق اور جمہوریت کے حوالہ سے قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمارے اوپر مسلط چلی آتی ہے تو ہم آزردہ ہو جاتے ہیں۔ اس افتاد نے ہمارا پنڈا جھلسا دیا ہے۔ یہی افتاد مملکت خداداد کو دولخت، نظریہ پاکستان کو دونیم اور ہمارے قومی تشخص کو لخت لخت کر چکی ہے۔ ایک نظام جسے اسلامی کہا جاتا ہے اور ایک ضابطۂ حیات جو ہمارے مذہب کے عین مطابق ہے، قیامِ پاکستان کی تحریک کے دوران اس پر متفق تو ہم بھی تھے اور اسی کے نفاذ کے وعدہ پر انہونی ہونی میں بدل گئی تھی اور لیکن پھر ہماری نیت بدل گئی اور ہم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اب ہم اسی نیت کی خرابی اور بدعہدی کی سزا کاٹتے ہیں۔

زمانے کی گردش اب ہمارے خلاف ہوگئی ہے۔ اہلِ عبرت اور حق آگاہ جانتے ہیں کہ گردش پلٹنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی کہ ''کن فیکون'' کہنے میں۔ معتوب وسوختہ برطانوی جلاوطنوں کے حق میں یوں گردش پلٹی کہ سب دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں مگر ہمیں بہ نظرِ دگر دیکھا جاتا ہے۔ ہم نہ تو کسی ایک طرف ہیں اور نہ ہی کسی ایک کی طرف۔ بدعہدی کی سزا کبھی ہمارے خلاف گردش بن کر پلٹتی ہے، کبھی راستہ روکتی ہے اور کبھی راستوں کو مصائب بھرا اور منزل آزار بنا دیتی ہے مگر ہم سمجھتے اور سنبھلتے ہی نہیں ہیں۔

اللہ کے نام، نظام کے وعدہ پر حاصل کیے جانے والے خطۂ زمین میں ہم اپنی بداعمالیوں سے زیادہ بدعہدی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ اپنے بندوں کی بداعمالیوں پر تو اللہ تعالیٰ نظرِ کرم کرتے رہتے ہیں مگر بدعہدی پر گرفت ہو کر رہتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشادِ ربانی ہے: ''واوفوا بعهدی اوف بعهدكم و اياى فارهبون.'' (سورہ البقرہ)۔ ترجمہ: ''اور پورا کرو اس عہد واقرار کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں اس عہد واقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

ہم جس عہد واقرار سے بھاگے ہوئے ہیں اس کی سزا مسلسل ہمارے تعاقب میں ہے۔ بالآخر ہمیں وہ عہد واقرار پورا کرنا ہوگا جس کا عہد ہم نے بیسویں صدی کے پہلے نصف میں باندھا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم وعدہ شکنی کی سزا سے بچ جائیں یا وعدہ پورا کرنے کی ذمہ داری سے بھاگے رہیں اور وہ بھی قوی، قہار، جبار اور ذوالجلال سے کیے گئے وعدہ پر۔ آج کل تو اگر کسی نائب پٹواری سے بھی سو روپے دینے کا قول باندھا ہو تو وہ ٹھڈے مار مار کر دروازہ توڑ دیتا ہے حتیٰ کہ سو روپے بھی دیں اور تاخیر پر معذرت بھی کریں۔

ہماری سختی، ہزیمت، رسوائی اور جگ ہنسائی کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود بھی ہماری زمین پر اللہ کے نام، نظام کے بجائے امریکا اور یورپ کی خوشنودی مروج ہے بلکہ اس میں بدعہدی اور قول سے پھر جانے کی سزا بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا برتاوا نافرمانوں کے مقابلہ میں بدعہدوں سے کہیں زیادہ سخت لگتا ہے۔ نافرمانوں کے لیے تو درازرسی کی سہولت اور مہلت میسر ہے مگر وعدہ کر کے پھر جانے والوں کے لیے یہی درازرسی کبھی پھندے میں بدل جاتی ہے، کبھی طوق میں، کبھی اس میں گرہ پڑتی ہے اور کبھی کڑکی لگ جاتی ہے۔ جس عہد کو پورا کرنے کی پرسش کڑی اور شدید ہوگی اس کو پورا کر لینا ہی بہتر ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارا گروہ معین میعاد اور مہلت کی زد میں آ جائے، ہماری زمین میں اللہ کا نظام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سماجی عدل نافذ کر دینے سے ہی ہماری سختی کا بار ٹل سکتا ہے۔ ہمارا وعدہ بھی یہی تھا اور عہد بھی یہی باندھا گیا تھا۔ ہماری بقا، سرفرازی اور تحفظ اسی بنیاد میں پوشیدہ ہے۔

ہمارے مقتدر طبقے مانیں یا نہ مانیں، کانوں میں روئی لگائے رکھیں یا نکال لیں لیکن ندائے غیب آ رہی ہے:

''عذاب وہاں سے آتا ہے جہاں سے تم اس کی توقع بھی نہیں کرتے۔''

لیکن اگر ہم آج بھی...... اگرچہ دیر بہت ہو چکی ہے...... اپنا قبلہ درست کریں، عہد کو پورا کرنے کا عزم کریں تو قیاس اغلب اور امید قوی ہے کہ خیر ورحمت، نصرت، فتح مندی اور غلبہ بھی کسی ایسی طرف سے آ سکتا ہے کہ جس طرف سے توقع ہی نہیں ہے۔ حیران کر دینے کی صفت اور متحیر کر دینے کے وصف والا رب جب بھی چاہے شوریدہ سر لہروں کے درمیان راستہ بنا دے۔

کبھی پانی شق ہو کبھی قمر، ہوائیں حق میں ہو جائیں اور کبھی ابابیلیں لشکر کا رخ پھیر دیں۔ ہمارے حق میں خیر و رحمت اور غلبہ و نصرت کی نہ کوئی سمت معین ہے نہ حد مقرر۔ خواہ ابابیلیں آئیں کہ لہریں شق ہوں، آگ میں پھول کھلیں، نار گلزار بنے، پانی چڑھے کہ اترے...... ظلم مٹ کر ہی رہے گا۔ جس وطن کی گلیوں کے لیے خدا رسیدہ بزرگوں نے قربانی دی ہے وہ ان شاء اللہ ایک دن عروج پا کر رہے گا۔

باطل کے اجزائے ترکیبی اور پرچہ استعمال ''خطِ تنسیخ'' میں لکھا ہے۔ یہ حق سے ستیزہ کار تو رہ سکتا ہے، اسے ختم نہیں کر سکتا۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، پہلے بھی پورا ہوتا آیا ہے آج بھی پورا ہوگا، چاہے اس کی زد میں امریکن تھنک ٹینکس کے قیافے آئیں یا سی آئی اے کے تجزیے یا یورپی حکومتوں کی اسلام اور پاکستان کے خلاف بدخواہیاں۔ باطل کو مٹنا ہی ہوتا ہے کہ بالآخر مشیت ایزدی یہی ہے اور یوں ہو کر ہی رہے گا۔ ان شاء اللہ! بس بات اتنی ہے کہ اسے مٹانے کے لیے استعمال کون ہوگا؟ اے میری قوم! تو حق کی امین ہے، منتخب گروہ ہے، جان لے کہ اللہ تجھ پر کرم چاہتا ہے، ہرگز ایسا کام نہ کر کہ وہ تیری جگہ کسی اور کو منتخب کر لے۔

(نوٹ: زیر نظر اور اس سے ماقبل مضمون کی تیاری میں میرے کرم فرما دوست ڈاکٹر حق حقی کی کتاب ''سورۂ بنی اسرائیل گواہی دے'' سے ان کی اجازت سے مواد لیا گیا ہے۔)

یومِ آزادی سے یومِ غضب تک

☆ شاہ صاحب! 14 اگست ہے، یومِ آزادی پر کچھ لکھیں۔

o...... یار! ہم لوگوں کی یہ عادت اچھی نہیں۔

☆ کون سی عادت!؟

o...... سارا سال پاکستان کو لوٹتے کھسوٹتے ہیں۔ حب الوطنی کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔ پھر ایک دن علامتی جوش وخروش دکھا کر ایک سال تک کے لیے فارغ ہوجاتے ہیں۔ یومِ آزادی کے اگلے دن پرچم کی سرسبزی وشادابی کی فکر رہتی ہے نہ اس کے ستارہ وہلال کی معنویت کے تحفظ کی۔

☆ ایک تو آپ کا فلسفہ اتنا گاڑھا ہوتا ہے کہ سمجھنے کی کوشش میں پورا دماغ لتھڑ جاتا ہے۔

o...... یہ فلسفہ نہیں، ایمان اور عقیدے کی بات ہے۔

☆ وہ کیسے؟

o...... پاکستان دنیا بھر میں اسلام کا مینارہ ہے۔ مسلمانوں کا سہارا ہے۔ مظلوم مسلمانوں کی اُمید اور ان کے خوابوں اور ارمانوں کا محور ہے۔ یہ جب تک قائم ہے اس پر طلوع ہونے والا ہر نیا سورج صرف اہلِ پاکستان کے لیے نہیں، دنیا بھر کے حسرت زدہ مسلمانوں کے لیے آزادی کی کرن اور زندگی کا پیغام ہے۔

☆ تو یومِ آزادی پر کچھ لکھیں نا۔

o...... ہم سارا سال جو کچھ لکھتے ہیں، اس کی آزادی، وقار کے تحفظ اور تعمیر وترقی کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ ایک دن جھنڈا لہرانے اور پھر سارا سال اس کی جڑیں کھودنے والی عادت ہمارا دھڑن تختہ کر چھوڑے گی۔

☆ پچھلے یومِ آزادی پر آپ کا مضمون ''پاکستان سے پاکستان تک'' خاصے کا تھا۔

o...... ارادہ تو اس دن بھی فلسطین کے یومِ آزادی یا اسرائیل کے یومِ غضب پر لکھنے کا تھا۔

☆ کیوں؟ آخر اپنے وطن پر دوسروں کو ترجیح کیوں؟

o...... دیکھیے صاحب! اس روئے زمین پر پاکستان یا اسرائیل میں سے ایک کو رہنا ہے۔ اگر آپ اس بات کو نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں، صہیونی راہنما تو اس کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔ پاکستان کو بچانا ہے تو اس کے دشمنوں پر نظر رکھیے۔ اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا دشمن بھارت نہیں اسرائیل ہے۔

☆ بھارت کو آپ کیوں ہلکا سمجھتے ہیں؟

o...... شکست خوردہ لوگوں کی باتیں نہ کیا کریں۔ بھارتی عوام خود بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستانیوں سے متھا لگانا ان کے بس کا نہیں۔

دنیا کا کوئی میدان ایسا نہیں جس میں اس نے ہم سے منہ کی نہ کھائی ہو۔ اسرائیل سے ہماری دشمنی ازلی ہے اور ابد تک رہے گی۔ یہ اس دن شروع ہوگئی تھی جب مدینہ کے یہودیوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا تھا اور اس دن تک رہے گی جب اس کائنات کا سب سے بڑا فتنہ دجال اکبر، سچے مسیح موعود سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں اور اس کی فوج، مجاہدِ اعظم حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ہلاک ہوگی۔

☆ یہ معرکہ تو ہماری سرزمین سے بہت دور ہوگا، ہمیں اس سے کیا واسطہ؟

o...... وہ سرزمین تو ہم سے بہت دور ہے لیکن اس معرکے والے دنوں میں ہم اس کے بہت قریب ہوں گے۔

☆ ایسی مبہم باتیں نہ کیا کریں۔

o...... نہیں نہیں! خدائے واحد کی قسم! ہم میں سے جو بھی تقویٰ اور جہاد پر ثابت قدم رہا وہ (یا اس کی نسل کے پاکیزہ لوگ) اس دن وہاں بہت قریب ہوں گے۔

☆ بہت قریب۔

o...... ہاں بہت قریب!

☆ یا خدا! یہ کیا راز ہے؟

o...... یہ راز تو ہے لیکن ایسا معما بھی نہیں کہ حل نہ ہو۔ آپ مطالعہ کیا کریں اور مشاہدہ بھی۔

☆ وہ تو کرتے ہیں۔

o...... نہیں ویسے نہیں! وہ تو اوورلوڈ انفارمیشن ہوتی ہے۔

☆ تو پھر کیا دیکھا کریں؟

o...... مثلاً: آپ بنتِ جبیل کا مطالعہ کریں۔

☆ بنتِ جبیل کا مطالعہ؟؟؟

o...... جی ہاں! اس مشہور لبنانی شہر کا، جہاں زیتون کے جنگل اور انجیر کے باغ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ آیئے! میں آپ کو اس طرح کی چیزوں کے مطالعے کا طریقہ بتاتا ہوں۔ ویسے ضرورت اس وقت حزب اللہ کے طریق کار کے مطالعہ کی ہے لیکن ہم فی الحال بنتِ جبیل چلتے ہیں جہاں زیتون کی شاخوں سے ٹکرا کر سرگوشیاں کرتی ہوا ہم سے کچھ کہہ رہی ہے۔

☆......☆......☆

''بنتِ جبیل'' لبنان کے مشہور شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے ڈھکے اس شہر کے آغوش میں ''صلحا'' نامی دیہات خوبصورتی اور دلفریبی میں اپنی مثال آپ ہے۔ قدرتی مناظر سے بھرپور یہ پُر فضا مقام اب تک کیسی قیامتیں دیکھ چکا ہے، جب تک دنیا اس کی ایک جھلک نہ دیکھے اسے اندازہ نہ ہوگا کہ فوج کے ہوتے ہوئے حزب اللہ جیسی تنظیمیں کیوں وجود میں آتی ہیں اور جب چھ چھ عرب حکومتیں مل کر بھی اسرائیل کا مقابلہ نہ کرسکیں تو بے وسیلہ اور بے سہارا کارکن کس طرح بدمست دیو کو نکیل ڈال لیتے ہیں؟ دنیا بھر کے دانش وروں کو اس امر کا جائزہ لینا چاہیے اور پھر حد سے نکلتے یہودیوں کو باور کرانے کی کوشش

کرنی چاہیے کہ انہیں کھال سے باہر نکلنے کا شوق مہنگا پڑ سکتا ہے۔

بات بنتِ جبیل کی ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ اپنے قدرتی مناظر اور فطری خوبصورتی کے سبب جتنا مشہور ہے، اسرائیلی فوج کی درندگی کی بنا پر اتنا ہی مصیبت زدہ اور الم انگیز داستانوں کا موضوع ہے۔ یہ داستانیں اس غضب، قہر اور انتقام کو جنم دے رہی ہیں جو ایک دن پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

یہ وہی بستی ہے جہاں 1948ء کی ایک دلگداز صبح کو اسرائیلی وردیوں میں ملبوس لوگوں نے یہاں کے رہنے والوں کو صلحا کی جامع مسجد میں جمع ہونے کا کہا۔ لوگ بھاگم بھاگ مسجد کو چلنا شروع ہوئے اور لمحہ بھر میں مسجد سانس لیتے لوگوں سے بھری تھی۔ وردی والوں نے انہیں کھڑے ہونے اور دیوار کی طرف رُخ کرنے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنے کی آواز آنے لگی اور پلک جھپکتے ہی مسجد کی خوبصورت اور وسیع صحن خونی تالاب کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اسرائیل بننے کے بعد لبنان کی سرزمین پر اسرائیلیوں کی یہ پہلی دراندازی تھی اور اس کے بعد ظلم وستم کی داستان رکنے نہ پائی۔

اگلے سال 1949ء کو لبنان کے شہر ''خولہ'' نے بھی ایسی ہی خون آشام صبح کا نظارہ کیا۔ جب اسرائیلی فوج نے لوگوں کو ایک مکان میں جمع کر کے اسے بلڈوز کیا اور یوں لمحہ بھر میں 90 قیمتی جانیں نوچ کر اسرائیل کے خونخوار فوجی ''خولہ'' سے واپس جا رہے تھے۔ 1967ء کو اسی خولہ نے پھر ایک خونیں دوپہر کا مشاہدہ کیا اور ''ہدنہ'' معاہدے کے پرخچے شہر خولہ کی فضا میں اُڑ اُڑ کر اقوامِ متحدہ کے پطرس غالی کے منہ پر بدنام نشان بن کر پڑ رہے تھے۔

اسی سال شہر ''حاتین'' کے قصبے ''حرام'' کو 3 ماہ محصور رکھنے کے بعد غاصب اسرائیلی فوجیوں نے پوری آبادی کو مسمار کر کے اس پر بلڈوزر دوڑائے اور سوائے ایک غیر آباد کمرے کے کوئی سایہ دیوار بھی ان کے تشدد سے نہ بچی۔ لوگوں کو کلہاڑیوں اور برچھیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مٹی تلے دبا کر اسرائیلی فوج کے پاگل دیو کو کچھ آرام آیا۔

خونخوار اسرائیلی فوجی لبنان کے مکینوں کا خون چاٹتا اور کھوپڑیاں چباتا رہا کہ 1982ء کا سال طلوع ہوا اور دنیا نے ''صابرہ'' اور ''شتیلہ'' کیمپوں میں اسرائیلی مظالم کو سنا، دیکھا اور اخبارات میں پڑھا کہ جب 800 زندہ اور سانس لیتے افراد کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا تھا۔ یہ معاصر تاریخ کا دردناک ترین واقعہ ہے اور اسرائیلی فوجیوں نے یہ سنگین ظلم کسی اور کی نہیں، گینڈا صفت ایریل شیرون کی قیادت میں انجام دیا تھا جسے بعد میں اس سنگ دل قوم نے اپنا وزیراعظم بنایا۔

18 اکتوبر 1996ء کو شہر ''قانا'' کا محاصرہ کر کے دیوانہ وار بمباری ہوتی رہی۔ جب ''قانا'' کی فضاؤں سے گرد دھواں چھٹ گیا تو 105 افراد بارود کی آگ میں بھسم ہو چکے تھے...... لیکن پھر بھی اسرائیلی مظالم کی داستان کا بیشتر حصہ پردہ خفا میں ہے...... صحافی خاموش اور تجزیہ نگار مہر بہ لب ہیں۔

30 جولائی 2006ء کی وہ تاریک صبح اب تک چیخ رہی ہے اور ''قانا'' کی پہاڑیاں ایک بار پھر اپنا سر ٹکرا رہی ہیں کہ میری آنکھوں کے سامنے 35 معصوم بچوں کی جانیں بدبخت اسرائیل فوجی نے کیوں نوچ لیں؟ یہ پہاڑیاں خوبصورت سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں لیکن دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ سبزہ آتش فشاں لاوے کی طرح دہک رہا ہے۔

☆......☆......☆

قارئین کرام! کچھ چیزیں دور ہوتے ہوئے بھی قریب ہوتی ہیں اور بظاہر کوئی باہمی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ان میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ پاکستان کی آزادی اسرائیل کی بربادی سے گتھی ہوئی ہے اور اسرائیل کی بربادی پر دنیا کا امن وامان موقوف ہے۔ کسی کو اس میں مبالغہ نظر آتا ہے تو نیٹ پر وہ نقشہ دیکھ لے جس میں صہیونی منصوبہ سازوں نے جہاں سعودی عرب کے ٹکڑے کیے ہیں، وہیں خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے حصے بخرے کر کے دل ٹھنڈا کیا گیا ہے۔ جسے سمجھنا ہے وہ سمجھ لے اور جسے نہیں سمجھنا وہ بھی سن لے پاکستان کی آزادی کا تحفظ القدس کی آزادی سے ویسے ہی مربوط ہے جیسے کہ یہود وہنود کا آپس میں گٹھ جوڑ ہے۔ ہم جیے تو خود دیکھ لیں گے، رخصت ہوئے تو آنے والی نسلیں وہ کچھ دیکھیں گی جو ہو کر رہنا ہے۔

جڑ پہ کلہاڑا

کچھ غلطیوں کا کفارہ نسل درنسل ادا کیا جاتا ہے مگر پھر بھی ادا نہیں ہوتا۔ یہ وہ غلطیاں ہوتی ہیں جن کی مرتکب کوئی قوم یا گروہ ہوتا ہے۔ قدرت افراد کی غلط فہمیوں سے تو چشم پوشی کر لیتی ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے، دارالجزا نہیں...... لیکن قوم کی غلطیوں کی سزا ''عذاب ادنیٰ'' (بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب) کی شکل میں اس دنیا میں ہی دے دیتی ہے تا کہ تنبیہ ہوسکے اور توبہ ورجوع کی کیفیت پیدا ہو اور پھر جب یہ تنبیہات کام نہیں دیتیں تو ''عذاب اکبر'' (چھوٹی چھوٹی تنبیہات کے بعد ہمہ گیر اور بڑا عذاب) دھاڑتا، چنگھاڑتا ہوا مسلط ہو جاتا ہے۔

ہماری تباہ کن اور ہولناک غلطیوں کی ابتدا پاکستان بننے سے تین دن پہلے 11 اگست کو ہوگئی تھی جب پاکستان کی پہلی آئین ساز مجلس کے معزز و معتبر شرکا اس بات پر سر جوڑے بیٹھے تھے کہ ''نوزائیدہ مملکت خداداد میں طرزِ حکومت اور نظام ملکی کیا ہو؟'' ذرا سوچیے! جس ریاست کا نام اسلام کے نام لیے بغیر نہ لیا جاسکتا تھا، جس کا وجود صرف اور صرف اسلام کے نام پر تحریک چلائے جانے کا مرہون منت تھا، جس کے لیے 1905 سے 1945ء تک نصف صدی کے عرصے میں بار بار اسلام کا واسطہ دے کر دُعائیں مانگی گئیں اور باصرار، بوضاحت اور بانداز مختلف یہ طے کیا گیا کہ اس خطہ زمین کا حصول صرف اور صرف اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے اور اسلامی طرزِ حیات اور شرعی نظام حکومت کا نمونہ بنانے کے لیے کیا جارہا ہے، وہاں یہ بحث مباحثہ بالکل لاحاصل اور یہ دانش وری بالکل بے معنی تھی کہ پاکستان میں نظامِ مملکت کیا ہو؟ یہ بات نصف صدی میں پوری وضاحت وصراحت اور پورے سیاق وسباق کے ساتھ کہی، سنائی اور منوائی جاچکی تھی کہ یہ خطہ زمین لا الہ الا اللہ کی نظریاتی اساس پر حاصل کیا جارہا ہے مگر جیسے ہی قیام ریاست کا امکان پیدا ہوا ہم پہلی بیٹھک میں ہی نسل درنسل کیے گئے اس عہد کو فراموش کر کے اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہوگئے کہ پاکستان میں طرزِ حکومت کیا اور کیسا ہو؟ یہ انتہائی خوفناک اور تباہ کن غلطی تھی چنانچہ ہماری اس عہد شکنی، بدنیتی اور منافقت وغداری کا وبال تھا کہ پو پھٹتے ہی اندھیرا چھا گیا اور سورج چڑھنے سے پہلے ہی اسے گرہن لگ گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی 14 اگست کی صبح آئی بھی نہیں تھی کہ ہماری بدنصیبی اور مکافات عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس دن مجلس آئین ساز نے صرف اور صرف ایک نقطے (میں دُہراتا ہوں: نکتے نہیں نقطے پر) پر غور کرنا تھا کہ اللہ کا نظام اور رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت کس قدر جلدی اور کتنی شفاف طور پر بلا تاخیر اور بلا حیل وحجت نافذ کردی جائے، مگر ایک طے شدہ بنیاد کو ڈھا کر اور اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد ومیثاق کو جھٹلا کر اُصول وقانون اور آئینی تجاویز کے نام پر ایسے غیر ضروری مباحثے اور ایسی قانونی موشگافیاں اور قیاس آرائیاں شروع کردی گئیں جو خیر سے آج تک جاری ہیں اور اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک ہم پر کلمۂ حق پورا نہ ہو جائے۔ آپ پر یہ لفظ گراں گزرے گا مگر اب تکلفات بجالانے اور لگی لپٹی بات کہنے کا وقت ختم ہوگیا ہے۔

اس المناک قصے کی ابتدا 11 اگست 1947ء کو ہوئی تھی۔ اس دن پاکستان کی مجلس آئین ساز کا پہلا اجلاس تھا۔ نصف صدی کی جہد مسلسل کے بعد یہ دن دیکھنے کو ملا تھا کہ اسلامیانِ برصغیر عہد جدید کی پہلی نظریاتی ریاست قائم کرنے جارہے تھے۔ اللہ رب العالمین نے تقریباً دو سو سال بعد زمانے کی گردش کو ہمارے حق میں پلٹا دیا تھا۔ پاکستان کا وجود جو محض ایک خواب اور تصور تھا، حقیقت بننے جارہا تھا۔ ہم نے اللہ رب العزت سے جو عہد و پیمان کیے تھے، باری تعالیٰ نے اس کے صدقے ہمیں ترقی کے بے بہا امکانات سے بھرپور ملک عطا کر دیا تھا اور اب فرشتوں سے لے کر نظام تکوینی چلانے پر مامور اللہ کے نیک بندوں تک کی نظریں ہم پر تھیں کہ ہم اس عہد کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح پورا کرتے ہیں یا بنی اسرائیل کی طرح عہد شکنی کے مرتکب ہو کر دنیا میں ہی اس کی سزا پاتے ہیں؟ یہ 24 رمضان 1366ھ اور 11 اگست 1947ء کی تاریخ تھی مگر ہم نے پہلی اینٹ ہی ایسی غلط رکھی اور زمانے کی گردش جو ہمارے حق میں پلٹ گئی تھی اسے اپنے خلاف پلٹانے میں ایسے مصروف ہوئے کہ آج تک اس بدعہدی کی سزا کاٹ رہے ہیں لیکن ہماری سیاہ بختی، نامرادی اور سزا کا زور ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں۔

اس افسوس ناک آغاز کا المناک اختتام 3 دسمبر 2006ء کو اس وقت ہو گیا جب عزت مآب عالی جناب صدر پاکستان نے بقائمی ہوش و حواس بلا جبر و اکراہ پوری دلجمعی اور مکمل رضامندی سے اس بل پر دستخط کر دیے جو اللہ و رسول سے صریح بغاوت، قرآنی احکام کے خلاف کھلی جنگ اور اس تاریخی عہد و میثاق سے یکسر پھر جانے کے مترادف ہے جو ہم نے قیامِ پاکستان سے قبل پچاس سال تک رو رو کر اللہ رب العزت سے باندھا تھا...... لیکن ابھی ذرا ٹھہریے...... ہم زنجیر کی کڑیاں ملاتے چلیں تاکہ ''عذاب اکبر'' سہتے وقت ہمیں اپنی ''فردِ جرم'' غیر مربوط اور نامکمل ہونے کا احساس نہ ہو۔

پہلی مجلس آئین ساز کا حشر گورنر جنرل ملک غلام محمد کے ہاتھوں 24 اکتوبر 1954ء کو ہوا۔ یہ صاحب بذاتِ خود ہماری تاریخ کے معتوب ترین افراد میں سے ہیں اور ہماری قومی بدبختی پر ان کے اعمال کی نحوست کی چھاپ کافی گہری ہے۔ انہوں نے اس پہلی مجلس آئین ساز کو ٹھیک سات سال بعد برطرف کر کے ٹھکانے لگا دیا۔ ان سات سالوں میں ہمیں یہ اعزاز حاصل رہا کہ وطنِ عزیز، ملک خداداد، عصر جدید کی اولین اسلامی ریاست کا نظام حکومت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء میں ترمیم و اضافہ کر کے آزادیٔ ہند ایکٹ 1947ء کے تحت چلایا جاتا رہا۔ اس طرح دشمنانِ خدا اور سول کا مرتب کردہ دستور ہمارے ابتدائی سات سالوں تک ہم پر سایہ فگن رہا اور اسلامیانِ پاکستان کو نشانِ منزل کی تلاش کے دوران مشعل راہ کا کام دیتا رہا۔

1956ء ہی کو سرزمین پاکستان کو پہلا آئین نصیب ہوا لیکن...... جس آئین کو بنانے میں 9 سال لگے، اسے توڑنے میں ہم نے صرف ڈھائی سال لگائے اور 8 اکتوبر 1958ء کو صدر اسکندر مرزا نے پارلیمانی نظام کا خاتمہ، آئین کی تنسیخ اور مارشل لا کا نفاذ کر کے ہمیں ایک اور مجلس آئین ساز کے سامنے سوکھنے کے لیے ڈال دیا۔ 1973ء میں قراردادِ مقاصد، آئین پاکستان کا جز ٹھہری اور قرآن و سنت کو بالاتر اتھارٹی تسلیم کرتے ہوئے یہ بات طے ہوئی کہ پاکستان میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا مگر ہماری نیتوں کے کھوٹ نے یہاں بھی رنگ لایا اور قانونی بازی گروں اور آئینی بچہ جمہوروں نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ آج تک کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ کے دے رہی کہ اگر پاکستانی آئین و قانون کو قرآن و سنت کے منافی نہیں بنایا جا سکتا تو پھر موجودہ آئین و قوانین قرآن و سنت کے منافی کیوں ہیں؟ کیا یہ بات بالکل سامنے کی اور سیدھی سی نہیں کہ جو ضابطہ عین

قرآن وسنت نہیں ہے وہ یقیناً اور صریحاً قرآن وسنت کے سراسر منافی ہے۔

یہ کیسا کھلا فریب اور چھپی منافقت ہے کہ آئین کے مطابق تو ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں ہوگا لیکن مملکت کے ہر قانون کو بہر حال اسلامی قوانین سے دور اور محروم رکھا جائے گا؟؟؟ کیا اس مکروہ اور بھونڈی منافقت کے بعد بھی ہم قانون الٰہی اور عذاب تکوینی کی گرفت میں آنے سے بچ سکتے ہیں؟ اس سے قبل تو شاید ایسا ممکن ہو مگر اب ایسا ہوتا نظر نہیں آتا، اس کی وجہ بھی سمجھ لیجیے۔

اس سے قبل ہمارا طریقۂ واردات ذرا مختلف تھا۔ ہم ذرا ڈھکے چھپے اور شرمے شرمائے انداز میں گلشن کا کاروبار نفاق کی بنیاد پر چلاتے تھے۔ وہ اس طرح کہ ''قرآن وسنت کے منافی آئین سازی نہیں ہوسکتی'' اس جملے کو ہم نے دستور میں لکھ تو لیا تھا لیکن اس پیش بندی کے ساتھ کہ یہ آئین کا جز تو ہو لیکن آئین پر حاوی اور برتر نہ ہو۔ سبحان اللہ! ''رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔'' اس طرح کی ایک اور ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے جسے ہمارے ہاں ''محمد علی بوگرہ آئینی فارمولا'' کا نام دیا گیا۔ اس فارمولے کے تحت جہاں آئین میں یہ سدا بہار شق رکھی جاتی: ''ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔'' وہاں اس طرح کی پخ بھی لگادی جاتی کہ ''25 سال کے لیے مالیاتی اُمور پر اسلامی قوانین کا اطلاق نہیں ہوگا۔'' اس سے اس طرح کا تاثر اُبھارا جانا مقصود تھا کہ گویا بقیہ تمام اُمور اسلامی احکام کے مطابق اور تابع ہیں صرف مالیاتی اُمور ناگزیر وجوہ کی بنا پر ایک محدود مدت کے لیے سخت مجبوری کے تحت غیر شرعی اُصولوں کے تحت چلیں گے۔ اب سادہ لوح عوام کیا جانیں کہ یہ سب الفاظ کی شعبدہ بازی اور حرفوں کی ہیرا پھیری ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مالیات تو کیا، کسی بھی شعبے پر عادلانہ اسلامی قوانین کا نفاذ ہونے ہی نہیں دیا گیا۔

کافی عرصے تک ہمارا یہی چلن رہا کہ ''راضی رہے رحمٰن بھی، خوش رہے شیطان بھی'' حتیٰ کہ جولائی 2002ء آپہنچا۔ اس دن ہم نے نفاق کا بدنما اور بدہیئت چولا اُتار پھینکا اور وہ طاغوتی انداز اپنا لیا جس کا کھلا ڈلا مظاہرہ حال ہی میں 3 دسمبر 2006ء میں ہوا ہے۔ اس مرتبہ قصہ کچھ یوں پیش آیا کہ 14 نومبر 1991ء کو شریعہ اپیلٹ بینچ نے سود کے خلاف تاریخ ساز فیصلہ دیتے ہوئے یہ قرار دیا کہ موجودہ مالیاتی نظام تو سود پر مبنی ہے اس شر سے پاک کر کے غیر سودی شرعی مالیاتی نظام جاری کیا جائے۔ حکومت کی سہولت کی خاطر اس کے لیے ٹائم فریم بھی دیا گیا جو نہایت معقول اور مناسب تھا۔ اس فیصلے کی پاداش میں اس بنچ کے ایک نامور رکن جو عالمی سطح کے مدبر اور راسخ العلم عالم دین تھے، کو معزول کر دیا گیا۔ موصوف اسلامی معاشیات میں اتھارٹی سمجھے جاتے تھے اور اپنی معتدل مزاجی، ذوقِ سلیم اور دینی وعصری علوم میں یکساں مہارت کے سبب ہر حلقے میں مقبول ومحبوب تھے۔ پھر ستم یہ کہ انہیں معزولی کی یہ سزا ایک ایسے وقت سنائی گئی جب وہ ملک کے ممتاز تاجروں اور صنعت کاروں کو تین روزہ سیمینار کے ذریعے سود کے متبادل نظام سے آگاہ کرنے میں مصروف تھے۔ اتفاق سے بندہ بھی اس سیمینار میں شریک تھا اور اس ناچیز کو یہ بھی اعزاز حاصل ہوا تھا کہ اس تقریب کے مختلف غیر ملکی مندوبین اور اسکالرز کے علاوہ خود عصر حاضر کی اس نامور شخصیت یعنی مفکر اسلام شیخ الحدیث حضرت جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے تفصیلی انٹرویو کی سعادت بھی حاصل کرے۔ اس سیمینار پر ضربِ مؤمن نے خصوصی صفحہ شائع کیا تھا۔ (دیکھیے: جلد 6 شمارہ 23، 31 مئی تا 6 جون 2002ء) حضرت نے تو اس معزولی کو

اپنے لیے اعزاز سمجھا اور سود کے خلاف جدوجہد میں پہلے سے زیادہ محویت کے ساتھ جُت گئے۔ دوسری طرف حکومت نے اپنی کارروائی آگے بڑھاتے ہوئے اس پر بس نہ کی بلکہ اس علمی شخصیت کے بنچ سے اخراج کے بعد ''ماہرین'' کی موجودگی میں 6 جون 2002ء کو ''سود کے خلاف'' فیصلے کے ''خلاف'' باقاعدہ سماعت شروع کردی اور بالآخر جولائی 2006ء کی ابتدا میں وہ سیاہ دن آگیا جب اللہ و رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف گناہ عظیم کے بارے میں قانونی طور پر قرار دیا گیا کہ اگر ہم اس سے دستبردار ہوئے اور غیر سودی نظام اپنایا گیا تو ملک میں انارکی پھیل جائے گی۔ اس دن ہم نے جس بغاوت کی کھلی ابتدا کی تھی اس کی انتہا گزشتہ دنوں اس وقت ہوئی جب اللہ کی متعین کردہ حدود کو ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے ایک ایسے بل کو اسمبلی کے کھلے اجلاس میں باقاعدہ طور پر منظور کر کے قانون پاکستان کا جز بنایا گیا جو بدیہی طور پر قرآن و سنت کے منافی ہونے کے علاوہ نظام عفت و عصمت کو تباہ و برباد کر کے آیندہ نسلوں کو فحاشی و عریانی کی داغ دار پیداوار بنا چھوڑے گا۔

گویا ہم اپنے اس قول و قرار سے پھرے ہوئے تو تھے جو ہم نے بیسویں صدی کے آغاز میں رب تعالیٰ سے کر کے اس کے بدلے سرزمینِ پاکستان مانگی تھی اور اس بدعہدی کے نتیجے میں 1971ء میں ہم پر ''عذابِ ادنیٰ'' نازل ہوا...... لیکن اب اکیسویں صدی کے آغاز میں ہم اللہ واحد قہار و جبار، قوی و ذوالجلال سے لیے گئے عہد سے صاف مکر گئے ہیں اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر ہم واپس نہیں آئے تو ہمیں ''عذابِ اکبر'' کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہم لوگ اپنے وجود کا جواز کھو بیٹھے ہیں اس لیے اب یا تو قوم یونس کی طرح رضاکارانہ توبۃ نصوح کر کے بچت کا سامان کریں یا پھر یاد رکھیں: ''تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں۔''

ممکن ہے کچھ دانش ور اس کو منفی سوچ یا قنوطیت زدگی کا نام دیں لیکن ہم گہرے درد و رنج کے ساتھ وہ کچھ عرض کرنے پر مجبور ہیں جو بخت نصر کے ہاتھوں عظیم سلطنت اسرائیل اور مقدس شہر یروشلم کی کامل تباہی سے قبل انبیائے بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''ہوش میں آجاؤ! ورنہ جان لو کہ درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا جا چکا ہے۔''

مئی 1857ء سے 2007ء تک

20 مئی 1498ء کو برصغیر ہند کے جنوبی ساحل میں مالابار نامی جگہ کی چھوٹی سی بندرگاہ کالی کٹ کے سامنے ایک سمندری جہاز آ کر رُکا۔ اس میں پُرتگیزی جہاز راں واسکوڈی گاما سوار تھا۔ اس کے ساتھ مسلمان ماہر بحریات احمد بن ماجد بھی تھا۔ کہنا تو یوں چاہیے کہ اس جہاز میں مشہور ماہر بحریات احمد بن ماجد سوار تھا اس کے ساتھ ہسپانیہ کے لالچی حکمرانوں کا ہرکارہ واسکوڈی گاما بھی تھا لیکن پروپیگنڈے کا زور جس طرح 1857ء کی جنگ آزادی کو ''1857ء کا غدر'' کہلواتا ہے اسی طرح مؤرخ یوں کہتا ہے کہ پرتگیزی جہاز راں کے ساتھ مسلمان ماہرین سوار تھے۔ حالانکہ 1498ء تک مسلمانوں کو سمندروں پر حکمرانی کرتے ہوئے قریباً 600 سال ہو چکے تھے اور پُرتگیزیوں کو اس وقت تک پینٹ پہن کر سیدھا کھڑا ہونا بھی نہ آتا تھا لیکن پروپیگنڈہ اور وہ بھی جھوٹ اور فریب کی عادی زبانوں کا پروپیگنڈہ چیز ہی ایسی ہے کہ دہشت گردوں کو امن پسند اور استعمار کو جمہوریت کا نام دے دیتا ہے۔

مئی 1498ء کی اس گرم سہ پہر جب شلغم جیسی پھیکی سفیدی اور داغی سیب جیسے چھوٹے لال دانوں والے پہلے پستہ قد یورپی نے ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا تو سادہ لوح ہندوستانیوں کے لیے یہ ایک عام سا معمولی واقعہ تھا۔ اتنا معمولی کہ کالی کٹ کی بندرگاہ کے باہر کسی نے اس کی طرف منہ کر کے پان تھوکنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی ہوگی لیکن حرص وہوس اور طمع ولالچ کے مارے ہوئے لوٹ کھسوٹ کے عادی اور متعصب مزاج یورپیوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ ان کے یخ بستہ ممالک کو ہندوستان کی شکل میں سونے کی چڑیا ہاتھ آ گئی تھی اور سلطان محمد فاتح (اے پروردگار! ایسا ایک اور اولوالعزم سپہ سالار مسلمانوں کو دے دے...... صرف ایک سہی) کے ہاتھوں فتح قسطنطنیہ کے بعد ان کے لیے پہلی مرتبہ ممکن ہوا تھا کہ وہ بحیرۂ روم کے پانیوں سے گزرے بغیر بحیرۂ عرب پہنچ سکیں۔ جہاز میں سوار ہسپانیہ کے عرب ملاحوں کو پتہ بھی نہ تھا کہ سقوطِ ہسپانیہ کا سانحہ ہوئے ابھی چھ سال بھی نہیں گزرنے پائے کہ متعصب اور جنونی ہسپانوی عیسائیوں نے سقوطِ ہندوستان کے سانحۂ عظمیٰ کی پہلی اینٹ رکھ دی ہے۔ واضح رہے کہ پرتگال اس زمانے میں ہسپانیہ کا ایک ساحلی علاقہ تھا اور بس! یہ مستقل ملک نہ تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی مسلمانوں کی تاریخی عظمت کے زوال اور یورپ کے عروج کے آغاز کی صدی تھی اور اس عروج کی بنیاد دو واقعوں پر ہے۔ اتفاق تو نہیں شامت اعمال ہی کہیے کہ دونوں کا تعلق ہسپانیہ کے سقوط اور وہاں کے فاتح عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کی بحری تحقیقات کو استعمال کرنے سے ہے۔

1492ء میں ہسپانیہ کے مسلم حکمرانوں کی خودغرضانہ مفاد پرستی اور اُمہ کے اجتماعی مفاد کے حصول کی آڑ میں ذاتی سفلی خواہشات کی تکمیل کے نتیجے میں مسلمانوں کے پاس موجود آخری شہر غرناطہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے بعد مراکش تک بیچ میں سمندر تھا یا موت۔ مشہور مسلمان جہاز راں خیرالدین باربروسا نے کوشش کی کہ لٹے پٹے مسلمانوں کو بحفاظت سمندر پار مراکش لے جایا جائے۔ باربروسا کا یہ احسان مراکش کے موجودہ مسلمان جو مئی کے مہینے میں ہر سال ہسپانیہ جا کر اپنی

آبائی مکانات کی زیارت کرتے ہیں اور ان مکانات کی چابیاں اور دستاویزات نسل در نسل سنبھال کر رکھتے ہیں نہیں بھول سکتے۔

باربروسا بحیرۂ روم میں اس نقل وحمل میں مصروف تھے جبکہ ہسپانوی فاتحین (بادشاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا) مسلمانوں کی کتابیں تو جلا چکے تھے لیکن مسلمانوں کے بحری تجربات کے نتیجے میں نئی دنیا کی دریافت اور وہاں کی دولت سے اپنا دیوالیہ ملک برباد ہونے سے بچانے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے یہودی اشرافیہ کی ترغیب اور چندے کی بدولت جب اطالوی یہودی جہاز راں کرسٹوفر کولمبس کی بحری مہم کامیاب ہوتے اور نئے دریافت شدہ براعظم (امریکا) سے سونا چاندی، تمباکو، خوشبودار لکڑی اور ریڈ انڈینز لونڈی غلام آتے دیکھے تو دوسری بحری مہم بھیجنے کے لیے بھی آسانی سے تیار ہو گئے۔

ہسپانوی یہودیوں کا کام تو ہو چکا تھا، انہیں نئی دنیا کے ایک ساحلی شہر (امریکا کا موجودہ شہر نیویارک جسے ''جیویارک'' بھی کہا جاتا ہے) میں ٹھکانا مل گیا تھا۔ البتہ عیسائیوں کے منہ کو تو حرام کی دولت اور حیوانی ہوس لگ گئی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کی دریافت کی ٹھانی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی پُراسرار الف لیلوی کہانیاں یورپ کے قصہ گو اس طرح سنایا کرتے تھے جیسے آج کل ہمارے ہاں امریکا اور یورپ کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ہسپانیہ کے بادشاہ وملکہ نے ہندوستان کی طلسماتی دولت سے اپنی حرص کی تسکین کے لیے واسکوڈی گاما کو بھی سرکاری سرپرستی میں چار نئے جہاز، بے تحاشا خوراک وشراب، وافر خرچہ اور ماہر مسلمان ملاح دے کر روانہ کیا۔ اس کے پاس وہ قیمتی نقشے موجود تھے جو مسلمان جہاز رانوں نے تیار کیے تھے۔

اب واپس چھ صدیاں پیچھے مئی 1498ء کی اس لُوتی سہ پہر کی طرف چلتے ہیں جب مسلمان جہاز رانوں اور ملاحوں کی مدد سے ہندوستان کی دریافت کا اعزاز اپنے نام کرواتے ہوئے واسکوڈی گاما نے اپنے منحوس قدم ہندوستان کی سرزمین پر رکھے۔ پندرہویں صدی کی آخری دہائی غیر معمولی طور پر عیسائیوں کے حق میں کامیابیوں کی نوید لائی ہے۔ براعظم امریکا کو دریافت ہوئے ابھی محض پانچ سال ہوئے تھے کہ ہسپانوی داداگیروں نے ہندوستان کی دریافت میں کامیابی حاصل کر لی۔ پانچ سال کے قلیل عرصے میں دو انتہائی اہم اور دور رس نتائج کی حامل، تاریخی کامیابیوں نے یورپین کے دل پھیر اور دماغ خراب کر دیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہسپانیہ کے بدبخت مسلم حکمران، فوج اور عوام کو لڑنے دینے سے روک کر نام نہاد جبری خیر خواہی ان پر مسلط نہ کرتے تو یہ دو کامیابیاں مسلمانوں کے حصے میں آ جاتیں اور آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھار ایک شخص پوری اُمت کے لیے ایسا نامبارک اور اس کے اعمال شامت کا سبب ہوئے ہیں کہ صدیوں پر پھیلی شکست کے ذمہ دار اس عقل کُل کو خود بھی محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی قبر میں اتنا عذاب سمیٹنے کی گنجائش ہے بھی یا نہیں؟

کولمبس نے ہوس ملک گیری، حرص، مال وزر اور جنسی خواہشات کی تکمیل اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کے دھوکے اور وعدہ خلافی کی جو طرح امریکا میں ڈالی تھی واسکوڈی گاما نے اس سفلی روایت کو آگے بڑھایا اور ہندوستان میں بھی تن کے گورے من کے کالے یورپی لٹیروں نے وہی کچھ کیا جو امریکا کی اصل آبادی ریڈ انڈینز کے ساتھ کیا گیا تھا۔

یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ عیسائی فاتحین کے سامنے سچے مسیح سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مبارک تعلیمات کی تبلیغ کے بجائے مال وزر کی ہوس مطمحِ نظر رہی ہے جبکہ مسلمان فاتحین جہاں بھی گئے وہاں کا چپہ چپہ ان کی وسعت ظرفی، بلند اخلاقی، عفو ودرگزر اور مقامی لوگوں سے حسن سلوک کا گواہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب بھی مسلم حاکمیت قائم ہوئی، روادار معاشرہ وجود میں آیا اور مسلم اقتدار کا دبدبہ ختم ہوتے ہی وہی مذہبی جنون اور حیوانی جبلت پروان چڑھی اور جوان ہوئی ہے جسے اعتدال میں رکھنے کے لیے مسلم حاکمیت وجود میں آئی تھی اور جس کا مقابلہ ایک ہی ذریعے ممکن ہے۔ وہی ذریعہ جس کا نام لینے پر پابندی رسم چلی ہوئی ہے۔ تاریخ کے ورق گردانی کرتے ہوئے عیسائی فاتحین کے کردار میں شائستگی اور رواداری کی جھلک تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کالے کوئلہ کی کان میں سفید نمک کی ڈلی کی تلاش بے سود ہوتی ہے۔ ہسپانوی عیسائیوں (موجودہ امریکی انہی کی آل اولاد ہیں) کی کارپٹ بمبنگ، شادی کی دعوتوں میں شریک بچوں اور عورتوں پر بے تحاشا بارود باری اور بھارتی ہندوؤں میں انتقام کی شدت، خون آشامی اور اقلیت کے ساتھ غیر انسانی سلوک کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے اور اسلام کی نرم دلی اور جہاد کی حقانیت کو اس پہلو سے سمجھا اور سمجھایا جانا چاہیے۔

واسکوڈی گاما کے ساحل ہندوستان پر اُترتے ہی وہی کچھ ہونا شروع ہو گیا جو امریکا میں مقامی قبائل کے ساتھ ہوا تھا۔ میزبان وسیع النظر، فراخ دل اور سادہ مزاج تھے جبکہ مہمان نفاقی فطرت، حرص کی ماری طبیعت اور ہوس سے ناکوں ناک بھرے ہوئے عیارانہ سرشت کے حامل تھے۔ جس طرح ریڈ انڈین قبائل نے کولمبس کا شاندار استقبال کیا لیکن نتیجے میں وہ دس کروڑ سے صرف ڈھائی لاکھ رہ گئے۔ ان کے آبائی علاقے ان کے ہاتھ سے جاتے رہے اور آج وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے سادہ لوح باسیوں نے عیار فرنگیوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ اپنے ملک میں ان اجنبی مہمانوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی لیکن شاید ہی کوئی انگریز ہو جس کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے اور اس کی تجوریاں ہندوستان کی لوٹی ہوئی دولت سے بھری ہوئی نہ ہوں۔

یہ مماثلت جتنی حیرت انگیز ہے، اتنی المناک بھی کہ آج جبکہ بھارت میں 1857ء کی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات منائی جارہی ہیں ہمارے پاس اس ولولہ خیز واقعہ کا تذکرہ بس اتنا ہی ہے جتنا کہ امریکا میں ریڈ انڈین کا تذکرہ فلموں میں۔ بلکہ اب تو ہم نے آپس میں وہ کچھ کرنا شروع کر دیا ہے جو انگریز نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ مئی 2007ء میں کراچی کی سڑکیں مئی 1857ء میں دہلی کی سڑکوں سے زیادہ خونِ ناحق سے رنگین ہیں۔ مانا کہ انگریز کے دور میں نہ ان ظالمانہ اور لرزہ خیز واقعات کو کوئی لکھ نہ سکتا تھا جن کو سن کر آج یقین نہیں آتا کہ مہذب اور باوقار گورے ایسا بھی کر سکتے ہیں مگر آج آزادی کے بعد کیا ہوا ہے کہ ہمارے آباواجداد کے ان عظیم کارناموں اور بے مثال قربانیوں کے تذکرے کا بازار سرد پڑا ہے۔ ہمارے ملک میں چھپنے والی ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں 1857 کی جنگ آزادی کو ''غدر'' کہا گیا ہے۔ یہاں ایسے جاگیردار مسلط ہیں جن کے پسینے سے تیلی اور مالشی کی نسل کی بُو آتی ہے جو اس بات کی گواہ ہے کہ ان کے پاس موجود جاگیریں 1857ء کے مجاہدین آزادی کی مخبری اور وطن کی آزادی کی تحریک سے غداری کر کے حاصل کی گئی تھیں۔ دنیا میں گئی گزری قومیں اپنے محسنوں کی قدر و عزت افزائی اور غداروں کی تذلیل و انتقام کو اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ یہ انوکھی روایت صرف ہم نے ہی قائم کی ہے کہ ڈاکٹر خان جیسے محسنِ پاکستان تو نظر بند ہیں اور وہ ٹوانے ٹوانے جن کے نام کئی تحقیقی کتابوں میں انگریز کی چھوڑی ہوئی مصدقہ دستاویزات کے حوالوں کے ساتھ درج ہیں کہ وہ نسلی ٹاؤٹ تھے، وہ اس ملک پر اقتدار کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ اے میرے مولا! سیاست کے یہ رنگ ترنگ کتنے دن تک بہار دے سکیں گے؟

آیئے! آزادی کی تکمیل کریں

اس نقشے میں ان مسلمان ممالک کی آزادی کی تاریخ وار جھلک دکھائی گئی ہے جو جنگ عظیم اوّل و دوم کے بعد عالمی استعماری طاقتوں کے پنجے سے آزاد ہوئے۔ (دیکھیے: کتاب کے آخر میں دیے گئے نقشوں میں سے پہلا نقشہ) جب دنیا میں مشینی ایجادات ہوئیں، صنعتی انقلاب آیا اور جدید حربی علوم اور آلاتِ حرب ایجاد ہوئے تو عیسائی اقوام نے جو جہالت اور پسماندگی میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں، ان علوم کی طرف توجہ دی اور رفتہ رفتہ ان میں کمال حاصل کیا۔ انہوں نے زمین کے پیٹ سے معدنیات نکال کر انہیں کار آمد بنانے پر تحقیق کی اور سمندروں کے سینے چیر کر بحری راستوں سے واقف ہوئے اور اپنے آلاتِ حرب وضرب کو جدید سے جدید تر بنایا۔ ان کے مقابلے میں مسلمان اپنے اعمال واحوال کی درستگی اور جہاد کی تیاری سے غافل تھے، اس کے لیے درکار اسباب ووسائل کے مہیا کرنے، اپنی معیشت کو مستحکم کر کے فنون حرب میں ترقی کرنے اور اپنے عقائد و اعمال کو کتاب وسنت سے موافق کر کے انہیں دنیا پر غالب کرنے کی فکر سے بے بہرہ تھے۔ ان کے عقائد میں توہم پرستی اور فلسفیانہ موشگافیاں، اعمال میں رسوم وعبادات اور کردار میں ناقابل بیان کمزوری اور پستی آ چکی تھی۔ دنیاوی علوم وفنون میں جستجو و تحقیق کی جگہ جمود اور نقل درنقل نے اور شجاعت و بلند کرداری کی جگہ پست ہمتی اور دنیا پرستی نے لے لی تھی۔ چنانچہ وہ یورپی طاقتیں جو کبھی طارق بن زیاد اور اس کے جانشینوں کی تلوار سے سہمی رہتی تھیں اور کبھی ترکانِ عثمانی کی یلغار ان کو خوفزدہ رکھتی تھی۔ وہ ایشیا وافریقہ کے اسلامی ممالک پر حملہ آور ہونا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد ناپید تھا اور جہاد کے لیے درکار جدید آلات وسامان کی ایجاد وتیاری کی طرف ان کی خاص توجہ نہ تھی، باہمی نزاع اور تفرقے اور اخوت اسلامی کے بےلوث جذبے سے محرومی کا یہ عالم تھا کہ جنوبی ہند میں انگریزوں سے برسرِ پیکار سلطان ٹیپو شہید رحمہ اللہ نے عراق، ترکی، ایران وافغانستان ہر طرف کے مسلمان بادشاہوں کو تعاون کے لیے سفارتیں اور خطوط بھیجے۔ ان کے جواب میں فرانسیسیوں نے تو انگریزوں کے خلاف ان کا ساتھ دینے کی حامی بھری اور سلطان کی فوج میں ایک دستہ فرانسیسی فوج کا مستقل رہتا تھا، لیکن کسی مسلمان حکومت نے لفظی آداب والقاب سے آگے بڑھنا گوارا نہ کیا۔ عقائد واعمال کی کمزوری، عیش وآرام پسندی کے رجحان اور اخوتِ اسلامی و غیرتِ دینی کے فقدان نے یہ نتیجہ دکھایا کہ رفتہ رفتہ یورپ کے بدباطن، کم ظرف اور ہوسِ ملک گیری کے مارے ہوئے جنگ آزما ایک ایک کر کے مسلم ممالک پر قابض ہوتے چلے گئے۔

میدان اور بند کمرے:

چونکہ اسلام قیامت تک رہنے کے لیے آیا ہے اور حدیث شریف کی پیش گوئی کے مطابق ''مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جو حق کی سربلندی کی خاطر جانیں دیتی رہے گی۔'' اس لیے غیرملکی استعمار کے خلاف جلد ہی تحریکیں چلنا شروع ہو گئیں۔ علماء ومشائخ کی سرپرستی میں جہادی تنظیمیں جابجا وجود میں آنے لگیں اور انہوں نے یورپی طاقتوں سے اسلامی مقبوضات میں دخل

اندازی کی بھاری قیمت وصول کرنا شروع کی۔ بعض نے تو بیرونی قابضین کے خلاف جدوجہد کی ایسی شاندار تاریخ رقم کی جس پر مسلمان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک جہاد، اطالوی طالع آزماؤں کے خلاف سوڈان میں سنوسی تحریک اور لیبیا میں اطالوی استعمار کے خلاف شیخ عمر مختار کی شاندار جدوجہد اور تیونس والجزائر میں سید بادشاہ کی قیادت میں فرانسیسیوں کے خلاف زوردار جہادی تحریکوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ عیسائی میدان میں اتنے اچھے شہسوار نہ تھے جتنے کہ بند کمروں میں ترتیب دی جانے والی سازشوں میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ جب انہیں پاؤں اکھڑتے محسوس ہونے لگے تو انہوں نے محکوم مسلمانوں میں سے اپنے مطلب کے آدمی تلاش کرنا شروع کیے اور حکومت انہیں سپرد کر کے واپس اپنے ممالک میں سمٹنے کی ٹھانی، جہاں وہ اسلامی ممالک کی دولت سمیٹ لپیٹ کر پہلے ہی لے جاچکے تھے۔ اس طرح ان ممالک کو بظاہر تو آزادی ملتی گئی، مگر بباطن وہ محکومیت میں رہے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کو ناگوار گذرے گی کیونکہ جشن آزادی کا ولولہ کہاں کچھ سوچنے دیتا ہے؟ مگر انسان اس وقت تک حالات کی تلخی کو شیرینی سے نہیں بدل سکتا جب تک وہ تلخ حقائق کا سامنا کرنے کا جگر نہ پیدا کرلے۔ اس لیے ہم کو کھلے دل سے اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہمیں ملنے والی آزادی حقیقی ہے یا کھوکھلی؟ ہماری خودمختاری مکمل ہے یا ادھوری؟ یہ اس وجہ سے کہ جسم کی آزادی تو کوئی آزادی نہیں۔ جسم تو ذہن کا محکوم ہوتا ہے۔ اگر ذہن کسی اور کا محکوم ہو تو جسم ہرگز آزاد نہیں ہوسکتا۔ تو آئیے! اپنی آزادی کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اگر اس میں کوئی نقص ہو تو اس کے ازالے کی کوشش کریں۔

مملکت کے چار ستون:

مشہور ہے کہ مملکت کے تین ستون ہوتے ہیں: مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ جبکہ صحافت کو چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ آپ دور نہ جائیے! مسلم ممالک کی معاشرت، معیشت اور سماجیات کا تجزیہ نہ کیجیے۔ صرف انہی چار ستونوں کو دیکھ لیجیے کہ یہ کس بنیاد پر قائم ہیں۔ ان پر کون سا رنگ چڑھا ہوا ہے اور انہوں نے اپنے سر پر کیا بوجھ اُٹھا رکھا ہے؟ تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ہم آزادی کا جو جشن مناتے ہیں۔ وہ کھوکھلا اور مصنوعی ہے یا پائیدار اور حقیقی؟ کیا ہماری مقننہ قانون سازی میں کتاب وسنت کے احکامات کی پابند ہے؟ وہ قانون سازی کرتے وقت مسلمان عوام کی حقیقی امنگوں کا پاس کرتی ہے؟ کیا ہماری عدالتوں میں ہماری مذہبی تعلیمات کے مطابق منصفانہ فیصلے ہوتے ہیں؟ کیا ہماری انتظامیہ اس امانت ودیانت کے ساتھ ملک کو چلا رہی ہے جس سے ملک فلاح وترقی کے راستے پر گامزن ہوجائے؟ کیا ہماری صحافت یہودی وعیسائی ثقافت کی یلغار کا توڑ کر رہی ہے یا اس کا حصہ بنی ہوئی ہے؟ سچ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں ان اداروں کی جو صورتحال ہے اسے کوئی بھی قابل اطمینان قرار نہیں دے سکتا۔ جب صورتحال یہ ہے کہ ہمارے قانون اللہ تعالیٰ کے احکامات کے بجائے مصلحتوں کے پابند ہوتے ہیں۔ ہمارے فیصلے اصولوں کے بجائے چمک کے تابع ہوتے ہیں۔ ہماری انتظامی کارگذاری ملک وملت کی فلاح وبہبود کے بجائے نوکر شاہی کی مالی وسماجی حیثیت میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ ہماری صحافت پر ''زردی'' غالب نظر آتی ہے۔ ہمیں ان مسلمانوں کی فکر نہیں جو ہندوؤں کے تسلط میں ہیں۔ کشمیر، جونا گڑھ، حیدرآباد دکن بلکہ مغلیہ سلطنت کے ایک انچ کی واپسی کا عزم نہیں۔ خنزیر کھانے والا وہ انگریز جس نے ہم سے یہ عظیم سلطنت چھینی اور ہمارے آباء واجداد سے درندگی والا سلوک کیا۔ اس سے انتقام لینے کی تڑپ نہیں، تو ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم آزادی کو مکمل سمجھیں یا اس محدود خودمختاری پر اکتفا کرلیں جو لکڑی کے جنگلے میں بند ''آزاد'' پھرنے والے چوپایوں کو بھی حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہ نہ بھولیے!

آزادی بلاشبہ ایک نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر نعمت پر خوشی منانے کا مسلمانوں کو حق ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس موقع پر ایک حق اللہ تعالیٰ کا بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔ خوشی جب ہی پائیدار اور دیرپا ہوتی ہے۔ جب وہ شکر کے ساتھ جڑی ہوئی ہو۔ ہمارے ہاں یہ رواج چل پڑا ہے کہ ہم آزادی کا جشن تو بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں لیکن شکر نعمت کی فکر نہیں کرتے۔ جبکہ شکر وہ چیز ہے جس سے نعمت بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے جبکہ خوشی منانے اور محفل جشن سجانے سے نفس پھولتا ہے اور پھولے ہوئے نفس مزید نعمتوں کے حصول کے لائق نہیں رہتے۔ ہم لوگ آزادی ملنے کے بعد نہ صرف یہ کہ خوشی اور مسرت سے پھول کر شکر کی ادائیگی بھول چکے ہیں، بلکہ بدعہدی کے مرتکب ہورہے ہیں۔ جب پاکستان نہیں بنا تھا اور ہم انگریز کے محکوم تھے۔ اس وقت ہمارے بڑے جھولیاں پھیلا کر آزادی کی دُعا مانگتے تھے۔ اور یہ عہد کرتے تھے کہ ہمیں الگ ملک مل جائے تو ہم اس میں شریعت کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ مگر آپ دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ کیا الگ خطۂ زمین مل جانے کے بعد ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا کیا ہے؟ کیا ہم نے اسے مثالی اسلامی ریاست نہیں تو مثالی مسلم ریاست بنانے کی کوشش کی ہے؟ اگر نہیں تو ہمیں ناشکری کے عذاب سے ڈرنے کے ساتھ بدعہدی کے وبال سے بھی پناہ مانگنی چاہیے۔

شکر اور عہد:

تو آیئے! برصغیر میں دنیا کی ایک عظیم اسلامی مملکت کے وجود میں آجانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ زبان سے بھی اور عمل سے بھی۔ زبانی شکر یہ تو یہ کہ ہم بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہو کر دل کی گہرائیوں سے ربّ تعالیٰ کی حمد وستائش کریں کہ اس نے وسائل سے مالا مال یہ ملک ہمیں دیا اور عملی شکر یہ کہ ہم اس کو ہر اعتبار سے مضبوط ومستحکم بنائیں اور اپنے ان مسلمان بھائیوں کی فکر کریں جو آج بھی ہندوؤں کی غلامی میں ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں انہیں آزاد کروانے کے لیے عملی جدوجہد شروع ہے اس کا ساتھ دیں۔ اگر یہ علاقے آزاد ہو گئے تو ان شاء اللہ بقیہ بھی رفتہ رفتہ آزاد ہو جائیں گے۔

آیئے! اللہ تعالیٰ سے اس عہد شکنی کی معافی مانگتے ہیں جو ہم نے پاکستان مل جانے کے بعد کی۔ قومی اموال میں خیانت اور اجتماعی امانتوں میں بددیانتی سے توبہ کرتے ہیں۔ ملکی وسائل کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے ملک کی ترقی کے لیے وقف کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ اپنے فرائض کی صحیح صحیح بجا آوری اور حقداروں کو ان کا حق پہنچانے کا عہد کرتے ہیں۔ ملک کے نظام کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد کرنے اور اس جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں، تاکہ ہماری آزادی مکمل، حقیقی اور بامعنی ہو جائے اور ہم صحیح معنوں میں عالمِ اسلام کی سرپرستی، قیادت اور تحفظ کا وہ فریضہ ادا کرسکیں جو ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد ہم پر پہلے سے کہیں زیادہ تاکید کے ساتھ عائد ہو گیا ہے۔

چوتھا باب

شخصیات

غامدی نامہ

ہاشمی نامہ

کچھ یادیں، کچھ باتیں

یہ آج سے تقریباً بیس اکیس سال پہلے کی بات ہے۔ بندہ ملک کے ایک مشہور دینی ادارے میں درجہ رابعہ کا طالب علم تھا۔ سہ ماہی امتحان کے نتائج نکلے تو مدرسہ کی طرف سے کتابیں انعام میں ملیں، ساتھ ہی ایک کتاب ''احسن الفتاویٰ، جلد 4'' الگ سے ملی۔ معلوم ہوا کہ ناظم آباد میں ایک مفتی صاحب ہیں، ان کے فتاویٰ کے مجموعے میں سے چوتھی جلد مرتب ہوئی ہے جو انہوں نے طلبہ کیلیے ہدیے میں بھیجی ہے۔ کتاب لانے والے اور دیگر طلبہ سے مفتی صاحب کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا، مثلاً یہ کہ مفتی صاحب علمی تربیت کے ساتھ عملی اصلاح پر بہت زور دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن مفتی صاحب کی جو بات بطور خاص یاد رہ گئی وہ یہ کہ آپ لاٹھی چلانے کے ماہر ہیں اور طلبہ کے ساتھ صبح صبح قریب کے باغ میں تشریف لے جا کر انہیں لاٹھی چلانے کا طریقہ اور اس کے داؤ پیچ سکھاتے ہیں۔ یہ بنوٹ اور لاٹھی چلانے والی بات ذہن سے چپک کر رہ گئی اور اس نے طبیعت پر ایسا اثر چھوڑا کہ دل میں عزم کیا کہ قسمت نے یاوری کی تو حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری ضرور دیں گے۔ اب جب مڑ کر ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو یاد نہیں پڑتا کہ حضرت کی اتنی ساری صفات میں سے بہت سی باتوں کو چھوڑ کر صرف اس چیز نے زیادہ متاثر کیوں کیا؟ شاید یہ وجہ ہو کہ علمی و روحانی شخصیات کا ان چیزوں سے عموماً تعلق نہیں رہتا جبکہ بزرگوں سے سنتے آئے تھے کہ تقسیم سے قبل علمائے کرام خطاطی، طب اور لاٹھی چلانے کے فن میں طاق ہوا کرتے تھے۔ اب اسلاف کی زندگی کا یہ پہلو عملی صورت میں حضرت والا کی شخصیت میں جلوہ گر دیکھا تو اس نے دل و دماغ کو متاثر کیا اور حضرت اقدس کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

قصہ مختصر ایک دو سال بعد ہم چند طلبہ تہے سہائے حضرت کے یہاں مصافحے اور زیارت کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ کی مجلس کا رعب و وقار اور ہر چیز کا سلیقہ و قرینہ اتنا متاثر کن تھا اور اس نے ایسے سحر میں جکڑا کہ پھر عمر بھر اس کی گرفت سے نہ نکل سکے۔ شاید وہ لمحہ جب دل میں حضرت والا کی زیارت اور استفادے کا عزم کیا تھا، قبولیت کی گھڑی تھی کہ رفتہ رفتہ حاضری کا سلسلہ مستقل ہوتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم اسی در کے ہو کر رہ گئے۔ جیسے جیسے حضرت سے قربت بڑھتی گئی آپ کے مزاج و مذاق کی بہت سی ایسی باتیں سامنے آئیں جو شاذ و نادر ہی کہیں پائی جاتی ہیں اور ان کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا عبقری الصفت بنایا تھا جو خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں اور قسمت ان کو کسی بڑے کام کیلیے دنیا میں بھیجتی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں حضرت والا رحمہ اللہ کی چند وہ باتیں لکھی جائیں گی جو آپ کی منفرد اور ممتاز خصوصیت تھی اور توفیق الٰہی شامل حال ہو تو انسان ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

☆ نماز اور تلاوت قرآن کریم کا از حد اہتمام تھا۔ بندہ کو بعض ساتھیوں نے بتایا کہ انہیں دارالافتاء میں پندرہ سال اور بعض کو اس سے بھی زائد ہونے کو آئے ہیں۔ اس طویل عرصے میں کبھی حضرتِ والا کی تکبیر اولیٰ اور صفِ اول فوت ہوتے نہیں دیکھی۔ نماز کے سنن و آداب کی رعایت کا بھی بہت اہتمام تھا۔ نماز کے دوران پوری صف میں اگر کوئی ہاتھ ہلاتا تو آپ کو اس کا ادراک ہو جاتا۔ سلام پھیرنے کے بعد جب آپ دریافت فرماتے کہ نماز میں کس نے ہاتھ ہلایا ہے تو صرف اس طرح دریافت

فرمانے سے ہی بہت سوں کی اصلاح ہو جاتی۔ تلاوت قرآن سے آپ کو ایسا لطف آتا تھا کہ اس کا کیف پاس والوں کو بھی محسوس ہوتا تھا۔ آپ کے حلقے سے وابستہ متعلقین میں نماز اور تلاوت کا خصوصی اہتمام آپ ہی کے مزاج اور تربیت کا فیض ہے۔

☆ تحقیق، جستجو، حقائق اشیا تک رسائی اور معاملے کی تہ تک پہنچنا بھی آپ کی فطری جبلت، عجیب وغریب خصوصیت اور عادت تھی۔ علمی مسائل میں آپ نے لگن کے ساتھ محنت اور تحقیق کی جو عادت اپنے تلامذہ کو ڈالی، وہ تو آپ کا امتیاز ہے ہی لیکن دنیوی معاملات یا طلبہ کے ''مقدمات'' (حضرت والا کی اصطلاح میں طلبہ سے تادیبی پوچھ گچھ کو مقدمہ کا نام دیا گیا تھا) میں بھی آپ جس طرح احقاق حق فرماتے اس سے معاملے کی تہ تک پہنچنے کا سلیقہ آپ کے متعلقین کو سیکھنے کا موقع ملتا، وہ اس دور میں ایک نادر ونایاب چیز تھی۔

☆ حضرت اقدس کی ایک مخصوص عادت نظم وضبط اور وقت کی پابندی تھی۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک منٹ نظم کے تحت گزرتا تھا۔ اپنے علمی، تصنیفی اور اصلاحی کاموں کے علاوہ نجی اور ذاتی مشاغل کو بھی منظّم طور پر سلیقے سے انجام دیتے۔ اوقات کی حفاظت کرنے میں آپ اس دور میں بے مثال تھے۔ ہمارے قابل فخر اسلاف میں وقت کی حفاظت کا اہتمام خاص طور سے پایا جاتا تھا اور بعض اکابر اس بارے میں بہت ہی محتاط اور معروف تھے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں ہمارے علمی کتب خانوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس صفت کی بھرپور جھلک حضرت والا میں بھی پائی جاتی تھی اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نماز اور مجالس کیلیے آپ کی آمدو رفت دیکھ کر گھڑیاں درست کی جاسکتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو استقامت اور صحت بھی ایسی نصیب فرمائی تھی کہ سالہا سال تک آپ کے معمولات میں ذرہ برابر فرق نہ آتا تھا۔ آپ کے اکابر تلامذہ میں سے ایک بہت ہی محترم شخصیت نے بندہ کو بتایا کہ حضرت والا عیدین کے دن بھی اپنے معمولات انجام دیا کرتے تھے اور آپ کی بعض تحریرات کے ذیل میں دستخط کے ساتھ تاریخ کی جگہ پر یوم الفطر یا یوم النحر کے الفاظ ثبت ملتے ہیں۔ ایسا استقلال اور عمر فانی کے لمحات کی ایسی حفاظت بلاشبہ بڑی کرامت تھی۔

☆ یوں تو آپ کو علوم نقلیہ کے ساتھ علوم عقلیہ اور فنون مروّجہ میں بھی کمال حاصل تھا اور علم منطق وفلسفہ کا رد کرتے ہوئے فرماتے: ''میں نے ان علوم کی تشریح الابدان (پوسٹ مارٹم) کرنے کے ساتھ وہ مخطوطہ کتب بھی پڑھی ہیں جو مدعیانِ منطق وفلسفہ نے دیکھی نہ سنیں''، لیکن ریاضی وفلکیات میں جو مہارت آپ کو تھی، اس کی مثال ناپید ہے۔ آپ کی کتاب ''ارشاد العابد الی تخریج الاوقات وتوجیہ المساجد'' جو احسن الفتاویٰ ج دوم میں شامل ہے، اس پر شاہد عدل ہے۔ اس میں جس اختصار، جامعیت اور ثقاہت کے ساتھ تخریج اوقات نماز، تعیین سمت قبلہ اور ہجری وشمسی تاریخیں معلوم کرنے کے قواعد دیے گئے ہیں، اس کو دیکھ کر ماہرینِ فن یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ پورے روئے زمین کے علماء میں ایسی شخصیت ملنا مشکل ہے جسے اس فن میں اس قدر رسوخ حاصل ہو۔ انوار الرشید میں ایسے واقعات قارئین پڑھ سکتے ہیں، جن میں علوم جدیدہ کے ماہرین آپ کے کمال فن کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے۔ آپ کی مہارت تامہ کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ایک شمسی وقمری تقویم خود ایجاد کی تھی، جس سے از ابتدا تا قیامت قمری وشمسی تاریخیں معلوم کی جاسکتی تھیں۔ اسٹیل کی خوبصورت پلیٹوں پر بنی ہوئی یہ جنتریاں آپ کے حجرے کی جنوبی دیوار پر آویزاں ہیں۔ آپ کی محولہ بالا کتاب اس فن کی قدیم وجدید تحقیقات کا نچوڑ ہے اور یہ فن اس وقت اگر کوئی پڑھنا چاہے تو آپ کے تلامذہ کے علاوہ مشکل ہے کہ کوئی اس کی تشنگی دور کر سکے۔

☆ اردو زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ اور برمحل استعمال میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا، وہ بھی آپ پر ختم تھا۔ اس بارے میں

آپ کی وسیع معلومات اور عمیق تحقیقات سن کر انسان ششدر رہ جایا کرتا تھا۔ الفاظ کی درست ادائیگی اور زبان و بیان کی صحت و نجابت کا اس قدر اہتمام تھا کہ غلط لفظ سنکر طبیعت مکدّر ہو جایا کرتی تھی۔ بندہ اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدے کی بنا پر دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ علمائے کرام کو علوم عصریہ سے نابلد سمجھنے والے اس دور کے بڑے بڑے جغادری ادیبوں اور دانشوروں کی مجال نہ تھی کہ آپ کے سامنے چند سطریں پڑھ سکیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اپنے حجرے تک محدود رہنے والے ایک شخص کا مطالعہ و مشاہدہ کس قدر وسیع اور اردو کے ادب عالیہ میں رسوخ و مہارت کتنی مکمل اور ہمہ گیر تھی کہ آپ کے چند تربیت یافتہ شاگردوں کے علاوہ کسی کی ہمت نہ تھی کہ آپ کی مجلس میں چند سطری تحریر تلفظ اور ادائیگی کی صحت کے ساتھ باآواز بلند پڑھ سکے۔

☆ قدرت نے آپ کو فیاضی اور سخاوت ایسی عطا فرمائی تھی کہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ یہ آپ ہی تھے جنہوں نے اپنے تلامذہ اور خدام میں ''لینے'' کے بجائے ''دینے'' کا شعور پیدا کیا۔ آپ نے شروع ہی سے اپنے اموال کا مخصوص حصہ راہِ خدا میں خرچ کرنے کا معمول بنایا ہوا تھا اور آخر عمر میں تو اپنی کل آمدنی فی سبیل اللہ وقف کردی تھی۔ اسی کی برکت تھی کہ آپ کے ادارے نے خدمتِ خلق کے شعبے کا ایسا احیا کیا کہ اس کی نظیر بڑی بڑی این جی اوز پیش نہیں کرسکتیں۔ بعض لوگ مہمانوں کی آمد پر اپنا بہت سا وقت اور پیسے ان کے تکلف و اکرام پر خرچ کرتے ہیں، آپ کی یہ عادت نہ تھی۔ اس کے بجائے آپ علمائے کرام اور طالبان کی خبر گیری اور مدارس و دینی کاموں کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے اور اس حوالے سے آپ کو مجدّد کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے اپنی اس خصلت کا گیرائی اور گہرائی کے ساتھ مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ایسے اسلامی رفاہی ادارے کی بنیاد رکھی جو اس وقت تمام اہلِ علم اور دیندار حضرات کیلیے قابل فخر اور تقلید ہے۔

☆ حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی صحت اور قوت سے بھی خوب نوازا تھا۔ عمر اسی برس سے متجاوز تھی مگر بالکل آخری دنوں کے علاوہ جب بیماری اور ضعف بہت ہو گیا تھا، کبھی گھر کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے کیلیے ریلنگ کا سہارا بھی نہ لیتے۔ ایک مرتبہ علمی وادبی مقابلوں میں بھیجے گئے خاکے دیکھنے کیلیے دارالافتاء سے متصل دفتر میں تشریف لائے۔ جس بڑے ہال میں ان خاکوں کو سجایا گیا تھا، بندہ آج کل وہیں بیٹھتا ہے۔ یہ ہال تیسری منزل پر واقع ہے اور بندہ آج تک کبھی ایک مرتبہ بھی بغیر ریلنگ کے سہارے کے اس تک آنے والی سیڑھیاں نہیں چڑھ سکا۔ حضرت والا جب تشریف لائے تو اس پیرانہ سالی کے عالم میں پہلی سیڑھی سے لے کر چھت تک بغیر رکے اور بغیر سہارا لیے چڑھتے چلے گئے۔ لاٹھی چلاتے وقت جب آپ شیر کی طرح جست لگا کر خاص شان سے میدان میں اترتے تو وہ منظر انتہائی دلکش، قابل دید اور جوانوں کیلیے رشک کا باعث ہوتا تھا۔ آپ کی صحت میں جہاں آپ کی متناسب جسمانی ساخت کارفرما تھی، وہیں غذا میں آپ کا اعتدال اور ہر چیز میں میانہ روی بھی اس کا سبب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اکثر علمی کام آپ کی حیات میں آپ کے سامنے مکمل ہوئے۔ آپ نے اپنے تمام مواعظ پر خود نظرِ ثانی فرمائی اور احسن الفتاوی کی تبویب کا اکثر بلکہ قریب بہ کل حصہ آپ نے خود ملاحظہ فرمایا۔

☆ اور آپ کا یہ احسان خصوصیت سے لوگ بھول ہی نہیں سکتے کہ آپ نے دینداری کے معانی و مفاہیم میں ترک منکرات کے پہلو کو جو بالکل دھیما اور مضمحل ہو چکا تھا، اجاگر کیا۔ آپ کی مجلس میں آنے سے قبل بہت سے فضلا کرام بھی نہ جانتے تھے کہ اللہ والا بننے کے لیے حلیے کی مخصوص ہیئت کافی نہیں بلکہ گناہوں کا چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ معاملات میں حلال وحرام کی

تمیز، وقف کے اصول میں احتیاط اور ہر حال میں شریعت پر استقامت کا جو قابل رشک سلیقہ جیسا آپ کے متعلقین میں ہے، وہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

☆ایک عجیب عادت یہ تھی کہ کسی سے ذاتی خدمت نہ لیتے تھے۔ بھائی راشد تمام تلامذہ و خدام میں وہ سعادت مند ساتھی ہیں جن کو حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں شدید بیماری کے دوران حضرتِ والا نے خدمت کی اجازت دی اور انہوں نے اس کا حق ادا کر کے حضرت سے خوب دعائیں لیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ آخر وقت تک کوشش فرماتے تھے کہ شدید ضعف کے باوجود خود اپنے زور پر اٹھیں اور کسی دوسرے پر اپنا بوجھ نہ ڈالیں۔

☆اور آخر میں وہی بات جو سب سے پہلے لکھی تھی کہ حضرت والا کو علمی کمالات کے ساتھ ریاضت بدنیہ میں بھی بے مثال مہارت تھی۔ لاٹھی چلانے کیلیے آپ جب میدان میں اُترتے اور اپنے مخصوص انداز میں "ھل من مبارزی" کا نعرہ لگاتے تو وہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اس وقت آپ کے چہرۂ انور کے تاثرات اور بڑھاپے میں جوانوں جیسی پھرتی، استادانہ مہارت کے ساتھ پینترے بدلنا اور داؤ پیچ کھیلنا آپ کی ناقابل فراموش خصوصیت ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل مسلمان پہلوانی، تیراکی اور بنوٹ وغیرہ میں کمال حاصل کیا کرتے تھے تاکہ ہندوؤں کے ساتھ پنجہ آزمائی کے وقت اسلحے کی کمی محسوس نہ ہو۔ آپ کو بھی شاید اسی مناسبت سے گھڑ سواری اور بنوٹ میں کمال حاصل تھا اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ جسمانی کمال آپ کی ہمہ جہت اور جامع شخصیت کا وہ پہلو ہے جس پر بے ساختہ رشک آتا ہے۔ آپ کی یہ جامعیت جہاد اور مجاہدین سے آپ کی محبت اور تعلق کا باعث تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاد سے قدرتی رغبت کے سبب آپ کا میلان اور رجحان ان چیزوں کی طرف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب افغانستان میں جہاد کا آغاز ہوا تو آپ نے علمی تحقیق اور اصلاح خلق کے ساتھ فریضۂ جہاد کے فروغ میں وہ خدمات ادا کیں جو اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں اور ان سے پوری اُمت مسلمہ نے استفادہ کیا ہے اور کر رہی ہے۔

یہ چند باتیں ارتجالاً قلم سے ادا ہوئی ہیں ورنہ آپ کی شخصیت کے گوناگوں پہلو، خدمات، کمالات اور خصوصیات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے جملہ تلامذہ، خدام، متعلقین اور منتسبین کو توفیق دے کہ وہ آپ کے مشن کو آپ کی ہدایات، نصائح اور تربیت کے مطابق آگے بڑھائیں اور آپ کی تمناؤں کے موافق آپ کے علمی، اصلاحی، رفاہی اور جہادی کاموں کو ترقی و استحکام دینے کیلیے کما حقہ محنت اور جد و جہد کریں۔ آمین یارب العالمین۔

شجرِ سایہ دار

اجتہاد میں تجزی ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ اُصول فقہ کی ایک دلچسپ بحث ہے۔ ''تجزی'' کا معنی ہے کسی چیز کے اجزا کا الگ الگ پایا جانا۔ آسان لفظوں میں اس سوال کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ایک عالم تمام مسائل میں اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو تب ہی مجتہد کہلائے گا یا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک موضوع سے متعلق مسائل پر کوئی صاحبِ علم مکمل دسترس حاصل کر لے تو اسے کم از کم اس موضوع کی حد تک مجتہد قرار دینا درست ہوگا؟ اہلِ علم کی اس بارے میں مختلف آرا ہیں۔ اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اجتہاد میں ''تجزی'' ہوتی ہے یعنی یہ ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ علم کسی ایک ہی موضوع پر طویل تحقیق کے ذریعے اتنا عبور حاصل کرے کہ وہ اسے اس موضوع کے اُصول وفروع کے ساتھ جزوی تفصیلات اور متعلقہ ضمنیات پر بھی دسترس حاصل ہو جائے تب اسے اس موضوع کی حد تک مجتہد قرار دیا جاسکتا ہے۔ امام غزالی، امام رازی، علامہ آمدی اور علامہ شوکانی جیسے حضرات کی یہی رائے ہے۔

جس طرح اجتہاد کے حوالے سے کلی اور جزوی دونوں طرح کے اجتہاد کا وجود ممکن ہے اسی طرح ''تجدید'' کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے یعنی اس اُمت میں کچھ شخصیات تو ایسی گزری ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبے کی تجدید کا کام لیا۔ انہوں نے دینِ متین کے چہرے سے گرد صاف کی۔ اسے بدعات، رسوم اور منکرات سے پاک کیا۔ دنیا پرست جعلی پیروں کی ہفوات اور شکم پرست علمائے سوء کی ایجاد کردہ بدعات کو قرآن وسنت کی حقیقی تعلیمات سے جدا کر کے اُمت کی تمام شعبہ ہائے زندگی میں صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کی۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ رب العزت نے جزوی طور پر تجدیدِ دین کی سعادت سے نوازا اور انہوں نے کسی ایک یا چند شعبوں میں اپنی شاندار کاوشوں کے ذریعے نئی روح پھونکی اور مٹے ہوئے احکام کو زندہ کر کے اُمت کو ایسی نعمت سے روشناس کروایا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن وہ اس سے بے خبر و غافل تھی۔

ہمارے حضرت والا حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دین کے چند شعبوں میں ایسا بے مثال اور ہمہ گیر کام لیا کہ بلا جھجک اسے ''جزوی تجدید'' کہا جاسکتا ہے۔ یہ پورا موضوع تو ایک تحقیقی مقالے کا باب ہے۔ یہاں ہم بطورِ مثال ایک دو چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

صحافت ایسی چیز تھی دینی حلقوں میں جس کا گزر تک نہ تھا۔ تحریکِ ختم نبوت اور تحریکِ سوادِ اعظم کے زمانے میں ڈھونڈ نے سے ایک صحافی ایسا نہ ملتا تھا جو ایک آدھ خبر ہی معاصر اخبارات میں لگوا دے۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار اسلامک صحافی، بھائی جان محمد کے روپ میں دیکھا۔ مولانا جان محمد شہید رحمہ اللہ ہمارے بنوری ٹاؤن کی طالب علمی کے زمانے کے ساتھی تھے۔ ایک دن بندہ دارالافتاء میں بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھا ڈھیلا ڈھالا واسکٹ پہنے، ہاتھ میں مخصوص طرز کا بیگ اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ مرحوم بہت ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے۔ حسِ مزاح بھی وافر مقدار میں پائی تھی۔ ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی تو خوب گپ شپ ہوئی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ ''صحافی'' بن گئے ہیں۔ جیب سے ایک خوب صورت سا کارڈ نکال کر عنایت فرمایا اور بہت ترغیب دی کہ تم بھی

اس لائن میں آ جاؤ۔ یہاں دینی ذہن کے ساتھیوں کی بہت ضرورت ہے۔ بندہ کا حال یہ تھا کہ کبھی خط لکھنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ صرف ایک مرتبہ جب تبلیغی جماعت کے ساتھ چلہ لگانے گئے تو وہاں سے خیر خیریت کی چند سطریں گھر والوں کی پریشانی اور ناراضی کے خوف سے گھسیٹ ماری تھیں ورنہ لکھنے لکھانے سے کوئی واسطہ نہ تھا اور پھر دارالافتاء میں اخبار کا کیا گزر۔ اسے تو ویسے بھی، ''شجرِ ممنوعہ'' سمجھا جاتا تھا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ جب ضربِ مؤمن کا اجرا ہوا تو بھائی جان محمد شہید کے حساب سے تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا وہ تو ''اللہ دے اور بندہ لے'' کے مصداق اپنی محنت اور صلاحیت کا اصل میدان دیکھ کر اس کی ٹیم میں شامل ہوگئے۔ پھر اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران مزار شریف میں گرفتار ہوکر رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ ضربِ مؤمن کے لیے اعزاز ہے کہ اس کے ایک اہم کارکن کو اسلامی صحافت کا پہلا شہید ہونے کا افتخار نصیب ہوا۔ ان کے بعد اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نے غیر ارادی طور پر اس حقیر کو بھی اسلامی صحافت کے اس ''شجرِ سایہ دار'' تلے کچھ وقت گزارنے کا موقع نصیب فرمایا۔ میں اسے اتفاقی واقعہ تو نہ کہوں گا کیونکہ ہر چیز کے پیچھے رب کی تقدیر اور حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ بہر حال یہ ایک دلچسپ داستان ہے کہ ضربِ مؤمن اور لکھنے لکھانے سے ہمارا تعلق کیسے قائم ہوا؟ یہ آپ بیتی ہمارے ذمہ اُدھار ہے۔

الغرض قصہ مختصر! بات ہو رہی تھی کہ مروّجہ صحافت دینی حلقوں میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ دنیائے صحافت کے کچھ بڑے اور معتبر نام اس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر وہ ان کی فطرت میں موجود قدرتی جوہر تھا جس نے انہیں اس مقام تک پہنچایا۔ ماحول کی مطابقت و موافقت یا تربیت و تدریب کا اس میں کوئی دخل نہ تھا بلکہ حال یہ تھا کہ جب علمائے کرام کے لیے یک سالہ صحافت کورس کا اجرا ہوا تو عام تاثر یہ تھا کہ اس نامانوس اور اوپرے مضمون کے لیے فضلائے کرام کس طرح اور کس بنیاد پر داخلہ لیں گے اور اساتذہ تو تھے ہی نہ۔ دور دور تک آثار اچھے نہ تھے...... وہ تو اللہ کا فضل و کرم تھا کہ کام کے لوگ مل گئے اور ماشاء اللہ اس رمضان میں پہلی کھیپ تیار ہوکر میدان عمل میں وارد ہو رہی ہے۔ کچھ تجربات کے پیش نظر آیندہ کے لیے اس کورس میں فاضل ہونے کے ساتھ کم از کم میٹرک پاس ہونا شرط قرار دے دیا گیا ہے۔ آیندہ یہ شرط گریجویشن میں تبدیل ہو جائے گی اور ان شاء اللہ اُمید ہے کہ یہ کورس کامیابی کے منازل تیزی سے طے کرے گا۔ دراصل یہ سب کچھ حضرت والا مفتی رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا فیض ہے کہ ان کے زیر سرپرستی نکلنے والے اخبارات نے اسلامی صحافت کی بنیاد رکھی اور پھر حضرت کی دُعاؤں اور توجہات کی برکت نے انہیں اوجِ کمال تک پہنچایا۔ یہ عجوبۂ روزگار واقعہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے کہ اخبارات سے کوسوں دور رہنے والی شخصیت نے جب مسلمانوں کا درد محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تڑپ اور کڑھن کی لاج رکھتے ہوئے اس محیر العقول کارنامے کو وجود بخشا۔ بلاشبہ یہ انوکھا سلسلہ جزوی تجدید کا شاہکار ہے۔

شہیدِ راہِ وفا

حضرت اقدس حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ امت مسلمہ کی ان معدودے چند ہستیوں میں تھے جو دین اسلام کی حقانیت کی نشانیوں میں سے سمجھی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ظاہری و باطنی علوم، افادہ وافاضہ، عالمانہ وقار و متانت، خلق خدا کے ساتھ شفقت ومحبت میں انبیاء کے سچے جانشینوں اور مقربان بارگاہ الٰہی کا نمونہ بنایا تھا۔ علم وعرفان، اصلاح و ارشاد اور عامۃ الناس کی دینی راہنمائی اور باطنی تربیت کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ان کی ساری عمر اعلیٰ پائے کی علمی خدمات اور سچی وبےلوث درویشی میں گذری۔ خداوند قدوس نے اُن سے بہت سے شعبوں میں قابل قدر بلکہ بعض محاذوں پر بے مثال کام لیا۔ تحفظ ختم نبوت، تردید فرق باطلہ، جدید تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں میں پائے جانے والے شکوک وشبہات اور مغرب سے مرعوب اربابِ دانش کے اُٹھائے گئے سوالات کے بامعنیٰ مسکت اور معیاری علمی جوابات دینے میں تو انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس سلسلے میں ان کی چند کتابیں اور تحریریں اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تحریر جہاں علمیت، معروضی حقائق اور منطقی استدلال کا مرقع تھی، وہاں اعلیٰ پائے کے ادبی اسلوب کا بھی نمونہ تھی۔ ایسا سنجیدہ، متین اور باوقار قلم اردو اسلامی لٹریچر کے ذخیرہ میں خال خال ہی پایا جاتا ہے اور عصر حاضر میں تو اس کی کوئی نظیر ہی نہیں۔

حضرت اقدس رحمہ اللہ کو سب سے پہلے حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ کی مردم شناس نگاہوں نے دریافت کیا۔ بعد ازاں محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے آپ کی صلاحیتوں کو پہچانا اور انہیں ان کے بہترین مصرف پر لگایا۔ یوں ان قدسی صفت اکابر کی صحبت اور دعاؤں کے سائے میں حضرت نے اپنا علمی، قلمی اور روحانی سفر جاری رکھا تا آنکہ ایک وہ وقت بھی آیا جب آپ مرجع خلائق بن گئے۔ لاتعداد عوام وخواص آپ سے شرعی مسائل میں راہنمائی لیتے اور آپ کی اصلاحی مجالس میں شرکت سے اپنے باطن کو مغفرت الٰہی کے انوارات سے مالا مال کرتے۔ جہاں آپ کا قلم سدابہار تھا اور آپ اپنے تلے مستند جوابات اور مخصوص انداز تحریر کی وجہ سے ملک بھر میں بلکہ بیرون ملک میں بھی جہاں جہاں اردو پڑھی اور لکھی جاتی ہے، مشہور ومعروف تھے۔ وہیں آپ کی وعظ وارشاد کی مجالس علماء، طلبہ اور عوام کی دلچسپی کا مرکز اور ان کی روحانی تشنگی کے ازالے کا باعث تھیں۔ آخر سالوں میں تو عوام وخواص کا آپ کی طرف بہت زیادہ رجوع ہوگیا تھا اور مادیت کے ستائے ہوئے عوام اور اصلاح باطن کے متلاشی خواص جوق درجوق آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور بقدر ظرف وطلب سیراب ہوکر لوٹتے تھے۔

حضرت نے بہت سے محاذوں پر بیک وقت کام کیا۔ جو ان کے بعد رہ جانے والوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ آپ اپنی وقیع علمی، تدریسی اور تصنیفی مصروفیات کے ساتھ ساتھ عالمی مجلس تحفظ نبوت کے نائب امیر اور اس عظیم الشان تحریک کے روح رواں تھے۔ اس عنوان سے آپ کی خدمات وتصنیفات ناقابل فراموش ہیں۔ علاوہ ازیں شہر بھر میں بیسیوں قرآنی مکاتب و مدارس آپ کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ آپ بڑے ذوق وشوق سے ان کا افتتاح فرماتے۔ معاینہ کے لیے تشریف لے

جاتے اور بچوں کو حفظ قرآن مکمل کر لینے پر دعاؤں سے نوازتے اور اپنے متعلقین کو اس طرف متوجہ فرماتے۔ ملک کی مایہ ناز دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے آرگن ماہنامہ بینات کے تاعمر مدیر رہے۔ اقرأ اسلامی صفحے میں ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کے نام سے آپ کے جوابات کا کالم تو بے مثال اور عدیم النظیر مقبولیت کا حامل تھا۔ جو استناد، معیار و اسلوب اور مقبولیت عامہ میں اپنی مثال آپ سمجھا جاتا تھا۔ اس کالم میں شائع ہونے والے جوابات کتابی صورت میں کئی جلدوں میں شائع ہو کر عامۃ الناس کی دینی راہنمائی اور افادہ عام کا سبب بن رہے ہیں۔ ختم نبوت کے دفتر میں نشست کے دوران آپ دیگر علمی مشاغل کے ساتھ فارغ التحصیل علماء کو افتاء کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ بہت سے نوجوان فاضل حضرات نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جامعہ بنوری ٹاؤن میں حدیث شریف کا درس بھی دیتے تھے اور یوں آپ نے اس خلا کو پُر کیے رکھا جو آپ کے شیخ حضرت بنوری قدس سرہٗ کی عظیم یادگار جامعہ بنوری ٹاؤن کے اکابر اساتذہ کے انتقال فرما جانے یا شہید ہو جانے سے پیدا ہوا تھا۔

آخر عمر میں آپ نے ایک ایسا تجدیدی کارنامہ انجام دیا جو آپ کی ساری مبارک اور متبرک خدمات کے لیے ''ختام مسک'' کے طور یاد رکھا جائے گا۔ وہ یہ کہ آخر عمر میں آپ نے سرعام کھلے مجمع میں اپنے مریدین و منتسبین کے سامنے بیعت علی الجہاد کی اور یوں اس مبارک سنت کو زندہ فرمایا جو ایک عرصے سے مٹ چکی تھی اور جس کے مٹ جانے کی وجہ سے اللہ کی بہت سی رحمتوں اور برکتوں کا نزول رکا ہوا تھا۔ یہ آپ کے اخلاص، تواضع، غلبہ دین کی تڑپ اور وقت کے تقاضے کو پہچاننے کی دلیل تھی جو خاصانِ بارگاہ الٰہی کی خصوصی صفات ہیں۔ آپ کا یہ تجدیدی کارنامہ آپ کی حسنات میں سرفہرست ہے اور آپ کی تمام خدمات کی عنداللہ قبولیت کی نشانی ہے کہ ربّ العزت نے آپ سے آخر وقت میں یہ عظیم، مبارک اور بابرکت کام لیا۔ پھر آپ امارتِ اسلامی میں نظام اسلام کا مشاہدہ کرنے تشریف لے گئے اور اگلے مورچوں کے خط اوّل پر جا کر مجاہدین کے ساتھ وقت گزارا۔ یہ گویا آپ کے تکمیل حسنات اور رجوع الی اللہ و سیر فی اللہ کی آخری منزل تھی۔ جس کے بعد صرف ربّ العزت کے سامنے حاضری کا مرحلہ رہ جاتا ہے جو آب و تاب اور شان و شوکت سے مکمل ہو گیا۔

حضرت اقدس رحمہ اللہ علمی و عملی جدوجہد سے بھرپور زندگی گزار چکے تھے۔ ربّ العزت نے جہاں انہیں ساری عمر اپنی خاص رحمت کے سائے میں رکھا اور بیش بہا دینی اور روحانی نعمتوں سے نوازا۔ وہیں اس کی قدرت کو یہ بھی منظور ہوا کہ آپ کو وہ اعلیٰ اور لازوال نعمت بھی عطا کرے جو ہر مؤمن کا مقصود مطلوب اور منتہائے کمال و سعادت ہے۔ چنانچہ آپ کی علمی و اصلاحی خدمات کی طرح آپ کی جان کو بھی ربّ العزت نے اپنی بارگاہ میں قبول فرمالیا اور آپ کو خلعت شہادت سے سرفراز کرتے ہوئے وہ نعمت بھی عطا فرمادی جس کے آگے ساری دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

جس طرح یہ سچ ہے کہ شہید کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ جب یہ گرتا ہے تو آسمان سے ہدایت و نصرت اور خیر و فتح کے فیصلے اُترتے ہیں۔ مسلمانوں سے بداعمالیوں کی شامت و نحوست دور ہوتی ہے۔ وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شہید کے پسماندگان اگر اس کے خون سے بے وفائی کریں تو اس کا وبال ان پر آ کر رہتا ہے۔ خون شہید سے بے وفائی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس مقدس خون کی مہکتی سرخی کا پیغام بھول جائے اور اس مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد نہ کرے جس کی خاطر یہ قیمتی خون گرا تھا۔ نہ اس شہادت کی لذت کی تلاش کرے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے صرف خدا اور اس کے دین کا بنا کے چھوڑتی ہے۔ ہم

سب حضرت اقدس قدس سرہٗ کے پسماندگان میں سے ہیں۔ ختم نبوت والے رفقا کا فرض ہے کہ ناپاک قادیانیوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے ان کا تعاقب جاری رکھیں۔ حضرت کے تلامذہ، مریدین، متعلقین اور منتسبین کا فرض ہے کہ ان کے فیوض سے دل کو منور اور دماغ کو روشن کر کے ان کو امت تک پہنچانے کی فکر کریں تاکہ حضرت کا صدقہ جاریہ تاقیامت جاری رہے۔ مجاہدین پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنے دلوں کو خدا کی محبت و تعلق سے پگھلا کر موم کریں اور جسموں کو ریاضت و مشقت سے گزار کر فولاد بنائیں اور حضرت کی ان امیدوں کو پورا کر دکھائیں جو وہ ان سے رکھتے تھے۔

اے پسماندگانِ شہیدِ وفا!

شہید اپنے ربّ کے پاس جنت کے بالاخانوں میں عزت واکرام سے آرام فرما ہو کر منتظر ہیں کہ تم کیسی کارکردگی دکھاتے ہو؟ دیکھنا! ان کو مایوس نہ کرنا۔ جنت ومغفرت کی طلب اور رضا و دیدالٰہی کی تلاش میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا۔ سرخرو ہو کر اپنے پیش رووں سے جاملو گے۔

پیکرِ علم و حلم

یہ آج سے تقریباً پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے، ملک کے ایک مشہور و معروف دینی ادارے میں ایک طالب علم درجۂ تخصص میں داخلہ کے متعلق معلومات کے لیے داخل ہوا۔ پہلے تو اس نے مدرسہ کی مسجد میں جا کر تھوڑی سی نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! اس مدرسہ میں میرے لیے پڑھائی میں خیر ہو تو اسے عافیت کے ساتھ مقدر فرما۔ اس طالب علم نے اس سے قبل شروع سے آخر تک ایک ہی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی نئے مدرسہ میں تعلیم کے لیے جا رہا تھا، اس واسطے نئے ماحول کی وجہ سے سہا ہوا تھا۔ مسجد سے نکلنے کے بعد اس نے سب سے پہلے نظر آنے والے طالب علم سے ناظم صاحب کے بارے میں پوچھا کہ وہ کب اور کہاں ملتے ہیں؟ ''وہ سامنے چلے جائیں'' اس نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اشارے کے تعاقب میں جب نووارد نے نظریں دوڑائیں تو وہاں بجری کے ڈھیر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گول پتھروں کا ڈھیر تھا جو خوبصورتی کے لیے دیوار میں چنے جاتے ہیں یا پھسلن سے بچنے کے لیے فرش میں گاڑے جاتے ہیں۔ پتھروں کے اس ڈھیر پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کچھ لوگ بیٹھے تھے اور نیچے جھکے ہوئے کوئی چیز اکٹھی کر رہے تھے۔ اجنبی طالب علم سمجھا کہ راہنما نے اس کا مطلب نہیں سمجھا یا پھر اس سے مذاق کیا ہے مگر راہنما کے چہرے اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ بظاہر ایسا لگتا نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی اور نووارد کے ساتھ بے تکا مذاق کر رہا ہے۔ ابھی مدرسہ میں باقاعدہ داخلے شروع نہ ہوئے تھے لہٰذا قریب میں بلکہ اس جگہ سے لے کر .... جہاں یہ دونوں کھڑے تھے .... پتھروں کے اس ڈھیر تک کوئی دوسرا طالب علم بھی دکھائی نہ دیتا تھا، جس سے مکرر راہنمائی حاصل کی جائے۔ چار و ناچار یہ اسی طرف چل پڑا۔ قریب پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ چند طلبہ ایک بلند قامت اور باوقار شخص کے گرد بیٹھے ہیں اور اچھے اچھے متناسب گولائی والے پتھر چُن چُن کر تغاری میں ڈال رہے ہیں۔ درمیان میں بیٹھے وجیہہ شخص کی وجہ سے ''سنگ چینی'' کی اس مجلس پر رعب اور وقار کی چھاپ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ اجنبی کو یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ درمیان والا شخص کوئی مقتدر ہستی ہے لیکن اس مجلس میں ان کی موجودگی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مہمان کو قریب کھڑے دیکھ کر انہوں نے ایک طالب علم کو اشارہ کیا کہ اس سے پوچھے کس غرض مطلب سے آیا ہے؟ ''ناظم صاحب سے ملنا ہے۔'' اجنبی نے مدعا بیان کیا۔ اب قبل اس کے کوئی کچھ کہتا انہوں نے دریافت فرمایا: ''ان سے کیا کام ہے؟'''' داخلے کے متعلق معلومات لینی ہیں۔'' طالب علم نے عرض کیا۔ ''داخلے کی معلومات کیا ہوتی ہیں؟ داخلے والے دن آ جانا، مفتی صاحب کو امتحان دے دینا۔'' لو یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ طالب علم حیران تھا کہ اتنے بڑے جامعہ میں اتنی بڑی شخصیت کے پاس داخلے کے لیے تو بہت سی شرائط ہوں گی۔ کیا کیا پاپڑ بیلنے ہوں گے، یہاں تو شفقت اور تواضع کا عالم ہی کچھ اور ہے۔ ناظم صاحب رئیس شعبہ سے بڑھ کر مہربان ہیں اور رئیس شعبہ کی طلبہ پر شفقت تو ہے ہی ضرب المثل۔ اس نے سوچا کہ جس جامعہ کی دو بڑی ہستیاں اتنی اعلیٰ اخلاق کی حامل ہیں وہ جامعہ یقیناً خوش نصیب ہے اور ان کے سائے میں رہنا زندگی کا خوشگوار تجربہ ہو گا۔

داخلے والے دن وہ پوچھتا پاچھتا اس درس گاہ کے سامنے جا پہنچا جہاں رئیس تخصص تشریف رکھتے تھے۔ طالب علم نے یہ تو سن رکھا تھا کہ وہ بلند پایہ علمی مقام اور مطالعہ کی وسعت کے ساتھ انتہائی ملنسار، محبت وشفقت اور تواضع وانکساری کا پیکر ہیں مگر جب ان کو دیکھا تو جو کچھ سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا، پھر ان کی صحبت میں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور ان کی شخصیت کے پرت کھلتے گئے، معلوم ہوتا گیا کہ عالم ربانی کی صفات کیا ہوتی ہیں اور علم جب کسی انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کی شخصیت پیکرِ حلم کیسے بن جاتی ہے؟

اجنبی کی نظر پہلے پہل ان کے چہرے پر پڑی تو ایسا معلوم ہوا شیر اپنی کچھار میں ساری دنیا سے مستغنی وبے نیاز اور رعب، وقار کا پیکر مجسم بنا بیٹھا ہوا ہے.........بس اتنا فرق معلوم ہوتا تھا کہ شیر کو اپنی طاقت کے شدید احساس نے فخر اور غرور میں مبتلا کیا ہوا ہے جبکہ حضرت مفتی صاحب اپنی وجاہت اور حاضرین پر وقار ورعب سے بے خبر نرمی اور دھیمے پن کا مرقع تھے۔ ان کو دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ بڑے لوگ کیسے ہوتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کس طرح کی ظاہری وباطنی خصوصیات سے نوازتا ہے۔ بلند قامت، چوڑا چکلا اور صحت مند جسم، کشادہ پیشانی، چہرے پر خوبصورت اور سینے کو بھرنے والی ڈاڑھی جس نے ہروقت چہرے پر سجی ہلکی سی مسکراہٹ کو اپنے گھنے پن میں چھپایا ہوا تھا۔ جسمانی اعتبار سے جتنے قوی، مزاج کے اعتبار سے اتنے ہی حلیم اور بامروت۔ درس ومطالعہ سے جتنا شغف، جہاد وسیاست اور دینی تحریکوں اور اداروں سے اتنا ہی تعلق۔ ''**بسطة فی العلم والجسم**'' کا جتنا شاندار نمونہ وہ تھے، شاید ہی اس کا کوئی اور مصداق ہو۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ناظم صاحب اور مفتی صاحب دونوں ڈیل ڈول اور قامت وشباہت میں ایک جیسا ہونے کے علاوہ آپس میں گہرے دوست اور ہم نوالہ وہم پیالہ بھی ہیں۔ دونوں علم میں رسوخ اور فہم وبصیرت میں کمال کا حامل ہونے کے باوصف اپنے کمالات کو تواضع اور وضعداری میں چھپائے رکھتے ہیں۔ یا خدا! اس دور میں ابھی ایسے باکمال لوگ پائے جاتے ہیں۔ قارئین سمجھ گئے ہوں کہ مفتی صاحب سے حضرت شامزئی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ مراد ہیں البتہ ان کے دوست ناظم صاحب کو آپ نے نہ پہچانا ہوگا۔ یہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت برکاتہم تھے۔ جو آج کل جامعہ امام ابوحنیفہ مکہ مسجد کراچی کے مہتمم ہیں۔ یہ دونوں دوست اس وقت جامعہ فاروقیہ کے تعلیمی اور انتظامی نظام کا جڑواں ستون تھے اور ان کی باکمال اور باغ وبہار شخصیات طلبہ کے لیے ایسا فرحت بخش اور ٹھنڈا سایہ تھیں کہ آج بھی اس کا تصور کریں تو اس شاندار دور کی یادیں حاصلِ زندگی معلوم ہوتی ہیں۔ بندہ جب حضرت الاستاذ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھائی اور صاحبزادگان سے تعزیت کے لیے حاضر ہوا.........اور تعزیت کیا تھی سب خاموش بیٹھے تھے، ایک لفظ کہنے کا یارا نہ تھا کیونکہ جو خود اپنے آپ کو یتیم محسوس کرے وہ کیسے اور کس پیرائے میں تعزیت کرے.........تو خیال آیا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت برکاتہم سے بھی تعزیت کرنی چاہیے۔ حضرت شہید سے ان کا تعلق سگے بھائیوں سے کم تو نہیں۔

حضرت مفتی صاحب شہید رحمہ اللہ کی ہمہ جہت خدمات اور منفرد طبعی مزاج پر بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا، ایک محقق عالم، بلند پایہ مفتی اور شیخ الحدیث میں جو جو صفات ہوتی ہیں یا ہونی چاہییں وہ تو ان میں تھی ہیں، لیکن بڑا کمال یہ تھا کہ آپ وعظ، سیاست، جہاد، احیائے خلافت اور دینی اداروں، تنظیموں اور جماعتوں کی سرپرستی جیسی غیر نصابی مہمات میں بھی نمایاں تھے۔ علماء حق کی ترجمانی، عوام الناس کو دین اور اہلِ دین سے جوڑنا، مجاہدین کی سرپرستی، ان کی ہر سطح پر حمایت اور ہر طرح کی اعانت، ان

کے باہمی نزاعات نمٹانا اور کام سے جوڑے رکھنا، امارتِ اسلامیہ کی ترقی واستحکام کے لیے شب وروز فکر اور تڑپ اور بساط بھر عملی جدوجہد، دینی وسماجی تقریبات میں شرکت اور منتظمین وحاضرین کی حوصلہ افزائی، حرمین کی زیارت میں متعلقین کے مجمع کے ساتھ روح پرور اسفار، اندرون وبیرون ملک مختلف تقاریب اور اجتماعات میں نمایاں شرکت اور پھر کرامت یہ کہ ان سب سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مسلسل مطالعہ، تحقیقی کاوشیں، فقہی مجالس میں شرکت اور علمی استحضار.......... بالکل آخری دنوں میں جامعہ دارالعلوم کراچی میں منعقدہ فقہی مجالس میں ان کی صحبت اور معیت ہمیشہ یادگار رہے گی.......... الغرض سمجھ نہ آتا تھا کہ دنیا جہاں کے مسلمانوں کا دردوغم اٹھائے یہ ہستی ایسے بلند پایہ علمی کاموں کو مسلسل کیسے جاری رکھے ہوئے ہے۔ حضرت الاستاذ ایسے لوگ اس گئے گزرے دور میں مسلمانوں کے لیے امید کی آخری کرن تھے۔ اس دورِ زوال میں جبکہ مسلمان عقیدۂ توحید اور اتباعِ سنت سے بغاوت کے سبب بداعمالیوں کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں اور نشاۃِ ثانیہ تو چھوڑیے نجات وترقی کی کوئی صورت دور دور تک دکھائی نہیں دیتی.......... امید کی آخری کرن یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ پاک اس نعمت ناشناس قوم کو اپنی خاص رحمت سے بخش دیتا ہے مگر یہ قوم اپنے ہاتھوں ایسے چراغوں کو بجھا کر اپنی ازلی بدبختی کا جو سامان کر رہی ہے، اس کا انجام نہایت ہولناک ہوگا۔ ذرا سوچیے تو سہی جو شہر صلاح الدین صاحب اور حکیم محمد سعید جیسے محبِ وطن لوگوں اور حضرت مولانا حبیب اللہ مختار، استاد جی حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب، الشیخ الاجل حضرت لدھیانوی شہید اور حضرت مفتی شامزئی صاحب رحمہم اللہ جیسے علماء کا خون کر بیٹھے وہ کے روز تک عیش کوشی کرتا رہے گا؟

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا وصف جو حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعد نہیں دیکھا گیا، یہ تھا کہ وہ اپنی اعتدال پسند اور مشفقانہ طبیعت کے سبب تمام دینی سیاسی اور جہادی جماعتوں کے یکساں بزرگ اور سرپرست تھے، تمام دینی حلقوں میں انہیں عزت واحترام اور عقیدت واعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اپنی نیک نیتی اور بے نفسی کے باعث وہ ہر جماعت اور تنظیم کے لیے قابلِ قبول تھے اور اختلاف یا نزاع کے وقت ان کو بطورِ حکم قبول کرنے سے کسی کو انکار نہ تھا۔ خود وہ بھی تمام حلقوں، جماعتوں اور دھڑوں سے رابطے میں رہتے اور ہر ایک کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ صفت بہت نادر ونایاب ہے۔ حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور سنا تھا کہ تمام شعبوں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ تبلیغ میں جانے والے طلبہ کی روانگی کے وقت اجتماعی دعا کروا کر انہیں رخصت کر رہے ہیں، جہاد کا عزم رکھنے والوں کے لیے سامانِ سفر مہیا کر رہے ہیں، کام کے آدمیوں پر نظر رکھ کر مختلف جگہوں پر ان کی تشکیل کر رہے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کے لیے احباب کے نام تعارفی خطوط لکھ کر دے رہے ہیں، نئے نئے اداروں کے قیام میں تعاون اور سرپرستی فرما رہے ہیں، انتخابات کے زمانے میں اہلِ حق کے دونوں بازوؤں کے لیے پوسٹر چھپوا کر بھجوا رہے ہیں اور پھر یہ تو چند ظاہری باتیں ہیں جو ایک حقیر طالب علم کے ناقص مشاہدہ میں آئیں، اللہ جانے قوم کی خدمت کے کتنے عظیم فلاحی کام ایسے ہیں جن کی عالم الغیب کے علاوہ کسی کو خبر ہی نہیں۔

آپ کے بعد حضرت شامزئی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ میں یہ صفت دیکھنے کو ملی اور واقعہ یہ ہے کہ جی بھر کر دیکھنے کو ملی۔ اللہ پاک نے ان میں جمال وکمال ایسا جمع کیا تھا کہ تبلیغ سے جہاد تک اور تدریس وافتاء سے سیاست وقیادت تک کوئی حلقہ آپ کے فیض سے محروم نہ تھا۔ دوسرے مکاتب فکر کے علمائے کرام بھی آپ کے علمی تبحر اور اعتدال وتوازن کے قائل تھے۔ کسی ایک چیز کی

ایسی چھاپ خود پر نہ لگنے دینا جس کے بعد آدمی دوسرے کسی کام کا نہ رہے، بڑے دانشمندانہ کمال اور اولوالعزمی کی بات ہے اور یہ عزم و کمال حضرت شامزئی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ میں اپنے پیش رو کی طرح اعلیٰ درجے کا تھا............لیکن ہماری قسمت کہ دونوں حضرات اس وقت داغِ مفارقت دے گئے جب ان کا شباب روحانی اپنے جوبن پر تھا اور ملک و ملت کو ان کی ضرورت زیادہ............بہت زیادہ تھی۔ انے مادرِ علمی! قحط الرجال کے اس دور میں تیرے بے آسرا سپوت کہاں جائیں؟ اے پروردگار! ہم حرماں نصیبوں سے اتنی بڑی بڑی نعمتیں اتنی جلد کیوں چھن جاتی ہیں؟؟؟

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی جامع کمالات شخصیت سے متعلق یادگار باتوں اور واقعات کے علاوہ نجی یادیں بھی اتنی ہیں کہ ان سب کو قلم بند کیا جائے تو بھی نہ طبیعت سیر ہوگی نہ ان کا حق ادا ہوگا مگر ایک تو ان کی اس عالمِ جوانی میں............ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے ورثہ پر روحانی جوانی چالیس سال کے بعد آتی ہے............فرقت کے صدمہ سے دماغ میں باتوں کا تو ہجوم ہے لیکن دل کے گرد پھندا سا لگا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے خصوصی شمارہ کے لیے آئے ہوئے "مہمان مضامین" کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے۔ اس واسطے اس وقت اسی پر اکتفا ہے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ پر کوئی خصوصی کتاب شائع کی جائے تو یادوں کا ہجوم اس میں سما سکتا ہے۔ حضرت کی محبوبانہ شخصیت کی عقیدت و محبت ایسی چیز نہیں جس کا نقش دل سے مٹ سکے، دوسری طرف ان کا ہم سب کو یتیم چھوڑ جانے کا صدمہ بھی سقوطِ امارتِ اسلامیہ کے بعد امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا سانحہ ہے، سو ان کی یادیں اور ان کی جدائی کا رنج یکساں قلب و دماغ میں پیوست ہے، ان کی یادیں مٹیں گی نہ یہ رنج کم ہوگا اور چونکہ یہ کم ہونے والا نہیں اس لیے ان کا مشن بھی رُکنے والا نہیں۔ قافلۂ حق کی خصوصیت یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی خلعت شہادت سے سرفراز ہوتا ہے، قدرت اس کے لہو کی برکت سے حق کے جھنڈے کو تھامنے والا کوئی دوسرا پیدا کر دیتی ہے۔ سو جدو جہد اور قربانیوں کا یہ مبارک سفر جاری رہے گا اگرچہ اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں پر گراں گزرے۔

مسکراتے چہرے کا پیغام

یہ آج سے تقریباً نو دس سال پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب استفتاء لے کر بندہ کے پاس آئے جس میں ایک امام صاحب کے بارے میں متعدد سوالات کیے گئے تھے۔ یہ روایتی قسم کے سوالات تھے۔ مثلاً: کیا حکم ہے شریعت کا اس امام کے بارے میں جو کمیٹی کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا، جو کمیٹی کے لکھے ہوئے معاہدے پر دستخط نہیں کرتا جبکہ کمیٹی نے ہی اس کی خدمات حاصل کی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سوالات یکطرفہ تھے اور ان میں ایسی کوئی بات بھی نہ تھی جس سے امام کے شرعی منصب کے خلاف کسی امر کا اظہار ہوتا ہو۔ بندہ نے سائل سے عرض کیا کہ ایسے یک طرفہ سوالات کا جواب ہمارے ہاں نہیں دیا جاتا۔ بہتر ہوگا کہ امام صاحب اور کمیٹی کے حضرات دونوں کسی دارالافتا میں چلے جائیں اور اپنا موقف بیان کر کے شرعی حکم معلوم کریں، اسی میں جانبین کے لیے خیر ہے۔

...... ''مگر مفتی صاحب! بات یہ ہے کہ وہ امام صاحب درسِ قرآن دیتے ہیں۔''

...... ''تو اس میں تفکر کی کیا بات ہے؟''

...... ''ان کا درسِ قرآن بہت مقبول ہو گیا ہے اور لوگ دور دور سے اس میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔''

...... ''یہ تو آپ لوگوں کے لیے سعادت کی بات ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کی پریشانی کیا ہے؟''

...... ''پریشانی تو کوئی نہیں، پر بات یہ ہے کہ مقتدی اور عوام سب ان کے ساتھ ہیں۔''

یعنی بات دراصل یہ تھی کہ کمیٹی والے حضرات امام صاحب کے درس کی مقبولیت سے خائف تھے اور جیسا کہ زوال کے اس دور میں ہماری اخلاقیات کو گھن لگ چکا ہے، انہیں یہ تو پسند تھا کہ امام صاحب ان کے تابع مہمل بن کر رہیں، چاہے مسجد میں دین کا کوئی کام ہو رہا ہو یا نہ، لیکن دین کا کام وسیع پیمانے پر ہو اور امام صاحب کی وجیہہ شخصیت کمیٹی کے اثر و رسوخ کے ظاہری تقاضوں کی راہ میں آڑ ہو، یہ انہیں منظور نہ تھا اس لیے امام صاحب کو خواہ مخواہ کے ضابطوں میں باندھنا چاہتے تھے جبکہ امام صاحب اپنے استغنا کے بل بوتے پر ان کے ہاتھ نہ لگتے تھے۔ بندہ نے ان صاحب کو سمجھا بجھا کر رخصت کیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ دنوں بعد بندہ کو ساتھیوں نے بتایا کہ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ایک عالم جو مفتی بھی ہیں اور درس بڑا اچھا دیتے ہیں فلاں مسجد میں تشریف لا رہے ہیں، اگر طبیعت ہو تو ملاقات کے لیے چلے چلیں۔ اب بات یہ ہے کہ بیرون ملک سے فارغ ہو کر آنے والے حضرات سے بندہ کچھ دور ہی رہتا ہے کہ آزاد مزاجی ان کا خاص وصف ہے اور خوب گُل کھلاتا ہے۔ اس واسطے ساتھیوں سے کہا: درس تو ہم ان کا سن لیں گے لیکن کوئی فتویٰ ان کا لکھا ہوا ہو تو دکھاؤ۔ اتفاق سے ایک ساتھی کے پاس ان مفتی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب موجود تھا۔ لے کر دیکھا تو طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ کیا جامع عبارت تھی اور کیا خوبصورت اسلوب کہ لطف آ گیا۔ یہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے بندہ کا دوسرا تعارف تھا۔ (پہلا تعارف سامراجی مزاج کمیٹی کے رکن کی

معرفت ہو چکا تھا) اس کے بعد تو ان سے پکی پکی دوستی ہوگئی جو آہستہ آہستہ عقیدت اور محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔ مفتی صاحب شہید جہاں علمیت کے اعتبار سے راسخ العلم تھے وہاں طبیعت بھی خوب پائی تھی۔ بہت اچھا اور شائستہ مذاق کرتے تھے اور ہمیشہ پتے کی بات کہتے تھے جس سے ان کی محفل میں خوب دل لگتا تھا۔ ان کا نورانی چہرہ اور اس پر ہمہ وقت بکھری دھیمی سی مسکراہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس بندہ کا باطن کورے لٹھے کی طرح صاف شفاف ہے۔ یہ معصومانہ مسکراہٹ مرنے کے بعد بھی ان کے پُروقار چہرے کا نور بن کر چمک رہی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ نرم دل اور نرم خو ہونے کے ساتھ بڑے جرأت مند اور بے باک تھے۔ حق گو تھے اور بات بڑی مدلل کرتے تھے جس کی وجہ سے سننے والا سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا اور ''ملائیت'' کی پھبتی کس کے ان کی بات کو رد کرنا ممکن نہ ہوتا تھا۔

ایک بار ان کے گھر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ درویشی کا حقیقی مفہوم سامنے تھا۔ ان کی بیٹھک میں کتابوں کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر نظر ٹکتی۔ ایک پرانی تپائی جس پر چند کتابیں اور فون دھرا تھا۔ نیچے پلاسٹک کی چٹائی اور باقی اللہ ہی اللہ! پورے گھر میں سامان آرائش کا تو ذکر ہی کیا، کوئی قیمتی چیز بھی شاید ہی ہو۔ ایک طرف ایسا نستعلیق قسم کا نفیس آدمی اور دوسری طرف فقر و غنا سے بھرپور زندگی۔ کمال ہے قدرت والے رب کا اپنے بندوں کو کیسی کیسی صفات سے نوازتا ہے؟ موصوف کے لہجے میں بڑی گھن گرج تھی، بچے تلے لہجے میں بولتے تھے اور بولتے کیا تھے موتی رولتے تھے۔ گزشتہ سے پیوستہ سال بندہ کو معلوم ہوا، وہ ایک جگہ تراویح پڑھاتے اور اس کے بعد ''خلاصۂ قرآن'' بیان کرتے ہیں۔ مفتی صاحب کی عربی لہجے میں تلاوت، پھر شستہ اُردو میں تفسیر، سبحان اللہ! بڑا سماں بندھتا تھا اور جو ایک بار سننے آئے وہ بار بار آتا تھا۔ کئی دن حاضری ہوتی رہی۔ بندہ چپکے سے جاتا اور مفتی صاحب کے باہر آنے سے پہلے سرک جاتا تھا۔ رمضان کی یہ راتیں بڑی پُرلطف تھیں۔ جامعہ بنوریہ میں ہونے والی مشہور زمانہ محفلِ قرأت میں ان کے استقبالیہ خطبے اور بیچ بیچ میں تعارفی بیانات ...... جو اُردو اور عربی دونوں میں ہوتے تھے...... ابھی تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔

مفتی صاحب آدمی بڑے دبنگ قسم کے تھے۔ کسی خوف و خطرے کو خاطر میں نہ لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے علم، وجاہت، جرأت اور قوت استدلال کے ساتھ گفتگو کے سلیقے سے بھی نوازا تھا۔ لگتا ہے کہ انہوں نے ان سب نعمتوں کا شکر ادا کر کے رب تعالیٰ کو ایسا راضی کر لیا کہ ان کو اس دنیا کی آخری نعمت ''شہادت'' بھی عطا کر دی گئی۔ نعمتوں کا جتنا شکر کیا جائے اتنا ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ حافظ، قاری، عالم، مفتی اور شیخ الحدیث کے بعد اب شہادت کا رتبہ ہی وہ چیز رہ گئی تھی جو قدرت کے خزانے سے ان کو عطا ہونی تھی سو خوب شان کے ساتھ عطا ہوئی۔

ایدھی صاحب کہہ رہے تھے: ''ہمارے سرد خانے میں جو میت آتی ہے دو گھنٹے میں ہونٹوں پر پپڑی جم جاتی ہے، مگر یہ عجیب میت ہے کہ 12 گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی گرم خون جاری ہے۔''

یہ خون واقعی گرم تھا کیونکہ اس میں ایمان، توحید اور جہاد کی حرارت تھی۔ مفتی صاحب نے جیسے ہی گاڑی کے سامنے طاغوت کے پینٹ کسے ایجنٹوں کو رکتے اور گن لوڈ کرتے دیکھا، اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ قریب واقع گھر کی خواتین نے بھی سنا۔ یہ ان کی جرأت مند فطرت کا حصہ تھا۔ پھر وہ جلال کے عالم میں کلمہ طیبہ کا با آواز بلند ورد کرتے رہے۔ یہ ان کی ایمانی

خصلت کا مظاہرہ تھا۔

سنا ہے کہ جب دشمن کسی علاقے پر چڑھائی کرتا ہے تو پہلے ان لوگوں کو راستے سے ہٹاتا ہے جو اس کو راستہ نہ دیتے ہوں پھر بقیہ قوم سے خود بخود وہ راستہ بھول جاتا ہے، جس پر اس کو چلنا چاہیے۔ حضرت لدھیانوی شہید رحمہ اللہ سے لے کر جناب شامزئی شہید، جناب جمیل خان صاحب اور اب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب...... اللہ تعالیٰ ان سب کو اعلیٰ علیین میں اپنے خصوصی قرب سے نوازے...... شہادت کی لڑی بتارہی ہے کہ طاغوت کی پیش قدمی مسلسل جاری ہے۔

مفتی صاحب کی شہادت کے بعد دشمن کے پوائنٹس کا گراف بہت اوپر چلا گیا ہے لیکن جو لوگ فلسفہ شہادت کو سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جب پردۂ غیب سے وہ کچھ ظہور میں آتا ہے جس کی کسی کو بھی توقع نہیں ہوتی۔ مفتی صاحب شہید کا مطمئن اور مسرور چہرہ یہی کچھ کہتا لگ رہا تھا۔ آگے کی باتیں عالم الغیب ہی جانے۔

سید بادشاہ کی رخصتی

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو بندہ نے پہلی بار آج سے تقریباً ربع صدی قبل دیکھا۔ معہد الخلیل الاسلامی بہادر آباد کراچی میں، جو پاک و ہند کے سر برآوردہ علما و مشائخ کا میزبان و مسکن رہا ہے، محفل برپا تھی۔ معہد کے رئیس حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ اور میرے محترم استاذ حضرت مولانا یحییٰ مدنی صاحب دامت برکاتہم (بندہ نے جامعہ بنوری ٹاؤن میں حضرت سے نور الایضاح اور قدوری پڑھی تھی) کی صاحبزادی صاحبہ کا نکاح مسنون ہمارے محترم دوست اور بھائی جناب حافظ شاہد صاحب کے ساتھ ہو رہا تھا۔ مجلس میں حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہ کے صاحبزادے حضرت مولانا طلحہ صاحب، داماد حضرت مولانا سلیمان صاحب، حضرت پیر عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی، استاذ محترم حضرت مفتی شاہد صاحب، ان کے بھائی حضرت مولانا زبیر صاحب (مرحوم عالم شباب میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے) اور بہت سے علماء و مشائخ اور طلبہ و مسترشدین حاضر تھے۔ اہل اللہ کی چونکہ عادت ہے کہ محفل کا عنوان اور موضوع کیسا ہی ہو، محبوب حقیقی کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور چھیڑتے ہیں کہ حاضرین کے قلوب کا تصفیہ تزکیہ کا اہتمام ہو سکے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ان کا عامۃ المسلمین پر بہت بڑا احسان ہے۔ چنانچہ حسبِ معمول نکاح سے پہلے محفلِ ذکر کا اہتمام ہوا۔ بیانات ہوئے، نظمیں پڑھی گئیں۔ محفل کا نکتۂ عروج وہ موقع تھا جب حضرت مولانا زبیر صاحب رحمہ اللہ کے متوسلین میں سے ہمارے کسی بھائی نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وہ مشہور زمانہ نظم خوبصورت اور پُرسوز آواز میں پڑھی جو حضرت نے گنگوہ میں امام ربانی، قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مرقد مبارک پر حاضری کے وقت پڑھی تھی۔ سبحان اللہ! کیا سماں بندھا؟ سچ تو یہ ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا۔ یہ محفل زندگی کی یادگار محفلوں میں سے ایک ہے جو کبھی بھلائی نہ جاسکے گی۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ خود تشریف فرما تھے۔ اہلِ دل کا مجمع، حاضرین کی توجہ اور وارفتگی، پڑھنے والے کی پُرسوز آواز...... آسمان تا زمین نور کی چادر سی تنی ہوئی اور انوارات برستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

بندہ اس وقت طالب علم تھا۔ حضرت کے بلند روحانی مقام اور آپ کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں سے کیسے آگاہی ہوتی؟ پیروں، فقیروں کی مجلس میں سید بادشاہ کی زیارت ہوئی تو ان کی زندگی کے اس رخ سے بھی واقفیت ہوئی۔ ورنہ اس سے قبل حضرت شاہ صاحب سے شاہِ خطاطین اور قلم کے بے تاج بادشاہ کے طور پر غائبانہ تعارف تھا۔ غائبانہ اس طرح کہ زمانہ طالب علمی میں کتابیں خریدنے کی استطاعت تو ہوتی نہ تھی۔ کتابوں کی دکان میں گھس جاتے اور حضرت شاہ صاحب کے شاہانہ اور نفیس خط سے لکھے ہوئے سرورق دیکھ دیکھ کر آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کی تسکین کا سامان کرتے۔ حضرت کے تخلیق کردہ شاہکار دیکھ کر بے پناہ لطف آتا تھا۔ کتاب سے زیادہ سرورق دیکھنے سے تسکین ملتی تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ حضرت کا فن تو جو کچھ تھا، وہ تو تھا ہی کہ مسلمہ طور پر صاحبِ طرز خطاط اور امام الخطاطین تھے لیکن ان کے خط میں جو اتنی غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی اس میں ان کی قلبی توجہات اور روحانی برکات کا پرتو بھی رہا ہے۔

اس کے بعد حضرت سے غائبانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ اس طرح کہ بندہ نے استاذ محمد یامین خان مرصع رقم دہلوی سے دہلوی خط جیسا تیسا سیکھا تھا۔ لاہوری نستعلیق کے شوق میں مولانا عبدالستار واحدی صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ آپ دفتر ختم نبوت پرانی نمائش میں بیٹھتے تھے اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگردِ نفیس تھے۔ اب حضرت شاہ صاحب کے شاگرد ہوں، خطاطی کا سبق ہو اور پھر جنابِ شاہ کا تذکرہ نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟ چنانچہ لطف لے لے کر حضرت کے اور ان کے فن کی باتیں ہوتی تھیں۔ ان کی محفلوں اور شانِ سیادت و اندازِ استاذی پر گفتگو ہوتی۔ پھر عرصہ دراز گزر گیا۔ اس سلسلے میں انقطاع آ گیا۔ یہاں تک کہ "ضربِ مؤمن" کا دور شروع ہوا۔ تب حضرت سے غائبانہ ملاقات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ جب ضربِ مؤمن کی کسی خصوصی اشاعت یا کسی کتاب کی طباعت کا موقع ہوتا تو حضرت کے دست مبارک کے لکھے ہوئے کتبے اور طغرے قارئین کے لیے لاجواب تحفہ ہوا کرتے تھے۔ اس غرض سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خطاطی کی کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ ان میں سے حضرت شاہ صاحب کا خط یہ عاجز دور سے پہچان لیتا تھا اور اس کے ذریعے ضربِ مؤمن کی خوبصورتی اور شان و شوکت میں اضافے کا کام لیا جاتا تھا۔

حضرت سے آخری بالمشافہ اور تفصیلی ملاقات تقریباً دو سال قبل ہوئی۔ جب جامعۃ الرشید کے "دورۂ قضا و تحکیم" کے سلسلہ میں ملک بھر کے علماء و مشائخ اور مفتیانِ کرام کی خدمت میں حاضری کے لیے پاکستان بھر کا سفر بذریعہ سڑک ہوا۔ بندہ اس سفر میں ایک معرکۃ الآرا تقریری مقابلے کے ذریعے عالمی شہرت پانے والے نوجوان عالمِ دین مولانا سید عدنان کاکاخیل کے ہمراہ تھا۔ موصوف اپنی دیگر گوناگوں حیرت انگیز صلاحیتوں کے علاوہ یہ کمال رکھتے ہیں کہ انہیں عصر حاضر کے "اسمائے رجال" کا زبردست علم ہے۔ ملک کے علما و مشائخ، مدارس و خانقاہیں، کتابیں اور کتب خانے، شخصیات و آثار کا جتنا استحضار ان کے پاس دیکھا، اس کی مثال کم ہی ہو گی۔ اس حوالے سے ان کی یادداشت حیرت انگیز اور غیر معمولی ہے۔ قریہ قریہ، بستی بستی، گھومتے گھومتے اور سید عدنان صاحب کی معلومات سے استفادہ کرتے لاہور پہنچے تو سید بادشاہ کی خانقاہ پر حاضری دی۔ سبحان اللہ! خانقاہ کے ماحول اور کیفیات واثرات کی تصویر کشی تو کوئی صاحبِ دل ہی کر سکتا ہے۔ یہ عاجز تو اتنا عرض کرے گا کہ خانقاہ کے صحن میں رکھے مٹکے اور ساتھ دھرے کٹورے سے پانی پی کر اتنا سکون ملا کہ روح سرشار ہو گئی۔ اس سے آگے کی باتیں ہم کور چشم اور دل کے اندھے کیا بیان کریں؟ حضرت سید بادشاہ رحمہ اللہ نے انتہائی محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا۔ سید بادشاہوں کی شاہانہ سخاوت کا فطری اظہار کرتے ہوئے اپنی تصنیفات مرحمت فرمائیں جو بوقتِ تحریر سامنے پھیلی ہوئی اور حضرت کی یادوں کی معطر خوشبو بکھیر رہی ہیں۔

بندہ نے جب حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے سفر جہاد و اقامتِ امارت شرعیہ کے آثار کی تحقیق کے لیے تقریباً پانچ سال قبل سرحد اور سرزمینِ ہزارہ کا سفر کیا تھا تو اس دوران معلوم ہوا کہ اس وقت پورے پاک و ہند میں ان آثار کا جو علم حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس ہے، کسی کے پاس نہیں۔ اس وقت سے حضرت کی زیارت کا شوق تھا۔ حضرت کے دربار پر حاضری دی تو خانقاہ کا نام 'خانقاہِ سید احمد شہید' پڑھ کر ہی اندازہ ہوا کہ حضرت شاہ صاحب کس فکر کے وارث اور امین ہیں اور انہیں اپنے اکابر سے کس قدر محبت اور ان کے طرزِ فکر کو اوڑھنے کے بعد اسے عام کرنے کی کتنی تڑپ ہے؟ خانقاہ میں داخل ہوئے تو واہ میرے مولا! جو کچھ کتابوں میں پڑھا تھا، آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ طریقت و شریعت، علم و جہاد کا ایسا حسین امتزاج اللہ رب العالمین نے اس روئے زمین پر ہمارے اکابر کو ہی بخشا ہے۔ دنیا والو! وراثت نبوی کی جامعیت کا یہ حسن کہیں اور نہ ملے گا۔ یہ چیز فقط ہمارے بزرگوں کے قدموں میں بیٹھنے سے ہی مل

سکتی ہے۔ حضرت نے اپنی کتاب ''سید احمد شہید رحمہ اللہ سے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے روحانی رشتے'' عطا فرمائی اور بہت سے نادر تاریخی مقامات و آثار کا تذکرہ کیا۔ ان میں سے ایک جگہ مردان میں ''ہوتی'' کے قریب ''مایار'' نامی مقام پر کھلبانی نہر کے کنارے شاہ عبدالرحیم ولایتی شہید رحمہ اللہ کی جائے شہادت اور آخری آرام گاہ بھی تھی۔ آپ کے مقام کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تمام دیوبندیوں کے سید الطائفہ اور سرخیلِ ملت جناب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ کے دادا پیر تھے لیکن ایک عام مجاہد کی طرح سید بادشاہ کے لشکر میں خدمات انجام دیتے تھے۔ مایار کی جنگ میں جب دشمن کے حملے کا زور ہوا تو اپنے شیخ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی محبت میں بے تاب ہو کر ساتھی مجاہدین سے کہا: ''بھائیو! جب سید صاحب نہ رہیں گے تو زندگی کا کیا مزہ؟'' یہ کہہ کر یہ شیخِ وقت دشمن کے جمگھٹے میں گھس گئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اب چھ شہید ساتھیوں کے ہمراہ ''گنج شہیداں'' (ایک ہی قبر میں) آرام فرما ہیں۔ حضرت نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک مرید مولانا سید زبیر حسین شاہ صاحب جو بندہ کے ہم سبق ہیں، نے اپنے شیخ کی ہدایت پر شیخ الشیوخ شاہ عبدالرحیم ولایتی رحمہ اللہ کی آرام گاہ کی تلاش کے لیے سفر کیا تھا۔ بندہ نے وہ دلچسپ سفر نامہ پڑھا تھا۔ حضرت کے سامنے تذکرہ ہوا تو پھر معلومات کا جو دریا بہا تو رکنے میں نہ آتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سید بادشاہوں کے قافلے کی اس ہمہ جہت شخصیت کی وفات سے جہاں دنیا شیخ کامل سے محروم ہوگئی، وہیں وہ شخصیت بھی اب نہیں رہی جو بجا طور پر ان حضرات کی نسبت کی وارث ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج و مذاق کا مکمل نمونہ اور ان کے تاریخ و آثار کی عارف و شاہد تھی۔

حضرت کی راہنمائی کے بعد اسی سفر میں مایار کے ''گنج شہیداں'' پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت نفیس شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف سے لگایا ہوا کتبہ دیکھا۔ آج جب حضرت کی عطا کردہ کتابیں سامنے کھلی ہیں، وہ کتبہ بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور حضرت کے اس سلسلۂ طریقت و جہاد کا سچا وارث ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ حضرت نے مذکورہ بالا کتاب (سید احمد شہید سے حاجی امداد اللہ مکی کے روحانی رشتے) دیکھ کر دیوبندیت پر یہ احسان عظیم کیا ہے کہ اسے اپنے قابلِ فخر روحانی نسب اور عظیم المرتبت آبا و اجداد اور ان کے مزاج و مذاق سے آگاہ کیا۔ اسی کتاب میں انہوں نے علمائے دیوبند اور ان کی علمی، اصلاحی اور جہادی تحریک کے وہ مخفی گوشے آشکارا کیے جنہیں زمانے کی گرد نے دھندلا دیا تھا۔

اے اللہ! اے عظیم پروردگار! قافلۂ سادات کے اس عظیم سپوت کو اپنے جوارِ رحمت میں قرب خاص عطا فرما اور ان کے پسماندگان کو توفیق دے کہ ان عظیم ہستیوں کے قائم کیے ہوئے شریعت و طریقت کی جامعیت پر مبنی سلسلے کو استقامت کے ساتھ جاری و ساری رکھیں تاکہ علم و جہاد کے علمبرداروں کا یہ قافلہ آخر زمان میں ظاہر ہونے والے سید بادشاہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کرۂ ارض پر دین حق کے غلبۂ کلی کا ظہور تیری منشا و مرضی کے مطابق کر سکے۔ آمین۔

استاد جی کی باتیں

ہمارے ایک استاد جی ان شخصیات میں سے تھے جو ہر دور میں نادر و نایاب رہی ہیں اور میں جس چیز پر اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر ادا کرتا رہتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھے ان جیسے برگزیدہ اللہ والے کی صحبت بلکہ طویل رفاقت اور خدمت گزاری نصیب ہوئی۔ یوں تو ان کی ساری شخصیت ہی عجیب وغریب تھی لیکن فقیری میں شاہی، دنیا کے بیچ میں رہتے ہوئے اس سے مکمل استغناء، اللہ کے دین کی خدمت کے لیے جفاکشی، امراو اغنیا کے ساتھ رہتے ہوئے بھی عیش کوشی سے کوسوں دور، حق گوئی و بے باکی میں اسلاف کی تصویر.......... یہ ان کی شخصیت کے ممتاز ترین اوصاف تھے۔ ان میں ایک بڑا کمال یہ بھی تھا کہ وہ بیک وقت جلال و جمال کا حسین مرقع تھے۔ طلبہ اور خدام کے ساتھ لطیف مذاق اور دلجوئی کے وقت وہ شفقت و محبت آمیز ذہانت و ظرافت کا پیکر ہوتے لیکن جہاں کسی بے اصولی کی بنا پر انہیں غصہ آتا.......... اور ایسا کم ہی ہوتا تھا.......... تو اچھے اچھوں کی مجال نہ ہوتی کہ ان کے سامنے لب ہلاسکیں۔ چونکہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا تھا اس لیے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں، رسوم اور بدعات کے خلاف بلا جھجک بولتے بلکہ اس معاملہ میں وہ ننگی تلوار تھے۔ قدرت نے انہیں حق گوئی کا کامل سلیقہ عطا فرمایا تھا اور زبان میں ایسی تاثیر رکھی تھی کہ جو چیز ہمیں بھی ناممکن معلوم ہوتی تھی اور ہم ڈرتے ڈرتے ان سے کہنا چاہتے تھے کہ ایسا ممکن نہیں ہے لہٰذا اس پر اصرار نہ کریں، سننے والوں کو وہ اس کا بھی قائل کر چھوڑتے تھے اور سچائی کے اظہار سے کبھی نہ گھبراتے تھے۔ ان کی سادہ لیکن پُر مغز باتوں کے سامنے ہم نے کئی سنگ دل موم ہوتے دیکھے۔ ایک اور بڑی صفت ان میں یہ دیکھی کہ ان کے آس پاس رہنے والا ان کی سحر انگیز شخصیت کے زیر اثر آجاتا تھا اور پھر جلد ہی ان کے سانچے میں ڈھل کر شریعت و سنت کو اپنا لیتا تھا۔ ان کی باتیں تو بہت ہیں، میں ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتا ہوں تاکہ آخر میں جو اصل بات کہنی ہے اس کی تمہید بن سکے۔

جیسا کہ عرض کیا ان میں زہد و استغنا اور دنیا سے بے رغبتی اس قدر تھی کہ اگر ہم نے خود اپنی آنکھوں سے ان کا یہ وصف دیکھا نہ ہوتا تو یقین نہ آتا کہ اس دور میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کا گھر سادہ سا تھا مگر وہ اس پر اللہ تعالیٰ کے اتنے شکر گزار تھے جیسے وہ کوئی عالی شان بنگلہ یا سپر لگژری فلیٹ ہے۔ کھانے کا بھی یہی حال تھا۔ مانا کہ وہ انتہائی لذیذ ہوتا تھا لیکن ہوتا بہت سادہ تھا۔ کبھی تو سبزی کے شوربے میں روٹی توڑ کر ثرید بنائی جاتی لیکن وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اس والہانہ انداز میں اور اتنے شوق سے اور مزے لے لے کر کرتے کہ جس نے کھایا نہ ہو وہ سمجھتا کہ قورمہ متنجن کی بات ہو رہی ہے۔ جفاکش بہت تھے، مسجد سے گھر تک کافی فاصلہ تھا لیکن کبھی کبھی کرائے کے پیسے نہ ہونے کے سبب پیدل آتے جاتے اور اس میں شکر گزاری کا یہ پہلو نکال لیتے کہ پیدل ذکر و تلاوت کا جو مزہ ہے وہ سواری پر کہاں؟ ان کی سفری ''دولت'' کا خزانچی میں تھا۔ جب گھر کے لیے نکلنے لگتے تو مخصوص انداز میں پوچھتے: ''ہاں بھئی شاہ صاحب! اجازت ہے؟ اگر خرچہ باقی ہوتا تو میں دو روپے پیش کر دیتا۔ ایک روپیہ جانے

کا اور ایک آنے کا.......... ورنہ وہ دوسری مرتبہ نظر ڈالے بغیر جیب سے تسبیح نکالتے اور اللہ کا نام لے کر پیدل ہی روانہ ہوجاتے۔ چونکہ اعلیٰ درجے کے خطاط تھے اس لیے رات کو جاگ کر اگلے دن خوبصورت طغرہ لکھ لاتے اور ہمارے ہاتھ محلّہ کی ایک دکان میں رکھوا دیتے۔ دکاندار انہیں ان کے عوض جو پیش کرتا وہ اتنا ہوتا کہ اگلے دنوں میں پھر سے اپنی مرضی کی چائے جی بھر کر پی سکنے کے قابل خرچ اکٹھا ہوجاتا۔ خطاطی کو مستقل ذریعہ معاش نہ بناتے کہ پھر درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ رہ جانے کا اندیشہ تھا۔ رمضان المبارک میں خصوصاً اعتکاف کے دنوں میں محلّہ والے قسما قسم چیزیں لاتے اور بندہ کو یقین ہے کہ اگر استاد جی ان میں سے کسی کی کوئی چیز قبول فرمالیتے تو وہ اسے اپنی خوش قسمتی اور ان کا احسان سمجھتا لیکن استاد جی تو کیا ان کے شاگرد بھی آنکھ اٹھا کر ان رنگا رنگ چیزوں کی طرف نہ دیکھتے۔ حضرت الاستاد نے ''غیرت'' کا سبق جو پکا کرا رکھا تھا۔ چونکہ ان کا گھر دور تھا اس لیے مسجد کے محلّہ والے ان کو نہایت خوش حال سمجھتے تھے کیونکہ وہ چائے نہایت اعلیٰ قسم کی بناتے اور سخاوت سے پلاتے تھے۔ شاید ہی محلّہ کا کوئی متمول شخص ایسا ہوگا جو ان کی مخصوص طرز کی پیالیوں میں معیاری اور نفیس چائے سے لطف اندوز نہ ہوا ہو۔ ان کی اکثر آمدنی چائے سے شروع ہوکر چائے پر ختم ہوجاتی تھی اور ان کی تنگدستی پر ایسا دبیز پردہ ڈالے رکھتی تھی کہ اس کی خبر ہم دو خادموں کے علاوہ کسی کو نہ تھی۔

استاد جی کا خارجی مطالعہ بہت تھا۔ ان کے پاس قسما قسم کتابیں تھیں، جب بھی کوئی نئی کتاب لاتے کئی دنوں تک سرہانے رکھی رہتی اور جب تک اسے چاٹ کر ہضم نہ کرلیتے الماری میں نہ رکھتے۔ دنیا میں ان کے دو ہی شوق تھے: کتابیں پڑھنا اور اعلیٰ قسم کی چائے پینا۔ میں نے محلے کے اچھے اچھے جغادری قسم کے تعلیم یافتہ وکلا اور افسر صاحبان کو دیکھا کہ استاد کی معلوماتِ عامہ اور ان پر قرآن و حدیث کی روشنی میں کیے گئے تبصرے بُت بنے سُن رہے ہیں اور اس قدر مبہوت ہیں کہ لفظ منہ سے نہیں نکلتا۔ کسی اچھی کتاب پر نظر پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں مخصوص قسم کی چمک آجاتی تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر کوئی روحانی طاقت کروٹ لے کر بیدار ہورہی ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے جابجا نشانات لگاتے اور تبصرہ یا تصحیح درج کرتے جاتے تھے۔

استاد جی کو حرام کمائی سے نہایت نفرت تھی۔ وہ اس بارے میں حد درجہ کی احتیاط کرتے تھے کہ کہیں کوئی مشکوک لقمہ ان کی اولاد یا شاگردوں کے منہ میں نہ چلا جائے۔ ایک صاحب ان کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ استاد جی کی ہدایت تھی کہ کسی طرح ان کو جلد چائے پلوا کر رخصت کیا کرو۔ مجھے اس شخص سے ایسی بُو آتی ہے جیسے گٹر اُبل رہا ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف انشورنس کمپنی میں ملازم ہیں اور لوگوں کو پالیسی خریدنے کے لیے مائل کرنے کے واسطے اُلٹے سیدھے عملیات بھی کرتے رہتے ہیں۔ حرام کھانے اور کھلانے والوں سے بھی ان کو سخت بیزاری اور نفرت تھی۔ ایسے شخص کو قریب نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ کبھی کبھار وہ نماز کے لیے صفیں سیدھی کراتے ہوئے پکارتے: ''سوّوا صفوفكم يا أعداء الله!: اے اللہ کے دشمنو! صفیں سیدھی کرلو۔'' استووا اقبحكم الله ''سیدھے سیدھے ہوجاؤ، اللہ کی تم پر مار ہو۔'' ہمیں بہت تعجب ہوتا کہ یہ کس کو ایسا کہہ رہے ہیں۔ فرماتے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دن بھر حرام کماتے اور کھاتے ہیں اور پھر یہاں میرے پیچھے کھڑے ہوکر اللہ سے بندگی کا عہد باندھتے اور دعاؤں پر آمین کہتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر دین کا دشمن اور کون ہوگا جو غیر مسلموں کے سامنے بھی ایسی حرکتیں کرتے نہیں شرماتے۔ انہوں نے اسلام اور اہل اسلام کو رسوا کر رکھا ہے، ان میں سے کچھ وکلا ہیں جو سارا دن عدالتوں میں غیر شرعی نظام کے مطابق فیصلے کرتے

اور اس کے مطابق دلائل دیتے ہیں پھر یہاں آ کر ہم سے تعویذ مانگتے ہیں کہ پریکٹس خوب چلے۔ کچھ بیوروکریٹ ہیں جو سارا دن اس ملک کی جڑیں کھودتے اور اپنی تجوریاں بھرتے ہیں اور شام کو بیٹھ کر ملک کی بدحالی پر دلسوزی کے ساتھ تبصرے کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ کا دشمن اور مستحق لعنت نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ ایک مرتبہ محلّہ کے کنارے میدان میں سرکس لگا تو جب تک محلّہ والوں نے اسے ختم نہ کروایا، حضرت یہی الفاظ ہر نماز میں کہتے رہے۔ اور اب آخر میں وہ بات جس کے لیے بندہ نے ان کا تذکرہ چھیڑا ہے۔

چونکہ میں نے عرض کیا ہے حق گوئی اور بیبا کی میں وہ نسبتِ موسوی کے حامل معلوم ہوتے تھے۔ اس واسطے جس بات کو حق، درست اور عامۃ المسلمین کے لیے فائدہ مند سمجھتے اس کے بیان سے کبھی جھجکتے نہ تھے۔ ایک مرتبہ ان کو محلے کی کسی خاتون نے اپنا دکھڑا لکھ کر بھیجا کہ اس کے سر کے بالوں میں چاندی کے تار دکھائی دینے لگے ہیں لیکن گھر والے جاہلانہ شرائط کی وجہ سے اس کا رشتہ نہیں دیتے۔ حضرت الاستاد پر اس کا بہت اثر ہوا۔ آپ نے نہ صرف زوردار بیان فرمایا بلکہ محلے کے بڑوں کو جمع کر کے خط کا حوالہ دیے بغیر ان کی خوب خبر لی اور رشتوں میں تاخیر پر وعیدیں سنائیں اور اس کے بُرے اثرات سے آگاہ کیا۔ ان دنوں میں آپ نماز سے قبل صفیں درست کرواتے وقت وہی جملے کہتے جن کا پہلے تذکرہ آ چکا ہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک خط نما مضمون لکھا اور اسے تمام لوگوں کو بھیجا۔ اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ تم لوگ لڑکیوں کو وراثت نہیں دیتے نہ بروقت ان کے رشتے کراتے ہو۔ یہ دو ظلم جاہلیت کے زمانے کی یادگار ہیں۔ میں بحیثیت روحانی والد تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنی بچیوں کے رشتے جلد کرواؤ اور ان کو ان کا شرعی حق وراثت دینے کی وصیت کرو۔ ایک وصیت نامہ بھی اس مضمون کا تیار کروایا جو لوگ ان کے پاس سے لے جاتے اور دستخط وغیرہ کر کے اپنی دستاویزات میں رکھوا دیتے۔ استاد خود کبھی شادیوں میں نہ جایا کرتے تھے۔ ان شادیوں کی جو آپ کی ترغیب سے ہوئیں، مسجد میں نکاح کی اجتماعی تقریب اپنے پلّے سے منعقد کی اور حاضرین کو چھوہاروں کے ساتھ اپنی مشہورِ زمانہ چائے سے تواضع کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی جرأت اور سلیقے کی وجہ سے معاشرے کے اس گھمبیر مسئلے کو حل کرنے میں ان کے حلقے کی حد تک بہت مدد ملی اور رسوم و رواج کے ہاتھوں ستائی ہوئی بہت سی بچیوں کی اس عذاب سے گلوخلاصی ہوئی جو ناسمجھی میں ان کے سرپرستوں نے ان پر مسلط کر رکھا تھا۔

پچھلے دنوں جب ''ضربِ مؤمن'' میں کچھ بچیوں کے اس طرح کے خطوط شائع ہوئے تو مجھے استاد جی کی یاد آئی۔ کاش! آج وہ ہوتے یا ان کے بیانات ضبط کیے گئے ہوتے تو ان بچیوں کے دکھ کے مداوا میں بہت تاثیر دکھاتے۔ پچھلے شمارے میں مدرسۃ البنات میں زیرِ تعلیم ایک بچی کے خط سمیت اس طرح کے دیگر خطوط اس بے بس مخلوق کی آوازیں ہیں جن پر اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے معاملات سے پہلے توجہ دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کو بھی اس مسئلے کو اہمیت کے ساتھ لینا چاہیے۔ رسوم و رواج سے پاک، فضول اخراجات اور تکلفات کے بغیر مسنون شادی کا ایسا باوقار ماڈل یا پیکج پیش کرنا چاہیے جس کو اپنانے میں سب فخر محسوس کریں۔ یہ اجتماعی شادیوں کی تقریب کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کوئی شادی ہال یا تنظیم والے بھی ایسا پیکج متعارف کروا سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں کراچی میں ایک فرقہ کے سربراہ نے 400 جوڑوں کو نکاح کے بندھن میں باندھا۔ معلوم نہیں کہ اس کی تفصیل کیا تھی یعنی اس تقریب کے بعد بقیہ تقریبات ہوئیں یا نہ؟ لیکن اس تفصیل کے معلوم

ہونے پر کوئی بات موقوف بھی نہیں۔ شادی کے موقع پر مسنون تقریبات دو ہی ہیں۔ ایک محفلِ نکاح جو جامع مسجد میں ہونی چاہیے اور دوسری ولیمہ جو مختصر اور نام و نمود سے پاک ہونا چاہیے۔ بس ان دو تقاریب کے لیے ہمیں ایک پُر وقار طریقہ وضع کر کے متعارف کروانا ہوگا اور لوگوں کا ذہن بنانا ہوگا کہ اگر کسی کو نکاح کی تقریب میں نہ بلایا جائے تو اس پر ناراض نہ ہونا چاہیے کیونکہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہوئے تھے نہ اسے محسوس کیا تھا۔ ائمہ مساجد اس سلسلے میں دلچسپی لیں تو اپنے محلے، برادری، علاقے کو ایک بڑی مشکل سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ دینی فلاحی اداروں کا دائرہ کار اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، انہیں بھی اس اہم موضوع سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ استاد جی کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل کرے جن کے قدموں میں بیٹھنے سے یہ چند سطریں لکھنے کی توفیق ملی۔ آج کے زمانے کو ایسے ہی حق گو، نبض شناس اور سلیقہ شعار علمائے کرام کی ضرورت ہے۔

بے ریاست بادشاہ

پیرس کے نواح میں ایگلی مونٹ کے مقام پر جنگلات اور باغات میں گھری ہوئی ایک محل نما شاندار عمارت ہے۔ اس میں نجانے کتنے ہی خوبصورت کمرے، عالیشان خواب گاہیں، آراستہ و پیراستہ مہمان خانے، طویل و عریض راہداریاں، کئی قسم کے پھولوں والے باغیچے، سرسبز گھاس کے قطعے، غسل کے تالاب، گھوڑوں کے لیے اصطبل اور ریس کورس، آنکھوں کو خیرہ کردینے والا مہنگا ترین سامان آرائش اور جدید دور کی ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس میں داخل ہوں تو مرکزی گزرگاہ کے وسط میں ایک نقشہ آویزاں ہے۔ اس کا خوشنما فریم ہر آنے جانے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتا ہے۔ اس نقشے پر سُنہری رنگ میں یہ الفاظ کندہ ہیں: ''دی میپ آف ہز ہائی نس آغا خان رائل اسٹیٹ۔'' یہ نقشہ صدیوں قدیم ایک خفیہ منصوبے اور ایک دیرینہ حسرت اور دل فگار آرزو کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ اسماعیلی ریاست کے قیام کی اس دیرینہ تمنا کا ترجمان ہے جو صدیوں سے نسلاً بعد نسل ایک باطنی گروہ کے دل میں مچلتی آرہی ہے۔ ''باطنی گروہ'' کیا ہوتا ہے؟ اور مغرب کے دل پیرس کے اس مکین کے مشرق میں ریاست بسانے کی آرزو نے کیوں تڑپا رکھا ہے؟ ایک شخص عجمی النسل ہے اس کے آباؤ اجداد یورپ کی عیسائی اور یہودی عورتوں سے رشتے کرتے رہے۔ خود اس کا بھی یہی حال ہے لیکن وہ کیونکر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آل میں سے انچاسویں نسل سے تعلق رکھتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالوں کا جواب جاننے کے لیے ہمیں 14 صدیاں پیچھے جانا پڑے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے حضرت محمد باقر کے صاحبزادے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ جب فوت ہوئے تو ان کے جانشین کی نامزدگی کے موقع پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنا جانشین نامزد کردیا تھا۔ اس فرقہ کے اصطلاحی الفاظ میں ''نص'' یعنی صراحت کے ساتھ تعیین کردی تھی لیکن حضرت اسماعیل بن جعفر صادق 133ھ میں اپنے والد کی زندگی میں انتقال فرما گئے۔ اب ان کی طرف خود کو منسوب کرنے والے بعض پیروکاروں کا کہنا تھا کہ چونکہ امامت کی ''نص'' نبوت کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور ایک مرتبہ کی ہوئی ''نص'' واپس نہیں ہوتی حتیٰ کہ باپ کی وفات کے بعد بیٹے کی طرف خود بخود منتقل ہوجاتی ہے اس لیے نامزد جانشین کے انتقال کے بعد قیادت اس کے بیٹے کو منتقل ہونی چاہیے لہٰذا انہوں نے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ جن کو وہ چھٹا امام مانتے تھے، کے انتقال کے بعد ساتویں امام کے طور پر ان کے پوتے محمد بن اسماعیل کو منتخب کرلیا تاکہ حضرت اسماعیل پر کی ہوئی نص برقرار رہے۔ آگے چل کر یہی لوگ ''اسماعیلیہ'' کہلائے جبکہ دوسرا گروہ جو اس نظریے کو تسلیم نہ کرتا تھا اور ''نص'' کی تبدیلی کے جواز کا قائل تھا اس نے حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کو ساتواں امام ماننا شروع کردیا اور ''موسویہ'' کہلایا۔ پھر بعض اسماعیلی عقیدت مندوں کے نزدیک ساتویں اور آخری امام محمد بن اسماعیل پر سلسلۂ امامت ختم ہوگیا۔ اب وہ آخرت میں ظاہر ہوں گے اس لیے ان کو سبعیہ (Seveners) بھی کہا جاتا ہے۔ (اس کے بالمقابل جنہوں نے حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کو امام مانا، وہ بارہویں امام کی غیبوبت کے بعد اثنا عشری (Twelers) کہلائے)

اور چونکہ اسماعیلیوں نے آگے چل کر اپنے من گھڑت عقائد کی دلیل قرآن کریم سے پیش کرنے کے لیے یہ عقیدہ بنایا کہ قرآنی آیات کے ایک معنیٰ ظاہری ہیں اور ایک باطنی۔ باطنی معنی کا علم صرف امام کو ہوتا ہے نیز یہ لوگ اپنی دعوت خفیہ طریقے سے گھروں میں چھپ چھپ کر دیتے تھے اس لیے ان کا نام باطنی پڑ گیا۔ ان کے عقیدے کے مطابق آیندہ امامت کا سلسلہ محمد بن اسماعیل کی اولاد میں جاری ہوا اور جب ان کے گیارہویں امام ابومحمد عبداللہ المہدی باللہ کو 297ھ...... 909ء کو مصر و مراکش میں حکومت مل گئی تو انہوں نے اپنے آپ کو عباسی خلفاء کے بالمقابل ''فاطمی خلفاء'' کہلوایا۔ یہ لوگ عباسی خلفاء کے مقابلے کے لیے ان جیسے القاب رکھتے تھے اور یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ وہ صحیح النسب فاطمی ہیں اس لیے ان کو ''سیّد'' کہا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک یہ اس موضوع پر بحث سے کتراتے ہیں اور اپنے 23ویں امام حسن کا نسب سادات سے ثابت نہیں کر سکتے۔ مسلم اور غیر مسلم مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ ایک اسماعیلی داعی کا بیٹا تھا جسے 45 سال کی عمر میں ''سید'' بنا کر اسماعیلیوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

محمد بن اسماعیل کے پوتے احمد بن عبداللہ کی وفات کے وقت اسماعیلیوں کے پھر دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ امامت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ امام محمد بن اسماعیل ساتویں اور آخری امام ہیں جو قیامت سے قبل ظاہر ہوں گے۔ اس گروہ کا قائد حمدان قرمط تھا۔ اس شخص کی آنکھیں سرخ تھیں، پستہ قد تھا اور چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا تھا۔ ایسے شخص کو ''قرمط'' کہتے ہیں اس لیے اس کے پیروکار قرامطہ کہلانے لگے جو قرمطی کی جمع ہے۔ یہ گروہ اصل اسماعیلیوں کے مرکز سے کٹ گیا اور کچھ عرصہ بعد ختم ہو گیا۔ گویا کہ قرامطہ اسماعیلیوں کی ایک معدوم شاخ ہے۔ دوسرا گروہ اس بات کا قائل تھا کہ امام صرف سات نہیں بلکہ ان کی اولاد میں سلسلۂ امامت جاری ہے۔ دنیا کبھی بھی امام سے خالی نہیں ہوتی چاہے وہ ظاہر ہو یا غائب۔ اس گروہ میں شامل افراد کا سلسلہ خلافت و امامت عامۃ المسلمین سے الگ ہٹ کٹ کر چلتا رہا۔ تقریباً 100 سال کے بعد 411ھ/ 1020ء میں دنیاوی طور پر خلیفہ اور باطنی طور پر امام الحاکم باللہ کے انتقال پر ایک گروہ اس مردہ کو (نعوذ باللہ) خدائی کا درجہ دے کر الگ ہو گیا۔ اس کا قائد محمد بن اسماعیل درازی تھا جو ایران کے ایک مقام ''دراز'' کا رہنے والا تھا۔ اس نسبت سے یہ لوگ ''درازی'' کہلائے جو رفتہ رفتہ ''دروزی'' ہو گئے۔ اس ''خدائی'' اختلاف کے سبب یہ لوگ اسماعیلی مرکز سے کٹ گئے اور مصر سے جو ان کا دارالخلافہ تھا، نقل مکانی کر کے شام کے ساحل پر چلے گئے، وہی ان کا صدر مقام ہو گیا۔ آج یہ جگہ موجودہ لبنان میں پڑتی ہے اور لبنان کے دروزی، فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی میں یہودیوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ قرامطہ تو ختم ہو گئے لیکن دروزی آج بھی اسلام کا نام لے کر الحاد و بے دینی کی بدترین شکل کے علمبردار ہیں۔

اسماعیلیوں کے مرکز سے جو لوگ وابستہ رہے وہ انہی کے خفیہ عقائد پر جیتے اور مرتے رہے یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری کے آخر سے پہلی دہائی میں ان میں ایک اور شدید اختلاف ہوا اور وہ دو فرقے بن گئے جو آج بھی نئے ناموں سے دنیا میں موجود ہیں اور خود کو مسلمان کہلوا کر بھی ہر چیز میں مسلمانوں سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ان کے خلیفہ اور امام (دونوں لفظوں کے معنی کی طرف اشارہ ہو چکا ہے) المستنصر باللہ کی جب وفات ہوئی تو اس کے دو بیٹوں میں جانشینی پر تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ ان میں سے ایک نام نزار اور دوسرے کا مستعلی تھا۔ نزار کے ماننے والے آج آغا خانی کہلاتے ہیں اور مستعلی کے پیروکار داؤدی بوہرہ فرقہ کے نام سے معروف ہیں۔ اس کا پس منظر یوں ہے کہ دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی اس کشمکش میں نزار اور اس کا ایک بیٹا قتل ہوا۔ دوسرے بیٹے کو مشہور زمانہ شخصیت، خفیہ قاتلوں کا سردار حسن بن صباح پوشیدہ طریقے سے ایران لے آیا

اور اپنی نگرانی میں اس کی پرورش کرتا رہا۔ بعدازاں اپنے چچا سے (جوخود بھی امام تھا) جان بچا کر بھاگنے والا اور تاریخ کی بدنام ترین شخصیت کے ہاتھوں تربیت یافتہ یہ نوعمر لڑکا امام بن گیا اور اس کے پیروکار نزاری کہلائے۔ اس فرقے کا مرکز ایران میں قزوین کے شمال میں ضلع اودبار میں واقع تھا، اس کو شکرے کا گھونسلا (Eagle'sNest) اور بعض گدھ کا گھونسلا (Vultur'sNest) کہتے تھے۔ تاریخ میں اسے ''قلعۃ الموت'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

نزاری امامت کا خفیہ سلسلہ ایران میں جاری رہا اور انیسویں صدی عیسوی میں اس سلسلہ کے 45ویں امام حسن علی خان اپنے محسن ایرانی حکمران فتح علی شاہ قاچار کی حکومت پر قبضہ جمانے کے منصوبوں میں ناکامی پر نقل مکانی کر کے ہندوستان آ گئے اور بمبئی اور اس کے نواح میں قیام کیا۔ نزاریوں کے اس امام کی اگرچہ حاکمِ ایران سے نہیں بنی لیکن انہوں نے اپنا لقب وہ ہی رکھا جو اس حکمران نے اسے ایک مرتبہ خوش ہو کر دیا تھا یعنی ''آغا خان'' چنانچہ ان کا فرقہ آج کل نزاری کے بجائے ''آغا خانی'' کہلاتا ہے۔ آج کل اس سلسلہ کے انچاسویں امام، کریم الحسینی (کہنا عبدالکریم چاہیے، یہاں صرف معروف نام کا ذکر مقصود ہے) المعروف بہ آغا خان چہارم نزاریوں کے مولا باپا اور صاحب الزماں ''حاضر امام'' کہلاتے ہیں۔ ایران کی نزاری امامت کے زمانے میں ان کے خفیہ داعیوں نے شمالی ہندوستان، کشمیر، ملتان اور گجرات وغیرہ میں سرگرمی دکھلا کر جن لوگوں کو اسماعیلی باطنی نزاری بنایا ان کو خواجہ کہا جاتا تھا جو بگڑ کر خوجہ اور پھر کھوجہ ہو گیا۔ اسماعیلی کھوجوں سے یہی لوگ مراد ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کا ایک داعی پیر شمس سبزواری تھا جس کا مزار ملتان میں ہے جہاں سادہ لوح مسلمان اسے پہنچی ہوئی شخصیت اور ولی اللہ سمجھ کر حاضری دیتے ہیں جبکہ یہ ایک خفیہ تحریک کا کارندہ تھا۔

یہ تو پہلے فرقے کی کارگزاری تھی۔ دوسرا فرقہ جو المستعلی باللہ کو خلیفہ و امام (ان دونوں اصطلاحی الفاظ کے مطلب کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے) مانتا تھا وہ مستعلویہ کہلایا۔ قلعۃ الموت میں پناہ گزین نزاری جن کے امام کا مربی شیخ الجبال حسن بن صباح جیسا اتالیق تھا اور جو ہر لمحے اپنے حجرے میں بیٹھا خفیہ فرامین کے ذریعے اپنے دہشت گرد فدائین کے خنجر کے لیے سینوں کی نشاندہی کرتا رہتا تھا، ان نزاریوں نے اپنے امام کے بدلے میں مستعلویہ کے امام ابوعلی منصور الآمر باحکام اللہ کو قتل کر دیا۔ اب اس کے کمسن بیٹے کی باری تھی لیکن اسے غائب کر دیا گیا اور اس مستور (پوشیدہ) امام کا ''دور، دورِ ستر'' تاحال جاری ہے۔ نزاری مصر سے ایران گئے تھے، مستعلویوں کو یمن فرار ہونا پڑا۔ یہاں انہوں نے 500 سال تک مسلمانوں کے درمیان مسلمان بن کر خفیہ زندگی گزاری اور اپنی دعوت چلاتے رہے۔ بالآخران کی داعی جماعتوں کو ہندوستان میں کامیابی ہوئی اور 946ھ/ 1540ء میں سرزمینِ ہندوستان کے ایک شہر احمد آباد (گجرات) میں ان کا مرکز منتقل ہو گیا۔ ان کے 26ویں داعی داؤد بن عجب شاہ کے انتقال پر 999ھ/ 1591ء میں ہندوستان اور یمن کے مستعلویوں میں ٹھن گئی، ہندوستان والوں نے داؤد بن قطب شاہ کو اور یمن والوں نے سلیمان بن حسن کو ستائیسواں داعی مانا۔ اس طرح داؤدی اور سلیمانی دو گروہ وجود میں آئے جو آج 425 سال بعد بھی موجود ہیں۔ ان چار صدیوں میں سلسلہ سربراہی 27 سے ہوتا ہوا 52 تک پہنچ گیا ہے اور برصغیر پاک و ہند میں 52ویں داؤدی داعی، سیدنا برہان الدین کے نام سے جانے جاتے ہیں اور چونکہ یہ سارا فرقہ تجارت کرتا ہے اس لیے بوہری کہلاتا ہے۔ بوہرہ کے معنی تاجر کے ہیں۔ یمن کے سلیمانی بوہری تو عربی بولتے ہیں جبکہ پاک و ہند کے داؤدی بوہریوں کی زبان گجراتی ہے۔ ایک سال قبل خبر آئی تھی کہ داؤدی بوہرہ فرقے کے سربراہ مصر میں چند تاریخی مساجد کی تعمیرِ نو کریں گے۔ اس خبر میں مساجد سے مراد فاطمی دور کے اسماعیلیوں کی وہ عبادت گاہیں تھیں جنہیں برہان الدین صاحب

نے ڈھونڈ نکالا تھا اور اپنے تاریخی ورثے کی حفاظت کے خیال سے اس پر خطیر رقم خرچ کر رہے تھے۔

یہ ہے پیرس کے مضافات میں ایک محل کے اندر لٹکے ہوئے اس نقشے کے پیچھے چھپی داستان جو تاریخ کے صفحات میں سے جھانک جھانک کر ہم اہلِ پاکستان کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ اسماعیلی فاطمی باطنی نزاری فرقہ اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت کی تلاش میں ہے۔ اس خواہش نے اسے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش میں ناکام ہونے پر ایران سے نکالا، افغانستان کا ''درۂ کیان'' اس کی پناہ گاہ بنا لیکن اس کی تمنائیں اس سے کچھ سوا ہیں، انگریزوں کے زمانے میں اس نے سندھ پر نظر رکھی اور انگریزوں کی بھرپور مدد کی لیکن امید پوری نہ ہوسکی، پھر اس نے انگریزوں سے مصر مانگا لیکن انگریز اتنے فراخ دل نہ تھے کہ ان کو اتنا بڑا انعام دیتے کہ یہ ہزار سال بعد اپنی سابقہ راجدھانی میں لوٹ جاتے، پھر سنکیانگ کو اسماعیلی ریاست کے لیے چنا گیا لیکن بات نہ بنی، اب پاکستان کے شمالی علاقہ جات کو مجوزہ آغاخانی ریاست (جو حسن بن صباح کی فاطمی خلافت یا اسماعیلی حکومت کے دوبارہ قیام کے مشن کا تسلسل ہے) کے نقشے میں شامل کرنے کے منصوبے جاری ہیں لیکن کشمیر کی ایک ایک انچ زمین کے لیے آخری سانس تک لڑنے کا اعلان کرنے والے حکمران نامعلوم وجوہ کی بنا پر خاموش ہیں۔ شمالی علاقہ جات کی بلند عمارتوں پر پاکستان کے قومی جھنڈے کے بجائے آغا خان کا ''پراسرار جھنڈا'' مائی فلیگ (My Flag) لہراتا ہے۔ اس میں سبز رنگ کو جس سے عام طور پر مسلمان اور عالمِ اسلام مراد ہوتے ہیں، سرخ رنگ سے جو کفر کی علامت ہے، کاٹا گیا ہے، ان رنگوں کے اوپر ہندوؤں کے نشانِ فتح ''ترشول'' (تین شاخوں والا تیر جسے شنکر بھگوان اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھتے ہیں) کو ثبت کیا گیا ہے۔ (آغاخانیوں کی ہندوؤں سے جدی پشتی وابستگی اور اس کے اسباب ایک مستقل بحث کا موضوع ہیں) اس کے اوپر ''امامت کا تاج'' دکھایا گیا ہے جس کے نیچے انچاس عدد دائرے انچاس اماموں کا عدد ظاہر کرتے ہیں۔ (آغا خان یونیورسٹی کے مونوگرام میں بنے ہوئے سورج کی انچاس کرنیں بھی اسی مطلب کی ترجمان ہیں) طالبان نے جب درۂ کیان فتح کیا تو جعفر نادری کے شاہی محل پر یہی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ انہوں نے اسے وہاں سے اتار کر پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے خلاف پنپتی سازشوں کو ناکام کر دیا۔ گزشتہ دنوں جب آغا خان پاکستان تشریف لائے تو صدر پاکستان سے ملاقات کے وقت درمیانی میز پر پاکستان کے قومی جھنڈے کے ساتھ ان کا مخصوص پراسرار جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہمارے اربابِ اختیار کے لیے مقامِ فکر ہے کہ خفیہ اور پراسرار تاریخ رکھنے والی اس جماعت کا تیار کردہ پرچم آخر کس چیز کا ترجمان ہے؟ ان کا الگ ترانہ اور خفیہ فورس کس تاریخی تمنا کی نشاندہی کرتی ہے؟ سالہا سال سے مولا حاضر امام کے لیے الگ ریاست کی جدوجہد کرنے والے اور خلافتِ عباسیہ کو بھی تسلیم نہ کرنے بلکہ اسے توڑ کر اپنے لیے الگ ریاست بنانے والوں کو ہم کیونکر مراعات پر مراعات اور سہولتوں پر سہولتیں دے رہے ہیں؟ انہوں نے ایران کو جس نے انہیں صدیوں پناہ دی، نہ بخشا، ہندوستان کی فتح کا عظیم کارنامہ انجام دینے والے سپہ سالار سلطان شہاب الدین غوری کو شہید کیا، مغلیہ سلطنت کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا، آخر وہ کس طرح، کس اعتبار سے اور کس بنیاد پر ہمارے لیے بے ضرر ثابت ہوسکتے ہیں؟ کیا ہم جانتے بوجھتے اور دیکھتے سمجھتے ایک اور تاریخی حادثے کی طرف جا رہے ہیں؟ دنیا آغا خان کو بے تاج بادشاہ کہتی ہے لیکن درحقیقت وہ ''بے ریاست باتاج بادشاہ'' ہے۔ ایسا بادشاہ جس کے لیے تاج بنالیا گیا ہے اور اس تاج کے لیے ریاست کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمارے وطنِ عزیز کے ایک حصے کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ''قلعۃ اَلموت'' کی بنیادیں رفاہی ترقیاتی اداروں کی شکل میں رکھی جا چکی ہیں اور ملک وقوم کے محافظ سو رہے ہیں۔

شیرِ میسور کی یاد میں

آج سے تقریباً دو صدی پہلے 4 مئی 1799ء کی بات ہے۔ مئی کی ایک گرم دوپہر تھی۔ سورج کی کرنوں سے جھلسا دینے والی تیز دھوپ خارج ہو کر ماحول کو آتش کدہ بنائے ہوئے تھی۔ یوں تو گرمیوں کی دوپہر میں ویسے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہوتا ہے اور چرند پرند بھی دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے درختوں کے سائے میں دبکے ہوتے ہیں لیکن آج عام دنوں کی سی بات نہ تھی۔ آج کی خاموشی کچھ پُر اسرار قسم کی تھی۔ ہر چیز پر ایک بے نام سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ سارا ماحول غمزدہ اور رنجیدہ تھا۔ گرم اور خشک ہوا چل رہی تھی جس کے تھپیڑے فضا کی غمناکی اور اداسی میں اضافہ کر رہے تھے۔

ریاست میسور میں دریائے ''کاویری'' کے کنارے قائم ''سرنگاپٹنم'' کا قلعہ گرد و پیش کے جاذب نظر اور دلفریب مناظر کے لیے مشہور تھا لیکن آج ان مناظر پر بھی اداسی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ شاید آج درختوں، پتھروں اور چرند و پرند کو بھی احساس تھا کہ ہندوستان کی قسمت پر مسلمانوں کی بداعمالیوں کے سبب مہر لگنے والی ہے۔

سالہا سال کی بے نوری کے بعد جو ایک دیدہ ور چمن میں پیدا ہوا تھا آج اہلِ چمن کی نالائقی کے سبب ان سے چھننے والا ہے۔ آج اس جوان رعنا، اس مردِ مؤمن، اس مجاہد دوراں، اس غازی بے بدل کی شہادت کا دن ہے جو ہندوستان پر طاغوتی یلغار کے راستے میں آخری رکاوٹ تھا۔ آج آسمان پر اس صاحب عزم و یقین کے استقبال کی تیاریاں ہیں جو ہندوستان کا وہ واحد فرماں روا ہے جسے عین میدانِ جنگ میں شہادت کا مرتبۂ بلند نصیب ہوا اور رہتی دنیا تک اس کے نام کو عزت و سرفرازی کا نشان بنا گیا۔

اسلام نے دنیا کو کئی ایسی نامور شخصیتیں دی ہیں جن پر تمام انسانیت فخر کر سکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ بھی اپنے دامن میں کئی گوہر آبدار رکھتی ہے مگر کچھ شخصیتیں اپنی ذات میں ایسی بلند اور مثالی ہیں اور ان کی قربانیاں اور جہد و اخلاص ایسا سبق آموز اور جذبات آفریں ہے کہ ان کا نام سنتے ہی انسان کا ذہن عقیدت و محبت سے لبریز ہو جاتا ہے اور ان کی زندگی کی وہ مخصوص شان ان کا نام کان میں پڑتے ہی سامنے آ جاتی ہے جس نے انہیں شہرت دوام اور عزت لازوال بخشی۔

شجاعت و جواں مردی کے حوالے سے ایسی شخصیات کی ابتدا سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ہوتی ہے اور پھر آخری دور میں ہندوستان کی تاریخ میں شیر میسور سلطان فتح علی ٹیپو شہید رحمہ اللہ کا نام لافانی شہرت رکھتا ہے۔ سیف اللہ تو تھے ہی سیف اللہ، ان کی عظمت کو دنیا کے ہر مؤرخ اور عسکری تجزیہ نگار نے تسلیم کیا ہے لیکن سلطان ٹیپو بھی ایسی عجیب و غریب شخصیت تھے کہ انسان جتنا ان کی شخصیت، سیرت اور کارناموں کا مطالعہ کرے حیران سے حیران تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ یارب! ایسی چنگاری بھی اپنے خاکستر میں تھی۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو، وہ کچھ کر دکھائیں جو وہ کہتے رہے ہوں۔

سلطان شہید رحمہ اللہ نے اپنے قول کو جو ضرب المثل بن چکا ہے: ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے

بہتر ہے''، اپنا خون دے کر ایسا سچ کر دکھایا کہ رہتی دنیا تک ان کی جواں مردی، بے جگری اور اولوالعزمی کی مثال کے طور پر باقی رہے گا۔ سلطان شہید شیروں کی طرح جیے اور شیروں کی طرح جان دی اور مسلمانوں کے لیے مثال قائم کر گئے کہ زندہ رہ کر جینے کا مزہ اتنا نہیں کہ اس پر ریجھ کر اپنے پیچھے برا نام چھوڑا جائے، مزہ تو وہ ہے جو مر کر جینے کے بعد ملتا ہے۔

سلطان شہید رحمہ اللہ پر ہمارے ہاں جیسا کہ اس عظیم شخصیت کا حق تھا، کام نہیں ہوا۔ گنی چنی چند ایک کتابیں ملتی ہیں۔ ہماری قوم کو رنز بنانے اور ان کے ریکارڈ اوپر تلے جما کر گننے اور خوش ہونے سے فرصت ملے تو اسے اپنی تاریخ کی ان عظیم شخصیتوں پر توجہ دینی چاہیے جو کسی اور قوم میں ہوتے تو آج وہ ان کے مقبول ترین ہیرو ہوتے اور ان کے حالات اس قوم کے بچے بچے کی زبان پر ہوتے۔ سلطان جیسی شخصیت کے تذکرے ہماری نسل میں ایسے فرزندوں کو جنم دیتے کہ ہم کم از کم اپنے ان محسنوں کے قاتلوں سے انتقام لے سکتے مگر آج میسور کے کتب خانے کی کتابیں لندن کی لائبریریوں کی زینت ہیں، سلطان کا اسلحہ اور استعمال کی نجی اشیا لندن اور اسکاٹ لینڈ کے عجائب خانوں میں ہیں، اس کے شاہی خزانے کے قیمتی نوادرات برطانیہ کے قبضے میں ہیں، سرنگا پٹنم سے لوٹی گئی دولت سے آج لندن کی سڑکیں روشن ہیں...... مگر ہماری نسل کو خبر بھی نہیں کہ انگریز نے ہماری قوم کے اس سپوت کو شہید کر کے اور اس کی سلطنت کو لوٹ کر ہم پر کتنا بڑا ظلم کیا تھا اور اس ظلم کا انتقام ہم نے نہ لیا تو آج جس طرح دشمن کے سامنے ذلیل و رسوا ہیں، کل قیامت کے دن اپنے محسنوں کو بھی منہ نہ دکھا سکیں گے۔

ہم نے سلطان کی زندگی، اس کا نظریہ اور اس کا مشن نئی نسل کے سامنے صحیح طرح متعارف نہیں کروایا ورنہ ہم میں کئی ایسے ٹیپو پیدا ہوتے جن کی تلوار کی کاٹ دشمن کو سات سمندر پار تک سہائے رکھتی۔

مئی کا مہینہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے لیکن سلطان پر نہ کوئی سیمینار ہوتا ہے نہ مذاکرہ۔ کوئی تصویری نمائش نہ تقریری یا تحریری مقابلہ۔ کہیں کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہوتی بھی ہے تو میڈیا میں اسے اتنی جگہ ملتی ہے جیسا کہ چند یتیم جمع ہو کر اپنے آباواجداد کی عظمت پر رو رہے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ہندوستان کے مسلمان یتیم ہو گئے تھے اور اس وقت تک یتیم ہی رہیں گے جب تک ہم اس غداری کا کفارہ ادا نہیں کرتے جو اس عظیم شخصیت کے ساتھ ہم نے کی اور یہ کفارہ ادا نہیں ہو سکتا جب تک سلطان کے نظریے اور مشن کو نہیں سمجھتے اور اتنا پڑھ لکھ کر خود کو تیار نہیں کرتے کہ خود کو اس کے دشمنوں سے انتقام کے قابل بنا سکیں۔

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ مشرق میں ٹیپو سلطان شہید رحمہ اللہ جیسا دلیر، بہادر، محبِّ وطن، علم و جہاد کا علمبردار اور سیاست و شجاعت کا جامع عظیم سپہ سالار پیدا نہیں ہوا۔ اس نے جن نامساعد حالات میں اپنوں کی جفا کاریوں اور دشمن کی مکاریوں کا سامنا کیا اور غیرت و شجاعت کی عظیم مثال قائم کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تاریخ کے جس طالب علم نے بھی سلطان کا مطالعہ کیا ہے اسے یہ کہنے میں باک محسوس نہیں ہوتا کہ اس جیسے بیدار مغز، معاملہ فہم، نیک دل، عوام دوست اور مرد میدان حکمران کے ساتھ دنیا پرست امرا اور ضمیر فروش وزرا غداری نہ کرتے تو آج ہندوستان کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔ مگر اخلاقی گراوٹ جس طرح ہم لوگوں میں سرایت کر چکی تھی اس کا انجام یہی ہونا تھا کہ قدرت ہم سے یہ غیر معمولی شخصیت چھین لے اور ہمیں غلامی کے ذلت ناک گڑھوں میں دھکیل دیا جائے۔

4 مئی 1799ء کی دوپہر ٹیپو سلطان اور اس کے جانثار مجاہد ساتھیوں کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ غدارانِ ملت نے ناموس ملت کا سودا کر لیا ہے۔ سرنگا پٹنم کے قلعے میں تقریباً ایک سال کا راشن موجود تھا، اسلحہ اور بارود وافر مقدار میں ذخیرہ

تھا، قلعے کی حفاظتی فصلیں مضبوط تھیں، جوانوں اور کمانڈروں کے حوصلے بلند تھے، سلطان جیسے ہر دلعزیز حکمران کی موجودگی سے عوام وخواص میں جذبہ مومنانہ کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ میسور کے جواں مرد باشندے اس سے قبل انگریزوں کو متعدد معرکوں میں شکست دے چکے تھے اور وہ اس مرتبہ بھی گورے بندروں کی دُرگت بنانے کے لیے پُرعزم تھے۔ دوپہر کے وقت عموماً ہندوستانی سپاہیوں کے کھانا کھانے اور قیلولہ کرنے کا ہوتا ہے، اس Relaxing Time میں سلطان بھی اپنی کمانڈ پوسٹ کے قریب آم کے ایک درخت کے نیچے کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ ابھی پہلا لقمہ ہی اُٹھایا تھا کہ ایک تیز رفتار گھڑسوار پیغام رساں نے انہیں انگریز فوج کے بھرپور حملے اور سلطان کے اہم ساتھی اور وفادار جرنیل سید عبدالغفار کی شہادت کی خبر سنائی۔

سلطان کو اس پر شدید حیرت ہوئی کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان کی زندہ سلامت موجودگی اور دن کے اُجالے میں انگریز فوج کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ قلعے پر حملہ کریں نہ اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ مضبوط فصیل میں شگاف ڈال سکیں مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ انگریز کی اس کارروائی میں اس کی بہادری کا نہیں عیاری کا دخل ہے۔ سلطان نے اس وقت حسرت اور رنج کے عالم میں غداروں کو بددُعا دی: ''اے غدارو! تم غداری کا انجام ضرور دیکھو گے، تمہاری نسلیں انگریزوں کی غلامی میں زندگی گزاریں گی اور تم چاول کے ایک ایک دانے اور پیاز کی ایک ایک ڈلی کے لیے ترسو گے۔'' بعد کے وقت نے ثابت کیا کہ ایسا ہی ہوا۔

اس وقت ایک ضمیر فروش نے سلطان کو حالات کی سنگینی اور اپنوں کی غداری کے بعد لڑائی کی عدم افادیت کا احساس دلاتے ہوئے ہتھیار ڈالنے اور خود کو انگریز کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا۔ سلطان اگر ایسا کر لیتے تو انہیں زندگی کے چند دن مل جاتے مگر ہندوستانی مسلمان اور ان کی تاریخ اس قابلِ رشک وفخر مثال سے محروم ہوجاتی جو انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے اور مشکل وقت میں زندگی کا حوصلہ دیتی ہے۔ سلطان نے ...... اللہ اس کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل کرے ...... اس رذیل کو سختی سے جھڑک دیا اور وہ تاریخی جملہ کہا جس کا ذکر مضمون کے شروع میں آیا ...... پھر انہوں نے وہ کام کیا جو جواں مردوں کا خاصہ ہے اور جس نے ہماری لاج رکھ لی اور انہوں نے اپنے جانثار جنگی ساتھیوں کو ساتھ لیا اور قلعے کے اس حصے کی طرف روانہ ہوگئے جہاں انگریز فوج کے حملے کا زور زیادہ تھا۔ سلطان اپنے وفادار گھوڑے طاؤس کے ساتھ آگ وخون کے اس معرکے میں کود پڑے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

جنگ کے اختتام پر سلطان کا جسد قلعہ کے مرکزی دروازے (Water Gate) کے پاس لاشوں کے بہت بڑے ڈھیر کے پاس سے ملا۔ سلطان کے گرد پانچ سو سے زیادہ لاشوں کا انبار تھا۔ ان کا جسم کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی گرم تھا اور بدن کی تازگی بالکل زندہ انسان کی طرح تھی۔ ان کا ہاتھ مضبوطی سے تلوار کے دستے پر جما ہوا تھا۔ موت ان کا رعب ودبدبہ نہ چھین سکی تھی۔ سلطان کے پاس شاندار جنگی ہتھیاروں کے علاوہ ٹیلی اسکوپ، پانی کی بوتل، ایک تسبیح اور دُعاؤں کی کتاب تھی۔ مؤخر الذکر دو چیزیں ہمیشہ اس کے پاس ہوتی تھیں۔ انگریز سپاہیوں نے سب کچھ چرالیا اور ایسا چرایا کہ آج ہمارے پاس سلطان کا اتنا ترکہ بھی نہیں کہ اس کی یاد زندہ رکھ سکیں۔ البتہ ایک چیز ایسی ہے جو سلطان کا ترکہ ہی نہیں، قدرت کا لازوال عطیہ ہے اور وہ ہے ہمارا ملک پاکستان۔

پاکستان، سلطان ٹیپو شہید جیسے لوگوں کی قربانیوں کے صلے میں ملا ہوا قدرت کا عظیم تحفہ ہے۔ دشمنوں کی کوشش ہے کہ اسے شیروں کی کچھار کے بجائے گیدڑوں کا مسکن بناڈالیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم ان ناپاک ارادوں کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں؟؟

بہتے لہو کی گواہی

(غازی عامر چیمہ کی شہادت پر)

آج میں آپ کو جو واقعات سنانے لگا ہوں یہ میری زندگی کے ان مشاہدات میں سے ہیں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے اور وقتاً فوقتاً یاد آتے رہتے ہیں۔ بندہ جب کتابوں کے مطالعے سے تھک جاتا تھا تو انسانوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا، یہ اس دور کی یادگار ہیں۔ یہ عادت آج بھی ہے۔ انسانوں کا مطالعہ بندہ کا پسندیدہ ترین مشغلہ رہا ہے۔ اس لیے وہ شخصی واقعات اور انسانی خاکے جو قارئین ان کالموں میں پڑھتے ہیں مثلاً: شیر خان، صوفی صاحب اور لالو استاد...... انہیں اس تناظر میں پڑھا اور سمجھا جائے۔ طوری ماما کے متعلق البتہ جو کالم افغان امریکا جنگ کے ابتدائی دنوں میں چھپا تھا، ذاتی مشاہدہ نہ تھا، خبر رساں ساتھیوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی تھا۔ اس طرح فلسطین کے محمود عباس اور یحییٰ ایاش وغیرہ کے متعلق کالم ظاہر ہیں کہ اس دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان دونوں واقعات کا تعلق ایک جیسے حالات سے ہے لیکن دونوں میں کرداروں کے مزاج اور طبیعت کا کچھ فرق ہے۔ جو معنی خیز بھی ہے، سبق آموز بھی اور غازی عامر عبدالرحمٰن چیمہ کی بابرکت شہادت اور یادگار کارنامے سے متعلق بھی...... مغرب کے دانش ور اور مفکر نجانے کس گھاٹ کا پانی پیتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کی نفسیات سمجھ نہیں آرہیں۔ ان واقعات کے تناظر میں مسلمانوں کے ضمیر میں گندھے ہوئے حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لافانی اور اٹل جذبات کو سمجھنے اور مغرب کو سمجھانے میں بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

پہلا واقعہ آج سے تقریباً دس سال قبل اس وقت پیش آیا جب کراچی میں ایسی بیڈ شیٹس چھپ کر سامنے آئیں جن پر اللہ رسول کا مبارک نام لکھا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس کے نمونے لے کر اس جامعہ میں آئے جہاں بندہ خدمتِ افتا پر مامور تھا۔ وہ اس واقعے کے متعلق فتویٰ چاہتے تھے۔ اب یہ ایسی بدیہی اور واضح چیز ہے جس کے لیے شرعی فتویٰ کی ضرورت نہیں، کون مسلمان ہے جو اس کا حکم نہیں جانتا؟ لیکن جو لوگ اس طرح کی باتوں میں مفتیان کرام کی طرف رجوع کرتے ہیں دراصل وہ اپنا دکھڑا سنانے، غم و غصہ کا اظہار کرنے اور مفتیان کرام کو اس المناک واقعے سے آگاہ کر کے اس کے تدارک کے لیے لائحہ عمل جاننا چاہتے ہیں بلکہ ان کے ذہن میں یہ خواہش چھپی ہوتی ہے کہ ہم نے ان لوگوں تک بات پہنچادی جو ان چیزوں کے تدارک کے اصل حق دار، ذمہ دار اور دینی معاملات میں ہمارا آخری سہارا ہیں، اب آگے کی کارروائی ان کو چلانی چاہیے، ہم تو ان کے پیچھے پیچھے مقتدی اور معاون ہیں۔

اس صورتِ حال میں محض فتویٰ دینے سے کیا ہوسکتا ہے؟ کراچی کا ایک اخبار (بندہ کا ان دنوں کسی اخبار یا اخباری دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا) روز اس حوالے سے ایک فتویٰ شائع کرتا اور بہت شہرت کماتا۔ بندہ کا نکتہ نظر اس وفد کے سامنے یہ تھا کہ آپ لوگ فتویٰ لینے کے بجائے قانونی کارروائی کریں اور علاقے کے عمائدین مل کر تھانے کچہری کے ذریعے ایسے افراد کے خلاف ٹھوس قانونی اقدام کی فکر کریں اور ترتیب بنائیں۔ قانون کے رکھوالوں کو فتویٰ کی ضرورت نہیں۔ پاکستان کے آئین اور قانون کی رو سے یہ سنگین جرم ہے اور قانون کے ذمہ دار اس پر فوری کارروائی کے پابند ہیں۔

حاضرین میں سے کچھ کا اصرار تھا کہ فتویٰ دیں۔ بندہ کا کہنا تھا کہ فتویٰ تو ضرور آپ کو مل جائے گا لیکن اس کو لے کر کس کو دکھائیں گے؟ توہین رسالت کے متعلق فتویٰ کی مسلمانوں کو کیا ضرورت ہے؟ البتہ کوششوں کا رُخ دارالافتاء کی طرف پھیر رکھنے میں جتنی دیر لگے گی تب تک مجرم اپنے گرد حصار کھینچ کر قانون کی گرفت سے محفوظ یا آپ کی پہنچ سے دور جا چکا ہوگا۔ ابھی یہی بات چل رہی تھی کہ ایک چاچا جی کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے کہا: ''مولانا صیب نوعمر ہے لیکن بات صحیح کہتا ہے۔ ہم سب اس کو غلط سمجھتے ہیں جبھی تو یہاں آئے ہیں۔ جب غلط سمجھتے ہیں تو فتویٰ میں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ علمائے کرام کے پاس چکر لگا کر ان کو پریشان کرنے سے کیا ہوگا۔ اب یہاں سے اُٹھو! سب مل کر تھانے چلتے ہیں اور قصہ نمٹاتے ہیں۔ فتویٰ ہی چاہیے تو وہ زبانی بھی مل چکا ہے۔''

چاچا جی ان پڑھ تھے، انہوں نے فتویٰ کا تلفظ فا کی زیر کے ساتھ ''فِتویٰ'' کیا تھا۔ شکل وصورت سے غریب معلوم ہوتے تھے مگر ان کے ایمانی جذبات دیکھنے والے تھے۔ یہاں پر وضاحت کرتا چلوں کہ ان کو (دیگر حاضرین کو بھی) اسمِ الٰہی کی بے ادبی سے زیادہ محمد پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کی بے حرمتی پر غصہ تھا اور ان کا بس نہ چلتا تھا کہ ایسے مردود کو کچا چبا جائیں یا زندہ ادھیڑ ڈالیں۔ چاچا جی نے الوداعی سلام کیا اور توہین رسالت کے مرتکب کو اس کے انجام تک پہنچانے کا عزمِ مصمم ظاہر کرتے رخصت ہوگئے۔ ان کا فتویٰ ہمارے پاس دھرا رہا۔ نجانے کیا گزری لیکن بڑھاپے میں ان کا جوانوں والا انداز اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کو چادر پر لکھا دیکھ کر بار بار کڑھنا اور بل کھانا آج تک یاد ہے۔

شروع شروع میں ایسی حرکات کے مرتکب کے خلاف جب کوئی کارروائی نہ ہوئی تو لائن لگ گئی۔ کم بخت اور دریدہ دہن عناصر نے کپڑوں، رومالوں، چادروں اور چپل جوتے کے تلے تک پر مبارک ناموں سے ملتے جلتے ڈیزائن مارکیٹ میں پھیلا دیے۔ بندہ جب ضربِ مؤمن میں آیا تو ایک زمانہ ایسا بھی گزرا جب کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرتا تھا کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ نہ پیش آتا ہو۔ ایسی چیزیں لے کر آنے والوں کا اصرار ہوتا تھا کہ ان چیزوں کی تصویر اخبار میں لگائی جائے۔ بندہ کا موقف یہ ہوتا تھا کہ اس سے مایوسی اور بے نتیجہ غم وغصہ پھیلے گا۔ اس کے بجائے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہ سراغ لگایا جائے کہ یہ کس نے بنایا اور کس نے پھیلایا ہے؟ دکانداروں سے پوچھا جائے انہیں کس نے سپلائی کیا اور سپلائر سے کھوجا جائے کہ تم نے کس فیکٹری سے مال اُٹھایا؟ تب خبر لگانے کا کوئی فائدہ بھی ہوگا۔ ایسی مبہم خبریں اور تصویریں جن میں ذمہ دار عناصر کا کسی کو پتہ ہی نہ ہو، چھاپنے سے سوائے لوگوں کو اپنا آپ عاجز باور کرانے کا اور کیا فائدہ ہے؟ تعجب اس پر ہے کہ ایسی منصوبہ بند حرکات ذمہ داروں کا سراغ نہ لگا کہ کون ایسی چیزیں بناتا ہے؟ ایک ایسا ہی وفد ایک مرتبہ ایک چپل لے کر آیا، پوچھا گیا: ''بنانے والی فیکٹری کون سی ہے؟'' کسی کو خبر نہ تھی۔ بس سب پر یہ خیال سوار ہوا کہ اس کی تصویر لی جائے اور چھاپ دی جائے جبکہ بندہ کا وہی موقف تھا جو اوپر عرض کیا۔ ان میں سے ایک خاموش خاموش نوجوان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اندر سے سخت طیش میں ہے۔ اس کا معاملہ بھی یہی تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے مقدس نام کی بے حرمتی پر بھی رنج تھا لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو ایسی چیزوں پر لکھا دیکھ کر اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ظاہری وضع قطع عام دنیادار مسلمانوں کی سی تھی لیکن اندرونی حدّت کی شدت سے چہرہ تمتما رہا تھا اور دانت سے دانت بھنچا ہوا تھا۔ مسئلہ یہاں بھی وہی تھا کہ اگرچہ یہ نوجوان بھی دنیاداری کے دھندے میں پھنسے عام نوجوانوں کی طرح تھا لیکن حبِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) چیز ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں دین دار اور دنیادار کا فرق نہیں۔ یہ تو

تکوینی طور پر اہلِ اسلام کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں ودیعت کردی گئی ہے بلکہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ دین دار لوگ اپنی نیکیوں کے بھرم میں سوچتے رہ جاتے ہیں اور دنیادار اسے ذریعۂ نجات وشفاعت سمجھ کر میدان مار جاتے ہیں۔ غازیانِ ناموسِ رسالت کی فہرست پر ایک نظر ڈالیے آپ کو "ورفعنا لك ذكرك" (اور ہم نے بلند کردیا تیرے لیے ذکر تیرا) کا تکوینی اعلان پوری آب وتاب سے جگمگاتا دکھائی دے گا اور اس کے جلو میں سرخیٔ شہادت سے رنگے جو پھول بہار دے رہے ہوں گے، یہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اُمتی ہوں گے جن کو دنیا والے بلاوجہ ہی ادھورا مسلمان سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔

غازی عامر چیمہ کو دیکھ لیجیے! طالب تھا نہ مُلّا، مجاہد نہ مبلغ، شدت پسند نہ بنیاد پرست...... اسکول میں پڑھا، کالج میں رہا، یورپ کی یونیورسٹیوں میں پہنچ گیا، مگر ایمان کی چنگاری ماحول کی چکاچوند سے بھی کبھی بجھی ہے؟ یورپ کے منصوبہ ساز جب بھی ہمارے ہاں فحاشی پھیلانے اور بکاؤ قسم کی جنس کا مول لگانے کے بعد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کو روند ڈالا ہے، کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ہوجاتا ہے کہ ان کے سارے اندازے ان کا منہ چڑاتے اور سارے منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اب چیمہ خاندان کے اس خوش نصیب کو دیکھ لیجیے جس نے مسلمانوں کو پھر سے سر اُٹھا کر جینے کی اُمنگ اور حوصلہ دیا ہے اور اس انداز سے دیا ہے کہ ہمیں اپنے مسلمان اور پاکستانی ہونے پر رشک آرہا ہے۔ اب یورپ کے احمق، بدتہذیب اور اخلاق سے عاری کم ظرف ایڈیٹر جو چاہیں چھاپیں، اکیلے اس شیر جوان نے انہیں ان کی حیثیت جتادی ہے۔ اس نے انہیں باور کرادیا ہے کہ گوری چمڑی منڈھے ہوئے ان گندے اور بدتمیز بندروں کا وجود غلاظت بند پوٹلی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ چیمہ شہید کے واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جب تک مسلمان مائیں کلمہ پڑھ کر اپنے بچوں کو دودھ پلاتی رہیں گی ان میں ایسے شیر صفت پیدا ہوتے رہیں گے جن کے خنجر کی دھار شیطان کے چیلوں کو خوفزدہ رکھے گی۔

بندہ سے کسی نے پوچھا: ''غازی کے کیا معنی ہیں کہ عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں کا جز بن جاتا ہے؟'' عرض کیا: ''کہتے تو یہ اس سعادت مند کو تھے جو جہاد میں شریک ہو لیکن آج کے دور کے ترسے ہوئے اور کفریہ دنیا کے ستائے ہوئے مسلمانوں نے یہ معزز لقب ان جواں مردوں کے لیے مخصوص کردیا ہے جو گستاخِ رسول پر حملہ کرے۔ پھر چاہے اس کو جہنم تک پہنچائے یا خود آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوجائے۔ دونوں صورتوں میں بیڑا پار، وارے نیارے اور موج ہی موج ہے۔ یہ ایسا کھرا سودا ہے جس میں خسارے کا احتمال ہی نہیں۔

ذرا ایک نکتے پر سوچیے! یورپ کے ماحول میں رہنے والے دنیاوی تعلیم یافتہ نوجوان کی وہ کون سی نفسیات ہیں کہ وہ اپنا مستقبل، جوانی، خواب سب کچھ تج کر ایک شکاری چاقو خریدتا ہے (اے ارمان! کسی طرح یہ یادگار چاقو پاکستانیوں کو نہیں مل سکتا) اخبار کے دفتر کا پتہ معلوم کرتا ہے، سیکیورٹی کا حصار توڑ کر ایڈیٹر کے کمرے میں جا گھستا ہے، خنجر کی نوک سے بدبو کے اس بورے کو چیرتا پھاڑتا ہے، عدالت میں سینہ تان کر ایسی حالت میں فخر سے ''اقرارِ جرم'' کرتا ہے جبکہ اس کو چاروں طرف خونخوار بھیڑیے نظر آرہے ہیں جن سے کسی لحاظ، مروت کی امید نہیں۔ جن کا سفاکانہ رویّہ وہ دورانِ تفتیش بخوبی دیکھ چکا اور جن کے خطرناک ارادے وہ اچھی طرح بھانپ چکا ہے۔ یہ فدائیانہ جذبات، یہ غیرت وشجاعت، یہ بے خوفی وجرأت ہی مسلمانوں کی وہ لافانی اور لازوال روایت ہے جو حبِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اعجاز آفریں برکت ہے، جو ہماری آبرو کی ضامن، ہماری

پہچان اور مایۂ افتخار ہے اور جو اہلِ مغرب کی ہزار کوششوں کے باوجود اہلِ اسلام کے دلوں سے کھرچی نہیں جا سکتی۔

معاملے کے ایک اور پہلو کو دیکھیے! جرمن ایڈیٹر نے بالیقین ایسی حرکت کی تھی جو بین الاقوامی قوانین اور مسلّمہ انسانی اخلاقیات کی رو سے بلاشبہ جرم ہے۔ چلیے مان لیا کہ جرمن قانون کی رو سے عامر شہید رحمہ اللہ نے بالفرض بلا جواز اقدام کیا لیکن ان کو ان کے اقدام کے بقدر پوچھ گچھ کے بجائے ماورائے عدالت تکلیفیں دے دے کر شہید کرنے میں جرمن پولیس، جرمن انتظامیہ، جرمن عدلیہ، جرمن پریس اور پھر جرمن حکومت سب نے اپنا اپنا حصہ ڈال کر مسلمانوں سے دلی بغض وعناد کا جو اظہار کیا ہے۔ اس سے یورپ کی تہذیب پر فریفتہ دانش وروں اور روشن خیال چڑی ماروں کی آنکھیں کھل جانی چاہییں۔ اس اتفاق واتحاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ یورپ اوپر سے نیچے تک انتہائی گئی گزری مخلوق ہیں۔ انہوں نے دل کی بھڑاس نکال کر سمجھا تھا کہ وہ مسلم دنیا کو اپنے شقاوت آمیز اور ظالمانہ رویے سے مرعوب کن پیغام دیں گے مگر یہاں پھر معجزہ نبوی ظاہر ہو کر رہا۔ اہلِ ایمان تو گویا طویل نیند سے جاگ اُٹھے ہیں۔ کھلاڑیوں، گلوکاروں، سرکس کے کرتب بازوں اور ہندوؤں کی نقل مار اداکاروں کو ہیرو سمجھنے والی قوم نے چیمہ شہید کی دہلیز پر تہنیتی پیغامات اور گلی میں پھولوں کے ڈھیر لگا کر جس طرح کا جوابی پیغام دیا ہے وہ ایمان افروز بھی ہے اور روح پرور بھی۔ راولپنڈی کا ایک عام سا نوجوان راتوں رات مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بن گیا ہے۔ کتنی ہی جوانیاں اس کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم سینے میں دہکا چکی ہوں گی۔ نوجوانوں نے اپنے آئیڈیل بدل لیے ہیں۔ جو کام لاکھوں مبلغین نہ کر سکتے تھے، ایک فدائی نے تنہا کر دکھایا۔ خنجر کی نوک وہ کچھ کہہ گئی جس سے قلم اور زبانیں عاجز ہو چکی تھیں۔ غازی عامر عبدالرحمٰن چیمہ! تم نے مایوس اہلِ اسلام کو جینے کی آس دلا دی ہے۔ قوم تمہارا یہ احسان بھلا نہ سکے گی۔

سلام اس نبی پر جس کے امتی اس کے دیوانہ وار شیدائی ہوتے ہیں۔

سلام ان امتیوں پر جو اپنے نبی کے ایسے سرفروش فدائی ہوتے ہیں۔

سلام ان خوش نصیبوں پر جن کے گھر ایسے خوش بخت پیدا ہوتے ہیں۔

سلام ان ماؤں پر جو ایسے شیر دل سپوت جنتی ہیں۔

سلام ان بہنوں پر جو ایسے عظیم بھائیوں کی پرورش کرتی ہیں۔

سلام ان جواں مردوں پر جو ایسی انمٹ روایات قائم کر جاتے ہیں۔

پہلے مسلم دنیا شاید صرف اس شیر بچے پر فخر کرتی جو گستاخِ رسول پر قاتلانہ حملے میں کامیاب ہو جاتا، اب وہ جواں مرد بھی ان کا ہیرو اور آنکھوں کا تارا ہو گا جو ان کی طرف سے اس فرضِ کفایہ کی ادائیگی کی محض کوشش کرے گا۔ جرمن حکام کو علم ہوتا کہ ان کا ظلم یہ رخ اختیار کر جائے گا تو وہ ہرگز ایسا اوچھا اقدام نہ کرتے مگر خدا نے مسلمانوں کو نئی زندگی دینی تھی، سو وہ مل چکی ہے۔

چیمہ جی! جب سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضری ہو تو ہم حسرت زدہ گنہگار اُمتیوں کا سلام بھی پہنچا دینا۔ ترسے ہوئے ارمانوں اور ٹوٹے ہوئے دلوں کا پیغام گوش گزار کر دینا۔ عرض کر دینا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُمتی کتنے ہی گنہگار سہی، مگر ناموسِ رسالت پر پہلے کبھی سمجھوتہ کیا نہ آئندہ کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے سسکتے جذبات، تڑپتے ارمان، ناآسودہ حسرتیں اور بہتا لہو اس پر گواہ ہے اور ہم قیامت تک اس گواہی کو زندہ و تابندہ رکھیں گے۔

عشق کی بازی

جذبوں کی صداقت:

یہ آج سے تقریباً چار سال قبل کی بات ہے۔ بندہ ملک کے ایک معروف اور مؤقر دینی ادارے میں افتاء کے شعبے سے منسلک تھا۔ روز کی ڈاک میں دینی امور کے بارے میں پوچھے گئے سوالات پر مشتمل کئی خطوط موصول ہوتے تھے۔ ایک دن امریکا کی ایک جیل سے ایک نوجوان کا خط آیا جس میں اس نے اپنی موت کے بارے میں اتنے عام انداز اور ٹھہرے ہوئے لب ولہجے میں سوال کیا تھا جیسے کوئی شخص اپنے ملنے جلنے والوں سے ''ہور سناؤ'' کہہ کر حال احوال دریافت کرتا ہے۔ بندہ کو اس کے پرسکون لہجے، موت کے خوف سے آزادی اور آخرت کی زندگی کے شوق کی کیفیت بھانپ کر رشک آیا کہ ایک عام سے نوجوان کا دل ایمانی جذبات اور شوقِ شہادت سے کس قدر لبریز ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے مجبور کرنے اور وکیلوں کے سمجھانے کے باوجود آخرت کے شوق میں نہ صرف یہ کہ قتل کا اعتراف کرنا چاہتا ہے بلکہ امریکی حکام کو اس کی وجوہ بتا کر ان کو یہ پیغام دینے کا آرزومند ہے کہ اگر وہ مسلمانوں کی زندگیوں سے کھیلتے رہیں گے تو انہیں دنیا کے طول وعرض میں ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ ردعمل ان مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوگا جو معروف معنوں میں شدت پسند ہیں نہ ان کا کسی جہادی تنظیم سے باقاعدہ تعلق ہے اور پھر امریکی حکام چاہیں بھی تو اس فطری جذبے کو دہشت گردی یا مذہبی جنون کہہ کر دبا نہیں سکیں گے۔

مجھے فتویٰ درکار ہے:

یہ نوجوان عامل کاسی شہید تھا جو تاریخ کے صفحات میں غازی عامل کاسی شہید علیہ الرحمۃ کے نام سے شہرت دوام پا گیا ہے۔ اس نے ہم سے پوچھا تھا کہ ریاستی عدالت نے اس کی بیان کردہ وجوہ (کہ مقتول امریکی افسر کئی مسلمانوں کے قاتل تھے اور مسلسل مسلمانوں کی جان ومال کو نقصان پہنچانے کے منصوبوں کا حصہ بنے رہتے تھے) تسلیم نہیں کیں اور انہیں سزائے موت کا حکم سنایا ہے۔ اب اگر وہ سزا کے خلاف وفاقی عدالت میں اپیل کریں تو کیس مزید 4، 5 سال چل سکتا ہے۔ اگر وہ اپیل نہ کریں (بعد میں اپیل نہ کرنے کی وجہ خود شہید کے انٹرویو سے یہ معلوم ہوئی کہ وہ اس پیسے کو چرب زبان امریکی وکلا کی فیسوں پر خرچ کرنے کے بجائے کسی مستحق مسلمان کو دینا چاہتے تھے) تو یہ لوگ مجھے سزائے موت دے دیں گے، کیا میری موت اسلام کی رو سے شہادت ہوگی؟ مجھے فتویٰ درکار ہے کہ کیا کرنا چاہیے؟ ہم نے انہیں جواب میں لکھا: ''کفار کے ہاتھوں آنے والی موت بہر حال شہادت ہے۔ آپ کو یہ نعمت مبارک ہو لیکن اس نعمت عظمیٰ کے حصول کے شوق میں ان کو اپنے قتل پر قدرت دینا درست نہیں۔ آپ ہر جائز طریقے سے اس سزا کے نفاذ کو مؤخر سے مؤخر کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ غیب سے آپ کی دست گیری فرمائیں۔ اس حیات فانی کے جتنے لمحے میسر ہوں انہیں عبادت اور نیک کاموں میں صرف کریں۔ اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیں کہ ذکر وعبادت، دینی کتب کا مطالعہ، قیدی ساتھیوں کو دین کی دعوت وغیرہ امورِ خیر مناسب مقدار میں سموئے ہوئے

ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔''

من کی دنیا:

اس وقت بندہ کو اندازہ نہ تھا کہ یہ خط ایک تاریخی حیثیت اختیار کر جائے گا اور اس کے مندرجات مسلم نوجوانوں کے لیے ایمان کی تازگی اور قلب کی سرشاری کا سبب بنیں گے۔ پچھلے دنوں جب بی بی سی پر شہید کا یہ مکالمہ سنا:

''سوال: ایمل کاسی! آئندہ چھتیس گھنٹوں میں آپ کو سزائے موت دے دی جائے گی یا باقی زندگی آپ کو امریکی جیل میں گزارنا ہوگی۔ لیکن ان دونوں میں سے آپ کس سزا کو ترجیح دیں گے؟

جواب: ظاہر ہے کہ میں عمر قید کو سزائے موت پر ترجیح دوں گا، زندگی خدا کی امانت ہے اور خدا کا حکم ہے کہ زندگی کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ میں نے اپنا سارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے کہ وہی کوئی بہتر صورت نکالے۔''

یہ مکالمہ سن کر خیال آیا کہ اس خط کو تو سنبھال کر رکھنا چاہیے، ممکن ہے ہماری نجات کا پروانہ ثابت ہو۔ اب آپ شہید کے اپنے انتقال سے چند گھنٹے قبل کیے گئے یادگار انٹرویو کے کچھ حصے ملاحظہ کیجیے اور اس میں درج بعض مکالموں سے اندازہ لگائیے کہ ایمان جب دل میں گھر کر جاتا ہے تو تن کی دنیا جیسی بھی ہو لیکن من کی دنیا کے چمن زار میں کیسے کیسے خوشبودار پھول بوٹے اگ آتے ہیں۔

سوال: آپ کا اصل نام کیا ہے؟

جواب: میرا اصل نام جو میرے والد نے رکھا ہے ایمل خان کاسی ہے۔ غلطی سے اسکول کے ریکارڈ اور شناختی کارڈ میں میر ایمل خان کاسی اندراج ہوگیا ہے۔ میر ہمارے علاقے میں بلوچ اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ میں پٹھان ہوں بلوچ نہیں ہوں اس لیے ''میر'' میرے نام کے ساتھ غلطی سے لگ گیا ہے۔ میرا جو اصل نام ہے وہ ایمل خان کاسی ہے۔

سوال: آپ امریکا کب آئے تھے؟

جواب: میں 1990ء میں آیا تھا۔

سوال: کس لیے؟

جواب: میرا ایک دوست یہاں پر رہتا تھا۔ وہ یہاں کا مستقل رہائشی تھا وہ یہاں ورجینیا میں رہتا تھا۔ میں یہاں آیا تھا ایک ملک دیکھنا تھا پھر میں کچھ اپنے پیسے ساتھ لایا تھا۔ میں نے کہا شاید کچھ بزنس کرلیں۔

سوال: آپ ڈیرہ غازی خان میں تھے جب آپ کو حراست میں لیا گیا، آپ ڈیرہ غازی خان میں کیا کر رہے تھے؟

جواب: میرے کچھ ساتھی تھے انہوں نے کہا ڈیرہ غازی خان چلتے ہیں وہاں پہ ان کی کوئی بزنس کی ڈیل ہے، کوئی سامان وغیرہ خریدنا چاہتے ہیں، افغانستان میں ہمیں رقم دیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں آپ کا ساتھ ہونے سے ہمیں فائدہ ہوگا کیونکہ آپ پڑھے لکھے ہیں اردو بھی جانتے ہیں۔ مجھے ان پر بھروسہ تھا لہٰذا میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں جاکر آدھی رات کو چھاپہ پڑا اور مجھے گرفتار کرلیا گیا۔

سوال: ایمل کاسی! آپ کو حراست میں لینے والے افراد امریکی اہلکار تھے یا پاکستانی؟

جواب: ان میں تین یا چار افراد امریکی تھے جبکہ دس یا بارہ لوگ پاکستانی تھے۔ یہ کارروائی آدھی رات کے وقت کی گئی

تھی۔

سوال: یہاں لائے جانے سے قبل کیا آپ کو پاکستانی عدالت میں پیش کیا گیا تھا؟

جواب: جی نہیں۔ مجھے پکڑنے کے بعد جس حوالات میں لے جایا گیا وہاں موجود ایک پاکستانی گارڈ نے بتایا کہ یہ امریکی سفارت خانے کی حوالات ہے، مجھے وہاں تین روز رکھنے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز یہاں لایا گیا، مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔

سوال: آپ نے اقبالِ جرم تو کر لیا لیکن کیا آپ عدالتی کارروائی سے مطمئن ہیں؟

جواب: جی نہیں۔ اول تو پاکستانی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجھے وہاں سے اغوا کیا گیا، پھر میری گرفتاری کے بعد یہاں کے ذرائع ابلاغ نے میرے خلاف انتہائی شدید پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور مجھے پہلے ہی مجرم قرار دے دیا گیا۔ مقدمہ کی کارروائی کے دوران جیوری کے حضرات اس پروپیگنڈہ سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ انہوں نے مجھ پر لگائی گئی ہر دفعہ کے فیصلے میں سخت ترین سزا تجویز کی جن میں عمر قید، جرمانہ اور سزائے موت شامل ہے۔ میرے خلاف انتہائی متعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ میرے خلاف عدالتی کارروائی بھی اسی علاقے میں کی گئی جہاں حملے کا واقعہ پیش آیا تھا اور قانون کے تحت یہ اقدام بھی غلط تھا۔

سوال: آپ کے خیال میں حکومت پاکستان نے غیر ملکی اہلکاروں کو ایک پاکستانی شہری کو لے جانے کی اجازت کیوں دی؟

جواب: میرے خیال میں اس کی وجہ ملک کی سیاسی صورت حال ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پاکستان کے حکمران آئین کی پرواہ نہیں کرتے اور غیر ملکی راہنماؤں کے دباؤ میں باآسانی آ جاتے ہیں۔

سوال: آپ نے کبھی سی آئی اے کے لیے یا اس سے متعلق کوئی کام کیا؟

جواب: میں نے سی آئی اے کے لیے کبھی کوئی کام نہیں کیا، جس وقت افغانستان میں جنگ ہو رہی تھی میں کوئٹہ کے ایک کالج میں پڑھتا تھا، پھر میں 1988ء تک یونیورسٹی میں رہا۔ میں نے کبھی بھی سی آئی اے کے لیے کام نہیں کیا۔

[اس سے اس پروپیگنڈے کی حقیقت معلوم ہوتی ہے جو کاسی کے اس اقدام کے اسباب پر پردہ ڈالنے کے لیے عالمی میڈیا نے کیا۔ انہوں نے مشہور کیا کہ کاسی نے اپنے عزیز کا بدلہ لینے کے لیے سی آئی اے کے ایجنٹوں کو قتل کیا کہ وہ خود بھی سی آئی اے کے لیے کام کرتا تھا، اس دوران اس کی دوسرے اہلکاروں سے دشمنی ہو گئی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کاسی ایک کوریئر کمپنی ''ایکسل'' میں کام کرتا تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ کمپنی سی آئی اے کے ایک اعلیٰ آفیسر کے بیٹے کرس مارسنی کی تھی اور سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں حساس دستاویزات پہنچاتی تھی۔ کاسی شہید اس دوران اس امر سے واقف ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں تب اس نے تن تنہا ان پر قاتلانہ حملے کا منصوبہ بنایا۔]

سوال: آپ کے اوپر الزام تھا عدالت میں کہ آپ نے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر پر فائرنگ کر کے دو لوگوں کو ہلاک، تین کو زخمی کیا۔ کیا آپ نے واقعی ایسا کیا؟

جواب: جی ہاں! میں نے ایسا کیا۔ میں نے اقرار کیا تھا اس بات کا اور اپنا اقبالی بیان ایف بی آئی والوں کو دیا تھا۔

سوال: کیوں؟

جواب: میں نے انہیں وجوہات بتائی تھیں، ان کی جو فارن پالیسی ہے اسی پر میں نے احتجاج کرنا تھا جو مڈل ایسٹ میں ہے۔ خاص طور پر وہ اسرائیلی پالیسی جو سراسر مسلمانوں اور فلسطینیوں کے خلاف ہے اس پر میں نے احتجاجی حملہ کیا۔

سوال: کاسی صاحب! آپ کو یقیناً معلوم تھا کہ کسی چیز پر احتجاج کرنے کا کوئی سیاسی طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ گن خریدنا اور خرید کر اس کا استعمال کرنا لوگوں کو ہلاک کرنا۔ یہ بات میری بھی اور بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے آخر ایسا کیوں کیا؟

جواب: ان کی فارن پالیسی کے بارے میں میرا جو غصہ تھا اس کا اس میں دخل تھا، میں نے خود جو گن کا طریقہ ہے اس کو سیاسی احتجاج پر ترجیح دی۔

سوال: آپ نے صرف سرکاری وکیل پر اکتفا کیوں کیا؟

جواب: اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں سرکاری وکیل کی صلاحیت سے مطمئن تھا اور دوسرے یہ کہ آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں وکلا کی فیسیں بہت زیادہ ہیں تو ایسی صورت میں وکیل کو فیس دینے سے بہتر ہے کہ کسی غریب پاکستانی کی مدد کی جائے۔

سوال: اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ 25 جنوری 1993ء کی صبح آپ کی زندگی میں دوبارہ آ جائے اور آپ سی آئی اے کے صدر دفتر کے باہر موجود ہوں تو اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟

جواب: میرے خیال میں میں وہی کروں گا جو میں نے پہلے کیا۔ میں ان کی (امریکی) حکومت کے لوگوں کو حملے کا نشانہ بناتا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا مجھے اس پر قطعی طور پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔

سوال: آپ نے سی آئی اے کو ہی نشانہ کیوں بنایا؟

جواب: سی آئی اے ایک خاصا بڑا ادارہ ہے۔ ان پر حملہ کرنا میرے بس میں تھا اور میں جو کچھ کر سکتا تھا میں نے وہی کیا۔

سوال: آپ کیا چاہتے ہیں کہ آپ کے اس دنیا سے جانے کے بعد لوگ آپ کو کن الفاظ میں یاد کریں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ لوگ مجھے اچھے الفاظ میں ہی یاد کریں گے۔ لوگوں کی ہمدردیاں اب بھی میرے ساتھ ہیں۔ پاکستان میں بہت سے لوگوں نے مجھے خطوط ارسال کیے ہیں۔ آپ یقین کیجیے کہ گزشتہ کئی روز سے مجھے امریکیوں کے خطوط بھی موصول ہو رہے ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو امریکی پالیسیوں اور سزائے موت کے خلاف ہیں۔

[شہید کی یہ تمنا اس کی توقعات سے بڑھ کر پوری ہوئی اور اس کی شہادت کے بعد لاکھوں عوام بے ساختہ اس کے جنازے میں شرکت کے لیے امڈ آئے اور کیفیت یہ تھی کہ وہ زبان سے تو اس کے لیے دعائے مغفرت کر رہے تھے لیکن دل میں اس جنازے میں حاضری کو خود اپنے لیے باعثِ مغفرت سمجھ رہے تھے۔]

سوال: آپ کو اس کام سے کیا حاصل ہوا؟

جواب: میرے خیال میں امریکا کے خلاف جو احتجاج میں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میں نے کیا اور اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

سوال: آپ کے خیال میں اس سے کچھ فرق پڑا یا کچھ بدلا؟

جواب: جو احتجاجی بیان میں نے دینا تھا وہ دے دیا اور انہیں (امریکا) بتا دیا کہ اگر ان کی پالیسیوں سے پاکستانی مسلمان متاثر ہوتے ہیں تو ان کے عوام کو بھی حملے کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور یہ لوگ یہاں امریکا میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ میں نے

انہیں یہ پیغام دے دیا ہے۔

سوال: ان تمام باتوں کے علاوہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

جواب: پاکستانی شہری ہونے کی حیثیت سے میں حکومت پاکستان کے حوالے سے بہت مایوس ہوں کیونکہ انہوں نے میرے کیس کو بین الاقوامی عدالت تک لے جانے میں میری کوئی مدد نہیں کی اور مجھے ان کے اس ردعمل پر انتہائی افسوس ہے۔"

کاسی کا یہ شکوہ دراصل پورے عالم اسلام سے ہے۔ ہر اس شخص سے ہے جو کلمہ پڑھتا ہے لیکن دوسرے کلمہ گو مسلمانوں کا درد دل میں نہیں رکھتا۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انٹرویو لینے والے کے لیے یہ چیز انتہائی انوکھی تھی کہ جو شخص چند گھنٹوں کے بعد یقینی موت کا سامنا کرنے والا ہے وہ اتنے باوقار، متانت آمیز اور حوصلہ مندرویے کے ساتھ کیونکر گفتگو کر رہا ہے؟ دراصل جس شخص کے استقبال کی تیاریاں آسمانوں پر ہو رہی ہوں وہ زمین والوں کو کیا خاک خاطر میں لائے گا؟ لیکن افسوس کہ دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر ہم اس جاں فزا حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ شہید کی یادگار باتیں آپ نے پڑھ لیں اب آخر میں تین باتیں کہنا مطلوب ہیں، ایک امریکی حکام سے، دوسری اپنے وطن کے ارباب اقتدار سے اور تیسری 61 ممالک میں پھیلے ہوئے ڈیڑھ ارب مسلمانوں سے۔

جس دھج سے کوئی "مشہد" کو گیا......:

امریکی حکام کو یہ سوچنا چاہیے کہ ایک بااثر اور کھاتے پیتے گھرانے کا پڑھا لکھا نوجوان جو اپنے والد کی وفات کے بعد خاندانی جائیداد میں سے اپنے حصے کا پیسہ لے کر کاروبار کرنے کی غرض سے امریکا جاتا ہے، وہ ایک صبح آٹومیٹک رائفل لے کر سی آئی اے کے صدر دفتر کے باہر کھڑی کاروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کیوں کرتا ہے؟ جبکہ ورجینیا کے اٹارنی جنرل جو استغاثہ کی سربراہی کر رہے تھے، خود بھی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ انہیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ کاسی کا تعلق کسی بھی دہشت گرد تنظیم سے رہا ہو۔ ادنیٰ عقل رکھنے والا امریکی بھی سمجھ سکتا ہے کہ امریکی حکومت کے استعماری کردار اور صہیونیت کی بے جا پشت پناہی کے علاوہ اس کا سبب اور کیا ہو سکتا ہے؟ امریکی حکام نے شہید کی گرفتاری کے لیے چار سال تک ہزاروں ڈالر خرچ کیے، اس کی معروف عالم خفیہ تنظیم سی آئی اے کے اہلکار اس عرصے میں بلوچستان اور ملحقہ سرحدات کی خاک چھانتے رہے، سی آئی اے کے سربراہ کے حکم سے شہید کی تصویر والی دو کروڑ ماچسیں تیار کروا کر مفت تقسیم کی گئیں، مُخبری کرنے والے کے لیے پہلے 20 لاکھ بعد میں 35 لاکھ ڈالر انعام رکھا گیا (یعنی تقریباً ساڑھے اکیس کروڑ روپے۔ یہ وہی خطیر رقم ہے جس کی تقسیم پر امریکی جج نے پوری پاکستانی قوم کو گالیوں کے تحفے سے نوازا تھا۔ بعد کی اطلاعات کے مطابق یہ "عطائیہ" کوئٹہ کے کمشنر کے پی اے کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو کر "حسب خدمت" تقسیم ہوا) امریکی حکام نے اپنی خفیہ تنظیم کی ساکھ بچانے کے لیے اتنا کچھ کیا لیکن وہ امریکی تجزیہ نگاروں کے اس بیان پر غور کرنے پر تیار نہیں کہ "کاسی کا عمل مسلمانوں کے ایک طبقے میں امریکا کے خلاف بڑھتے ہوئے غم و غصہ کی ابتدائی نشانی تھی اور اس کی سزائے موت نے اس جذبہ کو تقویت دی ہے" حتیٰ کہ زہریلے انجکشن لگائے جانے کے بعد اس کا اثر ہونے سے ذرا پہلے کاسی کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کے اس اشارے کو سمجھنے کی بھی کسی نے کوشش نہیں کی جس سے کاسی عشق کی بازی جیتنے کا اشارہ دے رہا تھا مگر یہودی پروپیگنڈہ باز اسے امن کی علامت سے تعبیر کر رہے تھے۔ کیا امریکی اتنی بات نہیں سمجھ

سکتے کہ کوئی مجرم اتنی شان اور سج دھج سے اپنے مقتل (اوہ! معاف کیجیے مشہد کہنا چاہیے تھا) کی طرف جاتا ہے کہ کسی کا سہارا لینے کے بجائے ساری دنیا کو اپنے رب اور قرآن کا سہارا لینے کی تلقین کر رہا ہو۔

برسرِ عام:

دوسری گزارش اپنے وطن کے حکمرانوں سے کہ اگر وہ خود اپنی اور اپنے ملک کی عزت نہیں کروائیں گے تو دنیا میں کون ہمیں عزت دینے پر تیار ہوگا؟ اگر ہمارا قانون (مشہور قانون دان اکرم شیخ نے کسی پاکستانی کو کسی دوسری حکومت کے حوالے کرنے کا سارا طریقہ کار قوم کے سامنے بیان کر دیا ہے) خود حکومت کے نزدیک قابل عمل و احترام نہیں تو کوئی پاکستانی شہری یا غیر ملکی باشندہ کیسے اس کی تکریم کرے گا؟ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسانی حقوق کی تنظیمیں ہم سے اپیل کر رہی ہیں کہ ہم اپنے شہریوں کو ایسے ملک کے حوالے نہ کریں جہاں ان کے حقوق پامال کیے جائیں۔ یاد رہے کہ ایمنسٹی نے اس واقعہ کے حوالے سے پاکستانی حکومت سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ اپنے کسی بھی شہری کو ایسے ملک کی تحویل میں نہ دے جہاں اس شہری کے انسانی حقوق خطرے میں ہوں، خاص طور پر اگر اس پر ''دہشت گرد کارروائیوں'' کا الزام لگایا جا رہا ہو۔ ایمنسٹی کے مطابق حال میں پاکستان نے اپنے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بے شمار شہری امریکا کے حوالے کیے ہیں جن پر القاعدہ سے تعلق رکھنے کا شبہ ہے۔ کیا وہ قوم بھی دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ جینے کا حق یا تمنا رکھتی ہے جسے دوسرے تلقین کریں کہ وہ اپنوں کا خیال رکھے لیکن ان کا ایک سابقہ حکمران اسے ایک فون پر غیروں کے سپرد کر دے اور دوسرا اس کی دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھانے سے بھی برسرِ عام انکار کر دے؟

سمجھنے کی بات:

تیسری بات عالم اسلام سے کہنے کی ہے۔ امریکا نے رمضان کے مقدس مہینے میں عید سے کچھ دن قبل ہمارے ایک بھائی کو شہید کیا۔ کیا امریکا میں جو ایک سیکولر اسٹیٹ ہے کسی عیسائی مجرم کو ''کرسمس'' سے کچھ پہلے یا کسی یہودی مجرم کو ''ہانوکا'' سے کچھ پہلے سزائے موت دی جاتی ہے؟ اگر نہیں تو اس نے اس عمل کے ذریعے عالم اسلام کو کیا پیغام دیا ہے؟ کیا وہ اس سزا کو چند دن مؤخر نہیں کر سکتا تھا؟ خدارا! اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، اپنے معاشرے میں دیانت اور انصاف کو رواج دیجیے اور اپنی علمی و عسکری ترقی کی فکر کیجیے ورنہ کلمہ پڑھتے ہوئے رب کو جان دینے والے شہدا اپنے رب کے حضور پہنچ کر ہماری بے حسی پر شکوہ کرتے رہیں گے اور ہم پر سے ذلت و خواری کی چھاپ ختم نہ ہوگی۔

نظریۂ فنا و بقا

''مسلمان شان کے ساتھ جیتا اور آن کے ساتھ اس دنیا سے جاتا ہے۔'' اس قول کو کسی نے سچا کر کے دکھایا تو وہ شیرِ اسلام ابوالفتح سلطان فتح علی ٹیپو رحمہ اللہ ہیں۔ آج کل زندگی کے قرینے ہی بدل گئے ہیں اس لیے سلطان کا ذکر ہی ہماری محفلوں اور زبانوں سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ بعینہٖ وہی صورتِ حال ہے جو اس مردِ خدا کو دشمنوں کے ساتھ مقابلے کے وقت پیش تھی کہ ایک طرف تو وہ حیدرآباد کے مسلمان حکمرانوں اور غیر مسلم مرہٹوں کو انگریز کے ناپاک ارادے سمجھاتے ہوئے خدا کے نام اور وطن کی سالمیت کی خاطر متحد ہونے یا کم از کم انگریزوں کے ساتھ مل کر اس کی مخالفت سے باز آنے کی تلقین کر رہا تھا اور دوسری طرف افغانستان، ایران، فرانس اور سلطنت عثمانیہ سے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے لیے انگریزوں کے خلاف اتحاد اور تعاون کے لیے سفارتیں بھیج رہا تھا...... ہر محاذ پر عظیم مردِ مجاہد تن تنہا سرگرم تھا...... لیکن...... تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ لگتا ہے وہی روح یا بدروح ہے جو مسلم حکمرانوں میں تین صدیوں سے حلول کر گئی ہے۔ ایک ہی طرح کی سڑی ہوئی شراب ہے جس نے احمقانہ قسم کی مستی چڑھا رکھی ہے۔ آج کل ہم کراچی میں سقوطِ حیدرآباد و سقوطِ جونا گڑھ کے المناک مرثیے سنتے ہیں لیکن ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' دکن کے اعلیٰ حضرت جناب نظام نے اپنے ہم مذہب، ہم وطن اور فطری حلیف سلطان ٹیپو کے بجائے بلاوجہ اور بلاسبب انگریزوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کو ترجیح دی اور مسلمان کے اس مردِ آہن کے خلاف ''فرنٹ لائن اتحادی'' کا شرمناک کردار ادا کر کے خود کو ہمیشہ کے لیے لعن طعن کا ہدف بنا دیا۔ اب اس پر افسوس کرنے اور سقوط کا ماتم کرنے سے کیا حاصل؟؟؟

ایک طرف بیرونی دشمنوں یعنی انگریز عیسائیوں، مرہٹے ہندوؤں اور نظامی منافقوں نے سلطان کا گھیراؤ کر رکھا تھا تو دوسری طرف درونِ خانہ میر صادق اور پورنیا جیسے بیوروکریٹ اور غلام علی لنگڑا جیسے غدارِ ملت، ننگ قوم اور اسفل ترین فطرت کے مالک منافقین، شیرِ میسور کے جہاد فی سبیل اللہ کی کامیابی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ تقدیر کا علم تو خدا کو ہے لیکن مؤرخ جب حالات کا جائزہ اور فریقین کی جنگی قوت اور حکمت عملی کا تجزیہ کرتا ہے تو یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتا ہے کہ ایمان کے یہ سوداگر ضمیر فروشی نہ کرتے اور سلطان کو انگریزوں کے خلاف آزاد چھوڑ دیا جاتا تو سلطان جیسے بیدار مغز حکمران اور فطری مجاہد کے لیے فارمی نسل کے انگریزوں کو رگیدنا اور ان کی ناک خاک میں ملانا کچھ بھی مشکل نہ تھا اور آج برصغیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہاں انگریزوں کے ٹوڈی، ٹاؤٹ، وظیفہ خور، کاسہ لیس، جی حضوریے، ایمان فروش، ننگ قوم اور اسفلی منافق نہیں بلکہ ٹیپو کے وارث مشیروں جیسی صفات رکھنے والے مؤمن کامل، کھرے قول و عمل والے، نفاق سے پاک کردار کے حامل مسلمانوں کے ہمدرد اور اسلام کی آن پر مرمٹنے والے لوگ مقتدر طبقہ میں ہوتے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ ہم جب بھی اخبار میں کسی کے حلف اُٹھانے کی خبر پڑھتے ہیں تو ہمیں بے ساختہ میر صادق کا حلف یاد آجاتا ہے۔ میر صادق نے حلف اُٹھا اُٹھا کر سلطان ٹیپو سے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا

لیکن اس کم بختِ دوران بد بخت پر ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ اس نے اس حلف سے غداری نہ کی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل حلف کے الفاظ کے مطابق کوئی چلے تو یہ ملک رشک گلزار بن جائے لیکن شاید حلف اُٹھائے اس لیے جاتے ہیں کہ انہیں توڑ کر غضب الٰہی کا شکار بنا جائے۔ میر صادق سلطان ٹیپو رحمہ اللہ کا منتظم اعلیٰ (چیف ایگزیکٹو) تھا۔ ذرا اس کے حلف کے الفاظ دیکھیے! کہیں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہنمی دنبہ درون خانہ انگریزوں سے ساز باز کر چکا تھا:

جولائی 1798ء

''میں میر صادق، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قسم کھا کر یہ عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے آقا (ٹیپو سلطان) کی دل و جان سے وفاداری کروں گا اور اپنی آنکھوں، اپنے کانوں، اپنی زبان اور اپنے ہاتھوں سے اپنے مالک کی خیر خواہی کروں گا۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا۔ اگر خدانخواستہ میں کسی غلطی کا مرتکب ہوا یا میں نے کوئی حکم عدولی کی تو اللہ مجھے غارت کرے اور مجھ پر اللہ کا قہر نازل ہو۔''

اب ذرا ایک اور پہلو ملاحظہ کیجیے! یہ سلطان کی فطرت اور کردار کا وہ پہلو ہے جو اس کے لیے اور ہمارے لیے سرمایۂ عزت وافتخار ہے۔ یہ انسانی کردار کا وہ قیمتی جوہر ہے کہ انسان کا سب کچھ لٹ جائے لیکن تن تنہا یہ چیز اسے ابدالآباد تک زندہ جاوید، سرفراز و سربلند رکھتی اور اس کے نام کو روشن کرتی اور جگمگاتی ہے۔ سلطان شیروں سے محبت کرتا اور اپنے مجاہد فوجیوں اور عوام کو شیروں والی صفات اپنانے کی تلقین کرتا تھا۔ اس نے آخری دم اپنے اس قول کی لاج رکھی اور میدان سے منہ موڑنے یا چند دن کی ذلیل زندگی کی بھیک مانگنے کے بجائے یقینی موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی شیروں کی طرح عین اس جگہ جا گھسا جہاں اس کے ساتھی معرکہ گرم کیے ہوئے جامِ شہادت نوش کر رہے تھے۔ قارئین کرام! صورتِ حال واضح نہ ہو سکے گی اور اس شیر مرد کی جواں مردی کے تذکرے کا حق ادا نہ ہوگا۔ اگر ہم سلطان کو درپیش حالات کے تحت اس کی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی حالت کا مطالعہ نہ کر لیں۔

1799ء کے آغاز میں جب انگریزوں نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کیا تو یہ سلطان اور انگریزوں کے درمیان چوتھی جنگ تھی۔ سلطان اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ فیصلہ کن اور حتمی نتیجے تک نہ ختم ہونے والی جنگ ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ حیدر آباد کے تنگ چوڑی دار پاجامے پہنے اعلیٰ حضرت نظام صاحب مکار گوری چمڑی کے ''کولیشن پارٹنر'' بن چکے ہیں۔ قلعے میں باہر سے رسد آنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ انگریزوں کی طرف سے صلح کا پیغام بار بار آ رہا ہے اور ہر بار سلطان کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ ''نوے ہزار بچوں کو یتیم کروانے کے بجائے نوے ہزار قیدیوں کو بچا کر لے آئے۔'' فرانسیسی فوج کا دستہ اس سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ محفوظ مقام کی طرف نکل جائے اور قلعے کی حفاظت ان پر چھوڑ دی جائے۔ اگر اس کو شک ہے تو اپنے اطمینان کے لیے وہ ان میں سے کچھ جوانوں کو گروی رکھ لے۔ سلطان کو پتہ ہے کہ انگریز اسے اپنے راستے کی آخری رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ وہ ہٹ جائے تو اس کے بدلے جو چاہے مل سکتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ دہلی سے حیدر آباد تک اب اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہ آئے گا......اور اگر یہ قلعہ اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تو نہ صرف یہ کہ رُوئے زمین پر اس کے لیے کوئی پناہ گاہ نہ بچے گی نیز اس کے اہل و عیال اور اسے جان سے زیادہ عزیز فوج اور عوام اس کے سامنے ذبح ہوں گے بلکہ یہ ریاست جاتی رہی تو ''اسلام کا قلعہ'' ڈھے جائے گا اور

چونا لگے مکار انگریزوں کا عیسائیت کی جھاگ اُڑاتا صلیبی سیلاب پورے برصغیر کو بہالے جائے گا۔ ان سے صلح کر کے خود کو نہیں تو وطن کو بچالیں کہ ''سب سے پہلے'' تو وطن ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی تو ''اخلاص وایمان'' اور ''حب الوطنی'' کی علامت ہے۔

یہ سب کچھ اس کے سامنے تھا...... لیکن سلطان کا فیصلہ کیا تھا؟ اس کے لیے ہمیں 4 مئی 1799ء کی صبح کی طرف جانا ہوگا۔

آج کے دن سلطان نے صبح سویرے غسل کیا۔ اپنے مشیر خاص حبیب اللہ کے ساتھ اپنی تعمیر کردہ قلعہ کی سب سے بڑی مسجد ''جامع مسجدِ اعلیٰ'' میں فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ جنگی وردی پہنی۔ سچے مردِ مجاہد کی طرح اپنے پسندیدہ ہتھیار سجائے اور مورچوں کے معاینے اور جوانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے نکلا۔ دوپہر تک سب خیر تھی۔ مئی کی کڑکتی دھوپ، دن کا اُجالا اور سلطان جیسے محبوب کمانڈر کی بذاتِ خود مجاہدین کے درمیان موجودگی، کسی کو تصور بھی نہ تھا کہ دن کے وقت انگریز فوج دریائے کاویری کی چٹانیں، قلعے کے گرد خندق اور پھر فصیل پر پہرہ دیتے میسوری مجاہدین کے مورچے عبور کر کے حملے کی احمقانہ جرأت کرے گی۔ سلطان اپنا راؤنڈ ختم کر کے آم کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا۔ دوپہر کا کھانا لایا گیا۔ ابھی اس نے ایک لقمہ اُٹھایا ہی تھا کہ اطلاع ملی میر صادق کی ساز باز سے مجاہدین کو تنخواہ دینے کے بہانے پیچھے بلالیا گیا تھا اور انگریزوں نے اس گندی نسل کے کیڑے کا اشارہ پا کر حملہ کر دیا ہے۔ اب ذرا اس نازک اور فیصلہ کن وقت میں اس شیر ابن شیر کے اقدامات دیکھیے جبکہ اس کو اپنے قابل ترین کمانڈر سید غفار کی شہادت کی اطلاع بھی عین اسی وقت ملی تھی۔ اس نے جواں مردوں کی طرح حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے فوراً سید غفار شہید کے متبادل کمانڈر کی تقرری کی اور خود اپنا گھوڑا اور خصوصی دستہ لے کر مجاہدین کو ہدایات دینے اور آخری معرکے کو شان سے لڑنے کی تاکید کرنے نکلا۔ اس کے بعد اگر کوئی دنیا پرست گیدڑ زادہ ہوتا تو شاہی محل کو چلا جاتا اور وہاں کی کھڑکیوں سے تانک جھانک کر جنگ کی خبریں حاصل کرتا لیکن ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' کا مقولہ بھی تو خدا نے آج ہی یادگار بنانا تھا۔ سلطان نے جب دیکھا کہ انگریزوں کی یلغار زور پکڑ رہی ہے تو یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے بہادر شاہ ظفر کے سامنے جب جنرل بخت خان نے تجویز رکھی کہ جنگل کو نکل چلتے ہیں اور وہاں سے انگریزوں کے خلاف جنگ کی کمان کرتے ہیں تو اس نے جواں مردانہ فیصلہ کرنے کے بجائے خود کو تن بہ تقدیر کرنے اور اپنی بزدلی کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کی درخواست کے پیچھے چھپانا چاہا اور ناقابلِ رشک انجام سے دوچار ہوا۔ سلطان صحیح معنوں میں شیر تھا اور جب شیر کو ذلت کی زندگی اور عزت کی موت میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑ جائے تو وہ بلاجھجک اور بلاتردد جنگ کے شعلوں میں کود کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے مزے لیتا اور باقی رہنے والی روایت قائم کرتا ہے۔

اس وقت اگر ٹیپو سلطان محل میں مقید ہو کر سفید جھنڈا لہرادیتا اور صرف ایک جملہ کہہ دیتا: ''ہم انگریز کے ساتھ ہیں'' تو اس کی جان اور سلطنت کی سلامتی کی ضمانت مل سکتی تھی...... لیکن اس نے وہ راستہ اختیار کیا جس کی بنا پر آج بھی دشمن اسے عزت کے لفظ سے یاد کرنے پر مجبور ہیں اور ''گاجر کھانے اور چھڑی دکھانے'' کا طعنہ نہیں دے سکتے۔ اس شیر دل نے وہ جملہ کہا جو لوحِ عالم پر ثباتِ دوام حاصل کر چکا ہے اور رہتی دنیا تک انسانیت...... جی ہاں انسانوں اور انسانیت کے لیے نہ کہ حیوانیت زدہ انسان نماؤں کے لیے...... عزت ووقار کا پرچم بن چکا ہے۔ اس نے دیکھا کہ سب سے زیادہ زوردار حملہ کہاں ہے اور معرکہ کی گرمی کا رُخ کس طرف ہے؟ واٹر گیٹ پر معرکہ ''فنا وبقا'' لڑا جا رہا تھا۔ وہ بلاخوف وتردد آتش نمرود میں کود پڑا۔ سلطان کی لاش وہاں اس

حال میں پائی گئی کہ اس کے ارد گرد پانچ سو مجاہدین کی لاشیں تھیں۔اندازہ لگائیے معرکہ کس قدر خون ریز رہا ہوگا اور کس گھمسان کا رن پڑا ہوگا؟ نیز یہ بھی سوچیے کہ کیا غیرت مند امیر اور اس کے جاں نثار مجاہدین کی طرف سے وفا اور خلوص کا دو طرفہ اظہار اس سے زیادہ خوبی اور جرأت کے ساتھ ممکن ہے؟؟؟ شیر دل سلطان نے فانی زندگی کو قربان کر کے دوست و دشمن سب کے دل میں لافانی مقام حاصل کیا۔انگریز بھی اسے ''ٹائیگر آف میسور'' کا خطاب دینے پر مجبور ہوئے اور اس سے منسوب ایک ایک چیز کو عزت واحترام سے اپنے میوزیم میں سجا کر رکھتے ہیں۔جبکہ اس نے صرف...... میں دُہراتا ہوں......صرف سترہ سال حکومت کی۔دوسری طرف دکن کے نظام نے انگریزوں کے زیرِ سایہ 1748ء سے 1948ء یعنی دو سو سال تک حکومت کی مگر آج ان کا نام ڈھنگ سے لینے پر کوئی آمادہ نہیں۔یہ ہے فنا و بقا کا وہ راز جسے آج نئی نسل سے چھپانے اور قوم کے دلوں سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

پاکستان کی جدوجہد کا آغاز سلطان ٹیپو شہید نے کیا تھا۔آج سلطان کے حقیقی وارث (اہالیانِ پاکستان) سلطان کے نوادرات واپس لانے اور انگریز سے انتقام کی فکر تو کیا کرتے اس کے تذکرے سے بھی منہ موڑے رکھنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔البتہ ہماری نصابی کتابوں میں چرچا ہے تو بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا، جس نے ساری زندگی انقلاب اور آزادی کے بغیر ایک پریشان روح کی طرح گزاری اور جواں مردی کی موت کے بجائے انگریزوں کی خوشنودی اور پھر ان کی قید میں بے بسی کی عبرتناک موت کو ترجیح دی۔

پاکستان کے کلمہ گوؤں پر فرض ہے کہ شیر کے نظریۂ فنا اور گیدڑ کے نظریۂ بقا کو یاد رکھیں۔اس کے بغیر پاکستان بن سکتا تھا نہ محفوظ رہ سکتا ہے۔تاریخ کے بننے اور بگڑنے، قوموں کے بچنے اور برباد ہونے، ترقی پانے یا زوال کا شکار ہونے کا راز اس نظریے کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔

قدرت کی بخشش

ہمارے ایک استاذ جی عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔ بظاہر بڑے سادہ اور دنیا سے لاتعلق......لیکن بندے کو پہچاننے اور اسے اس کے حساب سے کسی کام میں لگانے اور اس کے اندر سوئی روح بیدار کرنے میں انہیں زبردست قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ وہ خاموشی سے انسانوں کا مطالعہ کرنے اور درست ترین تجزیہ کرنے میں ماہر تھے۔ کسی آدم زاد کی پرکھ میں خال خال ہی کہیں ان سے غلطی ہوئی ہوگی۔ اکثر وبیشتر ان کی کہی ہوئی باتیں، تاثرات اور تجزیے درست نکلتے اور ایمانی فراست کا نمونہ ہوتے تھے۔

وہ لاابالی اور غفلت کا شکار طالب علم کا گھیرا بڑی خوبصورتی سے کرتے تھے۔ کبھی اس کو دوسروں کا نگران بنا دیتے، کہیں اس کی خاندانی شرافت یا حسب نسب کا تذکرہ کر کے اسے یہاں تک لے آتے کہ وہ سستی اور کاہلی کو اپنے لیے عار سمجھتا، کبھی اس کو ذمہ داری دے کر باز پرس کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ اس کے لیے کام کیے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہتا، کبھی شاباش اور کبھی تحفہ وغیرہ کے ذریعے حوصلہ افزائی سے کام نکال لیتے۔ انسانی کردار کے حوالے سے ان کی پیش گوئیاں اکثر وبیشتر درست ثابت ہوتی تھیں۔

ان کے سادہ سے جملے ایسے درست اور برمحل بیٹھتے تھے کہ سبحان اللہ! ''دریا بہ کوزہ'' کا مصداق ہوتے تھے۔ بہت سے کام کے طلبہ جو نوعمری کی روایتی غفلت اور بے توجہی سے ضائع ہو رہے ہوتے تھے، ان کی محنت سے راہ پر لگے اور ان کی زندگی ہی میں بڑے مرتبے پر پہنچے۔ ان کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے لگائے ہوئے یہ پودے تناور درخت بن گئے اور اپنے اپنے علاقوں میں دین کے کام کی کئی شکلیں سنبھال لیں تو جب وہ اس مشفق ومہربان مربّی سے ملنے آتے تو استاذ جی تواضع سے ان کے ساتھ ہم مرتبہ لوگوں کی طرح پاؤں سکیڑ کر بیٹھتے تھے۔ بلکہ پکارنے میں اپنے شاگردوں کو ''استاذ جی'' کہا کرتے تھے۔

ان کے شاگرد تو شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتے۔ کوئی ناواقف سنتا تو حیران ہوتا کہ یہ نوجوان کس طرح اس معمر بزرگ کے استاذ جی ہو سکتے ہیں؟ لیکن ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ میرے یہ سارے بچے اپنی اپنی جگہ استاذ ہیں اور بہت معیاری کام کر رہے ہیں، اس لیے میں ان کو ''استاذ جی'' ہی کہا کروں گا۔

استاذ جی کے ہاتھوں میں برکت بہت تھی۔ جو ان سے فیض یاب ہو جاتا اس کی قسمت یاوری کر جاتی۔ تب استاذ جی کھڑے اس کی کامیابیوں پر خوش ہو کر مسکرایا کرتے اور شکر سے اس طرح جھک جاتے جیسے پھلوں سے لدے پیڑ کی ڈالیاں۔ ان کے اخلاص کا کمال تھا کہ وہ کبھی اپنے شاگردوں کی کامیابیاں اپنے کھاتے میں ڈالنے یا فخر جتانے کی کوشش نہ کرتے۔ اگر کبھی کوئی ان سے فیض یافتہ شخصیات کی بلند مرتبے کا تذکرہ چھیڑتا تو فوراً بات کو اپنی مدح سے ہٹا کر ان طلبہ کی ستائش کی طرف پھیر دیتے اور اگر کبھی کوئی ان کی مردم ساز صفت کو موضوع سخن بناتا تو طرح دے جاتے۔ البتہ ایک مرتبہ چل چلاؤ میں ایک جملہ ایسا کہہ گئے جو اب تک ان سے یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔

فرمایا: ''کچھ چیزیں کچھ لوگوں کو قدرت کی طرف سے بخشش ہوتی ہیں۔''

یہ تبصرہ ان کی زندگی اور محنتوں کا حاصل تھا اور اگر یہ بات سچ ہے...... اور کوئی وجہ نہیں کہ سچ نہ ہو...... تو دارالافتاء والارشاد کے بانی اور ضربِ مؤمن، الرشید ٹرسٹ، جامعۃ الرشید، صفہ اسکول جیسے عظیم صحافتی، علمی اور رفاہی اداروں کے مؤسس اور سرپرست حضرت والا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی ''بخشش'' سے نوازا تھا۔ ان کے وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے اصلاحی، علمی اور تصنیفی و رفاہی کاموں کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس ''بخشش'' کی حدود ''شانِ تجدید'' سے جا ٹکراتی ہیں۔

دین کے کچھ شعبے ایسے ہیں جن کو اس دور میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے نئی تازگی اور اُٹھان بخشی۔ تصلّب فی الدین، ترکِ منکرات اور افتاء وارشاد کے ذریعے سے وسیع پیمانے پر عوام الناس کی دینی راہنمائی واصلاح، ذاتی واجتماعی زندگی میں بے مثال نظم وضبط، تقویٰ واحتیاط، سخاوت وشجاعت، اُصول پسندی اور بلند حوصلگی تو تھے ہی آپ کے مخصوص اور نمایاں اوصاف...... لیکن صحافت، رفاہی خدمات اور ارشاد و جہاد کے حوالے سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ سے بے نظیر کام لیا اور اب آپ کے بعد آپ کی اس صفت کا ظہور آپ کے خلفا اور تربیت یافتہ مسترشدین کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ یہ تحریر اس حوالے سے چند اہم باتوں کے تذکرے کے لیے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس کی وقیع علمی واصلاحی خدمات ہماری تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔ ان اداروں نے اللہ رب العزت کے سہارے ریاستی وسائل وطاقت کی پشت پناہی کے بغیر محض عامۃ المسلمین کے تعاون سے وہ کام کر دکھایا ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ ان کے بانیوں نے نہ صرف یہ کہ مشکل حالات میں اپنا فرض ادا کیا اور جو ذمہ داری اہلِ علم کے طبقے پر عائد ہوئی اسے انتہائی ناموافق حالات میں حیرت انگیز طور پر پورا کر کے دکھایا بلکہ اسے اس خوبصورتی سے نبھایا کہ بنظرِ انصاف ان کے کام کا مطالعہ کیا جائے تو انسان داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ ان مدارس نے عصرِ حاضر کی ضروریات اور زمانے کے بدلتے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے بہتر سے بہترین کی طرف پیش رفت جاری رکھی اور وہ کام بھی کیے جو تعلیمی اداروں کے منشور میں شامل نہیں ہوئے لیکن کوئی دوسرا طبقہ اس کو پورا نہیں کر رہا تھا اور معاشرے میں ان کی ضرورت اس قدر تھی کہ دینی مدارس کو ہی اس سلسلے میں آگے آنا پڑا۔ جامعۃ الرشید کے شروع کردہ چند شعبے اس کی بہترین مثال ہیں۔

''کلیۃ الشریعہ'' کو لے لیجیے۔ عوام کے لیے ''فہم دین کورس''، ''حج تربیت پروگرام'' اور ''جغرافیہ قرآنی وسیرت نبوی'' کے پروگرام بھی اگرچہ اپنی جگہ اہم تھے لیکن ''کلیۃ الشریعہ'' کے نام سے پوسٹ گریجویشن کورس کے اس سلسلے کے مقاصد وطریقہ کار کا جائزہ لیا جائے تو روح خوش ہو جاتی ہے۔ دنیوی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جب علم دین کے زیور سے آراستہ ہو کر معاشرے میں نفوذ کریں گے تو جو خیر اور بھلائیاں وجود میں آئیں گی ان کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس شعبے کی مکمل تفصیل جامعۃ الرشید کے خوبصورت تعارف نامے میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو شائع ہو چکا ہے۔ یہاں ہم اس شعبے کی مزید تفصیل میں نہیں جائیں گے کہ فی الوقت ان تین شعبوں کا تذکرہ مقصود ہے جو اگلے ہفتے جامعہ میں شروع ہو رہے ہیں۔

جامعۃ الرشید میں فضلائے کرام کے لیے تکمیل اور تخصص کے دو شعبے سالہا سال سے چلے آ رہے ہیں، جہاں سند فضیلت

حاصل کرنے والے علمائے کرام کو درسِ نظامی سے فراغت کے بعد عملی میدان میں جانے سے قبل کچھ ان چیزوں کی تیاری کرائی جا رہی ہے جن کو سیکھنے کا موقع انہیں تعلیم کی جاں گسل مصروفیات کے دوران نہ مل سکا تھا۔ درجہ تخصص میں افتاء کی مشق کے علاوہ فلکیات (تخریج سمت قبلہ، تخریج اوقات نماز اور مباحث رؤیت ہلال)، بینکنگ (سودی و اسلامی بینکاری کا مکمل تقابل و تعارف اور طریق کار) اور تاریخ و جغرافیہ طبعی و قرآنی وہ قابلِ ذکر مضامین ہیں جن کو جامعۃ الرشید کا امتیاز کہا جا سکتا ہے۔ گزشتہ سال 10 شعبان تا 20 رمضان ہر روز ان مضامین کا مستقل کورس بھی کروایا گیا لیکن اس کا اعلان قدرے تاخیر سے ہوا جس پر ملک بھر سے احباب نے شکوہ کیا۔ رواں سال کے اختتام پر ان شاء اللہ تعالیٰ ان کو خوب اہتمام کے ساتھ منعقد کیے جانے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں کامیابی عطا فرمائیں۔ آمین۔

قارئین سے التماس ہے کہ دُعا کریں جامعۃ الرشید کو اللہ رب العزت کی طرف سے یہ خصوصی ''بخشش'' جاری و ساری رہے اور مسلم اُمہ کی وہ توقعات پوری ہوسکیں جو وہ دینی مدارس سے وابستہ رکھتے ہیں۔

میچور ہونے تک

بندہ اپنی زندگی میں جن لوگوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ان میں ایک ''استاد جی'' تھے۔ یوں تو ان کا کمال یہ تھا کہ وہ اعلیٰ پائے کے مدرس تھے، وہ صرف کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ متعلقہ فن گھول کر پلاتے تھے۔ کچھ جگہوں میں یا تو کتاب رٹوائی جاتی ہے یا پھر املائی کاپیوں سے امتحان کی تیاری ہو جاتی ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا...... لیکن اگر بات اتنی ہوتی کہ وہ کتاب سمجھانے اور فن کا اجرا کروانے کے ماہر تھے تو شاید ہماری زندگیوں پر ان کا اثر اتنا نہ ہوتا۔ ان کی طبیعت کی انوکھی اور متاثر کن خصوصیت یہ تھی کہ وہ متعدد متضاد صفات کے حامل تھے۔ میں پہلے ان دلچسپ خصوصیات کی بات کروں گا پھر ان کے طرزِ تدریس کی طرف آؤں گا جو اس کالم کا اصل موضوع ہے۔

استاد جی بہت نرم دل تھے، مہربان اور شفیق تھے مگر جب کسی سے ناراض ہو جاتے...... اور یہ ناراضی مخصوص وجوہ سے ہی ہوتی تھی...... تو ان جیسی سنگدلی، بے رخی اور پتھریلا پن کہیں دیکھا نہ سنا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ ان کو اپنے طلبہ سے بہت محبت تھی۔ ہر وقت ان کی بہتری اور دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ خصوصاً مسافر طلبہ سے جن کے ماں باپ دور ہوتے، ان کی شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ محسوس ہوتا ان کے دل میں شہد بھری زنبیل ہے جس سے فوارے پھوٹ رہے ہیں اور ہر ایک بقدرِ ظرف سیراب ہو رہا ہے...... لیکن یہی نرم خُو اور نرم دل استاد جی جب اصول کی مسلسل خلاف ورزی پر کسی سے منہ موڑ لیتے تو پھر لاکھ منتیں کی جائیں، سفارشیں کروائی جائیں، مان کر ہی نہ دیتے تھے۔ ان کی موم صفت طبیعت سنگلاخ چٹان میں تبدیل ہو جاتی تھی، جس سے سر تو ٹکرایا جا سکتا ہے اسے جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسا مرنجان مرنج اور ہنستا مسکراتا شخص کیونکر ایسے سپاٹ چہرے، سخت اعصاب اور کھردری طبیعت کا مالک بن گیا ہے، جس پر کوئی بات اثر ہی نہیں کرتی۔ ہاں یہ بات ہے کہ ان کی شفقت تو ہر ایک کے لیے تھی لیکن ناراضی اور بیزاری زندگی بھر میں چند انسانوں سے ہی رہی۔

استاد جی سخی بہت تھے۔ جب موڈ میں ہوتے تو ان جیسا مہمان نواز اور دریا دل شاید ہی کوئی ہو۔ اللہ پاک نے وجاہت اور علم کے ساتھ رزق وافر سے بھی نوازا تھا۔ یہ البتہ کبھی سمجھ نہ آیا کہ ان کے پاس پیسے آتے کہاں سے ہیں؟ خدا جانے دستِ غیب کے حامل تھے (یہ عامل حضرات کی مخصوص اصطلاح ہے) یا پھر کیا بات تھی کہ بظاہر کوئی خاص ذریعہ آمدن نہ ہونے کے باوجود بعض اوقات ان کا چند دن کا خرچہ دوسروں کے ماہانہ اخراجات سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مجلسی آدمی تھے، اکیلے کھاتے پیتے نہ تھے اور کوئی نہ ہوتا تو طلبہ کو ہی بلا لیتے۔ اس وقت سر ننگا ہوتا، گریبان کے اوپر والے بٹن کھلے ہوتے، بے تکلف چیزیں اُٹھا اُٹھا کر سب کی پلیٹ میں ڈالتے اور کبھی کسی کی پلیٹ سے کوئی چیز اُٹھا کر (یا اس سے چھین کر کہہ لیجیے) کہتے: ''دھاندلی نہ کر یار! تُو تو ہمارے لیے کچھ چھوڑتا ہی نہیں۔''

دروازے سے کسی کو واپس نہ کرتے تھے۔ جن کو اس عادت کا پتہ تھا وہ ان سے پیسے اینٹھنے کے لیے طرح طرح کی

مکاریاں کرتے۔ بہت لوگوں نے قرض کے نام پر ان سے پیسے لے کر کھا لیے۔ ہمیں یقین تھا کہ استاد جی سب کچھ سمجھتے ہیں پھر بھی اس کا بھرم رکھنے کے لیے نظریں نیچی کیے رکھتے ہیں اور کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتے لیکن اس سخاوت اور دریا دِلی کے باوجود بعض مرتبہ انہیں دیکھا کہ چار آنے کی چیز ضائع ہونے پر دل گرفتہ ہیں، افسوس کررہے ہیں اور تنبیہ کررہے ہیں کہ یہ اس سے بہتر مصرف پر لگ سکتی تھی لیکن تم لوگوں کے توجہ نہ کرنے سے ضائع ہوگئی۔ ایسی سستی چیزوں کا بار بار ذکر ان سے کچھ جڑ تا نہ تھا پر وہ اس کا مکرر اظہار کیے بغیر نہ رہتے تھے۔

ایک بار ایک موالی قسم کے شخص نے ان سے ہاتھ کرنے کی کوشش کی اور مجبوری بتا کر پیسے ہضم کرنا چاہے۔ دوسروں کو سینکڑوں بخشش دینے والے استاد جی اس کو چند سو روپے معاف کرنے پر تیار نہ تھے اور بالآخر اس سے نکلوا کر ہی چھوڑے۔

استاد جی بہادر بہت تھے، فطری اور جگری بہادر۔ ایسا نہ تھا کہ وہ خوف کو دبا کر بہادری کا اظہار کرتے تھے بلکہ ہمارا مشاہدہ تھا کہ درحقیقت ان کو خوف محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ ہمارے مدرسے کے بعض مخالفین نے ذرا زیادہ پھیلنے کی کوشش کی تو انہیں محسوس ہوا کہ قلندر قسم کا یہ آدمی کچھ اور ہی چیز ہے۔ خیر اسی میں ہے کہ اس سے ''اوکھا'' نہ ہوا جائے...... لیکن دوسری طرف دل کے کمزور بھی ایسے تھے کہ بس نہ ہی پوچھیے۔ ایک طالب علم کو کھیلتے ہوئے چوٹ لگ گئی۔ بھل بھل کر کے خون بہنے لگا۔ ان سے اس کا خون دیکھا ہی نہ جاتا تھا۔ استاد جی اتنے کمزور دل کے ہیں اس روز ہمیں معلوم ہوا۔

اسی طرح وہ بے انتہا ذہین وفطین، معاملہ فہم اور سمجھ دار تھے مگر بعض اوقات ایسی سادگی اور بھولے پن کا مظاہرہ ان سے دیکھنے میں آتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی ایسا جہاں دیدہ شخص کیسا بھولا بھالا ہے؟ عام حالت میں ان کی متانت اور وقار ان کی رعب دار شخصیت کا حصہ تھا لیکن سیر وتفریح یا شکار کے لیے جاتے تو ان کی بے تکلفی اور خوش مزاجی دیکھنے کی چیز ہوتی تھی۔

یہ تو ان کی چند متضاد خصوصیات کی باتیں تھیں۔ رہا ان کا طرزِ تدریس تو وہ انتہائی منفرد اور انوکھا تھا۔ ان کو صرف کتاب اور فن پر عبور نہ تھا بلکہ کمرۂ جماعت اور حاضرین بھی پوری طرح ان کے بس میں ہوتے تھے۔ لگتا تھا سامعین پر انہوں نے سحر پھونک دیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ان سے انتہائی ذہنی قربت محسوس کرتے ہوئے بھرپور استفادہ کرتا تھا۔ استاد جی کو آواز کے اُتار چڑھاؤ اور اعضا کی زبان (Body Language) پر پوری طرح دسترس تھی۔

بعض اوقات کسی جملے کو ادھورا چھوڑنا یا بولتے بولتے ٹھہر کر مخصوص انداز میں ادھر ادھر دیکھنا ہی سامعین کو سب کچھ سمجھا دیتا تھا۔ بلکہ میں تو کہوں کہ ان کی کھنکار ہی ایسی بامعنی ہوتی تھی کہ سبحان اللہ! اس سے بھی کئی طرح کے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کی پلکیں، بھنویں اور پیشانی کے بل بہت سی باتیں ازخود سمجھا دیتے تھے۔ ان کا حافظہ جس غضب کا تھا تفہیم اس سے زیادہ شاندار تھی۔ ان کی گفتگو میں اُلجھاؤ یا پیچیدگی تو کبھی محسوس ہی نہ ہوئی۔ صاف اور سیدھی بات کرتے جو دل سے دل تک کا سفر ہوا میں تیرتے ہوئے کرلے اور سامنے والے کی بھرپور تشفی کرے۔ فرماتے تھے:

''میں نے اپنے استاد کی خدمت میں رہ کر ان کی نگرانی میں تدریس سیکھی ہے۔ بڑی کتابیں استاد صاحب سے پڑھتا تھا اور چھوٹی پڑھاتا تھا۔''

یہ بھی فرماتے تھے: ''آج کل کے فضلائے کرام علوم کی رسمی تکمیل کرتے ہی ابن سینا اور فارابی بن جاتے ہیں۔

حالانکہ تعلیم سے فراغت کے بعد طریقۂ تعلیم سیکھنا بہت ضروری ہے۔''

جامعۃ الرشید میں ''دورہ تدریب المعلمین'' (ٹیچر ٹریننگ کورس) اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ آج کل چونکہ مدارس کی طرف طلبہ کا رجوع بہت زیادہ ہے۔ طالب علمی کے دوران اپنے ساتھیوں سے تکرار یا چھوٹے درجات کی کتابیں پڑھانے کا موقع کم ہی ملتا ہے، اس لیے فضلائے کرام کو علم میں رسوخ کے ساتھ ان مہارتوں (Skills) اور رویوں (Attitudes) کو بھی سیکھنا چاہیے جو ایک معلم کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ان سب چیزوں کو فطری صلاحیت اور تجربے کے حصول پر چھوڑ دیا جائے تو مدرس کے میچور ہونے تک کا وقت بلاوجہ ضائع ہو جاتا ہے۔

تکمیل علما کا ایک سالہ نصاب جو آج کل جامعہ میں رائج ہے اس کے تین حصے ہیں: تربیت معلّمین، صحافت اور انگلش لینگوئج وکمپیوٹر۔ تربیت معلمین کے ایک استاد ایسے ہیں جو عرب دنیا میں رائج طرزِ تدریس کے ماہر ہیں اور فضلائے کرام کو عربی میں اس موضوع پر لیکچر دیتے اور نوٹس لکھواتے ہیں۔ اس سے عربی میں مہارت کے ساتھ طرزِ تدریس اور اچھے مدرس کے اوصاف سے واقفیت ہو رہی ہے۔ ایک استاد ہمارے قدیم روایتی طریقے سے، جو سالہا سال کے تجربوں کا حاصل ہے، کتاب سے سبق تیار کرواتے اور پھر علمائے کرام کو چھوٹے درجات میں لے جا کر اس کی عملی مشق کرواتے ہیں۔

اب الحمدللہ! ایک اور چیز کا اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکا اور یورپ میں تعلیمی نفسیات پر جو کام ہوا ہے یہ کورس اس سے بھرپور استفادہ کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔ عرب اور مغرب سے اخذ کی گئی ان مہارتوں اور رویوں کو دینی مدارس میں فروغ دینے سے بہت شاندار نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ جو طلبہ دورۂ حدیث یا تکمیل وتخصص میں پڑھ رہے ہیں یہ ان کے لیے ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے کہ ساری عمر کے لیے زادِ راہ کا کام دے گی۔ جو اہلِ علم شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں وہ تو ان کو سیکھ کر ''مُدرِّب'' (ٹرینر) بھی بن سکتے ہیں اور اس کو آگے پھیلانے میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

شائقین انتظار کے ساتھ دُعا فرمائیں کہ اس کورس کا جلد ہی اعلان ہونے والا ہے، جو حضرات پورا سال نہیں دے سکتے وہ سالانہ تعطیلات میں بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ والحمدللّٰہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات. (تمام تعریفیں اس اللہ ہی کے لیے ہیں جس کے فضل سے نیک کام پورے ہوتے ہیں۔)

عجمی نسل کا عرب حکمران

جنگ کے دوران مخالفین کی صفوں میں اپنے آدمی داخل کر دینا جو اس کے ارادوں اور اقدامات کے بارے میں پل پل کی خبریں پہنچاتے رہیں، عسکری نقطۂ نظر سے بڑی کامیابی سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی منصوبہ ساز اس امر میں کامیابی حاصل کر لے کہ اپنے کسی مہرے کو دشمن کے اختیارِ اعلیٰ کے مرکز تک پہنچا کر اسے مقتدر ترین منصب پر فائز کروا دے اور اس کے ذریعے دشمن کا دماغ، کان اور آنکھ اپنے قبضے میں لے لے تو بلاشبہ اسے مثالی اور بہت بڑی کامیابی کہا جائے گا۔ ''ابو مازن'' اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ اس کے آباؤ اجداد ایران کے رہنے والے تھے۔ 1260 ہجری مطابق 1844ء میں ایران میں باطنی فرقوں کی ایک نئی شاخ نے جنم لیا۔ باطنی فرقے سے مراد مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے وہ فرقے ہیں جو آیات، احادیث اور احکامِ شرعیہ کی من مانی تاویلات کے ذریعے ان کا وہ مطلب گھڑ لیتے ہیں جس میں انہیں آسانی محسوس ہو۔ وہ اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس میں دل کو بھانے والی کوئی ممنوع چیز حرام نہ رہے اور نفس کو مشقت میں ڈالنے والی کوئی عبادت ایسی شکل میں باقی نہ رہے جس پر عمل میں مشقت برداشت کرنی پڑے۔ پھر اس کو اپنا دین و مذہب بنا کر زیر زمین اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے فرقے مسلم دشمن قوتوں کے لیے نہایت کارآمد ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ان کی سرپرستی کر کے مسلمانوں کے لیے فتنہ و فساد اور اپنے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسے فرقے زیادہ تر نفس پرست اور نام نہاد روحانی پیشواؤں کی ان گمراہ کن کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو سیاسی یا اقتصادی مفادات کے حصول کی خاطر اپنی دنیا بنانے کے لیے لوگوں کا دین خراب کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں قلعۃ الموت سے اٹھنے والے قرامطہ اور آج کے دور میں بلوچستان کے پہاڑوں کو مسکن بنانے والے ''ذکری'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

ہاں تو آج سے تقریباً 160 سال پہلے ایران میں قلعۃ الموت کے کھنڈروں سے ایک نئے باطنی فرقے نے جنم لیا۔ اس کا بانی ایک شہوت پرست روحانی معالج مرزا علی محمد باب شیرازی (1235ھ/1266ھ بمطابق 1819ء/1850ء) تھا۔ اس نے اپنے پیروکاروں میں اس عقیدے کا پرچار شروع کیا کہ نعوذ باللہ خدا انسان میں حلول کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اس ''انسان'' کا مصداق خود اس کی اپنی ذات نے ہو جانا تھا۔ یہ اپنے ماننے والوں میں یوگی رجنیش کی طرح آزادانہ جنسی اختلاط کو رواج دینے کی کوشش کرتا تھا تاکہ خود اسے جنسی تسکین کے ذرائع میسر آ سکیں۔ نماز و زکوٰۃ کا انکار اور روزہ اور حج کو ساقط قرار دینے کے علاوہ جہاد کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ باطل فرقوں میں یہ چیز قدرِ مشترک رہی ہے کہ وہ جنسی آزادی کے گرم جوش حمایتی اور جہاد فی سبیل اللہ کے سب سے بڑے مخالف ہوتے ہیں۔ اس شخص کے شاگردوں میں ''بہاء اللہ'' نام کا ایک شخص دوسرے مفاد پرست خوشامدیوں پر بازی لے گیا اور اس نے اپنے فرقے کے خفیہ پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے ساتھ کسی ایسی غیر مسلم طاقت کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش شروع کی جو اس کی لذت پرستی کے جذبے کی تسکین کے لیے سرمایہ اور مسلمانوں میں

گمراہ کن نظریات کے پرچار کے لیے وسائل فراہم کر سکے۔ بالآخر ابلیس کے اس نمایندے کو ایک ابلیسی گروہ مل گیا جو خود تو خدا پرستی کا دعویدار ہے لیکن بقیہ دنیا کو شیطانی کاموں میں ملوث دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ ہوا یوں کہ اس زمانے میں سوئٹزر لینڈ کے شہر باسل میں یہود کے چوٹی کے راہنماؤں کا خفیہ عالمی اجلاس ہو رہا تھا۔ بہاء اللہ سوئٹزر لینڈ پہنچ گیا اور یہودیوں کو قائل کر لیا کہ وہ اگر اس کی سرپرستی کریں تو وہ ان کے لیے نرم لکڑی کا ایسا کارآمد دستہ ثابت ہوسکتا ہے جس کو وہ خنجر، کلہاڑی، تیشہ جس چیز میں چاہیں فٹ کر کے مسلم کش ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ یہودیوں کو ارضِ موعود میں واپسی کی مہم کامیاب بنانے کے لیے ''مسلم صہیونی'' درکار تھے، اس شخص میں انہیں وافر مقدار میں ایسے جراثیم نظر آئے جو اِن کی منشا کے مطابق رینگ سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے اسے اپنی سرپرستی میں قبول کر لیا اور جب ایران کی قاچار حکومت نے اس کے پیروکاروں کو اپنی حدودِ مملکت سے بے دخل کیا تو یہ ایران سے سیدھا مقبوضہ فلسطین جا پہنچے جہاں صہیونیت نواز برطانوی حکومت کے جنرل ایلن بی (جس نے القدس پر یہودی تسلط قائم کروا کر صلیبی جنگوں کے عیسائی ہیرو شاہ فرانس لوئس دوم کا کردار ادا کیا تھا) نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اسرائیل کے شہر حیفہ میں ان کو اپنا مرکز بنانے کے لیے وسیع و عریض قطعہ زمین الاٹ کیا۔ ابو مازن کا خاندان ان بھگوڑوں میں شامل تھا۔ ابو مازن جب بڑا ہوا تو بہائی فرقے کا ذہین ترین نوجوان سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس کی تربیت میں صہیونی دماغوں نے خاص توجہ سے حصہ لیا اور آج صہیونیت کے منصوبہ سازوں کا تربیت یافتہ یہ نوجوان فلسطین کا وزیر اعظم ہے جسے دنیا محمود عباس مرزا کے نام سے جانتی ہے۔

کراچی میں پٹیل پاڑہ کے قریب بہائی فرقے کا مرکز ''بہائی ہال'' کے نام سے موجود ہے اور یہ مسلمان سمجھا جانے والا دنیا کا دوسرا فرقہ ہے جسے اسرائیل کی حدود میں اپنا مرکز بنانے اور تربیت گاہیں قائم کرنے کی کھلی آزادی ہے۔ دوسرے فرقے کا نام اکثر قارئین جانتے ہوں گے، جو نہیں جانتے وہ اگلے شماروں میں سے کسی ایک میں جان جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔ بہائی فرقے کا مرکز اسرائیل میں دو جگہ ہے۔ ایک حیفہ میں جہاں ان کا بہت بڑا عبادت خانہ تمام تر متعلقہ لوازمات کے ساتھ قائم ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اسرائیلی حکومت نے اپنی خفیہ ایجنسی ''شین بیت'' کو مامور کر رکھا ہے۔ دوسرا ساحلی شہر ''عکا'' میں ہے۔ یہاں کسی زمانے میں شیرِ اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبیوں کو عبرتناک شکست دی تھی۔ آج وہاں مسلمان ہونے کے دعویدار فرقے کے مورث اعلیٰ بہاء اللہ کی قبر ہے۔ جب اس فرقے کے پیروکار صہیونیت کی خدمت سے فارغ ہو جائیں تو اس قبر پر حج کے لیے جاتے ہیں۔ اس فرقے نے ماضی قریب میں ارضِ فلسطین میں اپنے سرپرست یہودیوں کے پاؤں جمانے کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ مسلمانوں کو ان کی زمینوں اور جائیدادوں سے بے دخل کر کے ان کی جگہ یہودیوں کو بسانے میں اس خبیث الباطن فرقے کے افراد کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں میں گھل مل کر زمین بیچنے کی صورت میں بہت سے فوائد کا لالچ دیتے اور نہ بیچنے کی صورت میں نقصانات کے اندیشے سے ''خیر خواہانہ'' طریقے سے آگاہ کرتے۔ آج بھی ان کی ڈیوٹی اسی طرح کے ایک کام پر لگائی گئی ہے۔ صہیونیت کی چھری تلے پرورش پانے والے عجمی النسل فلسطینی وزیر اعظم کو یک نکاتی ایجنڈا سونپا گیا ہے یعنی فلسطین کی اسلامی جہادی تحریکوں حماس، الجہاد الاسلامی اور الفتح کے خلاف ہر سطح پر ایسے اقدام کرنا کہ یہ عوام کی اخلاقی حمایت سے محروم ہو جائیں، ان کا زور ٹوٹ جائے اور ان کی عسکری کارروائیوں سے اسرائیل اور اس کے مفادات کو تحفظ دیا جا سکے۔ محمود عباس کا سب سے زیادہ زور فدائی حملوں کی حوصلہ شکنی پر ہوتا ہے۔ یہود و ہنود

کو جو خود دنیا کی زندگی سے حریصانہ محبت ہے اس لیے وہ مسلمانوں کے جذبۂ شہادت سے از حد خائف رہتے ہیں۔ کیونکہ تمام تر بدنظمی، بے سروسامانی اور پسماندگی کے باوجود یہی ایک چیز ہے جس نے مسلمانوں کو سر اٹھا کر زندہ رہنے کا بہانہ فراہم کر رکھا ہے۔ اگر 1965ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاکستانی افواج کے جوان جسم پر بم باندھ کر بھارت کے اسلحہ اور نفری کی برتری کے جواب میں ''فی ٹینک ایک جوان'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے فدائی حملوں کے ذریعے بھارتی ٹینکوں کی پیش قدمی نہ روکتے تو آج بنئے کی دھوتی نہ جانے پاکستان میں کہاں کہاں پھڑ پھڑا رہی ہوتی۔ بالکل اسی طرح اگر فلسطینی جانباز صہیونی منصوبوں کو اپنے جسموں کی قربانی سے سبوتاژ نہ کرتے تو آج بیت المقدس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی بنیادیں کھودی جا چکی ہوتیں۔

جس طرح کوئی پاکستانی شاعر، دانشور، اداکار یا فلمکار پاکستانی عوام کو بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانے اور جغرافیائی سرحدوں کو کاغذی لکیریں قرار دے کر دونوں ملکوں کے عوام کو باہم قریب آنے کا مشورہ دے تو سمجھ دار لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ بھارتی لابی نے ایک اور بٹیر شکار کرلیا ہے، اسی طرح فلسطینی مسلمان کسی شخص کے مخلص یا ساتھی ہونے کا اندازہ اس امر سے لگاتے ہیں کہ وہ صہیونیت کے خلاف جہاد میں کتنا سرگرم ہے؟ لیکن مرزا صاحب کے بارے میں فلسطینی مسلمانوں کو کسی کسوٹی سے کام لینے کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں کہ اسرائیلی ایجنٹوں نے پچھلے سالوں میں چن چن کر یاسر عرفات کی جانشینی کی ممکنہ حق دار شخصیتوں کو ٹھکانے لگایا ہے تاکہ صہیونیت نواز فرقے کے اس ذہین اور کارآمد مہرے کو آگے بڑھا کر فلسطین کے اعلیٰ ترین مقتدر منصب پر فائز کروایا جاسکے۔ فلسطینی مسلمانوں کی صف میں نقب لگانے کے لیے جن بہائیوں کو 70ء کی دہائی میں فلسطینیوں کی صف میں داخل کر دیا گیا تھا، انہوں نے اپنے آقاؤں سے حق وفاداری خوب نبھایا چنانچہ اب ان میں سے ایک صہیونی ایجنٹ کو وزارتِ عظمیٰ پر فائز کر دیا گیا ہے۔ عین ان دنوں جب ابو جہاد اور ابو عیاد جیسی نابغۂ روزگار فلسطینی جہادی قیادت کو اسرائیلی ایجنٹ چُن چُن کر شہید کر رہے تھے، محمود عباس پیرس اور روم کے شاندار محل نما بنگلوں میں دادِ عیش دے رہا تھا۔ یورپ کے شہروں کو چھوڑیے رام اللہ اور غزہ میں ان کے ایک ایک گھر کی قیمت 10 بلین ڈالر بنتی ہے۔ ان کی سیاست انگریز والی سیاست ہے کہ مظلوم مسلمانوں نے احتجاج کرنا ہے تو صرف نعرے لگائیں، جلسے کریں اور دل کا غبار فضا میں اڑا کر ٹھنڈے ٹھار ہو کر گھروں کو جائیں۔ ہتھیار اٹھانا یا خودکش حملے کرنا ان کے مفادات کے خلاف ہے۔ اس سے امن کی کوششیں متاثر اور مطالبات منوائے جانے کے امکانات سبوتاژ ہوتے ہیں۔ محمود عباس بڑے خیر خواہانہ انداز میں دلسوزی کے ساتھ فلسطینیوں کو سمجھاتے ہیں کہ ''جب فلسطینی اسرائیلیوں پر حملے کرتے ہیں تو اسرائیلی ان حملوں کو جواز بنا کر فلسطینیوں کو مارتے ہیں اس لیے اسرائیلیوں کے جواز کو ختم کیا جائے۔'' یہ کہنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ پاکستان جب میزائل تیار کرتا ہے تو بھارت بھی دور مار میزائل کے تجربات کرتا ہے اگر علاقے میں کشیدگی کو روکنا ہے تو جدید اسلحہ کے حصول کی کوشش ختم کر دینی چاہیے۔ فلسطینی مسلمان ان کے جھانسے میں آ جاتے، اگر مرزا صاحب چند خطرناک غلطیاں نہ کر چکے ہوتے۔ یہ غلطیاں بالکل ایسی ہی تھیں جیسی ہمارے ہاں کے بعض دانشور دِلّی اور بمبئی کی یاترا کے بعد کر بیٹھتے ہیں اور پھر باشعور پاکستانیوں کی نظر میں ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے فلسطینی ہوتے ہوئے بھی یہودیوں کی سب سے بڑی بستی ابو غنیم کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا۔ دوسرے یہ کہ وہ صہیونیت نوازی میں اتنا آگے چلے گئے کہ کھلم کھلا کہنے لگے کہ اب مسلمانوں کو عالمِ اسلام کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ وہ تمام امیدیں مغرب

سے رکھیں، اہلِ مغرب ہی ان کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ترنگ میں آ کر اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ کہہ بیٹھے کہ وہ اسرائیلی خفیہ تنظیموں کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، لہٰذا ان کے مشوروں کو زیادہ غور کیے بغیر قبول کر لینا چاہیے۔ ایک پہاڑ جیسی غلطی مرزا جی نے یہ کی کہ فلسطینی مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوششوں میں لگے رہے کہ امریکا اور اس کے حلیف اسرائیل کے خلاف جنگ کے نتائج بھیانک ہو سکتے ہیں، چنانچہ وہ بیچ میں پڑ کر ''اوسلو معاہدہ'' کروانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس معاہدے سے فلسطینی مسلمان ''بھیانک نتائج'' سے محفوظ ہوئے یا نہ، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہیں فلسطین کی 80 فیصد زمین سے دستبردار کروا دیا گیا۔ اس طرح کی حرکتیں ہمارے ملک کے کچھ راہنما بھی بھارت کے حوالے سے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی چابی ایک ہی طرح کے ریموٹ کنٹرول سے گھومتی ہے۔

''اوسلو معاہدے کے معمار'' کا خطاب پانے والا یہ عجمی النسل شخص کسی عرب ریاست کا پہلا غیر عربی سربراہ ہے۔ حیرت ہے کہ جب مسلمان اس قدر غفلت میں ہیں کہ اپنے باصلاحیت لوگوں کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھا رہے اس وقت یہود و ہنود طویل المیعاد منصوبہ بندی کے ذریعے ان کی آستین میں اپنے سانپ پال رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سانپوں کا رنگ و روپ، ان کے ڈسنے کا انداز اور ان کے گندے زہر کی تباہ کاریاں ایک جیسی ہیں مگر ہم اپنی آستینوں میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ کیا چیز کلبلا رہی ہے؟ یہود و ہنود کا طریقۂ واردات ایک جیسا ہے، فلسطین اور پاکستان میں سرگرم بیرونی ایجنٹوں کی کارستانیاں، کام کرنے کا انداز اور انہیں پڑھائے گئے بول ایک جیسے ہیں مگر ہم پھر بھی انہیں نہیں پہچان سکتے۔ جب چوکیدار ہی اندھا پن کا شکار ہو تو چور کو کس چیز کا ڈر ہو سکتا ہے..........؟

پروفیسر صاحب

مغرب نے کچھ اصطلاحات ہماری تاریخ سے چرائی ہیں اور انہیں اپنی تہذیب و ترقی کی علامت کے طور پر استعمال کر کے دنیا پر رعب گانٹھتا رہتا ہے۔ انہیں میں سے ایک اصطلاح ''سینئر سٹیزن'' (بزرگ شہری) کی ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں (اور مغرب کا کون سا ملک ہے جو مسلمانوں کے علوم اور طرز زندگی سے استفادہ کر کے ترقی یافتہ نہیں بن گیا) جب کوئی باشندہ عمر کی ایک مخصوص حد تک پہنچ جاتا ہے تو اسے کئی طرح کی سہولتیں مفت ملتی ہیں۔

مادہ پرست مغرب کی نظر میں چونکہ یہ مادی سہولتیں اور جسمانی آسائش میسر ہو جانا اس دنیا کی زندگی کا اول و آخر ہے اور انسان کی روح جن چیزوں کی فراہمی سے تسکین پاتی ہے اس کی انہیں کوئی خبر نہیں، اس لیے یہ ''بزرگ شہری'' مفت کی چند آسائشوں کے بعد مزید کسی چیز کا استحقاق نہیں رکھتے اور روحانی و نفسیاتی اعتبار سے وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے اس بری طرح ترستے ہیں کہ دیکھنے والوں کو ان پر ترس آتا ہے۔

مغرب کے کسی ملک میں آپ جائیں اور اس کی چمکتی دمکتی روشنیوں کے پیچھے کرب بھری حقیقتوں سے واقف ہونا چاہیں تو ''اولڈ ہاؤس'' جانا کافی ہے۔ وہاں کا ایک دورہ اہل مغرب کی زندگی کا وہ عبرتناک پہلو سامنے لاتا ہے کہ انسان اسلام کے عطا کردہ خاندانی نظام پر فخر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بندہ کو اولڈ ہاؤس جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن پروفیسر کارل بیکر سے ملاقات کے بعد احساس ہوا کہ وہ مغربی باشندے بھی جو دنیا کی تمام سہولتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں، اندر سے کتنے دکھی، ٹوٹے ہوئے اور گہرے نفسیاتی خلا کے ہاتھوں طرح طرح کے عوارض کا شکار ہیں۔

پروفیسر کارل بیکر ایک معمر جرمن باشندے تھے۔ انہیں ہم مستشرق (اسلامی علوم کا ماہر غیر مسلم عالم) تو نہیں کہہ سکتے لیکن اسلامی تاریخ سے ان کا ذوق و شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ ان کے وسعت مطالعہ کی داد دینا پڑتی تھی۔ یہ تقریباً سال ڈیڑھ سال قبل کی بات ہے جب مجھے ایک صاحب کا فون آیا کہ ہمارے ایک جرمن دوست آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان صاحب کا یورپ کے کئی ملکوں میں کاروبار کے لیے آنا جانا تھا۔ وہاں ان کے کسی پاکستانی دوست کے ذریعے ان کا رابطہ کارل صاحب سے ہوا۔

کارل صاحب یورپ میں رہنے والے مسلمانوں سے زیادہ اسلام کا علم رکھتے تھے اور دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کا فاتحانہ داخلہ اور اس کے اسباب کا مطالعہ ان کا خصوصی موضوع تھا۔ انہوں نے ان صاحب سے درخواست کی کہ وہ محمد بن قاسم کے ہندوستان کی طرف سفر کا راستہ، سرزمین سندھ پر اترنے کا مقام، پھر اندرون ملک کی طرف اس کی پیش قدمی کا رخ اور اس کے بنائے ہوئے شہر منصورہ کا محل وقوع معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

کارل صاحب تک خدا جانے کس طرح ضربِ مؤمن کے نقشے پہنچ چکے تھے اور وہ کراچی کا سفر کرنے اور مذکورہ بالا نقشے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ ان کا پاکستانی دوست کراچی کا باشندہ تھا اور اتفاق سے ضربِ مؤمن کا قاری رہ چکا تھا چنانچہ

کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی۔ جلد ہی وہ دن آ گیا کہ بندہ اپنے پاکستانی اور جرمن مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔
دیکھا کہ 72 سالہ ایک معمر شخص ہے جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت اور بھولا پن ہے۔ اس کی آنکھیں، پیشانی اور چہرہ بلاوجہ مسکراتی محسوس ہوتی ہیں اور اس ضعیف العمری میں بھی وہ پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ اس نے اتنی تیزی اور پھرتی سے دوسری منزل تک جانے والی سیڑھیاں چڑھیں کہ چائے کے ہاتھوں گلے ہوئے نوجوانوں کو تو رشک آ جائے۔

موصوف جنگ عظیم کے دوران اپنے بائیں بازو سے محروم ہو گئے تھے اور مصنوعی بازو پر ہمہ وقت دستانہ چڑھائے رکھتے تھے اس کی وجہ سے ان کو نقشوں کی بھاری بھرکم فائلیں الٹنے پلٹنے میں کافی دقت ہوتی تھی لیکن انہیں ہاتھ کے چلے جانے کا خاص ملال نہ تھا۔ لگتا تھا انہوں نے اس حادثے سے مکمل طور پر صلح کر لی ہے۔ پروفیسر صاحب سے کئی طویل نشستیں رہیں۔ ان کو جتنی عربی آتی تھی بندہ اس زمانے میں اتنی انگلش سیکھ چکا تھا لہٰذا ہماری نیم عربی نیم انگلش گوئی کی صلاحیت نے ہمیں ترجمان کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ بندہ کو جرمن مستشرقین، ان کے کام اور اسلام میں ان کی دلچسپی کی وجہ جاننے سے مطلب تھا اور کارل صاحب کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے روٹ اور اس سے متعلقہ معلومات سے دلچسپی تھی، سو خوب گزرتی تھی جب دو مطلبی مل بیٹھتے تھے۔

پھر جب کارل صاحب کو اسلام کے کرۂ ارض میں انتشار کے تمام رخوں، مختلف اسلامی سلطنتوں کی حدود اور ایشیا و افریقہ میں مسلمانوں کے بھرپور نفوذ جبکہ یورپ میں دو مرتبہ داخلے کے بعد کے واپسی کے اسباب اور مسلمانوں کی پسپائی کے متعلق فقیرانہ نکتۂ نظر پتا چلا تو وہ اپنا علم و فضل بھول کر بالکل پانی ہو گئے۔ اب وہ اسلامی تاریخ پر بولتے ہوئے رعب جھاڑنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کی روانی میں بھی فرق آ گیا تھا اور ان کا انداز یوں ہو گیا تھا جیسے اپنی معلومات کی تصدیق چاہتے ہوں البتہ کبھی کبھی بات کرتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے دیکھتے تھے کہ ان کی نئی باتوں کا ان کے سامع پر کوئی مثبت اثر پڑا یا وہ فقیرانہ بے نیازی سے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہا ہے؟ جرمنوں میں پائے جانے والے احساسِ تفاخر نے آخر تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔

پروفیسر صاحب علمی آدمی تھے۔ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ بنوامیہ ہوں یا بنوعباس، ہسپانیہ کی خلافت ہو یا سلطنت عثمانیہ، خوارزمی ہوں یا سلجوقی، افریقہ کے بربر ہوں یا وسط ایشیا و ہندوستان کے ترک و مغل، ان کی نظر سے ہماری تاریخ کا کوئی گوشہ پوشیدہ نہ تھا۔

پروفیسر صاحب کافی کے نہایت شوقین تھے۔ اگر ان کو ترنگ میں دیکھنا ہو تو گرم گرم گاڑھی کافی کا بھاپ اڑاتا پیالہ سامنے رکھ دیجیے۔ لگتا تھا اس کا دھواں ناک میں جاتے ہی ان کا دماغ کھلنا شروع ہو گیا ہے اور کڑوا گھونٹ حلق سے اترتے ہی ان کے ذہن کے ایسے خانے بھی کھل جاتے تھے جو عام حالات میں کسی مسلمان کے سامنے یقیناً بند رہتے ہونگے۔ پروفیسر صاحب خود عیسائی تھے یا یہودی یا کچھ اور، کچھ پتا نہ چلتا تھا البتہ ان کو اس بات کی خاص فکر تھی کہ وہ کون سی ایسی چیز ہے جو مرنے کے بعد والی زندگی میں انسان کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔

سورۂ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی ابتدائی چند آیات کے علاوہ اور کچھ آیتیں بھی ان کو زبانی یاد تھیں اور سورۂ فاتحہ تو وہ مزے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کو توجہ دلائی کہ آپ جب "اھدنا الصراط المستقیم" والی آیت پڑھتے ہیں تو

کبھی اپنے ذہن کو اس کے معنی سے ہم آہنگ کیا ہے؟ پوچھنے لگے کیا مطلب؟ عرض کیا کہ اس آیت میں انسان کی سب سے بڑی ضرورت اور کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اسے کائنات کے پیدا کرنے والے سے طلب کرو۔ کیا آپ نے کبھی طلب کی کیفیت سے لبریز دل کے ساتھ اس آیت کو پڑھا ہے؟ اس پر تھوڑا سا چونک سے گئے۔

بندہ نے لوہا گرم دیکھا تو تامل کیے بغیر چوٹ لگائی: ''دیکھیے پروفیسر صاحب! اتنا تو آدمی کو اپنے پیدا کرنے والے سے مانگنے کا حق ہے کہ وہ اسے دنیا کی نعمتوں کے ساتھ وہ چیز بھی عطا کرے جو اسے آخرت میں کامیاب کرے گی۔ آپ اس بات کی معقولیت تسلیم کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: ''ضرور۔''

عرض کیا: ''تو پھر آپ اس نیت سے یہ آیت پڑھا کریں کہ اے اس جہاں کو پیدا کرنیوالے! میری عمر کے جتنے دن رہ گئے ہیں تو مجھے ان میں وہ چیز عنایت کردے جو مرنے کے بعد مجھے عذاب سے بچالے اور نجات دلوادے۔''

کہنے لگے: ''یار بات تو تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم مجھے مسلمان ہونے کی دعوت دے رہے ہو۔''

عرض کیا: ''پروفیسر صاحب! ہماری گفتگو میں اسلام کا نام بھی بیچ میں آیا ہے؟ ہماری بات تو صرف اتنی ہوئی ہے کہ آپ اپنے خالق و مالک سے یہ نعمت مانگیں۔ اس کے بدلے میں جو کچھ آپ کو نصیب ہو اسے کسی تعصب کی نذر کرنا انصاف اور معقولیت کے خلاف ہوگا۔'' پروفیسر صاحب نے وعدہ کرلیا کہ وہ اس آیت کو خاص مفہوم کے ساتھ پڑھنے بلکہ مانگنے کی کوشش کریں گے۔

بندہ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ دعا رد نہیں فرماتے کہ یہ انسان کا اپنے رب سے وہ سوال ہے جس پر اس کی نجات کا فیصلہ ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ بندہ نجات کا راستہ طلب کرتا رہے اور رب تعالیٰ اسے عذاب میں مبتلا کردیں۔ اس سے قبل بندہ یہ گر بہت سے ایسے نوجوانوں پر کامیابی سے آزما چکا تھا جو مذہبی اختلافات کی بنا پر دین سے ہی بیزار و برگشتہ ہوئے جاتے تھے۔

پروفیسر صاحب کے ساتھ جرمنی واپسی کے بعد کیا گزری؟ یہ ایک مستقل داستان ہے جو اس وقت نہیں چھیڑی جاسکتی۔ سردست وہ بات کہنی ہے جس کا ذکر شروع میں آیا۔ پروفیسر صاحب مالی طور پر آسودہ حال تھے۔ انہوں نے یورپ کے ایک متمدن ترین ملک میں اپنی مرضی کی پرتعیش زندگی گزاری تھی اور بظاہر ایسی زندگی گزارنے والے کو کسی طرح کی حسرت نہ ہونی چاہیے لیکن تعجب اس وقت ہوا جب پتا چلا کہ تحقیقی کام کے بعد جب فراغت کا یا آرام کا وقت قریب آتا ہے تو تنہائی کے خوف سے ان کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ چھٹی کا دن گزارنا ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے جبکہ وہ مسلسل کام بھی نہیں کرسکتے۔

اس کشمکش نے انہیں نفسیاتی مریض بنا رکھا تھا اور وہ اچھی صحت، خوب صورت گھر، معقول آمدنی اور شاندار معاشرتی حیثیت کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو ادھورا اور خالی خالی محسوس کرتے تھے۔ ان کے مطابق سب کچھ ہونے کے باوجود ان کو سمجھ ہی نہیں آتا کہ کہاں کوئی کمی رہ گئی ہے؟

دراصل یہ کمی اس توجہ و محبت، خدمت و اکرام اور عزت و احترام کی تھی جو مسلمان خاندانوں اور معاشروں میں اپنے بڑوں کو دیا جاتا ہے۔ جرمن یا دیگر یورپی حکومتیں اپنے بزرگ شہریوں کو سب کچھ دے سکتی ہیں (انہوں نے مسلمانوں سے اتنا کچھ دبا جو رکھا ہے) مگر وہ روحانی تسکین اور نفسیاتی تشفی جو اسلام کے تشکیل کردہ خاندانی نظام میں ہے جس کے مطابق خاندان کے تمام

چھوٹے اپنے سر پر بڑوں کے سائے کو اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت اور بڑوں کی عزت و ادب اور خدمت و اکرام کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں اور اپنے بڑوں کو خوش رکھنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں، وہ چیز مغرب کی کوئی مالدار ترین حکومت بھی اپنے شہریوں کو کسی قیمت پر فراہم نہیں کر سکتی۔

پروفیسر صاحب اس فلسفے کو دلچسپی سے سنتے رہے اور آخر میں بولے: ''یار ہم لوگوں نے بے انتہا مادی ترقی تو حاصل کر لی لیکن اس کی جو قیمت ادا کی ہے وہ نہایت مہنگی ہے۔ آپ لوگ جب ترقی حاصل کر لو تو اس چیز کو ہاتھ سے جانے نہ دینا جو تم لوگوں کو حاصل ہے ورنہ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔''

اب ہم یورپ جیسی مادی ترقی کب حاصل کر سکیں گے؟ یہ تو خدا کو معلوم ہے، بظاہر ہماری بے عملی اور بد عملی تو راستہ دیتی نظر نہیں آتی لیکن بات یہ ہے کہ اسلام کا شاندار معاشرتی نظام وہ نایاب دولت ہے جس کی مغرب کو ہوا بھی نہیں لگی اور آج کل صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر مغربی تہذیب مسلط کر کے یہ قیمتی متاع چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسلام کے نام لیواؤ! ماڈرن بننے کے چکر میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احسانات کو فراموش نہ کرو جو انہوں نے معاشرت سے متعلق اخلاقی تعلیمات کی شکل میں ہم کو سکھائے۔ اگر یہ ہم سے چھوٹ گئے تو ہم خود اپنی نظر میں قابلِ عبرت بن جائیں گے۔

وائس ماسٹر

وہ آوازوں کا ماسٹر تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی صلاحیت دی تھی کہ وہ جس طرح کی آواز ایک بار سن لیتا اس کی نقل اُتار لیتا تھا۔ اس کی سماعت اور نقالی دونوں غیر معمولی تھیں۔ اس کو دور سے ہلکی سی آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی اور وہ کان لگا کر آواز کی سمت اور نوعیت کا بالکل صحیح صحیح اندازہ کر لیتا تھا۔ اس کی نقالی اتنی شاندار اور زوردار ہوتی تھی کہ وہ جانوروں کو بھی دھوکہ دے دیتا تھا۔ بلی کی آواز اس خوبصورتی سے نکالتا کہ بلیاں اس ''صوتی ہم جنس'' کو تلاش کرتے کرتے تھک جاتیں مگر نہ پہچان سکتیں کہ اصل کی شکل میں نقل ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی وہ نقل نہ اُتار سکتا ہو۔ اس زمانے میں جنرل ضیاء الحق صاحب حکمران تھے۔ ان کی تقریر کی وہ ہو بہو کاپی کرتا تھا۔ سبزی فروش، قلفی فروش، ٹین ڈبے والا، ہر مال دو روپے والا... غرض کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس کی آواز اس کے کان میں پڑ جائے پھر یہ اس کی کاپی نہ کر سکے۔ لوگ خوب شغل لگاتے اور تفریح لیتے تھے۔ چونکہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لیے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ بڑا ہونے کے بعد اس کے والد نے اسے مکینک کی دکان میں بٹھا دیا۔ وہاں اس کی خداداد صلاحیتوں نے خوب رنگ دکھایا۔ وہ آواز سن کر بتا سکتا تھا کہ یہ آواز گاڑی کے کس حصے سے آ رہی ہے اور کس خرابی کی بنا پر آ رہی ہے؟ جب بھی ''استاد'' کے پاس کوئی ایسا گاہک آتا جو گاڑی کے کسی حصے سے آواز آنے کی شکایت کرتا تو استاد آواز کے ماسٹر ''چھوٹے'' کو بلا لیتا۔ چھوٹا آواز سنتے ہی بھانپ لیتا تھا کہ اس کا مرکز کہاں ہے؟ اور یہ کس طرح درست ہوگی؟ بسا اوقات دوسری ورکشاپوں کے ''استاد'' بھی ''چھوٹے'' کو بلا لیتے تھے اور وہ اپنے اس فن کا مظاہرہ کر کے سب کو حیران کر دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی شہرت دور تک پھیلتی چلی گئی۔

ایک دن اس کی ورکشاپ میں ایک سیٹھ صاحب آئے جو ہوٹلوں کی چین کے مالک تھے۔ انہوں نے جب چھوٹے کے کمالات دیکھے تو ان کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ وہ چھوٹے کو اپنے ساتھ لے گئے اور اسے اپنے شاندار ہوٹل میں میزبانی کی ذمہ داری سپرد کر دی۔ چھوٹے کا کام یہ تھا کہ مہمانوں کو مختلف آوازوں میں خوش آمدید کہتا اور مختلف انداز سے ان کا دل بہلاتا۔ اس کی مہیا کردہ تفریح سے مہمان بہت محظوظ ہوتے۔ چھوٹا باری باری مختلف میزوں پر جاتا اور مہمانوں کی فرمائش کے مطابق آوازیں سناتا۔ سیٹھ صاحب کے گاہکوں میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا اور بہت سے لوگ محض اس نادر تفریح کی خاطر وہاں آنے لگے۔

جس طرح چھوٹا ''آواز کا ماسٹر'' تھا، اسی طرح کچھ لوگ سیاسی آوازوں کے ماسٹر ہوتے ہیں۔ مثلاً: پیر پگارا صاحب سیاسی پیش گوئیوں کے حوالے سے بہت شہرت رکھتے ہیں... لیکن چھوٹے میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ چھوٹے کے کمالات خداداد صلاحیت کے مرہونِ منت تھے جبکہ پیر صاحب تو ہر آنے جانے والے سے اس کی رائے پوچھتے اور اندازہ لگاتے ہیں۔ ان کو اپنی اس شہرت کو برقرار رکھنے اور برجستہ بامعنی تبصرے کرنے کے لیے منتخب الفاظ کی تلاش کے ساتھ ساتھ سیاسی اتار چڑھاؤ سے واقف ہونے کے لیے بہت سے جتن کرنا پڑتے ہیں، کبھی وہ صحافیوں کی دعوتیں کرتے ہیں اور کبھی سیاست دانوں کی... اور ان دعوتوں کے

دوران وہ اپنے مطلب کی باتوں کو کھینچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں... جبکہ چھوٹا سب کچھ خود بخود اور فطری انداز میں کرتا تھا۔

بندہ جب دوسال پہلے بلوچستان کے علاقے "بھاگ" گیا اور وہاں پسماندگی اور بدحالی کے عجیب وغریب مناظر دیکھے تو بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ بندہ نے اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ ایک ایسا متعفن جوہڑ جس میں کئی مہینے سے بارش کا بدبودار پانی کھڑا ہے، اسی میں سے جانور بھی پانی پی رہے ہیں، انسان بھی برتن بھر رہے ہیں اور خیر سے یہ بھی ہورہا ہے کہ جس گدھا گاڑی کو پانی بھرنے کے لیے لایا گیا ہے، اس میں جوتا ہوا گدھا تالاب کے کنارے جو پیشاب کر رہا ہے وہ بہہ کر دوبارہ اسی تالاب میں پہنچ رہا ہے جہاں سے پانی بھر کر اس کی پشت پر رکھا گیا تھا۔ یہ سب کچھ پاکستان بننے سے بہت پہلے سے ہورہا تھا اور پاکستان بننے کے پچاس سال بعد بھی بلوچستان کے عوام، یہ سب کچھ سہنے اور برتنے پر مجبور تھے۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اس علاقے کا کونسلر، ناظم، ممبر صوبائی وقومی اسمبلی اور اہل خیر کہاں ہیں؟ اور وہ اپنے عوام کو اس قدر عذاب میں مبتلا دیکھ کر بے چین کیوں نہیں ہوتے؟ پتہ چلا کہ "آوے کا آوا" بگڑا ہوا ہے اور سب نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان بوجھ کر آنکھیں پھیر رکھی ہیں۔ بظاہر لگتا تھا کہ عوام اپنی قسمت پر راضی اور صابر وشاکر ہیں لیکن بندہ کے کانوں نے خطرے کی آہٹ تالاب کے کنارے کھڑے سن لی تھی۔ بلوچستان کی علیحدگی (اب تو بھرم بھی ختم ہوگیا ہے صاف صاف آزادی کہہ لیجیے) کے حوالے سے قوم پرست سیاست دانوں کے بیانات اور انٹرویوز میں چھپا خطرہ تالاب کے کنارے جمی کائی سے جھانک رہا تھا۔

انسانیت کی اس قدر توہین اور تذلیل دیکھ کر جس قدر تکلیف ہوئی بیان سے باہر ہے۔ مقامی عوام سالہا سال سے یہ پانی پیتے چلے آرہے تھے اور سال میں کچھ دن ایسے بھی آتے تھے جب انہیں یہ پانی بھی نہ ملتا تھا۔ یہ صورتِ حال انتہائی دل سوز اور المناک تھی۔ بندہ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ گیا تو کسی اور کام کے لیے تھا مگر واپس آتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اخبار میں مہم چلائی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ صاحب دل قارئین نے بھرپور تعاون کیا اور آج الرشید ٹرسٹ کا شعبۂ فراہمی آب اپنے مستقل عملے اور آلات کے ساتھ بھاگ میں موجود ہے۔ کئی تالابوں کی مرمت ہوچکی ہے اور بڑے تالاب کی تعمیر پر کام جاری ہے۔ اگر ایک نیا ہیوی ٹریکٹر مل جائے تو بلوچستان میں جہاں جہاں یہ انسانی المیہ اپنی دردناک صورت میں پایا جاتا ہے وہاں وہاں پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا جاسکتا ہے۔ کام تو یہ حکومت کا ہے لیکن کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اس قدر بے توجہی اور سنگدلی کیوں برتی جارہی ہے؟ بہرحال ہم سے بلوچ بھائیوں کے لیے جو کچھ ہوسکا اس سے دریغ نہیں کریں گے... مگر سوال یہ ہے کہ کیا اب ایسی خدمات بلوچوں کے زخم پر مرہم رکھ سکیں گی؟

جب ہم بھاگ میں مقیم تھے تو میزبانوں نے نواب اکبر خان بگٹی کے حالات سنائے: "شاہ صاحب! آپ ہمارے ساتھ ضرور ڈیرہ بگٹی چلیں۔ آپ کو اپنے مزاج کا آدمی دیکھنے کو ملے گا۔ علم دوست بھی ہے اور مہمان نواز بھی۔ علمائے کرام سے علمی موضوعات پر شاندار گفتگو کرتا ہے اور اچھی گفتگو والوں کو بہت پسند کرتا اور ان کا اکرام کرتا ہے۔" پھر انہوں نے نواب صاحب کے فیصلوں کا طریق کار اور کچھ دلچسپ واقعات سنائے۔ بگٹی قبیلے کی کچھ اور روایات بھی سننے کو ملیں۔ مثلاً: کوئی شخص خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہے تو کس طرح انگاروں پر سے گزر کر دکھاتا ہے اور بکری کی دستی کی ہڈی پر کس طرح سے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کی جاتی ہے؟ بگٹی صاحب اپنی وفات سے قبل ہڈی دیکھ کر فوج آنے کی پیش گوئی کرتے رہے تھے۔ بندہ اس طرح کی دیکھی ہوئی چیزوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن سنی ہوئی یا سونگھی ہوئی چیزوں کو بالکل غلط بھی نہیں کہا جاسکتا۔ عوام میں نواب صاحب کی مقبولیت اور تاحیات سرداری پر اتفاق بھی سننے میں

آیا۔نواب صاحب کو پہلی مرتبہ کراچی ہل پارک کے قریب دیکھا تھا۔اس وقت پہلا تاثر یہی ذہن میں آیا کہ دینی اعتبار سے اللہ ان کو ہدایت دے،البتہ دنیوی اعتبار سے سرداری ان پر جچتی ہے۔ہل پارک کے قریب کہیں نواب صاحب کا ٹھکانا تھا۔پہاڑی کے نیچے مسطح میدان میں بعد فجر کچھ نوجوان کراٹے کی مشق کرتے تھے۔ایک دن نواب صاحب ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے۔لڑکوں کے ہاتھ پاؤں دیکھے تو گپ شپ کی اور بتایا کہ آکسفورڈ قیام کے زمانے میں مارشل آرٹ سیکھتا رہا ہوں اور اس میں بلیک بیلٹ حاصل کیا ہے۔نواب صاحب کا لہجہ،اعتماد اور خوبصورت گفتگو،ہر چیز میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔کچھ شک نہیں کہ بلوچوں نے ایسے شخص کو جو تاحیات سردار مانا تھا، کسی دھونس سے نہیں بلکہ وہ ان کو فی الواقع اپنا قائد مانتے تھے۔جب ڈیرہ بگٹی کے حالات خراب ہوئے تو جو لوگ نقل مکانی کر کے ''بھاگ'' آئے،وہ کھلے آسمان تلے پڑے تھے مگر نواب صاحب سے شاکی نہ تھے۔وہ بہرحال ان کو اپنا سردار مانتے تھے۔ان کے اس طرح دنیا سے جانے کی خبر سن کر بندہ کو اس خطرے کی بو زیادہ شدت سے آتی محسوس ہو رہی ہے جو بھاگ کے تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر محسوس ہوا تھا۔

گزشتہ دنوں جہاں بھی جاتے یہ سوال ہوتا:''آپ حزب اللہ کی کامیابی کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں؟''

''اپنی خامیوں اور دشمن کی خوبیوں پر نظر رکھیں۔کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔''

''بس اتنی سی بات؟''

''یہی بات سب کچھ ہے۔ہمارے ہاں اپنی خوبیوں کو اُچھالنے اور دشمن کی خامیوں سے فائدہ نہ اُٹھانے کی جو ریت ہے،اس نے ہمارا دھڑن تختہ کر دیا ہے۔اللہ کے واسطے اپنے آپ پر رحم کیجیے۔''

اب جہاں بھی جائیں یہ سوال ہوتا ہے:''آپ نواب صاحب کے قتل پر کیا کہیں گے؟''

''خطرناک،بہت خطرناک۔ہر طرف آگ نظر آ رہی ہے۔''

''کیا اس کا کوئی حل ہو سکتا ہے؟''

''آپ بلوچوں سے معلوم کریں ان کے پاس قتل کی تلافی کی کوئی صورت ہوتی ہے؟ اگر کوئی ایک صورت بھی ہے تو خدا کے واسطے اس کے ذریعے ان کے زخم پر مرہم رکھیں ورنہ...''

''ورنہ کیا...؟''

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:''اگر یہ ملک پچیس سال تک قائم رہ گیا تو بہت آگے جائے گا۔اگر اس سے پہلے اسے کچھ ہو گیا تو پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

1947ء سے 1971ء کے درمیان پچیس سال سے ذرا کم وقفہ تھا اور اب اگر حالات یونہی رہے تو خاکم بدہن 1971ء پر چالیس گزرنے نہ پائیں گے......آگے حدِادب ہے۔اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ ہی رحم کرے۔اللہ تعالیٰ ہی ہم پر رحم کرے۔

''چھوٹا'' استاد

اس کو پہلی مرتبہ ہم نے پنکچر کی دکان پر دیکھا۔ یہ دکان بڑے موقع پر تھی۔ ایک چوراہے کے کارنر پر جہاں آتے جاتے گاہک خود بخود رک جاتے تھے۔ ہمارے قدم بھی وہیں لگے ہوئے تھے۔ گاڑی میں ہوا بھروانی ہو یا ٹائر پنکچر لگوانا ہو، درختوں کے سائے تلے بنی چھوٹی سی دکان پر رکتے وقت بالکل کوفت نہ ہوتی تھی۔ ایک دن دیکھا کہ جیسے ہی گاڑی رکی، ایک بچہ بھاگتا ہوا آیا۔ ڈگی سے ٹائر نکالا اور بڑی پھرتی سے اسے ''پنکچر لگوائی'' کے مختلف مراحل میں دھکیل دیا۔ اس کی ترت پھرت اور کام سے لگن دیکھنے والی تھی۔ ایسی چیزیں اس بندۂ عاجز کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں اس لیے کہ زوال کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں تو اچھے خاصے ذمہ دار لوگ بھی روایتی سستی اور کاہلی کے مارے کام کے وقت بھی پڑے ستاتے رہتے ہیں۔ احساس ذمہ داری تو عنقا ہو چکا ہے اور آپ بھتیری ترغیب وتحریض دیں، نصیبوں ماری یہ قوم ویسے کی ویسے پڑی کسل مندی کا بوجھل نمونہ بنی رہتی ہے لہٰذا پنکچر لگانے جیسے کام میں ایسا نظم وضبط اور مستعدی دلچسپ چیز تھی۔ ورکشاپوں میں تو عموماً استاذ آنے پانے مانگتے اور ''چھوٹوں'' کو کوستے رہتے ہیں لیکن چھوٹے کام کر کے نہیں دیتے۔ بندہ سمجھا کہ شاید یہاں کا ''استاذ'' غیر معمولی طور پر منتظم مزاج انسان ہے مگر اسے دیکھا تو اول جلول قسم کا آدمی تھا۔ آنکھوں کے کنارے اور ہونٹوں کے گرد منہ نہ دھونے کے واضح آثار تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس بچے کی اپنی فطری لائقیت ہے۔ استاذ کی تربیت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ ساتھی نے بتایا کہ یہ بچہ بہت تیز طرار اور محنتی ہے۔ اپنی عمر سے بڑھ کر کام کرتا ہے۔ ٹرکوں کے ٹائر سے بھی ٹیوب نکالتا اور لگاتا ہے۔ اس کا باپ بہت غریب آدمی ہے۔ اسے یہاں دہاڑی پر رکھ چھوڑا ہے۔ بچے کی عمر زیادہ سے زیادہ نو دس سال ہوگی۔ دھان پان سا تھا اور چہرے مہرے سے لگتا تھا کہ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز ہوگا۔ بندہ نے ساتھی سے کہا یہ گودڑی کا لعل ہے، حالات نے اس حال کو پہنچادیا ہے کہ سارا دن ٹائروں کی کالک سے ہاتھ اور منہ میلا کرتا ہے۔ اسے اس طرح ضائع نہ ہونے دینا چاہیے۔ اس کے والد سے بات کریں اس کی تعلیم اور کفالت کا ان پر کوئی بوجھ نہ ہوگا۔

بچے سے جب بات چیت ہوئی تو حسب توقع غیر معمولی طور پر ذہین تھا لیکن اس کے والد کے لیے تعلیم کا خرچ اور کفالت کافی نہ تھی۔ انہیں گھر کا خرچ چلانے کے لیے اس کے تعاون کی ضرورت تھی اور وہ مجبور تھا کہ وقت سے بہت پہلے اس پر ''کماؤ پوت'' والی ذمہ داریاں ڈال دی جائیں۔ اگر کوئی بے روزگار نوجوان روزگار ڈھونڈتا ہوا آئے تو یہ عاجز اسے کمپوزنگ سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اخبار کے مختلف صفحوں میں جگہیں تو نکلتی ہی رہتی ہیں...... لیکن اس بچے کی عمر کم تھی۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ان دنوں جامعہ میں جاری انگلش کورس کے لیے درکار انگریزی زبان کے کسی استاذ کی تلاش میں بندہ نے شہر کے مختلف انسٹی ٹیوٹس میں رابطے شروع کیے۔ عجیب وغریب ماحول دیکھنے کو ملا۔ ہم مغرب کی کم مائیگی پر روتے تھے، پتہ چلا پاکستان میں بہت سے ''یورپین جزیرے'' کھلے ہوئے ہیں۔ بہرحال ایک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بلاوجہ ہی ہم سے عقیدت مند ہوگئے۔ جتنا تعاون ہم ان سے چاہتے تھے اس سے زیادہ کے لیے حاضر رہتے۔ نہایت محبت اور اخلاق سے پیش آتے اور بہت ہی

عجز و نیاز کا اظہار کرتے۔ ایک دن بندہ ان کے آفس میں کسی مشورے کے لیے گیا تو انہوں نے ملازم کو بلا کر چائے وغیرہ لانے کو کہا۔ بندہ کے ذہن میں جھما کا ہوا: ''اگر پنکچر کی دکان کا ''چھوٹا'' یہاں ملازم ہو جائے تو اس کو روزگار بھی مل سکتا ہے اور انگلش بھی سیکھ لے گا۔ آگے اللہ مالک ہے۔'' ڈائریکٹر صاحب ہم سے کسی بڑی فرمائش کی خواہش رکھتے تھے لیکن ہم کچھ پھوٹ کر نہ دیتے تھے۔ ان کے انسٹی ٹیوٹ کی شہر میں کئی شاخیں تھیں۔ یہ چھوٹی سی بات تو کچھ معنی ہی نہ رکھتی تھی۔ ہم سے میل جول ہوا تو انہوں نے نماز پابندی سے شروع کر دی تھی اور بہت واضح آثار تھے کہ انسٹی ٹیوٹ میں نماز کے اہتمام اور ماحول کی درستی کے لیے اقدامات کریں گے۔

بندہ نے محسوس کیا تھا کہ ''چھوٹے'' میں سیکھنے، یاد رکھنے اور ضبط میں لانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ بندہ نے اس کو تاکید کی کہ دیانت اور محنت سے خدمت کرے اور جی لگا کر اس کورس میں شریک ہو جس میں اسے بلا معاوضہ شرکت کا موقع مل رہا ہے۔ ''چھوٹے'' نے ہماری لاج رکھ لی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا ایسا کمال دکھایا کہ سبحان اللہ! سچ کہا جائے تو کئی ریکارڈ توڑ ڈالے۔ وہ ہر لیول میں ٹیچرز کو حیران کرتا اور تعلیم یافتہ ہم جماعتوں کو پیچھے چھوڑتا منزلیں پھلانگتا گیا اور کچھ ہی عرصے میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ کچھ اس کی غیر معمولی ذہانت تھی اور کچھ اسے ہماری توقعات کا پاس تھا کہ اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ زبان میں روانی اور دماغ و زبان میں ہم آہنگی ایسی تھی کہ وہ کوئی بھی زبان سیکھنے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ آدمی خاندانی تھا۔ شرافت و مروت ایسی کہ کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ جتنی ترقی کی، اصیل لوگوں کی طرح اتنا ہی عجز و نیاز اور وفا و احسان شناسی کا پیکر بنتا گیا۔ اس کو ایڈوانس کورس کروانے کے بعد انگلش پڑھانے کی تربیت دلوادی گئی اور کل کا چھوٹا آج انگریزی زبان کا بہترین مدرّس ہے اور دینی مدارس کے طلبہ کے لیے انگلش لینگویج انسٹی ٹیوٹ چلا رہا ہے۔ اس کی پُراعتماد گفتگو اور متاثر کن شخصیت دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ کسی اسکول میں ایک جماعت پڑھے بغیر وہ انگریزی زبان کا بہترین استاد ہے۔ اس کے انسٹی ٹیوٹ میں گریجویٹ بھی انگلش سیکھنے آتے ہیں اور ماننے پر تیار نہیں ہوتے کہ ان کے استاد نے کبھی کسی اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔

آج کل علمائے کرام کو فکر رہتی ہے کہ نوجوان نسل دین سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ہر بڑا مدرسہ محلے کے بچوں کے لیے اقرأ اسکول نہ سہی، ایک انگلش لینگویج انسٹی ٹیوٹ ہی کھول لے جس میں ساتھ ساتھ کمپیوٹر سکھانے کا بھی انتظام ہو تو محلے کے نوجوان وقت اور پیسے ضائع کرنے کے بجائے علمائے کرام اور اہل اللہ کی صحبت میں رہیں گے۔ عام لوگوں کے سامنے مدارس کی نافعیت سوالیہ نشان بنتی جا رہی ہے۔ جب اہلِ مدارس سے ربط ضبط بڑھے گا تو اس طرح کے وساوس خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ ایسے انسٹی ٹیوٹ اپنا خرچ خود نکالتے ہیں بلکہ کئی ''چھوٹوں'' کی کفالت بھی کر سکتے ہیں۔ جن اداروں کو انگریزی پڑھانے والے باشرع اساتذہ کی کامیابی کا مسئلہ رہتا ہے وہ اپنا ایک مدرّس جامعہ کے ''اسپیشل کورسز'' میں بھیج سکتے ہیں۔ دیگر شرائط و کوائف پورے ہوں تو ایسے اُمیدواروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مدارس کے فضلائے کرام کے لیے جامعہ کا ''یک سالہ انگلش لینگویج کورس'' ایک منفرد استعداد حاصل کرنے اور مستقبل میں دینی اداروں کی ایک اہم ضرورت پورا کرنے بلکہ اپنا انسٹی ٹیوٹ کھولنے کے قابل ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔

لالو استاد

ایک عام مسلمان کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دیگر دینی شعائر سے کس قدر قلبی تعلق اور عقیدت و محبت ہوتی ہے؟ اس کا احساس ہمیں پہلی مرتبہ ''لالو استاد'' کی باتوں سے ہوا۔ لالو استاد علاقے کا نامی گرامی دادا گیر تھا۔ اس کی بدمعاشی میں ایک خاص طرح کا رعب اور وقار تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس میں ساتوں شرعی عیب پائے جاتے ہیں، بہت سی برائیوں کا رسیا ہے، کئی قتل کر چکا ہے، بندہ پھڑکا دینا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں لیکن پھر بھی لوگ اس کا بھرم رکھتے تھے اور اس کی وجہ محض اس کی دہشت اور خوف نہیں بلکہ اس کی بہادری، بے جگری، غریبوں، کمزوروں اور بے کسوں سے اس کی ہمدردی تھی۔ لالو استاد چاقو بازی کے فن میں یکتا اور دست بدست لڑائی کا ماہر تھا۔ آج کل تو بدمعاشی سفلوں کی رذالت اور شہدوں کا کمینہ پن بن کے رہ گئی ہے لیکن لالو نے اس وقت سے اپنے فن کا لوہا منوایا ہوا تھا جب دادا گیری باقاعدہ پیشہ ہوا کرتی تھی۔ وہ اتنی صفائی سے مدمقابل کا پیٹ چاک کیا کرتا تھا کہ آنتیں باہر پہلے لٹکتی تھیں، مجروح کو پتا بعد میں چلتا تھا۔

بات مدرسے کی ہو رہی تھی، ذکر بدمعاشی کا چھڑ گیا۔ عربی کا مقولہ ہے بلکہ اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو مشہور شاعر متنبی کے ہمزیہ کا مصرعہ ہے:

''وبضدّها تتبين الأشياء''

یعنی متضاد چیزوں کے تقابل سے ان کی حقیقت خوب واضح ہوتی ہے۔ لالو استاد کو دنیا میں دو ہی چیزوں سے محبت تھی۔ ایک اپنی تلوار مار کہ مونچھوں سے، بھاری بھرکم مونچھوں کو وہ ہر وقت تاؤ دے کر رکھتا تھا اور گھی پلا پلا کر پالتا تھا اور دوسرے اپنے گراری والے چاقو سے۔ لڑائی سے پہلے جب وہ کڑ کڑ کر کے اپنا چاقو کھولتا تھا تو اگلے کا پِتّا اس کی آواز سن کر ہی پانی ہو جاتا تھا۔ مونچھوں کے علاوہ اس کے چہرے پر دو چیزیں نمایاں تھیں۔ ایک تو بائیں گال پر گہرا زخم جو اسے کسی پھڈے میں لگا تھا اور دوسرے اس کی آنکھیں۔ لال بھبھوکا آنکھیں ہر وقت چنگاریاں چھوڑ رہی ہوتی تھیں، گویا دو سرخ بلب ہیں جن کی لائٹ تیز ہوتے ہوئے اچانک دھیمی پڑ جاتی اور پھر دھیرے دھیرے تیز ہونا شروع ہو جاتی۔ جن لوگوں کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر کراہیت کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن لالو استاد کی آنکھوں کی سرخی کو ایک مرتبہ ہم نے قریب سے دیکھا، بالکل قریب سے، ایسے لگا جیسے آپ اینٹوں کے بھٹے میں کھلتی اور دہکتی کھڑکیوں سے اندر جھانک رہے ہوں، مگر کراہت کے بجائے رحم دِلی کا تاثر پیدا ہوا۔

ہوا یوں کہ مدرسے کے راستے میں ایک چھوٹا سا کھلا قطعہ پڑتا تھا۔ اس میں محلّے کے لڑکے بالے کنچے کھیلا کرتے تھے۔ مدرسے کے طالب آتے جاتے کبھی تماشے کے لیے گھڑی دو گھڑی کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم بھی تماش بینوں میں شامل تھے کہ لالو استاد کا وہاں سے گزر ہو گیا۔ وہ یقیناً پہلے کئی مرتبہ وہاں سے گزرتا رہا ہو گا مگر آج اس نے تماشائیوں کے بیچ چند چمکتی ٹوپیاں دیکھ لی تھیں۔ یہ اس کے لیے نئی اور غضب آور چیز تھی۔ وہ دھیرے دھیرے ٹھہرے قدموں سے کنچہ بازوں اور ان

کے گرد جمع ہجوم کی طرف بڑھا۔ حالانکہ بچوں کا بنٹے کھیلنا معمول کی بات تھی لیکن اسے لالو استاد کا رعب کہیے یا کیا کہ ایک ذی روح بھی وہاں نہ ٹھہرا۔ سب اپنے کنچے سمیٹ کر چمپت ہوگئے۔ سوائے ہم چند طالبوں کے کوئی بھی نہ بچا۔ مجمع کے چھٹ جانے کے بعد اصولاً لالو استاد کو واپس ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہماری طرف بڑھتے بڑھتے قریب آ پہنچا تو ہمیں احساس ہوا کہ اس کی نظریں ہم پر جمی ہوتی ہیں۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید ہمارے سروں کے اوپر وہ پیچھے کہیں جھانک رہا ہو مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ اس کا یقینی مطلب یہ تھا کہ اس کا مطلب ہم سے ہے۔ ہم طالبوں کی مخصوص شان بے نیازی سے اپنا راستہ لینے والے تھے کہ اس کی آنکھیں نظر آ گئیں۔ دہکتے انگاروں کی طرح دو آنکھیں گویا قربانی کے تازہ تازہ خون کا چھڑکاؤ ہوا ہے۔ عموماً سرخ آنکھوں میں لال پڑیاں جمی ہوتی ہیں جن سے کراہت آتی ہے مگر لالو استاد کی آنکھوں کی سرخی میں ایسی بات نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ قابلِ رحم انسان ہے جسے حالات نے اس حد تک پہنچا دیا ہے مگر اب یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہ رہا تھا۔ لالو استاد قریب آ پہنچا تھا۔ حسبِ معمول اس کے ساتھ دو ایک پٹھے بھی ساتھ تھے جن کے اُبھرے ہوئے ''بڈّے'' بتا رہے تھے کہ وہاں بھاری بھرکم قسم کے چاقو اٹکے ہوئے ہیں۔ ان کے چہروں پر البتہ رونق نہ تھی اور آدمی کو نفرت کا احساس ہوتا تھا۔ رونق تو لالو استاد کے چہرے پر بھی نہ تھی مگر وہ ایسا اُجڑا ہوا ویران بھی نہ تھا کہ بدمنظر محسوس ہو۔ بہرحال استاد اور شاگردوں کے چہروں میں اس فرق پر غور کرنے کا وقت نہ تھا کیونکہ استاد نپے تلے قدم اٹھاتا قریب آ پہنچا تھا۔ اس نے نظریں ہم پر گاڑ رکھی تھیں اور ہم حیران تھے کہ اس کو ہم سے کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

''تم مدرسے کے طالب علم ہونا؟'' استاد کے لہجے کی گھن گرج دھیمی مگر آواز پاٹ دار تھی۔

''جی ہاں!''

''تو یہاں کیسے کھڑے تھے؟''

لالو استاد صحیح کہہ رہا تھا۔ ہمیں یہاں نہ رکنا چاہیے تھا۔ اگر ہمارے استاد جی کو پتہ چل جاتا ہے تو وہ بھی ضرور ناراض ہوتے۔ بات یہ تھی کہ اگر محلے کے لڑکے کھیل رہے ہوتے تو ہم وہاں نہ رکتے، مگر ان میں کچھ ایسے تھے جو دوسرے وقت میں مدرسے میں پڑھتے رہتے تھے۔ ''الجنس يميل إلى الجنس'' ان کو دیکھ کر ہم بھی رُک گئے۔ بہرحال ہم غلط جگہ پر کھڑے تھے...... اور لالو استاد ہمارے سر پر کھڑا تھا۔ سچ پوچھیے تو ہمیں استاد سے ڈر نہیں لگ رہا تھا، ہمیں فکر اس بات کی تھی کہ لالو استاد ہمارے استاد جی کا بڑا احترام کرتا تھا اور اگر بات ہمارے استاد جی تک پہنچ جاتی تو ان کو بہت محسوس ہوتا کہ طلبہ کی شکایت باہر سے کیوں آئی ہے؟

''ہمارے کچھ ہم سبق، اسکولیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھنے رک گئے۔''

ہم نے حقیقت بیان کر دی تھی اور استاد کی آنکھوں میں جھانک لیا تھا کہ وہ ہماری بے خوفی سے متاثر ہے نیز یہ کہ ٹوپی اور سفید کپڑوں کا احترام بھی کرتا ہے۔

''دیکھو! یہ تم لوگوں کی جگہ نہیں۔ تم لوگ یہاں پھٹکا بھی نہ کرو۔ اگر تم دوبارہ یہاں نظر آئے تو لالو کو غصہ آ جائے گا اور اللہ معاف کرے (یہ اس کا تکیہ کلام تھا) لالو کا غصہ بہت خراب ہوتا ہے۔''

لالو استاد کی وارننگ ہم نے سن لی تھی اور چونکہ کہنے کو ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا اس لیے عافیت اسی میں سمجھی کہ چپکے سے ''یرک'' جائیں اور مدرسے کی طرف کھسک نکلیں۔ ابھی اپنی جگہ سے ہلے ہی تھے کہ ایک شاگرد نے لالو استاد کو بتایا کہ یہ جو طالب آپ سے آنکھیں ملا کر بات کر رہا تھا یہ سادات گھرانے سے ہے۔ یہ سن کر استاد کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ ہم تو جان بخشی سمجھ کر کھسک چلے تھے۔ استاد نے پھر دھر لیا۔ اب اس کی مونچھوں نے ہولے ہولے پھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

''دیکھ شاہ جی! تو آل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے۔ تم تو خدا کے واسطے کبھی ادھر سے نہ گزرنا ورنہ یاد رکھو! لالو بہت وکھری قسم کی بلا کا نام ہے۔ جب بگڑ جائے تو......اللہ معاف کرے......اس کو کوئی قابو نہیں کر سکتا۔''

لالو استاد کی دھمکی میں قطعیّت تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا ہمیں وہاں دیکھ کر اسے بہت رنج ہوا ہے۔ وہ بہرصورت شریف شرفا لوگوں کو ایسی بے وقار اور لایعنی چیزوں سے دور دیکھنا چاہتا ہے۔

اب آپ غور فرمایے! لالو سکّہ بند بدمعاش تھا۔ وہ بدمعاشی پر جینا اور مرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں واپسی کی راہیں بند ہو چکی تھیں مگر مدرسے کے طلبہ ایسی چیزوں کے قریب پھٹکیں جو ان کی عرفیت کے منافی اور وقار سے میل نہ کھاتی ہوں، یہ اسے برداشت نہ تھا اور پھر سادات سے عقیدت کا یہ عالم ہے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے سید السادات سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے گنہگار اُمتیوں کی محبت اور وارفتگی کس درجے کی ہو گی؟ اہلِ یورپ خود کو نفسیات شناس کہتے ہیں مگر افسوس وہ مسلمانوں کی اس کیفیت کو آج تک نہیں سمجھ سکے۔ دراصل کچھ عرصہ پہلے جو شخص جتنا زیادہ دین سے دور ہو وہ دینی شعائر کا اتنا زیادہ احترام کرتا تھا۔

خیر! ہمیں اس دن احساس ہوا عام لوگوں کے دل میں دینی مدارس، دینی شعائر اور جناب نبی کریم شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کس درجے کی ہے؟ نیز یہ کہ مدارس کے طلبہ خاص قسم کی مخلوق ہیں۔ خاص بن کر رہنے میں ہی ان کی عزت و عافیت ہے۔ مگر تعجب اس بات پر ہے اس زمانے کے بدمعاش طلبہ کا احترام کرتے اور ان کے احترام کے خلاف چیز برداشت نہیں کرتے تھے۔ آج کی دنیا کو کیا ہوا کہ اپنی ایمانی اور غیرتی روایات بھلا کر اہلِ مدارس اور دین داروں کو روایات فراموشی کا درس دے رہی ہے۔

طوری ماما

(1)

سنتے آئے تھے کہ گورا صاحب بڑا صاحب فہم و دانش ہے۔ غضب کا ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ بلا کا قوم پرست اور محبّ وطن ہے۔ وہ اپنے وقت، عقل، تجربے اور محنت کو اپنی قوم کی برتری کے لیے صرف کیے رکھتا ہے۔ مواقع اور حالات سے فائدہ اُٹھانے میں اس کا جواب نہیں۔ وفاداریاں خریدنے اور انہیں استعمال کر لینے کے بعد دھتکار دینے کا فن بھی اس پر ختم ہے۔ غرض یہ کہ اس کی ہمہ جہت برتری کے غلغلے نے ایسی دھاک بٹھا رکھی تھی کہ اکثر اقوامِ عالم تو بن دیکھے ہی اس کی غلامی کو ذہنی طور پر قبول کر چکی تھیں، حتیٰ کہ ساڑھے 36 انچ کی چھاتی پر ساڑھے 33 تمغوں کی قطار لٹکانے والے اور جھکے ہوئے کندھوں پر چمکتے ہوئے ستاروں کی کہکشاں سجانے پر فخر کرنے والے بے جگروں کا جگر بھی ان کی دھونس سے دہل جاتا تھا، مگر لگتا ہے خداوند قدوس نے اس مرتبہ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے طوری ماما جیسے خان صاحب کو منتخب کر لیا ہے۔ آپ کو یہ بات رجائیت آمیز مبالغہ محسوس ہوگی مگر ٹھہریے! آپ پہلے ماما کی کہانی سن لیجیے، شاید آپ اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

افغانستان کی شہری آبادی پر جب سے جدید تاریخ کے سفاک ترین حملے شروع ہوئے ہیں، افغانوں کے ہاتھ دلچسپ مشغلہ آ گیا ہے۔ امریکیوں کے آنے سے قبل ہی انہوں نے امریکی فوجیوں کے لباس، سامان اور اسلحے کے ریٹ مقرر کر لیے تھے مگر جب طویل انتظار کے بعد دنیا کی نامور افواج کے مایہ ناز سپوتوں نے بموں کی تنی ہوئی چادر کی اوٹ سے اپنا پھٹکاری چہرہ نہ دکھایا تو ایک زندہ دل قندھاری خان صاحب ''طوری ماما'' کو نیا طریقہ سوجھا۔ انہوں نے بازار سے گاڑیوں میں لگنے والی بیٹری خریدی اور اس کے ساتھ ایک بلب منسلک کر کے ویران پہاڑی کی چوٹی پر اس طرح رکھ دیا کہ ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' کا نقشہ کھنچ گیا۔ طوری ماما کا مقصد اس سے یہ نہ تھا کہ ویرانے میں چراغاں کر کے جنگل میں منگل کا لطف لیں بلکہ ان کی غرض شاعر کے اس شغل سے کچھ ملی جلتی تھی۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تو خان صاحب نے یار کے رُخ کے سامنے شمع سجانے سے متاثر ہو کر پہاڑ کی چوٹی پر بلب جلایا اور امریکی دیوانوں کی طرف سے بموں کے پروانے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ پہلی رات گزاری، دوسری بھی بیت گئی، لگتا تھا امریکیوں کے سیٹلائٹ پر زمینی حملے میں ہونے والی شکست سے اُڑنے والی ذلت کی دھول پڑ گئی ہے کہ اس چراغِ برقی کی طرف توجہ منعطف نہیں کر رہا، مگر آخر کار تیسری رات طوری ماما کی اُمید بر آئی۔ امریکی اپنی تمام تر تیزی و طراری اور عقلمندی و عیاری کے ساتھ اس سادہ مزاج ماما کے بچھائے ہوئے جال میں آ پھنسے۔ امریکا کے اعلیٰ ترین جاسوسی نظام کے منظم ترین نیٹ ورک نے اپنے مرکزی کمان کو رپورٹ دی کہ پہاڑوں کے

کالے کالے میں کچھ چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ گوری کھوپڑی میں مقید خنزیر کے جراثیم کی ماری ہوئی عقل نے سمجھا کہ طالبان نے کوئی نئی پناہ گاہ ڈھونڈ لی ہے۔ چنانچہ اس سنسنی خیز انکشاف کی اطلاع ''اوپر'' دی گئی۔ امریکا کی خصوصی فورس تو ناممکن کی تہہ سے ممکن کو برآمد کر لیتی ہے، اندھیری رات میں چمکتے ہدف کو نشانہ بنانا ان کے لیے کیا مشکل تھا۔ چنانچہ ''اوپر'' سے منظوری کے بعد امریکا کی ناقابل شکست فضائی قوت ایک نئی مہم پر نکلی۔ دنیا کے جدید ترین طیارے مقدس صلیبی مشن پر گئے اور کسی مزاحمت کے بغیر کامیاب کارروائی کر کے بخیر و عافیت اپنے مستقر پر واپس پہنچ گئے۔ مشن کی تکمیل کی اطلاع ''اوپر'' دی گئی تو صلیب کی عظمت کی طرف ایک اور کامیاب قدم بڑھانے پر ایک دوسرے کو گرم جوش مبارکباد دی گئی اور اپنے اعلیٰ جاسوسی نظام اور درست نشانہ لگانے کی صلاحیت پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

اگلی صبح جب کامیاب مشن میں شریک فوجی فتح کے جام لنڈھا کر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ طوری ماما چوٹی پر پہنچا، بموں کا اسکریپ جمع کیا، گدھے پر لاد کر شہر پہنچایا اور 400 کی بیٹری کے بدلے 1300 کا کباڑ کھرا کر لیا۔ اس نفع بخش تجارت کی خبر پاس پڑوس کے خان بھائیوں کو بھی ہو گئی لہٰذا ان دنوں افغانستان کے شہروں کے مضافات میں بہت سی چوٹیوں پر برقی شمعیں فروزاں رہتی۔ ان پہاڑوں کے دامن میں کسی چٹان کی آڑ میں خان صاحب ٹکٹکی باندھے بیٹھے ہوتے تھے۔ جب جدید آلات سے لیس امریکی طیارے ان اہم اہداف پر پروانہ وار بمباری کرنے کے لیے آتے ہیں تو وہ اطمینان کا سانس لے کر جیب میں رکھی نسوار کی خالی ڈبیا کو تھپتھپاتے، صبح اسکریپ بکتے ہی سب سے پہلے تازہ پسے ہوئے تمباکو سے ڈبیا کا خلا بھرتے اور کلّے میں نسوار کی چٹکی دبا کر اگلی رات کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔

امریکا کے گرائے ہوئے خوراک کے پیکٹوں کو تو غیرت مند افغانوں نے نفرت سے جلا دیا تھا، مگر ان کے برسائے ہوئے بموں سے افغانوں کے روزگار کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا۔ ہم امریکا کی روشن عقل کے قائل پہلے سے تھے، اب اس کی فراخ دلی کے بھی قائل ہوتے جا رہے ہیں۔

طوری ماما

(2)

امریکا نے جب افغانستان پر حملہ شروع کیا تو طوری ماما چمن سے قندھار کے درمیانی علاقے میں کسی جگہ رہتا تھا۔ اس جگہ کی صحیح تعیین کا کوئی ذریعہ بندہ کے پاس نہیں لیکن سقوطِ قندھار کے دنوں میں طوری ماما کی جو کارروائیاں بندہ نے ایک کالم میں ذکر کی تھیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ماما قندھار کے گردونواح ہی میں کہیں رہتا تھا۔ ان دنوں ماما کو دلچسپ مشغلہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ ماما ہر رات اپنے چھوٹے بیٹے کو لے کر نکلتا اور کسی پہاڑی کی چوٹی پر بیٹری سے بلب جلا کر رکھ دیتا۔ امریکی طیارے آتے، ''ٹارگٹ'' کو تاڑتے اور جدید ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے جا کر اپنے کمانڈروں کو ناتجربہ کار دشمن کے اہم مقامات تباہ کیے جانے کی خوشخبری سناتے۔ طوری ماما صبح پہاڑی کے دامن میں پہنچ جاتا اور اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر ان بموں کے ٹکڑے تلاش کرتا جو امریکی نشانہ بازوں کی ''کمال مہارت'' کے باعث ''ہدف'' کے اردگرد ہی با آسانی مل جاتے۔ طوری ماما کا یہ کاروبار اتنا چلا کہ اس نے گاؤں میں کہلوا دیا کہ یہ پہاڑی اس کے خاندان کا روزگار ہے۔ اگر کسی اور کو اس طرح کے شکار کا شوق ہے تو وہ کوئی دوسری پہاڑی تلاش کرے۔

طوری ماما پر لکھے گئے اس کالم میں نجانے کیا بات تھی کہ کئی احباب نے اس کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کیا۔ طوری ماما خالص پٹھان تھا۔ اس کو یہ برداشت نہ تھا کہ کوئی گاؤں والا اس کی نشان زدہ پہاڑی کے قریب جائے تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ''کاپر خارجیان'' (کافر غیرملکی) اس کے وطن پر قبضہ کریں۔ وہ جب امریکی طیاروں کو اپنے گاؤں کی فضا میں پرواز کرتے دیکھتا تو غصے سے اس کی مونچھیں پھڑکنے لگتیں۔ پشتو زبان کے وہ نوادرات جو عرف عام میں گالیاں لیکن ماما کے خیال میں غیرت اور غصے کی علامت سمجھے جاتے ہیں، خود بخود اس کی زبان پر جاری ہوجاتے۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح امریکی جی داری کا مظاہرہ کر کے کچھ نیچے آجائیں، کم از کم اتنا کہ اس کی دسترس میں ہوں، تب وہ اپنے ارمان پورا کرسکے، اور اپنے جوان بیٹوں کے سامنے سرخ رو ہوسکے۔ جب طالبان امریکی حملے کے آغاز سے لے کر 35 دنوں تک ڈٹے رہے تھے، اس دوران قربانی اور شجاعت کے وہ مناظر دیکھنے میں آئے جو لازوال بھی ہیں اور بے مثال بھی۔ افسوس کہ جنگ عظیم اوّل ودوم کے جھوٹے سچے واقعات پر دنیا بھر کے قلمکاروں نے لکھا۔ ناول تحریر ہوئے۔ افسانے وجود میں آئے۔ فلمیں تک بنائی گئیں............ لیکن طالبان نے ایثار و قربانی کی جو داستانیں رقم کیں، ان کو کریدنے اور ان پر لکھنے بولنے والے خال خال ہیں۔ جب طالبان نے دیکھا کہ صاحب بہادر نیچے اتر کر چھہ پانے پر تو کیا، پنجہ لڑانے پر بھی آمادہ نہیں، بالا ہی بالا بہادری کے جوہر دکھا کر داد سمیٹنا چاہتے ہیں تو انہوں نے شہروں کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر دنیا بھر کے اللہ والوں کو سخت صدمہ تھا اور یار لوگوں نے خوب بغلیں بجائی تھیں۔ بندہ نے اس وقت ''داؤ'' کے عنوان سے کالم لکھا تھا کہ افغانوں کی نفسیات سمجھنی چاہییں، یہ پسپائی نہیں، یہ دشمن کو اپنی مرضی کے میدان میں

کھینچنے کا حربہ ہے۔ جب سے گورے صاحب زمین پر آئے ہیں ان کو برگر کا ذائقہ اور کوک کی مستی بھول گئی ہے۔ طالبان تو طالبان، طوری ماما جیسے دیہاتی افغانوں نے ''اللہ دے اور بندہ لے'' کے مصداق گوری چمڑی کے شکار کو مشغلہ بنالیا ہے۔ پہلے کی بنسبت فرق اتنا ہے کہ بیٹری اور بلب کی جگہ ڈیٹونیٹر اور بارود نے لے لی ہے۔ امریکی گاڑیوں کی گذرگاہ کی ریکی کر کے مناسب جگہ تاڑ لی جاتی ہے پھر موٹے لوہے کی ایک مخصوص طرز کی کیتلی میں ''گرم مسالہ'' بھر کر تاروں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ جب امریکی گاڑی عین اس کے اوپر آ پہنچتی ہے تو ''انفجار'' (دھماکہ) کی مخصوص ترنم بھری آواز پہاڑوں میں گونج جاتی ہے۔ آگ کے مرغولے اور دھویں کے بادل میں سے گاڑی کے پرخچے اِدھر اُدھر بکھرتے ہیں جو طوری ماما کے اندر چھپے کٹر افغان مسلمان کے دل کی تسکین کا سامان بھی ہے اور پیٹ پالنے کا ذریعہ بھی۔

امریکی خوش تھے کہ انہیں امارت کے خاتمے کے بعد افغان سرزمین کی معدنیات ملیں گی۔ طوری ماما خوش ہے کہ اس کو کافر کو مارنے کے ثواب کے ساتھ روزگار کا ذریعہ مفت ہاتھ آرہا ہے۔

امریکی دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ ہم نے خلافت کے دوبارہ احیا کے امکانات ختم کر دیے اس لیے عیسائی دنیا ہمارا ساتھ دے۔ طوری ماما خوش ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے سامنے مونچھیں تان کر چل سکتا ہے کیونکہ وہ اطمینان بخش حد تک خارجی دشمن شکار کر چکا ہے اور مزید کی امید بھی رکھتا ہے۔

امریکیوں کو اپنی اس ٹیکنالوجی پر ناز تھا جو کائنات کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ طوری ماما کو اپنے اندر اُٹد تے غصے کی وہ آگ ٹھنڈی ہونے پر فخر ہے جس کی بنا پر دنیا پشتونوں کو ٹھیٹھ مسلمان کہتی ہے۔

کھیل ابھی جاری ہے۔ عام دنیا والے شاید اس فریق کا تعین کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لیں گے، جس کے حصے میں فتح کا تاج آئے گا لیکن جو لوگ افغانوں کے مزاج کا الف بھی جانتے ہیں یا انہیں کبھی افغان کہساروں سے ایک مرتبہ بھی ہو کر آنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ گورے صاحبان کا اسٹائل خراب ہونے والا ہے۔ غیب کا علم تو اللہ کو ہے لیکن یہ بات پتھر کی لکیر کی طرح نظر آرہی ہے۔

طیارہ شکن چرواہا

مشہور ہے کہ سابقہ سوویت یونین کے زمانے میں عبدالمنان کوچی نامی ایک مجاہد تھا جو کوچیوں (خانہ بدوشوں/ چرواہوں) کے قبیلے سے تھا۔ اسے قدرت نے ہوائی جہازوں کو نشانہ بنانے کی خاص صلاحیت عطا کی تھی۔ اس زمانے میں مجاہدین سے یہ بھی سنا کہ چند دنوں تک اگر اسے جہاز کے شکار کا موقع نہ ملتا تو وہ سخت بے چینی کا شکار ہو جاتا تھا۔ کبھی یہ بے چینی بڑھ کر دانوں اور خارش کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ اس وقت تک اس کی جسمانی حالت اعتدال پر نہ آتی تھی جب تک اس کی گن سے نکلا ہوا سیسہ کسی فولادی پرندے کو مار نہ گراتا۔ اس طرح اس نے ہاتھ پیر کھجاتے اور بے چینی مٹاتے مٹاتے 27 طیارے مار گرائے۔ اگر یہ کوچی مجاہد کسی اور ملک سے تعلق رکھتا تو اعداد و شمار کے گرد گھومنے والے اور حساب و کتاب کی مہارت رکھنے والے مغربی ممالک اس کا نام ''گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں درج کرتے، اسے اعلیٰ ترین جنگی اعزازات سے نوازا جاتا۔ اسے جدید دنیا کا ماہر ترین نشانچی قرار دیا جاتا، اس کی یادگار بنائی جاتی، اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے، اس کے نام سے منسوب ایئر وار کالج بنائے جاتے، اس کے نام پر کوئی انعامی میڈل جاری کیا جاتا اور بھی بہت ایسا کچھ ہوتا جو آج کل کی ریاکار اور شہرت پسند دنیا کی عادت ہے۔

مگر وہ ایک پسماندہ ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ آج کی مہذب دنیا کی جانبدارانہ اصطلاح کے مطابق وہ تیسرے نمبر کی دنیا کا ایک فرد تھا جسے دو نمبر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ محیر العقول کارنامہ انجام دینے کے باوجود گمنام رہا اور اسی گمنامی کی حالت میں اپنے ربّ کے حضور پہنچ گیا جہاں وہ یقیناً نیک نام اور معزز ہوگا۔ اسے اس کے قدردان پروردگار نے وہ سب کچھ دے رکھا ہوگا جو ایک مہربان اور سخی ذات اپنے وفا شعار اور جانثار بندے کو دیتی ہے۔ وہ دنیا والوں کی ستائش اور کسی مادّی صلے کی تمنا سے بے پروا ہو کر رُوسی پائلٹوں کو زمین چٹاتا رہا تھا۔ لہٰذا اسے دنیا والوں کی ناقدری کا قطعی کوئی شکوہ نہ ہوگا بلکہ وہ اپنے ربّ کے دیے ہوئے انعامات سے اتنا خوش و خرم ہوگا کہ اس کی شادمانی اور مسرت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ بلاشبہ وہ خوش نصیب تھا جب تک دنیا میں رہا تو قدرت کی دی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں کو اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کرتا رہا اور جب دنیا سے گیا تو اپنے مہربان ربّ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھنے والا یہ مجاہد اتنی عجیب و غریب اور حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا کہ ہوابازی سے تعلق رکھنے والے بعض وہ ماہرین جنہیں ان دنوں افغانستان جانے کا موقع ملا تھا وہ اگرچہ اپنے شعبے میں حرفِ آخر سمجھے جاتے تھے، لیکن وہ عبدالمنان کوچی کے کارنامے دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ اس پیدائشی مجاہد کی غیر معمولی بلکہ عدیم النظیر طیارہ شکن صلاحیت ان کی دلچسپی کا خاص موضوع بن جاتی تھی اور وہ خالقِ کائنات کے تخلیق کردہ اس شاہکار کی مہارت کے مظاہروں سے نہایت محظوظ ہوتے تھے۔ ایک ایسا شخص جس نے رُوس کی آمد سے قبل جنگی طیارہ دیکھا بھی نہ تھا، وہ بغیر کسی تربیت کے اتنا اچھا اور سچا نشانہ کیسے لگا لیتا تھا

جبکہ اس شعبے کے لیے ہزاروں میں سے چند افراد منتخب کیے جاتے ہیں، انہیں مہنگی اور اعلیٰ تربیت دی جاتی ہے، پھر بھی ان میں سے ماہر ترین فرد کا ریکارڈ بھی اس مجاہد کی کارکردگی کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے بڑی سبق آموز ہے جو آج کل اخبارات میں امریکا کے انواع واقسام کے جنگی طیارے (لڑاکا، بمبار، ٹینکر، جاسوس اور راڈار کے حامل ہوں) دیکھ دیکھ کر اپنا خون خشک کر لیتے ہیں اور ہمدردانہ لہجے میں کہتے ہیں: ''طالبان اگرچہ اچھے لوگ ہیں لیکن وہ ٹیکنالوجی کے اس عفریت کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو بحر اوقیانوس کے اس پار 50 جادوئی ریاستوں والے اس ملک میں بستا ہے جس کا نام امریکا ہے۔''

بکریاں چرانے والا یہ مجاہد جن دنوں اپنے سچے نشانے سے روسیوں کو اونچی فضاؤں میں شکار کر رہا تھا، ان دنوں طیارہ گرانا نہایت مشکل کام تھا۔ بہادر رُوسی ہوا باز اپنے طیاروں کو نیچے نہ لاتے تھے۔ وہ بادل نخواستہ مجاہدین کے علاقے میں آتے اور بالا ہی بالا بم برسا کر واپسی کا راستہ پکڑتے۔ ان دنوں آہنی پرندوں کا شکار نہایت صبر آزما، کٹھن اور مہارت طلب کام تھا۔ ہمارا وہ کوچی مجاہد جو اس داستان کا مرکزی کردار ہے۔ اس مشکل کام کو یوں چٹکی بجاتے کر دکھاتا جیسے سردیوں کے موسم میں رُوس سے آئے ہوئے پرندوں کا ہمارے بعض ہم وطن شکار کیا کرتے ہیں۔ عبدالمنان کوچی کی شہادت کے بعد مجاہدین کی طیارہ شکنی کا گراف نیچے آتا جا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ اسٹینگر میزائل لگ گیا جس کو کندھے پر سجا کر پہاڑوں سے ہوتے ہوئے کسی ہوائی مستقر کے قریب پہنچ جاتے تھے۔ موقع ملنے پر کھڑے یا اُڑتے طیاروں کے پیٹ میں سُوا نما میزائل گھونپ دیتے تھے اور پکڑائی کا خطرہ پیدا ہونے سے قبل واپس آ جایا کرتے تھے۔ اسٹینگر میزائل کا خوف کوچی مجاہد کے شہید ہونے کے بعد بھی رُوسیوں کو نیچی پرواز کرنے نہ دیتا تھا۔ ان کے ہیلی کاپٹر اُترنے کے لیے قطار میں آنے کے بجائے گول چکر کاٹ کاٹ کر نیچے اُترا کرتے تھے۔ انہیں ہر وقت پیٹ میں چھرا گھونپے جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔

رُوسی ریچھ کو اتنی جگہ سے مار پڑی کہ اس کے لیے دریائے آمو کے پار واپس جائے بغیر چارہ نہ رہا۔ وہ واپس چلا گیا تو امریکا کو فکر ہوئی کہ یہ دور مار ''سُوا'' مجاہدین کے ہاتھوں سے واپس لینا چاہیے جسے انہوں نے اسٹینگر میزائل کا نام دے رکھا تھا۔ مگر ان کی یہ فکر غم میں اور غم، کڑھن اور صدمے میں تبدیل ہو گیا جب مجاہدین نے صاف جواب دیا کہ ابھی ہمارا چاند ماری کا شوق پورا نہیں ہوا لہٰذا آپ اس کو فی الحال بھول جائیں۔ ویسے بھی یہ امریکا نہیں، افغانستان ہے اور افغانوں میں تحفہ دے کر واپس لینا نہایت بُرا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہوا میں تیرتا ہوا جہازوں کی دُم میں جا گھسنے والا یہ ''سُوا'' طالبان کے پاس ہے۔ وہ اس کے بے داغ نشانہ کے ساتھ حملہ آوروں کے استقبال کے لیے میزائل براہ ہیں۔ دیکھیں اس مرتبہ طیارہ شکنی کا اسکور کہاں تک پہنچتا ہے؟

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میں نے جب انہیں دوسری مرتبہ دیکھا تو چونک کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ شیر بَبر کی طرح لگ رہے تھے۔ کشادہ پیشانی، چمکتا چہرہ، پُر رعب اور باوقار، آنکھوں میں غیر معمولی چمک، اندرونی جوش، تمتماتے چہرے پر غیر معمولی رونق و دبدبہ، کسی انسان کو شیروں سے تشبیہ دیتے ہوئے تو بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو سنا تھا مگر اپنی آنکھوں سے ایسی شخصیت کو دیکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا جو اس تشبیہ پر سو فیصد مکمل اُترتی تھی۔ اتنی مکمل کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے مبہوت ہو کر گرد و پیش سے بیگانہ ہو جائیں۔

ان کو پہلی بار آج سے تقریباً پچیس برس قبل اس وقت دیکھا تھا جب بندہ سادسہ کا طالب علم تھا۔ چڑھتی جوانی کا زمانہ تھا۔ جان بنانے اور فنونِ حرب سیکھنے کا جنون تھا۔ اس زمانے میں جہادی تربیت کا ڈول نہ ڈالا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مارشل آرٹ تھے جس سے دل بہلایا جا سکتا تھا۔ اس فن کے کامل استاذ کی تلاش میں کراچی کے بہت سے ''نمائش خانوں'' میں جانا ہوا۔ خالص مردانہ کھیل میں زنانہ اسٹائل کی آمیزش دل کو نہ بھائی۔ ہم تو پتھر سے فولاد بننے آئے تھے اور یہاں کی ظاہر داری، نمود و نمائش، فنِ حرب کی جگہ فنِ نمائش تو اُلٹا ہمیں آٹے کی ناک والا موم کا گڈا بنائے دے رہی تھی۔ پوچھتے پاچھتے گھومتے گھامتے ہم ''انعام مزجمز'' گزری جا پہنچے۔ سچ پوچھے بے قراریوں کو قرار آ گیا۔ بندہ کیا تھا سراپا فولاد۔ سراپا نظم و ضبط، سراپا حرب و ضرب، پیکرِ اخلاص...... جس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہوئے آپ کو فخر محسوس ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شعر کا مصرع ہے: "**وقدر کل امرئی ما کان یحسنہ**" (اس دنیا میں ہر آدمی کی قدر و منزلت اس کے اپنے شعبے میں اس کی مہارت اور کمال سے لگائی جاتی ہے۔) سپاہی سے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ تمہیں آرائش گیسو کا طرز نہیں آتا۔ اسے تو اپنے فن میں طاق ہونا چاہیے اور اگر وہ اس فن کا استاذ بھی ہے اور اپنے شاگردوں سے مخلص بھی۔ بس اس کے بعد باقی دنیا فانی ہے۔ بقا صرف فن میں مہارت اور اخلاص کی خوشبو کو ہے اور خدا کی شان کہ پاکستان میں کیوکشن کراٹے کے گرینڈ ماسٹر اور فنِ حرب کی آبرو سیہان انعام اللہ خان کو اللہ رب العزت نے ان دونوں خوبیوں کے علاوہ ایک بہترین انسان اور بہترین دوست ہونے کی اعلیٰ اوصاف سے بھی نوازا تھا۔ وہ اقبال کے مردِ مؤمن کی ہو بہو مکمل تصویر تھے

ہو حلقۂ یاراں تو ابریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

بندہ نے 80ء کی دہائی میں پہلی بار جب ان کو دیکھا تو آتش اس وقت جوان تھا۔ ایک تو وہ خاندانی خان صاحب اور پھر آرٹ مارشل سے ان کا قلبی اور فطری تعلق۔ صبح و شام انسانی جسم کو لوہا بنانے اور پھر اس لوہے کو کارآمد ہتھیار میں تبدیل کرنے کی طویل ریاضت نے انہیں سراپا برق بنا رکھا تھا۔ ان کے اندر بجلی بھری معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس بے پناہ طاقت اور بے مثال فن کو انہوں نے کبھی کسی کمزور پر رُعب جمانے کا ذریعہ بنایا نہ کبھی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوئے۔ شہرت اور مقبولیت کس کا دماغ خراب نہیں کرتیں

سوائے اس کے کہ انسان فطری طور پر اعلیٰ ظرف اور خاندانی ہو یا پھر کسی سچے اللہ والے سے اس کا تعلق ہو۔ خان صاحب بلاشبہ خاندانی آدمی تھے انہوں نے کبھی ہم فقیروں کے آنے جانے کا برا نہیں منایا بلکہ اُلٹا خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے حالانکہ یہ ان کے عروج کا وہ دور تھا جب ایک دنیا ان کی شاگردی اور ملاقات کی متمنی رہتی اور وہ بھی اس وقت ظاہری طور پر باشرع نہ تھے...... لیکن جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے: "خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا" (جو لوگ خاندانی ہوتے ہیں، ان کی خاندانی صفات زمانہ جاہلیت ہو یا زمانہ اسلام ان کے فطری اوصاف ان کا طرۂ امتیاز ہوتے ہیں) ورنہ بندہ نے ایک ایسے "بگ ماسٹر" کو بھی دیکھا جو رنگ میں اُترنے سے کتراتا تھا لیکن ایک مرتبہ تماشائیوں میں موجود ہمارے ایک طالبان ساتھی سے کچھ شکایت ہوئی تو وہ اپنے تمام حقیقی و غیر حقیقی اعزازات بدن پر سجائے اپنی منفرد مسند سے اُٹھ کر تماشائیوں کے درمیان آ گیا اور اسے کہنے لگا: "جاؤ مسجد کو جاؤ۔ چلو یہاں سے مسجد کو جاؤ۔" دیکھا آپ نے کم ظرفی کے بدنما مظاہرے۔

خان صاحب کی باتیں لکھنے بیٹھیں تو یقین جانیے صفحوں کے صفحے ہو جائیں اور دل نہ بھرے۔ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ان جیسا خوددار، وضع دار اور یاروں کا یار، دنیا گھوم جائیے کہیں نہ ملے گا۔ ایسے لوگ قوم کی آبرو اور زمانے کی پہچان ہوتے ہیں جو قوم و وطن کے لیے اپنا سب کچھ لٹا کر بھی بدلے میں کچھ نہ چاہیں۔ ایک بار راقم الحروف نے ان کا انٹرویو لے کر چھاپنا چاہا، کہا: "ہم تو اپنے آپ کو چھاپنا نہیں چھپانا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ چھپ کر خوش ہوتے ہیں ہم چُھپ کر خوش رہتے ہیں۔" بتائیے! ایسی بے نفسی تو درویشانِ زمانہ میں بھی ڈھونڈے سے ہی ملے گی۔ ان کی جو سب سے بڑی صفت بندہ کو پسند تھی وہ یاروں کا یار اور بے لوث وفادار ہونا تھی۔ محفل کے تو بادشاہ تھے۔ وفات سے تین روز قبل علمائے کرام کی ایک جماعت کے ساتھ عیادت کے لیے جانا ہوا۔ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو ہمیں دیکھ کر چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ مجلس لگ گئی تو کھل پڑے اور پرانی یادوں کے دریچے سے جھانک جھانک کر اپنے اسفار، مقابلوں اور تجربات کی جھلکیاں دکھائے گئے۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو ہدایت بھائی مخل ہوئے اور عرض کی کہ ڈاکٹروں نے بات کرنے سے منع کر رکھا ہے اور یہاں ڈیڑھ گھنٹے سے محفل جمائے خوش گپیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن بات یہ کہ خان صاحب کے اندر ایک سچے مجاہد کی طرح "ول پاور" بے انتہا تھی۔ انہوں نے آخری دم تک بیماری نامی کسی چیز کے سامنے ہتھیار ڈالے نہ شکست مانی۔ وہ زندہ دلی اور بذلہ سنجی جوان کا طرۂ امتیاز تھی آخر تک باقی رہی۔ نجانے پرانے زمانے کا یہ انسان اس زمانے میں کیسے پیدا ہو گیا تھا؟ مجھے اس وقت مال دار ہونے کی شدید خواہش پیدا ہوئی جب سنا کہ ڈاکٹروں نے انہیں بتایا ہے کہ چار اٹیک ہو چکے ہیں، اب اگر ایک خاص قسم کی جدید مشین جس کی قیمت سات لاکھ روپے ہے، لگائی گئی تو وہ اٹیک کو سہارے گی ورنہ ان کی زندگی کی ضمانت نہیں۔ خان صاحب انتہائی خوددار آدمی تھے اور ہم جیسا کہ من حیث القوم ہیں زندہ کو نہیں پوچھتے البتہ مرتے ہی پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ اتنا کھرا، اتنا بے لوث اور دل صفا بندہ، منافقت، خوشامد اور ریا کاری کی ماری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی ملنا مشکل ہے۔

خان صاحب کو بھی کسی نے نہ پوچھا حتیٰ کہ اس سرکاری ادارے نے بھی جہاں کے جوانوں کو خان صاحب نے غیر معمولی تربیت دی تھی اور دیتے رہتے تھے۔ البتہ ان کے جنازے پر پھولوں کے گلدستے لے کر کچھ جوان اور افسران آئے ہوئے تھے۔ عظیم لوگوں کی اتنی سنگ دلانہ ناقدری نے ہی تو ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے کہ انسان گھٹ گئے اور سائے بڑھ گئے ہیں۔

خان صاحب کو آخر عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام نیکیوں کا صلہ عطا فرمایا جو انہوں نے عمر بھر کی تھیں۔ انہوں نے غریبوں کی اولاد کو بھی فن سکھانے میں کبھی بخل نہیں کیا بلکہ بخل تو ان کے مذہب میں تھا ہی نہیں۔ بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے جواں مرد بیٹے عطا کیے جو ان کے فن کے صحیح جانشین اور وارث ہیں۔ ایسے خوش اخلاق، خوش خصال، خوش اطوار اور اپنے فن سے شغف رکھنے والے کہ اللہ نظر بد سے بچائے اور خوب خوب ترقی اور کامیابی سے نوازے۔ خان صاحب نے ساری عمر پاکباز گزاری۔ وہ زمانہ بھی جب وہ 144 ملکوں میں گئے اور ہیرو شمار ہوتے تھے مگر اپنا دامن آلودگیوں سے بچائے رکھا۔ اللہ نے انہیں بڑھاپے میں مکمل دین داری کی نعمت سے نوازا تھا۔ سنت رسول نے ان کی مردانہ وجاہت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ شرعی ڈاڑھی ان کے گورے سرخ چہرے پر ایسی سجتی تھی کہ سبحان اللہ! شیر بھی کھلے جنگل میں ایسا رعب دار کیا ہوتا ہوگا؟ کسی کو شک ہو تو ان کے انسٹیٹیوٹ کے استقبالیہ میں ایک مرتبہ چلا جائے۔ انہیں پیر طریقت مرشدی حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی دامت برکاتہم سے ارادت و بیعت کا تعلق تھا۔ اس کے اثرات بھی ان پر صاف محسوس کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹروں کے سخت منع کرنے کے باوجود گزشتہ رمضان میں امراض قلب کا مریض ہونے کے باوجود روزے چھوڑے نہ تراویح کا ناغہ کیا۔ جبکہ چار مرتبہ اٹیک ہو چکا تھا اور ڈاکٹروں نے حتمی وارننگ دے رکھی تھی۔

خان صاحب کو اپنے فن سے عشق تھا۔ وہ یہ فن سکھانے میں پوری دیانت سے کام لیتے تھے۔ ''سینہ بہ سینہ'' چھپائے رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کے نزدیک یہ فن نوجوانوں کی جسمانی تربیت کے ساتھ اخلاقی سدھار کا بہترین ذریعہ تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ محبِ وطن اور محسن قوم شخص اپنی پوری زندگی قوم کے نوجوانوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے جُتا رہا۔ ملک کے طول وعرض میں بکھرے ہوئے سیکڑوں ماسٹرز اور ہزاروں شاگرد اس کے کمال فن اور اخلاص و وفا کا چلتا پھرتا ثبوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ خان صاحب کے خلف الرشید بھائی ہدایت اللہ اور خان صاحب کے تمام بیٹوں اور شاگردوں کو ان جیسا ایمان، توکل، اسلام کی محبت اور وطن واہلِ وطن کی خدمت کا سچا جذبہ نصیب فرمائے اور مرحوم کو اپنے مقربین میں شامل فرمائے۔ آمین۔

گنڈاپور کی گنڈیریاں

شعلہ و شبنم کا اجتماع:

ہم جب پڑھتے تھے تو ہمارے ساتھ دو طالبعلم بھائی ہوا کرتے تھے، ایک کا نام تھا بسم اللہ جان اور دوسرے کا گنڈاپور۔ یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کی ضد تھے۔ بسم اللہ جان انتہائی شریف النفس، کم گو، صلح کُل طبیعت کا مالک اور پڑھنے پڑھانے کا شوقین تھا جبکہ گنڈاپور بڑھکتی چنگاری کی طرح تیز وطرار، ہر لمحہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کو بے قرار اور بگڑے بچوں کی طرح لکھنے پڑھنے سے بیزار تھا بلکہ اوازار۔ اس میں ایک عیب اور بھی تھا۔ وہ بڑبولا تھا اور چونکہ کسرتی جسم کا مالک تھا اور کچھ کراٹے کے داؤ پیچ بھی سیکھ رکھے تھے، اس واسطے فارغ وقت میں ہاتھ پیر چلانا اور ہا ہو کی آوازیں نکالتے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ دونوں بھائیوں میں مزاج کے اس فرق کے باوجود گاڑھی چھنتی تھی اور ہر جگہ اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ آگ و پانی اور شعلہ و شبنم کا یہ اجتماع ہمیں حیران کرتا تھا لیکن ایک دن ہمیں اس سے بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ ہوا یوں کہ محلے میں ایک آدمی تھا جو مدرسہ اور ''طالبوں'' سے پرخاش رکھتا تھا۔ وہ فتنہ انگیز اور فتنہ پسند طبیعت کا مالک تھا اور قابل اعتراض باتوں کا بہانہ ڈھونڈتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی ان بھائیوں سے تکرار ہوگئی۔ وہ تو چونکہ فتنہ چاہتا تھا اس واسطے ہر لمحہ اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ ہم سے ضبط مشکل ہوگیا۔ ہم چاہتے تھے کہ اس زبان دراز فسادی کو اتنا موقع نہ ملنا چاہیے کہ طالبعلموں پر رعب جماتا پھرے لیکن ہم حیرت زدہ اس بات پر تھے کہ گنڈاپور جس کے کسرتی بازوؤں اور برق رفتار داؤ پیچ کا سارے مدرسے میں شہرہ تھا، بیمار مرغ کی طرح ست اور بیکار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ جو آج کے دن غیرت سے تمتمانا چاہیے تھا، سیاہ پڑ رہا تھا اور اس کا سارا کرّ وفر، ساری تیزی وطراری اور شوخی وشرارت رخصت ہو چکی تھی۔ بلاشبہ یہ اس کی زندگی کا سیاہ دن تھا۔

سوکھی گنڈیریاں، عقابی روح:

جبکہ دوسری طرف بسم اللہ جان کا ردعمل دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ پہلے تو گنڈاپور کی طرف سے مناسب جواب کا انتظار کرتا رہا پھر جب اس نے دیکھا کہ اس کی گنڈیریاں سوکھ چکی ہیں اور اس کے بادل میں آج پانی تو کیا گرج و چمک بھی نہیں تو اس کے اندر اچانک کوئی عقابی روح بیدار ہوگئی۔ اس نے بڑے مضبوط، ٹھہرے ہوئے اور رعب دار لہجے میں اس مفتن کو ایسے تُرت جواب دیے کہ طبیعت صاف کردی، پھر جب اور طالبان بھی بیچ میں پڑے تو خان بہادر صاحب کے مزاج کا ابال جاتا رہا اور وہ جلد ہی اپنے جامے میں...... جس سے وہ باہر ہوئے جا رہے تھے...... واپس آگئے۔ خان بہادر تو بلاوجہ کی فضیحت مول لے کر رخصت ہوئے لیکن گنڈاپور کی شامت آگئی۔ ہمیں محض یہ افسوس نہ تھا کہ اس نے طالبان سے بدسلوکی کرتے ہوئے دل کا میلا غبار نکالنے والے بابو پر خاموشی اختیار کی بلکہ ہمیں اس پر بھی غصہ تھا کہ اس کی وہ تُرت پھرت کیا ہوئی جس کے مظاہرے دکھا دکھا کر وہ آسمان سر پر اٹھائے رکھتا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کی اچھی طرح خبر لی۔ اس کے مقابلے میں بسم اللہ جان ہماری نظروں میں

ہمیشہ کا احترام اور عزت پا گیا کیونکہ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بردباری اور حلیم الطبعی میں بزدلی اور بے غیرتی کا کوئی شائبہ نہیں تھا، وہ تو محض اپنے شرافت اور وضع داری کے سبب لیے دیے رہتا تھا۔

کوئی بسم اللہ جان چاہیے:

آج امریکا ہمارے مدرسے کے محلے دار خان بہادر والا کردار ادا کر رہا ہے۔ مسلمانوں کی بے عزتی اس کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے اور عراق پر ٹوٹ پڑنے کے لیے وہ ایسا بے چین ہے جیسے وہاں تیل کے کنویں نہیں، سونے کا کوئی پہاڑ ہے جو زمین کے شق ہونے سے برآمد ہونے کو ہے۔ مسلمانوں کے پاس تیل کی وہ بے بہا دولت اور سیاسی طاقت ہے کہ عراق پر حملوں کے خوف سے ہی عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں بڑھنا شروع ہوگئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان حکمران اس دولت کے ذریعے اپنے دشمنوں کا ناطقہ بند کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ مسلم حکمرانوں کی اکثریت وہ گنڈا پوری بنی ہوئی ہے جس کی گنڈیریوں سے رس ختم ہو چکا ہے۔ امریکا مسلمانوں سے جو سلوک کر رہا ہے اس کے جواب کے لیے کوئی بسم اللہ جان چاہیے۔ کوئی بلند کردار، اولوالعزم اور صاحبِ بصیرت شخصیت جو گنڈا پوروں کی کاہلی، بزدلی اور کوتاہی کی تلافی کر دے۔ عراق کے بارے میں شُنید ہے کہ اس نے خلیج کی جنگ کے بعد اپنے وسائل کو دفاع اور ملی یکجہتی کے لیے بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے اور کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اب کی مرتبہ امریکا جتنی بے تابی دکھا رہا ہے اسے شاید اتنا زوردار جواب ملے۔ بہرحال یہ ایک موہوم بات ہے۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں نے کرنے کے کام ڈھنگ سے نہیں کیے اور وہ ایجادات کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ انہیں خارجی یلغاروں سے نمٹنے کے ساتھ داخلی تعمیر پر بھی ازحد توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اسباب سے بندھی ہوئی اس دنیا میں خوش گمانیاں تو پالی جا سکتی ہیں، خوش خبریاں سننے کو نہیں مل سکتیں۔

چوہے کا کان:

اس وقت جبکہ امت اغیار کی طرف سے لگنے والے دھچکوں سے سہمی ہوئی ہے، اندرونی طور پر بھی بہت سے مہربانوں کی کرم فرمائیاں جاری ہیں۔ کبھی علمائے کرام سے موسیقی کی حرمت پر کتاب وسنت کے دلائل مانگے جاتے ہیں اور کبھی چہرے کے پردے کو ''بالاجماع'' غیرضروری قرار دیا جاتا ہے۔ ایک دھماچوکڑی مچی ہوئی ہے جس میں مصروف اسکالر حضرات ''دین خالص'' کا خوبصورت چہرہ مسخ کرنے کی جدوجہد میں بڑے ''خلوصِ نیت'' کے ساتھ مشغول ہیں۔ موسیقی کے قسما قسم کے برقی آلات اس قدر ترقی کر چکے ہیں کہ ''گھر گھر گانے والی باندیاں پائی جائیں گی'' والی علامتِ قیامت صاف طور سے پوری ہو رہی ہے۔ وہ گناہ جو گاہے گاہے ہوتا تھا اب دن رات کا کوئی لمحہ خالی نہیں جس میں اس کا طوفان مچا نہ رہتا ہو۔ کمپیوٹر نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ بچہ لوگ سیکھنے سکھانے کے بہانے گھنٹوں پھدکتے چوہے کو دوڑا دوڑا کر جادونگری کی سیر کرتے رہتے ہیں اور اماں ابا خوش ہوتے رہتے ہیں کہ بچوں کا دل کام میں لگا ہوا ہے۔ وہ چیز جو میلوں کی مسافت دور ہوتی تھی اب چوہے کا کان دبانے کی دیر ہے کہ الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو جاتی ہے۔ یورپ وامریکا میں تو موسیقی کے نت نئے آلات اربوں ڈالر میں بکتے ہیں ہی، مسلمان ممالک میں بھی یہ وَبا کچھ کم نہیں۔ موسیقی، فحش گیت اور غیرت کے دشمن بول سن سن کر مسلم نوجوانوں کے دلوں سے ایمان رخصت ہوتا اور نفاق جگہ بناتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور فتنوں کے اس دور میں ایمان کو سلامتی کے ساتھ بچا کر لے جانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

میٹھی چھری

ذو معنی استعمال:

بھورے بھائی ہمارے گہرے دوست ہیں۔ ایسا کچھ یاد پڑتا ہے کہ قارئین سے ان کا ایک مرتبہ تعارف بھی کروایا تھا۔ نہ بھی کروایا ہوتو پاکستان کا کون سا جوہری ہے جو انہیں نہ جانتا ہو۔ آپ کو قیمتی پتھروں کی شناخت میں قدرتی مہارت حاصل ہے۔ بے جان پتھر ان کی چھوٹی چھوٹی نوکیلی انگلیوں میں آتے ہی بول پڑتے ہیں۔ ان کے جوہر شناسی کے عمل کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ پتھر ہاتھ میں لیا، ذرا دیر کو اسے تولا، ایک ترچھی سی نظر ڈالی اور گویا ایک وجدانی صلاحیت کے بل بوتے پر اس کے بارے میں جچی تلی رائے دے دی۔ ان کی پرکھ کو چیلنج کرنے کی ہمت کوئی کم ہی کرتا ہے۔ ہماری ان سے دوستی ان کی اس مہارت کے سبب نہیں، وہ باتیں بھی ایسی نپی تلی کرتے ہیں اور ان کے تبصرے ایسے لگے بندھے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں کہ ایک ایک جملہ سو صفحوں پر بھاری ہوتا ہے۔ الفاظ کو ذو معنی استعمال کرنے میں بھی ان کو ملکہ حاصل ہے۔ مثلاً اقوامِ متحدہ کے نمائندہ خصوصی برائے عراق ڈاکٹر ''ہینس بلکس'' کا نام سن کر فرماتے تھے کہ یہ ڈاکٹر پہلے مسلمانوں کو ''ہنسائے'' گا پھر انہیں ''بلک بلک'' کر رونے پر مجبور کرے گا۔ بھورے بھائی نے ڈاکٹر صاحب کے نام کے دونوں اجزا کا جو مطلب نکالا تھا اس میں پہلے جز کا مصداق تو کئی دنوں سے نظر آ رہا تھا کہ وہ امریکا کی مرضی کا بیان نہ دے رہے تھے، مگر دوسرے جز کا مطلب اب سمجھ آیا ہے جب انہوں نے فرمایا کہ عراق اپنا ممنوع میزائل اور دیگر ممنوعہ ہتھیار آٹھ روز میں تلف کرنا شروع کر دے بصورت دیگر سنگین نتائج کے لیے تیار ہو جائے۔ جبکہ عراق اس میزائل کی رینج ممنوعہ حد سے پورے ایک کلومیٹر کم بتاتا ہے۔

تکلف برطرف:

ڈاکٹر ''ہنس بلک'' صاحب کے بیان سے معلوم ہوا کہ اب تک جو بیانات انہوں نے دیے وہ جذباتی مسلمانوں کو قدرے مطمئن اور اپنی انصاف پسندی کا قائل کرنے کے لیے تھے۔ اب انہوں نے اپنا اصل رنگ دکھانا اور جمانا شروع کیا ہے۔ چنانچہ ان کے ساتھی محمد البرادی حملہ ہونے پر استعفا کی دھمکی دیتے رہ گئے مگر انہوں نے عراق کو آخری الٹی میٹم سنا کے دم لیا ہے۔ ادھر ایک امریکی دفاعی افسر نے بتایا ہے کہ عراق پر حملے کے لیے دو لاکھ فوجی ''اٹین شن'' پوزیشن میں تیار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی قیامت سی قیامت ہے جو شاید برپا ہونے والی ہے۔ امریکا نے گزشتہ چند برسوں سے عراق کی جو اقتصادی ناکہ بندی کر رکھی تھی اس سے بہت سے عراقی بچے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ناکافی غذا، دواؤں کی ناپیدگی اور بموں کی برسات نے عراق کے ننھے ننھے معصوم بچوں کی جان لے لی تھی اور سینکڑوں کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھیں۔ گویا کہ امریکی جارحیت گزشتہ کئی سالوں سے جاری تھی۔ موجودہ تکلف اسے ذرا بڑے پیمانے پر شروع کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔

میدان سج چکا ہے:

امریکا نے فرعونیت کے مختلف روپ زندہ کیے تھے جس پر وہ فطرت کی تعزیروں کا پورا پورا مستحق بن چکا ہے مگر اس کی

پابندیوں کی وجہ سے جن عراقی بچوں نے اپنی ماؤں کی نظروں کے سامنے سسک سسک کر جان دی ہے اس کا وبال ان شاء اللہ اس پر ضرور آ کر رہے گا۔ اب تک تو عیسائی مشنریاں اس فرعونی طریق کار پر عمل کر رہی تھیں کہ مسلمانوں کے بچوں کو ذبح کردو اور عورتوں کو اپنے ڈھب پر لے آؤ، چنانچہ وہ مشنری اسکولوں میں مسلم نونہالوں کے ذہن، عقل، فطرت اور نظریئے کو ذبح کرتی تھیں اور رسالوں، ڈائجسٹوں اور میگزین کے ذریعے مسلم خواتین کو اپنے رنگ میں رنگتی تھیں۔ گویا فرعون لوہے کی تیز چھری سے ذبح کرتا تھا، یہ پروپیگنڈے کی میٹھی چھری کام میں لاتے تھے مگر اب امریکا بے صبر ہو چکا ہے۔ وہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کا پیٹ چیر کر سارے انڈے ایک ہی دن میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اپنے ہاں بھگدڑ ریں، اموات، آگ اور دھواں ہے مگر وہ عراق کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ چکا ہے اور قدرت کی تعزیروں کی سختی سے لاپروا ہے۔ دیکھیں امریکا کا لالچ، ظلم، تعصب اور زیادتی کتنے دنوں میں رنگ لاتی اور اسے کیا دن دکھاتی ہے۔ میدان سج چکا ہے، تماشائیوں کے ٹھٹھ لگ چکے ہیں بس تماشا شروع ہونے اور پھر بساط لپیٹ دیے جانے کی دیر ہے۔

ایک ماہر ''تیلیات'' کی کہانی

تیل شناس چوہا:

اس کو اس کے دوست تیل شناس چوہا کہتے تھے۔ جس طرح ہُد ہُد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زیر زمین پانی معلوم کرنے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کے اندر بھی کوئی ایسی رگ تھی جو تیل والی زمین کے قریب پہنچتے ہی پھڑ کنے لگتی تھی۔ اس نے 1920ء کی دہائی کے بعد ارضی تحقیقاتی ٹیکنالوجی کو بامِ عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کو کم عمر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر اتنی دسترس اور اپنی مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ ممتاز ماہرین ارضیات کی زبانیں اس کے سامنے بولتے وقت لڑکھڑا جاتی تھیں۔ وہ جب کوئی بات ثابت کرنا چاہتا تو اس وقت اپنی اہلیت اور ممتاز استعداد کا بھرپور مظاہرہ کرتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس نے ایک بڑا کارنامہ اس وقت انجام دیا جب وہ امریکی ریاست ٹیکساس میں زیر زمین تیل کی دھاروں کا تعاقب کرتے کرتے پڑوسی ملک میکسیکو جا پہنچا اور وہاں تیل کا ایک بہت بڑا کنواں دریافت کر لیا۔ اس دریافت کو تیل کی پیداوار کے سُنہری دور کا آغاز کہا جاتا ہے اور اس کامیابی کے بعد اس ''تیلی چوہے'' کو اس شغل سے اس حد تک شغف ہو گیا کہ ہمہ وقت تیل اور تیل کی دھار کھوجتا رہتا تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جبکہ وہ ابھی جوان تھا، اس کی شہرت اس ''ماہر تیلیات'' کے طور پر ہو گئی تھی جو اپنے ساتھ ہر وقت ڈائنامائٹ لیے پھرتا ہو، حتّٰی کہ وہ واقعہ پیش آ گیا جس نے آج کل اتحادی افواج کو بھوکے بھیڑیے کی طرح عراقی مسلمانوں پر جھوٹ موٹ کے بہانے گھڑ کر حملہ آور ہونے پر اُبھار رکھا ہے۔ ہوا یوں کہ 1927ء میں عراق کے شمال میں کرکوک کے مقام پر تیل کے ذخائر دریافت ہو گئے۔ ان کی دریافت عالم اسلام کے لیے ایک نہایت خوش کن خبر ہو سکتی تھی، مگر ہم مسلمان اپنی نااہلی کے سبب آج تک اس ''خوشی'' کو بھگت رہے ہیں۔ یہ خبر امریکا اور اس کے اتحادیوں کے لیے بے حد چونکا دینے والی تھی اس لیے کہ جنگ عظیم اول میں فتح و شکست کا فیصلہ تیل کی سپلائی نے کیا تھا۔ اس وقت کے امریکی صدر نے تیل کے اس کھوجی کو بلایا اور ہدایت کی کہ وہ عربستان جائے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اور تجربہ بروئے کار لا کر اس سوال کا واضح جواب لائے ''سرزمین عرب میں تیل کے ذخائر کے امکانات کتنے ہیں اور وہ دنیا کے مستقبل کے لیے کتنے اہم ہو سکتے ہیں؟'' تیلیات کا ماہر یہ تیلی کھوجی سفر کے تمام تر لوازمات اور بھاری انعامات کے وعدوں کے ساتھ اپنے مشن پر مشرق وسطی روانہ ہو گیا۔ جس امریکی صدر نے اسے اس مشن پر بھیجا تھا اس کا نام آپ کو بعد میں بتائیں گے، البتہ یہ ماہر ارضیات و ''تیلیات'' تاریخ میں ایوریٹ لی ڈیگولیلر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

زیر زمین سمندر:

یہ شخص تلاش اور تحقیق کی مہم کے دوران عراق کے بعد سعودی عرب، کویت اور ایران بھی گیا کیونکہ اس کی ''چھٹی حس'' اسے عراق سے آگے کی طرف کھینچے لے جاتی تھی۔ خلیج عرب کے کنارے پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ تیل کے زیر زمین سمندر

کے اوپر کھڑا ہے۔ اس نے جلد اپنا کام سمیٹا اور سیدھا واشنگٹن جا پہنچا۔ اسے بغیر تاخیر کے خصوصی طور پر صدر سے ملوایا گیا جہاں اس نے اپنی گذشتہ مہینوں کی جاں گسل محنت کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا: ''خلیجی ممالک دنیا میں عنقریب تیل کی پیداوار کا مرکز ومحور بننے والے ہیں اور کرۂ ارض کا مستقبل آیندہ اس کے ہاتھ میں ہوگا جو اس علاقے میں مضبوطی اور استحکام کے ساتھ اپنی جگہ بنالے گا۔'' اس چند لفظی رپورٹ نے امریکی صدر کے ذہن میں موجود بنیادی سوال کا جواب دے دیا تھا اور اگر اسے مشرق وسطی کے متعلق اپنے آیندہ کے منصوبوں میں کوئی الجھن یا ابہام تھا بھی تو وہ ختم ہوگیا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس دولت پر جو اس کے خیال میں (نعوذباللہ، ثم نعوذباللہ) غلطی سے مسلمانوں کی مقدس سرزمین میں پھوٹ پڑی تھی، ہرصورت میں تسلط حاصل کرنا ہے۔ اس کے سامنے مشکل یہ تھی کہ سعودی عرب کے جن علاقوں میں اس ماہر ارضیات نے نہ ختم ہونے والے بے پناہ قیمتی ذخائر کی نشاندہی کی تھی، وہاں اسلامی شعائر کی سختی سے پابندی کرنے والے دیہاتی عرب (بدّو) رہتے تھے اور وہ اس سرزمین پر کسی کافر کا وجود برداشت کرنے پر کبھی بھی تیار نہ ہوتے، لیکن وہ صہیونی دماغ ہی کیا جو مکر سے آشنا نہ ہو، چنانچہ اس مشکل کا حل تلاش کرلیا گیا۔ امریکی ماہرین نے ڈاڑھیاں بڑھائیں، جبّے پہنے اور مسلمانوں کے حلیے میں اس علاقے میں جا پہنچے جہاں صدیوں سے کسی غیرمسلم نے قدم نہ رکھا تھا۔ اس وقت سعودی عرب کے حکمران شاہ عبدالعزیز تھے جو موجودہ سعودی عرب کے بانی ہیں اور خلافتِ عثمانیہ کی سرپرستی سے عرب کو جدا کرکے وہاں آل سعود کی حکومت کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ انہوں نے امریکی اہلکاروں کے تحفظ کے لیے اپنا خصوصی حفاظتی دستہ فراہم کیا اور اس طرح سرزمین عرب میں دشمنانِ دین وملت امریکیوں کی نگرانی میں ''انقلاب بذریعہ تیل'' کے تصور میں رنگ بھرنے کا آغاز ہوگیا۔ جنوری 1997ء میں اسلام آباد میں فواد پبلی کیشنز نامی ادارے نے شاہ عبدالعزیز کی زندگی پر ''عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ سعود'' کے نام سے کتاب چھاپی ہے۔ اس میں صفحہ 407 پر صحرا میں نصب ایک خیمے کا اندرونی منظر ہے جس میں شاہ عبدالعزیز کے ساتھ عربی لباس اور حلیے میں موجود امریکی دکھائے گئے ہیں جو ''عربوں کی معاشی زندگی میں انقلاب'' کا پرکشش نعرہ لے کر سرزمین اسلام میں آئے تھے اور آج عراق کے عوام کو ''آزادی'' دلوا کر اس انقلاب کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں۔

آخری کوشش:

سب سے پہلے جس جگہ تیل تلاش کرنے کا کام شروع کیا گیا، وہاں سے کچھ نہ ملا۔ اس کام کے لیے نہ صرف یہ کہ تمام آلات امریکا سے منگوائے گئے بلکہ کھانے اور پانی کے علاوہ صابن، چاکلیٹ اور تمام متعلقہ سامان بھی امریکا سے منگوایا گیا۔ ''ماہر تیلیات'' نے پہلے جن تین جگہوں کی نشاندہی کی وہاں سے تیل نہ نکلا۔ دوسری طرف امریکی بے آب وگیاہ صحرا میں جس طرزِ زندگی سے دوچار تھے وہ ان کے لیے بہت زیادہ مشکل تھی، لیکن لالچ ان سے وہ سب کچھ کروا رہی تھی جو عام حالات میں وہ کبھی نہ کرتے لہٰذا انہوں نے حوصلہ اور صبر سے کام لیا۔ پہلے کنویں میں ناکامی کے بعد دوسرا کنواں کھودا گیا لیکن اس میں بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تیسرے کنویں کی کھدائی میں امریکیوں کو یقین تھا کہ کچھ ملے گا۔ اس وقت تک اس پر ہزاروں ڈالر خرچ ہوچکے تھے۔ عملے کے ارکان نے تکلیف بھی بہت اٹھائی تھی۔ مزدوروں کے رہنے کے لیے شروع میں خیمے ہوتے تھے۔ گرمی بھی ایسی ہوتی تھی کہ جس سے چہرے جُھلس جاتے تھے۔ بعد میں ریاض کے کچے گھروں کی طرح چھوٹے چھوٹے گھر بنائے گئے۔ یہ گھر بطور

آثارِ قدیمہ آج بھی موجود ہیں۔ تیسرے کنویں کے کھودنے کے بعد اتنا پتا چلا کہ تیل تو ہے لیکن اتنا نہیں ہے جس کے لیے اتنی تکلیف برداشت کی جائے۔ تیل نکالنے والی کمپنی کے اعلیٰ حکام کو تیل کے کھوجی کی رپورٹ پر شک ہونے لگا، لیکن اس شخص کو اپنے تجربے اور صلاحیت پر پورا اعتماد تھا۔ وہ کمپنی کے حکام کو یقین دلاتا اور ہمت بندھاتا رہا۔ چونکہ تیل کی تلاش میں کام کرنے والوں کے زیادہ عرصہ رہنے کی وجہ سے امریکی یہاں کی آب وہوا سے خاصے مانوس ہوچکے تھے اس لیے وہ مان گئے اور انہوں نے کام جاری رکھا۔

چوتھا کنواں جس جگہ کھودا گیا وہ پہلی جگہوں سے مختلف تھا لیکن تیل جس کے لیے اتنی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہاں بھی نہ نکلا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا کمپنی فلاپ ہونے کا اعلان کرے؟ جو کچھ خرچ کرنا تھا وہ تو ہوچکا تھا۔ چنانچہ امریکا میں موجود کمپنی کے کرتا دھرتا حکام کی میٹنگ ہوئی۔ 1937ء تک جو خسارہ ہوچکا تھا وہ 30 لاکھ ڈالر کا تھا۔ امریکی سرمایہ کار اور عملہ انتہائی متفکر اور پریشان تھا لیکن اگر کوئی شخص مطمئن تھا تو ڈی گوٹیلر تھا۔ اس نے امریکی حکام کو ایک بار پھر امید دلائی کہ وہ اس پوشیدہ خزانے کو یونہی چھوڑ کر نہ جائیں۔ امریکیوں نے چاروناچار اس کی بات مان لی اور کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ نئے ماہرین کو بھیجا گیا اور کمپنی میں کام کرنے والوں کو نئے کانٹریکٹ اور مراعات دیں تاکہ وہ کام جاری رکھ سکیں۔ ان حالات میں پانچواں کنواں کھودنے کا کام شروع ہوا۔ ماہرین کے پاس جو تجربہ اور کمال تھا وہ سب اس میں جھونک دیا لیکن اس کا بھی وہی نتیجہ نکلا۔ امریکی اب ناامید ہوچکے تھے لیکن ڈی گوٹیلر نے ان کو آمادہ کرلیا کہ وہ ایک آخری کوشش اور کرکے دیکھ لیں۔ اس کے اصرار پر فیصلہ کیا گیا کہ ایک کوشش اور کی جائے تاکہ اگر تیل نہ ملے تو حسرت بھی باقی نہ رہے۔ اس مرتبہ ایک وقت میں دو کنویں کھودنے کا فیصلہ کیا گیا، یہ چھٹے اور ساتویں کنویں تھے۔

کنواں نمبر سات:

کھدائی شروع کی گئی، ماہرین کے علاوہ کمپنی کے اعلیٰ حکام بھی لمحہ لمحہ کی معلومات حاصل کررہے تھے۔ چھٹے کنویں سے بھی کچھ نہیں ملا جس سے امریکیوں کی نااُمیدی میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ذہران اور کیلیفورنیا کے درمیان یہ گمان ہونے لگا کہ کسی وقت بھی حکم آسکتا ہے کہ تیل کی تلاش بند کرکے واپس آجاؤ، پھر یہ اطلاع ملی کہ کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل خود آرہے ہیں، لیکن ساتویں کنویں کو ابھی پوری طرح کھودا بھی نہیں گیا تھا کہ ایک کرشمہ ہوا جس سے امریکیوں کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ زمین سے خزانہ اُبل پڑا اور اتنا تیل نکلا جس پر خود امریکی حیران وپریشان تھے۔ یہ مارچ 1938ء کی بات ہے۔ اب تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوچکا تھا۔ یہ واقعہ امریکیوں کے لیے نہ صرف حیران کن تھا بلکہ وہ رشک اور حسد کے ملے جلے جذبات میں بھی گرفتار تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ قدرت نے جو بیش بہا دولت (معاذ اللہ) بغیر استحقاق کے مسلمانوں کو دی ہے وہ اسے کبھی مسلمانوں کی دسترس میں نہ رہنے دیں گے۔ یہ کنواں آج بھی سات نمبر سے پکارا جاتا ہے۔ 1933ء سے 1938ء کے آخر تک ان پانچ سالوں میں 575 ہزار بیرل تیل نکالا لیکن صرف 1939ء میں 39 لاکھ 34 ہزار بیرل نکالا گیا، یعنی گزشتہ پانچ سال سے سات گنا زیادہ۔ یہ مقدار 1940ء میں 50 لاکھ 75 ہزار بیرل اور 1945ء میں 2 کروڑ 13 لاکھ 11 ہزار بیرل تک جاپہنچی۔ یہ دنیا میں جہاں جہاں تیل نکلا ہے اس سے زیادہ ہے۔ 1946ء میں 990 لاکھ 66 ہزار بیرل ہوا یعنی سالانہ 60 ملین بیرل، 1947ء میں

8 کروڑ 98 لاکھ 25 ہزار بیرل یعنی 90 ملین بیرل ہوگیا اور امریکی کمپنیاں دیکھتے ہی دیکھتے اتنی مالدار ہوگئیں کہ ایک ایک کمپنی کا بجٹ دنیا کے کئی ملکوں کے قومی بجٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔

رسیلے خربوزے کی قاشیں:

تیل کی دریافت ہوجانے پر امریکی کمپنیوں کی مشکلات ختم ہوگئی تھیں کہ انہیں آبِ حیات کے چشموں کا پتہ مل گیا تھا مگر اسی دن سے مسلمانوں کی مشکلات کا آغاز ہوگیا۔ اسی سال جنگ عظیم دوم شروع ہوگئی اور یہ خطرہ پیدا ہوا کہ علاقے میں جرمن افواج پیش قدمی کر کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ نہ کرلیں، چنانچہ تیل کے ان کنوؤں کو عارضی طور پر بند کردیا گیا۔ اتحادیوں کا خطرہ درست تھا، جرمنی کی فوجیں اس "تیل خیز" علاقے کی طرف بھی پیش قدمی کرنا چاہتی تھیں اور امریکا سے یورپ کو تیل فراہم کرنے والی پائپ لائن کو بھی اڑانا چاہتی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس میں کامیاب ہوجائیں لیکن مشہور جرمن جرنیل رومیل کو 1942ء کے آخر میں عرب سرزمین میں "العالمین" کے مقام پر برطانوی جنرل منٹگمری کے ہاتھوں شکست ہوگئی اور جرنیل رومیل یہ کہتے ہوئے پسپا ہوا: "افسوس ہماری فوجوں کے پاس حسب ضرورت تیل نہیں اور یہ کمی ہمیں رُلا دینے کے لیے کافی ہے۔" جرمنی کی افواج وسط ایشیا میں بحیرۂ کیسپین کے کنارے "باکو" کے مقام تک بھی پہنچ گئی تھیں جہاں سے سوویت یونین کو تیل فراہم کیا جاتا تھا، مگر وہاں بھی ان کو غیر متوقع شکست ہوگئی۔ یوں امریکا اور اس کے اتحادیوں کے سامنے کھلے ہوئے میدان میں کوئی مدمقابل نہ رہا۔ امریکا نے موقع غنیمت جانا اور خلیج عرب و بحیرۂ کیسپین کے ذخائر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے طویل منصوبہ بندی شروع کی۔ بحیرۂ کیسپین کے کنارے واقع ترکمانستان، آذربائیجان اور چیچنیا سوویت حدود میں واقع تھے۔ وہاں امریکا کی دال نہ گل سکتی تھی (اب افغانستان میں امریکی مداخلت کے بعد اس کی راہ بھی ہموار ہوگئی ہے) لہٰذا اس نے پہلے عربستان کی طرف توجہ دی۔ برطانیہ جنگِ عظیم دوم میں امریکا کا اتحادی تھا۔ اس کو لوٹ کے مال میں حصہ دینا ضروری تھا لہٰذا طے پایا کہ کچھ "آئل فیلڈ" امریکیوں کے پاس ہوں اور کچھ برطانوی اپنے پاس رکھیں۔ اس زمانے میں امریکا کا صدر فرینکلن روزویلٹ (جی ہاں! وہی روزویلٹ جس نے ایوریٹ لی ڈوئیگر کو مشرق وسطیٰ میں تیل کے ذخائر کی بو سونگھنے بھیجا تھا اور آج جس کے نام سے موسوم طیارہ بردار بحری جہاز سے طیارے اُڑ کر عراق پر آگ اور بارود برسا رہے ہیں) اور برطانیہ کا وزیراعظم ونسٹن چرچل تھا۔ ان دونوں نے جزیرۃ العرب کا نقشہ سامنے رکھ کر تیل کے علاقے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے عیش پسند حکمرانوں میں رسیلے خربوزے کی قاشوں کی طرح بانٹ دیے اور ان پر "احسان" یہ کیا کہ ان کو تیل کے اخراج، صفائی اور ترسیل کے خرچ سے بچانے کے لیے وہاں اپنی کمپنیوں کے ملازمین کے لیے آزاد اور خودمختار کالونیاں تعمیر کیں اور ان کو تحفظ دینے کے لیے سیکورٹی کے نام پر فوجی چھاؤنیوں کے لیے جگہ بھی حاصل کرلی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، مسلمانوں کی وہ دولت جو عالمِ اسلام کی سائنسی، اقتصادی اور عسکری ترقی کا ذریعہ بن کر مسلمانوں کی کایا پلٹ سکتی تھی، وہ دشمنوں کا گھر روشن کر رہی ہے اور مسلمانوں کو تیل کی تلچھٹ کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

موت پر بیعت:

قارئین کرام! ممکن ہے آپ اس داستان سے اُکتا گئے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ آپ میں سے کچھ اسے فرضی کہانی سمجھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جگر خراش کہانی تاریخی حقیقت ہے، ایسی حقیقت جس میں مسلمانوں کی نااہلی، دنیا پرستی اور غیروں کی

چالاکی اور مفاد پرستی بدنما دھبوں کی طرح جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ اس دلدوز کہانی کا بقیہ حصہ اور دستاویزی ثبوت آپ آیندہ کسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ فی الحال ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اتحادی طاقتیں صدر صدام کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہیں؟ دولت کی ریل پیل ہو جانے کے بعد عرب حکمرانوں نے کھیل، تفریح تعیّشات کی درآمد کے علاوہ کسی مصرف پر ''بیکار'' پیسہ خرچ نہیں کیا۔ انہوں نے بڑے بڑے اسٹیڈیم، بے آب و گیاہ صحرا میں میلوں پر پھیلے ہوئے گالف کے میدان، گھوڑے اور اونٹوں کی دوڑ کے لیے وسیع و عریض ریس کورس، انواع و اقسام کے غیر ملکی سامان تعیش کی جدید ترین مارکیٹوں، شاپنگ پلازہ، بلند و بالا ہوٹلوں، سوئمنگ پولوں اور تفریح گاہوں کے علاوہ کسی چیز پر دولت ''ضائع'' نہیں کی، ان میں سے کسی کے پاس اسرائیل کے ایک ٹینک کے جواب کا معیاری ٹینک تک نہیں، ان کے فوجی قالین پر کراسنگ کرکے ''معیاری'' عسکری تربیت حاصل کرتے ہیں، یہ بندوق یا توپ کیا بناتے؟ ان کے پاس ایک سوئی تک تیار کرنے کی فیکٹری نہیں، یہ چھوٹی سی چھوٹی چیز امریکا و یورپ سے منگوا کر دشمنانِ اسلام کے خزانے بھرتے ہیں مگر صدام نے نہ صرف یہ کہ اپنے عوام کو کفایت شعاری اور جفاکشی کا سبق دیا بلکہ اس نے جزیرۃ العرب کا مضبوط ترین عسکری ادارہ اور دفاعی نظام مرتب کیا۔ اس نے سفید کفن پوش فدائی دستے تیار کیے جو پاسنگ آؤٹ پریڈ کے دن موت پر بیعت کرتے ہیں۔ اس نے فضولیات تعیّشات اور لہو و لعاب پر پیسہ خرچ کرنے کے بجائے ملکوں ملکوں پھر کر کام کا اسلحہ جمع کیا، عوام میں جہاد کا جذبہ پھونکا اور انہیں جینے کی خاطر مرنے کا فن سکھایا۔ امریکا و برطانیہ کو یہ برداشت نہیں کہ کوئی عرب حکمران ایسا ہو جس کی دیکھا دیکھی دوسرے حکمرانوں کی عادتیں خراب ہو جائیں اور وہ اِن کے چُنگل سے آزادی کا خیال دل میں پکا سکیں، لہٰذا وہ عراق کے عوام کو صدر صدام سے آزادی دلانے اور حقوق فراہم کرنے کے لیے آ ٹپکے ہیں اور اب سرزمین عراق پر عرب مسلمانوں کی آزادی یا غلامی اور عظیم تر صہیونی ریاست کی تشکیل یا تخریب کی جنگ لڑی جارہی ہے۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ اکیلا صدر صدام کتنے عرصے تک سیاہ دل اور سیاہ فطرت اتحادیوں کو نتھ ڈالتا ہے، مگر اتنی بات طے ہے کہ جن عرب ریاستوں نے آج تک اپنے ہاں جبری نظام مسلط کرکے نماز میں جہاد کی آیات پڑھنے اور مجلسوں میں اُسامہ کا نام لینے پر پابندی لگائی ہوئی ہے وہ جلد ہی اپنا انجام دیکھ لیں گی۔ اب آیندہ دنیا کا نقشہ کچھ بھی ہو لیکن مسلمانوں میں سے اسی کو بقا نصیب ہوگی جو جہاد کو اپنا شعار بنائے گا اور جس نے اب بھی جہاد اور مجاہدین کو اپنا سہارا نہ سمجھا وہ تاریخ کے بے رحم صفحوں میں ایسا گُم ہوگا کہ اس کے پیچھے ذِلت اور رسوائی کے غبار کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔

ایک آنکھ والا وزیر

پڑھتا نہیں یا سمجھتا نہیں:

موشے دایان اسرائیل کا کُھرانٹ قسم کا وزیر دفاع گزرا ہے۔ یہ ایک آنکھ سے کانا تھا۔ عام طور پر ایسے افراد یا تو بہت ہی مرنجانِ مرنج قسم کے گو گلے اور شریف ہوتے ہیں یا پھر بہت ہی نابکار، خبیث النفس اور شقی القلب۔ مکار طوطے جیسی مکروہ شکل والا یہ کھوسٹ بڈھا یک چشموں کی دوسری قسم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی کارروائیوں کا مخصوص انداز تھا۔ یہ جب فلسطینی شہریوں کے خلاف کسی قسم کے آپریشن کی منظوری دیتا تو موساد کے ماہرینِ نفسیات میں سے کچھ لوگ ساتھ کر دیتا جو اسرائیلی فوج کی جارحانہ کارروائیوں کا شکار ہونے والے فلسطینی مردوں، بچوں اور عورتوں کے ردعمل کی کارکردگی کا اندازہ لگاتے تھے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی درست آنکھ اتنی دور تک نہیں دیکھتی جتنی اس کی بند آنکھ تاڑ لیتی ہے۔ یہ خود ایک ماہرِ نفسیات تھا اور اس بات کو بھانپنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ ہر طرف سے صہیونیت کے حصار میں گھرے ہوئے فلسطینی مسلمان آخر ہتھیار کیوں نہیں ڈال دیتے؟ یہودیت کی چوطرفہ یلغار کا سامنا بڑے بڑے جغادری حکمران اور ان کی بھاری بھرکم مضبوط حکومتیں نہیں کر سکتیں پھر آخر کیا وجہ ہے کہ فلسطینی، اسرائیلی حملے کے بعد پہلے سے زیادہ پرجوش اور ہر ناانصافی کے بعد پہلے سے زیادہ پرعزم ہو جاتے ہیں؟ یہ شخص دست و بازو سے زیادہ دل اور دل سے زیادہ دماغ سے کام لینے کا عادی تھا۔ دیگر عرب ریاستوں کے حکمرانوں، عوام اور مختلف طبقوں کے ذہنی و سیاسی رجحانات سے اسے بھرپور واقفیت تھی اور اسرائیل کا وزیر دفاع ہونے کی حیثیت سے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہمہ وقت اپنی بند آنکھ سے بھی کام لیتا رہے۔ عربوں کی نفسیات، میلانات اور درونِ خانہ حالات سے گہری واقفیت کے سبب یہ اسرائیل کے دفاع کے بارے میں انتہائی پُراعتماد رہتا تھا۔ اس حوالے سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اس نے 1967ء کے عرب اسرائیل معرکے میں جنگ کا نقشہ ایک اخبار کو جنگ سے پہلے عام اشاعت کے لیے دے دیا تھا۔ ایک یہودی صحافی نے اس سے بصد ادب واحترام پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ اس سے جنگی راز فاش ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''عرب پڑھتا نہیں ہے، اگر پڑھتا ہے تو سمجھتا نہیں ہے۔''

تھوکنے کی جرأت:

موشے دایان کی یہ خود اعتمادی مالدار خلیجی ریاستوں کی حد تک تو درست تھی، مگر فلسطین میں اسے قدم قدم پر ہتک آمیز رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً: ایک مرتبہ فلسطین کے مشہور شہر نابلس کی ایک مسلم آبادی کو کھنڈر بنا دینے کے بعد یہ بازار میں گھوم رہا تھا۔ اس کے خیال میں وہ فلسطینی مسلمانوں کے حوصلے کو توڑنے، انہیں بے بسی کے احساس سے دوچار کرنے اور اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چلا تھا۔ بازار میں سناٹا تھا اور ہر طرف دہشت کا عالم طاری تھا۔ اتنے میں اسے ایک دکان کھلی نظر آئی۔ اس نے دکان دار کو بلایا اور اس کا ذہن جاننے کی غرض سے پوچھا: ''مسلمان تمہاری مدد کو نہیں آئے،

کیا تم اب بھی ان سے کوئی توقع رکھتے ہو؟''

دکان دار نے جواب دیا: ''نہیں! مجھے کسی عرب مسلمان سے کوئی توقع نہیں کیونکہ ان کے ہاتھ پیر تو مفلوج تھے ہی اب ان کے منہ بھی سوکھ گئے ہیں۔''

''منہ سوکھنے سے تمہارا مطلب؟'' موشے دایان نے کانی آنکھ سکیڑ کر پوچھا۔

''اگر ہر مسلمان تم پر صرف تھوک دے تو تمہاری ''ریاست موعود'' اس میں غرق ہو جائے گی لیکن افسوس کہ ان میں تم پر ''تھوکنے کی جرأت'' بھی نہیں رہی۔''

فلسطینی دکاندار کا یہ جواب فلسطینی مسلمانوں کی جرأت و ہمت اور عالم اسلام کی بے حسی پر ان کے دلی احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

تین آلہ کار فرقے:

یہاں پر ہم مسلمانوں کے لیے......... ہاں! ہر اس شخص کے لیے جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا کلمہ پڑھتا ہے، محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور یومِ حساب کے دن ہر چھوٹے بڑے کو ایک میدان میں جمع کر کے زندگی بھر کی کارگزاری کا حساب لیے جانے پر یقین رکھتا ہے......... سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر ہم دشمن پر تھوکنے کی جرأت سے بھی کیوں محروم ہو گئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے بارے میں ہر دانشور، مبصر، تجزیہ نگار اور آنکھیں سکیڑ کر پیشانی پر بل ڈال کر فلسفیانہ انداز میں گفتگو کرنے والے پروفیسر، اسکالر اور ڈاکٹر حضرات کے پاس کچھ نہ کچھ جواب مل جاتا ہے اور سچ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں مفلوج ہونے سے لے کر منہ سوکھنے تک کے حسرتناک عمل میں بہت سے عناصر کارفرما تھے، لیکن ایک چیز جس نے سب سے زیادہ ہمارے اپاہج پن میں حصہ لیا وہ مسلم معاشروں میں ان فرقوں کا ظہور تھا جو یہود کے عیار ذہن کی پیداوار تھے یا وہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے یہودیوں کے آلہ کار بن گئے تھے۔ ان میں تین فرقے بہت مشہور ہیں اور بلاشبہ ان ''غیر یہودی صہیونیوں'' نے یہودیت کے لیے وہ خدمات انجام دی ہیں جو بعض کٹر یہودی تنظیمیں بھی نہ کر سکتی تھیں۔ آپ کو یقیناً تجسس ہوگا کہ ان کا نام جلد از جلد جان سکیں لیکن نام سے پہلے ان کا کام پہچاننا ضروری ہے اور ان کا کام آپ اس وقت تک نہ جان سکیں گے جب تک ''غیر یہودی صہیونی'' کی اصطلاح کا مطلب نہ جان لیں گے۔

دورِ مسیحائی میں داخلہ:

یہودی اور صہیونی میں ''عموم خصوص من وجہ'' کی نسبت ہے۔ عام قارئین ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھے تو پریشان نہ ہوں۔ یہ دراصل ہماری طالبان برادری کے لیے لکھی گئی ہیں۔ آسان الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہودی تو وہ شخص ہے جو سیدنا حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کی شریعت پر ایمان کا دعویدار ہے (اگرچہ خود اس کو خبر نہیں کہ موسوی شریعت کا اصل حلیہ کیا تھا؟) اور صہیونی اسے کہتے ہیں جو ارضِ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام اور یہودی مفادات کے تحفظ کے لیے کام کرے اگرچہ وہ لامذہب یہودی ہو یا کسی دوسرے مذہب کا پیروکار۔ اب بعض یہودی ایسے ہوتے ہیں جو یہودی ریاست کے قیام اور اس کی خاطر فلسطینی مسلمانوں پر ظلم اور دنیا بھر میں اکھاڑ پچھاڑ کے حامی نہیں، ان کے خیال میں قیامت سے پہلے ارضِ مقدس میں یہودی

ریاست قائم ہو کر رہے گی لیکن یہ کارنامہ مسیح دجال انجام دے گا۔ اس کے ظہور سے پہلے جو کوئی ریاست موعودہ کی خاطر کوشش کرتا ہے یا کسی کا خون بہاتا ہے تو وہ کتابِ مقدس تورات کی رُو سے غلط کار اور گنہگار ہے۔ حسیدی نامی اس قدامت پرست فرقے کے افراد یہودی ہیں لیکن صہیونی نہیں۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ جو شدت پسند ہے اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کی باگیں ہیں، تاویل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوار براق (دیوارِ گریہ) پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم ''دورِ مسیحائی'' (Messianicera) میں داخل ہو چکے ہیں لہٰذا ''میراث کے ملک'' پر قبضہ ہمارا حق بن چکا ہے۔ ان لوگوں کی یہ تاویل بنی اسرائیل کی اس بدنام زمانہ تحریفی اور تاویلی ذہنیت کا شاہکار ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں جابجا آتا ہے۔

غیر یہودی صہیونی:

تیسری طرف کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو یہودی نہیں ہوتے لیکن پکے صہیونی ہوتے ہیں۔ وہ مذہب کے اعتبار سے یہودی نہ ہونے کے باوجود فلسطینی مسلمانوں کے مخالف، یہودی قابضین کے پرجوش حامی اور مددگار ہوتے ہیں۔ ان کو ''غیر یہودی صہیونی'' کہا جاتا ہے۔ امریکا میں بڑی تعداد ایسے ''غیر صہیونی مسیحیوں'' کی ہے جو کٹر عیسائی ہیں لیکن یہودیوں کے زبردست حامی ہیں اور اسرائیل کی حمایت میں مظاہرے اور اجلاس کرتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی چند فرقے ایسے ہیں جو ''غیر صہیونی مسلم'' ہیں اور کوئی ان کو پہچاننا چاہے تو ان کی قدر مشترک ''جہاد کی مخالفت'' ہے۔ یہ لوگ جذبۂ جہاد کی توہین سے لے کر فدائی حملوں کے نقصانات گنوانے تک ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے مسلمانوں کے ذہن و عمل سے جہاد کی عظمت و فضیلت اور اہمیت و محبت نکل جائے اور موت سے ڈرنے والے یہودیوں کی جان میں جان آسکے۔ مسلمانوں میں روشن خیالی پھیلانے اور انہیں اعتدال پسندی کا درس دینے کا یہ ''مشن'' یہ فرقے ہی نہیں، بہت سے ادارے، انسٹی ٹیوٹ، اسلامک سینٹر اور ان سے وابستہ رضا کار بھی انجام دے رہے ہیں اور بیرونِ ملک موجود ''معاونین'' سے خوب فنڈ حاصل کر رہے ہیں۔ آپ جب کوئی تقریر، تحریر یا سمعی بصری مواد ایسا پائے جس میں جہاد اور مجاہدین کے بارے میں گہرے تشویش آمیز تفکر کا اظہار کر کے ان کو ہمدردانہ اور خیر خواہانہ مشورے دیے گئے ہوں، یا ان کی کارروائیوں سے پہنچنے والے نقصانات گنوا کر انہیں امن کا واسطہ دیا گیا ہو تو جان لیں کہ اس شخص، ادارے یا فرقے کا سلسلۂ خبث بالواسطہ یا بلاواسطہ تل ابیب میں قائم ''غیر یہودی صہیونیوں'' کے ہیڈ کوارٹر سے جا کر جڑتا ہے۔ آپ اس بات کو شاید سنجیدگی سے نہ لیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے ہمارے بھیس میں ہمارے درمیان موجود ہیں اور چابکدستی سے مسجد نبوی کو مسجدِ اقصیٰ اور بیت المقدس کو مسجدِ ضرار قرار دے کر اس کی اہمیت مسلمانوں کے دل سے گھٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ اپنے گرد و پیش میں موجود ایسے انٹرنیشنل سینٹروں اور دانش گاہوں کو پہچانیے تب ان تین فرقوں کے نام بھی آیندہ کسی مجلس میں آپ کے گوش گزار کر دیے جائیں گے۔

درمیان کی کڑی

ایک ہم مجلس کی یاد:

عمر گل خان شرودی ہمارا ہر دلعزیز ہم سبق تھا۔ وہ اپنی خوش مزاجی، سادہ طبعی اور مرنجان مرنج فطرت کے باعث تمام رفقا میں مقبول و محبوب تھا۔ فطرتاً شرمیلا ہونے کے باوجود اس کی سادہ لوحی میں قدرتی حسنِ مزاح اتنی خوبصورتی کے ساتھ رچی بسی ہوئی تھی کہ لمحوں میں دل موہ لیتا تھا۔ چونکہ مردم آزاری اور دل شکنی سے کوسوں دور تھا، اس لیے ہر طالب علم فارغ وقت اس کے ساتھ گزارنے اور اس کی خوش کلامی اور خوش طبعی سے دماغ کی تھکن اتارنے اور دل کی پژمردگی دور کرنے کا خواہاں رہتا تھا۔ گل خان کے پاس ہر سوال کا پھڑکتا جواب اور ہر بات پر چہکتا تبصرہ تیار ہوتا تھا۔ وہ اس بارے میں اس حد تک خود کفیل تھا کہ لگتا تھا اس کے پاس وافر مقدار میں بامعنیٰ باتوں اور پہلودار جملوں کا حاضر اسٹاک موجود ہے جس میں سے جب چاہے جتنی مقدار میں چاہے کھرا اور نایاب سودا نکالتا ہے اور حاضرین میں مسکراہٹیں بکھیرتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے آواز بھی اچھی دی تھی۔ جب موڈ میں ہوتا تو منظوم کلام میں ایسا سُر لگاتا تھا کہ دلوں پر غیر معمولی اثر ہوتا تھا۔ بعض اوقات اس کی آواز کا سوز دلوں کو ٹکڑے کیے ڈالتا تھا۔ گل خان یوں تو بہت جلد گھل مل جانے والا، متواضع اور منکسر المزاج تھا لیکن کوئی ایسا مذاق اسے برداشت نہ تھا جس میں اس کی عزتِ نفس کی توہین ہوتی ہو۔ ایسے موقع پر اس کے چہرے پر سنجیدگی کی دبیز چادر تن جایا کرتی تھی۔ اس وقت اس کے اعصاب فولاد کی مانند ہو جایا کرتے تھے اور اسے پریشان کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر کوئی ایسی کوشش کرتا تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ جب کوئی ساتھی پریشان طبع، دل گرفتہ یا رنجیدہ ہوتا تو گل خان کی پرخلوص باتیں اس کے دل کا مرہم بن جاتی تھیں۔ بیمار ساتھیوں کی عیادت اور تیمار داری میں بھی اسے خاص لطف آتا تھا۔ غرضیکہ وہ اپنی باغ و بہار طبیعت اور ہمدرد و خیر خواہ فطرت کے سبب ہر دلعزیز اور مقبول تھا اور تمام ساتھی اس کی عزت و اکرام کرتے اور اس کے ساتھ مجلس آرائی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ پڑھائی میں گل خان متوسط درجے کا تھا۔ اساتذہ کرام اس کی سادہ اور پُرخلوص طبیعت کی بنا پر اس کی رعایت کرتے تھے اور اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ اس پر نہ ڈالتے تھے۔

گلو چاچا کا شوق:

عمر گل شرودی ہم میں سے نسبتاً معمر تھا، اس واسطے سب طالب علم اس کو "گلو چاچا" بھی کہتے تھے۔ گلو چاچا کو فنون پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں فنون کا بہت رواج تھا۔ لائق اور مستعد طلبہ "بڑے دورہ" (دورۂ حدیث شریف) کے بعد یا "چھوٹے دورہ" (مشکوۃ شریف، ہدایہ آخیرین) کے بعد فنون ضرور پڑھا کرتے تھے اور اس کو تکمیل یا تکملہ کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں تخصص کا اس قدر رواج نہ تھا جتنا اب ہے بلکہ اب تو تکمیل خال خال ہی رہ گئی ہے۔ فضلائے کرام کا زیادہ رجحان تخصص کی طرف ہوتا ہے اور جن مدارس میں تخصص ہوتا ہے وہاں طلبہ کا بہت زیادہ رجوع پایا جاتا ہے۔ فقہائے کرام کی اصطلاح

میں اس کو عرف کی تبدیلی کہتے ہیں۔ بطورِ مثال اگر کسی نے اپنے بیٹے کے بارے میں قسم کھائی کہ میں اسے اپنا فرمانبردار نہ سمجھوں گا، جب تک اعلیٰ دینی تعلیم حاصل نہ کرے یا کسی نے کہا کہ میں اپنے بھتیجے کو اس وقت تک رشتہ نہ دوں گا جب تک وہ اعلیٰ ترین دینی تعلیم حاصل نہ کرے تو دو عشرہ قبل اس سے مراد فنون کی تکمیل ہوتی لیکن اب اس کا مصداق تخصص کو قرار دیا جائے گا کیونکہ ضابطے کی دینی تعلیم کے بعد اب اعلیٰ تعلیم اسی کو کہا جاتا ہے۔

میدان میں اترنے سے پہلے:

فنون کے حوالے سے گل خان اور ہمارا شوق یکساں تھا۔ ہم بھی تحصیلِ فنون کی خواہش میں جنون کی حدوں کو پار کر رہے تھے مگر اس دوران ہمارے نصیب میں گل خان کی مزید رفاقت نہ لکھی تھی اور ہم جدا ہو گئے۔ آج نجانے مولانا عمر گل خان شرودی زید مجدہم کہاں ہوں گے؟ وہ جہاں ہوں اللہ انہیں سلامت رکھے، خوش رکھے اور ان پر اپنی رحمت و عافیت کا سایہ رکھے کہ وہ بہترین رفیق اور مخلص وغم خوار ساتھی تھے اور زمانہ طالب علمی کی بہت سی مشقتیں اور رکاوٹیں ان کی رفاقت کے طفیل بہت سے ہم جماعتوں پر آسان ہوئیں۔ ان کی یاد ''قارئین کی نشست'' میں شائع ہونے والا وہ خط پڑھ کر آئی جس میں فضلائے کرام کے لیے راہِ عمل منتخب کرنے کے حوالے سے تجاویز مانگی گئی تھیں۔ مولانا شرودی آج ہوتے تو ہم ان سے تکمیل کی ضرورت واہمیت پر وہ مفصل بیان ضرور دوبارہ سن کر فضلائے کرام تک پہنچاتے جو ایک زمانہ میں ان کی نوکِ زباں تھا۔ فرق اتنا ہے کہ اس زمانے میں تکمیل میں فلسفہ ومنطق اور ہیئت و ہندسہ پڑھایا جاتا تھا۔ اب اس تکمیل کی ضرورت ہے جس میں استعداد کی کمزوری دور کرنے اور تدریس کی تربیت دینے کے ساتھ تین عالمی زبانوں میں درس، وعظ اور تحریر کی مہارت پیدا کی جائے۔ استعداد کی مکمل پختگی کے بغیر تخصص کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نو تعمیر شدہ عمارت کے بنیادی ڈھانچے میں کمزوری کا علم ہو جانے کے بعد اس کی پختگی پر توجہ دینے کے بجائے اس پر مزید منزلیں تعمیر کی جائیں یا اضافی تزئین و آرائش پر سرمایہ خرچ کیا جائے۔ تکمیل کے معنی ہیں کہ اصل میں جو رخنہ رہ گیا ہے اسے دور کیا جائے اور تخصص کا معنی اصل مضبوط ہو جانے کے بعد ترجیحی بنیادوں پر کسی علم میں مہارت۔ ہمارے نوجوان فضلا کو اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ایک عالم کو میدانِ عمل میں اترنے سے قبل جن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ کون کون سی ہیں اور پھر درجۂ تکمیل میں ان سب کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کسی کو حقیر نہ سمجھیے:

یوں تو فضلائے کرام کے سامنے بہت سے میدان ہیں جن میں اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندوں سے کام لیتا ہے اور جس بھی طالب علم نے نیک نیتی، خلوص اور عقیدت و ادب سے علمِ دین حاصل کیا ہو، اسے اللہ تعالیٰ ان مختلف شعبوں میں کسی نہ کسی درجے میں قبول فرما لیتا ہے۔ اسی وجہ سے اکابر نے فرمایا ہے کہ کسی طالب علم کو جو استعداد میں کم ہو، حقیر یا بے کار نہ سمجھنا چاہیے۔ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ بہت سے ایسے طلبہ جو استعداد کے اعتبار سے ممتاز نہ تھے ایسے ایسے مناصب پر کام کر رہے ہیں اور ایسے اہم مورچوں میں ڈٹے ہوئے ہیں کہ اگر ذی استعداد طلبہ کا وہاں سے گزر ہو تو انہیں دانتوں پسینہ آجائے۔ ہمارے معاشرے میں دینی کاموں کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ایک عالم کو علمی استعداد کے علاوہ بھی بہت کچھ درکار رہے۔ ایک زمانہ میں جو طلبہ داخلہ کا امتحان لینے آتے اور ان کو کتاب نہ آتی تو بندہ ان سے پوچھ لیتا تھا کہ آپ قرآن اچھا پڑھ لیتے ہیں؟ نظم پڑھنے کا

ڈھنگ آتا ہے؟ بیان کر سکتے ہیں؟ تبلیغ یا جہاد میں وقت لگایا ہے؟ کوئی ایسا کام جو ایک عالم کے ساتھ جچتا ہے اگر آپ کو آتا ہے تو اس شرط پر داخلہ مل سکتا ہے کہ آئندہ اپنے اوقات کی حفاظت کریں گے اور مقدور بھر محنت کر کے دکھائیں گے۔ پھر وہی طالب علم جو لکھنے پڑھنے میں نسبتاً کمزور ہوتے تھے، اپنی انتظامی صلاحیتوں یا دیگر کسی خوبی کے سبب فراغت کے بعد ایسا کام کر دکھاتے تھے جو قابل طلبہ کے بس کا بھی نہ ہوتا تھا۔

دو بنیادی باتیں:

الغرض یوں تو نو فاضل شدہ رفقا کے لیے میدان کار بہت سے ہیں جو ان کی متنوع صلاحیتوں کے اظہار کے منتظر ہیں لیکن جس طرح آج کل حفظ کے بعد گردان کا التزام ہونے لگا ہے جبکہ ایک زمانہ میں اس کا تصور نہ تھا، اسی طرح اب فراغت کے بعد عملی میدان کی طرف روانہ ہونے سے پہلے تکمیل کے ذریعے ان چیزوں کی طرف توجہ دینی چاہیے جن پر زمانہ طالب علمی میں دسترس حاصل نہ ہو سکی۔ یا اس وجہ سے کہ وہ درسِ نظامی کا حصہ نہ تھیں یا اس وجہ سے کہ ان کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں دی جا سکی۔ علوم دینیہ چونکہ عربی میں ہیں لہٰذا علوم عربیت (صرف، نحو، لغت اور بلاغت) میں مضبوط استعداد کے بغیر علوم دینیہ میں رسوخ کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور علومِ دینیہ کے حصول کا مقصد چونکہ ابلاغِ دین ہے اس لیے ذرائع ابلاغ پر مضبوط گرفت کے بغیر اس مقصد کی تکمیل مشکل ہے۔ اب کلیہ یہ بنا کہ ایک عالم کو علومِ عربیت میں دسترس اور اظہار مافی الضمیر پر قدرت کے بغیر مقاصد علم کا حصول مستبعد ہے لہٰذا درجۂ تکمیل میں ان دونوں باتوں پر زور دینا چاہیے۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے صرف و نحو کو مکمل اجرا کے ساتھ اچھی طرح ضبط کیا جائے، بعد ازاں دو دقیق فنی کتابوں میں طالب علم کو تدریس کی تربیت دی جائے۔ طالب علم قدیم طرزِ تدریس کی طرح اپنے مطالعہ سے سبق تیار کر کے لائے اور درست عبارت خوانی کے بعد مطلب بیان کرے۔ استاد اس کو حسب موقع لقمہ دے کر تصحیح کریں۔ ہدایہ ثالث اور بیضاوی و مختصر یا شرح ابن عقیل کو بنیاد بنا کر تدریس کی عمدہ مشق کروائی جا سکتی ہے۔ طالب علم پہلے ایک سبق کے بقدر کتاب کی عبارت میں موجود مشکل صیغوں کو حل کرے، پھر رفع نصب جر کی وجہ وغیرہ پہچانے، مشکل الفاظ کا معنیٰ دیکھے اور جب صرف، نحو اور لغت تینوں اعتبار سے عبارت تیار ہو جائے تو پھر معنیٰ فہمی اور تفہیم مطلب کی کوشش کرے۔ سال بھر اسی طرح کی مشق سے استخراجِ معنی اور تفہیم مطالب کی اچھی خاصی مشق ہو سکتی ہے اور عالم کی صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ عبارات سے معنیٰ کا استنباط صحیح صحیح کر سکے۔

جدید علوم نہیں، جدید معلومات:

اس دوران طالب علم کو تین عالمی زبانوں میں تحریر و تقریر کی مہارت پیدا کرنے کے مکمل مواقع فراہم کیے جانے چاہییں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کا شکوہ زبان زد عام ہے کہ علماء کو جدید علوم حاصل کرنے چاہییں۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے کرام کو جدید علوم کی نہیں جدید معلومات کی ضرورت ہے اور یہ معلومات ان تین زبانوں کے اچھی طرح سیکھنے سے آ سکتی ہیں جو عالمی بھی ہیں اور علمی بھی.........یعنی دنیا کے اکثر خطوں میں ان میں سے کوئی ایک بولی یا سمجھی جاتی ہے اور ان میں علم و تحقیق کا ایسا خزانہ ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یعنی عربی، اردو اور انگریزی۔ اگر ان تینوں زبانوں پر عبور ہو تو جدید معلومات کے سمعی و بصری ماخذ تک رسائی اور ان معلومات کے ذریعے اپنے بیانات اور دروسِ قرآنیہ میں دلچسپی کا عنصر سمو کر جدید تعلیم یافتہ

طبقے تک ابلاغ نہایت سہل ہو جاتا ہے اور وہ خلا پُر ہونے کی صورت نکل سکتی ہے، جو عصری علوم کے حامل حلقوں اور علمائے کرام و داعیانِ دین میں پیدا ہوتی جا رہی ہے، لہٰذا درجۂ تکمیل میں اردو ادب، عربی محادثہ و انشا اور انگریزی بول چال کا مستقل گھنٹہ اہتمام کے ساتھ ہونا چاہیے۔

ایک بہترین تجربہ گاہ:

اردو ہماری قومی زبان ہے مگر علماء و طلبہ کرام کے حلقے میں بولی جانے والی اردو میں عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب اور عوامی حلقوں کی اردو میں انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات کے بے تکلف شامل ہوتے چلے جانے سے دونوں طبقوں کی باہمی افہام و تفہیم کا عمل خطرناک حد تک متاثر ہوتا جا رہا ہے۔ علمائے کرام کے بیانات میں عوام کو اجنبیت کی جھلک محسوس ہوتی ہے جسے وہ ثقیل الفاظ کا نتیجہ گردانتے ہیں، حالانکہ یہ الفاظ اردو کا حصہ تھے اور ہیں۔ دوسری طرف عوام جب کوئی مسئلہ پوچھتے ہیں تو انگلش کا ایسا بے دریغ استعمال کرتے ہیں کہ اندازوں اور قرائن سے کام لیے بغیر ان کی بات سمجھنا کارے دارد ہے۔ پچھلے دنوں جاپان کے ایک اردوداں پروفیسر کو کہنا پڑا کہ اردو کو انگریزی کی دسترس سے بچایا جائے۔ اب عربی و فارسی کی تعلیم جس معاشرے میں عنقا ہو اور موچی و حجام بھی انگلش الفاظ کے بورڈ لگائیں، وہاں قومی زبان کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ رہی سہی کسر ایف ایم ریڈیو جیسے ذرائع ابلاغ کی مسخ شدہ کچلی ہوئی زبان اور انگریزی تعلیم یافتہ پروفیسر، انجینئر اور ڈاکٹر صاحبان کے دروسِ قرآنیہ نے پوری کر دی ہے چنانچہ عوام شیخ محمد اور بابر چوہدری کے بیانات میں انسیت اور تفہیم میں سہولت محسوس کرتے ہیں جبکہ اٹھارہ اٹھارہ، بیس بیس مرتبہ قرآن کریم کا مکمل ترجمہ و تفسیر پڑھنے پڑھانے والے علمائے کرام کے بیانات میں انہیں زبان کی چاشنی محسوس نہیں ہوتی۔ اردو ادب، جدید عربی اور انگریزی بول چال کو اگر درسِ نظامی کا حصہ بنانے میں رکاوٹ ہے تو درجۂ تکمیل ہر اس مضمون کے لیے بہترین تجربہ گاہ ہے جسے بوجوہ وفاق کے نصاب کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا۔

ایک دیرینہ شکوہ:

ہفتے میں تین دن کمپیوٹر کا گھنٹہ، جمعرات کو تقریری انجمن کی پابندی اور پندرہ دن بعد چھوٹے موٹے مجلّہ جداریہ (دیواری اخبار جس پر کچھ بھی خرچ نہیں آتا اور طلبہ کی متنوع صلاحیتوں کا اظہار ہو جاتا ہے) کا اجرا بھی تکمیل کے طلبہ کی صلاحیتوں کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ نئے فارغ التحصیل ہونے والے ساتھیوں کو اردو ادب کی تعلیم ابلاغ و صحافت کے وسیع میدانوں تک، عربی محادثہ عالم عرب کے ایوانوں تک اور انگریزی بول چال دنیا کے کونے کونے تک پہنچا سکتی ہے اور ہمارے معاونین و خادمین اور مخالفین و معاندین سب کا یہ دیرینہ شکوہ ختم ہو سکتا ہے کہ ہمیں علمائے کرام سے عقیدت تو ہے لیکن ان سے استفادہ تعویذ لینے، نکاح و جنازہ پڑھانے اور دعاؤں کی درخواست تک محدود ہے۔ جغرافیہ تاریخی و قرآنی اور فلکیات یعنی تخریج اوقات صلاۃ، تخریج سمت قبلہ اور مباحث رؤیت ہلال بھی وہ مضامین ہیں جنہیں منطق و فلسفہ اور ہیئت و ہندسہ کی منتہی کتب (لفظ "منتہی" مدنظر رہے) کی جگہ تکملہ کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔

ترجمان کی شرائط:

تخصص فی الافتاء ایسا شعبہ ہے کہ اس کی تعلیم پانے والا اللہ اور بندوں کے درمیان ترجمان بن جاتا ہے لہٰذا بہت ہی

مضبوط اور پختہ استعداد کے بغیر افتاء کی تمرین نہ کروانی چاہیے۔ شنید ہے کہ وفاق المدارس العربیہ کے اکابرین نے درجہ تخصص کا نصاب تشکیل دیا ہے۔ یہ خوش آیند بات ہے۔ اس سے تخصص کا معیار بلند ہونے اور شرکا کے سخت انتخاب میں یقینی مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اکابرین کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ تکمیل کے لیے بھی جامع نصاب کی تشکیل پر غور فرمائیں کہ فضلائے کرام کو اس کی ضرورت واحتیاج کا تناسب تخصص سے بڑھ کر ہے۔ درجۂ تکمیل، درسِ نظامی اور تخصص کے درمیان کی سُنہری کڑی ہے۔ اس کو جوڑے بغیر ''سلسلة الذهب'' نامکمل سا محسوس ہوتا ہے۔ اہل مدارس اگر آیندہ سالوں میں تخصص سے زیادہ تکمیل کو رواج دیں اور فضلائے کرام کو میدانِ عمل میں درکار لازمی اسلحہ سے مسلح کر دیں تو یہ ان کے ساتھ حقیقی خیر خواہی کے علاوہ عامۃ المسلمین کے لیے بھی نہایت مفید اور نافع ہوگا اور وہ مسائل نہ پیدا ہوں گے جو فراغت اور تخصص کے درمیان کی کڑی کے غائب ہو جانے سے پیدا ہو رہے ہیں۔

جنت گل کی تلاش

جواں مردی کی آزمائش:

ایک تازہ ترین سروے میں دنیا کے دس امیر ترین افراد کو نامزد کیا گیا ہے۔ بعض عرب جرائد نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ فہرست تعصب اور جانبداری پر مبنی ہے۔ اس میں صرف ایک عرب شہزادے کا نام ہے جبکہ ایسے کئی شہزادے یا امیر ہیں جو اتنے صاحب ثروت ہیں کہ فہرست میں دیے گئے کچھ افراد یقینی طور سے ان سے کم صاحبِ حیثیت ہیں۔ یہاں یہ بات بتانے کا ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان عرب بھائیوں کی وکالت کریں اور ان کی عرفی حیثیت کے ازالے پر احتجاج نوٹ کروائیں بلکہ کچھ اور باتیں ہیں جنھوں نے یہ سطور لکھنے پر مجبور کیا۔

ایسی کوئی فہرست عام طور پر جب شائع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس طرح کے الفاظ لکھے ہوتے ہیں: ''دنیا کے دس خوش قسمت ترین افراد'' یہ وہ جملہ ہے جس نے بہت سے لوگوں کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ اس میں دس افراد کے ساتھ ''خوش قسمت'' کا لفظ پڑھ کر بہت سے لوگ ناشکری اور کفرانِ نعمت جیسے مہلک اور تباہ کن گناہ میں اس طرح مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دنیا بھی کھوٹی کررہے ہیں اور آخرت بھی۔ وہ ایک نظر ان ناموں کے سامنے لکھے اعداد وشمار پر ڈالتے ہیں اور دوسری اپنی موجودہ حالت اور مستقبل کے مایوس کن امکانات پر اور پھر اللہ تعالیٰ سے شکوہ شکایت اور حسرت و مایوسی ان کے دل میں ایسی جگہ بنالیتی ہے کہ انہیں شکر کی بے بہا نعمت سے محروم کردیتی ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ دولت خوش قسمتی کی نہیں آزمائش کی علامت ہے اور یہ ایسی خطرناک آزمائش ہے کہ اس میں ''جنت گل'' جیسا کوئی جواں مرد ہی پورا اُترتا ہے۔

خاندانی نو دولتیا:

اپنے اسلاف میں سے کسی باوقار، صاحب حال اور متبرک ولائقِ تقلید شخصیت کی مثال پیش کرنے کے بجائے جنت گل کا تذکرہ میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ بندہ کا اندازہ ہے کہ حسرتوں کے مارے بعض لوگ جب اکابر میں سے کسی کا واقعہ سنتے ہیں تو ان کی کچلی ہوئی نفسیات یہ ہوتی ہیں کہ اس ہوس زدہ دور میں کوئی ایسا دکھاؤ جو مال جیب میں رکھتا ہو، دل میں نہیں۔ اس معیار پر ہمارا پختون بھائی جنت گل آفریدی پورا اُترتا تھا۔ جنت گل معروف معنوں میں مولوی مُلّا یا درویش فقیر نہ تھا لیکن اللہ والوں کی صحبت کی برکت سے رب تعالیٰ نے اس کو استغنا کی صفت عطا فرمادی تھی اور وہ بعض چیزوں میں مولویوں سے بڑھ کر مُلّا اور درویشوں سے بڑھ کر صوفی تھا۔ وہ یاروں کا یار اور انتہائی کھلے دل کا آدمی تھا۔ زبان کا کھرا اور ہاتھ کا کھلا۔ مزدوری کرنے کے لیے کراچی آیا لیکن رب تعالیٰ نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے ''صاحبِ آزمائش'' بنادیا۔ (یہ لفظ 'صاحبِ دولت'' کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا ہے) جنت گل اصیل خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور فقر واستغنا والے مُلّاؤں سے اس کا واسطہ رہ چکا تھا، اس لیے اس آزمائش میں پورا اُترا۔ دولت نے اس کی تجوریوں میں تو جگہ بنالی تھی لیکن اس کے دل ودماغ تک اس کی بُو نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ

''نو دولتیا'' ہونے کے بعد بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ خاندانی وضع دار اور دین دار لوگ عام طور پر ہوتے ہیں۔ دوستوں یاروں کے لیے اس کا دروازہ ہی نہیں، جیب بھی ہر وقت کھلی رہتی تھی اور وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھتا تھا کہ اس کے پرانے دوستوں میں سے کوئی تکلف سے کام لے اور اس سے ویسا برتاؤ اور یادِ اللہ نہ رکھے جیسے اس وقت رکھتا تھا جب جنت گل کے پاس نسوار کے پیسے یا بس کا کرایہ بھی نہ ہوتا تھا۔

امتحان یا انعام:

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ صاحبِ حیثیت ہونے کے بعد آدمی پر حیثیت کا بھوت سوار ہو جاتا ہے اور اسے وہ لوگ کم حیثیت معلوم ہونے لگتے ہیں جن کی دوستی، حوصلہ افزائی اور تعاون کے سہارے وہ کسی مقام تک پہنچا ہے...... لیکن جنت گل کم ظرفی کی اس بیماری سے کوسوں دور تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے نئے دوست بن گئے تھے اور وہ ان سے تعلق کی نوعیت کے مطابق انہیں وقت دیتا تھا لیکن وہ پرانے دوستوں کو ہرگز بھولا نہ تھا۔ اگر اور کوئی وجہ ملاقات نہ ہو تو اپنا پرانا وقت یاد کرنے کے لیے ہی وہ ان کے پاس پہنچ جاتا تھا اور اپنی کسی بات یا رویّے سے ہرگز ظاہر نہ ہونے دیتا تھا کہ وہ کوئی خاص قسم کی چیز بن چکا ہے۔ بارہا لوگوں نے تعجب کیا کہ یہ گورا سرخ پٹھان جو فقیروں کے پاس اُٹھتا بیٹھتا ہے بڑی اونچی چیز ہے، یہ ادھر کیسے آ پھنکتا ہے؟ بعض لوگ اسے ایجنسیوں کا آدمی سمجھ کر دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے مگر بات یہ تھی کہ یہ لال سرخ پٹھان نہ صرف یہ کہ دوستی کا کھرا، دل کا صاف اور زبان کا پکا تھا بلکہ وہ اس حد تک بے لوث اور مخلص تھا کہ دوستوں کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتا تھا۔ ساٹھ ستر روپے دہاڑی کمانے سے لے کر ساٹھ ستر ملکوں کے سفر تک وہ ویسا ہی تھا جیسے شریف النسل لوگ ہوتے ہیں۔ وہی بے تکلفی، وہی گپ شپ، وہی کھانا پینا، بے لوث تعلق اور وفادارانہ یاری۔ غریب غربا لوگوں کو خالی ہاتھ واپس جانے دینا وہ بے برکتی اور بدقسمتی سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا یہ بندہ اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس بھیج کر اس کا امتحان لیا ہے اور میں تو بغیر امتحان کے لٹانے بلکہ لٹنے پر تیار بیٹھا رہتا ہوں۔ بلاشبہ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کی دولت اور حیثیت آہستہ آہستہ آزمائش کے بجائے انعام بن جاتی ہے اور پھر اس انعام میں ترقی ہی ہوتی رہتی ہے۔

خیبر سے دمام تک:

ہمارے عرب بھائیوں نے...... اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور ان کی دینی و دنیاوی نعمتوں میں ترقی اور فراوانی عطا فرمائے...... تیل کے چشمے اُبلنے کے بعد اپنے مذہبی بھائیوں سے ویسے تعلقات نہ رکھے جیسے ان کا حق تھا۔ حتیٰ کہ دنیا نے دیکھا کہ دنیا میں معدنی دولت سب سے زیادہ مسلمانوں کے پاس ہے، لیکن دنیا میں سب سے زیادہ غریب اور پسماندگی کا شکار بھی مسلمان ہی ہیں۔ عرب شہزادوں نے ہم عجمی فقیروں کو اس طویل عرصے میں فراموش کیے رکھا اور ان کے اکرام اور اعتماد کا رُخ ناقابلِ فہم طور پر یہود و نصاریٰ کی طرف مڑ گیا اور وہ یہود و نصاریٰ جن کو ہمارے آباو اجداد نے اپنے زورِ بازو سے سرزمین عرب سے نکال باہر کیا تھا، وہ ان کے نزدیک محبوب و مقبول بن گئے اور پچھلی دہائی میں تاریخِ اسلام کا یہ سانحہ رونما ہوا کہ خیبر کے باغات سے رسوا ہو کر نکلنے والے یہود و نصاریٰ دمام اور دہران کے تیل کے کنوؤں کے پاس منڈلی جما کر آن بیٹھے ہیں اور انہوں نے لوٹ کے اس تیل سے اس قدر دولت پیدا کر لی ہے کہ وہ ہمارے عرب شہزادوں کو خاطر میں لاتے ہیں نہ فہرست میں۔ جہاں ان

کا کام فریب اور سیاست سے چلا وہاں فریبی سیاست سے اور جہاں ان کی مکاری کام نہ آئی وہاں کھلم کھلا ڈاکہ زنی کے ذریعے وہ تیل کی دھار کا رُخ اپنی طرف موڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے قابلِ احترام سادہ دل عرب بھائیوں نے اگر کچھ کمایا بھی تو اسے انہی دشمنانِ جان و دین کے سود خانوں میں لے جا کر محفوظ کیا چنانچہ امریکا و یورپ کے تیل چوس اور سرمایہ بٹور اتحادیوں کا ایک ہاتھ تیل میں تھا دوسرا اس سرمائے پر جو عرب ممالک سے سمٹ سمٹ کر ان کے سود گھروں میں جمع ہو رہا تھا۔ نائن الیون کے دھواں دار واقعے کے بعد امریکا کے بعض افراد اور تنظیموں نے یہ دعویٰ کیا کہ امریکا میں لگی ہوئی عربوں کی ساری دولت ان کے حوالے کی جائے کیونکہ ان کے رشتہ دار اس واقعہ میں مرے ہیں اور ان کی کچھ کمپنیاں ڈوب گئی ہیں۔ اس پر امریکی حکام کی طرف سے عرب شہزادوں اور سرمایہ کاروں کو جب یہ باور کرایا گیا کہ امریکا میں آپ کی لگائی ہوئی دولت جڑواں ٹاور میں پھٹک جانے والے سرمائے کے عوض ضبط تو نہیں کی جاتی لیکن آپ کو اس کے آزادانہ انتقال کی اجازت بھی نہیں اور ملک سے باہر تو آپ اسے قطعاً نہیں لے جا سکتے تو انہیں ہوش آیا کہ وہ جن ملکوں کو اپنے سرمائے کے لیے محفوظ اور نفع بخش خیال کرتے تھے ان سے زیادہ حریص، لالچی اور بدنیت کوئی نہیں۔ لہٰذا اب ہمارے یہ دینی اور تاریخی بھائی اپنے دورِ غربت کے ساتھیوں کو تلاش کر رہے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ وہ اپنی دولت اسلامی ملکوں خصوصاً پاکستان میں لگائیں۔

جنت گل! کہاں ہو؟

جی ہاں! اسی پاکستان میں جس کی انفرادیت، کشش اور انوکھا پن قیامت تک قائم رہے گا، چاہے ہم اس سے فائدہ اُٹھائیں یا مواقع کو ضائع کرتے رہیں۔ عرب بھائیوں کا سرمایہ اب تیزی سے پاکستان آ رہا ہے، ان کی اچھی خاصی تعداد وطن عزیز کا رُخ کر رہی ہے اور ہمارے اربابِ اقتدار چاہیں تو عربوں کی دولت اور اہلیانِ وطن کی صلاحیت اور ذہانت یکجا ہو کر ترقی و امکانات کا ایک نیا جہاں تشکیل دے سکتی ہے۔

افسوس! آج کوئی جنت گل نہیں جو ہمارے عرب مہمانوں کو بتائے کہ غربت کے زمانے کے دوستوں کو بھلانا نہیں چاہیے ان کی وفاداری ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

کاش! ہمارے اربابِ اقتدار میں کوئی فقیر منش محبِ وطن ہو جو مواقع کی اس نئی دنیا سے...... عربوں کے سرمائے کے پاکستان کی طرف رُخ کرنے پر تیار اس دریا سے...... کماحقہٗ فائدہ اُٹھا سکے۔

امریکا و یورپ سے مایوس ہونے کے بعد عرب امیر، شہزادے اور سرمایہ کار پاکستان کی طرف نظریں لگائے ہوئے ہیں، اگر انہیں یہاں مخلص اور وفادار جنت گل میسر آ جائیں تو خزاں کی جگہ ایسی بہار آ سکتی ہے جو صحرا میں گل بوٹے کھلا دے۔ جنت گل تم کہاں ہو؟ میری قوم کو تمہارے جیسے بے لوث شخص کی ضرورت ہے۔

صوفی صاحب

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کے تعلق کا مطالعہ کیا جائے تو عجیب وغریب فرق سامنے آتا ہے۔ اس فرق کو الفاظ میں بیان کرنے کا لطف اتنا نہیں، نہ صاف صاف الفاظ میں اسے سمجھا سمجھایا جا سکتا ہے۔ البتہ واقعات کے ضمن میں اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بڑا کیف وسُرور آتا ہے۔

ہزار واٹ کا بلب:

بچپن میں ایک بزرگ کو دیکھا تھا۔ نام ان کا خدا جانے کیا تھا...... بس سب انہیں "صوفی صاحب" کہتے تھے۔ اس وقت تو ہمیں کچھ سمجھ نہ تھی کہ "صوفی" کا کیا معنی ہوتا ہے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ آج پیچھے مُڑ کر دیکھیں تو وہ بزرگ اسم با مسمیٰ تھے۔ صوفی صاحب کے چہرے پر عجیب سی ملائمت تھی جس کی وجہ سے ان کا رنگ سیاہی مائل ہونے کے باوجود بڑا کِھلتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا ان کے گرد روشنی کا ہالہ ہے۔ ان کو دیکھتے ہی دل میں ایسی بشاشت طاری ہوتی تھی جیسے روح تازہ ہوگئی یا باطن میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔ ان کے چہرے کو دیکھئے تو ایسی معصومیت کہ جی چاہے دیکھتے رہیے۔ مگر ایک بڑی مشکل ان کی آنکھیں تھیں۔ ان کی آنکھوں میں لگتا تھا ہزار واٹ کا بلب روشن ہے اور وہ انسان کے اندر یوں اُترتی محسوس ہوتی تھیں جیسے کوئی برمے سے سوراخ کر رہا ہو۔ ان کے چہرے پر جمی نظریں جیسی ہی ان کی آنکھوں سے ٹکراتیں، چنگاری سی سلگتی اور مجال نہ ہوتی کہ ان کی نظر سے نظر ملائی جائے۔ آنکھوں کی اس طلسماتی کیفیت کی ایک جھلک بعد میں کمانڈر نصر اللہ لنگڑیال کے ماتھے میں روشن دو چراغوں میں دیکھنے کو ملی۔ اس شخص کی آنکھیں بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔ خصوصاً جب ساتھیوں کی تشکیل کرتا تو اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک صاف دیکھی جا سکتی تھی جس کی وجہ سے اس کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ دائیں یا بائیں؟ تعارض میں یا پیچھے؟ اس کا اشارہ حرفِ آخر جیسی قطعیت رکھتا تھا۔ اللہ جانے آج وہ کس حال میں ہے؟ جس شخص کے پیچھے ہم جیسے ناکارہ ہوں اس کا حال کیا اور بدحالی کیا؟

آمد اور آورد:

ہاں تو بات صوفی صاحب کی ہو رہی تھی۔ صوفی صاحب ہمیشہ ململ کا کُرتا اور دھوتی پہنتے تھے۔ لمبے پٹھے بالوں پہ پانچ پہلوؤں والی ٹوپی بڑی نفاست سے جمی رہتی تھی۔ گرمی ہو یا سردی ان کا یہی لباس تھا۔ البتہ سردیوں میں ایک سبز شال کا اضافہ ہو جاتا تھا جو ان پر بڑی بجتی تھی۔ جسم ان کا نحیف مگر گٹھا ہوا تھا۔ لہجے میں اتنی مٹھاس گویا شیرے میں گندھا ہوا ہے اور رویّے میں ایسی لطیف ملائمت اور ٹھنڈک کہ برگد کی چھاؤں معلوم ہوتے تھے۔ صوفی صاحب تقریباً سب ہی نمازوں کے بعد قبلہ رُخ خاموش بیٹھ کر ذکر کیا کرتے تھے لیکن فجر اور عصر اور کبھی عصر کی جگہ عشا کے بعد بہت اہتمام سے یکسو ہو کر دیر تک بیٹھا کرتے تھے۔ اس بیٹھک کے دوران ان پر کبھی کبھی حال طاری ہو جاتا تھا جو ہم بچہ لوگوں کے لیے...... اللہ معاف کرے...... بڑے مزے کی چیز ہوتا تھا۔ صوفی صاحب کا چہرہ اس وقت اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں یا کہیں اور پہنچے ہوئے ہیں۔ بعد

میں ملنگ قسم کے لوگوں کو حال کھیلتے ہوئے بھی دیکھا لیکن ان کا حال ''آمد'' نہیں ''آورد'' ہوتا ہے۔ صوفی صاحب کا حال خالص ''آمد'' ہوتا تھا۔ اس میں ان کا کوئی اختیار قطعاً نہ تھا۔ وہ بالکل بے خود اور مست کسی اور دنیا میں پہنچے ہوتے تھے۔ ان کی اس کیفیت کی سچائی کا ایک دن یوں مشاہدہ ہوا کہ ایک مرتبہ حال طاری ہونے کے وقت ایک بندے کا جسم ان سے چھو گیا۔ بس کیا تھا اس شخص کی زبان سے بے اختیار ذکر جاری ہو گیا، اس کی آواز بلند ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ وہ قابو سے باہر ہوتا گیا۔ اگر صوفی صاحب جلد ہوش میں نہ آتے اور اس پر دم کیے ہوئے پانی کا چھینٹا نہ مارتے تو نجانے اس شخص کا کیا بنتا؟ بہت دل چاہتا تھا کہ صوفی صاحب جب اچھے موڈ میں ہوں تو ان سے پوچھیں یہ ''حال'' کیا ہوتا ہے؟ مگر جیسا کہ پہلے بتایا ان کی آنکھیں مشکل پیدا کر دیتی تھیں۔ ان سے ایسی ایٹمی توانائی قسم کی چیز خارج ہوتی رہتی تھی کہ ہنس مکھ چہرے پر دو انگارے سے دہک رہے ہوں اور انگارے بھی ایسے جن کی حرارت بغیر سینکے جسم میں اُتر جائے۔

صوفی صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی بچوں سے ملتے تو دو کام ضرور کرتے: ایک تو یہ کہ فرداً فرداً سب سے پوچھتے: ''کتنے سپارے ہو گئے؟'' ان کا حافظہ غضب کا تھا اس لیے پچھلی ملاقات اور نئے سوالوں کے درمیان کے وقفے میں بچوں کی مقدار خواندگی اور ترقی کا موازنہ یوں کر لیتے تھے جیسے رجسٹر کا لکھا پڑھ رہے ہیں۔ ان کی دوسری عادت تھی کہ بچوں سے مختلف معلوماتی سوالات کرتے تھے جن کا موضوع اکثر و بیشتر سیرت اور اسلامی تاریخ ہوتا تھا، جو بچہ درست جواب دیتا اس سے بڑے خوش ہوتے، شاباش دیتے اور کبھی چھوٹا موٹا انعام بھی دیتے تھے۔

یہ ماجرا کیا ہے؟

ایک مرتبہ عجیب بات ہوئی۔ انہوں نے ایک بچے سے چند سوالات پوچھے۔ بہت آسان اور سادہ سوالات تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ صوفی صاحب کا مقصد اس کی حوصلہ افزائی ہے نہ کہ امتحان...... لیکن اس بچے نے ایک کا جواب بھی نہ دیا۔ سب کو اس پر حیرت تھی کہ ماجرا کیا ہے؟ بچے نے جب سب کی متعجب نگاہیں اپنی طرف مرکوز پائیں تو وہ اُٹھ کر گیا، وضو کر کے آیا اور صوفی صاحب سے عرض کیا: ''اب وہی باتیں دوبارہ پوچھیے۔''

اب کی مرتبہ صوفی صاحب پوچھتے گئے اور وہ فر فر جواب دیتا گیا۔ صوفی صاحب نے پوچھا: ''بیٹا پہلے کیوں جواب نہ دیا؟''

بچے نے کہا: ''اتفاق سے آپ نے جتنے سوالات پوچھے ان کا جواب دینے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لینا پڑتا تھا اور میں بے وضو تھا، بغیر وضو کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر نہ لا سکتا تھا۔ یہ سنتے ہی صوفی صاحب پر وجد طاری ہو گیا۔ یہ کیفیت ایسی شدید تھی کہ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ بار بار بے خودی کے عالم میں محمد محمد، مدینہ مدینہ پکارتے تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے کچھ اشعار اور مصرعے بار بار دہراتے تھے اور اُٹھ اُٹھ کر گر گرتے تھے۔ اسمِ الٰہی کے ذکر کے دوران بھی ان کو جذب کی حالت میں دیکھا تھا پر آج کی بات کچھ دوسری تھی۔ ایک شدید وارفتگی کی کیفیت ان پر طاری تھی جو ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اس دن ہمیں پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت تو ہے ہی بلند شان والی...... مگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت مسلمان کے دل میں ایسی گہرائی میں رچی بسی ہوئی ہے کہ سبحان اللہ......! اس کا کیف و سرور ہی جدا ہے۔ یہ ایسی وجد آفریں ہوتی ہے کہ ''ورفعنا لك ذكرك'' کا تکوینی حکم پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

جلال اور جمال:

عظمت الٰہی اور محبت رسول کے مظاہر روزِ اول سے آج تک ظاہر ہوتے آئے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ دنیا پرست کوتاہ بینوں کو بھی وقتاً فوقتاً اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں حرم شریف کی چھت پر ایک کالے نوجوان کو دیکھا کہ ملتزم کی سیدھ میں خانہ کعبہ پر نظریں گاڑھے ساکت و جامد بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے بیٹھنے کا انداز عجیب تھا۔ حج کے دنوں میں چونکہ رش زیادہ ہوتا ہے اس لیے آپ چھت کے کنارے پر بنی ریلنگ سے ذرا بھی پیچھے ہوں تو آپ کو خانہ کعبہ اچھی طرح دیکھنے کے لیے تھوڑا سا اُچکنا یا اونچا ہونا پڑے گا۔ یہ نوجوان گھٹنوں کے بل کھڑا ہو جاتا تھا اور گھنٹوں اس حالت میں بے حس و حرکت خانہ کعبہ کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا تھا جیسے آنکھوں کے راستے کچھ جذب کر کے دل میں اُتار رہا ہے۔ کئی دن اسے اسی حالت میں اس شغل میں مصروف دیکھا۔ اس کیفیت میں دیر تک بیٹھنا نجانے اس کے لیے کیسے ممکن تھا؟

کئی بار اسے پیش کش کی کہ ہماری جگہ پر کھلے اور کشادہ ہو کر سکون سے بیٹھ جاؤ مگر اسے یہ ریاضت جاری رکھنے میں مزہ آتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ صرف سینیگالی اور فرانسیسی جانتا تھا۔ کوئی اور زبان نہ آتی تھی ورنہ خوب گزرتی۔ مدینہ منورہ گئے تو ایک دن روضۂ اطہر کی جالیوں کے پاس دکھائی دے گیا۔ یہاں اس کی حالت کچھ اور ہی تھی۔ بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتا تھا۔ لگتا تھا مکہ مکرمہ میں بندھا ہوا بند یہاں ٹوٹ گیا ہے۔ وہاں کی خاموشی یہاں آنسوؤں کی زبان بن کر بہہ نکلی تھی۔ وہاں جلال یہاں جمال۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت نے رعب طاری کر رکھا تھا اور یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے ایسا بے خود کر دیا تھا کہ ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔

لازوال اور انمول دولت:

مسلمانوں میں اللہ ورسول سے تعلق کا یہ فرق عجیب وغریب ہے۔ اس کی صحیح صحیح تعبیر بہت مشکل ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ ایک میں وقار وتمکنت ہے تو دوسرے میں بے خودی اور وارفتگی...... یہ وارفتگی وہ انمول نعمت ہے جو مسلمانوں کو تکوینی طور پر عطا کی گئی ہے۔ یہ ایمان کی علامت بھی ہے اور کفر کو مبہوت کر دینے والی صفت بھی۔ مسلمان جتنا اس پر فخر کرتے ہیں دشمنانِ اسلام اس سے اتنا ہی سڑتے بھجتے ہیں۔ کفر کی بڑی کوشش ہے کہ مسلمانوں میں حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا یہ جذبہ کسی طرح ماند پڑ جائے کہ یہی وہ چیز ہے جو گناہگار سے گنہگار مسلمان کو چشم زدن میں تحت الثریٰ سے ملأ اعلیٰ تک پہنچا دیتی ہے۔

کفار کو اس بات کا غصہ ہے کہ ان ''مُسلوں'' کو جتنا حرام میں مبتلا کریں، گناہوں کے دلدل میں دھنسنے کے بعد بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت ان کے دل میں کہیں دور ایسی مضبوطی سے پیوست رہتی ہے کہ بس دل پر چوٹ لگنے کی دیر ہے، یہ ہوش میں آجاتا ہے اور اس کے دل میں سلگتی چنگاری لمحے بھر میں بھڑکتا شعلہ بن کر دشمنوں کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مغرب کے کم نصیب، توہینِ رسالت کا ارتکاب یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ مسلمان کو کالی کملی والے محبوب سے برگشتہ کریں گے، پر اُلٹا ہوتا یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ دیکھتے سنتے ہی ''محمڈن'' کے اندر چھپا مجذوب یکایک انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے اور دین سے بیزار ہونے کے بجائے اس پر چڑھا دنیا پرستی کا خول ٹوٹ کر اندر سے خالص بنیاد پرست قسم کا مسلمان صحیح سالم برآمد ہو جاتا ہے۔ یہ عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے جو ہمارے لیے مایۂ افتخار ہی نہیں، سرمایۂ نجات بھی ہے۔

شیر خان

لافانی کردار:

شیر خان سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو اس کی عمر تقریباً 21، 22 برس تھی۔ جوانوں میں عقابی روح بیدار ہونے کا فلسفہ اقبال کے کلام میں پڑھا تو تھا مگر عملاً ایسا کیسے ہوتا ہے؟ اس کا مشاہدہ شیر خان کو دیکھنے سے ہوا۔ شیر خان گٹھے ہوئے جسم اور مضبوط اعضا کا مالک پھرتیلا نوجوان تھا۔ اس میں عزم و ہمت اور حوصلہ و ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے تعلیم بالکل نہ پائی تھی لیکن اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کرتا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک، جسم میں ایسی پھرتی اور زبان میں ایسا اثر تھا کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ اس کا پانی بھرنے پر خود کو مجبور پاتے تھے۔ ہماری اس کی ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی اور چند دن کی رفاقت ایسی گہری شناسائی میں تبدیل ہوئی کہ سبحان اللہ! آج تک کوئی مشترکہ واقف ملتا ہے تو پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ شیر خان کی کچھ خیر خبر ہے؟ پرانے یار بیلی اکٹھے ہو جائیں اور شیر خان کا ذکر چھڑ جائے تو دوسرے تمام موضوعات اس وقت تک پس منظر میں چلے جاتے ہیں جب تک شیر خان کی باتیں چلتی رہیں۔ اس سے آپ اس کی مقبولیت اور دلوں پر گہرے اثر چھوڑنے کی صلاحیت کا اندازہ لگالیں حالانکہ وہ چٹا اَن پڑھ، پینڈو قسم کا دیہاتی اور اردو سے بھی نابلد تھا۔ یہاں میں وہ چند باتیں کروں گا جن کی وجہ سے شیر خان، شیر خان تھا اور جن کی وجہ سے وہ ہمیں کئی سال گزرنے کے بعد آج بھی ایسا ہی یاد ہے کہ کبھی نہ بھولے گا۔ شیر خان کا تذکرہ ان بھونچالی دنوں میں جبکہ مسلمانوں کے قتل و غارت اور علمائے کرام کی شہادت کے واقعات ہو رہے ہیں ہم نے کیوں چھیڑا، یہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا۔ پہلے وہ چند باتیں جن کی وجہ سے شیر خان جیسے لوگ لافانی کردار کے حامل بنتے ہیں۔

نرالا انداز:

دنیا میں بزدل بھی دیکھے اور بہادر بھی۔ تجربہ یہ ہوا کہ بہادر دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ جن کی فطرت اور طبیعت میں شجاعت کی صفت ودیعت کر دی گئی ہوتی ہے۔ یہ لوگ جب کسی خطرے کو محسوس کریں تو گھبرانے کے بجائے بے ساختہ طور پر اس کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں اور اسے ملیا میٹ کرنے پر تل جاتے ہیں...... دوسرے وہ جن کے اندر خوف کی لہریں جنم لے رہی ہوتی ہیں لیکن وہ اس پر قابو پا کر دشمن کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں۔ اس دوسری قسم کو آپ بزدلی اور بہادری کی بیچ کی قسم بھی کہہ سکتے ہیں۔ شیر خان کا تعلق پہلی قسم کے طبقۂ بالا سے تھا۔ بہت عرصہ پہلے محمد علی کے مدمقابل ایک باکسر بونا وینا کے بارے میں پڑھا تھا کہ اسے جتنا مارا جائے وہ اتنا ہی خونخوار بن جاتا تھا۔ آسان لفظوں میں اس کا فلسفہ یہ تھا: ''تم مجھے اذیت دو پھر میں تمہیں اذیت در اذیت دوں گا۔'' شیر خان کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ وہ خود کو جتنی زیادہ مشکلات میں گھرا ہوا دیکھتا اتنا ہی خطرناک ہو جاتا۔ ایسا لگتا اس کے اندر آتش گیر مادہ بھرا ہے جسے جتنی زیادہ حرارت دی جائے اتنا ہی بڑھکے گا۔ خوف نام کی کوئی چیز اس کو چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ مجاہدین کے مورچوں کے سامنے پہاڑ کے اوپر جہاں دشمن کے مورچے تھے، اس کے نیچے وادی

میں ایک گزرگاہ تھی، مجاہدین جب اس کو کراس کرتے تو نشیب میں ہونے کے سبب وہ جگہ ایسی تھی جہاں اوپر سے دشمن صاف دیکھ لیتا تھا کہ نقل وحرکت ہو رہی ہے۔ ایسے میں وہ بے تحاشا فائر جھونکتا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا تھا کہ جیسے ہی جھاڑیاں اور درخت ختم ہو کر کھلی جگہ شروع ہوتی تو مجاہدین جھک کر اس چھوٹی دیوار کی آڑ میں ہو کر بھاگتے بھاگتے اس جگہ کو پار کر لیتے جو اس راستے کے ساتھ ساتھ کھیت کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ یہ جگہ تقریباً 200 گز سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ کچھ مجاہدین اتنے نڈر اور بے خوف ہو گئے تھے کہ سیدھا چلتے ہوئے گزرتے تھے، جھک کر دوڑنے کو توہین سمجھتے تھے...... لیکن شیر خان کا تو انداز ہی سب سے نرالا تھا۔

ڈینجر زون:

اس کا طریقہ یہ تھا کہ درختوں میں چھپی پگڈنڈی سے نکل کر کھلی جگہ میں پہنچتے وقت جیب سے وائرلیس نکال کر کسی مورچے سے رابطہ کرتا اور انہیں کہتا کہ کوئی اعلیٰ قسم کی نظم لگا کر اسے سنائی جائے۔ کبھی نظم نہ ہوتی تو ساتھیوں سے بلا تکلف گپ شپ کرتے ہوئے مزے سے چہل قدمی کے انداز میں اس ''ڈینجر زون'' کو یوں عبور کرتا گویا کسی پر فضا باغ کی روش پر ہوا خوری کے لیے ٹہل رہا ہے۔ اس دوران وہ وائرلیس کا انٹینا کھول کر اونچا لہراتا تھا کہ دھوپ میں چمکے اور دشمن کو بغیر دوربین کے بھی نظر آئے۔ شیر خان اکثر کالے کپڑے پہنتا تھا (اس کی وجہ آگے چل کر بتاؤں گا) اور اکثر عین دوپہر میں وہاں سے گزرتا تھا۔ دشمن کو بھی اس کی یہ روٹین معلوم ہو گئی تھی۔ وہ اسے اپنی ہتک سمجھتا تھا اور جس تواتر سے آگ برساتا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کی بے خوفی سے سخت چڑا ہوا ہے اور ہر حالت میں اسے ہٹ کرنا چاہتا ہے۔ ادھر شیر خان کی شرارت...... یا حد سے بڑھی ہوئی بے خوفی...... دیکھیے کہ وہ کبھی کبھی اس دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا جو اس راستے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور مزے سے چمکتے انٹینا والے وائرلیس پر گپ شپ کرتا۔ اوپر سے پاگل گولیاں برس رہی ہوتی تھیں اور وہ نیچے مزے سے کھڑا دشمن کی جھنجھلاہٹ پر بے ساختہ مسکراتا اور اتنا خوش ہوتا کہ اس کی قلبی مسرت اس کے چہرے پر چمک رہی ہوتی تھی۔ ساتھی مجاہدین اس کو سمجھاتے تو تھے، منع کوئی نہ کرتا تھا کیونکہ سب جانتے تھے یہ ''وکھری ٹائپ'' کا بندہ ہے، مان کر نہ دے گا۔

حسنِ ظن:

شیر خان کو اُردو نہ آتی تھی اس نے جوانی اور نوجوانی کمیونسٹوں کے خلاف جہاد میں گزاری تھی۔ اس کو جہاد سے عشق تھا۔ جہاد اس کے رگ وپے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ سال کے کسی موسم میں بھی اس کو پاکستان ہجرت کرنے سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ سارا سال اپنا شوق ہی پورا کرتا رہتا تھا۔ سرحد پار نہ کرنے کے سبب اس کو اُردو کے چند الفاظ سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ یہ چند الفاظ اس کی زبان سے بہت اچھے لگتے تھے اور بڑا مزہ دیتے تھے۔ وہ ذہین اتنا تھا اور چہرہ اتنا اچھا پڑھ لیتا تھا کہ اس کی موجودگی میں جب پنجابی مجاہدین اپنی زبان میں بات کر رہے ہوتے اور باتوں کے بیچ میں ایک آدھ جملہ بھی اس کے بارے میں ہوتا تو وہ فوراً چوکنا ہو جاتا اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیتا کہ کیا سازش ہو رہی ہے۔ حسِ مزاح خوب پائی تھی۔ بہت اچھا مذاق کر لیتا تھا۔ اس کی خوداعتمادی بھی دیکھنے کے لائق چیز تھی۔ میں تو اس کو اللہ کے ساتھ اچھا گمان (حسن الظن باللہ) کہوں گا کہ کبھی بھی مایوس نہ ہوتا تھا۔ کبھی کوئی ایسی بات ہوتی جو بظاہر ممکن نہ ہوتی لیکن اس کا حوصلہ ٹوٹتا نہ تھا، وہ بڑے اعتماد سے کہتا: ''ابھی کوئی...... کہیں سے پیدا ہو جائے گا اور ہمارا یہ کام کر دے گا۔'' خالی جگہ میں وہ پشتو کا مخصوص لفظ استعمال کرتا تھا جو

اُردو میں ہلکی قسم کی گالی کے لیے بولا جاتا ہے لیکن پشتو میں ذومعنی ہے۔ ہنسی میں بولیں تو مزا دیتا ہے، غصے میں ہو تو برا لگتا ہے۔ پھر ہوتا بھی ایسا ہی تھا کہ وہ کام کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جاتا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے اسے خود اعتمادی کے بجائے پرورد گار کے ساتھ حسن ظن کا نام دیا ہے۔

قابلِ قدر:

اب میں آپ کو دور نہیں لے جاتا۔ اس بات کی طرف واپس آتا ہوں جس کی وجہ سے شیر خان جیسے ان پڑھ لوگ اسکالروں اور پروفیسروں سے زیادہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ شیر خان انتہائی غریب آدمی تھا۔ اس کو کئی بار پیش کش کی کہ ساتھ چلے اس کو مرضی کا کاروبار کرادیں گے۔ اس جیسے شخص کے سامنے ملازمت کا نام لیتے ہوئے زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں کچھ ''روکڑا'' بنالے تو پھر گرمیوں میں اکٹھے ساتھ آیا کریں گے...... مگر وہ ایسی باتیں سن کر پہلے تو خاموش رہتا جب اصرار کیا جائے تو ناراض ہو جاتا: ''مولوی صیب! آپ سے امارا دوستی جہاد کی وجہ سے ہے، اگر کاپر (کافر) سے جہاد سے علاوہ بات کریں گا تو مزا خراب ہو جائے گا'' اس کا کہنا تھا کہ افغانستان آزاد مسلمانوں کا وطن ہے۔ ہم اس پر کسی صورت میں کافر کا قبضہ برداشت نہیں کریں گے۔ ''دیکھتے نہیں اَم نے یہ کالے کپڑے کیوں پہنے ہوئے ہیں؟ جب تک وطن آزاد نہیں ہوگا ام دوسرا کپڑا نئیں پہنے گا۔'' غیر ملکی جارح اور پھر کاپر قسم کے جارح کے خلاف اس کا عزم اتنا قوی تھا کہ آگے بات کی گنجائش نہ رہتی تھی۔

مخصوص کھیل:

بندہ نے جب سنا کہ امریکا افغانستان پر حملہ آور ہو گیا ہے تو امریکی تھنک ٹینکس کی عقل پر حیرت ہوئی کہ کس کچھار میں گھس آئے ہیں اور کتنی جلدی صہیونیت کے جال میں اپنی قوم کو پھنسنے دیا؟ پھر جب معلوم ہوا کہ امریکا زمین پر اتر آیا ہے تو یوں لگا جیسے شکار چارہ کھانے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ افغانوں نے اسے نہایت خوبی سے اپنی مرضی کے میدان میں لا اتارا تھا اور اس دن سے آج تک اپنے مخصوص طریقے سے اس کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ گزشتہ ہفتے جب طالبان کے خلاف آپریشن کا غلغلہ بلند ہوا تو شیر خان کی یاد آئی۔ اس جیسے مجاہدین کی تو مراد برآئی ہوگی پھر جب تین دن بعد کسی اہم کامیابی کے بغیر آپریشن کے اختتام کا اعلان ہوا تو ایسا لگا جیسے شیر خان ڈینجرزون کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا مسکرا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس قوم میں شیر خان جیسے لوگ پائے جاتے ہیں اس کو ڈبل روٹی اور برگر کھا کر بدہضمی کی شکایت کرنے والی اقوام شکست نہیں دے سکتیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں، افغانستان کے پہاڑوں کا ہر پتھر یہی بات دُہراتا ہے۔ ضرورت کان لگا کر سننے اور عبرت پکڑنے کی ہے۔

غامدی نامہ

پردہ اُٹھتا ہے

غامدی صاحب کو دیکھنے کا پہلا اتفاق بندہ کو نوے کی دہائی میں ہوا۔ کراچی میں گورا قبرستان کے مدِ مقابل ایف ٹی سی کی بلڈنگ ہے۔ اس کے آڈیٹوریم میں غامدی صاحب کا ''چہرے کا پردہ'' کے موضوع پر بیان تھا۔ اس وقت ماشاء اللہ غامدی صاحب کا چہرہ اتنا کھدیڑا ہوا نہ تھا۔ اسلام کی پیروی کرتے ہوئے عمر گزرنے کے ساتھ انسان کے چہرے پر برکت اور نورانیت، ملائمت اور لطافت کی شکل میں نورانی ہالہ بنادیتی ہے۔ غامدی صاحب اس کائناتی آفاقی اُصول سے مستثنیٰ ہیں۔ آج کل وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہیں۔ اس وقت چالیس سے کچھ کم ہوں گے۔ ان دنوں ماشاء اللہ ان کی ''اچھی خاصی'' ڈاڑھی بھی تھی اور چہرہ مبارک بھی اتنا ''روشن'' اور کھلا ہوا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ گفتگو ان کی البتہ جتنی اس وقت پڑی سے اُتری ہوئی تھی آج کل یہ وصف اس سے کچھ سوا ہی ہے۔ گیا تو تھا بندہ ان کی گفتگو سننے...... لیکن ان کی ملغوبہ قسم کی باتیں اور موقف پر شدت آمیز اصرار نے ایسی طبیعت مکدر کی کہ جب سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا طبیعت مزید اس ماحول میں بیٹھنے کو تیار نہ تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جیسے ہی آڈیٹوریم سے نکلا ایک اور صاحب بھی اس وقت باہر تشریف لے آئے۔ بندہ کو ان کی شرعی صورت اور ساتھ میں مکمل پردے میں اہلیہ کو دیکھ کر شدید دکھ ہوا کہ کیسے کیسے لوگ سحر میں گرفتار ہوئے جارہے ہیں۔ مگر اس اللہ والے نے اس وقت جو جملہ کہا اس سے نہ صرف پریشانی دور ہوگئی بلکہ علمائے کرام کی محنتوں پر اطمینان بھی ہوا کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں جب تک درس کا حلقہ قائم اور دین کی دعوت جاری رکھیں گے تب تک ان شاء اللہ خیر ہے۔ حق باقی رہے گا اور باقی ہر چیز نے بہر حال فنا ہی ہونا ہے۔ اس شخص نے کہا: ''مولوی صاحب! یہ پرویزی لوگ ہیں جو اس قدر بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں؟'' گویا کہ ایک عام آدمی بھی ان کی گفتگو سے اس قدر بیزار ہوگیا تھا۔

اس کے بعد غامدی صاحب اُڑانیں بھرتے رہے۔ ان بیس پچیس سالوں میں ''دانش سرا'' کراچی سے لے کر ''المورد'' لاہور تک ان کے کام کو اگر دیکھا جائے تو ان پر حیرت ہوتی ہے کہ آنجناب کی تمام تر قوت اسلامی اقدار اور روایات کو متنازعہ بنانے، مسلمانوں کو اسلام کی مبارک حدود و قیود سے آزادی دلانے اور اکابرینِ اُمت کی توہین و تردید پر صرف ہورہی ہے۔ ان کی تحریر و تقریر میں اسلام کے مسلّمہ اُصولوں اور اجماعی مسائل کے خلاف تو آپ کو بہت کچھ ملے گا لیکن کسی ایک تحریر یا تقریر میں...... میں دُہراتا ہوں...... کسی ایک تحریر یا تقریر میں مغربی استعماریت، صیہونیت، صلیبیت، جدیدیت، سرمایہ داریت، اشتراکیت اور مستشرقین کے اسلام پر رکیک حملوں اور نازیبا الزامات کے خلاف ایک لفظ نہیں ملے گا۔ ان کا سارا زور اس پر ہے کہ ٹوپی نہ پہنی جائے۔ شلوار گھسیٹ کر چلا جائے۔ عورت کے سر پر چادر نہ رہے، وہ مردوں سے بے حجابانہ ہاتھ ملائے اور بے باکانہ گفتگو کرے تاکہ اسلام کی وہ حقیقی شکل لوگوں کے سامنے آئے جو مُلاؤں نے ''چھپا'' رکھی ہے۔ حدود اللہ میں ترمیم کی مہم کے ہراول دستے میں شمولیت کے بعد اب ان کا رُخ ہم جنس پرستی کی ترویج جیسے اہم عصری مسائل پر ہے۔ اس سے جو وقت بچ جائے

وہ مولویوں کی برائی اور غیبت میں صرف ہوتا ہے کہ انہیں کچھ اَتا پتا نہیں۔ حالانکہ آنجناب کو خود بھی مغربیت کی لادینیت، جدید فلسفہ، جدید فتنہ خیز نظریات، سائنس، ٹیکنالوجی کے بارے میں کچھ خبر ہے نہ ان کے حلقے میں ایسے افراد ہیں جوان چیزوں کا ذوق رکھتے ہوں۔ البتہ مُلّا حضرات نہ صرف راسخ علم اور استعداد رکھتے ہیں بلکہ وہ اسلامی تحقیقات اور عصر حاضر کے بارے میں بدرجہا بہتر اور تازہ معلومات رکھتے ہیں۔

گزشتہ سال بندہ لاہور گیا تو کچھ ساتھیوں نے کہا کہ ''آج'' نامی ٹی وی چینل پر حضرت غامدی صاحب چہرے کے پردے کے بارے میں لیکچر دے رہے ہیں جو دن میں کئی کئی مرتبہ دکھایا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی عالم اس کا جواب دے؟ بندہ کو یاد آگیا کہ یہ ربع صدی باسی کڑھی ہے۔ حیرت ہے کہ آنجناب کو پاکستانی معاشرے میں رائج برائیاں، بدعنوانیاں اور بے دینی کے رجحانات ختم کرنے پر ذرا توجہ نہیں، زور ہے تو اس پر کہ مردوں کے چہرے سے ڈاڑھی اور خواتین کے چہرے سے حجاب اُتر جائے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ اسلام کی نہیں، مغربی استعمار کی خدمت ہے۔ خدارا! اس دن سے ڈریے جب چودہ سو سال میں گزرنے والے اُمت کے باریش ولی اور باپردہ ولیات روزِ قیامت آپ کا گریبان پکڑ کر اپنی توہین کا حساب طلب کریں گے اور پوچھیں گی کہ تم پر کیا افتاد آپڑی تھی کہ اسلام کی آخری نشانیوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے؟ اسلام کی خدمت کے لیے تمہیں مسلمانوں کا حلیہ بدلنے کے علاوہ کوئی موضوع نہ ملتا تھا؟ خدارا سوچیے! اس وقت آپ کا جواب کیا ہوگا؟

آج کل غامدی صاحب کی علمیّت کا بڑا چرچا ہے۔ عوام میں اس طرح کی شہرت کا کوئی نوٹس بھی نہ لیتا لیکن جب خود غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں نے یہ دعویٰ شروع کیا کہ ''اسلامی دنیا میں ان کے پائے کا عربی دان اور عربی زبان وادب پر عبور رکھنے والا کوئی شخص نہیں نیز یہ کہ بڑے بڑے عرب علما ان سے استفادے کے لیے آتے ہیں اور جب غامدی صاحب عربی کے اسباق دیتے ہیں تو یہ علمائے عرب لغت کھول لیتے اور دانتوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں۔'' جب یہ تعلّی اور تکبر اہلِ علم کے سامنے آیا تو انہوں نے اس کی حقیقت جاننا اپنا فرض سمجھا۔ حال ہی میں کراچی سے شائع ہونے والے ایک ماہنامے ''ساحل'' (اپریل ومئی 2007ء) میں مشہور محقق ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کا تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے۔ سچ پوچھیے تو بڑے خاصے کی چیز ہے، پڑھا تو لطف آگیا۔ لکھنویوں کی اُردو، ندویوں کا انداز تحریر اور پھر پچاس سال سے عربی لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے والے صاحبِ علم کی طرف سے محاسبہ ومحاکمہ۔ پڑھتے جایئے اور سر دھنتے جایئے۔ غامدی صاحب کا جو حشر جناب ندوی کے ہاتھوں ہوا ہے لگتا ہے روزِ حشر قائم ہوگیا ہے۔ میزان رکھی جاچکی ہے (غامدی صاحب کی کتاب کا نام میزان ہے جو سرقہ کرکے لکھی گئی ہے) اور غامدی صاحب کی بے ہودگیاں تل تل کر باہر آرہی ہیں اور تول تول کر ان پر ماری جارہی ہیں۔

اب اس سے پہلے کہ آپ ڈاکٹر ندوی صاحب کی تحریر سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں، محوّلہ بالا ماہنامے کے اداریے سے چند سطریں پڑھ لیجیے تاکہ پس منظر وپیش منظر سمجھنے میں آسانی ہو:

''اس دعویٰ کے جائزے کے لیے ہم نے جاوید غامدی صاحب کے مطبوعہ کام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اپنی ساٹھ سالہ علمی زندگی میں انہوں نے صرف ایک سو بائیس صفحات عربی میں لکھے تھے۔ ان میں سے صرف بائیس صفحات ''الاعلام'' میں محفوظ ہیں جبکہ بقیہ سو صفحات جو عربی تفسیر ''الاشراق'' اور ''میراث'' پر ایک علمی رسالے کے لیے لکھے گئے تھے،

غامدی صاحب نے ضائع کردیے کیونکہ ان کے قلم سے لکھی گئی عربی ان کے عجمی محض ہونے کی داستان، بڑے کروفر سے سنا رہی تھی۔ اس کے باوجود ''المورد'' کی ویب سائٹ پر انہیں الاشراق، مثنوی، خیال و خامہ اور باقیات کا مصنف ظاہر کیا گیا ہے جبکہ یہ تصانیف آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ بائیس صفحات کے ایک ایک سطر اور ایک ایک جملے میں عربی قواعد، املا، انشا، زبان، بیان، صرف نحو کی بے شمار غلطیاں اسی طرح در آئی ہیں جس طرح ان کے فکر و نظر اعتقادات اور ایمانیات میں اغلاط اور الحاد کا گرد و غبار داخل ہو گیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ 1982ء میں لکھی گئی یہ غلط سلط عربی تحریر 5 اپریل 2007ء تک المورد کی ویب سائٹ پر جوں کی توں موجود تھیں یعنی ستائیس سال میں بھی غامدی صاحب اور ان کے حلقے کی عربی دانی کا ارتقا نہ ہو سکا۔ علامہ ساجد میر کے بھانجے مستنصر میر نے غامدی صاحب کے عربی رسالے میراث میں سو غلطیاں نکال دی تھیں۔ الاشراق نامی عربی مسودے کی لسانی اغلاط ڈاکٹر طاہر منصوری نے خط کے ذریعے واضح کر دی تھیں لہٰذا غامدی صاحب اس دفتر اغلاط سے دستبردار ہو گئے۔ غامدی صاحب نے الاعلام میں عربی دانی کے جو جوہر دکھائے تھے ان کا لسانی محاکمہ ڈاکٹر رضوان علی ندوی کے قلم سے پہلی مرتبہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ عربی تحریر نحوی اغلاط سے پُر اور بے معنی، بھونڈی، مہمل، رکیک، بے ربط اور پُر تصنع عربی نثر کا شہہ پارہ ہے جس میں انشا، املا، زبان و بیان، فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بے شمار غلطیاں ہیں۔ اسالیب عربی سے لاعلم یہ عجمی جو ایک مختصر نثر پارہ درست عربی میں لکھنے پر قادر نہیں، صحابہ کبار، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ائمہ، مفسرین اور ماہرین لغت کی عربی دانی کو حقارت سے رد کرتا ہے۔ یہ غرور علم انہیں فراہی اور اصلاحی سے ورثے میں ملا ہے۔ غامدی صاحب کی جہالت کا علم یہ ہے کہ 78ء سے 2005ء تک سنت پر یہ چودہ موقف بدل چکے ہیں۔ کبھی عورت کی ختنہ، ڈاڑھی، سنت تھی اب بدعت ہو گئی ہے۔ پہلے جمہوریت نظام کفر و شرک تھا آج دنیا کا عظیم ترین بلکہ الہامی نظام ہو گیا۔ جاوید غامدی مغربی فکر و فلسفے اور سائنس و ٹیکنالوجی کے علمی مباحث سے قطعاً لاعلم ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی اکیڈمی کا مرتبہ نصاب ہے جو اس جہالت کا آئینہ ہے۔ اشراق کے تیس سالہ فائل میں آپ کو کسی ایک مغربی فلسفی کا ذکر تک نہیں ملے گا۔ اس کے باوجود ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام اور مغرب کو یہ اپنے زور علم سے ملا دیں گے اور جدیدیت کی اسلام کاری فطری اصول پر کریں گے۔''

اب آئیے! جناب ندوی صاحب کی تحریر سے چند سطریں ہو جائیں:

''ان مختصر عربی مضامین کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے اندازِ بیان میں وہ عیب ہے جو عربی زبان میں ''عجمہ'' یعنی عجمیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی عربی تحریریں پڑھ کر یہ احساس اُبھرتا ہے کہ یہ عربی زبان کے عصری اسلوب سے بے خبر ہیں۔ انہوں نے بیسویں صدی کے مشہور ادبا مصطفیٰ صادق الرافعی، لطفی المنفلوطی، محمود احمد شاکر، طٰہٰ حسین، احمد حسن الزیات، احمد امین، احمد تیمور باشا وغیرہ مصری ادبا و علماء اور محمد کرد علی، خلیل مردم بک، بہجۃ البیطار، علی طنطاوی شامی اور اسی طرح عراق، سعودی عرب اور مراکش کے ادیبوں اور مصنفین کی تحریروں کو نہیں پڑھا ہے۔ ورنہ ان کی عربی کا وہ اسلوب نہ ہوتا جو مذکورہ بالا تحریروں میں ہے اور جس سے بوسیدگی کی بو آتی ہے۔ یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی طالب علم کے سامنے قدیم عربی کی کتابیں ہیں۔ وہ ان کے جملے، تشبیہات و استعارات اپنی تحریر میں منتقل کر رہا ہے۔

غامدی صاحب کی عربی نثر نحوی اغلاط سے پُر ہے۔ ان کی تحریروں میں نحو یعنی قواعد زبان کی ایسی غلطیاں ہیں کہ کسی عربی

کالج واسکول کا لڑکا بھی نہیں کرے گا۔ بلکہ دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے شائع ہونے والے عربی ماہنامے البعث الاسلامی میں لکھنے والے نوجوان ندوی بھی ایسی اغلاط نہیں کرتے۔ غامدی صاحب نے اپنے غرور علم (جس کی حقیقت واضح ہو چکی ہے اور مزید ظاہر ہوگی) میں ایک ایسا جملہ لکھ دیا ہے جس سے ہمارے اسلاف (صحابہ و تابعین) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت حسن البصری، مجاہد، ضحاک وغیرہ کی تغلیط وتضحیک ہوتی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں: **واما الذین قالو ان المراد به نجوم السماء، فانهم لم یتتبعوا کلام العرب حق التتبع، ولم یتأ ملوفیما یقتضی موقعه هنا، فلم یتبین لهم معناه، فاخطاؤا وجه الصواب.**" (اور جن لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد آسمان کے ستارے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کلام عرب کی اچھی طرح چھان بین نہیں کی اور نہ اس پر غور کیا کہ یہاں کس بات کا موقع ومحل ہے۔ اس لیے انہیں اس (ذات الحبک) کے معنی سمجھ میں نہیں آئے اور وہ غلطی کے مرتکب ہوئے۔)

معاذ اللہ! آپ کو معلوم ہے کہ اس انسان نے جو عربی کے چند جملے بھی صحیح نہیں لکھ سکتا، کس پر حملہ کیا ہے۔ امام حسن البصری وسعید بن جبیر جیسے تابعین اور طبری وزمخشری جیسے ادیب وماہرین لغت ومفسرین قرآن پر (ملاحظہ ہو: اس آیت قرآن کی تفسیر طبری اور زمخشری میں)، یہ وہ غرور علم ہے جو موصوف کو امین احسن اصلاحی مرحوم اور ان کو حمید الدین فراہی صاحب سے ورثہ میں ملا تھا۔"

جو لوگ سورۂ مائدہ کے لفظ "المحصنات" سے پاک دامن عورتیں مراد لیتے ہیں، ان کے متعلق غامدی صاحب نے حسب عادت کچھ طنزیہ الفاظ لکھے ہیں۔ ندوی صاحب فرماتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ غامدی صاحب کی اس تغلیط اور طنز کی ضرب کس پر پڑتی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد اور مفسر قرآن مجاہد پر اور ان کے بعد امام طبری پر جن کی تیس جلدوں کی تفسیر سے بارہ سو سال سے مسلمان فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کیا ان مقدس اور معتبر عرب ہستیوں کو لغت (زبان) قرآن کی فہم نہ تھی؟ اور وہ اس کے اسالیب سے لاعلم تھے؟ کہ آج ایک عجمی کو جو عربی زبان کا ایک پیراگراف بھی صحیح نہیں لکھ سکتا اور اپنی عربی تحریر میں املا اور نحوی اغلاط کا مرتکب ہوتا ہے اس کو یہ جرأت ہو کہ ان عظیم اسلاف پر طنز کرے جن کی عمریں قرآن کی شرح وبسط میں گزریں۔

ہم نے مضمون غامدی صاحب کی چند عربی تحریروں کے زبان کے نقطۂ نظر سے تنقیدی جائزہ لینے کے لیے شروع کیا تھا لیکن اس میں ان کے اور ان کے استاد الاستاد مولانا فراہی کے بعض تفسیری مباحث پر بھی گفتگو ہوگئی۔ قارئین کو یہ اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا ہوگا کہ جو شخص عربی الفاظ کا صحیح املا نہیں لکھ سکتا، جو غلط نحوی تراکیب اور عربی کے متروک اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرتا ہے، جن سب کی نشان دہی گزشتہ صفحات میں کر دی گئی ہے، اس کا عربی سے متعلق دعوائے زبان دانی کیا قیمت رکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی ان کی قلت نظر ان کے محدود مطالعے، ان کے غرور علم اور اسلاف کے خلاف ڈھکے چھپے انداز میں ان کی زبان درازی کی حقیقت بھی واضح ہوگئی ہوگی۔ وماتوفیقی الا باللہ اللّٰھم انا نعوذ بك من فتنة اللسان ومن فتنة القلم."

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ قصہ اس سے بھی کچھ آگے کا ہے۔ غامدی صاحب کی علمیّت کا عالم یہ ہے کہ اپنا نام تک صحیح نہیں لکھ سکتے۔ انہوں نے اپنی ایک عربی تحریر کے شروع میں درج تعارفی نوٹ جو بذاتِ خود مبہم اور یک گونہ مہمل ہے۔ (دیکھیے

منسلکہ عکس بشکریہ: ''ساحل'') کے آخر میں اپنا نام ''اَلغامدی'' لکھا ہے یعنی الف پر ہمزہ کے ساتھ۔ جبکہ دینی مدارس کے پہلے درجے کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ ہمزہ وصلی پر ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔ یہ عربی املا کا مسلمہ قاعدہ ہے۔ اس لرزہ خیز جہالت کے باوصف غامدی صاحب کے سر پر ایک زمانے میں قرآن کریم کے مقابلے میں آیات سازی کا جنون سوار تھا اور انہوں نے اپنے پاس سے چالیس مہمل، بے ربط اور رکیک جملے گھڑ کر انہیں آیات کا نام دے رکھا تھا اور اسے محفلوں میں سنایا کرتے تھے۔ اس روداد کے نقل کے لیے ہم ایک مرتبہ پھر ماہنامہ ''ساحل'' کے مشکور ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''1975ء میں جناب غامدی صاحب ممتاز اہل حدیث عالم علامہ ساجد میر کے بھانجے ڈاکٹر مستنصر میر کی دعوت پر سیالکوٹ تشریف لائے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک ممتاز راسخ العقیدہ گھرانے کا ہونہار فرزند غامدی صاحب جیسے عربی زبان سے ناواقف، دینی علوم اور مغربی علوم سے لاتعلق لاعلم فرد کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سہیل طفیل نشتر میڈیکل کالج میں سال دوم کے طالب علم تھے۔ (ڈاکٹر صاحب مستنصر میر کے خالہ زاد بھائی اور علامہ ساجد میر کے بھانجے جواب ممتاز ماہر قلب بھی ہیں) اور جس گھر میں رہتے تھے اس گھر کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی گلی میں میر خاندان کا ایک آبائی مکان جس کا نمبر 31\694 جو آج بھی موجود ہے اور جناب عبدالوکیل میر صاحب یہاں قیام پذیر ہیں۔ اس وقت اس گھر کے مالک عبدالرؤف میر تھے۔ جناب غامدی صاحب کی میزبانی کی سعادت اس مکان کو حاصل ہوئی۔ اسی مکان میں جناب غامدی نے قرآن کی وہ چالیس آیات پیش فرمائیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن کے چیلنج کا جواب ہے۔ مولانا میر ابراہیم سیالکوٹی جو رشتے میں علامہ ساجد میر صاحب کے رشتے کے نانا ہیں، سیالکوٹ میں ان کی مسجد، مسجد ابراہیمی میں غامدی صاحب نے سورۂ عصر کا درس بھی دیا تھا۔ چالیس فرضی آیات کی مجلس میں راقم بھی حاضر تھا۔ اس کے علاوہ اسد صدیقی، ڈاکٹر سہیل طفیل، برادر مستنصر میر، ڈاکٹر مستنصر میر، ڈاکٹر منصور الحمید، اسد صدیقی اور دیگر رفقائے خاص اس موقع پر موجود تھے۔ غامدی صاحب نے بعدازاں یہ آیتیں کتابی شکل میں اشاعت کے لیے منڈی مرید کے ایک کاتب سے کتابت بھی کرائی تھیں لیکن کتابت بہت ناقص تھی لہٰذا مسودہ روک دیا گیا۔ دریں اثنا ڈاکٹر مستنصر میر کی زجر و توبیخ کے باعث غامدی صاحب نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ ان کے اس حلقہ مریدین نے قبول بھی کر لی لہٰذا مسودہ ضائع کر دیا گیا۔ راقم کے پاس اس مسودے کا ایک ٹکڑا محفوظ رہ گیا تھا۔''

غامدی صاحب جس طرح اپنا نام صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اسی طرح وہ اپنا نام غامدی رکھنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں بتا سکتے۔ یہ بحث بھی بڑی دلچسپ ہے جسے آپ اس مضمون کے ساتھ لگے ایک چوکھٹے میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ غامدی صاحب اور ان کے شاگردانِ رشید سے ہماری گزارش ہے کہ دنیا چند روزہ ہے۔ اسلام اور مسلمان اس وقت ابتلا اور آزمائش کے عالم میں ہیں۔ توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے ورنہ سوچ لیجیے کہ آج انسانوں کی عدالت میں آپ اپنا ''نام'' رکھنے کی وجہ نہیں بتا سکتے تو کل احکم الحاکمین کی عدالت میں اپنے ''کام'' کی کیا جوابدہی کریں گے؟ اب بھی وقت ہے۔ پردہ اُٹھ تو گیا ہے اس کے چاک ہونے سے پہلے واپس آجائیے اور اس حرماں نصیب قوم کو مزید مذہبی آزمائشوں میں نہ ڈالیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اصلاح اور رجوع کی توفیق دے۔

ایک نام چار وجوہات:

غامدی صاحب کی ویب سائٹ www.ghamidi.org پر آپ کے تعارف میں درج ہے: ''ان کے دادا نورِ الٰہی کو

لوگ گاؤں کا مصلح کہتے تھے، اسی لفظ مصلح کی تعریب سے اپنے لیے غامدی کی نسبت اختیار کی اور اب اسی رعایت سے جاوید احمد غامدی کہلاتے ہیں۔'' مصلح خود عربی لفظ ہے اس کی تعریب سے غامدی کی نسبت اختیار کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آیا۔ مصلح غیر عربی لفظ تو نہیں کہ اس کی تعریب کی جا سکے۔ غامد کا مادہ (غ م د) ہے اور اس کے معنی چھپانے اور مستور رکھنے کے ہیں۔

ڈاکٹر رضوان علی ندوی کے نام ایک خط میں آپ نے غامدی کا پس منظر یہ بیان فرمایا تھا کہ آپ کے بچپن میں آپ کے والد محترم کے کوئی دوست عرب سے تشریف لائے تھے ان کے نام کا آخری حصہ غامدی تھا۔ آپ کے والد کو یہ نام اچھا لگا اور انہوں نے اسے آپ کے نام کا حصہ بنا دیا جبکہ (حدیث مبارک ابن ماجہ کتاب الحدود باب 36) میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے جو اپنے آباؤ اجداد کے سوا کسی دوسرے باپ کے ساتھ اپنی نسبت جوڑ دے۔

گزشتہ دنوں ڈین فیکلٹی آف ماس کمیونی کیشن، جامعہ پنجاب ڈاکٹر مغیث شیخ کراچی تشریف لائے تھے۔ ایک نجی محفل میں جہاں سجاد میر، طاہر مسعود صاحب اور انعام باری صاحب بھی موجود تھے۔ آپ کا لقب غامدی زیرِ بحث آیا تو مغیث شیخ صاحب نے آپ کے حوالے سے اس کی تصریح فرمائی: ''عربوں کا قبیلہ غامد فصاحت و بلاغت میں عالم عرب میں ممتاز تھا اسی مناسبت سے غامدی کنیت اختیار کی جس کے مجازی معنی ہیں ''عربی فصاحت و بلاغت میں ممتاز ترین شخص'' جبکہ تاریخ کے کسی تذکرے میں یمن کے غامدی قبیلے کی فصاحت و بلاغت کا کوئی ذکر نہیں اور عرب میں قبیلہ قریش افصح العرب تھا۔ اس فصاحت کی غامدی قبیلے تک منتقلی عجیب بات ہے۔

چوتھی روایت آپ کے حوالے سے یہ بیان کی گئی ہے کہ بنو غامد کی وہ خاتون جنہیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اعترافِ گناہ کے بعد سنگسار فرما دیا تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بعض نار وا الفاظ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: ''اگر غامدیہ کی توبہ مدینہ پر تقسیم کردی جائے تو سب کے لیے کافی ہوگی۔'' اس خاتون کے اکرام و احترام میں آپ نے غامدی کی نسبت اختیار فرمائی ہے۔ یہ چار وجوہات ہوگئیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے اور یہ معمّا کب حل ہوگا؟

ذکر ایک عالمی شاہکار کا

غامدی صاحب کی عربی دانی کا حال آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ زندگی بھر (آنجناب کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے) کا کل عربی سرمایہ 122 صفحات ہیں۔ ان میں سے سوکو آپ نے اس لیے خود ضائع کر دیا کہ وہ ان کے خیال میں عربی علوم میں عجمی مہارت اور تحقیق واجتہاد کے پردے میں جاہلانہ یاوہ گوئیوں کی حقیقت آشکارا کرتے تھے۔ جو بائیس صفحات غامدی صاحب کی سائٹ پر موجود ہیں، اللہ جھوٹ نہ بلوائے ان میں سے ہر ایک میں 22 سے زیادہ غلطیاں ہیں۔ غلطیاں محض تعبیر واسلوب کی نہیں کہ کوئی کہہ سکے اس طرح کی اصلاح تو ہر ایک کے کلام پر ہوسکتی ہے...... نہ حضور نہ...... یہ غلطیاں اس قسم کی ہیں کہ درجۂ اولیٰ کے طالب علم دیکھیں تو اُنگلیاں دانتوں تلے دبالیں اور منتہی طلبہ پڑھیں تو انہیں زمین آسمان کی نبضیں تھمتی محسوس ہوں۔ آزمائش شرط ہے اور ثبوت کے طور پر مزید ایک صفحہ پیش خدمت ہے جس پر محترم ڈاکٹر رضوان ندوی صاحب کی اصلاح موجود ہے۔ یوں تو پورا صفحہ پڑھنے کے بجائے ایک نظر ڈالنا کافی ہے کہ غلطیاں یوں بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں جیسے کسی چیچک زدہ منہ پر پھیلے ہوئے مواد بھرے دانے۔ البتہ اتنی درخواست ہے کہ پچھلے شمارے میں چھپے عکس کا آخری جملہ اور اس پر ڈاکٹر ندوی صاحب کا تبصرہ ضرور پڑھ لیجیے۔ طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"فبهـذا السبب كان عمل أعضاء هذا النوع من الأحزاب أن يقضوا طيلة حياتهم لحصول النجاة من سوء نتائج حسابهم هذا."

پڑھیے اور داد دیجیے کہ ایسی بے معنی، مہمل، بھونڈی، رکیک اور جملہ عیوب سے آراستہ عربیت اور اس پر متکبرانہ دعویٰ کہ غامدی مکتب فکر ہی عصر حاضر کا وہ طبقہ ہے جو قرآن کی روح سے واقف اور اس کے مزاج سے آشنا ہے۔ خود ساختہ فتنہ انگیز مسائل پر دانش وری بگھارنا صرف اس کا حق ہے، آنے والا دور صرف ان کا ہے اور دبستان شبلی کا واحد اور حقیقی جانشین صرف وہی ہے۔

اسلامی علوم اور عربیت میں غامدی صاحب اور ان کے لائق شاگردوں (جو 27 سال میں اپنے استاذ کی لکھی ہوئی چند سطریں پڑھ کر ان کی اصلاح نہ کر سکے) کی اہلیت ومہارت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اسی سے ان کے فتویٰ نما دعوؤں کی علمی حیثیت اور شرعی مسائل پر مجتہدانہ تبصروں کی حقیقت آپ پر واضح ہوگئی ہوگی۔ لے دے کے آنجناب کی پونجی میں ایک چیز ایسی رہ جاتی ہے جس کی بنا پر وہ پاکستان کے سب سے بڑے اسکالر ہونے کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور وہ ہے جدید علوم سے واقفیت اور انگریزی دانی۔ آئیے! اس محروم تمنا مکتب فکر کے اس دعوے کی حقیقت کا جائزہ بھی لگے ہاتھوں لیا جائے۔ واضح رہے کہ اس تمام تحقیق اور انکشاف کا کریڈٹ ماہنامہ "ساحل" کو جاتا ہے جس نے عصر حاضر کے فتنے کا پول کھولنے کا کارنامہ انجام دیا اور اس تحقیقی انداز سے انجام دیا کہ غامدی صاحب کو دفاع کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔

غامدی صاحب کی انگریزی دانی:

دبستان غامدی سے وابستہ جدیدیت پسندوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت الشیخ الغامدی کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ انگریزی میں مہارت کے ثبوت میں آنجناب کی انگریزی میں فرمائی گئی شاعری کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ شاعری 64 مصرعوں پر مشتمل چار نظموں کو ''محیط'' ہے اور قطع نظر اس کے کہ عربی نثر سے زیادہ بے تکی، مضحکہ خیز اور غنائیت، سلاست وشعریت سے محروم ہے، اسے سرقے کا عالمی شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ غامدی صاحب کی چار نظموں پر مشتمل ''بھان متی کا کنبہ'' انگریزی کے مشہور شعرا کے کلام سے اینٹ روڑے چرا کر جوڑا گیا ہے۔ یقین نہ آئے تو منسلکہ موازنہ پڑھ لیجیے اور غامدی صاحب کے حوصلے کی داد دیجیے کہ کس بے باکی اور جی داری سے نامی گرامی شعرا کی مشہور زمانہ نظموں سے سرقہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اس پر تعجب تو ہوا لیکن کچھ خاص نہیں اس لیے کہ حضرت غامدی صاحب جب صحابہ کرام وتابعین عظام رضی اللہ عنہم نیز ائمہ مجتہدین اور اُمت کے اکابرین کے علمی مقام ومرتبے کا لحاظ نہیں رکھتے تو انگریزی شعرا کی کیا حیثیت کہ ان کے کلام پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے انہیں کچھ جھجک محسوس ہوئی ہوگی یا تکلف آڑے آیا ہوگا۔

غامدی صاحب کی جدید علوم سے واقفیت:

اس بات کا پرچار بھی بڑے زور وشور سے کیا جاتا ہے: ''غامدی صاحب، مغربی فکر وفلسفے پر عبور رکھتے ہیں جبکہ علمائے کرام اگرچہ دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہیں لیکن جدید علوم اور سائنس وفلسفہ سے آشنا نہیں اس لیے سکہ بند قول تو وہ ہے جو حضرت الغامدی صاحب کی زبان عالی سے ارشاد ہو۔ مانا کہ غامدیین کو عربی یا انگریزی نہیں آتی، اسلامی علوم میں عبور نہیں، لیکن یہ پڑھا لکھا روشن خیال طبقہ مغرب اور مغربی علوم سے تو واقف ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ قدیم یونانی منطق وفلسفہ (جس میں اہلِ مدارس محققانہ بصیرت رکھتے ہیں) کی طرح غامدی صاحب اور ان کے شاگردانِ رشید جدید مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کی حقیقت سے بھی واقف نہیں۔ اس کی دو دلیلیں ہیں:

(1) غامدی صاحب کے قائم کردہ اکیڈمی ''المورد'' کے نصاب میں (یہ مشکل عربی لفظ بیروت سے چرایا گیا ہے) جدید علوم، فلسفہ، سائنس، سوشل سائنسز شامل تھے نہ ہیں۔ یونانی فلسفہ تو ویسے ہی شامل نہیں۔ مغربی فکر وفلسفے پر پورے غامدی مکتب فکر کا کوئی کام نہیں۔ اور غامدی صاحب تو کیا ان کے استاذ محترم امین احسن اصلاحی صاحب اور استاذ الاستاذ حمید الدین فراہی صاحب دونوں حضرات بھی مغربی فکر وفلسفے سے قطعاً ناواقف تھے۔ جب بانیانِ مکتب کا یہ حال ہے تو وابستگانِ مکتب کی حالت جانچنا کچھ مشکل نہ ہونا چاہیے۔

(2) غامدی صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں کتابی شکل میں اُردو نثر کے نو سو صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ ان تمام تحریروں میں ایک جگہ کے علاوہ کسی مغربی فلسفی یا مفکر کا کوئی حوالہ نہیں ملتا اور جو پہلا اور آخری حوالہ مغربی فلسفی ہیگل کا انہوں نے دیا ہے وہ مکمل طور پر غلط ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مذکورہ بالا ماہنامہ مئی 2007ص: 29،93) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم وجدید علوم کا جامع ہونے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ حضرات جو جدید فلسفہ پر ایک سطر نہیں لکھ سکے جدید فلسفیانہ مباحث کو سمجھنے یا اس پر نقد کرنے کی کیا اہلیت رکھتے ہوں گے؟

چند عاجزانہ گزارشات:

اس عاجز کو اندیشہ ہے کہ اس تحریر میں کچھ سخت الفاظ آگئے ہوں گے۔ اللہ شاہد ہے کہ یہ سب کچھ محض اہالیانِ وطن کے ایمان کی حفاظت کے پیشِ نظر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غامدی صاحب...... حدود اللہ میں ترمیم سے لے کر ہم جنس پرستی کے جواز تک...... جس مہم کو لے کر چل رہے ہیں اور جن گمراہانہ خیالات وافکار کی وہ اشاعت کر رہے ہیں، اس سے جو شر وفتنہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں پھیل رہا ہے، یہ ملک وملت کے لیے انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے۔ لہٰذا:

☆...... غامدی صاحب سے درخواست ہے کہ آپ نے آج تک اسلام کے دفاع اور مستشرقین کے اسلام پر حملوں کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا، نہ سہی، لیکن خدارا! اُمت کے اجتماعی اور متفقہ مسائل میں اختلاف کا رخنہ ڈال کر اپنا اور قوم کا ایمان برباد نہ کیجیے۔ ایک نئے فرقے کا اضافہ نہ کیجیے اور روزِ محشر کی حشر سامانیوں سے ڈریے! جہاں کوئی سایہ، کوئی پناہ گاہ نہ ہوگی۔ آپ آج خلقِ خدا کے سامنے اپنے ایک دعوے کو درست ثابت نہیں کر سکتے، کل عالم الغیب کے سامنے اُمت کی بھنور میں پھنسی کشتی کو مزید ہچکولے دینے پر کیا جواب دیں گے؟

☆...... غامدی صاحب کے شاگردوں سے گزارش ہے کہ وہ ہر طرح کے تاثر اور تعصب سے پاک ہو کر پیش کیے گئے دستاویزی ثبوتوں کی روشنی میں سوچیں اور غور کریں کہ کہاں اجتہاد کا مقدس علمی منصب اور کہاں یہ ہفوات اور علمی سرقے؟ جو شخص عربی کی ابتدائی باتیں نہیں جانتا، اپنا نام صحیح نہیں لکھ سکتا، اسے اپنا امام، شیخ یا مقتدا ماننا اور اس کی تقلید کرتے ہوئے اُمت کے متفقہ موقف سے انحراف کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟

☆...... جو چینل مالکان غامدی حضرات کو اہلِ علم ودانش سمجھ کر اپنے چینل پر وقت دیتے ہیں، وہ بلاوجہ دہرے گناہِ بے لذت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قوم کے نظریات میں بھی الحاد پیدا ہو رہا ہے اور علم کے نام پر جہالت اور دین کے نام پر بے دینی بھی پھیل رہی ہے۔ ان حضرات کو اگر ہم مُلاؤں کی بات پر یقین نہ آئے تو غامدی صاحب سے انٹرویو کر کے ان سے ان کے نام کا معنیٰ پوچھ لیجیے۔ آپ پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قلبِ سلیم عطا فرمائے۔

☆...... میرے جو ہم مذہب وہم وطن بھائی غامدی صاحب کی علمیت وصلاحیت اجتہاد کے معترف ہیں از راہ کرم وہ اتنا کرلیں کہ کسی پروگرام کے سوال وجواب کے سیشن میں ان سے یا ان کے شاگردوں سے جناب ڈاکٹر ندوی صاحب کی طرف سے نشان زدہ غلطیوں کے متعلق پوچھ لیجیے کہ آپ چند سطریں درست طرح سے نہیں لکھ سکتے تو ضخیم تفاسیر اور ذخیرہ احادیث سے کیسے استفادہ کر لیتے ہیں؟ چلیں جانے دیجیے بائیس صفحات ضرب بائیس اغلاط کو، صرف مذکورہ بالا عربی جملے (جو مضمون کے شروع میں گزرا) کا مطلب بتا دیجیے۔ اگر غامدی مکتبِ فکر کے دو تین مجتہدین اور پانچ دس مفکرین مل کر اپنے مجتہدِ اعظم کے ایک جملے کو درست ثابت نہیں کر سکتے تو میرے سادہ لوح ہم وطن بھائیوں کو مان لینا چاہیے کہ علمائے حق جو بات کر رہے ہیں للہ فی اللہ کہہ رہے ہیں۔ وہی درست ہے اور جو کچھ چینلوں پر بگھارا جا رہا ہے، غلط، الحاد، یہودی اور عیسائی مستشرقین کا پڑھایا ہوا سبق اور محض شیخی خوری ہے جس کا علمائے کرام سے جواب پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

☆...... میرے جو نوجوان دوست علمائے کرام کے بیانات میں دلچسپی نہیں لیتے کہ اس کے لیے ٹوپی پہن کر مسجد جانا پڑتا

ہے اور چینلوں پر آنے والے ڈاکٹرز، اسکالرز کو پسند کرتے اور ان کی آزاد خیالی سے لطف اندوز ہو کر ان کو دین کا حقیقی ترجمان سمجھتے ہیں، ان سے التماس ہے کہ منسلکہ شاعری پڑھیے۔ یہ بے جا اور مضحکہ خیز کلام کیا اس قابل ہے کہ Percy Wyndham Lewis کی مرتبہ کتاب The Stuffed owl میں شامل کیا جاسکے؟ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کے مرتب نے انگریزی کے بھونڈے اشعار سے نادر انتخاب کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی سوچیے! کیا آپ کا دل مانتا ہے جو شخص عالمی سطح کے معروف کلاسیکل لٹریچر پر اس دھڑلے کے ساتھ ہاتھ صاف کر سکتا ہے وہ آپ کو قرآن وحدیث کے حوالے دیتے وقت (جن کا پس منظر آپ قطعاً نہیں جانتے) انصاف ودیانت سے کام لیتا ہوگا؟ نہیں میرے عزیز! ہرگز نہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب توبہ کریں نہ کریں آپ کو ان کی عقیدت سے توبہ کر لینی چاہیے۔ علمائے کرام جیسے بھی ہوں کم از کم دینی معلومات کی فراہمی میں بددیانتی سے کام نہیں لیتے۔ یہ وہ وصف ہے جو آپ کو نام نہاد ڈاکٹرز، اسکالرز کے ہاں نہ ملے گا۔ کسوٹی ہم نے آپ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ حقیقت کو پرکھنا اور ہدایت کی تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی راہنمائی فرمائے اور ہر قسم کے فتنے سے میری اور آپ کی حفاظت فرمائے۔

بھان متی کا کنبہ

غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر آج کل اپنے اجتہاد جدید کی روشنی میں وطن عزیز کو چکا چوند کرتی روشنیوں اور دما دم کرتی روشن خیالیوں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے اُمت کے تمام پہلے اور پچھلے اہلِ علم کی تحقیقات کی نفی کرتے ہوئے قرآن کریم سے براہِ راست استنباط اور نام نہاد اجتہاد کی طرح ڈالی ہے۔ اب یہ تو دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ علوم عربیت سے ان کی واقفیت اور جدید مغربی علوم سے ان کی شناسائی کس قدر ہے؟ آیئے! آج ذرا قرآن فہمی کے حوالے سے ان کے کام کا جائزہ لیتے ہیں جو ان کی تمام کاوشوں کی بنیاد اور سہارا ہے۔ قرآن فہمی کے جھوٹے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے ان کا پہلا اور آخری سہارا عربیت دانی کا دعویٰ ہے کہ وہ عربی لغت اور ادب عربی کو اتنا اچھا سمجھتے ہیں کہ اس کے سہارے قرآن کے معنی و مفاہیم کو خود سے متعین کر سکتے ہیں۔ چاہے اس سے اجماع کا انکار ہو، اسلام کے مسلمہ احکام کی تردید کرنا پڑے یا پھر سرے سے خود قرآن ہی سے ہاتھ دھولیا جائے۔ آنجناب کو ''عربی مُعلّٰی'' (بامحاورہ عربی) جاننے کا بڑا زعم ہے اور ان کا یہ فرمان مستند سمجھا جاتا ہے کہ خالص عربیت کو سامنے رکھ کر قرآن کا معنی متعین کرنے میں ان کا مدِّ مقابل کوئی نہیں ہے۔ یہ دعویٰ اتنا ہی لچر اور بے اصل ہے جتنی آنجناب کی عربی سے واقفیت کا زعم۔ ہم اگر اپنے قارئین کو یہ حقیقت سمجھنے سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ان کی عربیت سے واقفیت اتنی ہی ہے جتنی ملعون رشدی کی انگریزی سے تو یہ سمجھنے میں مشکل نہ رہے گی کہ ملعون کو ''سر'' کا خطاب اور غامدی صاحب کو ''اسکالر'' کا اعزاز کس مقصد سے ملا ہے؟ ملعون رشدی اور غامدی صاحب میں قدرِ مشترک صرف یہی نہیں کہ جہالت عظمیٰ کے علی الرغم وہ مغرب کی طرف سے پشت پناہی اور کفالت وحمایت کے حق دار سمجھے جاتے ہیں بلکہ توہینِ رسالت کے پہلو کے حامل کچھ جملے جناب غامدی صاحب کی طرف بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔ دیکھیے منسلکہ کتاب۔

آیئے! تعصب اور جانبداری کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان ''مجتہدینِ عصر'' کے اس دعوے کھلے دل اور کھلی نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اگر اس کی حقیقت آشکارا ہو جائے تو ان کے بقیہ اُٹھائے ہوئے مباحث کی حقیقت سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ہم پہلی مثال ذرا تفصیلی، دوسری مختصر اور بقیہ 6 مثالیں بہت ہی مختصر دیں گے۔ کیونکہ یہ کوئی مقالہ تو ہے نہیں، بات سمجھنے سمجھانے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ جتنی صاف ستھری، براہِ راست اور پیچیدگی سے پاک ہو اتنی ہی مفید رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اسے میری قوم کے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔

سورۂ اعلیٰ میں ہے: ''وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی.''

اپنی اُلٹی تفسیر ''البیان'' (اس کو بعض صاحب ذوق اُلٹی تفسیر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ آخری سپارے سے الٹی طرف لکھی جا رہی ہے۔ پہلی جلد میں سورۂ ملک سے سورۂ ناس تک کی تفسیر ہے، بقیہ جلدیں نامکمل ہیں) میں غامدی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اور جس نے سبزہ نکالا پھر اسے گھنا سرسبز و شاداب بنا دیا۔'' (البیان: صفحہ 165)

اس کے علاوہ غامدی صاحب کے فکری و نظریاتی ''امام'' امین احسن اصلاحی بھی اس مقام کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''اور

جس نے نباتات اُگائیں، پھر ان کو گھنی سرسبز و شاداب بنایا۔'' (تدبر قرآن: 9\311)

یہ دونوں ترجمے بالکل غلط ہیں اور یہ بات ہم اتنی قطعیت کے ساتھ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس ترجمے اور مفہوم پر درج ذیل اعتراضات ہوتے ہیں: (1) یہ ترجمہ ومفہوم عربیت کے خلاف ہے۔ عربی زبان کی کسی لغت میں ''غثـــاء'' کا لفظ ''گھنے سبزے'' کے معنوں میں نہیں آتا۔ (2) یہ ترجمہ خود قرآن مجید کے نظائر کے خلاف ہے۔ (3) یہ ترجمہ احادیث کے شواہد کے بھی خلاف ہے۔ (4) یہ ترجمہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال کے بھی خلاف ہے۔ (5) یہ ترجمہ اجماعِ اُمت کے بھی خلاف ہے کیونکہ کسی مفسر نے آج تک ''غثاء'' کے معنی ''گھنے سبزے'' کے نہیں کیے۔ (6) یہ ترجمہ اُردو کے تمام مترجمین کے ترجموں کے خلاف ہے۔ آج تک کسی ایک مفسر نے ان آیات کا یہ ترجمہ نہیں کیا۔

اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''اور جس نے سبز چارہ نکالا اور پھر اسے سیاہ کوڑا بنا دیا۔'' اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہر چیز کی چمکتی دمکتی ابتدا و عروج اور پھر جلد ہی بھولا بسرا فنا و زوال سمجھانا چاہتے ہیں۔ آیت کا جو معنی ہم نے بیان کیا ہے اس کی تائید حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ خود اصلاحی صاحب کے دوسری جگہ ترجمے سے بھی اور اُردو کے تمام مترجمین کے ترجموں سے بھی۔

☆ حدیث شریف سے اسی معنی کی تائید یوں ہوتی ہے کہ قیامت کے بارے میں ایک حدیث میں ''غثـــاء'' کا لفظ یوں آیا ہے: ''كما تنبت الحبة فى غثاء السيل'' (سنن دارمی: 1\61، مسند احمد: 12013) ''جیسے سیلاب کے خس و خاشاک میں دانہ اُگتا ہے۔''

☆ خود تدبر قرآن میں غامدی صاحب کے ''امام'' امین احسن اصلاحی نے جہاں قرآن میں دوسرے مقام پر ''غثاء'' کا لفظ آیا ہے اس کا ترجمہ خس و خاشاک ہی کیا ہے: ''فأخذتهم الصيحة بالحق فجعلنهم غثاء'' (المؤمنون: 41) ''تو ان کو ایک سخت ڈانٹ نے شدت کے ساتھ آ دبوچا۔ تو ہم نے ان کو خس و خاشاک کر دیا۔'' (تدبر قرآن: جلد 5، صفحہ 312)

اس طرح خود ان کے اپنے ترجمہ میں صریح تضاد ہے اور ایک ترجمہ یقیناً غلط ہے۔ قرآنی لفظ غثاء کے معنی ''امام صاحب'' ایک جگہ خس و خاشاک اور دوسری جگہ ''گھنی سرسبز یا گھنا سبزہ'' کے لیتے ہیں ع

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

☆ اردو کے قدیم وجدید تمام مترجمین و مفسرین نے بالاتفاق اس آیت کا ترجمہ خس و خاشاک اور سیاہ کوڑا کیا ہے۔ کیا یہ سب حضرات عربیت سے نابلد تھے اور ان کو عربی نہیں آتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مذکورہ آیت کے ایک ہی ترجمے اور مفہوم پر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ سمیت پوری اُمت مسلمہ کے مفسرین متفق ہیں تو یہی ترجمہ لغت کی رو سے درست ہے۔ قرآن و حدیث کے نظائر و شواہد کے مطابق بھی یہی ترجمہ ہے۔ اس سے ہٹ کر اس آیت کا کوئی اور ترجمہ اخذ کرنا گمراہی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں!!

الغرض سورۂ اعلیٰ کی زیر بحث آیات کا وہی مفہوم صحیح اور معتبر ہے جس کی تائید لغت سے ہوتی ہے اور جس کی موافقت قرآنی نصوص اور نظائر سے بھی موجود ہے اور جو اُمت مسلمہ کے تمام جلیل القدر مفسرین کرام کی متفقہ تفسیر کے بالکل مطابق ہے۔ غامدی صاحب اور ان کے شیخ اجل کے ذوقِ اختلاف اور شوقِ اجتہاد نے یہاں ان سے وہ سنگین غلطی کروائی ہے، جس سے ان کی اہلیت کی قلعی بالکل اس طرح اُتر گئی ہے جیسے نقلی زیور کی پالش ایک دھوپ کھاتے ہی پول کھول دیتی ہے۔

دوسری مثال:

"وَالسَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا بِأَيْدٍ وَّإِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ." (الذاریات: 47)

غامدی کے شیخ اور امام، اصلاحی صاحب اس آیت کا پہلے یہ ترجمہ کرتے ہیں: "اور آسمان کو ہم نے بنایا قدرت کے ساتھ اور ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں۔" پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "أیـد کے معروف معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ قوت و قدرت کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت و عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے سر پر پھیلے ہوئے آسمان اور اس کے عجائب کے اندر کرسکتا ہے۔" (تدبر قرآن: 7\626)

اس مقام پر مولانا اصلاحی صاحب کی سنگین غلطی یہ ہے کہ انہوں نے لفظ "أیـد" کو "یـد" کی جمع سمجھ لیا جو کہ قطعاً غلط ہے۔ "أید" کے معنی طاقت اور قوت کے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے: "واذکر عبدنا داؤد ذاالأید" اور ہمارے بندے داؤد کا تذکرہ بیان کرو جو قوت والا تھا۔ جمہور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔ اب سوچنے کی یہ بات ہے کہ جو لوگ قرآنی الفاظ کے مادوں (Roots) ہی سے بے خبر ہوں اور اس کے دو مختلف الفاظ میں امتیاز نہ کر سکتے ہوں، ان کی عربیت پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اور جب استاد کی عربیت کا یہ حال ہے تو شاگردوں کی تفسیر اور من مانے اجتہادات کا کیا حال ہوگا؟؟

تحریفِ قرآن کی چند مختصر مثالیں:

غامدی صاحب کے ہاں تحریف قرآن، تلعب بالقرآن اور مذموم تفسیر بالرائے کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ تفصیلی مثالوں کے بعد ذیل میں ہم ان کی کتاب "البیان" سے چند مختصر مثالیں بلا تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ اہلِ علم غور فرمائیں اور عوام اپنے ایمان کی حفاظت کی فکر کریں کہ یہ لوگ انہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں جن کے دعوائے اجتہاد کی واحد دلیل معیار اتنا ہی ہے جتنا عقل کو گالی دینے والی بات کا ہوتا ہے۔

(1) سورۃ اللہب میں "تَبَّتْ یَدَآ أَبِیْ لَهَبٍ" کا ترجمہ یہ کیا ہے: "ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے۔" پھر اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "یعنی اس کے اعوان و انصار ہلاک ہوئے۔" (البیان ص: 260، تاریخ اشاعت ستمبر 98ء لاہور) کوئی بتائے کہ "ید" (ہاتھ) کا ترجمہ بازو کس قانون سے کیا ہے؟

(2) سورۃ الاخلاص میں "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: "وہ اللہ سب سے الگ ہے۔" (البیان، صفحہ: 261) "أحد" کا ترجمہ "الگ" کس قاعدے سے کیا گیا ہے۔ یہ تو "أبدا، أحدٌ" کی تختی پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ "أحد" کے معنی ایک ہیں۔

(3) سورۃ الفیل میں "تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ" کا ترجمہ یہ کیا ہے: "تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر انہیں مار رہا تھا۔" (البیان، صفحہ 240) انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علمائے کرام غور فرمائیں "ترمیهم" کو یہ شخص واحد حاضر کا صیغہ سمجھ رہا ہے۔ یہ غلطی تو درجہ صرف کا نا سمجھ بچہ بھی نہ کرے گا۔

(4) سورۃ البروج میں "قُتِلَ أَصْحٰبُ الْأُخْدُوْدِ o النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ." کا یہ ترجمہ کیا ہے: "مارے گئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے۔" (البیان، صفحہ: 157)

اور پھر اس کی تفسیر یوں فرمائی ہے: "یہ قریش کے ان فراعنہ کو جہنم کی وعید ہے جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے

ظلم وستم کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو دوزخ کی اس گھاٹی میں پھینک دیے جائیں گے جو ایندھن سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی آگ نہ کبھی دھیمی ہوگی اور نہ بجھے گی۔" (البیان، صفحہ 157) ہمارا دعویٰ ہے کہ غامدی صاحب سے پہلے دنیا کے کسی مفسر نے اس آیت کا مصداق قریش کو نہیں مانا۔ یہ تو اقوامِ سابقہ میں سے "خندق والوں" کے نام سے مشہور قصے کا ذکر ہے جو جمہور مفسرین کے مطابق یمن میں پیش آیا تھا۔

قارئین محترم! یہ ہیں سابقہ محمد شفیق لکھے زئی عرف کا کوشاہ اور حالیہ جاوید احمد غامدی صاحب (یہ داستان بھی بڑی دلچسپ ہے اور بشرطِ زندگی قارئین کی امانت ہے) کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کی حقیقت جو آج کل کبھی پس پردہ اور کبھی پردۂ اسکرین پر آکر تحریفِ قرآن کی رسم زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ فتنہ انکارِ حدیث کی آبیاری کررہے ہیں۔ صہیونی مستشرقین کی اختراع کردہ روشن خیال اعتدال پسندی (Enlightened Moderation) کی پُرجوش نمایندگی فرمارہے ہیں اور دینِ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کررہے ہیں تاکہ یہودی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کرسکیں جو انہوں نے عیسائیت اور عیسائیوں کے ساتھ کیا۔ جہاں تک اظہارِ حقیقت کی بات ہے تو علمائے کرام نے اپنا فرض ادا کردیا اب جہاں تک اقرارِ حقیقت کی بات ہے یہ آپ کا اور آپ کے ایمان اور ضمیر کا معاملہ ہے۔ میں اپنے اور آپ کے ایمان کو اللہ ربّ العزت کی پناہ میں دینے کی دعا کرتا ہوں جس کی نظر کرم ہو تو فتنہ خیز زہریلی ہوائیں کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

بات کیا ہے؟

قارئین کرام! آپ سوچتے ہوں گے غامدی صاحب کی سرپرستی کرنے والی قوتیں اور خود یہ اور ان کے شاگرد اپنی اس جہالت کے باوصف اتنے بڑے بڑے تحریفی دعووں کے ذریعے چاہتے کیا ہیں؟ بات یہ ہے کہ یہ دورِ حاضر کا تجدد پسند گروہ (Miderbusts) ہے جو مغرب سے مرعوب ومتاثر ہوکر دین اسلام کا جدید ایڈیشن تیار کرنے کے لیے قرآن وحدیث کے الفاظ کے معانی اور دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدلنے کی کوشش کررہا ہے۔

ہمارے ہاں اس فتنے کی ابتدا سرسید احمد خان نے کی۔ پھر اُن کی پیروی میں دوفکری سلسلوں نے اس فتنے کو پروان چڑھایا۔ ان میں سے ایک سلسلہ عبداللہ چکڑالوی اور اسلم جیراج پوری سے ہوتا ہوا غلام احمد پرویز تک پہنچتا ہے۔ دوسرا سلسلہ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی سے گزرتا ہوا جناب جاوید احمد غامدی تک آتا ہے۔ گویا یہ دونوں فکری سلسلے "دبستانِ سرسید" کی شاخیں اور برگ وبار ہیں اور "نیچریت" والحاد کے نمایندہ ہیں۔ اگرچہ پرویز صاحب اور غامدی صاحب کا طریقِ واردات الگ الگ ہے تاہم نتیجے کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ دونوں تجدد، انکارِ حدیث، الحاد اور گمراہی کے علم بردار ہیں۔ دونوں اجماعِ اُمت کے مخالف اور معجزات کے منکر ہیں۔ دونوں لغتِ عرب کا سہارا لے کر دین اسلام کا تیاپانچا کرنے کے درپے ہیں۔ دونوں فاسد تاویلوں کے ذریعے اسلامی شریعت میں تحریف وتبدل اور ترمیم وتنسیخ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دونوں اکابرینِ امت کے مسلمہ ومتفقہ تعبیر کے خلاف ذاتی فہم اور رائے کو دین کی بنیاد بناکر ٹھوکر کھاتے اور گمراہ کرتے ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ ان کی اکثر تحریرات اسلام دشمن یہودی اور عیسائی عالموں کا سرقہ اور چربہ ہیں۔ یہ جو کچھ تحقیق بگھارتے ہیں ان کی یہ باتیں طبع زاد نہیں، رٹو طوطے کی سمع خراش چیخیں ہیں جو وہ چُوری کی حرص میں لگاتار رہتا ہے۔ ان کی تحریریں بھان متی کا کنبہ ہیں جو کہیں سے اینٹ اور کہیں سے روڑا اُٹھا کر تیار کی گئی ہیں۔ بطورِ مثال کے ایک نمونہ دیکھ لیجیے اور اس پر ان حضرات کی دیگر "نادر علمی تحقیقات" کو قیاس کرلیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھے۔

کاکوشاہ کلّے زئی

کہتے ہیں کہ انسان اپنے استاذوں سے اور استاذ اپنے شاگردوں سے پہچانا جاتا ہے۔ آیئے! اس حوالے سے ایک شاگرد، استاذ اور استاذ الاساتذہ کی سوانح اور کردار وعمل کا جائزہ لیتے ہیں کہ آج کل ان کا بڑا غلغلہ ہے اور وطن عزیز کا کوئی درخت ایسا نہیں جس کی شاخوں پر ان کا طوطی نہ بولتا ہو۔

☆......☆......☆

یہ 1900ء کا ذکر ہے۔ ہندوستان پر برطانوی سامراج کی دوسری صدی چل رہی تھی۔ ہندوستان کا وائسرائے مشہور ذہین اور شاطر دماغ یہودی ''لارڈ کرزن'' تھا۔ ان صاحب کو مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر اور صہیونی مقاصد کی تکمیل کا شیطانی شغف تھا۔ انگریز نے علمائے حق کی قربانیوں کی بدولت برصغیر کی زمین پاؤں تلے سے کھسکتے دیکھ لی تھی۔ سونے کی ہندوستانی چڑیا کے پر وہ نوچ چکا تھا۔ اب مشرقِ وسطیٰ میں تیل کی دریافت اور ارض اسلام کو اپنے گماشتوں میں تقسیم کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ لارڈ کرزن کو انگریز سرکار کی جانب سے حکم ملا تھا کہ وہ خلیج عرب کے ساحلی علاقوں میں مقیم عرب سرداروں سے ملاقات کرے اور مطلب کے لوگوں کی فہرست بنائے۔ خلیج عرب کے ساحلی علاقوں سے مراد کویت، سعودی عرب کا تیل سے لبالب مشرقی حصہ جو اس وقت آل سعود کے زیر نگیں تھا، نیز بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات میں شامل سات مختلف ریاستیں اور عمان ہے۔ برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل اور امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ ریت پر لکیریں کھینچ کر ''جتنا کم اتنا لذیذ'' کے اُصول پر عمل کرتے ہوئے جس طرح کیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں اسی طرح ''جتنا مالدار اتنا چھوٹا'' کے اصول پر عرب ریاستیں اپنے دوست عرب سرداروں میں تقسیم کر چکے تھے۔ اب اس تقسیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فیلڈ ورک کی ضرورت تھی اور لارڈ کرزن اپنے مخصوص یہودی پس منظر کے سبب یہ کام بخوبی کر سکتا تھا۔

لارڈ کرزن خلیج عرب کے خفیہ دورے پر فوری روانہ ہونا چاہتا تھا اور اسے کسی معتمد اور راز دار عربی ترجمان کی ضرورت تھی۔ برصغیر میں عربی اس وقت دو جگہ تھی۔ یا تو دارالعلوم دیوبند اور اس سے ملحقہ دینی مدارس، یا پھر علی گڑھ کا شعبہ عربی۔ اول الذکر سے تو ظاہر ہے کوئی ایسا ٹاؤٹ ملنا دشوار تھا۔ لارڈ کرزن کی نظر انتخاب اسی طرح کی مشکلات کے حل کے لیے قائم کیے گئے ادارہ علی گڑھ پر پڑی وہاں ایک مانگو تو چار ملتے تھے۔ مسئلہ چونکہ وائسرائے ہند کے ساتھ خفیہ ترین دورے پر جانے کا تھا جس کے مقاصد اور کارروائی کو انتہائی خفیہ قرار دیا گیا تھا اس لیے کسی معتمد ترین شخص کی ضرورت تھی جو عقل کا کورا اور ضمیر کا مارا ہوا ہو۔ سفارشوں پر سفارشیں اور عرضیوں پر عرضیاں چل رہی تھیں کہ خفیہ ہاتھ نے کارروائی دکھائی اور علی گڑھ کے سرپرستان اعلیٰ کی جانب سے ایک نوجوان فاضل کا انتخاب کر لیا گیا۔ لارڈ کرزن صاحب کو ان کی عربی دانی سے زیادہ سرکار سے وفاداری کی غیر مشروط یقین دہانی کرادی گئی اور یوں یہ عجمی عربی دان مسلمان ہو کر بھی اس تاریخی سفر پر انگریز وائسرائے کا خادم اور ترجمان

بننے پر راضی ہو گیا جس کے نتیجے میں آج خلیجی ریاستوں میں استعمار کے مفادات کے محافظ حکمران کلا گاڑ کے بیٹھے ہیں اور امریکی و برطانوی افواج کو تحفظ اور خدمات فراہم کر رہے ہیں۔

یہ نوجوان فاضل حمید الدین فراہی تھے۔ جو اُتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ''فراہا'' میں پیدا ہوئے۔ آپ مشہور مؤرخ علامہ شبلی نعمانی (1858-1914ء) کے کزن تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور MAO کالج میں عربی پڑھاتے رہے۔ لارڈ کرزن کی ہم راہی کے لیے ان کے انتخاب میں علی گڑھ میں موجود ایک جرمنی پروفیسر ''جوزف ہوروز'' کی سفارش کا بڑا دخل تھا جو یہودی النسل تھا اور آپ پر اس کی خاص نظر تھی۔ آپ نے اس سے عبرانی زبان سیکھی تا کہ تورات کا مطالعہ اس کی اصل زبان میں کر سکیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تورات کی اصل زبان تو جو کچھ ہے لیکن تورات اپنی اصلی زبان میں دنیا میں کہیں دستیاب نہیں۔

لارڈ کرزن صاحب جناب فراہی کی صلاحیت اور کارکردگی سے بہت خوش تھے چنانچہ واپسی پر انہیں انگریزوں کی منظور نظر ریاست حیدر آباد میں سب سے بڑے سرکاری مدرسہ میں اعلیٰ مشاہرے پر رکھ لیا گیا اور آپ نے وہاں سے اس کام کا آغاز کیا جو قسمت کا مارا یہودیوں کا پروردہ ہر وہ شخص کرتا ہے جسے عربی آتی ہو۔ آپ نے اپنے آپ کو قرآن کریم کی ''مخصوص انداز'' میں خدمت کے لیے وقف کر لیا۔ مخصوص انداز سے مراد یہ ہے کہ تمام مفسرین سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی کہ قرآن کریم کو محض لغت کی مدد سے سمجھا جائے۔ یہ لغت پرست مفسرین دراصل اس راستے سے قرآنی آیات کو وہ معنی پہنانا چاہتے تھے جس کی ان کو ضرورت محسوس ہو اگرچہ دوسری آیات یا احادیث، مفسرین صحابہ و تابعین کے اقوال اس کی قطعی نفی کرتے ہوں۔ درحقیقت قرآن سے ان حضرات کا تعلق، انکار حدیث پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتا ہے جیسا کہ تمام منکرین حدیث کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے اس عیب کو چھپانے کے لیے قرآن کریم سے بڑھ چڑھ کر تعلق اور شغف کا اظہار کسی نہ کسی بہانے کرتے رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ وہی حیدر آباد ہے جہاں شاعرِ مشرق علامہ اقبال جیسے فاضل شخص کو محض اس لیے ملازمت نہ مل سکی کہ وہ مغرب دشمن شاعری کے مرتکب تھے لیکن فراہی صاحب پر لارڈ کرزن کا دست کرم تھا کہ حیدر آباد کی آغوش ان کے لیے خود بخود وا ہو گئی اور انہیں ایک بڑے ''علمی منصوبے'' کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس منصوبے نے جو برگ و بار لائے انہیں مسلمانان برصغیر بالخصوص آج کے دور کے اہالیان پاکستان خوب خوب بھگت رہے ہیں۔ فراہی صاحب نے ''تفسیر نظام القرآن'' لکھی جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کتب خانوں میں تلاش کرنے سے بھی مل کے نہیں دیتی۔ علامہ شبلی نعمانی، فراہی صاحب کے بارے میں اس وقت شدید تحفظات کا شکار ہو گئے تھے جب ان کی بعض غیر مطبوعہ تحریر ''دار المصنفین'' میں شائع ہونے کے لیے آئیں لیکن ان کی طباعت سے انکار کر دیا گیا کہ زبردست فتنہ پھیلنے کا خطرہ تھا۔ فراہی صاحب اپنے پیچھے چند شاگرد، چند کتابیں اور بے شمار شکوک و شبہات چھوڑ کر 1930ء میں دنیا سے رُخصت ہو گئے۔

☆......☆......☆

فراہی صاحب نے حیدر آباد سے منتقل ہونے کے بعد اعظم گڑھ کے ایک قصبے ''سرائے میر'' میں ''مدرسۃ الاصلاح'' نامی ادارہ قائم کیا۔ نام سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تفسیر کے مسلّمہ اُصولوں کی اصلاح کر کے نئی جہتیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ

کے اس مدرسے میں 1922ء میں ایک نوجوان فارغ ہوا جو اساتذہ کا منظور نظر اور چہیتا تھا۔فراہی صاحب نے اسے دعوت دی کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ''قرآن کریم کا مطالعہ'' کرے۔ یہ نوجوان آگے چل کر فراہی صاحب کا ممتاز ترین شاگرد اور ان کے نظریات وافکار کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔ یہ جب مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوا تو امین احسن تھا، فارغ ہوا تو ''امین احسن اصلاحی'' (1904-1997ء) بن چکا تھا۔ اس نے فراہی صاحب کی وفات کے بعد آپ کی یاد میں رسالہ ''الاصلاح'' جاری اور ''دائرہ حمیدیہ'' قائم کیا۔ اصلاحی صاحب انکار حدیث اور اجماع امت کا منکر ہونے کے علی الرغم جماعت اسلامی کے بانیوں میں سے تھے۔ قیام کے دوران مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔1958ء میں مودودی صاحب سے اختلافات کی بناپر جماعت سے علیحدہ ہوئے اور وہی کام شروع کیا جوان کے استاذ نے آخری عمر میں کیا تھا۔ آپ نے ''حلقۂ تدبر قرآن'' قائم کیا جس میں کالج کے طلبہ کو قرآن کریم اور عربی پڑھائی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ ''تدبر قرآن'' کے نام سے تفسیر لکھنے میں بھی کامیابی حاصل کی لیکن اسے مقبول کروانے میں بری طرح ناکام ہوئے۔فراہی صاحب بہرحال عالم فاضل شخص تھے لیکن اصلاحی صاحب اس پائے کے عالم نہ تھے۔ مغربی علوم تو کیا وہ شرعی علوم سے بھی کماحقہٗ واقف نہ تھے۔ ان کی تفسیر میں کئی بچگانہ غلطیاں ہیں جن میں سے کچھ پچھلے مضمون میں قارئین کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ اصلاحی صاحب ہفتہ وار درس بھی دیتے تھے لیکن انکار حدیث، تجدد پسندی اور لغت پرستی نے انہیں اپنے پیش رواستاذ کی طرح کہیں کا بھی نہ چھوڑا اور وہ خالد سعود اور جاوید غامدی جیسے شاگرد تیار کر کے 1997ء میں اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔

☆......☆......☆

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور میں پاک پتن کے گاؤں میں ایک پیر پرست اور مزار گرویدہ قسم کا شخص رہتا تھا۔ مزاروں والا خصوصی لباس، گلے میں مالائیں ڈالنا، ہاتھ میں کئی انگوٹھیاں پہننا اور لمبی لمبی زلفیں بغیر دھوئے تیل لگائے رکھنا اس کی پہچان تھی۔ 18اپریل 1951ء کو اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نام تو اس کا محمد شفیق تھا لیکن باپ کے مخصوص مزاج کی وجہ سے اس کا عرف کا کوشاہ پڑ گیا۔ یہ خاندان ککے زئی کہلاتا تھا۔ اس طرح اس کا پورا عرفی نام ''کا کوشاہ ککے زئی'' بنا۔ محمد شفیق عرف کا کوشاہ ککے زئی جب گاؤں کی تعلیم کے بعد لاہور آیا تو اسے اپ ٹو ڈیٹ قسم کا نام رکھنے کی فکر لاحق ہوئی۔ اس نام کے ساتھ تو وہ ''لہوریوں'' کا سامنا نہ کرسکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اسے ''جاوید احمد'' نام اچھا معلوم ہوا کہ ماڈرن بھی تھا اور رعب دار بھی۔ اس نے محمد شفیق سے تو جان چھڑالی اب ''کا کوشاہ ککے زئی'' کے لاحقے کا مسئلہ تھا جو کافی سنگین اور مضحکہ خیز تھا۔ لیکن فی الحال اسے اس کی خاص فکر نہ تھی۔ اس زمانے میں اس کا ایک قریبی دوست ہوتا تھا...... جناب رفیق احمد چوہدری۔ وہ ان دنوں اور اس روئیداد کے عینی گواہ ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد 1972ء کا دور تھا۔ کا کوشاہ لاہور گورنمنٹ کالج سے بی اے آنرز کرنے کے بعد معاشرے میں مقام بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کی انگریزی تو یوں ہی سی تھی لیکن قدرت نے اسے ایک صلاحیت سے خوب خوب نوازا تھا...... وہ تھی طاقت لسانی۔ اس کے بل بوتے پر وہ تعلقات بنانے اور آگے بڑھنے کی سعی میں مصروف تھا۔ آخر کار اس کی جدوجہد رنگ لائی اور وہ اپنی چرب زبانی سے پنجاب کے ایڈمنسٹریٹر اوقاف جناب مختار گوندل کو متاثر کر کے اوقاف کے خرچ پر 29 جے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ''دائرۃ الفکر'' کے نام سے ایک تربیتی اور تحقیقی ادارہ کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

پھر جلد ہی قدرت نے انہیں مولانا مودودی مرحوم کے سایۂ عاطفت میں ڈال دیا تو جاوید احمد کو فوری طور پر جماعتِ اسلامی میں پذیرائی ملی۔ رکنیت مجلسِ شوریٰ تو چھوٹی شے ہے، ان کے حواری انہیں مولانا مودودی کا ''جانشین'' بتانے لگے کیونکہ مولانا مرحوم نے غالبًا جاوید احمد کی جولانیٔ طبع کو آزمانے کے لیے ان کو ''دارالعروبہ'' کی خالی ہونے والی کوٹھی 4 ذیلدار پارک اچھرہ لاہور نہ صرف مفت دے رکھی تھی بلکہ ایک ہزار روپے مزید ماہوار تعاون کا وعدہ بھی فرمایا۔ اس طرح جاوید احمد کو جماعت اسلامی کے متاثرین میں پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔

اس وقت جاوید احمد ابھی عربی گرامر کے طالب علم تھے اور ہر وقت معتزلہ کے امام ''زمخشری'' کی علم نحو پر کتاب المفصل ان کی بغل میں ہوتی اور تفسیر میں الکشاف سے استفادہ کرنے کا انہیں خصوصی شوق دامن گیر رہتا جو ان کے بس کی چیز نہ تھی اور آج تک نہیں ہے۔ آخر کار جب جاوید احمد کو جماعت اسلامی سے 1957ء میں الگ ہونے والے مولانا امین اصلاحی سے روابط کا شوق مولانا کے قریب تر اور جماعت اسلامی سے مزید دور لے جانے کا باعث بنا۔ آہستہ آہستہ وہ جاوید احمد سے جاوید احمد غامدی ہوگئے۔ اس لقب کی وہ دو چار وجوہات بیان کرتے ہیں اور صحیح ایک کو بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ حال ہی میں ان کے ایک شاگرد خاص نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ ''اصل میں وہ اصلاحی صاحب سے عقیدت کی وجہ سے اصلاحی لقب رکھنا چاہتے تھے لیکن ''مدرسۃ الاصلاح'' سے فارغ نہ تھے۔ اس لیے غامدی نام رکھ لیا۔'' سبحان اللہ! چھوٹے میاں کو یہ بھی نہیں پتہ کہ غامدی نہ اصلاحی کے ہم وزن ہے نہ ہم معنیٰ! آخر کس طرح سے اصلاحی سے غامدی تک چھلانگ لگا دی گئی؟؟؟ گویا یہ پانچویں وجہ بھی عار ہی عار ہے اور پورا مکتب فکر مل کر اپنے بانی کے نام کی درست توجیہ کرنے سے قاصر ہے۔

2001ء سے قبل غامدی صاحب کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی لیکن اسے کسی لارڈ کرزن کی سرپرستی دستیاب نہ تھی۔ 2001ء میں یہ کمی بھی پوری ہوگئی اور ان کے سر پر عصر حاضر کے لارڈ کرزن کا دست شفقت کچھ ایسا جم کر ٹکا کہ وہ شخص جو عربی کی دو سطریں سیدھی نہیں لکھ سکتا، جو انگریزی کی چار نظموں اور 4 مصرعوں کی پونجی میں آدھے سے زیادہ مصرع چوری کر کے ٹانکتا ہے، جس کی اکثر اُردو تحریریں سرقہ بازی کا نتیجہ ہیں، وہ آج ملک کا مشہور و معروف اسکالر ہے اور اس کا فرمایا ہوا مستند سمجھا جاتا ہے۔ ''کلکے زئی سے غامدی تک'' کے سفر کی روداد عبرت ناک بھی اور الم ناک بھی۔ سچ ہے استاذ اپنے شاگردوں سے ہی پہچانا جاتا ہے اور شاگرد اپنے استاذ کی پہچان کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ''فراہی سے اصلاحی اور اصلاحی سے غامدی تک'' استاذی شاگردی کا سلسلہ اس مقولے کی صداقت کے لیے کافی سے زیادہ شافی، اور درکار ضرورت سے زیادہ پکی سچی گواہی ہے۔

ہاشمی نامہ

ایک نیا فتنہ

عالمگیر کشمکش:

قرآن کریم میں مُسلمانوں اور غیر مسلموں، حق کے پرستاروں اور باطل کے پجاریوں، فرزندانِ توحید اور شرک کے دلدادہ لوگوں کے درمیان کشمکش کو مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک موقع پر کفر کی یورش کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے: ''اور یہود ونصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی ملت کا اتباع نہ کرنے لگو۔'' قرآن کریم کی اس پیش گوئی کی صداقت کا اظہار مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے ہوتا رہا۔ آج کل اسلام اور کفر کے درمیان چونکہ ایک عالمگیر کشمکش چل رہی ہے اس لیے مختلف میدانوں میں کفر کی کوشش ہے کہ فرزندانِ اسلام کو نیچا دکھایا جائے۔ خصوصاً اس بات پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ صحیح اسلامی سوچ کو مضمحل کر کے آزادانہ اجتہاد کا ڈول ڈالا جائے، قرآن وسنت کی وہ تعلیمات جو صحابہ کرام اور اکابر امت کی وساطت سے ہم تک پہنچیں، ان سے نورِ ہدایت اخذ کرنے کے بجائے عصرِ حاضر سے مطابقت رکھنے والا جدید ''اسلامی نظام'' متعارف کیا جائے۔ ایسا اسلام جس میں مذہبی ہدایات کی خاص پابندی نہ ہو بلکہ اباحیت، تجدد پسندی اور نصوص قرآن وسنت کی من مانی تاویلوں کی آمیزش سے ایسا ملغوبہ تیار کیا جائے جو اسلامی روایات کو فرنگی تہذیب سے ہم آہنگ کر دے۔ ایسا نظام جس کا پرچار کرنے والوں کا نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں سے دور کا تعلق نہ ہو لیکن وہ اسلام کے شارح اور جدید دور کے سہل پسند مسلمانوں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوں۔

متبادل طریق کار:

چنانچہ اس غرض کے لیے مغرب کی یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم اور عربی ادب کے شعبے قائم ہیں، جہاں مستشرقین (اسلام کا مطالعہ رکھنے والے غیر مسلم دانشور) کی زیرِ نگرانی قرآن وحدیث اور اسلامی علوم کی اس طرز سے تعلیم دی جاتی ہے کہ صحیح اسلامی سوچ پیدا ہوتی ہے نہ کردار شریعت کے مطابق بنتا ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں مسلم ممالک کے لائق طلبہ کو داخلہ دے کر ان کو اعلیٰ دینی تعلیم کے نام پر اس طرز کی تحقیق سکھائی جاتی ہے کہ وہ ڈاکٹر کی سند حاصل کر لیتے ہیں لیکن نظری اور عملی طور پر ان کی حالت روئی سے بنے ہوئے ایسے بھالو کی طرح ہوتی ہے جو یہود ونصاریٰ کی بھری ہوئی توانائی سے چلتا ہو۔ مزید برآں ان طلبہ کی عقیدت کا محور بلند پایہ مسلمان ہستیوں کے بجائے غیر مسلم مفکر ہوتے ہیں۔ وہ اسلامی روایات پر فخر نہیں، عار محسوس کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں اسلامی احکام کی ایسی تشریح کرنے والے لوگ تیار ہوتے ہیں جن سے اسلام کی روح سلب ہو چکی ہوتی ہے۔ اسلام کی تعلیم کفار سے پانے والے اور مشرقی تہذیب مغرب کے علمبرداروں سے سیکھنے والے یہ افراد جب اپنے اپنے ملکوں میں واپس جاتے ہیں تو وہاں کے مسلمانوں کے لیے ایک نئی آزمائش بن جاتے ہیں۔ ان کے پھیلائے ہوئے افکار سے اُن مسلمانوں کا دین سے رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے جو مغرب سے مرعوب ہیں اور وہاں سے درآمدہ ہر چیز کو معیاری

اور مستند سمجھتے ہیں۔ یہ بے چارے دین سے پہلے ہی دور ہوتے ہیں، باقی ماندہ کسر ان مفکرین کی زہر آلود ذہن سازی کے طفیل پوری ہو جاتی ہے۔

صدر ایوب کے زمانے میں اسلامی نظریاتی کونسل پر اس قسم کے حضرات کا قبضہ تھا اور وہ اس پلیٹ فارم سے تحریف شدہ اسلامی احکام کو ''تحقیق'' کے ''نئے اصولوں'' کا سہارا دے کر پاکستان میں متعارف کروار ہے تھے۔ ان کا سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمان برطانیہ کے ایک مشہور یہودی مستشرق کا چہیتا شاگرد تھا۔ جب وہ علمائے کرام کی بروقت اور بھرپور گرفت کے سبب اپنا مشن پورا نہ کر سکا تو اسے اس کے سرپرستوں اور مربّیوں نے واپس بلالیا۔ یوں ایک ہنگامہ خیز دور اختتام کو پہنچا مگر غیر مسلم لابی کے چوٹی کے دماغ اس عرصے میں کسی اور طریقہ کار کی تلاش میں تھے جو بالآخر اب پورے زور و شور کے ساتھ سامنے آ گیا ہے۔

مغرب کے روشن دان سے:

اب کی مرتبہ کسی حکومتی عہدے یا حیثیت کو استعمال کر کے ''اوپر سے نیچے کی طرف'' کے طرز محنت پر اسلام کی نئی تعبیر کو مسلط کرنے کے بجائے ''مفسرین قرآن'' کے روپ میں ایک کھیپ تیار کر کے بھیجی گئی ہے جو ''نیچے سے اوپر کی طرف'' کے انقلابی طرز پر کام کر رہی ہے۔ یہ حضرات بڑے بڑے شہروں کے متمول علاقوں میں تمام تر جدید سہولتوں سے آراستہ دفاتر حاصل کر کے، وہاں پرکشش نام سے دین اسلام کی تبلیغ کے دفاتر کھولتے ہیں۔ ان دفاتر سے عوام کو دین کی آسان تفہیم و تشریح کے عنوان سے وہ لٹریچر، آڈیو، ویڈیو کیسٹیں اور دیگر مواد فراہم کیا جاتا ہے جسے عمدہ اسلوب، دیدہ زیب پیشکش اور مروجہ اعلیٰ معیار پر تیار کیا گیا ہوتا ہے۔ اس لٹریچر کے پڑھنے والے اور ان ''مفکرین'' کے خیالات سے متاثر ہو جانے والے افراد کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ کل تک وہ اپنے آپ کو گنہگار اور بے عمل ادنیٰ سا مسلمان سمجھتے تھے اور یہ احساس ان کی مغفرت کا بہانہ ہو سکتا تھا، مگر اب وہ اپنے آپ کو اسلام کے اصل آفاقی پیغام سے آگاہ اور مسلمانوں کا رہبر و محسن سمجھتے ہیں، ان کی تمام عملی کمزوریوں کو مغرب سے جاری کی گئی سند کا سہارا مل چکا ہوتا ہے اور وہ اسلام کی اس نئی روشنی کو جلد از جلد دوسروں تک پہنچانے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں جو انہیں مغرب کے روشن دانوں سے حاصل ہوئی ہے۔

ایک نیا فتنہ:

اس ماہِ رمضان کے آغاز سے تو غضب ہی ہو گیا ہے۔ ملک کے بڑے شہروں میں بڑے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں مہنگے داموں پر ہال بک کرا لیے گئے ہیں جہاں درس قرآن کے نام سے فیشن ایبل خواتین کے اجتماعات ہو رہے ہیں، ان محفلوں میں دیار کفر سے تفسیر قرآن کی تعلیم حاصل کر کے آنے والے خواتین و حضرات، قرآن کریم کے حقائق و معارف بیان فرما رہے ہیں۔ یعنی یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے کہ دُنیاوی امور کی طرح دینی معاملات میں بھی ہم نے سڑاند زدہ تہذیب رکھنے والے مغرب کو اپنا امام بنالیا ہے۔ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر جیسی خالص مذہبی تعلیم ان لوگوں سے لی جا رہی ہے جو یورپ و امریکا کی یونیورسٹیوں میں متعین اسلام دشمن اور یہودیوں کے آلہ کار پروفیسروں سے پڑھ کر آئے ہیں اور علوم اسلامیہ کی جدید تشریح کے بہانے اباحیت، آزادروی اور تجدد پسندی کو ترویج دے رہے ہیں۔ اس طرح کے درس آج کل کثیر سرمایہ خرچ کر کے منعقد کیے جا رہے ہیں، ذرائع ابلاغ سے ان کی تشہیر پر اتنا روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے کہ

مسلمانوں کے عطیات سے چلنے والی تنظیمیں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ ان کی نشر و اشاعت کے لیے ویڈیو کے طویل دورانیے اور اخبارات کے بھاری بھرکم اشتہارات و مضامین کچھ اور ہی کہانی سناتے نظر آتے ہیں۔ ان کا مقصد قرآن کریم کے نور سے لوگوں کے دلوں کو منور کرنا نہیں، بلکہ خالص دینی نظریات سے چھڑا کر اس آزادانہ ذہنیت کو پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے جس کے بعد مسلمان کے دامن میں یہودیت کے پھیلائے ہوئے جراثیم کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ خود سوچیے کہ یہودی اور عیسائی پروفیسروں نے جس اسلام کی تعلیم اپنے ان ہونہار شاگردوں کو دی ہوگی اور اسلام کی تخریب کی خاطر اسلام کا مطالعہ اور تحقیق کرنے والوں نے مسلمانوں کے ذہین افراد چن کر ان کو جو ''جدید نظریات'' اور عصر حاضر میں اسلامی احکام کی ''نئی تشریح'' سکھائی ہوگی، وہ کس قدر خطرناک اور زہر آلود ہوگی؟؟؟

واضح قرائن و شواہد:

چنانچہ ہو یہ رہا ہے کہ ان محفلوں میں شریک ہونے والے افراد دین سے محبت کرنے، دینداری اختیار کرنے اور شریعت کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کے بجائے مزید آزاد خیال ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سادہ لوح مسلمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فکر کے بجائے دیندار مسلمانوں کو کم تر اور ان کے فہم دین کو ناقص سمجھنے لگتے ہیں، خصوصاً علمائے کرام سے متنفر اور بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ ان اجتماعات میں جانے کے بعد ان میں نماز روزہ کا اہتمام تو نہیں بڑھا البتہ بے پردگی، ٹی وی ویڈیو کے جواز اور صورت و لباس میں سنت کی پابندی کے غیر ضروری ہونے جیسے زہرناک خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ جہل مرکب کا یہ عالم ہے کہ یہ اعراب کے بغیر قرآن کریم پڑھ سکتے ہیں نہ ترجمہ سامنے رکھے بغیر آیات کا مطلب یاد ہے، لیکن ائمہ اسلام کی تقلید اور ان کی تحقیقات پر اعتماد کے خلاف بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کی علامت اور اس امر کی صاف دلیل ہے کہ مغرب سے درآمدہ ان مفکرین حضرات کا کام کسی طرح بھی داعیان اسلام کے طریقے پر نہیں بلکہ دین کی دعوت کے لیے مہلک اور خطرناک ترین ہے۔ ان حضرات کے کام کرنے کا جدید انداز، عیسائی مشنریوں والے طور طریقے، سرمائے کا بے دریغ خرچ، اعلیٰ طبقوں میں اہمیت کے ساتھ کام کرنا، (انبیاء علیہم السلام سے لے کر آج تک دین کی دعوت دینے والا ہر مخلص فرد یا ادارہ معاشرے کے تمام طبقوں میں بلا امتیاز کام کرتا چلا آیا ہے بلکہ امرا کی بہ نسبت غربا میں اس کی محنت کو زیادہ قبول حاصل ہوتا ہے) آزاد خیال مسلمانوں میں ان کی روز افزوں مقبولیت، یہ سب کچھ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ اسلام کے نہیں، مغرب کے نمائندے ہیں۔ یہ دین کے داعی نہیں، بددینی اور الحاد کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ قرآن کے خادم نہیں، حدیث شریف کے انکار کے مجرم ہیں۔ ان کے چنگل سے خود بھی بچنا اور دوسروں کو بچانے کی کوشش کرنا فرض ہے۔

دعوت دین کے تقاضے:

ان ''ماہرین شریعت'' مفکرین سے یہ خطرہ تو ان شاء اللہ نہیں کہ یہ فتنہ زیادہ عرصہ چل سکے گا لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ بہت سے دین سے محبت کرنے والے سادہ لوح مسلمان اُن جراثیم کا شکار نہ ہو جائیں جو مغرب کی دانش گاہوں میں تیار کر کے مسلم ممالک میں انجکٹ کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ خصوصاً ہماری وہ مائیں بہنیں ان سے زیادہ متاثر ہو سکتی ہیں جو مذہب سے قلبی عقیدت رکھتی ہیں لیکن اس کے حصول کے لیے اس ذریعے کی تلاش میں رہتی ہیں جو ان کے دل و دماغ کو ویسا متاثر کر سکے

جیسا کہ وہ آج کی ترقی یافتہ دنیا کی دیگر اشیا کو روز و شب دیکھتی ہیں۔ ان کے لیے مخلصانہ مشورہ ہے کہ انہیں ان مجالس میں جتنی بھی کشش اور فائدہ محسوس ہو لیکن ان میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ برادران اسلام اور محترم ماؤں بہنوں سے عرض ہے کہ اپنے علم کی پیاس ضرور بجھائیں مگر ان سرچشموں سے جہاں خالص اور شیریں آب حیات ملتا ہے۔ یہ حیات بخش مشروب اگر مٹی کے صاف ستھرے پیالے میں ہو تو بھی جراثیم سے آلودہ اُس محلول سے لازماً بہتر ہے جو ایسی پیکنگ میں فراہم کیا جا رہا ہے جو دیدہ زیب تو ہے مگر ان مہلک جرثوموں کو نظر نہیں آنے دیتی جو اس میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ معاشرے کا رُخ پہچاننے والے اور عوام کے نبض شناس محترم علمائے کرام سے گذارش ہے کہ درس قرآن کے حلقوں کو اس انداز سے قائم فرمائیں کہ ہمارے عصری تعلیم یافتہ برادران اسلام کو وہ علمی اور روحانی غذا میسر ہو سکے جس کی تلاش میں وہ مسجد اور مدرسہ چھوڑ کر کلبوں اور ہوٹلوں کا رخ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن مجید کا سچا اور کارآمد خادم بنادے اور ان تقاضوں کے مطابق کام کرنے کی توفیق دے جو اس دور میں دعوت دین کے لیے مفید اور معاون ہیں۔ آمین ثم آمین۔

الہدیٰ انٹرنیشنل: حقائق کیا کہتے ہیں؟

قارئین کرام! ہمارا ملک اس وقت جس انتشار اور خلفشار کا شکار ہے اس کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ امت مسلمہ کے باہمی اختلافات کو خصوصیت سے موضوع سخن بنایا جائے لیکن بعض اوقات کچھ باتیں اتنی سنگین ہوتی ہیں کہ اگر ان سے چشم پوشی کر لی جائے تو خطرہ ہوتا ہے کہ پشت میں خنجر گھونپنے والے ہمیں ''تیر کھا کر کمین گاہ کی طرف دیکھنے'' اور اپنے ''دوستوں کو پہچاننے'' کا موقع بھی نہ دیں۔ زیرِ نظر سطور کچھ اسی قسم کی مجبوری کے تحت لکھی جا رہی ہیں۔

الہدیٰ انٹرنیشنل کا نام اب ہمارے ملک میں غیر معروف نہیں رہا۔ یہ ادارہ درس قرآن کے حلقوں کے ذریعے خواتین میں دعوت دین کا کام کرتا ہے اور سننے میں آتا رہتا ہے کہ اس ادارے سے وابستگی کے بعد فیشن ایبل خواتین میں دینی مزاج پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، وہ پردہ شروع کر دیتی ہیں، ان کے گھروں کی چھت سے ڈش اتر جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے معاشرے میں جو تیزی سے دین سے دور ہوتا جا رہا ہے خصوصاً طبقہ اشرافیہ (ہائی سوسائٹی) میں اگر قرآن کریم کی طرف رجوع، دین سیکھنے کا شوق و ذوق اور اللہ و رسول اور یوم آخرت کی باتیں ہونے لگیں اور وہ بھی خواتین کے حلقے میں تو دینی ذہن رکھنے والوں کے لیے اس سے زیادہ خوشی اور مسرت کا موقع اور کون سا ہو سکتا ہے؟ لیکن وائے بدقسمتی کہ ہماری شامت اعمال سے ہم پر مغربیت اور الحاد کا جو سیلاب مسلط ہے اس کے پیش نظر اول تو دین کی دعوت کی آواز بہت مضمحل ہے، دوسرے دعوت دین سے وابستہ افراد اور ادارے اجماعی مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اپنے آپ کو فروعی مسائل میں الجھا لیتے ہیں اور اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ اپنے ذاتی نظریات جو جمہور علمائے امت کی تحقیقات سے مطابقت نہیں رکھتے، ان کو اپنی دعوت کا لازمی جز بنا لیتے ہیں اور بعض تعصب کے مارے ہوئے تو ان نظریات کی ترویج کے لیے علمائے اسلام کی تحریرات کو توڑ موڑ کر اپنے موقف سے مطابق دکھانے سے بھی نہیں چوکتے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہ آ جاتی ہے کہ ان کی محنت اس ستم رسیدہ امت کو کوئی مثبت اور تعمیری نتیجہ دینے کے بجائے ایک نئے فتنے کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ان کا قائم کردہ حلقہ ایک مستقل فرقہ بن جاتا ہے جس کے گمراہانہ اثرات سے عوام الناس کو بچانے پر علمائے امت کی وقیع جدوجہد اور قیمتی وقت اور وسائل خرچ ہوتے ہیں اور وہ اس کے لیے اپنی بہترین توانائیاں صرف کرنے کے باعث بیرونی دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچانے اور اپنے علمی کاموں کو آگے بڑھانے کی فرصت نہیں کر پاتے۔

الہدیٰ انٹرنیشنل کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا بلکہ گستاخی معاف ہو تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ بندہ نے جب پہلی بار سنا کہ اسلام آباد کے اعلیٰ حلقوں میں کام کرنے کے بعد اب کراچی میں بھی محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ نے پوش علاقوں میں کام شروع کیا ہے اور ان کے اولین تعارف کے طور پر یہ بات سامنے آئی کہ وہ انگلینڈ سے علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کر کے آئی ہیں تو اپنی کم علمی اور بے بصیرتی کے باوجود اسی وقت بندہ کا ماتھا ٹھنکا کہ اللہ خیر کرے، نجانے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بندہ کی اس پریشانی کا سبب دو چیزیں تھی۔ ۱......واقفان حال کو معلوم ہے کہ مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں میں غیر مسلم علماء اور دانش وروں کو

(جنھیں اسلامی اصطلاح میں مستشرقین کہا جاتا ہے) بھاری وظائف اور ہمہ قسم کی سہولتیں دی جاتی ہیں تاکہ وہ اسلامی لٹریچر کا بھرپور مطالعہ اور ادراک رکھیں اور مسلم ممالک سے آئے ہوئے ذہین اور قابل نوجوانوں کی ایسی تربیت کریں جس سے وہ دین کے نام پر بے دینی اور شریعت کے نام پر الحاد کو فروغ دینے کا ہنر سیکھ سکیں۔ محترمہ ڈاکٹر صاحبہ نے تو رسمی علوم کے بعد گلاسکو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی کی تھی لہٰذا بندہ کا سہم جانا کچھ ایسا بے جا نہ تھا۔

2...... جو دینی ادارے اپنی محنت کا مرکز صرف (صرف کے لفظ پر زور دے کر پڑھیے) اعلیٰ طبقے کو بناتے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کے دعوتی طریق کار سے منحرف ہوتے ہیں، اس لیے نہ صرف یہ کہ ان سے خیر کی توقع رکھنا عبث ہوتا ہے بلکہ در پردہ کسی اور مشن پر چلنے کا وہم ہوتا ہے کیوں کہ ''ملأ القوم'' اور ''مترفین'' (یعنی سیاسی حیثیت اور مالی استحکام رکھنے والے وڈیرے اور سرمایہ دار) جو دین کی دعوت کے سب سے پہلے مخالفین میں سے ہوتے ہیں، ان کو اپنی جدوجہد کا محور بنانا اور ان کا اس دعوت کو بے دھڑک قبول کیے جانا چونکا دیے بغیر نہیں رہتا۔

بعد میں الہدیٰ انٹرنیشنل اور اس کی بانی محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے متعلق بہت سی تشویش ناک باتیں سننے میں آتی رہیں لیکن اس کی تحریری یا صوتی تحقیق نہ مل سکی جو اس پر کھل کر کچھ کہنے کی بنیاد فراہم کرسکے۔ سال گزشتہ ماہ رمضان المبارک میں محترمہ ڈاکٹر صاحبہ کے کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں درس کی کچھ روداد پہنچی تو بندہ نے اس طرح کے درس قرآن کے حلقوں پر ایک عمومی سا تبصرہ لکھ کر اہل علم کو غور وفکر کرنے اور اس حوالے سے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی دعوت دینے کی جرأت کی جس کے جواب میں قارئین اور الہدیٰ سے علیحدہ ہوجانے والی خواتین کی طرف سے بہت سے خطوط آئے لیکن ظاہر ہے کہ کوئی وزن دار بات کہنے کے لیے خطوط کہاں کافی ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ حضرت الاستاد، شیخ الحدیث، جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ جو اہل اسلام کے لیے اللہ کی رحمت اور ہدایت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں، کے اپنے قلم حقیقت رقم سے نکلا ہوا ایک فتویٰ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے جو سلامت طبع، معتدل مزاجی، قدیم و جدید علوم پر دسترس اور احوال زمانہ پر گہری نظر عطا فرمائی ہے اس کا کوئی سلیم العقل شخص انکار نہیں کرسکتا۔ آپ علمائے کرام کے محبوب ومقتدا تو ہیں ہی لیکن اپنی بردبار شخصیت، راسخ علم، پر وقار انداز تقریر وتحریر اور بلند پایہ علمی واصلاحی مشاغل کے سبب جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بھی یکساں طور پر مقبول ہیں۔ آپ کے فتویٰ کو ''شدت پسندی'' یا ''جاہل مولویوں کا ردعمل'' کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنے ہاتھ سے اس ادارے کے نظریات کے بارے میں فتویٰ لکھنے کی جو ضرورت محسوس کی، صرف اسی سے اس کی اہمیت سمجھی جاسکتی ہے۔ اس فتویٰ کے مطالعے کے بعد اس ادارے کے بارے میں ذرہ بھر شبہ نہ رہا کہ مستشرقین کی نظر خاص کے مرکز پاکستانی معاشرے میں اتحاد کے نام پر ایک اور فرقہ اور ہدایت کے عنوان سے ایک اور گمراہی وجود میں آگئی ہے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے آپ یہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے جس پر صدر دارالعلوم کراچی جناب مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم اور جامعہ دارالعلوم کراچی کے چار نائب مفتی صاحبان کی تصدیقات اور مہریں ثبت ہیں۔ اس فتویٰ کا نمبر 486 / 1 ہے اور یہ مؤرخہ 21 ربیع الثانی 1422ھ کو تحریر کیا گیا ہے۔

استفتاء

حضرت جناب مفتی صاحب زیدت معالیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

سائلہ نے اسلام آباد کے ایک ادارے ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' سے ایک سالہ ڈپلومہ کورس ان اسلامک اسٹڈیز (One year diploma course in I.S) کیا ہے۔ سائلہ اس ادارے میں طلب علم کی جستجو میں گئی تھی اور ان کے خفیہ عقائد سے ناواقف تھی۔ ایک سالہ کورس کے بعد ان کے عقائد کچھ صحیح معلوم نہ ہوئے تو سوچا کہ علمائے کرام سے راہنمائی حاصل کی جائے تا کہ امت مسلمہ کی بیٹیوں تک عقائد صحیحہ کو پہنچا کر ان کو گمراہی سے بچایا جا سکے۔ ہماری استاد اور الہدیٰ انٹرنیشنل کی نگران محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ کے نظریات کا نچوڑ پیش خدمت ہے۔

1)......اجماع امت سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنا۔

2)......غیر مسلم اور اسلام بیزار طاقتوں کے نظریات کی ہمنوائی۔

3)......تلبیس حق و باطل۔

4)......فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک وشبہات پیدا کرنا۔

5)......من گھڑت آسان دین پیش کرنا۔

6)......آداب ومستحبات کو نظر انداز کرنا۔

اب ان بنیادی نکات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے۔

1)......اجماع امت سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرنا:

1) قضائے عمری سنت سے ثابت نہیں۔ صرف توبہ کر لی جائے۔ قضا ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

2) تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا۔

3) نفلی نمازوں، صلوٰۃ التسبیح، رمضان میں طاق رات خصوصاً 27 ویں شب میں اجتماعی عبادت کا اہتمام اور خواتین کے جمع ہونے پر زور دینا۔

2)......غیر مسلم، اسلام بیزار طاقتوں کے خیالات کی ہمنوائی:

1)۔ مولوی (عالم)، مدارس اور عربی زبان سے دور رہیں۔

2)۔ علماء، دین کو مشکل بناتے ہیں۔ آپس میں لڑتے ہیں۔ عوام کو فقہی بحثوں میں الجھاتے ہیں بلکہ ایک موقع پر تو فرمایا کہ اگر مسئلے میں صحیح حدیث نہ ملے تو ضعیف لے لیں لیکن علماء کی بات نہ لیں۔

3)۔ مدارس میں گرائمر، زبان سکھانے، فقہی نظریات پڑھانے میں بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ قوم کو عربی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ لوگوں کو قرآن صرف ترجمے سے پڑھا دیا جائے۔

ایک موقع پر کہا کہ ان مدارس میں جو 7، 7، 8، 8 سال کے کورس کرائے جاتے ہیں یہ دین کی روح کو پیدا نہیں کرتے

اپنے فقہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اشارہ درس نظامی کی طرف ہے۔

4)۔ وحید الدین خان کی کتابیں طالب علموں کی تربیت کیلیے بہترین ہیں۔ نصاب میں بھی شامل ہیں اور اساتذہ پڑھی رکھی جاتی ہیں۔ کسی نے احساس دلایا کہ ان کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے تو کہا: ''حکمت مؤمن کی گمشدہ میراث ہے۔''

3)...... تلبیس حق و باطل:

1)۔ تقلید شرک ہے (لیکن کونسی برحق ہے اور کس وقت غلط ہے یہ کبھی نہیں بتایا)

2)۔ ضعیف حدیث پر عمل کرنا تقریباً ایک جرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ (کہ جب بخاری صحیح ترین احادیث کا مجموعہ ہے تو ضعیف کیوں قبول کی جائے۔)

4)...... فقہی اختلافات کے ذریعے دین میں شکوک و شبہات پیدا کرنا:

1)۔ اپنا پیغام، مقصد اور متفق علیہ باتوں سے زیادہ مدارس اور علماء پر طعن و تشنیع پر زور دینا۔

2)۔ ایمان، نماز، روزہ، زکوۃ، حج کے بنیادی فرائض، سنتیں، مستحبات، مکروہات سکھانے سے زیادہ اختلافی مسائل میں الجھایا گیا۔ (پروپیگنڈا ہے کہ ہم کسی تعصب کا شکار نہیں اور صحیح حدیث کو پھیلا رہے ہیں۔)

دینی مسائل میں اجماع کی مخالفت

الہدیٰ انٹرنیشنل کی گمراہ کن سرگرمیوں کا جائزہ

اہل پاکستان کے مزاج میں عموماً پائی جانے والی بے احتیاطی اور لاپرواہی کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک غیر ملکی مندوب جب پاکستان کا دورہ مکمل کر کے جانے لگے تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے اہلیان پاکستان کو کیسا پایا؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے ملک میں ہر شخص ڈاکٹر ہے اور ہر شخص مفتی۔ یعنی کسی بیمار کے سرہانے چار آدمی جمع ہوں تو وہ اس کو کم از کم پانچ نسخے ضرور بتا جائیں گے، ایک اضافی اس لیے کہ غلطی کی گنجائش نہ رہے اور اگر کسی کو کوئی شرعی مسئلہ درپیش ہو تو جس کو بھی دو لفظ بولنے آتے ہوں وہ رائے دینے سے پیچھے نہیں رہے گا، حالانکہ طب اور افتاء دونوں نازک ترین شعبے ہیں۔ ایک کا تعلق انسان کی دنیوی زندگی کی بقاو فنا سے اور دوسرے کا اس کی آخرت کے بننے اور بگڑنے سے ہے، مگر ہم ان دونوں موضوعات میں اتنی ہی بے احتیاطی اور لاپرواہی کرتے ہیں کہ جتنی ہماری قومی تضحیک کا زیادہ سے زیادہ سبب بن سکے۔

حضرت والا حضرت اقدس مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ دینی مسائل میں ہر کس و ناکس کی جرأت گفتار پر سخت تنقید فرماتے ہوئے اس کو علامات قیامت میں سے شمار فرماتے اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

الف کو کیل جانیں سب بیچارے
مگر دعویٰ ہے سب کا اجتہادی

الہدیٰ انٹرنیشنل کے کارپردازان پر اس مزاج کا پرتو کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ اگر ان کی اب تک کی کارکردگی پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ عجیب وغریب بات سامنے آتی ہے کہ وہ دین سے دور مسلمانوں کو دین کے متفق علیہ مسائل کی طرف بلانے کے بجائے ایک ایک کر کے ان مسائل کو ان کے ذہن سے نکال رہے ہیں جن سے مسلمان کسی طرح کی ذمہ داری محسوس کرے اور جن کی بنا پر اس کے دل میں من چاہی زندگی بسر کرنے۔ کے بجائے اللہ ورسول کی بیان کردہ حدود وقیود کی پابندی کا احساس پیدا ہو۔ پچھلی قسط میں آپ نے پڑھا کہ ان کی بنیادی محنت اپنے شاگردوں اور متعلقین پر اس حوالے سے ہوتی ہے کہ وہ ائمہ کرام کی تحقیقات پر عمل کرنے کے بجائے ان کے مختلف اقوال میں سے اپنی سہولت کے مطابق انتخاب کر کے ان اقوال پر عمل کریں جن پر ان کا خواہش پرست دل ٹھکتا ہو۔ چونکہ یہ خطرناک طرز عمل باجماع امت حرام ہے اور اہل حق کے سلف وخلف میں کوئی اس کا قائل نہیں، اس لیے وہ اس باطل نظریے کی تائید وترویج کے لیے اکابر علمائے امت کی تحریرات میں تحریف واضافے جیسی قبیح حرکت پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ الہدیٰ والے حضرات نے شریعت کے جن مسائل میں جدت پیدا کر کے آزاد خیالی اور من مانی کا راستہ کھول دیا ہے ان کی فہرست کچھ کم نہیں۔ نماز سے جہاد تک اور تلاوت قرآن سے حج تک کوئی موضوع ان کی طبع آزمائی سے محفوظ نہیں رہا اور یہ سلسلہ جاری رہا تو نجانے کہاں تک پہنچے گا اور دین کا جو تصوراتی خاکہ یہ حضرات پیش کر رہے ہیں اس کی تکمیل

پر خدا جانے اسلام سے اس کا تعلق کس حد تک باقی رہے گا۔ شاید کسی کو یہ بات مبالغہ محسوس ہو لیکن اب تک جن مسائل میں ان کا جمہور امت سے جداگانہ نظریہ سامنے آچکا ہے اس پر ایک نظر ڈالیں تو حقیقت کچھ اس سے بھی زیادہ خوفناک صورت میں سامنے آتی ہے۔ تو آیئے آج پہلا مسئلہ دیکھتے ہیں۔ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ قضا شدہ نمازوں کی ادائیگی ضروری ہے صرف توبہ کافی نہیں۔ مگر الہدیٰ کی بانی ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ فرماتی ہیں: ''قضائے عمری کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس سلسلے میں ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے عالم اسلام کی ممتاز ترین علمی وروحانی شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب کی تلخیص پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اغلاط سے بچنے کی خاطر ہم عربی عبارات کے بجائے ان کے ترجمے پر اکتفا کریں گے۔

قضاءِ عمری کی شرعی حیثیت:

ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ درس قرآن دیتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیتی ہیں کہ ''قضاءِ عمری'' کا جو مسئلہ لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص نے بہت عرصے تک نمازیں نہ پڑھی ہوں پھر وہ نماز شروع کرے تو اسے قضائے عمری کے طور پر وہ نمازیں قضا کرنی چاہییں، قرآن وسنت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے بلکہ پچھلی زندگی میں جو نمازیں قضا ہوئی ہوں ان کی تلافی صرف توبہ سے ہو جاتی ہے، اتنی ساری نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ براہ کرم یہ واضح فرمائیں کہ کیا شریعت میں پچھلی نمازوں کی قضا واقعی ضروری نہیں ہے؟ اور کیا ائمہ اربعہ یا فقہائے کرام میں سے کسی کا مذہب یہ ہے کہ نمازیں زیادہ قضا ہو جائیں تو ان کی تلافی صرف توبہ سے ہو جاتی ہے اور قضائے عمری پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ان صاحبہ کا بتایا ہوا یہ مسئلہ صحیح نہیں ہے تو کیا ان کے درس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ نیز اگر قضائے عمری ضروری ہے تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

محمد رضوان کراچی

الجواب حامداً ومصلیاً

صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:

''جو شخص کوئی نماز پڑھنا بھول جائے تو اس پر لازم ہے کہ جب بھی اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے۔ اس کے سوا اس کا کوئی کفارہ نہیں۔'' (صحیح بخاری، کتاب المواقیت، باب نمبر 37، حدیث 597)

صحیح مسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں مروی ہے:

''جب تم میں سے کوئی شخص نماز سے سو جائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے تو جب بھی اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "أقم الصلاة لذكري" (میری یاد آنے پر نماز قائم کرو)۔'' (صحیح مسلم، آخر کتاب المساجد، حدیث نمبر 1569)

اور سنن نسائی میں مروی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز کے وقت سو جائے یا غفلت کی وجہ سے چھوڑ دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب بھی اسے نماز یاد آئے وہ نماز پڑھے۔'' (سنن النسائی، کتاب

المواقیت، باب فیمن نام عن صلاۃ، ص 71، ج 1)

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بیان فرما دیا ہے کہ جب کبھی انسان کوئی نماز وقت پر نہ پڑھے تو اس کے ذمے لازم ہے کہ متنبہ ہونے پر اس کی قضا کرے، خواہ یہ نماز بھولے سے چھوٹی ہو یا سو جانے کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی کی روایتوں میں اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت قرآنی "اَقم الصلاۃ لذکری" کا حوالہ دے کر یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ آیتِ قرآنی نماز کی قضا پڑھنے کے حکم کو بھی شامل ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کا یہ فریضہ ادا کرنے پر متنبہ ہو، اسے نماز ادا کرنی چاہیے۔

نمازیں قضا پڑھنے کا جو حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا احادیث میں دیا ہے اس کی بنیاد پر تمام فقہائے امت نے تصریح فرمائی ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازیں کتنی زیادہ ہوں، ان کی قضا ضروری ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی تمام مکاتب فکر اس پر متفق ہیں۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اگر فوت شدہ نمازیں بہت زیادہ ہوگئی ہوں تو ان کی قضا لازم نہیں، قرآن وسنت کے واضح دلائل اور ان پر مبنی فقہائے امت کے اتفاق کے بالکل خلاف ایک گمراہانہ بات ہے اور نماز جیسے اہم فریضے کو محض اپنی رائے کی بنیاد پر ختم کر دینے کے مترادف ہے اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ فوت شدہ نمازوں کیلیے بس توبہ کر لینا کافی ہے، اس لیے کہ توبہ کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کی جتنی تلافی بس میں ہو، وہ تلافی بھی ساتھ ساتھ کرے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ اصول حدیث کی بعض کتابوں میں موضوع احادیث کی علامتیں بیان کرتے ہوئے قضائے عمری کی حدیث کی مثال دی گئی ہے لیکن قضائے عمری کی جن روایات کو موضوع قرار دیا گیا ہے، ان سے مراد قضائے عمری کے بارے میں اس قسم کی روایات ہیں جو ایک نماز یا چند نمازوں کو عمر بھر کی نمازوں کے قائم مقام قرار دیتی ہیں اور علاوہ اس کے کہ اس قسم کی روایات کی کوئی سند نہیں ہے، ان کے موضوع ہونے کی وجہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ایک یا چند نمازیں سالہا سال کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی نہیں کر سکتیں اور اس پر امت کا اجماع ہے، لہٰذا اگر کسی کو ان احادیث کو موضوع قرار دینے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ قضائے عمری کا تصور ہی بے بنیاد ہے اور پچھلی نمازوں کی قضا لازم نہیں تو اس کا منشا جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

قضائے عمری کا صحیح طریقہ:

قرآن وسنت اور فقہائے امت کے اتفاق کی روشنی میں یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ جس مسلمان نے اپنی عمر کی ابتدا میں نمازیں اپنی غفلت یا لاپروائی کی وجہ سے نہ پڑھی ہوں اور بعد میں اسے تنبہ اور توبہ کی توفیق ہو، اس کے ذمے یہ ضروری ہے کہ اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کا محتاط حساب لگا کر انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔

بعض علماء نے مزید آسانی کے لیے یہ طریقہ بتایا ہے کہ انسان روزانہ ہر فرض نماز کے ساتھ اسی وقت کی ایک قضا نماز پڑھ لیا کرے، اس طرح ایک دن میں پانچ نمازیں ادا ہو جائیں گی، البتہ جب موقع ملے اس سے زیادہ بھی پڑھتا رہے۔

البتہ قضا پڑھنے میں نیت کا خیال رکھا جائے یعنی واضح طور پر قضا کی نیت کی جائے، مثلاً فجر کی قضا پڑھ رہے ہیں تو یہ

نیت کریں کہ میرے ذمے فجر کی جو سب سے پہلی نماز واجب ہے اس کی قضا پڑھ رہا ہوں۔

خلاصہ:

یہ ہے کہ انسان سے جو نمازیں چھوٹ گئی ہوں ان کی قضا اس کے ذمہ لازم ہے، صرف توبہ کر لینے سے وہ معاف نہیں ہوتیں خواہ کتنی زیادہ ہوں، البتہ اگر وہ روزانہ پانچ نمازوں کی قضا شروع کر دے اور جب زیادہ پڑھنے کا موقع ملے زیادہ بھی پڑھے اور ساتھ ہی یہ وصیت بھی کر دے کہ جو نمازیں میں اپنی زندگی میں ادا نہ کر سکوں ان کا فدیہ میرے ترکے سے ادا کیا جائے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ قبول فرما کر اس کی کوتاہی کو معاف فرمادیں گے۔ قضائے عمری کا صحیح طریقہ یہی ہے اور یہ کہنا کہ قضائے عمری پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف توبہ کافی ہے، گمراہی کی بات ہے اور جو شخص نماز جیسے بنیادی فریضے میں محض اپنی رائے سے کسی دلیل کے بغیر اس قسم کی گمراہانہ بات کی تلقین اور اس پر اصرار کرے اس کے درس پر ہرگز پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی

دارالافتاء دارالعلوم کراچی نمبر 14

13 / رجب 1422ھ

آپ نے دیکھا کہ اس فتویٰ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے حسب عادت کس عالمانہ تحقیق اور معتدل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ الہدیٰ کے کارپردازان سے یہ تو نہ ہو سکا کہ وہ عوام الناس سے نماز قضا کرنے کا گناہ چھڑانے کی محنت آگے بڑھا سکیں تو انہوں نے ان پر یہ احسان کر دیا کہ گذشتہ قضا نمازوں کی فکر سے انہیں آزاد کر دیا۔ یعنی مسلمان کے پاس احساس گناہ کی صورت میں مغفرت کا جو آخری بہانہ ہوتا ہے اس سے بھی اسے محروم کرنے کا سامان کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہماری حالت پر رحم فرمائے۔

عذر گناہ بدتر از گناہ

ڈاکٹر خالد عزیز کی طرف سے وضاحت کی گئی ہے کہ مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی کتاب ''وحدت امت'' (جو ادارہ الہدیٰ انٹرنیشنل کی طرف سے شائع ہوئی) کے صفحہ 8 کے آخر پر حاشیہ کی عبارت ٹائپسٹ (کمپیوٹر) کی غلطی سے متن میں شامل ہو گئی ہے۔ متن کی عبارت میں جو مضمون بیان ہو رہا تھا اس کی وضاحت کے سلسلے میں حاشیہ کی جو عبارت متن میں شامل ہو گئی تھی، اس عبارت کا مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ کی تحریر سے کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر خالد عزیز نے کہا کہ غلطی سے متن کی عبارت میں جو زیادتی ہو گئی ہے اس پر ادارہ الہدیٰ انٹرنیشنل کی طرف سے اور میں اپنی طرف سے (کیونکہ یہ حاشیہ میں نے لکھا تھا) جامعہ دارالعلوم کراچی کے قابل احترام علمائے کرام اور عوام سے معذرت خواہ ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس اعتذار کے بعد تلخی کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔

الہدیٰ انٹرنیشنل کی یہ وضاحت عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے اس لیے کہ: (1) کتاب کے شروع یا آخر میں کہیں یہ وضاحت نہیں کہ اس ایڈیشن میں حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ فلاں کے قلم سے ہے۔ (2) کسی دوسرے مصنف کی کتاب کے حاشیے پر ایسی کوئی بات درج کرنا جو اس مصنف کی اپنی سوچی سمجھی رائے اور عمر بھر کی تحقیق کے خلاف ہو، بدترین علمی بددیانتی ہے خصوصاً جبکہ محشی آخر میں قوسین کے درمیان اپنا نام لکھ کر یہ وضاحت بھی نہ کرے کہ یہ فٹ نوٹ کس کا ہے تو قاری اسے مصنف ہی کی طرف منسوب کرے گا لہٰذا حاشیے کو متن میں شامل کرنا کمپوزر کی غلطی مان بھی لی جائے تو یہ بات اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ ڈاکٹر خالد عزیز صاحب اپنی علمی حیثیت سے قطع نظر حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ جیسے عالمی سطح کے مدبر اور بلند پایہ عالم دین کی کتاب پر چار سطری اکلوتا حاشیہ چڑھانا ہی چاہتے تھے تو انہوں نے اسے اپنی طرف منسوب کیوں نہ کیا؟ کیا اس کے آخر میں ان کے نام کا حذف کرنا بھی کمپوزر کی غلطی تھی؟ (3) جامعہ دارالعلوم کراچی کے اکابر دو ماہ تک الہدیٰ سے رابطہ کر کے اس سنگین غلطی پر انتباہ کرتے رہے ہیں بالآخر مجبور ہو کر انہیں اس تحریف سے عوام الناس کو آگاہ کرنا پڑا، آج اس واقعے کو کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سارے عرصے میں اس غلطی کا اظہار کر کے معاملہ ختم کیوں نہ کیا؟

یہ سارے قرائن بتلاتے ہیں کہ تحریف کے بعد اب کذب بیانی کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ افسوس کہ ہمارا اخلاقی انحطاط اس قدر بڑھ گیا ہے کہ سو جھوٹ بولنا ایک جھوٹ سے توبہ کرنے کی بنسبت زیادہ سہل ہو چکا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے اعتذار کی بات ہے تو عمد کو خطا قرار دے کر معذرت کرنا، اعتذار نہیں، پہلے سے زیادہ سنگین جرم ہے اور یہ اس وقت تک جرم رہے گا جب تک جان بوجھ کر کیے گئے کام کو ماتحت عملے کی غلطی کا لبادہ اوڑھانے کی کوشش کی جاتی رہے گی۔

پانچواں باب

خاندانیات

ہمدردی یا نسل کشی؟

تحدید آبادی پروگرام، جسے ہمارے ہاں بہبود آبادی پروگرام کہا جاتا ہے، کی مہم چلانے والے سرکاری ادارے کی طرف سے آج کل ایک اشتہاری بورڈ نصب کیا جارہا ہے جس میں قرآن پاک کی ایک آیت غلط معنی و مفہوم میں پیش کی جارہی ہے۔ ہمارے ایک محترم قاری نے آزاد کشمیر سے اس اشتہاری بورڈ کی تصویر بھیجی ہے۔ جس میں وزارتِ بہبود آبادی کا مونوگرام نمایاں ہے اور اس میں آیت کریمہ کو تحریفی معنی میں ملفوف کر کے ایک ایسی چیز کی تشہیر کے لیے درج کیا گیا ہے جو شرعاً تو ہے ہی غلط، عقلی اور سیاسی لحاظ سے بھی خود اپنا گلا گھونٹنے اور اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی پر مذہبی، اخلاقی اور نظریاتی حوالے سے ہمارے ہاں سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے اور اس بارے میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس مہم کا بنیادی فلسفہ ہی اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت کی توہین کے مترادف ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں مذہبی اقدار اور روحانی اخلاقیات پر ایمان بالغیب کا تصور چونکہ کمزور پڑ گیا ہے اس لیے زیر نظر مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع پر قطعاً معروضی انداز میں بحث کی جائے اور عالمی استعماری طاقتوں کی طرف سے بہبود آبادی اور انسانیت کی بھلائی کے نام پر اس مہم کو جس زور وشور سے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں چلایا بلکہ مسلط کیا جارہا ہے، اس کے حقیقی اسباب ان قابلِ رحم برادرانِ اسلام کے سامنے پیش کیے جائیں جن پر اس مہم کا نگران اور سرپرست امریکا دہرا ظلم کر رہا ہے۔ ان کے وسائل بھی لوٹے جارہے ہیں اور ان وسائل کی حفاظت کے لیے آیندہ کھڑی ہونے والی نوجوان نسل کو بھی درگور کیا جارہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آبادی کم کرنے کے مہنگے منصوبوں اور کثیر المصارف مہموں کی بنیاد پسماندہ ممالک کی خیر خواہی اور ہمدردی پر نہیں بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی سیاسی اور جنگی حکمت عملی ہے، جس کا مقصد صرف اور صرف امریکا کی سیاسی برتری اور معاشی بالادستی کو قائم رکھنا ہے۔ آبادی کی فلاح و بہبود اور انسانیت کی بھلائی کے نام پر امریکا اور اس کا بھونپو بجانے والی اقوام متحدہ کی طرف سے جو کروڑوں ڈالر اور بیش بہا ادویات وآلات پسماندہ ملکوں اور ترقی پذیر ممالک میں خرچ کیے جارہے ہیں، ان کا اصل مقصد ان پسی ہوئی درماندہ اقوام کی صحت، تعلیم، خوراک یا معیار زندگی میں بہتری لانا نہیں، بلکہ ان کو مفلوج ومعذور کر کے محکوم بنانا اور اپنے غلبہ، طاقت اور مفادات کو مستحکم کرنا ہے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کو ناقابل یقین معلوم ہوگی لیکن ذیل کی سطور گواہی دیں گی کہ امریکا اور عالمی مالیاتی اداروں نے دجال کے مخصوص ہتھکنڈے، دجل وفریب کو اس خوبی سے برتا ہے کہ ظالم، محسن کی اور قاتل، ہمدرد کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور مظلوم اپنے دشمن کو پہچاننے پر بھی قادر نہیں رہے۔

اگر امریکا کو پسماندہ ممالک کی ترقی اور بھلائی مقصود ہے تو اسے ایسی بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی پر توجہ دینی چاہیے جو ان ملکوں میں ناپید ہیں۔ مثلاً: قحط زدہ آبادی کے لیے خوراک، بیمار یا زخمی کے لیے علاج، مہاجرین کے لیے پناہ گاہ، یا بے گھروں کے لیے سر چھپانے کی جگہ کی فراہمی۔ ایسی ہی بنیادی انسانی ضرورتیں ہیں جن کی ان ممالک کو کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے

باوجود ریاست ہائے متحدہ امریکا کی حکومت اور اس کی ایجنسیوں کا اصرار ہے کہ ان بنیادی ضرورتوں پر ''تحدید آبادی'' کے پروگراموں کو فوقیت دی جانی چاہیے۔ ان ایجنسیوں میں ''ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی''، ''وزارت خارجہ''، ''وزارت دفاع''، ''سی آئی اے'' اور ان سب اداروں میں تعامل وارتباط کی ذمہ دار اعلیٰ ترین ایگزیکٹو باڈی یعنی ''قومی سلامتی کونسل'' شامل ہے اور یہ امریکی سرکاری ادارے، اقوام متحدہ کے دور دور تک رسائی رکھنے والے اداروں، قرض دینے والے طاقت ور عالمی اداروں، بے شمار نجی فاؤنڈیشنوں، ملٹی نیشنل کارپوریشنوں اور دنیا کے ہر دوسرے صنعتی خطوں میں سیاسی لیڈروں کی روز افزوں تعداد کے ساتھ مل کر یہ سارا کام کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ اتنا اہم مشن ہے کہ آج بہبود آبادی اور منصوبہ بندی کا پروگرام، جو بڑی حد تک امریکی سی آئی اے کے خفیہ اطلاعاتی تجزیوں پر مبنی ہے، 1950ء کی دہائی کی انتہائی جارحانہ سیاسی جنگی مہمات کی سی وسعت اور خصوصیات کا حامل ہو چکا ہے۔ یہ پروگرام ہر لحاظ سے مکمل ہے کہ در پردہ ''مقامی'' محاذ بھی قائم ہیں، سیاسی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے لیے خفیہ ادائیگیاں بھی ہو رہی ہیں، بر محل (In-place) ایجنٹوں کی تقرری بھی ہوتی ہے، دانش وروں اور درس گاہوں میں نفوذ بھی ہے، مخالفین کو خوف زدہ کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کا باقاعدہ انتظام ہے، فریب کارانہ رابطے ہیں، میڈیا میں عمل دخل ہے، دھمکیاں ہیں اور مقررہ اہداف اور الٹی میٹم ہیں۔

پسماندہ لیکن معدنیات اور قدرتی وسائل سے مالا مال تیسری دنیا کے ممالک میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی توجہ کئی طرح کے مفادات پر مرکوز ہے مثلاً شرق اوسط کے تیل تک رسائی، افریقہ کے اہم معدنی وسائل پر تسلط، دنیا بھر میں امریکی سرمایہ کاری اور دوسرے مالی مفادات کا تحفظ، دنیا کی بڑی عالمی آبی گزر گاہوں مثلاً نہر سوئز، نہر پانامہ اور آبنائے ہرمز اور آبنائے ملاکا، کا استعمال اور بالخصوص ایشیا میں فوجی اڈے۔ ان سارے مفادات کے تحفظ کا مرکزی نکتہ صرف ایک ہے یعنی مخالفین کی آبادی میں کمی اور ان کی نئی نسل کی تحدید۔ اس بات کو سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ چھوٹی آبادیوں کی نسبت بڑی آبادیوں کے لیے منظم ہو کر اپنی طاقت منوانا آسان ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا امکان زیادہ ہے کہ ایک بڑی آبادی کو چھوٹی آبادی پر کنٹرول حاصل ہو بہ نسبت اس کے کہ چھوٹی آبادی کو یہ طاقت حاصل ہو۔ آبادی بڑھتی ہے تو اسے اپنے قدرتی وسائل کی بھی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا اثر خام لوہے اور تیل وغیرہ جیسے برآمدی اموال کی قیمت پر پڑتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک انہیں اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے لیکن یہ اشیا روایتی طور پر مغربی صنعتی برتری قائم کرنے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ترقی یافتہ ممالک دنیا کی پیداوار کا بڑا حصہ پیدا بھی کرتے ہیں اور صرف بھی کرتے ہیں اور اس طرح غریب ممالک کی معدنی دولت کی بنیاد پر بین الاقوامی تجارت کے میدان میں اپنے آپ کو آگے رکھنا چاہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ترقی یافتہ ممالک بڑی بڑی فوجی قوتیں تشکیل دینے اور علاقائی بلکہ عالمی تنازعات پر چھا جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس کے لیے مطلوبہ طاقت انہیں پسماندہ ممالک پر گرفت قائم رکھنے سے ملتی ہے اور تحدید آبادی کا پروگرام اس کا مؤثر ذریعہ ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے اس فکر نے پریشان کر رکھا ہے کہ آبادیوں کے حجم اور تقسیم وسائل میں واقع ہونے والے فرق کی وجہ سے وہ بالآخر دنیا کی قیادت سے معزول ہو جائے گا۔ گویا دنیا بھر کی قیادت داؤ پر لگی ہوئی ہے، لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اثر ورسوخ کے جو بھی ذرائع اور وسائل میسر ہیں، ان سے ایسے اقدامات کیے جائیں جن کا براہِ راست اثر زیادہ

شرح پیدائش والے معاشروں میں افزائش کی شرح کم کر کے ہو۔ اس مقصد کے لیے امریکا نے عالمی بینک پر اپنے اثر ورسوخ کو بہت مؤثر طور پر استعمال کیا ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ ممالک پر غیر مقبول آبادی پالیسیاں ٹھونسے۔ عالمی بینک نے تحدید آبادی پروگراموں کے لیے 1980ء کی دہائی میں دس کروڑ ڈالر سالانہ سے کچھ رقم مہیا کی تھی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ 1995ء تک آبادی کے شعبہ کے لیے قرض کی رقم بڑھا کر ڈھائی ارب ڈالر کر دے۔ اگر کسی ملک پر کسی بہت بڑے ''جرم'' مثلاً ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے اقتصادی پابندیاں لگ جائیں پھر بھی عالمی بینک کی طرف سے منصوبہ بندی کی مہم کے لیے اس ملک کے فنڈ نہیں روکے جاتے۔ عالمی بینک جب قرض کو ''ترغیب'' کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ترقیاتی فنڈ کو روک کر بطور ''دباؤ'' کے کام میں لاتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ سربراہانِ مملکت اور اہم سرکاری وزارتوں کا نیم دلانہ تعاون تحدید آبادی کے ایک باقاعدہ منصوبہ کے لیے حاصل کر لے۔ اس طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں شرح آبادی کافی گھٹ جائے اور مغرب کی کمزور پڑتی آبادیاتی کیفیت کو سنبھالا مل جائے۔ ان ممالک میں ہوتا یہ ہے کہ قرضہ وصول کر لینے کے بعد یہ پالیسیاں متاثرہ آبادیوں پر ''اوپر سے ٹھونسی'' جاتی ہیں۔ ان پر کسی طرح کا عوامی مباحثہ نہیں ہوتا اور اکثر...... کم از کم ابتدا میں...... یہ واضح طور پر تسلیم بھی نہیں کیا جاتا کہ ایسے منصوبے اپنائے گئے ہیں۔ قرض لینے والے ممالک کی حکومتیں خود اپنے ان عوام کے خلاف صف آرا ہو جاتی ہیں جن کی حفاظت کی وہ ذمہ دار سمجھی جاتی ہیں۔ وہ ان کے نام پر قرضہ لیتی ہیں اور پھر اسے انہی کی نسل کشی کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کئی دہائیوں سے اس نظریے کی تشہیر کر رہا ہے کہ ''جدید خاندانی منصوبہ بندی'' لوگوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ بچے تھوڑے ہوں تو مائیں صحت مند ہوں گی۔ چھوٹے کنبوں کا معیار زندگی بہتر ہوتا ہے۔ شرح آبادی سست رو ہوگی تو ترقیاتی عمل پائیدار ہوگا۔ انجام کار لوگ تھوڑے ہوں گے تو سیاسی لیڈروں کی سردردی بھی کم ہوگی وغیرہ وغیرہ...... لیکن کیا امریکی حکومت واقعی ان باتوں پر یقین رکھتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ امریکا میں نتائج اس کے برعکس مرتب ہوئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب امریکا بڑی حد تک دیہاتی معاشرہ تھا۔ گھرانوں کی ایک بڑی اکثریت کاشت کاری کرتی، فصل کاٹتی، اور سنبھالتی تھی، یا لوگ چھوٹے تاجر پیشہ تھے۔ ایک عام کنبہ پانچ سے سات بچوں پر مشتمل ہوتا تھا...... اس صورتِ حال نے امریکا کو ایک ''ترقی یافتہ'' ملک کے طور پر ابھرنے اور عالمی طاقت بننے سے نہیں روکا، بلکہ جس دوران امریکا طاقت کی سیڑھی پر چڑھ رہا تھا، اس دوران اس کی آبادی حیران کن شرح سے بڑھ رہی تھی۔ 1790ء اور 1840ء کے درمیان پچاس برسوں میں امریکی آبادی 4 ملین سے بڑھ کر اندازاً 18 ملین ہوئی۔ یہ تقریباً پانچ گنا اضافہ ہے۔ تین دہائیاں بعد یعنی 1870ء میں یہ آبادی مزید دوگنی سے بھی زیادہ یعنی 38.5 ملین تھی۔ اگلے دس برسوں میں (1870ء اور 1880ء کے درمیان) 37 فیصد اور اضافہ ہوا اور آبادی 50 ملین سے زیادہ ہوگئی۔ صدی اختتام کو پہنچی تو امریکی آبادی 76 ملین تھی...... یہ سو برسوں میں پندرہ گنا اضافہ ہے۔ اس کے بعد 1900ء سے 1940ء کے درمیان چالیس سالوں میں امریکی آبادی میں شرح افزائش آج کے بہت سے ترقی پذیر ممالک سے اونچی تھی اور اس کے نتیجے میں مزید 56 ملین افراد کا اضافہ ہوا۔ یہ سب تب ہوا جب امریکا نے اپنی پیداواریت (Productivity) اور دنیا میں اپنے مقام و مرتبہ میں بے حد مؤثر اضافہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آبادی میں اس اضافہ کا معتد بہ حصہ، بالخصوص بعد کے سالوں میں، بیرونی آبادکاروں کی وجہ سے ہوا اور کسی معاشرے کے لیے مقامی طور پر پیدا ہونے

والوں کی بہ نسبت باہر سے آنے والوں کو کھپانا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اندرونی اور بیرونی آبادی کی بڑھوتری امریکا کی ترقی میں کسی طرح رکاوٹ نہ بنی تو دوسرے ممالک میں یہ کس طرح ترقی کی راہ میں مشکلات پیدا کرسکتی ہے؟

عجیب مذاق یہ ہے کہ جب معاملہ خود اپنے ملک کا ہو تو ترقی یافتہ ممالک آبادی میں اضافہ کو مفید قرار دے کر خوش آمدید کہتے ہیں۔ مغربی یورپ کے کئی نسبتاً خوش حال اور کثیف آبادی والے ممالک نے ایسے قانونی اقدامات کیے ہیں کہ ان کے ہاں شرح ولادت بڑھ جائے۔ مثلاً اقوام متحدہ کی پاپولیشن پالیسیوں کی ڈائریکٹری کے مطابق فرانس نے اعلان کیا ہے کہ اس کے ہاں تولیدی شرح بہت کم ہے، چناں چہ اس نے گھرانوں کو دی جانے والی امداد کے نظام میں ایسی تبدیلیاں کی ہیں کہ ''نوجوان اور بڑے کنبوں کو زیادہ فائدہ ملے'' فرانسیسی حکومت نے چند اور اقدامات بھی کیے ہیں، جیسے شادی شدہ گھرانوں کو بہتر رہائشی سہولتیں، نوجوان جوڑوں کو کم شرح سود پر قرض کی فراہمی، اور ایسے قوانین کا اجرا کہ دوران حمل چھٹی کی ضمانت میسر رہے۔ ان سب کا اعلان شدہ مقصد ایک ہے، یعنی پیدائش اطفال کی شرح کو مناسب سطح تک اُٹھانا۔ اسی طرح سوئزرلینڈ نے بھی اپنی شرح آبادی کو ناکافی قرار دیا ہے۔ سوئس حکومت کی کوشش ہے کہ وہ ''ہر شعبہ میں بالخصوص بچوں اور گھرانوں کے لیے معاشی تحفظ اور بہبود کی ایسی فضا پیدا کردے جو بالواسطہ شرح تولید کو بڑھادے۔'' شادی شدہ جوڑوں کے لیے الاؤنس کا ایک نظام بھی کام کر رہا ہے جیسے کہ زچگی کے دوران کام سے چھٹی اور بیمہ کی سہولت موجود ہے۔ مغربی جرمنی نے بھی 1984ء میں ''حیات پسند'' (Pro-natalits) پالیسی کا اعلان کیا جس کے تحت سالانہ دو لاکھ جرمن بچوں کی اضافی پیدائش مقصود تھی۔ اس پالیسی میں ہر ماں کو جب تک اس کا نومولود سال بھر کا نہ ہو جائے 200 ڈالر کا خصوصی الاؤنس ملتا ہے۔ اس پالیسی میں ایک ترمیم کے ذریعہ والدین کے لیے چھٹی کی شقیں ڈالی گئی ہیں اور وضع حمل کے بونس میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یونان نے بھی ایک قانون نافذ کیا ہے جس کے تحت حاملہ خاتون کو کام سے نکالنے کی ممانعت کردی گئی ہے، زچگی کی 14 ہفتہ کی چھٹی لازمی کردی گئی ہے، اور زیادہ بچوں والے گھرانوں کے لیے ''بچوں کی بہبود کا الاؤنس'' مقرر کردیا گیا ہے۔ یہ تمام اقدامات اس لیے ہیں تاکہ ولادت اطفال میں اضافہ ہو۔ کئی اور یورپی ممالک میں بھی ''خاندان کے لیے فوائد و مراعات'' طے کیے گئے ہیں لیکن معاملہ جب غریب ممالک کا آتا ہے تو سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر زور دیتے ہیں کہ ان ممالک کو اپنی آبادی کم کرنی چاہیے۔

رنگ دار ممالک کی تحدید آبادی کے مسئلہ میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے کی یہ دوڑ محض اتفاقی نہیں۔ سینکڑوں نشریات، خبری تراشے اور پمفلٹس بار بار زور دیتے ہیں کہ آنے والے برسوں میں ہر بیس میں سے اُنیس بچے ترقی پذیر دنیا میں پیدا ہوں گے۔ دنیا میں آیندہ نسلوں کی لسانی ترکیب کا فیصلہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ ایک طرف یورپی نسل کے پانچ نوجوان ہوں گے اور جواب میں 95 عرب، افریقی، ایشیائی، لاطینی امریکی اور دوسرے افراد ہوں گے۔ امریکا میں موجود اور میسر لٹریچر، جس سے اسلام کے ایک عالمی طاقت کے طور پر اُبھرنے کے متعلق مغرب کے اختلال ذہنی کا پتا چلتا ہے، حیرت انگیز طور پر زیادہ ہے۔ اس میں اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں: ''ہمیں ایک ایسے خطرے کا مسلسل تجربہ ہو رہا ہے جس کی قوت محرکہ نہ سیاسی ہے نہ اقتصادی، بلکہ اس کی جڑیں انقلابی اسلامی بنیاد پرستی کی تحریک میں پیوست ہیں جو بالعموم امریکا مخالف ہے اور پرعزم ہے کہ شرق اوسط اور افریقہ میں پھیلتی جائے گی۔ یہ ''عام خطرات'' نامی کانفرنس کے لیے تیار کردہ ایک رپورٹ کے الفاظ ہیں۔ ہر قابل تصور اور ممکنہ

ذریعہ سے تیار شدہ ایسی ہزاروں رپورٹیں، خبرنامے اور سیاسی تجزیے ہیں، جن میں قریب قریب یہی ملتا جلتا پس منظر ملے گا۔ اور دنیا کے دونوں کناروں سے یہی دعوے سنے جا رہے ہیں کہ مغربی طاقتوں سے اگلا مقابلہ بالیقین مسلم دنیا کی طرف سے ہوگا۔ افریقہ سے پاکستان تک مسلم اقوام کے ریلے کی شکل میں جدوجہد ہوگی کہ ایک نیا عالمی نظام وجود میں آئے۔ مشرقِ اوسط اور جنوبی ایشیا کی ایک چوتھائی سے ایک تہائی تک آبادی، سیاسی طور پر بے چین اور سیماب صفت 15 تا 24 برس عمر والے گروپ پر مشتمل ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس اونچی شرح افزائش کا جو 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں موجود رہی۔ یہ 1984ء میں تیار شدہ سی آئی اے کے ایک خفیہ انٹیلی جنس جائزے کے الفاظ ہیں، مذکورہ جائزہ کہتا ہے کہ ''یہ نوجوان مخالفانہ مقاصد (مثلاً) اسلامی بنیاد پرستی کے لیے بھرتی کا تیار مال ہوگا، جو فی الوقت مسلم نوجوان کے سامنے سب سے بڑی نظریاتی پناہ گاہ ہے......'' اس طرح کی رپورٹوں کے ذریعے ڈولتی پھسلتی دنیا کے تصور کو، جسے کسی بھی لمحے امریکا کے ہاتھوں سے جھٹک کر چھینا جاسکتا ہے، مغرب کے سیاسی تجزیہ نگار بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔

امریکا اور مغرب کو مستقل خطرہ نئی نسل کے نوجوانوں سے ہے۔ یہ نوجوان رنگ دار نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں جو کم تر اہلیت اور اہمیت کی حامل ہیں، اس کے باوجود خدشہ یہ ہے کہ وہ محض اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر دنیا میں تسلط اور غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ رنگ دار اقوام کی اس بڑھتی ہوئی آبادی کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکا اور یورپ کا اپنی آبادی کو بڑھانا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ امریکا اور یورپی اقوام خاندانی نظام کو تباہ کرکے اپنی آبادی کی شرح خطرناک حد تک کم کرچکی ہیں اور نوبت اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ عام یورپی اور امریکی فرد، خاندان اور بچوں کے کسی جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتا اور "Enjoy thyself" کے معروف مغربی اصول کے تحت اپنی زندگی ذمہ داری سے پاک اور عیش و عشرت سے بھرپور گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ مغربی پالیسی سازوں کو اب یہی حل نظر آتا ہے کہ دوسرے خطے کے لوگوں کی آبادیاں بھی اس حد تک کم کردی جائیں کہ کبھی ان کے مقابل آنے کا خطرہ پیدا نہ ہوسکے۔ اس کے لیے گزشتہ کئی دہائیوں سے ایک ہمہ پہلو مہم چلائی جارہی ہے۔ علمی و نظریاتی سطح پر لٹریچر کی تیاری اور اشاعت، ابلاغی محاذ پر سرگرمی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی میدانوں میں آبادی کے حوالہ سے مطلوب پالیسی اقدامات اور ان اقدامات کے لیے بااثر حلقوں کی حمایت کا حصول اس ہمہ پہلو مہم کے اہم عنوانات ہیں۔ اور حکمت عملی یہ ہے کہ براہِ راست بھی اور بالواسطہ طور پر عالمی اداروں کے ذریعہ بھی غربت کے خاتمہ، اقتصادی ترقی اور ماں اور بچے کی صحت جیسے پروگرامات کے پردے میں تحدید آبادی کی مہم کو کامیاب بنایا جائے۔ اس ضمن میں اگر ترغیب و تحریص سے کام نہ نکل سکے تو جنگ، جبر، زورازوری زبردستی حتیٰ کہ ایٹمی اور کیمیائی جنگ کے بارے میں بھی سوچنے اور عمل کرنے کے لیے تیار رہا جائے۔ بظاہر یہ سب کچھ بہت خوف ناک اور ناقابلِ یقین ہے لیکن وہ حقیقت ناقابل تردید ہے یہی ہے کہ ''خاندانی منصوبہ بندی'' طاقت، سیاست اور مفادات کا عالمی کھیل ہے جس کا ایک مہرہ بن کر ہم اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب میں تحریف کرنے سے بھی نہیں چُوک رہے۔ یہ بدنصیبی کی انتہا ہے کہ ہم دشمنوں کے ملت کش منصوبوں کو قرآن پاک سے استدلال کرکے نافذ کرتے پھریں۔ ان بے باکیوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہمارا یوم حساب قریب آگیا ہے۔ فیصلہ حق کی گھڑی قریب آن پہنچی ہے۔ ہمارے نام قرعہ تقدیر نکلنے کو ہے اور لگتا ہے ہمیں حساب کتاب اتنی جلد چکانا پڑے گا کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔

سات سچ ایک جھوٹ

پچھلے کالم میں خاندانی منصوبہ بندی مہم کے پیچھے کارفرما عالمی استعماری طاقتوں کے اصل مقاصد کی نقاب کشائی کی کوشش کی گئی تھی، زیرِ نظر مضمون میں ان فریبی وعدوں اور جھوٹے فائدوں کی حقیقت آشکارا کی جائے گی جو اس حوالے سے کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس مہم سے ماں اور بچے کی صحت کو فائدہ پہنچتا ہے، نیز وسائل کم ہیں اور افراد زیادہ، اس لیے اگر بچے کم ہوں گے تو سب کے لیے صحت، تعلیم وغیرہ کی سہولتیں وافر ہوں گی اور چھوٹا گھرانہ خوشیوں کا خزانہ ثابت ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ دراصل یہ ساری باتیں جھوٹ اور فریب کا پلندہ ہیں لیکن اتنی کثرت سے پھیلائی گئی ہیں کہ عام آدمی ان کے بودے پن اور جھوٹ کو پکڑ نہیں سکتا۔ اس سلسلے میں اس مشہور دجالی اصول پر عمل کیا گیا ہے کہ: ''اگر تم کسی شخص کو سات برس تک صحیح معلومات دیتے رہے، تو آٹھویں سال کے پہلے دن وہ تمہاری بتائی ہوئی غلط بات پر یقین کر لے گا۔ اگر تمہیں ضرورت لاحق ہو اور تم اپنے نقطہ نظر سے چاہو کہ اسے غلط معلومات دی جائیں تو تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے پروپیگنڈا کو قابل اعتماد اور مستند بنا دو اور اپنے دشمن کے پیچھے پڑے رہو کہ وہ تم پر بھروسہ کرے، اگرچہ تم اس کے دشمن ہی رہو......'' (نفسیاتی جنگ پر ایک کتاب A Psychological Warfare Casebook (Baltimore, 1958), 38. سے ماخوذ) ہم ذیل میں مرحلہ وار ان سب چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ ہمارے وہ بھائی جو اپنے ہاتھوں اپنی نسل کو درگور کر رہے ہیں، حقیقت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

ان پروگراموں کی افادیت کے حوالے سے جس چیز کو سب سے زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے وہ ہے ماں اور بچے کی صحت، حالانکہ ان دواؤں کے استعمال سے ماں اور بچے کے لیے جو خطرناک نقصانات سامنے آئے ہیں وہ اس دعوے کی سختی سے نفی کرتے ہیں مثلاً ''ڈالکن شیلڈ'' ایک آلہ ہے، جو عارضی بانجھ پن پیدا کرتا ہے۔ 1970ء کی دہائی میں اس کی وجہ سے بہت سی اموات ہوئیں اور یہ ایک تاریخی عدالتی فیصلے کا موضوع بنا۔ اس کے باوجود بھی اسی طرح کے لاکھوں کروڑوں اختراعی آلات امریکا سے برآمد کیے جاتے ہیں اور انہیں ترقی پذیر اسلامی ممالک میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ان کے استعمال میں ممکنہ خطرات سے بھی ان سادہ لوح مسلمان خواتین کو آگاہ نہیں کیا جاتا جو انہیں استعمال کرتے ہوئے ہچکچا رہے ہوتے ہیں۔ نور پلانٹ (Norplant) اسی طرح کا ایک اختراعی آلہ ہے جسے سرجری کے ذریعہ خاتون کے بازو میں جلد کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ کئی طرح کی پیچیدگیوں کا باعث بنتا ہے۔ کئی رپورٹس اور شکایات ہیں کہ بعض استعمال کنندگان کو ضعف وناتوانی کی شکایت ہوئی لیکن خاندانی منصوبہ بندی کے ''نگرانوں'' اور ان کے آلۂ کار ڈاکٹروں نے وہ آلہ جلد کے نیچے سے ہٹانے سے انکار کر دیا۔ ٹیکے (Injectables) جو زیادہ عرصہ کام کرنے والی مانع حمل دوائیں ہیں، کے متعلق بھی متعدد شکایتیں ہیں کہ یہ ماں اور بچے دونوں کی صحت کو نقصان دیتی ہیں لیکن پھر بھی یہ دوائیں ''خاندانی منصوبہ بندی'' کے لیے کی جانے والی عالمی کوششوں میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔

پھر منع حمل کے بہت سے تجرباتی طریقے ہیں جنہیں انتہائی کم ترقی یافتہ ممالک میں مفلوک الحال خواتین پر استعمال کرتے ہوئے من مانی (Arbitrary) خوراکیں دی جاتی ہیں۔ ان غریب عورتوں کو امکانی طور پر مہلک پیچیدگیوں کی صورت میں طبی امداد اور علاج بھی مہیا نہیں کیا جاتا۔ نئے طریقوں میں سے جن پر طبی تجربات ہو رہے ہیں ایک ''دافع حمل ویکسین'' ہے جس کا اثر سال بھر رہتا ہے۔ ابھی اس کے عواقب ونتائج کا کچھ پتا نہیں۔ اس کے باوجود یہ ویکسین تجرباتی طور پر 1985ء کے بعد سے اقوام متحدہ کی طرف سے زیرِ استعمال ہے۔ کینا کرائن (Quinacrine) ایک اور ایسی ہی امریکی دوا ہے جس نے کافی تشویش پیدا کردی ہے۔ یہ مستقل بانجھ پن پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ امید ہے کہ مستقبل میں بانجھ پن کے غیر سرجیکل طریقے کے طور پر اس کی بڑی مانگ رہے گی۔ ''انٹرنیشنل جرنل آف گائینوکالوجی اینڈ آبسٹیٹرکس'' نے 1989ء کے ایک جائزہ میں زور دے کر یہ بات کہی گئی ہے کہ مذکورہ دوا میں یہ صلاحیت ہے کہ اس سے صرف بھارت میں سالانہ 10 لاکھ نسوانی نس بندیوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ''کینا کرائن'' کے بہت سے نقصان دہ اثرات معلوم ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین ''زہریلا دماغی عارضہ'' ہے۔ یہ گویا کیمیائی طور پر پیدا کردہ پاگل پن ہے۔ اس نئی ٹیکنالوجی نے کچھ اور خدشات بھی اُبھارے ہیں جن میں ایک امکان یہ ہے کہ ایک بار یہ ضبطِ حمل کے ذریعے کے طور پر عام ہوجائیں تو RU-486 والی گولی کی طرح خواتین کے علم یا اجازت کے بغیر بہ آسانی ان پر استعمال ہوسکتی ہے۔ چنانچہ کئی ایسے قرینے اور اشارے ملتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں ''تنظیم آبادی'' کے ہتھیار یہی ہوں گے جو صحت کے نام پر موت بانٹیں گے۔

اوپر جو مثالیں بیان ہوئیں، ان سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہورہا کہ یہ کسی ایسے ادارے یا حکومت کا فلسفہ یا سوچ ہے جسے ترقی پذیر ممالک میں صحت کی اصلاح کی فکر لاحق ہوگئی ہو۔ اس سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ یہ کچھ اور ہی گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دوسرا ایسا مسئلہ نہیں جو مغرب کے پالیسی سازوں میں بحران کا وہ احساس پیدا کرتا ہو جتنا ترقی پذیر ممالک میں شرح آبادی کا سوال ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا معاملہ بین الاقوامی طاقت واختیار کے قریب قریب ہر جزو کے ساتھ اتنا گتھا ہوا ہے...... خواہ یہ فوجی ضرورت کے لیے اشیا تک رسائی کی بات ہو، مستقبل میں افواج کی تعداد کا معاملہ ہو، مناسب اقتصادی برتری کا سوال ہو، یا سیاسی برتری، نسلی قوت اور ثقافتی اثرات کا قصہ ہو۔ ریکارڈ یہی بتاتا ہے کہ واشنگٹن میں بیٹھے بنیادی ڈھانچہ کی اصلاحات کی بات کرنے والے ''ماہرین'' پسماندہ لوگوں میں معیارِ زندگی کے متعلق چنداں پریشان نہیں ہیں بلکہ انہیں دنیا پر اپنے استعماری قبضے کو برقرار رکھنے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ مثلاً صحت کے لیے دواؤں کے معاملہ پر ہی نظر ڈال لی جائے۔ خیال ہے کہ افریقہ میں ہر برس ملیریا سے مرنے والوں کی تعداد ایک ملین ہے، جس میں زیادہ تر بچے اور حاملہ خواتین ہیں۔ ملیریا کا علاج ایسی انٹی بایوٹک دواؤں سے ہوسکتا ہے جن پر فی مریض صرف ایک ڈالر خرچ آئے گا۔ اور یہ بات ملحوظ رہے کہ یو ایس ایڈ کے افریقہ کے لیے پہلے مرحلے کے ''منصوبہ بندی'' پروگرام کو بنیادی معاہدہ کے تحت 23 ملین ڈالر ملے تھے اور لاکھوں کروڑوں مزید بیرون ملک ''مشن دفتروں'' سے حاصل ہوئے۔ گویا اس پروجیکٹ کے تحت صرف ایک ملک میں خرچ کی جانے والی رقم سارے افریقہ میں سال بھر ملیریا کے شکار مریضوں کے لیے دوا خریدنے کو کافی ہوتی۔ اس دلیل کو آگے بڑھائیں تو ایک اور ایسے ملک میں خرچ شدہ رقم سے سال بھر کے دوران پورے براعظم افریقہ میں حد درجہ ضرورت مند افراد تک ان دواؤں کو پہنچانے اور تقسیم کرنے کا خرچ پورا ہوجاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور زچہ وبچہ کی صحت کے نام پر خطرناک نسوانی بیماریاں پھیلانے پر یہ رقم خرچ کردی گئی۔

ایک پروپیگنڈا یہ بھی کہ ایسے پروگراموں کے عوض ملک کو اقتصادی امداد حاصل ہوتی ہے، چنانچہ پاپولیشن ڈویلپمنٹ پروگرام کو ''اقتصادی'' امداد کی ایک شکل تصور کیا جاتا ہے لیکن اس سے میزبان ملک کو کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ پالیسی مہم..... جسے کھل کر اس مقصد کے لیے تشکیل دیا گیا ہے کہ بیرونی دنیا میں لیڈروں کی ''تربیت'' کرے تاکہ وہ ایسے سیاسی اقدامات کریں جو مغرب کے لیے سودمند ہیں..... ان ملکوں کی اقتصادیات میں ایک پیسہ بھی فائدہ نہیں دیتی جہاں اس تربیتی پروگرام پر عمل ہورہا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کا فائدہ وزارتِ صحت اور دیگر محکموں کے ان مقامی افسروں، اہلکاروں اور ضمیر فروش ڈاکٹروں کو کی جانے والی ادائیگی کا ہوسکتا ہے جو ''برسرِ موقع'' ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ان کو ادائیگیاں تقریباً ہمیشہ خفیہ کی جاتی ہیں جس سے رشوت کی فضا کو تقویت ملتی ہے۔ یہ رشوت خور بدعنوان انتظامیہ اور نام نہاد مسیحا، امریکی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ اگر امریکا کھل کر مسلم ممالک میں تحدید آبادی پروگرام کی سرپرستی کرے تو اس سے خاندانی منصوبہ بندی کی سرگرمیوں کو سیاسی تنقید کے نتیجہ میں نقصان پہنچ سکتا ہے، لہٰذا وہ درپردہ وزارتِ صحت کے ان بدعنوان افسروں اور ضمیر فروش ڈاکٹروں کے ذریعے اپنا کام چلاتا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اس اقتصادی امداد کا مقصد دینا کم اور کچھ لے کر جانا ہے..... جو کچھ یہ لے جاتی ہے وہ دراصل مقامی افسران کی وہ دیانت دارانہ اہلیت ہوتی ہے جس سے واقعات کے نتائج کا دیانت دارانہ تجزیہ کیا جاتا ہے یا ان کے ایسے آزادانہ فیصلے ہوتے ہیں جو خود ان کی اپنی اقوام کے مستقبل کی بہبود میں مددگار ہوں۔

1991ء میں اقوام متحدہ نے اندازہ لگایا کہ ترقی پذیر ممالک میں آبادی کو کنٹرول کرنے پر سالانہ ساڑھے چار سے پانچ بلین ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اس میں وہ کافی بڑی رقوم شامل نہیں جو نجی سرمایہ کاری کے طور پر مغرب میں قائم بہت سی کثیر قومی کارپوریشنیں اور ''مخیّر حضرات'' فراہم کرتے ہیں۔ اس رقم میں ہر سال خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر اس کا محض ایک حصہ ہی افریقی اسکولوں کے لیے مختص کردیا جاتا یا مقامی اقتصادی ڈھانچے کی تعمیر، توانائی کی ترقی، زراعت میں نئے طور طریقوں کے رواج اور ٹیکنالوجی کے فروغ پر خرچ ہوتا تو چند برسوں میں ہی براعظم افریقہ کافی ترقی کرسکتا تھا۔ ایسے ہی جنگ عظیم دوم کے بعد یورپ میں ہوا لیکن یہ رقم افریقی عوام..... جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے..... کی فلاح و بہبود کی خاطر ان کی ''نسل کشی'' پر صرف کرائی گئی۔

پھر اس ''اقتصادی امداد'' کا انجام یہ ہے کہ صرف عالمی بینک سالانہ ایک بلین ڈالر سے زیادہ سود کما لے جاتا ہے جس میں ایک بڑا حصہ آبادی سے متعلق سرگرمیوں کے لیے دیے گئے قرضوں پر حاصل ہوتا ہے۔ اصل رقم مع سود اگلی نسل کے ان کارکنوں، کاشت کاروں، مزدوروں، اساتذہ اور عام فوجیوں نے ادا کرنا ہے جن کی تعداد کو گھٹانا ان قرضوں کا مقصد ہوتا ہے۔

جب امریکا نے عراق کے خلاف ''بین الاقوامی'' تعاون کے حصول کے لیے سفارتی مہم شروع کی تو اس نے مصر کو اس مہم میں شرکت کا معاوضہ 7 بلین ڈالر کے دوطرفہ قرضہ کی معافی کی شکل میں پیش کیا۔ امریکا نے سوچا ایک مسلم مملکت کو تاراج کرنے کے لیے عرب حمایت کے حصول پر اُٹھنے والا یہ خرچ مہنگا سودا نہیں..... لیکن یہی امریکا اس وقت قرض معاف کرنے کی بات نہیں کرتا جب بچوں کو عام اور مفت تعلیم دینے والا نظام منہدم ہورہا ہو، یا جب شہروں کی طرف انتقال آبادی، آبپاشی کی ناکافی سہولتیں اور نامہربان اقتصادی حالات، لاکھوں کروڑوں ایکڑ قابل کاشت زمین کو صحرا میں بدل دیتے ہیں۔

ایک اور موضوع گفتگو جس پر امریکی فنی امداد کے ماہرین زور شور سے بولتے رہتے ہیں وہ ہے تخفیفِ غربت..... یہ بھی کافی شک میں ڈالنے والا ہے۔ بہت کچھ شہادتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آبادی سے متعلق پروگرام کا غربت و افلاس کے خاتمے سے

کوئی تعلق نہیں، یہ تو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چند افراد کو نوازنے اور بقیہ کو کنٹرول میں رکھنے کا بہانہ ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں امریکا کے خلاف غیظ وغضب سے بھری اگلی نسل کو کم سے کم کیا جائے۔ اس کی ایک دلیل منصوبہ بندی نہ کرنے پر خوراک کی امداد روک لینے کی دھمکیاں ہیں پھر یہاں یہ بھی یاد رہے کہ قومی سلامتی کونسل کی آبادی کی منصوبہ بندی کی بنیادی دستاویز (NSSM-200) میں یہ خوش بیانی اور لفاظی موجود ہے کہ ''بنیادی سماجی اور اقتصادی ترقی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ امریکا پر لگنے والے استعماری ارادوں کے الزامات کو ٹھنڈا کردے'' جیسے ایک بار صدر نکسن نے کہا تھا جن کے حکم پر 1974ء کی مذکورہ دستاویز تیاری ہوئی تھی: ''ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امداد کا اصل مقصد دوسری اقوام کی نہیں بلکہ خود ہماری اپنی مدد ہے۔''

ایک نصیحت یہ بھی پلائی جاتی ہے کہ کم آبادی والے معاشرے میں تعلیم بہتر ہوتی ہے اور ٹیکنالوجی کی دریافت میں تیز رفتاری آتی ہے، جبکہ ماہرین کا کہنا ہے کہ ٹیکنالوجی کی ایجادات ایسے علاقوں میں زیادہ ممکن ہوتی ہیں جہاں آبادی کی کثافت زیادہ ہو۔ زیادہ بڑی اور وسیع اقتصادیات مقامی کیپٹل اشیا کی صنعتوں کے لیے زیادہ مددگار ہوتی ہے اور اسی سے توقع ہوتی ہے کہ مقامی ٹیکنالوجی میں ترقی آئے گی۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کی شرح پر محققین کی تعداد کا مثبت اثر ہوتا ہے اور یہ تعداد کل آبادی میں اضافے کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ اسی طرح بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے تعلیم کے شعبوں کو پہنچنے والے فوائد بھی واضح ہیں۔ سائنس دانوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بڑے خاندان میں کسی بچے کے تعلیم حاصل کرنے کے امکانات بہتر ہوتے ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں کیے گئے مطالعات کی بنیاد پر انہوں نے رائے دی کہ کئی جگہوں پر کثیر العیال خاندانوں کے بچے اسکولوں کے برتر درجوں تک پہنچے۔ محققین کی رائے میں دوسرے مقامات پر والدین کو صرف پہلے بچے کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ اُٹھانا ہوگا جبکہ بعد والوں کی مالی مدد بڑے بھائی بہن کرتے ہیں۔ یہ اسکالرز مزید کہتے ہیں: ''تولیدی صلاحیت کم ہونے سے سرکاری اسکولوں کے اسکول جانے کے قابل فی بچہ اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ زیادہ افراد والی سوسائٹی میں تعلیم نسبتاً ارزاں ہوجاتی ہے۔ انہوں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ آبادی میں اضافہ فی الاصل حکومتوں کے صحت اور تعلیم کے مقاصد کے حصول میں مددگار ہوسکتا ہے...... کیونکہ دور دور پھیلی ہوئی چھدری دیہی آبادی تک سرکاری صحت وتعلیم کی سہولیات پہنچانا مشکل ہوتا ہے۔

ایک تاثر یہ بھی اچھالا جاتا ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں اور دوسری ترقی یافتہ ٹیکنالوجی نے بڑی آبادیوں کی اہمیت ختم کرکے رکھ دی ہے۔ یہ بات کسی حد تک اور وقتی طور پر صحیح ہوسکتی ہے لیکن عسکری ماہرین اس سے قطعاً مطمئن نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ دلیل کہ جدید ہتھیار بڑی آبادی کے فوائد کو زائل کردیں گے غلط ہے...... ایٹم بم کی تخلیق وتعمیر کے لیے صرف علم کافی نہیں ہے۔ امریکا کی جنگی مشین کی تشکیل اس کی بڑی بڑی صنعتوں نے کی جن کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جدید تباہ کن ہتھیاروں کے لیے جس طرح کا صنعتی ڈھانچہ چاہیے، وہ صرف بڑی اور زیادہ آبادی والا ملک ہی مہیا کرسکتا ہے...... سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ جدید ہتھیاروں نے بڑی آبادی اور بڑی افواج والی اقوام کی قوت کم کرنے کے بجائے بڑی آبادی اور بڑے فوجی بجٹ والے ایسے ممالک کی طاقت کو بڑھادیا ہے۔ جنگی آلات کی ترقی پذیر ٹیکنالوجی اس خوفناک حد تک مہنگی ہوچکی ہے کہ اب صرف بہت بڑے ملک ہی یہ بوجھ سہار سکتے ہیں۔ مزید برآں اس ایٹمی دور میں برسرپیکار فوجوں کا حجم اور حوصلہ (Moral) کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعداد میں برتری کا فائدہ پسماندہ اقوام کے لیے شاید سب سے اہم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ برباد شدہ بستیوں کو کون بسائے گا اور باقی بچ جانے والوں

کے سر پر کون کھڑا ہوگا؟ وہ چھوٹی جنگیں کون لڑے گا جو اس صدی میں عام ہوں گی؟ بڑی طاقتیں یہ مان چکی ہیں کہ کسان سپاہی بھی جدید ہتھیاروں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر کسی قلی نے پیٹھ پر دھما کا خیز مواد اُٹھا رکھا ہو تو جیٹ جہاز سے اسے روکا نہیں جا سکتا۔ بھوسے کے اس ڈھیر پر جس میں کوئی ٹینک چھپایا گیا ہو ایٹم بم برسانا ممکن نہیں...... بیسویں صدی نے مجاہدین کو وہ پرانے طریقے پھر سے سکھائے ہیں جن سے جدید فاتحین کو ناکام بنایا جا سکتا ہے۔ کسان گوریلا جو پہاڑوں میں جا کر بیٹھ جائے، بم پھینکنے والا فدا کار جو انسانی بھیڑ میں چھپا کھڑا ہو، وہ فوج جو دن کی روشنی میں اِدھر اُدھر سٹک جائے...... یہ سب اس ہمہ گیر جنگ کی مختلف شکلیں ہیں جو صرف بڑی آبادی والی مزاحمتی اقوام لڑ سکتی ہیں۔ ایک بڑی آبادی اپنے فاتحین کو بے وقوف بنا سکتی ہے جو اپنا کنٹرول بڑی سڑکوں اور چند نمایاں شہروں تک پھیلا سکتے ہیں، لیکن وہ اپنے ہی اس جال میں پھنسے ہوئے پرندوں کی طرح بیٹھے ہوتے ہیں جبکہ پورا ملک ان کے نیچے جوش سے اُبل رہا ہوتا ہے۔ افغانستان اور عراق میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کو بعینہٖ اس صورتِ حال کا سامنا ہے۔ ان ملکوں کی آبادی اگر کم ہوتی تو امریکا انہیں بغیر چبائے ہضم کر چکا ہوتا۔

اب آخری بات...... سوچنے کا مقام ہے کہ امریکا ہمارا جانی دشمن ہے مگر ہماری بہبود کے نام پر تحدید آبادی پروگرام پھیلانے، آیوڈین ملا نمک کھلانے اور پولیو کے مشکوک قطرے پلانے پر کیوں تُلا ہوا ہے؟ دراصل آبادی سے متعلق قریب قریب سبھی ماہرین اندازے بتا رہے ہیں کہ آج کے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں (یورپ، سوویت یونین، جاپان، شمالی امریکا اور اوشیانا) میں آبادی میں اضافہ کی شرح نسبتاً سست ہے، جبکہ کم ترقی یافتہ علاقوں (یعنی باقی دنیا) میں یہ شرح افزائش نسبتاً تیز ہے۔ یہ اندازے بتا رہے ہیں کہ یہ رُجحان دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد سے مسلسل موجود ہے۔ اگر یہ سلسلہ دو ایک نسلوں تک ایسے ہی چلتا رہا تو بین الاقوامی سیاسی صورتِ حال اور عالمی طاقت کے توازن پر اس کے اثرات بے پایاں ہوں گے۔ مسلم ممالک کی آئندہ نسل خود سے کی جانے والی زیادتیوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی اور یہ صورتِ حال امریکا اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کے لیے گزشتہ نسل کی سرد جنگ سے بھی زیادہ خطرناک اور نقصان رساں ہوگی۔ یہ وہ ساری بنیاد ہے جس کی وجہ سے گزشتہ دہائی میں تحدید آبادی کے پروگرام کو حد درجہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ''نئی طاقتوں کے ظہور'' کا راستہ روکا جائے جو لازماً مسلمان یا ان کی حلیف ہوں گی جیسے چین وغیرہ۔ اپنی تمام تر عیاری کے ساتھ آج کے یہ طریقے اتنے ہی بے درد اور ہر لحاظ سے مکمل ہیں جیسے برسوں پہلے نوآبادیاتی حکمرانوں کے دور میں ہوتے تھے، لیکن ان کو مختلف فریب آمیز اور گمراہ کن عنوانات کے تحت مسلسل پھیلا کر مسلمانوں کی آئندہ نسل کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر مذہبی حوالے سے بحث نہیں کی کہ بانجھ پن یا اسقاط کا عمل کتنا سخت گناہ ہے، نہ اس تیزی سے پھیلتی ہوئی فحاشی اور بے راہ روی کا ذکر کیا ہے جو ان پروگراموں کی دین ہے، نہ ان اخلاقی قباحتوں کا تذکرہ چھیڑا ہے جو ایسے اشتہارات پڑھ پڑھ کر ہمارے معصوم بچوں کے مزاج کا حصہ بنتے جا رہے ہیں...... ہم نے صرف ان حقائق کا ذکر کیا ہے جو ان اُلجھانے والے وعدوں اور گمراہ کرنے والی ترغیبات میں پوشیدہ ہیں۔ اب فیصلہ ہماری وزارتِ صحت، قوم کے مسیحا کہلانے والے ڈاکٹر حضرات اور عامۃ المسلمین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس خوفناک گناہ کو مفید سمجھ کر کرتے رہتے ہیں یا خود پر اور اپنے ان بچوں پر رحم کرتے ہیں جو اس دنیا میں آنے سے پہلے ظالمانہ امریکی منصوبہ بندی کا شکار ہو رہے ہیں۔

نسل ماری کی خودکش مہم

ہمفرے جیسے درجۂ اول کے انگریز جاسوس کی غلطی سے افشا ہو جانے والے رازوں پر مبنی سلسلہ کی دوسری قسط آج پیش ہونی تھی۔ پہلی قسط میں مسلم معاشروں کی وہ خوبیاں گنوائی گئی تھیں جن کی وجہ سے وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ آج کی قسط میں وہ منصوبے اور تجاویز پیش کیے جانے تھے جنہیں ہمفرے اور اس جیسے دیگر کئی ذہین ترین دماغوں نے مل کر مسلمانوں کی بربادی کے لیے مرتب کیا...... لیکن اس دوران ایک ایسی خبر پر نظر پڑ گئی کہ اگلی قسط مؤخر کر کے اس موضوع پر کچھ کہنا ضروری ہو گیا۔ اس خبر کا عکس آپ مضمون کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، اس کا کچھ تعلق ہمفرے کے انکشافات سے بھی ہے۔ اس نے مسلمانوں کی خوبیاں گنواتے ہوئے کہا:

☆ شادی کے بغیر جنسی تعلقات قائم نہ کرنا اور اولاد کی کثرت اور تعددِ ازدواج کو مستحب سمجھنا۔

اس خوبی کا خوبصورت چہرہ مسخ کرنے کے لیے یہ منصوبہ تیار کیا گیا:

☆ نسل کو کنٹرول کیا جائے اور مردوں کو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نئے قوانین وضع کر کے شادی کے مسئلے کو دشوار بنایا جائے۔

بندہ جہاں تک سمجھتا ہے دشمنانِ اسلام نے اس مہم کے تین مراحل مقرر کیے تھے:

(1) ایک سے زیادہ شادیوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

(2) جب ایک سے زیادہ بیویوں کا رواج ختم ہو جائے تو دو سے زیادہ بچوں کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

(3) اور جب اس میں بھی کامیابی ہو جائے تو نکاح کے بغیر جنسی تعلقات کو آسان بنایا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا مستحب عمل ویسے بھی ختم ہو گیا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کی مہم نے دوسرے مرحلے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے، جس کے نتیجے میں نوجوان مسلم نسل کم سے کم ہوتی جا رہی ہے اور قلیل آبادی پر قابو پانا دشمن کے لیے آسان ہو گیا ہے، لہٰذا اب تیسرے مرحلے کے لیے ''حدود آرڈی نینس'' کے خلاف مہم زوروں پر ہے تاکہ فحاشی کے خلاف ہر قانونی رکاوٹ ختم ہو جائے اور گلی کوچوں میں سائنٹیفک طریقے سے چلتے ''قحبہ خانوں'' کو تحفظ حاصل ہو جائے۔ ایک معروف تجارتی اخبار اور اس کے چینل نے اس سلسلے میں دشمن کے ہراول دستے کا کام کیا ہے۔ اللہ ہی اسے سمجھے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں جہاں بھی مسلمان کا خون بہہ رہا ہے، امریکا اور اس کے حواری اس میں کسی نہ کسی طرح ملوث ہیں اور ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے یا اپنے سامنے مکمل طور پر جھکانے سے کم کسی چیز پر راضی نہیں، لیکن دوسری

طرف یہ ''کریم النفس'' لوگ ہماری فلاح و بہبود کی فکر میں مرے جا رہے ہیں اور کروڑوں ڈالر کی امداد بہبودِ آبادی کے لیے فراہم کر رہے ہیں۔ یہ کیا راز ہے؟ اور ان دو متضاد رویوں کی کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے؟ جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان پر لگی اقتصادی پابندیوں کے سبب ہر چیز ہم پر ممنوع کر دی گئی تھی سوائے بہبود آبادی کی گولیوں، انجکشنوں اور افسران اور ڈاکٹروں کو دی جانے والی رشوت کی رقم کے۔ یہ ان دنوں بھی جاری تھی اور آج تک مسلسل بغیر کسی رکاوٹ کے فراخ دلی سے جاری و ساری ہے۔ یہ کیا معما ہے؟ اور اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کون مہربان چھپا ڈوری ہلا رہا ہے؟

اس راز کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے، لیکن اگر ہم براہِ راست اس کی گرہ کشائی کی جسارت کریں گے تو کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا، مُلاّ کی ہانک کہہ کر مسترد کر دے گا پھر تحدید آبادی کا موضوع ایسا ہے کہ اس کے حق میں پیش کیے جانے والے دلائل انتہائی خوش کن، قابلِ قبول اور لائقِ توجہ سمجھے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دلائل کو ترتیب دیتے وقت شیطانی دماغوں نے دجل وفریب اور دھوکا دہی وجعل سازی کا ایسا قبیح ترین مظاہرہ کیا ہے کہ اچھے خاصے سمجھ دار لوگوں کی عقل وحواس معطل کر کے ان کا رُخ پھیرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف ان کی تردید جب صرف مذہبی دلائل سے کی جاتی ہے تو لوگ شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ عالمی استعمار نے اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے نام نہاد مذہبی شخصیات کی خدمات بھی حاصل کر رکھی ہیں...... لہٰذا ہم اس کے پیچھے چھپے فلسفے کو جاننے کی کوشش کریں گے تا کہ اگلی بات خود بخود سمجھ میں آ جائے۔ اس کے لیے آپ کو ہمارے ساتھ ماضی میں سفر کرتے ہوئے ذرا پیچھے جانا ہوگا۔

☆......☆......☆

سرد جنگ کے ابتدائی برسوں میں ہی امریکا یہ بات جان گیا تھا کہ وہ اپنی عالمی قوت ہونے کی حیثیت کو اس وقت تک استعمال کرنے کی اُمید نہیں کر سکتا جب تک کہ خود نظریاتی مقابلے کے لیے ہمہ وقت چوکس نہ رہے۔ لہٰذا اس نے ایسے اقدامات کیے کہ اپنے ساحلوں سے ہزاروں میل دور اجنبی علاقوں میں انسانی آبادیوں کے اندر دانش وروں کی سوچ، سیاسی زعما اور مستقبل کے امکانی لیڈروں کے میلان اور معاشرے کے دوسرے طبقات کے طرزِ عمل کو متاثر کر دے۔ اس غرض کے لیے اس نے ایک ادارہ قائم کیا جسے ''سائیکولاجیکل اسٹریٹجی بورڈ'' (Psychological strategy board) کا نام دیا گیا۔ یہ ادارہ صدر ہیری ٹرومین کی خصوصی ہدایت کے تحت 4 اپریل 1951ء کو قائم ہوا اور بری افواج، بحریہ اور ایئر فورس کو اس سلسلے میں اعتماد میں لے کر ان کے نام خصوصی یادداشت بھیجی گئی۔ اس کا مختصر نام PSB تھا۔ یعنی ''نفسیاتی حکمتِ عملی'' کا ادارہ۔ نفسیاتی جنگی مہم (PSY-War) کو دراصل لڑائی کے میدان میں مخالف کا حوصلہ توڑنے، دشمن فوج کے کمانڈروں کو چکمہ دینے اور مخالف دستوں کو اپنی فوج کا ساتھ چھوڑنے یا ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس ادارہ کے اغراض ومقاصد اس سے کچھ سوا تھے۔ اسے یہ مشن دیا گیا تھا کہ وہ عالمی سطح پر نظریاتی پنجہ آزمائی کی منصوبہ بندی کرے۔ ''پی ایس بی'' میں محکمہ خارجہ، محکمہ دفاع اور سی آئی اے کے چند اعلیٰ ترین عہدیدار شامل تھے جن کی ذمہ داری تھی کہ وہ سفارشات مرتب کریں اور فیصلے دیں کہ کیا پالیسیاں اختیار کی جائیں اور نفسیاتی جنگ کے ضمن میں امریکی حکومت کی سرگرمیوں کے نتائج کا تجزیہ کریں۔

سرد جنگ کی ابتدا میں نفسیاتی جنگ کی منصوبہ بندی کو واشنگٹن میں سیاسی اور فوجی لیڈر خاص طور پر بہت نمایاں ترجیح

دیتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد ایک اور اعلیٰ علمی حلقہ قائم کیا گیا کہ وہ نظری کام سرانجام دے جو پس منظر کا کام دے اور سماجی سائنسی تحقیق کرے جسے امریکی قوم کی نفسیاتی اقدامات کی پالیسی کی بنیاد بن جانا تھا۔ ''آپریشنز ریسرچ آفس'' کے نام سے قائم اس یونٹ کو فوج کی طرف سے ایک معاہدے کے تحت بالٹی مور میں قائم جان ہاپکنز یونیورسٹی چلارہی تھی۔ ابتدا میں اسے اتنا خفیہ رکھا گیا کہ اس کے تفویض شدہ کام کی تفصیل بھی پوشیدہ تھی اور امریکا کے چند اعلیٰ عہدیداروں کے علاوہ کوئی اس کے اصل مقاصد واہداف نہ جانتا تھا۔ آنے والے کئی برسوں کے دوران ''جان ہاپکنز آپریشنز ریسرچ آفس'' نے کئی بہت اعلیٰ کتابچے تیار کیے، جن میں نفسیاتی آپریشنوں کے تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا تھا۔ 1953ء میں تیار کردہ ایک ایسی کتاب کا نام تھا: The Nature of psycholoical Warfare۔ اس کے بعد Target Analysis and Medical in propoganda to Audiences Abroad سامنے آئی۔ 1958ء میں تیسری کتاب A psychological Warfare Casebook شائع کی گئی۔ ان کتابوں کی اہمیت اس سے سمجھیے کہ ان کو آگے چل کر جو امریکی حکومت کی طرف سے ''نفسیاتی جنگی مہمات'' کے لیے استعمال ہونے والے افراد کی تربیت کے لیے نصاب میں شامل کرلیا گیا اور یہ وہ معیاری نصابی کتابیں تھیں جو اعلیٰ امریکی افسران کی تربیت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے ذرا یہ سمجھتے چلیے کہ نفسیاتی جنگ (Psy-war) اپنی اصل میں گروہوں کے خلاف ہوا کرتی ہے۔ اگر مقصد سیاسی فیصلوں پر اثرانداز ہونا ہو تو نفسیاتی جنگ کا ہدف مملکتوں کے سربراہ، پارلیمانی گروپ، سفارت کار، وزارتوں کے اہلکار...... یہاں تک کہ حزبِ اختلاف کے راہنما، ذرائع ابلاغ اور خصوصی مفادات کے حامل گروہ ہوں گے۔ اگر مہم تجارت اور اقتصادی عمل کو متاثر کرنے کے لیے ہو تو خطاب کاروباری برادری کے لیے لیڈروں، عام تجار، تجارتی انجمنوں یا مزدور تنظیموں سے ہوگا اور اگر زیرِ ہدف ملک یا علاقے کی علمی فضا تبدیل کرنا مطلوب ہو تو دانشور اور علمی ادارے مہم کا نشانہ بنیں گے۔ درحقیقت کسی بھی سیاسی اثراندازی کی مہم میں اہم ترین اہداف یونیورسٹیاں ہوتی ہیں کیونکہ معاشرے میں اہل الرائے اصحاب اکثر وبیشتر یونیورسٹی سے فیض یافتہ اشرافیہ سے ہی سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ امریکی بیرونی امداد کے لبادے میں زیرِ عمل بیرونی اثراندازی کے اقدامات کا مطالعہ، علمی اداروں میں نفوذ کی بات کیے بغیر ادھورا رہے گا۔

☆......☆......☆

اب یہاں تک پہنچ کر ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ اصل موضوع کی طرف پلٹ سکیں۔ اس ریسرچ آفس نے 80ء کی دہائی میں امریکی حکومت کو ایک اہم ترین اور خفیہ رپورٹ بھیجی۔ اس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے:

''اگلی چند دہائیوں میں شرح آبادی کا رجحان ایک اچانک اور عظیم تبدیلی لانے والا ہے، جس کے نتیجہ میں دنیا کے سیاسی جغرافیہ کو نئی ترتیب ملنے والی ہے اور اس کے عمومی خدوخال کا اندازہ اب بھی ہوسکتا ہے۔ نوجوان قوتیں سامنے آئیں گی جن کی طاقت کا بیشتر انحصار ان کی آبادی کے حجم اور اس سے پیدا شدہ تحرک (Stimulus) پر ہوگا۔ پرانی قوتیں گھٹتی آبادی کے نتیجے میں اپنی چمک دمک کھو بیٹھیں گی۔''

اس رپورٹ نے امریکی حکومت کو اپنے ملک کی گھٹتی آبادی اور مظلوم ممالک میں تیزی سے بڑھتی آبادی کے حوالے سے

سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اتنے میں امریکی سینٹرل انٹیلی جنس (سی آئی اے) نے ایک اور تہلکہ خیز رپورٹ بھیجی:

''دنیا کی شرح آبادی کا ان مقامی پُرتشدد اور بین الاقوامی مناقشوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ ہوگا جو امریکی مفادات کو بری طرح متاثر کریں گے۔ آبادی کی نمو (Growth) بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کو سیاسی رنگ دینے میں بھی تقویت کا باعث ہوگی۔ اس سے [کم ترقی یافتہ ممالک کے] اس میلان اور پیش قدمی میں بھی اضافہ ہوگا کہ دولت اور بین الاقوامی اُمور میں اختیار کی ازسرِنو تقسیم ہو۔''

اس طرح کی دیگر رپورٹوں کے نتیجے میں امریکی کارپردازوں نے جو خاندانی نظام کی تباہی کی بنا پر اپنے ملک کی آبادی بڑھانے پر قادر نہ تھے، یہ انسانیت کش مہم مرتب کی کہ ان ممالک کی آبادی گھٹائی جائے جہاں کے وسائل وہ لوٹ رہے ہیں یا جن سے ان کے عسکری اور مالی مفادات وابستہ ہیں۔ افریقہ کے اہم معدنی وسائل، جزیرۃ العرب کے تیل تک رسائی، ان ممالک میں امریکی سرمایہ کاری اور مالی مفادات کا تحفظ، دنیا کی بڑی بڑی آبی گزرگاہوں مثلاً: نہر سوئز اور نہر پانامہ کا استعمال، ایشیا میں فوجی اڈوں کے ضمن میں ہونے والے معاہدات، ان سب منصوبوں کے لیے ضروری تھا کہ ایشیا و افریقہ میں 15 سے 25 برس کی آبادی جو استحصال سے بیزار اور اس کا انتقام لینے کے لیے پارے کی طرح بے تاب رہتی ہے، کم کی جائے۔ چنانچہ 23 ملین ڈالر کی خطیر رقم سے پروپیگنڈا مہم شروع کی گئی اور اس منصوبے کا نام ''جان ہاپکنز یونیورسٹی پاپولیشن انفارمیشن پروگرام'' رکھا گیا۔

اس مہم کے اغراض ومقاصد سادہ تر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ چھوٹی آبادیوں کی نسبت بڑی آبادیوں کے لیے منظم ہوکر اپنی طاقت منوانا آسان ہوتا ہے۔ آبادی بڑھتی ہے تو اسے اپنے قدرتی وسائل کی بھی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا اثر خام لوہے اور تیل وغیرہ جیسے برآمدی اموال کی قیمت پر پڑتا ہے جبکہ یہ اشیا روایتی طور پر مغربی صنعتی برتری قائم کرنے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مغرب کی ترقی کا پہیہ مشرق کے وسائل ہڑپ کرنے سے چلتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک دنیا کی پیداوار کا بڑا حصہ پیدا بھی کرتے ہیں اور صرف بھی کرتے ہیں اور اس کے لیے خام مال وہ ایشیا و افریقہ کے ان بدنصیب علاقوں سے حاصل کرتے ہیں جہاں کے حکمران ان کے کاسہ لیس ہیں۔ مزید یہ کہ ترقی یافتہ ممالک بڑی بڑی فوجی قوتیں تشکیل دینے اور علاقائی (بلکہ عالمی) تنازعات پر چھا جانے کے ارادے بھی رکھتے ہیں جبکہ ان کی قلیل آبادی اور محکوم ممالک کی کثیر آبادی اس مقصد میں اہم رکاوٹ ہے کیونکہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ ایک بڑی آبادی کو چھوٹی آبادی پر کنٹرول حاصل ہو بہ نسبت اس کے کہ چھوٹی آبادی کو یہ طاقت حاصل ہو۔ اس نظریے کو آخری چارہ کار سمجھتے ہوئے بھرپور طریقے سے بروئے کار لایا گیا۔ مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل کہتا ہے: ''یہ توقع عبث ہے کہ دنیا کی طاقت ور ترین فوجی اقوام ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں گی جبکہ دوسری اقوام محض افزائش نسل سے طاقت کا توازن بدل دیں گی۔''

پاکستان ان کا خصوصی ہدف ٹھہرا کیونکہ یہاں کئی ایسی اقوام رہتی ہیں جو اعلیٰ نسلی اوصاف کے باعث ممتاز ترین خصوصیات رکھتی ہیں اور ان کے باہمی رشتوں ناتوں سے دنیا کی بہترین انسانی نسل جنم لیتی رہتی ہے، جس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا ہمیشہ لوہا منوایا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں زندوں کو ضروریات زندگی مہیا ہوں نہ ہوں انہیں آبادی میں کمی کے مہنگے طریقے سستے داموں ضرور فراہم کیے جاتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں یہ مہم انتہائی خوفناک شکل اختیار کرگئی ہے۔ حال ہی میں ہمارے وزیرِ بہبود

آبادی جناب چوہدری شہباز حسین کا انٹرویو چھپا جو خودکش نسل ماری کے عزائم کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ انہوں نے کہا:

''ہم نے بہبود آبادی کے بارے میں آگاہی وشعور پیدا کرنے کے لیے اپنے پروگراموں میں دینی تعلیم رکھنے والی خواتین معلمین کو شامل کیا ہے۔ ہم نے مدرسوں اور یونیورسٹیوں کی اسلامی تعلیمات پڑھی ہوئی بچیوں سے سیمینار کرائے۔ اسلام آباد، لاہور، کوئٹہ اور پشاور میں سیمینار ہوئے اور اب وزارت دس سے بارہ ہزار مدارس اور یونیورسٹیوں کی بچیوں کو ایک کورس پڑھا رہی ہے اس کورس کے بعد ان خواتین کو رورل ایریا میں بھیجا جائے گا اور میں سمجھتا ہوں جو کام وزارت نے پچاس سالوں میں نہیں کیا وہ ایک ڈیڑھ سال میں ہو جائے گا۔ دوسری طرف ہم نے پانچ ہزار علمائے کرام کو تربیت دی ہے اور پندرہ جولائی کے بعد ان کو اعزازیہ دے کر اپنے پروگرام میں شامل کر رہے ہیں۔''

دنیا کی کسی قوم میں وہ صفت نہیں جو اہلِ پاکستان میں ہے۔ ہر قوم میں کوئی ایک آدھ وصف ہوتا ہے۔ یہاں ایسی کئی اقوام ہیں جن کے ممتاز اوصاف باہم مل کر جینیس لوگوں کی سب سے بڑی تعداد کو جنم دیتے ہیں۔ اس سے پوری دنیا خائف ہے۔ چنانچہ سب سے زیادہ تحریک کے قابل وزارت بہبود آبادی کی وزارت قرار دی گئی ہے۔

ذرا سوچیے! جس قوم کو قدرت نے طرح طرح کے قبیلوں اور نسلوں کا مجموعہ بنایا تھا تاکہ وہ اسلام اور عالمِ اسلام کے غلبہ کے لیے قیادت کا فرض انجام دے، وہ نسل ماری کی خودکش مہم کو خود اپنے ہاتھوں زور و شور سے پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہے۔ اے میری قوم! تو خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلائے گی؟ اے میری قوم کے لوگو! کیا تم اپنے ہاتھوں غلبہ کلی کے امکانات کو اس وقت تک ختم کرتے رہو گے جب تک تمہارے خلاف آسمانوں پر فیصلے نہیں ہو جاتے......؟؟؟

چھٹا باب

تاریخیات

ابتدائے اسلام سے غلبۂ اسلام تک

گاہے گاہے باز خواں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بکثرت اور جابجا اقوامِ عالم کے حالات بیان کر کے انسانوں کو عبرت لینے اور نصیحت حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس سے علم تاریخ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ اپنی ہو یا غیروں کی، اس کا مطالعہ فوائد سے خالی نہیں، بشرطیکہ اس مقصد کے تحت کیا جائے جو قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے۔ محض علم برائے علم کا حصول پیشِ نظر نہ ہو کہ یہ تو ایک طرح کا چسکا ہے جو مقصدیت سے خالی اور افادیت سے عاری ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بیان کردہ سابقہ قوموں کے قصص و تاریخ کے مطالعہ کا مقصد علماءِ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ دوسروں کی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے اپنی کوتاہیوں کا خمیازہ بھگتنے سے پہلے ان کی اصلاح کر لینے کی فکر کی جائے۔ یہ تو ہوا غیروں کی تاریخ پڑھنے کا فائدہ۔ اپنی تاریخ کے مطالعہ کے فوائد بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس کے پڑھنے سے انسان کو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف کو کن صفات کی بنا پر عروج اور ترقی نصیب ہوئی؟ وہ کون سی وجوہ تھیں جنہوں نے ان کو عظمتوں سے آشنا اور رفعتوں سے ہمکنار کیا؟ اور وہ کون سے اسباب ہیں جو ہماری پستی اور خواری کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں؟ وہ کیا کمی ہے جس کی وجہ سے آسمان نے ہم کو زمین پر دے مارا ہے؟ غلطیوں کا تدارک، کوتاہیوں کا ازالہ، جذبہ عمل کی تقویت اور بلند سے بلند تر مقام کے حصول کی خواہش، یہی وہ باتیں ہیں جو اپنے بڑوں کے کارنامے اور حالات پڑھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انہی فوائد کے پیشِ نظر ضربِ مؤمن نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں ہر ہفتے ہمارے عظیم ماضی کی کچھ جھلکیوں پر مشتمل ایک نقشہ اور اس کے ساتھ ہماری قابلِ فخر تاریخ کے چند اوراق پیش کیے جاتے تھے۔ الحمدللہ یہ بہت مقبول ہوا اور اب کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اسلاف کے احوال و واقعات کے مطالعہ سے ہم میں اپنے بلند ہمت اور جلیل القدر اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی فکر، ہمت اور جذبہ پیدا ہوگا۔ کامیاب قومیں ماضی سے اپنا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیتیں بلکہ گاہے گاہے اس پر ایک نظر ڈال کر اپنی فکر و نظر، یقین و عمل کو ایک نئی تازگی اور نیا ولولہ بخشنے کا سامان پیدا کرتی رہتی ہیں ؂

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

بعثتِ نبوی سے قبل سرزمینِ عرب کے سیاسی حالات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت مبارکہ سے قبل جزیرہ نمائے عرب اور اردگرد کے سیاسی حالات کا منظر کچھ یوں تھا کہ اس وقت دنیا میں دو بڑی طاقتیں پائی جاتی تھیں۔ جزیرۂ عرب کے شرقی جانب سلطنت فارس اور مغربی جانب بازنطینی سلطنت (رومی بادشاہت) واقع تھی۔ اس وقت ان دو طاقتوں کا طوطی بولتا تھا۔ فارس والے آتش پرست مشرک تھے اور روم والے صلیب پرست عیسائی۔ یہ دونوں اس وقت کی عالمی استعماری قوتیں تھیں۔ ان کی استعماری حرص وہوس کا دائرہ جزیرۂ عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ فارسیوں نے دریائے دجلہ اور فرات سے سیراب ہونے والی زرخیز زمین اور ربلۃ، انبار اور حیرۃ (موجودہ عراق، کویت، بحرین اور امارات کا کچھ حصہ) جیسے تجارتی مضافات پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ اس سونا اگلتے خطے کی زراعت وتجارت ان کے پنجۂ استبداد میں تھی۔ رومی بھی ان سے پیچھے نہ تھے۔ صلیب کے پجاریوں نے جزیرۂ عرب کے مغربی حصوں پر مشتمل حلب، حمص، دمشق، بیروت، فلسطین اور مصر کو زیرِنگیں کیا ہوا تھا۔ نیز شام کے ایک بڑے حصے پر بھی قابض تھے۔ انبیاء واولیاء کی سرزمین ''جزیرۂ عرب'' پر حرص وہوس سے بھری ہوئی یہ غاصب قوتیں قابض تھیں اور اس کے باسی شرک، جہالت اور آپس کے لڑائی جھگڑوں کا شکار تھے۔ سخاوت وشجاعت، جواں مردی ومہمان نوازی، فصاحت وبلاغت، زبان وادب میں بےنظیر مہارت اور انساب واحساب کی حفاظت جیسے اعلیٰ اوصاف کے مالک ہونے کے باوجود وہ اپنی آبائی سرزمین کے خودمختار حاکم نہ تھے۔ ان کے عقائد واعمال درست تھے نہ ان کی اعلیٰ ترین انسانی صفات کو صحیح رُخ دینے والا کوئی راہنما انہیں میسر تھا۔ نتیجتاً ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھا اور فارسی ورومی ان کے شرقی وغربی علاقوں پر بےفکر ہو کر حکومت کر رہے تھے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ کو عرب کے باشندوں کی کایا پلٹنا اور اس بنجر زمین کو ایمان وعمل کی نورانی بارش سے سرسبز و شاداب بنانا منظور ہوا تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب سارے عالم کو اللہ کی طرف بلانے اور مخلوق کو خالق سے جوڑنے کی محنت کے لیے بھیجے گئے تو انہیں سنگلاخ زمین اور بےآب وگیاہ میدان کا سامنا تھا۔ ایک بنجر ویرانہ تھا جس میں انہوں نے توحید ورسالت اور عبادت واخلاق کے گل بوٹوں کی آبیاری کرنی تھی۔ ان کے سامنے صرف عربوں کی جہالت آڑے نہ تھی بلکہ عالمی طاقتوں کا استعمار بھی ان کی محنت کے راستے میں حائل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان مشکلات سے کس طرح نپٹے۔ دینِ حق کی تبلیغ کے لیے کیسے کیسے مجاہدے برداشت کیے اور بالآخر اس کشتِ ویران کو اپنے خون سے سینچ کر کس طرح رشکِ گلستان بنایا؟ اس کی کچھ تفصیل آپ آیندہ میں ملاحظہ کر سکیں گے۔

اسلام سے قبل سرزمینِ عرب کے معاشی حالات

عرب کی اکثریت تجارت کے پیشے سے منسلک تھی۔ ان کی آزاد طبیعتیں ملازمت کے بار کو ناپسند کرتیں اور اسے اپنے لیے طوق گراں بار سمجھتی تھیں۔ فطری طور پر اولوالعزم اور آزاد جبلّت ہونے کے باعث تلاش معاش کی غرض سے تپتے جھلتے صحراؤں میں دوردراز کے سفر کرنا ان کے لیے نوکری کے خلاف مزاج تقاضے پورا کرنے کی بنسبت زیادہ سہل اور موافق طبع تھا۔ بلاشبہ اسلام کو دنیا بھر میں سربلند کرنے کے لیے ایسی ہی فطرت کی حامل قوم درکار تھی جو تازہ دم، سادہ مزاج، وسیع النظر اور حریت نظر وفکر کی حامل ہو۔ چنانچہ خالقِ کائنات کو جب اپنا پسندیدہ دین سارے عالم میں پھیلانا مقصود ہوا تو اس قوم کا انتخاب کیا گیا جو جہانبانی اور جہاں گیری کے مقاصد کو بخوبی پورا کرسکتی تھی۔ ان میں سے بھی جو قبیلہ سب سے زیادہ شریف الطبع، عالی نسب، اعلیٰ اخلاق وروایات کا حامل تھا، اس کے سب سے اونچے اور پاکباز و پاک طینت خاندان کو اللہ کے آخری دین کے لیے آسمانی وحی کے آخری پیغمبر کو بھیجنے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما کثیرا۔ پھر مختلف قبائل میں سے جو سلیم الطبع، نجیب الفطرت اور بلند انسانی اوصاف کے حامل افراد تھے ان کو اس پاک پیغمبر کی مصاحبت کے لیے چنا گیا اور یوں وہ جماعت وجود میں آئی جس کو ہم ''صحابہ کرام'' کے نام سے جانتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

جزیرۂ عرب میں دس بازار تھے جو سال کے مختلف مہینوں اور موسموں میں مختلف علاقوں میں لگا کرتے تھے۔ یہاں سارا عرب اکٹھے ہوکر تجارت کے علاوہ شعروادب، شمشیرزنی ونیزہ بازی، کشتی وتیراندازی کے مقابلے کیا کرتا تھا۔ ان میلوں میں گھڑ دوڑیں، شترسواری کے مقابلے اور اپنے اپنے قبیلوں کے فضائل ومناقب کے بیان بھی ہوا کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان بازاروں اور میلوں میں جاجا کر شرک وبدعت کو چھوڑنے اور توحید وسنت کو اپنانے کی دعوت دی۔ آپ کو اس موقع پر کٹھن مشکلات اور جان گسل مراحل سے گزرنا پڑا۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے جہاد کی صورت میں آپ کو اور آپ کی امت کو وہ نسخہ کیمیا عطا فرمایا جو دعوت کی راہ میں رکاوٹ بننے والی تمام مشکلات کا حل اور تمام دشواریوں کا علاج تھا۔ آپ نے یہ کارگر نسخہ کن اصولوں کے تحت اور کن تدابیر کے ساتھ استعمال فرمایا؟ اس کی کچھ تفصیل آیندہ میں آئے گی۔

شرک کے گہوارے میں توحید کا نقارہ

شرک میں گرفتار قابلِ رحم دنیا:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت مبارکہ سے قبل دنیا کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دور دراز واقع خطوں مثلاً ہندو چین، یورپ و امریکا کو چھوڑیے، خود دنیا کا دل جزیرہ نمائے عرب جہاں وحی الٰہی مسلسل اترتی رہی۔ جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام برابر تشریف لاتے رہے۔ چاروں آسمانی کتابیں رشد و ہدایت کا نور پھیلاتی رہیں۔ اس کا یہ حال تھا کہ توحید و شریعت کی تعلیمات کو بھلا کر یہاں کے باشندے شیطان کے جال میں بری طرح گرفتار اور شرک و بت پرستی کے ناقابل بیان حد تک خوگر تھے۔ اس وقت مہذب دنیا جزیرۂ عرب اور قریب کی دو بڑی طاقتوں فارس و روم تک محدود تھی۔ زمین کے موجودہ جغرافیے میں دنیا کے جو بقیہ بڑے بڑے ملک اور قومیں ہیں، اس وقت ایک گاؤں اور قبیلے جیسی تھیں۔ بے شک ان میں سے ہر ایک میں پیغمبر ہوئے۔ ارشادِ باری ہے: ''اور دنیا میں ایسی کوئی بستی نہیں جس میں کوئی پیغمبر نہ گذرا ہو۔'' لیکن کوئی جلیل القدر نبی جن کی دعوت کا میدان اور جس کا ذکر قرآن میں ہو، ان میں مبعوث نہیں ہوا۔

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے:

اس وقت زمین کے طول و عرض میں آثارِ قدیمہ کی شکل میں جگہ جگہ جو اجڑی ہوئی بستیاں، جا بجا پھیلے ہوئے کھنڈرات اور قدیم آبادیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں، یہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو نہ ماننے والی قوموں کے عبرتناک انجام کی یاد دلاتے ہیں، کیونکہ اس زمانے میں سنتِ الٰہیہ یہ تھی کہ نہ ماننے والوں کو باری تعالیٰ حجت پوری ہو جانے کے بعد خود سزا دیتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں کافروں کو بذریعہ جہاد سزا دینے کا فریضہ اور اعزاز صرف امت محمدیہ کے حصے میں آیا۔ آسمانی ہدایت سے محروم مغربی اقوام کے نام نہاد ماہرین آثارِ قدیمہ ان آبادیوں کے اجڑنے اور تہہ و بالا ہونے کے اسباب دریافت کرتے ہیں اور ان کے جاہل سرمایہ دار عوام ایسی جگہوں میں جا کر تفریح کرتے اور دادِ عیش دیتے ہیں، جبکہ مسلمانوں کے پاس موجود اللہ کے سچے کلام نے صدیوں پہلے ان آبادیوں کے ویران ہونے کا حقیقی سبب بتاتے ہوئے عالمِ انسانیت کو تنبیہ کر دی تھی کہ یہ جائے تماشا نہیں، مقامِ عبرت ہے۔ ان کو دیکھ کر لطف نہ لو، اللہ کے غصے کو یاد کرو۔ یہاں آ کر موج نہ اُڑاؤ، اپنے انجام کی فکر کرو۔

آمدم برسر مطلب، بات یہ ہو رہی تھی کہ اس کرۂ ارض کے قلب سرزمین عرب اور اس کے اردگرد کے ماسوا دنیا پسماندہ گاؤں کی طرح تھی۔ ان میں جو انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ان کی دعوت اپنے قبیلے اور علاقے والوں کے لیے تھی۔ ان کو اپنی قوم سے باہر دعوت کا فریضہ سونپا گیا تھا نہ ان کی طرف ایسی کوئی کتاب اُتاری گئی جس کی تعلیمات انسانیت کے ایک بڑے طبقے کے لیے ہوں۔ دنیا کے تمام جلیل القدر انبیاء اور صاحبِ شریعت رسول سرزمینِ عرب اور اس کے گرد و نواح میں بھیجے گئے کہ یہ قدیم تہذیبوں کا مرکز اور اس وقت کی مہذب دنیا کا دل اور مرکز تھی۔

دیوی دیوتاؤں کا ہجوم:

خالقِ کائنات کی طرف سے یکے بعد دیگرے یہاں اللہ کو ایک ماننے اور اس کے بتائے ہوئے احکامات پر چلنے کی دعوت دینے والے انبیائے کرام کے بھیجے جانے کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے پہلے وحی کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع ہوتے ہی شرک اپنی بدترین صورتوں میں رائج و نافذ ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے رشتہ کمزور ہو کر غیر اللہ سے جڑ گیا تھا۔ دنیا کے لیے مرکزِ توحید خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت ایستادہ تھے۔ اس کے علاوہ ہر قبیلے کا اپنا اپنا حاجت روا اور ہر علاقے کے لیے الگ الگ مشکل کشا کسی پہاڑی کی چوٹی پر یا کسی وادی کے دامن میں براجمان تھا، جس پر چڑھاوے چڑھائے جاتے، نذرانے پیش کیے جاتے اور جانوروں کی بھینٹ دی جاتی تھی۔ جس انسان کو "مسجودِ ملائک" کا اعزاز دیا گیا وہ شجر و حجر کے سامنے ماتھا ٹیکتا تھا۔

جزیرہ عرب میں اس وقت اکتیس مشہور بت تھے جو انسان کو اپنے سامنے پستی کی آخری حد تک جاتا ہوا روز دیکھتے اور اس کی حماقت پر ہنستے تھے۔ ان میں وہ آٹھ مشہور بت بھی شامل ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ تین کا تو قریش کو مخاطب کر کے اور پانچ کا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ذکر میں۔ اول الذکر لات، منات اور عزیٰ ہیں۔ (دیکھیے سورۂ نجم: پ 27) اور مؤخر الذکر وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں۔ (دیکھیے سورۂ نوح: پ 29) ان میں سے کچھ مذکر تھے اور کچھ مؤنث (مثلاً ہبل، اور نائلہ نامی بتوں کی جوڑی تھی) کچھ انسان سے ملتی جلتی شکل کے تھے اور کچھ ماوراء الفطرت مخلوق کی صورت والے، غرض یہ کہ دیویوں اور دیوتاؤں کا ایک ہجوم تھا، جن کے درمیان گھری ہوئی انسانیت کو پیغام ہدایت دینے کے لیے نبی آخر الزماں، سرورِ کون و مکاں، حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا۔ آپ کے سامنے سنگلاخ چٹانوں پر مشتمل پتھریلی زمین اور بے آب و گیاہ صحرا کی طرح ریتیلا میدان تھا جہاں آپ نے شرک و بدعت کی جھاڑیاں ختم کر کے توحید و سنت کا گلزار بسانا تھا۔

سبق پھر پڑھ......:

آج دنیا میں پھر شرک و بدعت کا غلغلہ ہے اور توحید و سنت کے متوالے اللہ کی مخلوق کو غیر اللہ سے توڑ کر اللہ واحد کی ذات سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ داعیٔ اعظم اور موحّدِ اکبر کی سیرت اور طریقہ کار کا مطالعہ کر کے اپنی محنت کو اس کے مطابق اور تابع بنائیں۔ اے توحید کی برکات اور نبی کی پیاری سنتیں دنیا تک پہنچانے کی تڑپ رکھنے والے مسلمانو! نبی علیہ السلام کو فریضۂ جہاد اپنانے کی بدولت قلیل وقت میں بے مثال کامیابی حاصل ہوئیں۔ تم بھی ان کے اس طریقہ کو اپنالو، دنیا سے شرک اور بدعت تب ہی ختم ہو سکتی ہے۔

تین یادگار مقامات:

حضور علیہ السلام نے جب ربّ ذوالجلال کی وحدانیت کی دعوت شروع کی تو شرک کے دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے قابلِ رحم لوگوں کو حضور کا یہ اندازِ مسیحائی پسند نہ آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جہنم کے کنارے سے واپس کھینچ لینا چاہتے تھے لیکن وہ آپ کو محسن ماننے کے بجائے آپ کے دشمن ہوتے چلے گئے۔ اس زمانے میں تین جگہیں ایسی تھیں جن کا خصوصیت

سے تذکرہ کرنا مقصود ہے کہ ان سے کچھ تاریخی واقعات متعلق ہیں۔

(1) پہلی جگہ دارِارقم جو مسجد حرام کے قریب تھی۔ یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے۔ گویا یہ ایک درس گاہ، خانقاہ اور آپ کے ابتدائی ساتھیوں کی تربیت گاہ تھی۔

(2) دوسری محصّب نامی وہ وادی ہے جہاں مشرکین نے جمع ہوکر آپس میں عہد کیا کہ بنی ہاشم کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کرو۔ ان سے رشتہ ناطہ، لین دین، سماجی تعلقات ختم کردو اس وقت تک جب تک یہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے حوالے نہ کریں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب جہاد کی برکت سے ان ظالموں پر فتح نصیب ہوئی تو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات سے واپس آتے ہوئے اس وادی میں قصداً قیام فرمایا تھا تاکہ اللہ کے انعامات کا شکر ادا کرسکیں۔

(3) تیسری جگہ شعب ابی طالب ہے، جہاں مشرکین کے مقاطعہ (سماجی بائیکاٹ) کے بعد حضور علیہ السلام بنی ہاشم اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ تین سال تک قیام پذیر رہے۔ دنیا کی کون سی مشقت تھی جو آپ پر یہاں نہ گذری ہو لیکن اپنے امتیوں تک دین حق پہنچادینے اور انہیں جہنم سے بچا کر جنت کا مستحق بنادینے کی جو فکر و تڑپ آپ علیہ السلام کے قلب مبارک میں تھی، اس کی بنا پر آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ یہ جگر خراش مظالم اور دلدوز تکالیف برداشت کیں۔

تقاضائے غیرت:

پاک پیغمبر کے نام لیواؤ! ان کی محبت کو دلوں میں بسانے والو! روزِ قیامت ان کی شفاعت کے امیدوارو! نبی نے تو اپنی جان پر سب تکالیف اُٹھا کر یہ دین تم تک پہنچادیا۔ اب غیرت و شرافت کا تقاضا ہے کہ دنیا کے ان کم نصیبوں تک تم یہ حیات بخش تعلیمات پہنچانے کی فکر کرو جو ان سے محروم ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پہلے تم خود سارے منکرات سے تائب ہوجاؤ۔ پھر جہاد کی تربیت سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ پھر اسلام کی دعوت دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے اور اس میں رکاوٹ بننے والے کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے نکل کھڑے ہو۔

ہجرتِ حبشہ کا واقعہ

ہجرت و جہاد: دو آزمائشیں، دو علامات:

انسان کے نزدیک دو چیزیں سب سے زیادہ عزیز ہیں: (1) وطن، جہاں اس کا گھربار، بیوی بچے، مال واسباب اور زندگی کا جما جمایا نقشہ ہوتا ہے۔ (2) جان، جس کو راحت پہنچانے کی خاطر وہ دنیا جہاں کی مشقتیں اُٹھاتا اور پاپڑ بیلتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی اپنی ذات سے عقیدت اور محبت وتعلق کی آزمائش کے لیے ان دونوں چیزوں کی قربانی پر مشتمل دو احکام رکھے ہیں: ایک ہجرت اور دوسرے جہاد۔ پہلے پر عمل کرتے ہوئے بندہ اپنے مالک کو راضی کرنے کے لیے اپنی جائے پیدائش، مقامِ رہائش، دوست احباب، عزیز واقارب کو چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے میں اپنی سب سے قیمتی پونجی کو پاک پروردگار کی خاطر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نچھاور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاجر اور مجاہد کے فضائل بے شمار اور باری تعالیٰ کے نزدیک ان کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے کہ یہ دونوں عمل عقیدہ وایمان کی سب سے بڑی کسوٹی اور محبت وتعلق کی سب سے کڑی آزمائشیں ہیں۔ بلاشبہ ہجرت اور جہاد سچے مؤمن کی نشانیاں ہیں۔

سچے نبی کے سچے ساتھی:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تو خیر تھے ہی خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ سچے اور کھرے، آپ نے نہ صرف دونوں آزمائشوں میں پورا اُتر کر دکھایا بلکہ اعلیٰ ترین مثال قائم کی، لیکن آپ کی صحبت کی نعمت عطا کرنے کے لیے ربّ العزت نے جن خوش نصیب ہستیوں کو چنا، ان کے صدق واخلاص، وفاداری اور جانثاری کی بھی ملاء الاعلیٰ کے فرشتے تک گواہی دیتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں کفار کے مظالم جب بہت بڑھ گئے اور ان کے علاج کے لیے جہاد کا عمل چند دیگر احکام شرعیہ کی طرح ابھی مشروع نہ ہوا تھا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ آپ کے صحابہ اپنا دین وایمان، کفر وشرک کے فتنے سے بچانے کے لیے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ایشیا اور افریقہ کے درمیان حائل سمندر (بحر احمر) پار کر کے ایک اجنبی سرزمین میں اجنبی افریقیوں کے درمیان پناہ لینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس قافلے میں گیارہ مرد اور پانچ عورتیں تھیں جن میں خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کی زوجہ محترمہ بنت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ جب یہ حضرات ساحل پر پہنچے تو دو تجارتی کشتیاں حبشہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ انہوں نے پانچ درہم لے کر ان سب کو سوار کر لیا۔ مشرکین کو جب خبر ہوئی تو آدمی پیچھے دوڑائے لیکن جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو کشتیاں روانہ ہو چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لیے قربانی دینے والوں کی یونہی مدد فرماتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق یہ حضرات جدّہ کے ساحل سے سوار ہوئے تھے۔ (فتح الباری: ج7، ص81)

مسلمانو! جب اللہ تمہیں ان جگہوں پر جانے کی سعادت نصیب کرے تو تھوڑی دیر وہاں کھڑے ہو کر ان مشقتوں کا تصور (مراقبہ) کر لیا کرو جو اللہ کے ان پیاروں نے اُٹھائیں۔ پھر دین کے لیے اپنی خدمات اور کارکردگی کا ان سے موازنہ کر کے

گزشتہ پر استغفار اور آیندہ کے لیے عزم کو تازہ کرلیا کرو۔ سیرت اور تاریخ کے مطالعے کا اصل مقصد یہی ہے۔

مہاجرینِ حبشہ کے اسمائے گرامی:

مرد:

(1) عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

(2) عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

(3) زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ

(4) ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ

(5) مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ

(6) ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ

(7) عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

(8) عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ

(9) سہیل بن بیضا رضی اللہ عنہ

(10) ابوسبرۃ بن ابی رہم عامری رضی اللہ عنہ

خواتین:

(1) حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ۔

(2) سہلہ بنت سہیل، ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیوی

(3) ام سلمہ بنت ابی امیہ، ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی بیوی جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت سے مشرف ہوکر اُمّ المؤمنین کے لقب سے ملقب ہوئیں۔

(4) لیلیٰ بنت ابی حشمہ، عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کی بیوی

(5) اُمّ کلثوم بنت سہیل بن عمر رضی اللہ عنہ، ابوسبرۃ کی بیوی

(فتح الباری، باب هجرة الحبشه: ج7،ص143)

کفر کی دو شیطانی تدبیریں اور اُن کا شافی علاج:

جب یہ حضرات ہجرت کے عمل کی برکت سے مشرکین کے چنگل سے صاف نکل گئے تو مشرکین تلملا اُٹھے اور سر جوڑ کر ان کو اپنی تحویل میں لانے کی تدبیریں سوچنا شروع کیں۔ کفر ملت واحدہ ہے، کل کے کافر کے پاس بھی وہی دو شیطانی تدبیریں تھیں جو آج کے کافروں کے پاس ہیں یعنی لالچ وطمع اور دھونس و دھاندلی۔ آج کا کافر انقلابی مسلمانوں کو اپنے بس میں کرنے کے لیے کبھی اقتصادی پابندیوں اور کبھی میزائل حملوں سے کام لے رہا ہے۔ کل کے کفار کے بھی یہی رنگ ڈھنگ تھے لیکن حق غالب ہونے اور باطل مغلوب ہونے کے لیے آیا ہے بشرطیکہ حق والے حق کو سو فیصد اپنائیں۔ صحابہ کرام نے جس طرح ایمان و جہاد کی

بدولت باطل کا بھیجا پاش پاش کیا۔ آج ان کے نام لیوا صرف اور صرف اسی مبارک عمل کے ذریعے کفر کا دماغ درست کر سکتے ہیں۔ کفارِ مکہ نے دو سفارتی نمایندے قیمتی تحفہ تحائف کے ساتھ بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس بھیجے تا کہ رشوت اور چاپلوسی کے ذریعے سے کام نکالا جائے۔ بادشاہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف سنے بغیر انہیں حوالے کرنے سے انکار کیا اور انہیں بلا بھیجا۔

کامیابی استقامت میں ہے نہ کہ مصلحت کوشی میں:

صحابہ کرام کی جماعت کی طرف سے حضور علیہ السلام کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھرے دربار میں کھڑے ہو کر اسلام کا مختصر تعارف پیش کیا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا کیونکہ بادشاہ عیسائی تھا اور خالص اسلامی عقائد بیان کرنے سے اس کے مخالف ہو جانے کا اندیشہ تھا نیز دستور کے مطابق حاضری کے وقت اس کو سجدہ بھی کرنا پڑتا تھا، مگر آفریں ہے صحابہ کے ایمان و استقامت پر اور سلام ہے ان کی جرأت و حق گوئی کو۔ انہوں نے یک زبان ہو کر یہ طے کیا کہ ہم دربار میں وہی کہیں گے جو نبی علیہ السلام نے ہمیں سکھایا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے اس میں ذرا بھی تبدیلی نہ کریں گے۔ اسی طرح دربار میں داخلے کے وقت سجدہ بھی نہ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس واقعے میں آج کل کے مسلمانوں کے لیے عظیم سبق ہے جو اپنی بزدلی اور کم ہمتی کو ''مصلحت'' اور ''حالات کے تقاضے'' کا نام دے کر دین کے احکام میں ڈنڈی مار لیتے ہیں۔ انہیں یہ اصول سمجھ لینا چاہیے کہ کامیابی ہر حال میں شریعت پر عمل کرنے میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کا آدمی تب ہی مستحق ہوتا ہے جب مشکل حالات میں بھی اس کا حکم پورا کرے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر جو خطبہ دیا اس میں عربوں کی قدرتی فصاحت و بلاغت، بدیہہ گوئی اور بے تکلف اظہار کی فطری صلاحیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ آپ نے کم وقت میں جیسا مؤثر اور جامع تعارف پیش کیا اور بادشاہ کے استفسار پر جیسی برمحل آیات تلاوت فرمائیں، ان کو سن کر سب کے آنسو نکل آئے۔ روتے روتے بادشاہ کی ڈاڑھی تر ہو گئی (معلوم ہوا کہ بادشاہ ڈاڑھی رکھتا تھا اور یہی تمام انبیائے سابقین اور نیک لوگوں کا طریقہ تھا۔ مسلمانو! تمہیں کیا ہوا کہ اللہ کی رحمت کے مستحق پارسا لوگوں کی شکل و شباہت چھوڑ بیٹھے ہو۔ اللہ والوں جیسی شکل بناؤ یہ ظاہری شکل بھی بیکار نہیں جائے گی اور بیڑا پار لگا دے گی۔ ان شاء اللہ) نجاشی نے کفر کے سفیروں سے صاف کہہ دیا کہ میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے سپرد نہ کروں گا اور صحابہ سے کہا: ''خدا کی قسم! تم سب راست باز ہو، اللہ کے نام پر یہاں امن و امان سے رہو۔ میں سونے کا پہاڑ لے کر بھی تم کو ستانا پسند نہیں کرتا۔'' (مسند احمد بن حنبل، حدیث جعفر بن ابی طالب فی الہجرۃ: ج 1 ص 201، مجمع الزوائد: ج 6، ص 27، سیرۃ ابن ہشام: ج 1، ص 115)

دستورِ مردانگی:

مسلمانو! کل کے کفار میں بھی اتنی غیرت تھی کہ اپنے علاقے میں پناہ لینے والوں کو کسی کے حوالے کرنا مردانگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ تمہارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا کہ عرب مسلمان مہاجرین کو تو افریقہ کے غیر مسلم پناہ دے دیں اور آج تمہارے مسلمان عرب بھائی تمہاری مہمانی میں غیر محفوظ ہوں؟؟؟ کبھی تم نے سوچا بھی ہے کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم قوم اور ان کے پاک روضے کی تحفظ کی خاطر دربدر ہونے والے عرب مجاہدین کو تمہارے علاقے میں کچھ ہو گیا تو کل حضور علیہ السلام کو کیا منہ دکھاؤ گے!!! تمہیں غیرت سے عاری اور دستورِ مردانگی سے بے خبر شخص کا سلام قبول کرنا گوارا نہیں ہوتا۔ ربِّ ذوالجلال کو ایسے شخص کا سجدہ کیا قبول ہوگا؟ ان باتوں کو سوچو اور جتنی زندگی باقی رہ گئی ہے، اس کو غیرت سے گزارنے کا عزم کرو۔

ہجرتِ مدینہ کے اسرار و رموز

ہجرت و جہاد، چولی دامن کا ساتھ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں قیام کے زمانے میں گھروں، بازاروں اور میلوں میں جا جا کر اسلام کی دعوت کر دیتے تھے۔ سخت ترین مشکلات اور بدترین مخالفتوں کے باوجود آپ کی محنت جاری تھی اور آپ اللہ تعالیٰ کے باغی انسانوں کو اس کے محبوب اور پسندیدہ بندے بنانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے لیکن چونکہ آپ کی دعوت کا سارے عالم میں پہنچانے اور اس راستے میں حائل ہونے والوں کے خلاف جہاد کی تیاری کے لیے موزوں میدان اور ایسی جماعت کی ضرورت تھی، جو اللہ کے دین کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو اور ساری دنیا کی مخالفت مول لے کر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں پناہ اور تحفظ دے سکے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے غلبہ دین کے لیے مؤثر اور مبارک عمل ''دعوت الی اللہ'' اور ''قتال فی سبیل اللہ'' کے لیے آپ اور آپ کے اصحاب کو ہجرت کا حکم دیا، کیونکہ ہجرت و جہاد میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مسند احمد میں براویت جابر بن عبداللہ رضی عنہ منقول ہے۔ آپ دعوت دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''من یؤوینی و ینصرنی حتی ابلّغ رسالة ربی و له الجنة!'' ''کون ہے جو مجھ کو ٹھکانہ دے اور میری مدد کرے تاکہ میں خدا کا پیام پہنچا سکوں۔ ایسے شخص کا بدلہ جنت ہوگی۔'' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی مدد و نصرت کے لیے یثرب کے باسیوں کو چن لیا جو اپنی سادگی و دیانت، صفائے قلبی اور مروت و اخلاق میں عرب بھر میں مشہور تھے۔ چنانچہ ان نیک بخت اور خوش نصیب افراد میں سے کچھ آپ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے اور جان و مال سے آپ کی مدد کرنے کی بیعت کر کے آپ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

خلوص و وفا کے پتلے:

ان حضرات کے صدق و وفا کا اندازہ ابن ہشام کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں نقل ہے کہ بیعت کے وقت عباس بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بیعت کرنے والے صحابہ سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے قبیلۂ خزرج کے لوگو! تم کو معلوم بھی ہے کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ سمجھ لو کہ عرب اور عجم سے جنگ کرنے پر بیعت کر رہے ہو۔ اگر آئندہ چل کر مصائب و شدائد سے گھبرا کر ان کو چھوڑ دینے کا خیال ہو تو ابھی سے چھوڑ دو۔ اُس وقت گھبرا کر چھوڑنا خدا کی قسم! دنیا آخرت کی رسوائی کا سبب ہوگا اور اگر تم مشکلات کا سامنا کر سکتے ہو اور اپنی جان پر کھیل کر اپنے عہد اور وعدہ پر قائم رہ سکتے ہو تو واللہ اس میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی فلاح و خیر ہے۔''

ان کی یہ باتیں سن کر سب نے یک زبان ہو کر کہا: ''ہاں! ہم اس پر بیعت کر رہے ہیں کہ آپ کے لیے جان و مال قربان کرنے سے ہمیں دریغ نہیں ہوگا۔ خدا کی قسم! مصائب سے ڈر کر ہم اس بیعت کو نہیں چھوڑ سکتے۔'' (سیرۃ ابن ہشام: ج 1، ص 156)

اندازہ لگائیے! صحابہ کے ایمان و اخلاص اور جرأت و شجاعت کا کہ اس وقت سارے روئے زمین پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

کوئی حامی نہ تھا اور حضور کا ساتھ دینے کا مطلب شر کی تمام طاقتوں سے جنگ مول لینا تھا، لیکن خلوص و وفا کے یہ پتلے جہاد کا حکم نازل ہونے سے قبل ہی دین کی حفاظت کے لیے جان دینے کا عہد کر رہے تھے اور آسمان کی رفعتیں شاہد ہیں کہ اس عہد کو انہوں نے جیسا نباہ کر دکھایا، اوّلین و آخرین اس کی نظیر لانے سے قاصر ہیں۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

صحابہ کا حبِ رسول ﷺ:

صحابہ کے اخلاص وللّٰہیت اور حبِ خدا اور رسول کی صحیح تصویر قارئین کے سامنے نہ آسکے گی اگر اس موقع پر ہم مشہور سیرت نگار محمد بن اسحٰق کی وہ روایت نقل نہ کریں جسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن حبان کی تصحیح کے ساتھ درج کیا ہے۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اور رسول کی محبت ان کے رگ و پے میں ایسی سرایت کر چکی تھی کہ ان کو اپنی جان و مال کی پرواہ نہ تھی۔ غم تھا تو اس کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غلبۂ دین کی محنت مکمل ہونے پر فتح و نصرت ملنے کے بعد کہیں انہیں تڑپتا چھوڑ کر واپس مکہ مکرمہ تشریف نہ لے جائیں۔ چنانچہ بیعت میں شریک ایک صحابی ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ نے اپنا یہی خدشہ حضور علیہ السلام سے عرض کیا، آپ علیہ السلام یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا: ''ہرگز نہیں تمہاری جان میری جان ہے۔ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔ جس سے تمہاری جنگ ہے اس سے میری جنگ ہے، جس سے تمہاری صلح ہے اس سے میری بھی صلح ہے۔'' اس یقین دہانی کے بعد سب نے برضا و رغبت بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ (فتح الباری: ج7، ص173)

سچی محبت کی دو نشانیاں:

اس واقعے میں سبق ہے نفس و شیطان کے دھوکے میں گرفتار ان لوگوں کے لیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سربلندی کے لیے جان و مال کی قربانی دینے اور مشقت برداشت کرنے سے تو گریزاں رہتے ہیں، لیکن چند من گھڑت رسومات سرانجام دے کر عشقِ رسول کے دعویدار اور اس کی فضیلت کے اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہیں۔ سچی محبت یہ ہے کہ خود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق بنا جائے اور سارے مسلمانوں کو ویسا بنانے کی فکر کی جائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کے دشمنوں کا دماغ درست کرنے اور آپ کی محبوب اُمت پر ظلم کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے جان و مال سے جہاد کیا جائے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ سچی محبت کی دو ہی نشانیاں ہیں: ایک یہ کہ محبوب کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کے دوستوں سے دوستی اور دُشمنوں سے دشمنی ہو۔ اس کے بغیر سب دعوے ہیں حقیقت نہیں۔ دھوکے ہیں، سچائی نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ان مردانِ خدا کے قول و قرار سے سچائی اور مردانگی ٹپکتی دیکھی تو اپنے دیگر صحابہ کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ آپ کا اذن پا کر صحابہ اپنے بھرے پُرے گھروں کو چھوڑ کر آزاد سرزمین کی طرف نکلنے لگے تاکہ وہاں کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر اللہ کے احکامات اور نبی علیہ السلام کی سنتوں کے مطابق زندگی گذار سکیں اور دین اسلام کو ساری دنیا میں سربلند کرنے کے آسمانی نسخے ''جہاد'' پر عمل پیرا ہو سکیں جو اس اُمت کا خاصہ اور امتیاز ہے۔ اس موقع پر ان کے ایمان و استقامت اور قربانی و مجاہدے کے مظاہروں پر مشتمل عجیب عجیب واقعات پیش آئے، جن کو قارئین سیرت کی کتابوں میں پڑھ کر ایمان تازہ کر سکتے ہیں۔ آخر کار جب تقریباً تمام صحابہ ہجرت کر گئے اور مکہ مکرمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور چند ان بے بس مسلمانوں کے جو کفار کے پنجۂ ستم میں پھنسے ہوئے تھے، کوئی نہ رہا تو آپ

کو بھی مکہ مکرمہ چھوڑنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ساری جماعت کو رخصت کرنے کے بعد آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو چند امانتیں جو آپ کے پاس تھیں، مالکوں تک پہنچانے کی ذمہ داری دے کر مدینہ منورہ کا پختہ عزم فرمالیا۔

سچی دوستی کی درخشاں مثال:

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آپ علیہ السلام عین دوپہر کے وقت (اس وقت عرب کم ہی کسی کے گھر جاتے تھے) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے ہجرت کی اجازت ہوگئی ہے۔ جنابِ صدیق نے دریافت کیا کہ مجھے بھی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوگا؟ آپ کے اثبات میں جواب دینے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خوشی سے رو پڑے۔ ابن اسحق کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سے قبل مجھے گمان نہ تھا کہ کوئی فرطِ مسرت سے بھی روتا ہے۔ جنابِ صدیق کو آپ کی رفاقت اور اس مشکل وقت میں آپ کی حفاظت و خدمت کے لیے ساتھ رہنے کا اس قدر اشتیاق تھا کہ آپ نے پہلے ہی سے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی تھیں جن کو چار مہینے سے ببول کے پتے کھلا رہے تھے۔ انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! دونوں میں سے جو چاہیں آپ کے لیے ہدیہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بغیر قیمت کے نہ لوں گا۔ معجم طبرانی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دوسری صاحبزادی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جنابِ صدیق نے بلاتکلف عرض کیا اگر آپ قیمتاً لینا چاہیں تو قیمتاً لے لیں۔ (فتح الباری: ج7، ص183)

مطلب یہ تھا کہ میری ذاتی خواہش کچھ بھی نہیں، میری خواہش اور قلبی میلان آپ کے اشارہ کے تابع ہے۔ اللہ اکبر! یہ ہے کامل طاعت اور بلاتکلف دوستی جس میں اپنی بات منوانے پر اصرار اور تصنع کے بجائے دوسرے کی راحت اور رضامندی کا خیال رکھا جائے۔ بلاشبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ابتدا سے ہی فنا فی الرسول کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔

اللہ والوں کے لیے اسوۂ حسنہ:

حضور علیہ السلام نے اپنے مخلص دوست کی خدمات اور پیش کردہ ہدایا کو اکثر قبول فرمایا، مگر اس موقع پر قیمت دیے بغیر اس لیے نہ لیا کہ ہجرت کے عظیم عمل میں اپنا ذاتی مال استعمال ہو اور خدا کی راہ میں اپنی جان کے ساتھ اپنا ہی مال استعمال ہو۔ تنظیمی کام کرنے والوں اور اللہ کی راہ میں جانے والوں کے لیے یہ بہترین اسوۂ حسنہ ہے۔

امیر کا حسنِ تدبر اور مامور کی جانثاری:

سفر ہجرت میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی فراست اور حسنِ تدبیر اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے ایسی وفا شعاری اور عقیدت مندی دیکھنے میں آتی ہے جو دین کا کام کرنے والوں اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلنے والوں میں سے امیر و مامور کے لیے بہترین نمونہ اور لائق تقلید مثال ہے، مثلاً:

(1) حضور علیہ السلام نے نکلتے وقت اپنی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سونے کا حکم دیا تاکہ کفار مکہ کو جو آپ کے قتل کے لیے جمع تھے، علم نہ ہونے پائے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں نہیں۔

(2) آپ نے نکلتے ہی مدینہ کی راہ نہ لی بلکہ مدینہ منورہ کی مخالف سمت میں واقع غارِ ثور میں فروکش ہوگئے اور تلاش کرنے والوں کی سرگرمی میں سستی آنے کے بعد جائے پناہ سے نکلے۔

(3) دونوں اونٹنیاں آپ نے ساتھ نہ رکھیں بلکہ عبداللہ بن اریقط کو دیں کہ وہ تیسرے دن لے کر غارِ ثور پر حاضر ہو۔

(4) غار میں قیام کے دوران غذا کی فراہمی اور دشمن کے ارادوں سے واقفیت کے لیے یہ ذریعہ استعمال کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ بن ابی بکر، دن بھر مکہ مکرمہ میں رہتے اور رات کو آ کر دشمن کی خبریں بتا جایا کرتے اور آپ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ بکریاں چراتے چراتے غار کے قریب آ جاتے اور اندھیرے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو دودھ پلا جاتے تھے۔

(5) عام راستے کے بجائے آپ نے غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ تعاقب کرنے والے سر پٹکتے رہ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بمع اپنے جانثار یارِ غار کے عافیت سے مدینہ منورہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔

تپتی دھوپ میں نخلستان کا سایہ:

یہ تو تھی آپ کی حسنِ تدبیر، جزم واحتیاط اور بیدار مغزی جو مجاہدین کے لیے قیمتی سبق ہے کہ وہ اس کو دوسرے احکام الٰہیہ اور سنن نبویہ کی طرح ثواب سمجھ کر اپنائیں اور اپنی منصوبہ بندی میں کسی قسم کا رخنہ نہ رہنے دیا کریں۔ دوسری طرف جنابِ صدیق کی وفاداری اور جانثاری کی شان وہ تھی جو دلائل بیہقی میں محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ راستے میں بے تابانہ کبھی آگے چلتے اور کبھی پیچھے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں، یعنی جب کبھی خیال آ گیا کہ کہیں پیچھے سے کوئی تلاش میں نہ آ رہا ہو تو آپ کے پیچھے چلتے۔ جب کبھی اندیشہ ہوتا کہ راستے میں کوئی گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو تو آگے آگے چلنے لگتے۔ اسی طرح کبھی دائیں اور کبھی بائیں۔ اس نیت سے کہ اگر آپ پر کوئی حملہ ہو تو میں ڈھال بن کر جان دے دوں اور رسول اللہ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ سبحان اللہ! یہ ہے سچی دوستی اور حقیقی جانثاری۔ اللہ تعالیٰ اس کا کوئی ذرّہ ہمیں بھی نصیب فرما دے تو دنیا وآخرت سنور جائیں۔

تمام سنتیں مبارک ہیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بروز جمعرات مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اور تین دن غارِ ثور میں ٹھہر کر پیر کے روز روانہ ہوئے اور پیر کے دن ہی بتاریخ 12 ربیع الاوّل (ایک روایت کے مطابق 8 ربیع الاوّل مطابق 24 ستمبر 622ء) بنوعوف کے ہاں نزول فرمایا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں بنوسالم بن عوف کے ہاں پہنچے تو جمعہ کا دن تھا۔ یہاں آپ نے اسلام کا پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ پھر مدینہ منورہ پہنچ کر میزبان رسول سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت خانہ میں فروکش ہوئے جو بنونجار کی آبادی میں تھا۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی تربیت کی۔ انہیں مثالی انسانی سانچے میں ڈھالا اور مسجدِ نبوی کو تعلیم وتدریس، دعوت وتبلیغ اور جہاد وقتال کا مرکز بنا کر وہ مبارک مہم شروع کی جس نے چند سالوں میں کایا پلٹ ڈالی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سنتوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

اسلام سے قبل دنیا کی حالت

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیا میں تشریف آوری سے قبل عقائد کی خرابی اور اعمال کی تباہی اپنی آخری حدوں کو چھو چکی تھی۔ دنیا والے اپنے خالق و مالک کو بھلا کر کفر و شرک کی گندگی اور فسق و فجور کے اندھیروں میں گرفتار تھے۔ اس وقت جتنی دنیا عالم انسانیت کے سامنے دریافت ہوئی تھی اس کا حال یہ تھا کہ دنیا کے وسط یعنی جزیرۃ العرب میں ...... جہاں پے درپے بے شمار انبیاء آئے ...... شرک زوروں پر تھا۔ بتوں، درختوں اور پتھروں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ایشیا میں سلطنت فارس تھی۔ یہاں آگ جیسی حقیر چیز کو انسان جیسا ذی عقل اپنا کارساز سمجھتا تھا۔

فارس کے آگے ہندوستان تھا جہاں بت پرستی اپنی بدترین شکل میں رائج تھی۔ ایسے مندر بھی پائے جاتے تھے جہاں چوہے جیسی مخلوق کی پرستش ہوتی تھی۔ اس سے آگے چین تھا۔ یہاں بھی فرضی دیوتاؤں کی خدائی کا عقیدہ تھا۔ برِاعظم یورپ میں رومی سلطنت اور دیگر ممالک تھے جن میں مسیحیت کی مسخ شدہ شکل لوگوں کا دین بن چکی تھی۔ ان کے کئی فرقے تھے جو سخت متعصب، تنگ نظر اور جنونیت کی حد تک متشدد تھے۔ کہیں یہودیت بھی پناہ گزین تھی۔ افریقہ کے کچھ حصے بھی تحریف شدہ مسیحیت کو مانتے تھے۔ بقیہ میں انسانوں تک ابھی باہر کی دنیا کی روشنی نہ پہنچی تھی۔ وہ جنگلوں میں درندوں کے ساتھ رہنے کے طریقے ایجاد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

آج کے مہذب کہلوانے والے شمالی و جنوبی امریکا کا بھی یہی حال تھا۔ وہاں کوئی قابل ذکر سلطنت کیا ہوتی؟ اس وقت کی انسانی دنیا نے انہیں دریافت بھی نہیں کیا تھا اور وہاں بسنے والے جنگلی قبائل جانوروں سے بھی زیادہ حیوانیت میں مبتلا تھے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ ان سے بھی زیادہ دور واقع تھے۔ وہاں انسان ابھی غاروں میں رہتا اور جانوروں کے ساتھ زندگی گذارتا تھا۔ وہ علم و آگہی سے آشنا تھے نہ روحانیت اور اخلاق سے ان کا کوئی واسطہ تھا۔ آدم زاد دوسرے آدم زاد کا دشمن تھا۔ دنیا پر چاروں طرف جہالت کے اندھیروں کا راج تھا اور انسانیت وحی کے نور کو ترس رہی تھی۔

ان حالات میں اللہ ارحم الراحمین کو منظور ہوا کہ بنی آدم پر رحم کرے اور ان کی طرف وہ تعلیمات نازل کرے جن سے انسانیت پستیوں سے نکل کر اعلیٰ اخلاق سے آراستہ ہو اور نورِ باطن سے منور ہو کر اپنی معراج کو پالے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، دانائے سبل، خیر الرسل، مجسّم برکات، سرورِ کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔ آپ اس اندھیروں سے بھری دنیا میں اکیلے تھے۔ چاروں طرف کفر و جہالت کا راج تھا۔ غیر تو غیر اپنے بھی آپ کا ساتھ دینے کے بجائے جان کے دشمن ہو گئے تھے۔

اس مشکل صورتِ حال میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس طرح ممکن ہوا کہ پہلے تو جزیرۃ العرب کو توحید کی جانفزا خوشبو سے مہکائیں اور پھر اپنے ساتھیوں کی اس طرح کی تربیت کر جائیں کہ وہ اطراف عالم میں آپ کی لائی ہوئی دعوت لے کر پھیل جائیں؟ یہ سب کچھ ان شاء اللہ اگلی قسطوں میں بیان کیا جائے گا۔

اسلام سے قبل جزیرۂ عرب کے اہم شہر اور مشہور قبائل

بعثتِ نبوی کے وقت عرب کے اہم شہر اور مشہور قبائل کی آبادیاں جہالت میں گھری ہوئی تھیں۔ جزیرۂ عرب کے طول و عرض میں بکھرے یہ قبائل عقیدے اور اعمال کے لحاظ سے تباہ حال تھے۔ ان میں بت پرستی پوری طرح سے رائج تھی۔ قتل و غارت اور ڈاکہ و لوٹ مار ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ سخاوت، مہمان نوازی اور بہادری جیسی چند اعلیٰ انسانی صفات تو ان میں تھیں لیکن ان کا بھی صحیح استعمال نہ ہوتا تھا۔ ادب اور شاعری سے بھی ان کو شغف تھا لیکن یہ صلاحیت بھی زیادہ تر غلط مصرف میں استعمال ہوتی تھی۔ جزیرۂ عرب کے ایک طرف مجوسی فارسیوں اور دوسری طرف عیسائی رومیوں کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں، جنھوں نے تجاوز کر کے ملحقہ عرب علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن عرب کے باسیوں کو باہمی لڑائی جھگڑوں اور نسل در نسل چلنے والی دشمنیوں سے فرصت نہ تھی۔ کفر و شرک اور توہم پرستی و بدعملی کے اس مرکز کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت نے توحید و رسالت اور امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دیا۔ آپ کی دل نشین دعوت، جاں گسل قربانیوں اور جہاد و قتال پر مشتمل صبر آزما جدوجہد نے چند برس میں عرب کی کایا پلٹ دی اور ان صحرا نشینوں کو آدابِ جہانبانی سکھا دیے۔

جزیرہ نمائے عرب کی جغرافیائی تقسیم و اہمیت

سیرت نبوی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت و جدوجہد کو سمجھنے کے لیے جزیرۂ عرب کی جغرافیائی تقسیم، اس خطے کی اہمیت و محل وقوع اور آپ علیہ السلام کی بعثت سے قبل کے حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔ ذیل میں ہم اس زمانے میں جزیرۂ عرب کی جغرافیائی تقسیم اور اس وقت کی اردگرد کی مشہور بادشاہتوں کا تعارف کرواتے ہیں۔

جغرافیائی تقسیم:

جزیرۂ عرب کو علمائے تاریخ و ماہرین جغرافیہ نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) پہلا حصہ بحر احمر سے ملا ہوا ہے۔ اسے ''غور'' کہتے ہیں۔

(2) دوسرا حصہ پہلے سے متصل ہے۔ اس میں ''حجاز'' اور ''تہامہ'' نامی علاقے واقع ہیں۔

(3) اس حصے میں ''نجد'' کا ٹکڑا ہے۔

(4) چوتھے حصے کو مؤرخین ''عروض'' کا نام دیتے ہیں۔

(5) خلیج عرب سے ملی ہوئی پٹی ''بحرین'' اور ساحل خلیج کہلاتی تھی۔

بحر ہند اور بحر عرب سے ملنے والی پٹی میں ایک طرف عمان واقع تھا جہاں ''عبد'' اور ''جیفر'' نامی دو بھائیوں کی حکومت تھی۔ دوسری طرف یمن تھا جہاں مشہور عرب قبیلے ''حمیر'' کی حکمرانی تھی۔

جغرافیائی اہمیت:

جزیرۂ عرب طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اندرونی طور پر یہ چاروں جانب سے صحرا اور ریگستان سے گھرا ہوا ہے جس کی بدولت یہ ایسا محفوظ قلعہ بن گیا ہے کہ بیرونی قوموں کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور اپنا اثر و نفوذ پھیلانا سخت مشکل ہے۔ بیرونی طور پر یہ پرانی دنیا کے تین اہم براعظموں کے بیچوں بیچ واقع ہے اور خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے ان کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس کا شمال مغربی گوشہ براعظم افریقہ میں داخلے کا دروازہ ہے۔ شمال مشرقی کنارہ یورپ کی کنجی ہے۔ مشرقی گوشہ ایران، وسط ایشیا و مشرق بعید کے راستے کھولتا ہے اور ہندوستان و چین تک پہنچاتا ہے۔ اس طرح سمندر کے راستے سے بھی یہ تمام براعظموں سے جڑا ہوا ہے اور ان ممالک کے جہاز عرب کی بندرگاہوں پر براہِ راست لنگرانداز ہوتے تھے۔ دنیا کے وسط میں واقع ہونے کے علاوہ عرب میں بسنے والے باشندے جس طرح کے چند اعلیٰ انسانی اوصاف سے آراستہ تھے، ان کا تقاضا یہ تھا کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی میں مبعوث کیا جائے۔ سخاوت، مہمان نوازی، شجاعت، قوت حافظہ، خطابت و شاعری، حلیفوں کے ساتھ کیا گیا عہد نبھانے میں جان قربان کر دینا، غرض کہ کئی ایسی صفات تھیں جو ان پر ختم تھیں۔ بس انہیں صحیح رُخ دینے کی ضرورت تھی۔

سیاسی حالت:

اس وقت دنیا کی سیاسی حالت یہ تھی کہ اس کے دونوں طرف دنیا کی دو بڑی سلطنتیں قائم تھیں جن کے درمیان یہ حد فاصل تھا۔ یہ سلطنتیں اس وقت کی عالمی طاقتیں سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی قوت وشوکت کا یہ عالم تھا کہ یہ روئے زمین پر بسنے والی دیگر اقوام وقبائل کو کسی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ ہندوستان وچین تمدن وتہذیب، عسکری قوت اور نظامِ مملکت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ یورپ کا اکثر حصہ اس وقت برف کی تہوں تلے چھپا ہوا تھا اور یہاں کے باشندے جہالت اور غلاظت کا بدنما نمونہ تھے۔ شمالی و جنوبی امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور دنیا کے بہت سے جزائر اس وقت کی دنیا کے لیے دریافت ہی نہ ہوئے تھے اور ان میں جنگلی قبائل کا راج تھا۔ (ان قبائل کے بچے کھچے لوگ آج بھی یہاں پائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک ان ممالک پر قبضہ جمانے والی مہذب اقوام کے لیے باعثِ عار ہے۔)

گویا کہ لے دے کے فارس اور روم دو ہی طاقتیں رہ جاتی تھیں جو ترقی یافتہ اور تہذیب وتمدن کی نمائندہ تھیں اور دنیا پر ان کا سکہ چلتا تھا۔ ان دونوں طاقتوں تک حق کی دعوت پہنچانا اور نہ ماننے کی صورت میں ان کے ردّعمل کا سامنا کرنا بہت بڑا چیلنج تھا جو بہت راسخ اور گہرے ایمان ویقین کا تقاضا کرتا تھا۔ اللہ ربّ العالمین نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّلین وآخرین کا سردار اور تمام عالم کے لیے داعی وراہنما بنا کر بھیجا تو آپ کو ان تمام خوبیوں سے نوازا جو انبیائے سابقین کو عطا کی گئی تھیں۔

روشن اُمیدیں:

یوں آپ انسانیت کے اعلیٰ ترین اخلاق وعادات اور بنی آدم میں پائے جانے والے تمام اوصاف وکمالات سے آراستہ ہو کر دنیا میں تشریف لائے۔ اس وقت پوری انسانیت گمراہی کے گھپ اندھیروں میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا کہ آپ نوکیلے کانٹوں کے اس جنگل میں خوشنما پھولوں کا گلستان کیسے اُگاتے ہیں؟

دنیا نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل عرصے میں عرب کو توحید کا گہوارہ بنا کر ایسے رفقا اور شاگردوں کی جماعت تیار کی جن کے دل کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ علم اور معرفت میں بھی باکمال تھے اور اخلاق وعادات بھی بے مثال تھے۔ انہوں نے دنیا کی عظیم الشان طاقتوں سے مرعوب ہونے کے بجائے انہیں بانگ ودہل پیغامِ حق سنایا اور خون کے دریا عبور کر کے دنیا والوں تک توحید کی امانت پہنچائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر دعوت کی تکمیل آپ کے اصحاب اور تلامذہ کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ بھی آپ کا عظیم الشان معجزہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والے علماء ومجاہدین آج بھی دعوت وجہاد کا یہ تابناک سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن دنیا سے بہت عرصے تک جہاد کے موقوف رہنے کی وجہ سے آج کل دفاعی جہاد ہو رہا ہے۔ اللہ کرے کہ جلد ہی وہ وقت آجائے جب اقدامی جہاد شروع ہو اور ہم اپنی آنکھوں سے دنیا کی ظلمت کدوں کو اسلام کا مرکز ومسکن بنتے دیکھیں۔

سرزمینِ اسلام سے بتوں کا صفایا

سکڑی سمٹی دنیا:

دین کی دعوت کی بنیاد وسائل پر نہیں، اخلاص پر ہے۔ جب داعی کے دل میں اخلاص اپنی کامل صورت میں موجزن ہو تو خدا تعالیٰ اس کی آواز دور تک پہنچا دیتے اور مطلوبہ وسائل بھی بغیر ظاہری اسباب کے مہیا کر دیتے ہیں۔ طالبان سے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں توحید کی دعوت کا کام لینا تھا، سو ان کی آواز کو کسی خاص کاوش یا اسباب کے بغیر ہی دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ اس وقت گلوبلائیزیشن کے عمل کے تحت سکڑی سمٹی دنیا میں شاید ہی کوئی کچا یا پکا گھر ایسا ہو جہاں بتوں کی عاجزی و بے بسی کی کہانی پوری شرح و بسط کے ساتھ نہ پہنچ گئی ہو۔ یہ بہترین موقع ہے کہ شرک میں مبتلا قابل رحم انسانوں کو توحید کی دعوت پہنچائی جائے اور ان کے عقائد و نظریات کو وہم کی پستی سے نکال کر یقین کی بلندی تک پہنچایا جائے۔ سائنس نے اس دور میں بہت ترقی کر لی ہے اور سائنسی انکشافات کو حرف آخر سمجھنے والوں نے آسمانی مذاہب کے مسلّمہ حقائق پر طرح طرح کے اشکالات وارد کیے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ پتھر کے تراشے ہوئے اور مٹی سے گوندے ہوئے خداؤں کو پوجے جانے پر کسی نے حرف گیری نہیں کی۔ یہ اس دور کا عظیم انسانی المیہ ہے۔ اس کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے ہمیں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے راہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔

مضحکہ خیز اور رحم انگیز:

جزیرۂ نمائے عرب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے قبل متعدد بتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہ بت مختلف شکل و صورت کے اور مختلف مقاصد کے لیے تھے۔ ان میں مذکر بھی تھے اور مؤنث بھی، نیک انسانوں سے منسوب بھی تھے اور جانوروں سے بھی، قبائل کے درمیان مشترک بھی تھے اور خاص لوگوں کے لیے مخصوص بھی، بعض مضحکہ خیز تھے کہ ان کو معبود کا درجہ دینے پر ہنسی آتی تھی اور بعض ترحم انگیز تھے کہ ان کے سامنے پیشانی جھکانے والوں کی بدنصیبی پر ترس آتا تھا۔ ان بتوں کے مجاورین نے ان کے متعلق طرح طرح کے دل آویز قصے اور کرشمے مشہور کر رکھے تھے اور عربوں کو توہم کے ایسے طلسم میں جکڑ رکھا تھا کہ ان کے تخیل میں مٹی اور پتھر کے یہ ڈھیر خدائی اختیارات کے مالک ہو گئے تھے۔ چنانچہ یہ بت اس قابل تو نہ تھے کہ اگر کوئی جانور ان کے سر پر پیشاب کرے تو اسے گندگی پھیلانے سے یا ہتک عزت سے روک سکیں لیکن مشرکین کے عقیدے کے مطابق وہ اپنے لیے کچھ نہ کر سکنے کے باوجود اپنے پرستاروں کی من مانی مراد پوری کر سکتے تھے۔ یہ مضحکہ خیز عقیدہ ان کی گھٹی میں اس طرح پڑ گیا تھا کہ ان کے سامنے اس عقیدے کی تردید تو کجا، اس کے تجزیہ و تحلیل کے لیے بات رکھنا بھی جان کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ بت پرستی دنیا کے اور خطوں میں بھی رائج تھی لیکن عرب کے مشرکین نے اس نامراد عمل کی تمام صورتوں کو تمام تر قباحت اور شدت کے ساتھ اپنایا ہوا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید پھیلانے کے لیے جو

طریق کار اختیار کیا، اس کا گہرا مطالعہ آج کے مسلمانوں کے لیے وہ ذمہ داری پوری کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے جو خیر الامت ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہے۔

قابل غور:

ذرا غور کیجیے! عرب کے بت کدے میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا فریضۂ دعوت لے کر مبعوث ہوتے ہیں۔ مشرکین کے دماغ کے ہر گوشے میں اور ان کی فکر کے ہر زاویے میں شرک کے جراثیم کلبلا رہے ہیں۔ ان کے مزاج میں اکھڑ پن اور سخت گیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، وہ قتل و غارت گری کے اتنے خوگر ہیں کہ اپنی عزت نفس کو ذرا سی ٹھیس پہنچنے پر مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں، ان کے خداؤں کے بارے میں لب کشائی تو بھوسے کے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کے مترادف ہے۔ توحید کی دعوت کو موقوف ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کوئی ہم خیال اور ہم فکر ہستی نہیں۔ ایسے ماحول میں توحید کی دعوت کے فریضے کو ادا کرنا بلاشبہ صرف اسی شخصیت کا کام ہے جسے اللہ رب العالمین نے جامع الصفات اور کامل اور مکمل انسان بنا کر اعلیٰ ترین ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور طبعی قوتیں عطا کی ہوں اور مفید ترین طریقۂ دعوت تلقین کیا ہو۔ اس طریقۂ دعوت کو نہایت آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اگر ہم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بت شکنی کے واقعات میں موجود فرق کو سمجھ لیں۔

بت شکنی کے دو طریقے:

ہمارے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی بتوں کی الوھیّت کے طلسم کو پاش پاش کیا تھا اور ہمارے مقتداو محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی مصنوعی خدائی کو تار تار کیا تھا لیکن ان دونوں واقعات میں فرق یہ ہے کہ جناب خلیل اللہ علیہ السلام نے آغاز دعوت میں یہ کام اپنی قوم کی غیر موجودگی میں کیا تھا اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں یہ عمل آپ کی دعوت کی تکمیل کے موقع پر علی الاعلان ہوا۔ یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ مفید، کارگر اور مبارک ہیں۔ فرق ان میں یہ ہے کہ ملت ابراہیمی میں جہاد نہ تھا، اس لیے سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام نے یہ عمل شروع میں ہی خفیہ طور پر انجام دیا اور بتوں کی بے بسی و بے چارگی کو دلیل کے طور اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، جب آپ کی قوم کی طرف سے ردعمل کے طور پر آپ پر ظلم ہونے لگا تو رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے آپ کو ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھا۔ جبکہ دین محمدی میں دعوت کی پشت پر جہاد کا بابرکت فریضہ مشروع کیا گیا ہے اور خیر کی دعوت کو ٹھکرا کر جارحیت پر آمادہ ہونے والے کفار کو رب تعالیٰ اپنے ہاتھ سے نہیں بلکہ مجاہدین اسلام کے ہاتھوں سے سزا دیتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے رفقائے کرام کو جہاد کے مقدس عمل کو تسلسل سے جاری رکھنے کے انعام میں فتح مبین سے نوازا تو مکّہ مکرمہ میں بت شکنی کا شاندار مظاہرہ وجود میں آیا اور قیامت تک کے لیے امت محمدیہ کے موحدین کو سبق مل گیا کہ وہ توحید پھیلانا اور شرک مٹانا چاہتے ہیں تو انہیں نبی علیہ السلام کے جہد اور جہاد والے مبارک طریقے کو اپنانا ہوگا۔

کل اور آج:

جس طرح کل جہاد کی بدولت سرزمین عرب مصنوعی خداؤں سے پاک ہوئی، اسی طرح آج جہاد ہی کی برکت ہے کہ افغانستان کی سرزمین پر کسی جعلی معبود کی یادگار باقی نہیں رہی۔ عرب کے بت کدوں سے بامیان کے پہاڑوں تک اور سومنات

کے مندر سے کابل کے عجائب گھر تک مجاہدین اسلام کے لازوال کارناموں نے ثابت کر دیا ہے کہ شرک کے اندھیرے میں گرفتار قابل رحم انسانیت اسی وقت غیر اللہ کو پوجنے کے اہانت آمیز عمل سے نجات پا سکتی ہے جب اللہ وحدہ لاشریک کے ماننے والے کفر کے ان سرغنوں کو سرنگوں کر دیں جو مظلوم انسانوں تک توحید کی دعوت پہنچنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کلمہ گو برادران اسلام کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو اتباع شریعت وسنت سے آراستہ کریں اور جہد و جہاد کو اپنا شعار بنا کر اپنے کردار و عمل کو صاف ستھرا، کھرا اور دوٹوک بنائیں اور پیٹ اور شرم گاہ کے چکر میں پڑے ہوئے انسانوں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہو جائیں۔ یہ نقشہ ہمیں یہی پیغام دے رہا ہے اور اس میں دکھائے گئے حقائق ہمیں موجودہ دور کے اس اہم ترین فریضے کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ اے برادران اسلام! دنیا فنا ہو جانے والی ہے۔ مہلت عمل ختم ہونے سے قبل دین اسلام کے لیے کچھ کر چلو اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دین کے خادموں کے خادم اور مددگار بن جاؤ، دارین کی فلاح پا جاؤ گے۔

اسلامی انقلاب کا راستہ: ہجرت اور جہاد

ہجرت برائے جہاد:

ہجری سال کی آمد واقعۂ ہجرت کی یاد تازہ کردیتی ہے جب اللہ جل جلالہٗ کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی خاطر اپنا وطن، گھربار، اقارب واحباب سب کو چھوڑ کر ایسی جگہ کی طرف ہجرت کی تھی جہاں انہیں اپنے پروردگار کا نام آزادی کے ساتھ لینے کی اجازت ہو۔ جہاں کی آزاد فضا میں رہ کر وہ دعوت کا کام جاری رکھ سکیں اور ایسی جماعت تیار کرسکیں جو جہاد فی سبیل اللہ کا وہ عظیم فریضہ ادا کرسکے جو اس امت کو خیر الامم اور خاتم الامم ہونے کے ناتے عطا ہوا ہے۔ واقعۂ ہجرت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی سربلندی، ہجرت اور جہاد کے عمل میں پوشیدہ ہے۔ یعنی کرۂ ارض کے وہ خطے جہاں اللہ کے دُشمنوں کا تسلّط ہے اور وہ انسانوں کو اللہ رب العزت کے بھیجے ہوئے سچے اور فطرتی دین پر چلنے نہیں دیتے اور وہاں کے مسلم باشندے شعائرِ اسلام پر عمل نہیں کرسکتے تو انہیں اس جگہ سے نکل کر ایسے آزاد علاقے کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہے جہاں رہ کر وہ جہاد کی تیاری کرسکیں، اس کی تربیت اور اس کے لیے درکار وسائل حاصل کرسکیں اور پھر اللہ کے ان دُشمنوں سے نمٹنے کے لیے اس دارالکفر کا رخ کرسکیں جہاں کے ظالم باسیوں نے انہیں ان کے خدا سے توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس دوران دوسرے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ان مہاجرین کا استقبال اور آؤ بھگت کریں، ان کی ضروریات کا خیال کریں اور ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے حصول کے لیے ان کا ساتھ دیں جن کی خاطر یہ اولوالعزم لوگ گھر سے بے گھر ہوئے ہیں۔

اجر بقدر صبر:

ہجرت بہت ہی صبر آزما اور حوصلہ طلب عمل ہے۔ ذرا سوچیے! ایک انسان کو اس کے بسے بسائے ماحول اور جمی جمائی زندگی چھوڑ کر انجانی راہوں اور نامعلوم منزلوں کی طرف نکل جانے کو کہا جائے تو اس پر کیا گذرے گی؟ دوست احباب اور رشتہ داروں کی محبت کا کہنا ہی کیا؟ درودیوار سے تعلق ہی انسان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دل میں اللہ رب العالمین کی محبت گھر کر جاتی ہے، وہ آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دینے کا فیصلہ کرلیتے ہیں اور پھر کسی چیز کی محبت ان کا راستہ روک سکتی ہے نہ کوئی مشکل ان کے پائے ثبات میں لغزش لاسکتی ہے۔ وہ ہجرت کی کٹھن منزلیں صبر وشکر کے ساتھ عبور کرجاتے ہیں اور بندگی کے اس امتحان میں پورا اُترتے ہیں جس میں کامیاب ہونے والے کا اجر رب تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ ہجرت کرنے والا چونکہ اپنی پسندیدہ اور محبوب ترین چیزوں کی قربانی محض اللہ تعالیٰ کی خاطر دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کی بہت قدر ومنزلت ہے۔ آخرت میں ایسے خوش نصیب اور بلند حوصلہ شخص کو ملنے والے انعامات تو اپنی جگہ ہیں، دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس سے کچھ وعدے کیے ہیں جن کی صداقت کا مشاہدہ تاریخ میں ہوتا چلا آیا ہے۔ جن افراد یا علاقے والوں کی ہجرت محض رضائے مولیٰ کے لیے تھی اور انہوں نے دُشمن کی پہنچ سے دور آزاد علاقوں میں پہنچ جانے کے بعد جہاد کو فراموش نہیں

کیا، ان پر زمین کی تنگی فراخی میں تبدیل ہوگئی، خیر و برکت ان کے شامل حال رہی اور وہ آزمائش کا وقفہ گذرنے کے بعد حیرت انگیز طور پر دنیاوی اعتبار سے بھی آسودہ حال ہوگئے۔ مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مکّہ مکرمہ سے نکلتے وقت صرف جان اور ایمان بچا کر لے گئے تھے مگر چند سالوں بعد ہی قدرت نے ان پر غیب سے ایسی کشادگی کی کہ فتح مکّہ کے موقع پر انہوں نے مکّہ مکرمہ میں واقع اپنے آبائی گھر بھی...... جن پر مشرکین نے ان کے جانے کے بعد قبضہ کرلیا تھا...... یہ کہہ کر واپس نہ لیے کہ جو چیز ہم نے ایک مرتبہ اللہ کے واسطے چھوڑ دی اب اسے دوبارہ نہیں لیں گے۔

ہجرت ونصرت کی برکات:

ہجرت ونصرت کے امتزاج سے دین پھیلتا ہے کیونکہ دونوں کی بنیاد قربانی پر ہے اور خدا تعالیٰ کا دین اتنی عظیم چیز ہے کہ جب تک اس کے لیے قربانی نہیں دی جاتی، دنیا والوں کو ہدایت کی روشنی نصیب نہیں ہوتی۔ جس علاقے کے مسلمانوں نے راہِ خدا کے مہاجرین کا خوشدلی سے استقبال کیا اور جہاد کو زندہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کیا، وہ نہ صرف یہ کہ کفر کے فتنے سے بچے رہے بلکہ اس علاقے میں جہاد اور فتوحات کی برکت سے دین پھیلنے کا اجر قیامت تک ان کو ملتا رہے گا اور جنہوں نے راہِ خدا کے ان مسافروں کو بوجھ سمجھا اور نصرت واعانت سے پہلوتہی کی ان پر بدحالی کے سائے چھانے لگے اور وہ بالآخر خود بھی کفر کی یلغار کا شکار ہوگئے۔ رُوس نے وسط ایشیا کی جن ریاستوں کو ہڑپ کرنے میں کامیابی حاصل کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے مسلمانوں نے یا تو ہجرت نہ کی یا پڑوسی ملک کے مسلمانوں نے ان کی نصرت نہ کی۔ لہٰذا رُوسی عفریت ایک ملک پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد دُوسرے کو نگلنے کے لیے بڑھتا رہا اور بالآخر سب اس کی ہوس ملک گیری کا شکار ہوگئے۔ البتہ افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں نے خوش قسمتی سے یہ غلطی نہ کی۔ افغانوں نے ہجرت کی سنّت زندہ کرکے جہاد کا علم بلند کیا اور پاکستان والوں نے ان کی نصرت کی سعادت حاصل کی۔ اس مشترکہ جدوجہد کی برکت ہے کہ آج نہ صرف افغانستان آزاد اور پاکستان محفوظ ہے بلکہ ان ممالک کو بھی آزادی مل گئی ہے جنہوں نے ہجرت سے جی چرایا تھا یا نصرت کو بوجھ سمجھا تھا۔ مسلمانانِ افغانستان وپاکستان نے ان کی طرف سے بھی کفارہ ادا کردیا ہے۔ برصغیر میں تحریک جہاد کے بانی سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا نے جہاد کے احیا کے لیے ہجرت کی، لیکن مقامی مسلمانوں نے ان کی خاطر خواہ نصرت نہ کی، اگر وہ اس وقت ان کی نصرت کا فرض ادا کرتے تو آج برصغیر پاک وہند کا نقشہ اور یہاں کے حالات قطعاً مختلف ہوتے۔

حکمت وتدبیر بھی سنّت نبوی ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسلامی تقویم کی ابتدا کے لیے واقعہ ہجرت کا انتخاب کرکے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو سبق دے دیا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح، دین کے لیے قربانی دینے سے وابستہ ہے۔ اگر وہ دین کے لیے خود کو مٹائیں گے تو چمک جائیں گے اور اگر دین کو مٹتا ہوا دیکھ کر جان ومال اس پر وارنے کے بجائے اپنی دنیا بچانے کی فکر میں لگے رہیں گے تو یہ دنیا ان سے چھن جائے گی اور ان کے بنے بنائے نقشے بگڑ جائیں گے۔ تاریخ انسانی اور سیرتِ نبوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کفر کی شرارتیں بڑھ جائیں تو ان کے خاتمے کے لیے لائے جانے والے انقلاب کی ابتدا ہجرت سے اور تکمیل جہاد سے ہوتی ہے۔ نبوی انقلاب کی ابتدا دعوتِ مکی کے بعد ہجرت نبوی سے ہوئی جب رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے رفیق جاں نثار جناب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اللہ کی خاطر وطن چھوڑا، اللہ کی خاطر ہر مشقت برداشت کر کے محبتِ الٰہی کی منازل طے کیں اور اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھ دی۔ اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک کے معروف راستے سے ہٹ کر سفر کیا۔ اس سے اس اعلیٰ تدبیر وحکمت کا پتہ چلتا ہے جو شان نبوت وصدیقیت کے مناسب ہے۔ ذرا غور کیجیے! حضور علیہ الصلوۃ والسلام پہلے مدینہ منورہ کی بالکل مخالف سمت کی طرف گئے اور وہاں ایک دور افتادہ غار میں تین دن تک رہنے کے بعد تعاقب کنندگان کی تلاش کا زور کم ہونے کے بعد نکلے اور غیر معروف راستے کو اپنا کر چلتے رہے۔ درمیان میں کئی جگہ وہ مشہور راستے کو قطع کر کے اس سے دائیں یا بائیں مڑے۔ ابتدائے سفر میں اصل راستے سے ان کی دوری کافی زیادہ تھی، مگر جیسے جیسے خطرہ کم ہوتا گیا یہ مسافت کم ہوتی گئی اور آخر میں تو دونوں راستے تقریباً متوازی ہو گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ بیدار مغزی وتدبیر پسندی سنّتِ نبوی ہے۔ اکثر مجاہدین اس بارے میں غفلت کرتے ہیں اور اسے شجاعت کے منافی سمجھتے ہیں، لیکن جس چیز کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال خوبی سے اپنایا ہے اس کے پسندیدہ بلکہ واجب العمل ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

عالمِ اسلام پر ایک نظر

اصلاح وخود احتسابی یا مسرت وشادمانی:

نئے سال کے آغاز پر مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی مسلم ممالک میں بھی نئے سال کی آمد کا جشن منانے کا احمقانہ سلسلہ چل نکلا ہے، جس میں ہڑبونگ، ہلڑبازی، بدتمیزی کا طوفان اور منکرات کا سیلاب امڈ آتا ہے، حالانکہ جس کا امتحان قریب آ لگے اور تیاری کا وقت کم رہ جائے تو اس پر فکر اور ندامت کا غلبہ ہونا چاہیے نہ کہ سرور اور فرحت کا۔ جس آدمی کو یقین ہو کہ دنیا کا عارضی وقفہ گذارنے کے بعد ایک حقیقی اور نہ ختم ہونے والی زندگی شروع ہو رہی ہے اور اس میں کامیابی وراحت یا ناکامی وکلفت کا دارومدار ان اعمال پر ہے جو آج میں کر رہا ہوں تو اسے ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ عمر عزیز کا سال گھٹ جانے اور سخت حساب کا وقت قریب آ جانے پر خوشیاں مناتا پھرے۔ یہ وقت تو خود احتسابی اور اصلاح احوال کا ہوتا ہے نہ کہ مسرت وشادمانی کے اظہار کا۔

خصوصاً آج کل امت مسلمہ جس قسم کے حالات سے گذر رہی ہے اس میں تو کسی طرح کوئی گنجائش نہیں نکلتی کہ مسلمان اپنے ماضی قریب کی غلطیوں کا جائزہ لینے کے بجائے خود فریبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے سبب، بے حقیقت اور بے نام خوشی پر غل غپاڑہ مچائیں۔ اس وقت مسلم دنیا کو کئی ایسے سلگتے مسائل درپیش ہیں جن کی کسک ہر اس شخص کو چین نہیں لینے دیتی جسے اللہ ورسول سے محبت، قبر وآخرت کی فکر اور مسلمانوں کا درد وغم ہے۔ اسلامی ہجری سال کے آغاز پر اہل اسلام کو خود احتسابی اور قوت عمل میں تحریک پیدا کرنے کی دعوت دینے کی ضرورت ہے۔

دشت تو دشت ہیں......:

یہ آج سے چودہ سو سال پہلے کی بات ہے، جب اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی بھلائی اور اسے ابدی ہدایت سے روشناس کرانا مقصود ہوا تو دنیا کے وسط میں موجود جزیرۃ العرب میں ایمان وعمل کے نور کی وہ روشنی اتاری جس نے چاردانگ عالم کو منور کیا اور جو ایک دن روئے زمین پر موجود ہر کچے یا پکے گھر میں پہنچ کر رہے گی۔ ابتدائے اسلام میں جن لوگوں کو وحی کی یہ امانت سپرد ہوئی، انہوں نے اسے کماحقہ، اپنے سینوں میں اتارا، اپنے ظاہر وباطن کو اس سے آراستہ کیا، اپنے کردار وعمل کو اس کے مطابق ڈھالا اور اسے لے کر ساری دنیا میں پھیل گئے۔ اس دور میں جو خطے خشکی کے راستے جزیرۃ العرب سے مربوط تھے وہ تو ان حضرات کی محنتوں اور توجہ کا میدان تھے ہی، سمندر کو بھی انہوں نے اپنے ارادوں میں حائل نہیں ہونے دیا اور اس زمانے میں بحری راستوں کو استعمال کر کے جہاں جہاں رسائی ہو سکتی تھی، وہاں وہاں وہ دین حق کا پیغام لے کر پہنچ گئے اور اس امانت کو بنی نوع انسان تک پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہ کی جو انہیں سپرد ہوئی تھی۔ اس بارے میں وہ نہ کسی مشکل سے گھبرائے، نہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں لائے، نہ کسی دنیا پرست فرمانروا کا دہشت ورعب یا غرور وتکبر ان کو متاثر کر سکا اور نہ ہی کبھی انہوں نے جان ومال، عزت ومنصب یا کسی اور چیز کی قربانی سے دریغ کیا۔ بحر وبر، خشکی وتری یکساں طور پر ان کی ترکتازیوں کی جولان گاہ تھی۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

سمندر کے پار:

ایشیا، افریقہ، مشرق بعید میں واقع ممالک اور یورپ کا وہ حصہ جو ان سے قریب تر تھا، ان کے افاضات سے خوب مستفید ہوا۔ نقشے میں آپ ہرے رنگ کو جزیرہ عرب سے دائیں اور بائیں دونوں طرف خوب دور تک پھیلا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ اس دور میں دستیاب وسائل کے سہارے جہاں تک پہنچا جا سکتا تھا وہاں تک ان کے قدم پہنچے۔ سرزمین عرب سے ہو کر جب وہ براعظم افریقہ میں داخل ہوئے تو مصر، لیبیا، تیونس، مراکش سے ہوتے ہوئے وہ الجزائر تک جا پہنچے۔ اب آگے بحر اوقیانوس تھا جس کے پار براعظم شمالی و جنوبی امریکا اور ذرا ہٹ کر براعظم آسٹریلیا و نیوزی لینڈ وغیرہ تھے۔ بحر اوقیانوس اپنی وسعت اور سفر کی ہولناکیوں کی وجہ سے بحر ظلمات کہلاتا تھا۔ اس وقت تک اسے کوئی عبور کر کے امریکا و کینیڈا یا آسٹریلیا وغیرہ تک نہ پہنچا تھا، بلکہ دنیا کو خبر ہی نہ تھی کہ اس کے پار کیا ہے؟ نہ اسے عبور کرنے کے لیے ایسے جہاز دستیاب تھے جو اتنے لمبے سفر کے متحمل ہو سکیں۔ فاتح افریقہ حضرت عقبہ بن نافع جب یہاں پہنچے تو سمندر میں گھوڑا ڈال کر یہ تاریخی الفاظ کہے: ''پروردگار! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس سمندر کے پار کوئی قوم رہتی ہے اور میں وہاں تک پہنچ سکتا تو ضرور وہاں پہنچ کر ان سے تیری خاطر جہاد کرتا''۔ حضرت عقبہ بن نافع کے بعد آنے والے فاتحین اسلام دائیں طرف مڑے اور ''مضیقِ طارق'' (آبنائے جبرالٹر) نامی تنگ درہ عبور کرتے ہوئے اسپین جا پہنچے اور عرصہ دراز تک یہ علاقہ عظیم اسلامی سلطنت کا مرکز بنا رہا۔

نسل کش قابضین:

بدقسمتی سے جب انجن کی طاقت سے چلنے والے عظیم الجثہ بحری جہاز تیار ہوئے تو ہسپانوی، پرتگیزی، انگریزی اور فرانسیسی استعمار کا دور دورہ تھا۔ مسلمان عروج کا طویل دور گذار کر زوال کی طرف گامزن تھے۔ چنانچہ یورپی اقوام کے سمندری مہم جوؤں نے (جنہیں فی الحقیقت بحری قزاق کہنا چاہیے) مسلمان ملاحوں کی مدد سے بحر اوقیانوس عبور کر کے امریکا دریافت کر لیا۔ وہاں کی زرخیز زمین اور مادی وسائل سے مالا مال علاقہ دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے وہاں کے اصل مقامی نسل ''ریڈ انڈین'' کی نسل کشی کر کے یہاں قبضے کی راہ کشادہ کر لی۔ یہی حال براعظم آسٹریلیا و نیوزی لینڈ کا ہوا۔ حرص و ہوس کے مارے ہوئے یورپین یہاں بھی پہنچ آئے۔ چھوٹے چھوٹے جزیروں سے لے کر بڑے بڑے ملکوں تک کوئی جگہ ان کے غاصبانہ تسلط سے خالی نہ رہی۔ آج بھی شمال و جنوبی امریکا کے سمندروں میں واقع جزائر اور ممالک کو جغرافیائی نقشوں میں دیکھیں تو ہر ملک یا جزیرے کے ساتھ اس یورپی ملک کا نام آپ کو ملے گا جس نے یہاں قبضہ جمایا ہوا تھا اور یہاں کی دولت اور وسائل لوٹ لوٹ کر اپنے ملک کے خزانے بھر رہا تھا۔

قدموں کی برکت:

ان کم ظرف اور ہوس کے مارے ہوئے یورپین نے کثرت سے ان نو دریافت شدہ ممالک کی طرف نقل مکانی کی حتی کہ امریکا اور آسٹریلیا جیسے بڑے ملکوں کی اصل اقوام آج وہاں ناپید یا قلیل ترین تعداد میں ہیں۔ زیادہ غلبہ باہر سے پہنچی ہوئی اقوام کا

ہے۔ یہ اقوام اپنی اخلاقی کمزوریاں اور تحریف شدہ عیسائی مذہب ساتھ لے کر ان نو آبادیوں میں پہنچیں لہٰذا ان براعظموں میں آج عیسائیت سب سے بڑا مذہب ہے، اور یہ خطے تثلیث کی مکمل گرفت میں ہیں۔ یہ صورتِ حال اہل توحید کے لیے عصر حاضر کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد ان ممالک میں تجارت و ملازمت کی غرض سے جا کر بس گئی ہے اور وہاں مساجد و مدارس تعمیر ہو رہے ہیں لیکن من حیث القوم کسی ملک کا اسلام میں داخلہ تو مجاہدین کے قدموں کی برکت سے ہوتا ہے۔ اس نقشے میں پیلے رنگ میں دکھائی دینے والے زمین کے ٹکڑے منتظر ہیں کہ مسلمان فاتحین کا سا کردار رکھنے والا کوئی فرزند اسلام کھڑا ہو اور یہاں سے کفر و شرک کی گندگی صاف کر کے بحراوقیانوس میں بہا دے اور اندھیرے اور ظلم میں جکڑی دنیا کو توحید کی لذت سے آشنا کر دے۔

کیا عجب کہ......:

نئے سال کے آغاز پر ساری دنیا اگلے سال بہتر بنانے کے منصوبے بناتی ہے، اگر کچھ مسلمان اس بات کا عہد کر لیں کہ ہم نے دنیا کے ان حصوں تک اسلام کی نعمت پہنچانے کا فرض ادا کرنا ہے اور اس احساس کو اہل اسلام میں بیدار کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو اس سفر کو دوبارہ شروع کیا جا سکتا ہے جس کا ایک مرحلہ حضرت عقبہ بن نافع نے مکمل کر دیا تھا۔ ان کے پاس آگے بڑھنے کے وسائل نہ تھے، ہمارے دور میں ہر چیز ایجاد ہو چکی ہے، صرف عزم و ہمت اور ایمانی قوت درکار ہے، مسلمانوں میں جذبۂ اصلاح و جہاد زندہ کرنے اور اس تحریک کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا عجب ہے کہ ہمارے آواز لگانے سے کافروں تک اسلام کو اس کے اصلی روپ میں پہنچانے کی کوئی ایسی باصلاحیت قوم یہ عزم لے کر کھڑی ہو جائے جو تاتاریوں کی طرح اسلام کی مشعل کو تھام کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کر دے۔

ساتواں باب

برصغیر کی چند دینی، سیاسی اور جہادی تحریکیں

علم و جہاد اور سلوک و احسان کے عظیم مراکز

علم و جہاد اور سلوک و احسان کے عظیم مراکز

فخرِ مسلمانانِ ہند:

نیک نیتی سے لگایا گیا شجرہ طیبہ کیسے برگ و بار لاتا ہے؟ اُمّ المدارس، دارالعلوم دیوبند اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ آپ ذرا چشمِ تصور سے اس وقت کا منظر دیکھنے کی کوشش کیجیے جب ہندوستان سے آٹھ سو سالہ طویل مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ مسلمان عروج کا ایک طویل دور اور یادگار دور گذار کر عبرتناک زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ ہر شعبہ زندگی میں انحطاط رونما ہو رہا تھا۔ سیاسی اور عسکری طور پر مغلوب ہو جانے کے بعد عامۃ المسلمین پر پژمردگی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی قابل ذکر دینی و علمی مرکز نہ تھا۔ انگریز نے سرکاری زبان انگلش کو قرار دے کر ہندوستان کی نئی نسل کو اسکول و کالجز کی طرف کھینچ لیا تھا۔ برصغیر پر انگریزی استعمار کے مہیب سائے طول پکڑتے جا رہے تھے اور خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ اگر کچھ عرصہ مزید یہی حالات رہے تو مسلمانانِ برصغیر کا مستقبل مخدوش سے مخدوش تر ہوتا چلا جائے گا۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ باشعور جہادی و سیاسی قیادت درکار تھی بلکہ علم دین کی شمع کو فروزاں رکھنے، دین کے مختلف شعبوں کو قائم و باقی رکھنے، دشمنانِ اسلام کے اُٹھائے ہوئے فتنوں کا توڑ کرنے اور معاشرے کو صاحبِ علم و عمل اور باکردار افراد فراہم کرنے کی از حد ضرورت تھی۔ یہ کوئی یکجہتی کام نہ تھا بلکہ پورے کے پورے دین کے قیام اور احیا کا مسئلہ تھا اور یہ وہی افراد کر سکتے تھے جنہیں ربِّ ذوالجلال کی خاص توفیق حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لیے ان سے کوئی عظیم کام لینا چاہتے ہوں۔ چنانچہ یہ سعادت بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے حصے میں آئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے اس پُر آشوب دور میں ایسا جامع، ہمہ گیر اور کثیر الجہت کام لیا جو عدیم النظیر ہے۔ دنیا میں کم ہی ایسے علمی ادارے ہوں گے جن کی خدمات ایسی متنوع، ایسی وسعت کی حامل اور عامۃ الناس کے لیے اس قدر مفید ہوں گی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے احیا سے لے کر سیاست شرعیہ کے قیام تک، درس و تدریس، تحقیق و تصنیف کے میدان سے لے کر دعوت و تبلیغ اور ارشاد و اصلاح کی سرگرمیوں تک، فرق باطلہ کے تعاقب و تردید سے لے کر غیر مسلموں سے مناظرہ و مجادلہ تک، عامۃ المسلمین کی دینی و علمی راہنمائی سے لے کر بین الاقوامی تحریکات میں مسلمانوں کی قیادت تک اور خلافت اسلامیہ کے تحفظ سے لے کر برصغیر کی آزادی تک کی مہم سر کرنے تک اکابرینِ دیوبند نے ایسی گراں قدر اور مخلصانہ خدمات انجام دی ہیں جو تاریخ کا روشن باب ہیں اور جس پر مسلمانانِ برصغیر کو ہمیشہ فخر رہے گا۔

ایں سعادت بزور باز و نیست:

ذرا اندازہ لگایئے! ان دو اشخاص کی قوت ایمانی، اخلاص و للّٰہیت اور کیفیات کا کیا عالم ہوگا جو ایک درخت کے نیچے بیٹھے پورے عالم میں علم و عرفان کے پھیل جانے اور جہد و جہاد کی زندہ ہو جانے کی فکر کر رہے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ کو ان کا یہ اخلاص، کڑھن اور فکر اس قدر پسند آیا کہ ان کا فیض چار دانگ عالم میں جاری کر دیا۔ اس وقت دنیا میں جہاں کہیں بھی دین کا کوئی کام ہو رہا ہے، تعلیم و تعلم یا تزکیہ و سلوک کا کوئی مرکز کہیں قائم ہے، کسی گاؤں بستی میں رجوع الی اللہ کی دعوت دی جا رہی ہے، کسی شہر

ملک میں غلبۂ دین کی محنت ہو رہی ہے یا جہاد فی سبیل اللہ کی آواز لگ رہی ہے، اس کا جائزہ لیا جائے تو اس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اس چشمۂ خیر و برکت سے نکل آئے گا جو دیوبند کی سرزمین سے پھوٹا تھا اور اس کا حیات بخش آبِ صافی آج تک دنیائے انسانیت کو سیراب کر رہا ہے۔ اس ادارے کی اُمت مسلمہ کے لیے یہ گونا گوں خدمات اتنی کثیر اور ایسی حیرت انگیز ہیں کہ ان کا سرسری جائزہ لینے والا بھی یہ باور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ اس ادارے کو قدرت نے برصغیر میں دینِ اسلام کے تحفظ اور بقا کے لیے منتخب کیا تھا اور اللہ ربّ العالمین کی غیبی دستگیری سے ہی اتنا بڑا کام ممکن ہوا۔

قلم اور تلوار کا حسین امتزاج:

اکابرین دیوبند کے پیشِ نظر صرف اعلیٰ دینی تعلیم کا اجرا ہی نہ تھا بلکہ وہ ملت کی ہمہ قسم راہنمائی اور ہر سطح پر قیادت کے لیے رجال کار فراہم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے دینی تعلیم کو بنیاد بنایا کیونکہ شرعی تعلیم کے بغیر دعوت علی منہاج النبوۃ اور احیائے دین و قیامِ خلافت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے اس دینی ادارے میں ایسا نصاب تعلیم اور نظامِ تربیت متعارف کروایا جس نے دین کے ہر شعبے میں کام کرنے والے رجال کار پیدا کیے۔ یہ ایک مکمل نظامِ تعلیم و تربیت تھا جس نے محقق علماء، اولوالعزم مجاہدین، صاحبِ بصیرت سیاسی قائدین، بلند پایہ ادیب، مصنفین و محققین، بے مثال خطبا و واعظین اور قوم کا درد رکھنے والے مصلحین و مرشدین تیار کیے۔ اس دارالعلوم کے تعلیم یافتہ افراد اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدے اور ریاضت کے بھی عادی ہوتے تھے۔ یہ بیک وقت قلم اور تلوار دونوں کے دھنی ہوتے تھے۔ یہ لوگ بوریا نشین اور فقیر منش ہوتے تھے لیکن ان کی خودداری اور بلند نظری کے سامنے فرعون صفت استعماری قوتیں بھی لرزہ براندام رہتی تھیں۔ انہوں نے انگریز کے اخراج سے لے کر نظام مصطفیٰ کی تحریک تک اور تحریکِ ریشمی رومال سے لے کر طالبان کی شہرۂ آفاق تحریک تک عزم اور جدوجہد کی ایسی لازوال داستان رقم کی ہے جو رہتی دنیا تک حق و صداقت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتی رہے گی۔

اہم ترین خصوصیت:

دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے عالمِ اسلام کے دیگر اداروں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نے صرف علمی، تدریسی، تصنیفی اور اصلاحی خدمات کو اپنا محورِ جہد نہیں بنایا، بلکہ مسلمانوں کو جس وقت جس طرح کی راہنمائی کی ضرورت پڑی، یہ اس میں پیش پیش رہا۔ غیر ملکی استعمار کے خلاف اس کی عملی جدوجہد، جہاد کے فریضے کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کرنا اور ایک سفاک حکمران کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا، اس کے وہ کارنامے ہیں جو اس کو دنیا بھر کے دینی اداروں میں منفرد اور قابلِ رشک مقام عطا کرتے ہیں۔ جامعہ ازہر سے زیادہ مشہور اور بڑا ادارہ کون سا ہوگا؟ لیکن جب انگریزی اور فرانسیسی استعمار کا سیلاب مصر کی طرف بڑھا تو علمائے ازہر اپنی قوم کی ویسی مجاہدانہ قیادت نہ کر سکے جو وارثین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کا تقاضا ہے۔ دنیا کے کسی بھی اسلامی ملک کے کسی بھی عظیم ترین ادارے کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجیے! جو مجاہدانہ اور سرفروشانہ کردار علمائے دیوبند کا رہا ہے، اس کی کوئی نظیر آپ کو روئے زمین کے کسی ادارے میں نہ ملے گی۔ دراصل علمی اور دماغی کاموں کے ساتھ جان جوکھوں میں ڈالنے والی جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینا بہت ہی مشکل، مشقت طلب اور حوصلہ آزما کام ہے۔ ان دونوں شعبوں کو صرف وہ علمائے ربانیین ہی جمع کر سکتے ہیں جنہیں حق تبارک وتعالیٰ

نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی نیابت کے لیے منتخب فرمایا ہوا اور علمائے دیوبند کے شاندار ماضی کو دیکھ کر اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے خصوصیت سے منتخب فرمایا تھا اور ایسے ظاہری و باطنی، علمی و عملی کمالات سے نوازا تھا کہ انہوں نے تجدید و احیائے دین کا کام بکمال خوبی انجام دیا۔ اس بارے میں نہ کسی کی ملامت کی پروا کی اور نہ کسی کی رعونت یا دبدبے کو خاطر میں لائے۔

سب سے بڑا کارنامہ:

اکابر و فرزندانِ دارالعلوم نے بہت سے میدان میں یادگار اور مثالی کارنامے انجام دیے اور ان کی کامیابیوں نے مسلمانانِ برصغیر کے دین و ایمان کے تحفظ اور مملکتِ خداداد پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے بقا و استحکام کے لیے دور رس اور دیرپا اثرات چھوڑے، لیکن اس ادارے سے منتسبین کا سب سے بڑا کارنامہ سرزمینِ افغان میں امارتِ اسلامیہ کا قیام اور برصغیر میں خصوصاً اور دنیا کے طول و عرض میں عموماً مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے طرز پر چھوٹے بڑے بے شمار مدارسِ اسلامیہ کی تعمیر ہے جہاں نئی نسل کے بے شمار خوش قسمت نوجوانِ علومِ نبوت سے فیضیاب ہو کر نکلتے ہیں اور اُمت کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں اس وقت جبکہ ڈیڑھ سو سالہ خدمات دارالعلوم دیوبند کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ دنیا بھر کے فرزندانِ اسلام کے لیے یہ نہایت خوشی اور فخر کا باعث ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتگان نے بالآخر لازوال قربانیاں دے کر ایک ایسے ملک کا قیام عمل میں لایا ہے جو غیروں کے تسلط اور دباؤ سے مکمل طور پر آزاد اور شریعتِ اسلامیہ کے ہر جز کو زندہ و قائم رکھنے کا عزم رکھتا ہے۔ دنیا میں جو علمِ الٰہی پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے وہ افغانستان میں عملی طور پر نافذ ہے۔ یہ بلاشبہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کے رفقا کی قربانیوں، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگردوں اور مریدین کی محنتوں اور برصغیر میں علماء کی سرپرستی میں چلنے والی مختلف تحریکوں کے علاوہ تصوف و سلوک کے مرکز تھانہ بھون، فتویٰ و ارشاد کے منبع گنگوہ، حدیث و محدثین کے گہوارہ سہارنپور، جہاد و حریت کے اوّلین میدان پانی پت شاملی اور تھانیسر، انگریز اور قادیانیوں کے خلاف سب سے پہلے فتویٰ جاری ہونے کے مقام لدھیانہ اور تحریکات آزادی کے مجاہدین کا فیض ہے۔ پشاور کے اجتماع میں تقریباً ان تمام مقامات سے اکابر دیوبند کے جانشین حضرات تشریف لائیں گے۔ جمعیت علمائے اسلام نے یہ کانفرنس منعقد کر کے دنیا بھر کی ممتاز دینی و علمی شخصیات کو مل بیٹھنے کا موقع دینے کے ساتھ تحریک دیوبند کو عالمی سطح پر متعارف کروانے اور اس میں نئی جان ڈالنے کے ساتھ فرزندانِ دیوبند کو دین کے غلبے کے لیے محنت کرنے کے لیے از سرِ نو متحرک کر دیا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ اجتماع اپنے مقاصد عالیہ میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو اور اس کے ذریعے اُمت مسلمہ کو دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے کا ولولہ اور حوصلہ ملے۔

دیو بند سے مالٹا تک

قیدی جزیرہ:

بحر متوسط کے وسط میں اٹلی اور قبرص کے قریب ''مالٹا'' نامی جزیرہ ہے۔ اس جزیرے سے برصغیر کی جدوجہد آزادی اور تحریکِ جہاد کی ناقابلِ فراموش داستان وابستہ ہے جس کے تذکرے سے آج ہم اپنے جذبۂ ایمانی کو جلا بخشیں گے، لیکن اصل واقعے سے پہلے ذرا اس جزیرے کا تعارف ہو جائے۔ آپ انہی کالموں میں پڑھ چکے ہیں کہ ''بحر احمر'' براعظم ایشیا اور افریقہ کے درمیان حد فاصل ہے۔ یورپ اور افریقہ کے درمیان جو سمندر حائل ہے اسے ''بحرِ متوسط'' یا ''بحرِ روم'' کہتے ہیں۔ اس میں کئی چھوٹے بڑے جزیرے ہیں جن میں سے ایک کا نام مالٹا ہے۔ انگریز اس جزیرے میں ان لوگوں کو قید کرتا تھا جنہیں وہ سیاسی، یا عسکری طور پر اپنے لیے نہایت خطرناک سمجھتا تھا۔ یہ جزیرہ سمندر کے بیچوں بیچ ہے۔ اس سے قریب ترین ممالک شمال میں اٹلی اور جنوب میں تیونس ہیں۔ مشرق اور مغرب میں دور دور تک سمندر ہی سمندر ہے۔ اس جزیرے کا موسم سرد ہے اور یہاں بارشیں بھی بکثرت ہوتی ہیں۔ اس کی آبادی میں ساڑھے اٹھانوے فیصد رومن کیتھولک عیسائی ہیں۔

وجہِ انتخاب:

اس ملک کے اکثر باشندے دیہاتی ہیں جو مختلف نسلوں کے میل جول کا نتیجہ ہیں مثلاً نارمن، عرب، ہسپانوی اور انگریز۔ یہاں زراعت نہیں ہوتی، جزیرے کا ایک بڑا حصہ ناہموار ٹیکریوں اور چھوٹی بڑی بلندیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی بحری جہازوں کی مرمت اور ماہی گیری ہے۔ آج کل سیاحت بھی اس ملک کی آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گئی ہے۔ ملک گیری اور اقوامِ عالم کی دولت کو ہڑپ کرنے کی حرص کے مارے ہوئے انگریز نے دنیا کے جس کسی ملک پر قبضہ جما رکھا تھا، وہاں قریب ہی ایسے جزیرے ڈھونڈ رکھے تھے جن میں ان حریت پسند افراد کو قید کیا جائے جو اس کے استعماری مقاصد میں رکاوٹ بنتے ہوں۔ چنانچہ ہندوستان میں جن قائدین کو اس نے سخت سزا دینا ہوتی تھی یا انہیں مقامی جیلوں میں رکھنا مصلحت کے خلاف ہوتا تھا، انہیں وہ بحر ہند میں موجودہ جزائر انڈمان میں (جنہیں عرف عام میں کالا پانی کہا جاتا ہے) بھیج دیتا تھا۔ مصر، عراق، ترکی وغیرہ کے مجاہدین کو قید کرنے کے لیے اس نے مالٹا کا انتخاب کیا ہوا تھا۔ یہ وہی مالٹا ہے جہاں برصغیر کے نامور عالم دین اور دینی وسیاسی قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ نے قید کاٹی۔ آپ ہند کے رہنے والے تھے، مگر عرب اور ترک حضرات کے لیے مخصوص ''قیدی جزیرے'' میں کیونکر محبوس رکھے گئے؟ اس کو سمجھنے کے لیے آپ اور آپ کے رفقا کی جدوجہد اور تحریکِ جہاد کی روداد سمجھنا ضروری ہے۔

ہموار زمین کی تیاری:

یہ آج سے تقریباً سو سال پہلے (1327ھ/1909ء) کی بات ہے کہ ہندوستان پر غلامی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

1857ء کے جہاد کی ناکامی کے بعد انگریز کے ظالمانہ اور سفاکانہ تشدد نے برصغیر پر جمود کی جو فضا طاری کی تھی، اس کے ازالے کے لیے 1283ھ/ 1866ء میں دیوبند کے قصبہ میں جو دارالعلوم قائم کیا گیا تھا وہ برگ و بار لا چکا تھا۔ اس کے پہلے طالب علم مولوی محمود حسن اب اسی دارالعلوم کے صدر مدرس تھے اور شیخ الہند کا مؤقر خطاب پا کر مسلمانانِ ہند کی آزادی کے لیے ہمہ جہت کام کر رہے تھے۔ وہ اپنے اساتذہ سے اس نظریے کو اچھی طرح سمجھ کر برتتے چلے آ رہے تھے کہ قیامِ دارالعلوم کا مقصد صرف تعلیم و تعلّم نہیں، بلکہ ایسے رجال کار پیدا کرنا ہے جو اس ملک کو انگریز کی غلامی سے نجات دلا سکیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلسل یہ کوشش جاری رکھی کہ باصلاحیت اور ذہین طلبہ کا انتخاب کر کے ان سے ان کے مزاج اور صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جائے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ سے آپ زیادہ امیدیں نہیں رکھتے تھے، کیونکہ ان کو اپنی بڑائی اور مرتبے کی وجہ سے بہت سے خطرات لاحق ہو جاتے ہیں، اس لیے آپ اپنے تلامذہ اور مریدین پر کام کرتے رہے۔ شاگردوں اور مریدوں کو لے کر تحریک چلانا بہت کامیاب حکمت عملی تھی جس کی بنیاد آپ نے رکھی۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ دارالعلوم کے صدر مدرس تھے۔ اس بلند علمی منصب پر فائز اونچے درجے کے سبق پڑھاتا ہے، چھوٹے درجات کے طلبہ کا سبق اس کا پاس نہیں ہوتا، مگر آپ سالہا سال سے ایسا کر رہے تھے کہ بڑے درجات کے ساتھ چھوٹے درجوں کے ہونہار طلبہ کو بھی درس دیتے۔ سبق کے بعد بھی آپ کی نشست درسگاہ بنی رہتی۔ آپ کی اس غیر معمولی شفقت اور دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلبہ صرف آپ کے گرویدہ نہیں ہوتے تھے بلکہ بہت سے آپ کے رنگ میں رنگ جاتے۔ اس رنگ کا ایک چھینٹا یہ ہوتا کہ جو آپ سے روحانی تربیت کے لیے بیعت ہوتا تھا اس سے آپ جہاد کی بیعت بھی لیتے تھے، لہٰذا آپ نے جو شاگرد تیار کیے وہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ حکومت برطانیہ کے زیرِ اثر علاقوں میں جہاد کے لیے عملی تربیت نہیں دی جا سکتی تھی، مگر یہ آپ کا کمال تھا کہ آپ نے ایک نظریاتی اور تصوراتی چیز کو عملی طور پر ممکن کام سے زیادہ پُر جوش اور متحرک بنا دیا تھا۔ آپ کے شاگردوں کا فوری کام یہ ہوتا تھا کہ وہ جہاں پہنچتے مدرسہ قائم کرتے اور اشاعتِ علم کے ساتھ ولولہ جہاد کے پودے لگا دیتے تھے۔ اس طرح کے مدرسے پورے ہندوستان میں قائم کیے گئے، مگر آپ کی خاص توجہ ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع سرحد کے قبائل پر تھی کیونکہ وہاں کی آزاد فضا میں جہاد کا کام عملی طور پر کیا جا سکتا تھا۔ اس علاقے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں کے جواں مرد مسلمانوں نے اب تک انگریزی اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ یہ جنگجو بھی تھے اور جانباز بھی۔ پھر یہاں سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک سے وابستہ مجاہدین بھی تھے۔ چنانچہ آپ نے سرحد سے تعلق رکھنے والے پٹھان شاگردوں کو ان قبائل میں بھیجا۔ انہوں نے وہاں پہلے سے موجود حضرت کے دیگر شاگردوں سے مل کر گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ جا کر زمین ہموار کی۔ پھر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے اصرار پر آپ کے مخلص دوست حاجی صاحب ترنگ زئی بھی اس علاقے میں چلے گئے اور اس طرح یہاں مجاہدین کی بھاری جمعیت تیار ہو گئی۔

جنودِ ربّانیہ کی تشکیل:

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ بہت بالغ نظر اور مدبر قائد تھے۔ آپ نے انگریز کے خلاف ہر سطح پر کام کیا۔ انگریز کے زیرِ قبضہ علاقوں میں ہم خیال اور ہم فکر افراد پیدا کرنے اور ان کی ذہنی و سیاسی تربیت کے لیے آپ نے بالترتیب ''ثمرۃ التربیت''، ''نظارۃ المعارف'' اور ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے جماعتیں اور ادارے بنائے۔ دوسری طرف آپ مسلح جہاد کے لیے قبائل والوں کو متحد

کررہے تھے اور سرحد سے لے کر کابل تک مجاہدین کی مضبوط جماعت تیار ہو رہی تھی۔ سیاسی اور جہادی دونوں سطح پر آپ کی یہ محنت جاری تھی کہ بین الاقوامی حالات نے اچانک کروٹ بدلی اور آپ کو اپنا کام تیز تر اور کھل کے کرنا پڑا بلکہ ایسا وقت بھی آ گیا کہ خود آپ کو عملی طور پر میدان میں نکلنا پڑا۔ ہوا یوں کہ جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ اس میں ترک کنارہ کش تھے، مگر انہیں بھی جنگ میں کھینچ لیا گیا۔ اب ایک طرف جرمنی اور ترکی تھے اور دوسری طرف یورپ کی بڑی طاقتیں۔ برطانیہ اور اس کی ہمنوا حکومتوں نے یورپ میں واقع بلقان کی ریاستوں (بلغاریہ، آسٹریا، ہنگری، سربیا وغیرہ) کو جو ترکوں کے زیرِ نگیں تھیں، ورغلا کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ان جنگوں نے جنہیں جنگ بلقان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مسلمانانِ عالم کو نہایت بے چین کر دیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یورپ کے ''سفید عفریت'' خلافت کے چراغ کو گل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ ادھر سرحدی قبائل کے مجاہدین کی انگریزوں سے جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ مجاہدین کی پُر جوش کارروائیوں سے چند مہینوں میں ہی انگریزوں کو انتہائی جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس پر انگریزوں نے یہ چال کھیلی کہ پروپیگنڈے کے ذریعے مشہور کروایا: جہاد بغیر امیر کے درست نہیں۔'' (آج کل بھی اس فرنگی پروپیگنڈے کی بازگشت سننے کو ملتی ہے اور بعض سادہ لوح مجاہدین کو پست ہمت کر دیتی ہے) اس سے مجاہدین کے جوش و خروش اور اتحاد میں کمی آ گئی۔ ادھر مجاہدین کے لیے سامان رسد اور ضروریات کی ترسیل کا مسئلہ بھی پیچیدہ شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس واسطے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے تقاضا کیا گیا کہ آپ آزاد قبائلی علاقے میں تشریف لے آئیں اور مجاہدین کی قیادت سنبھالیں لیکن حضرت نے وہاں جانے کے بجائے حجاز کا قصد کیا۔ کیونکہ مجاہدین اور ضروریاتِ جہاد کے لیے غیر معمولی امداد کی ضرورت تھی۔ عامۃ المسلمین کی خفیہ امداد اس کے لیے کافی نہ تھی، لہٰذا ضروری تھا کہ کسی باقاعدہ حکومت کو آمادہ کیا جائے کہ وہ پشت پناہی کرے۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت حاصل کرنے سے یہ فائدہ بھی تھا کہ مرکز خلافت سے تایید مل جانے کے بعد ہر مسلمان آپ کی بے دریغ حمایت کرتا، اس لیے آپ نے قبائلی علاقہ میں جانے کے بجائے حجاز کا ارادہ کیا تاکہ ترکی حکومت سے رابطہ کریں اور ان کی فوجی امداد ساتھ لے کر آزاد علاقوں کی طرف سے ہندوستان پر حملہ آور ہوں اور اسے انگریز سے آزاد کروائیں۔ آپ کے علاوہ اور کوئی شخص اتنا ذی وجاہت نہ تھا کہ ترک سلاطین اس کی بات مان لیتے۔ اس لیے آپ نے خود حجاز کا سفر کیا اور مجاہدین کے نظم کو دیکھنے کے لیے اپنی جگہ اپنے لائق اور معزز شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو بھیجا۔ انہوں نے کابل پہنچ کر تحریک کو منظم کیا اور ''جنودِ ربّانیہ'' کی داغ بیل ڈالی۔

خوابوں کی تعبیر:

اگر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف یہ کہ پورے ہندوستان پر شرعی حکومت قائم ہو جاتی بلکہ انگریز کو ایسا دھچکا لگتا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کی ہمت نہ کرتا۔ آپ حجاز پہنچ کر اعلیٰ ترک حکام سے ملے اور ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے نام پیغامات اور امداد کی یقین دہانی حاصل کی۔ اب آپ کو خلافت اسلامیہ کی حمایت اور نمایندگی حاصل ہو چکی تھی اور آپ جلد سے جلد قبائلی علاقہ میں پہنچ کر مجاہدین کی قیادت سنبھالنا چاہتے تھے مگر ابھی آپ سواریوں کے انتظام میں مصروف تھے کہ مکہ کے گورنر (جو اردن کے موجودہ حکمران خاندان کا جدِّ اعلیٰ اور انگریزوں کا ہم نوا تھا) نے آپ کو ترکوں کی مخالفت میں ایک فتویٰ پر دستخط کرنے کو کہا اور انکار پر بہانہ بنا کر گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد آپ کو مصر پہنچا دیا گیا۔ یہاں آپ

سے تفتیش ہوتی رہی۔ خطرہ پھانسی کا تھا مگر انگریز کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکے۔ ترک حکمرانوں سے لیے گئے خطوط ایک صندوق کی دہری لکڑی میں رکھ کر ہندوستان اور وہاں سے آزاد قبائل میں پہنچا دیے گئے تھے لہٰذا پھانسی کے بجائے مالٹا کے جزیرے میں قید کا حکم ہوا۔ 23 ربیع الثانی 1335ھ مطابق 15 فروری 1917ء کو مالٹا روانہ کر دیا گیا، جہاں فوجی افسروں یا سیاسی قائدین کو قید کیا جاتا تھا۔ وہاں تقریباً تین برس دو مہینے قید میں گذارنے کے بعد 23 جمادی الثانی 1238ھ/ 12 مارچ 1920ء جمعہ کے دن رہا ہوئے اور تقریباً دو ماہ بعد 20 رمضان 1338ھ/ 6 جون 1920ء کو رہا ہو کر واپس بمبئی پہنچے۔ آپ کے استقبال کے لیے دور دراز سے خلقت خدا ٹوٹ پڑی۔ آپ نے بقیہ عمر قرآن مجید کی لفظی و معنوی تعلیم کی اشاعت، مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کے فروغ اور انگریز کے خلاف حسب مقدور سیاسی جدوجہد میں گذاری۔

مالٹا کا جزیرہ ہمیں جدوجہد اور جہاد کی اس عظیم داستان کی یاد دلاتا ہے۔ آپ نے جس کابل کو دینی تحریک کا مرکز بنایا تھا، آج الحمدللہ! وہاں آپ کے متوسلین اور روحانی فرزندوں نے شرعی حکومت قائم کر کے آپ کے خوابوں کو شاندار تعبیر دے دی ہے۔ اب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے متقدین و منتسبین کا فرض ہے کہ اسے مضبوط و مستحکم بنا کر ان امیدوں کی تکمیل کریں جن کے لیے ان کے اسلاف نے جاں گسل جدوجہد کی تھی۔

کالا پانی
(1)

حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور:

''تم بہت عقلمند، ذی علم اور قانون دان ہو، اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو، لیکن تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ اب تمہیں پھانسی دی جائے گی، جائیداد ضبط ہوگی، تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ ملے گی اور تمہیں پھانسی پر لٹکا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

انگریز تفتیشی افسر کے یہ زہر بھرے الفاظ سن کر راہِ خدا کے جانباز مجاہد کا ردعمل یہ تھا: ''پھانسی کا حکم سن کر میں اتنا خوش ہوا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت مل جانے پر بھی اتنی مسرت نہ ہوگی۔'' انگریز افسر نے یہ حیران کن ماجرا دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ وہ تو ملزم کے چہرے پر کرب و رنج کی پرچھائیاں دیکھ کر اپنے کینہ اور غصہ کی تسکین کرنا چاہتا تھا، مگر یہاں تو رنج و غم سے بجھ جانے کے بجائے ملزم کا چہرہ مسرت و شادمانی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے ملزم کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا: ''پھانسی کے حکم پر تمہیں رونا چاہیے، اتنے خوش کیوں ہو؟''

شہادت کے تصور سے فرحاں و شاداں ملزم بولا: ''یہ سب سے بڑی نعمت ہے، لیکن تم اس کو کیا جانو؟''

انگریز جج سے مجاہدین کی یہ خوشی برداشت نہ ہوئی اور اس نے سزا میں ''تخفیف'' کرتے ہوئے اسے ''حبس دوام بہ عبور دریائے شور'' میں تبدیل کر کے قیدیوں کو ''کالا پانی'' بھیجنے کا حکم دیا۔ کالا پانی جزائر انڈمان کا عرفی نام ہے اور اس اعتبار سے اس کا ذکر ہماری دینی، عملی اور جہادی تاریخ میں ہمیشہ آتا رہے گا کہ وہ مشاہیر علم اور اصحاب فضل جنہوں نے 1857ء اور اس کے بعد انگریز کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا، انہیں گرفتاری کے بعد انہی جزائر میں قید رکھا گیا۔ ان اصحاب عزیمت کو ان ویران جزائر میں بھیجنے سے انگریز کے دو مقاصد ہوا کرتے تھے: ایک تو یہ کہ وہ بااثر اور ذی وجاہت ہستیوں کو ہندوستان کی سرزمین میں قید کر کے خطرہ مول نہ لینا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ ان کی جانثارانہ کارروائیوں اور تحریکِ جہاد میں غیر معمولی حصہ لینے کی بنا پر سخت تلملایا ہوا تھا اور غیر موافق آب و ہوا والے ان جزائر میں بھیج کر انہیں بیمار یا کمزور کر کے مار ڈالنا یا سخت تکلیف و مشقت میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ پچھلی قسط میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس شاطر اور عیار قوم نے بحرِ روم کے بیچوں بیچ جزائر مالٹا کو عربستان اور ترکی وغیرہ کے مجاہدین کے لیے جیل بنا رکھا تھا۔ اس قسط میں مجاہدین ہند کے لیے منتخب کیے گئے اس قید خانہ کا حال ذکر کیا جاتا ہے جس نے بہت سی بلند پایہ ہستیوں کے شب و روز دیکھے اور ان کی استقامت و عزیمت کے حیرت انگیز مناظر کا نظارہ کیا۔

کالا پانی (جزائر انڈمان):

انڈمان، بحر ہند میں جزیروں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ جزیرے خلیج بنگال کے مشرقی حصے میں برما کے جنوب مغربی کنارے سے

جنوب کی طرف مائل بہ مغرب واقع ہیں۔ اس مجموعہ میں چھوٹے بڑے دو سو چار جزیرے ہیں جن کا کل رقبہ دو ہزار پانچ سو آٹھ مربع میل ہے۔ یہ جزائر غیر معروف تھے اور ابتدا میں یہاں کے متعلق خوفناک قصے مشہور تھے۔ یہاں کی آب وہوا بھی ناموافق ہے لیکن انگریزوں کے دورِ حکومت میں یہاں طویل المیعاد قیدیوں کے لیے نو آبادی قائم ہوئی جس کے باعث ان جزیروں نے انڈمان کے نام سے کم اور ''کالا پانی'' کے نام سے ہمہ گیر شہرت پائی۔ ان جزائر کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں سے خشکی بہت دور تھی۔ یہ جزائر مدراس سے سات سو اسّی میل، رنگون سے تین سو ساٹھ میل اور انڈونیشیا کے جزیرے سماٹرا کے شمالی کنارے ''آچن'' سے تین سو چالیس میل کے فاصلے پر ہیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ انڈمان بظاہر ملائی لفظ ''ہندومان'' یعنی ہنومان (بندر) سے ماخوذ ہے۔

ان جزائر کے دو حصے ہیں: شمالی میں انڈمان کلاں (بڑا) اور جنوب میں انڈمان خرد (چھوٹا)۔

(1) بڑے انڈمان کا طول زیادہ سے زیادہ 219 میل اور عرض 32 میل ہے۔ یہ تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ شمالی انڈمان، وسطی انڈمان اور جنوبی انڈمان۔ ان میں چھوٹے چھوٹے بہت سے جزائر ہیں جو سرسری نظر سے دیکھنے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں ان کو تنگ آبنائیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔

(2) چھوٹا انڈمان انتہائی جنوب میں بڑے انڈمان سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کا طول زیادہ سے زیادہ 26 میل اور عرض 16 میل ہے۔

داستانوں کا عنوان:

اگرچہ یہ جزیرے بحرِ ہند کی آبی شاہراہ پر واقع تھے اور جہاز ران ان کا ذکر کرتے رہتے تھے مگر مدت تک ان میں آبادی کی کوئی صورت نہ بنی۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ تھا کہ ان کے اردگرد زیرِ آب خطرناک چٹانیں تھیں جن سے بچا کر جہازوں کو اندر لے جانا آسان نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان جزیروں میں بظاہر کوئی جاذبیت نہ تھی، جابجا گھنے تاریک جنگل تھے اور یہاں بسنے والے سیاہ فام وحشی قبائل جو برہنہ رہتے تھے، ہر آنے والے پر بے دریغ حملہ کر دیتے تھے جس کی وجہ سے یہ آدم خور بھی مشہور ہوئے اور طرح طرح کی داستانوں کا عنوان بنے۔ ان جزائر میں پھل چھوٹے چھوٹے اور بدمزہ ہوتے ہیں۔ البتہ ''پرادک'' نام کی ایک لکڑی ایسی ہے جس کی نظیر شاید ہی کہیں مل سکے۔ یہ خون کی طرح سرخ، نہایت پائیدار، خوشنما اور خوشبودار ہوتی ہے۔ اس طرح ''ماربل'' نامی پھولدار لکڑی تو انڈمان کے سوا روئے زمین پر کہیں نہ ہوگی۔ یہ بطور تحفہ تمام ملکوں میں جاتی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں چوپایوں میں صرف سور پایا جاتا ہے جو بہت چھوٹا اور بھیڑ کی طرح عاجز ہوتا ہے۔

تاریک جزیرے:

یہاں کی مقامی آبادی کہاں سے آئی؟ اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ یہ ایک نسل کے ہیں اور ان کے بارہ قبیلے یا ذاتیں ہیں جن کی زبانوں میں قدرے تفاوت پایا جاتا ہے۔ باہر سے یہاں آ کر نو آبادی قائم کرنے کی تاریخ یہ ہے کہ سب سے پہلے ستمبر 1789ء میں انگریزوں نے یہاں قیدیوں کو بسانے کے لیے لیفٹیننٹ بلیر کو بھیجا (جس کے نام پر جزیرے کا دارالحکومت پورٹ بلیر ہے) مگر 1796ء میں خرابیٔ آب وہوا کے باعث یہ آبادی ترک کر دی گئی۔ اس کے بعد 1857ء کے جہاد میں جن مجاہدین یا ان کے معاونین کو طویل سزائیں ہوئیں، ان کے بارے میں انگریز مناسب نہ سمجھتا تھا کہ انہیں عام جیل خانوں میں

رکھے لہٰذا اس سفاک قوم نے جزائر انڈمان کی آبادی کا از سرِ نو فیصلہ کیا اور طے کیا کہ 1857ء کے قیدی مجاہدین وہاں بھیج دیے جائیں۔ واضح رہے کہ ان جزائر کی آب و ہوا، ماحول اور فضا نو آبادی کے قیام کے لیے حد درجہ ناساز گار بلکہ مضرِ صحت اور تباہ کن تھی اور ان قیدیوں میں بعض نہایت عظیم المرتبت علماء اور ایسے عالی نسب مجاہدین تھے جو اپنے علاقوں کے شرفا اور رؤسا تھے، مگر کینہ پرور انگریز نے انہیں یہاں طویل المیعاد سزائیں دے کر بھیجا تاکہ جہادی تحریک ناکام ہو جائے، مگر حیرت انگیز بات ہے کہ قید و بند کی یہ ناقابلِ تحمل تکالیف نہ ان اسیروں کے پائے استقامت میں لغزشیں دلا سکیں (اس کا کچھ اندازہ مضمون کی ابتدا میں ذکر، مکالمے سے ہوتا ہے) نہ ان کے جانشینوں کو اس راہ پر چلنے سے روک سکیں اور انہوں نے بالآخر انگریز کو یہاں سے نکلوا کر دم لیا۔ یہ لوگ آسمان علم و فضل کے روشن ستارے اور سرزمین ہند کے نامور سپوت تھے لیکن ان عظیم الشان اور ذی وجاہت و صاحبِ علم شخصیات کے ساتھ پھیکی چمڑی والے کم ظرف انگریزوں نے جو سلوک کیا، وہ بلاشبہ انسانیت سے فروتر اور تہذیب و شرافت کے ماتھے پر بدنما داغ ہے۔ ان حضرات میں کئی جلیل القدر اور نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں جن کی زندگی کے کئی قیمتی سال ان تاریک جزیروں میں بسر ہوئے اور بیشتر وہیں فوت ہو گئے۔ اس اعتبار سے جزائر انڈمان کو ہماری تاریخ میں ناقابل فراموش حیثیت حاصل رہے گی اور جب بھی انگریز سے مظالم کے انتقام لینے کی بات چلے گی تو ان جزائر میں مشقت کی قید کاٹنے والے مجاہدین کی تنہائی، غربت اور بے بسی کی یاد اس جذبہ انتقام کو آتش فشاں بننے کی تحریک دیتی رہے گی۔

حُدی را تیز تر خواں:

اب ان چند بلند مرتبت علماء اور مجاہدین کا تذکرہ ہو جائے جنہوں نے دنیا سے کٹے ہوئے ان وحشت ناک جزیروں میں اسیری کے دن کاٹے اور مجاہدین کو سبق دیا کہ شہادتیں، زخم اور قید و بند عشق و محبت کے اِس راستے کا لازمی حصہ ہیں اور تاریخ کی جلیل القدر ہستیوں نے غلبۂ دین کی خاطر اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار ہو کر اس سب کچھ کو ہنسی خوشی برداشت کیا ہے۔ یوں تو ان جزائر میں بہت سے اور بھی قیدی بھیجے گئے تھے جن کا نام اور کارنامے اس ذات کو ہی معلوم ہیں جس کی خاطر ان نیک ہستیوں نے دُکھ جھیلے، مگر ان میں سے اکثر گمنام ہیں اور روزِ قیامت باری تعالیٰ کی طرف سے صلہ ملنے تک انہیں کوئی نہ جان سکے گا، اس لیے یہاں صرف چند سر برآوردہ ہستیاں جن کا تذکرہ تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کیا ہے، درج کیا جاتا ہے تاکہ ان کے مبارک حالات، جانبازی و جانثاری کے واقعات اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے دی جانے والی قربانیاں اور جہاد کے راستے میں آنے والی مشقتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی تفصیل ہمارے دل میں بھی عزیمت اور جدوجہد کی لو تیز تر کر دے۔

کالا پانی
(2)

راہِ وفا کے راہی:

جزائر انڈمان المعروف کالا پانی میں قید رہنے والے مجاہدین میں سے کچھ تو 1857ء کی جنگ آزادی کے نامور قائدین تھے اور کچھ 1857ء کے بعد وقتاً فوقتاً گرفتار کیے جانے والے سرفروش تھے۔ اس دوسری قسم میں سے اکثریت امام المجاہدین سید احمد شہید رحمہ اللہ کے سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔ انہوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد جدوجہد اور جہاد کے اس چراغ کو بجھنے نہ دیا جسے حضرت روشن کر گئے تھے اور اپنے لہو سے اس کو فروزاں رکھا۔ امام المجاہدین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت 24 ذی قعدہ 1246ھ مطابق 6 مئی 1831ء بروز جمعہ ہوئی۔ اس کے بعد ان کی تحریک سے وابستہ مجاہدین نے اپنی جماعت کو ازسرنو منظم کیا اور ہندوستان سے سرحد کے آزاد علاقہ تک اپنی زیرزمین مربوط سرگرمیوں کا جال بچھا دیا۔ 1857ء کی مشہورِ عالم جنگ آزادی میں ظاہری ناکامی اور انگریزوں کے وحشیانہ تشدد کے بعد بھی ان کی ہمتیں پست نہ ہوئیں اور انہوں نے انگریزوں کے منحوس وجود کو نشتر ٹھونکنے کا سلسلہ مسلسل جاری رکھا۔ اس جماعت کی سرگرمیاں دو طرح کی تھیں: تنظیمی اور میدانی (یعنی محاذ پر دشمن کے ساتھ جنگ آرائی)۔ قائدین کی شہادت اور کارکنوں کے ساتھ انگریزوں کی بے پناہ سختیوں اور تشدد کے باوجود دونوں نوع کی سرگرمیاں حسن وخوبی سے جاری تھیں۔ تنظیمی سرگرمیوں کے ضمن میں ہندوستان کے اندر جہاد کی دعوت دی جاتی تھی اور افراد وسرمایہ فراہم کر کے آزاد علاقہ کو روانہ کیا جاتا تھا۔ ہر صوبے میں سینکڑوں افراد اس کام میں چپ چاپ مصروف تھے اور خاص افراد کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ بعض ایسی ہستیاں بھی کارکنوں کا لشکر جمع کرنے اور عطیات بہم پہنچانے کے اس خفیہ کام میں مصروف رہی ہیں جن کے متعلق کسی کو وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس خطرناک ترین کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ کالا پانی بھیجے جانے والے افراد اسی تنظیمی شعبے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ ان کا دائرہ کار ہندوستان کی ان حدود تک تھا جو انگریز کی عملداری میں تھے اور وہاں ننگِ ملت اور غدارانِ وطن بدبخت مخبر انعام کی لالچ میں پھرتے رہتے اور مجاہدین کی ٹوہ لگا کر مخبری کرتے تھے۔ جو افراد آزاد علاقہ میں پہنچ کر عملاً جہاد میں مصروف ہو جاتے تھے ان میں سے کسی کی گرفتاری کا حادثہ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا۔ مثلاً ان میں سے کوئی جب مرکزِ جہاد سے رخصت لے کر گھر کو واپس ہوتا تو مخبری پر اس کی گرفتاری کے خدشات پیدا ہو جاتے تھے۔ اس مضمون میں جن حضرات کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کی اکثریت قسم اوّل سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاد اور مجاہدین کے لیے انہوں نے بے شمار خدمات انجام دیں اور اس راستے میں ایسی ایسی مشقتیں جھیلیں جن کے تصور سے بھی عام آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جبکہ یہ برگزیدہ ہستیاں علم وفضل اور تقویٰ میں اپنے وقت کے امام اور دنیاوی طور پر بھی امیر کبیر گھرانوں کے چشم وچراغ تھے، لیکن اللہ کے دین کی سربلندی اور غاصب انگریز عیسائیوں کو ہندوستان سے مار بھگانے کی خاطر انہوں نے اپنے

جان و مال اور عزت و منصب ہر چیز کو راہ خدا میں قربان کر کے ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی حاصل کر لی۔

مقصدِ یادآوری:

ان حضرات کے تذکرے سے قبل کچھ باتیں ذہن نشین رہنی چاہییں۔ ان کے بغیر ان کی یاد تازہ کرنے کا مقصد کماحقہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

1- پہلی یہ کہ ان کی تحریک دنیا کے دیگر خطوں میں اٹھنے والی آزادیٔ وطن کی تحریکوں کی طرح محض اپنے ملک کو بیرونی آقاؤں سے چھڑانے اور زمینی اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہ تھی۔ یہ اسلامیت یعنی رجوع الی اللہ، ظاہری و باطنی اصلاح اور شریعت پر کامل و مکمل کاربند ہونے اور اس زمین پر نافذ کرنے کے لیے جہاد کا کارگر نسخہ اپنانے کی جامع و مانع تحریک تھی۔ اس کے کارکن جہاں انگریز کے خلاف جہاد کے لیے اسلحہ اور جسمانی تربیت میں اعلیٰ مہارت رکھتے تھے وہیں وہ ایک بہترین اور پابند شرع مسلمان بھی تھے۔ اگر چند غداران ملت اپنی عاقبت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر کے ان سے بے وفائی نہ کرتے تو آج پورے ہند پر اسلام کا پرچم لہرا رہا ہوتا اور یہ پوری سرزمین مسلمانوں سے چھننے کے بعد مسلمانوں ہی کو ملتی اور آج کی جدید دنیا کی طاقتور ترین مسلم مملکت مانی جاتی۔

گرتے حوصلوں کے لیے سہارا:

2- سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کے اصلاح احوال اور غیر ملکی عیار حکمرانوں کے خلاف مسلح جہاد کا تاریخی عمل اس وقت شروع کیا جب برصغیر کی تمام اقوام اور گروہوں پر یک گونہ افسردگی، بے حسی، پژمردگی اور مایوسی طاری تھی۔ وہ آزادی کی تمنا اور عزت کی زندگی کی تڑپ بھلا کر گورے حکمرانوں کی خوشنودی اور ان سے دنیاوی منفعت حاصل کرنے کی دوڑ میں مشغول تھے۔ جہاد جیسے عمل کا اکثر لوگ نام لینے سے بھی گریزاں و ہراساں رہتے تھے۔ بعض کے دلوں پر انگریز کا رعب و دہشت طاری تھی اور بعض کی آنکھوں پر دنیا کی طمع و لالچ کی پٹی بندھ چکی تھی۔ انگریز بہادر کے خلاف اٹھنے کی ان کے دلوں میں ہمت تھی نہ ان کے دماغ اتنے بلند پرواز تھے کہ سفید بندروں جیسی خاصیت رکھنے والی انگریز قوم سے خلاصی کے لیے عملی جدوجہد کی سوچتے۔ ان حالات میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء و مریدین کی تاریخ ساز جدوجہد ان حضرات کی بلند ہمتی، اعلیٰ کردار اور مجددانہ کاوشوں کی آئینہ دار ہے۔ ان کی اولوالعزمی حالات کی بدترین سازگاری میں بھی غلبۂ دین کی محنت کرنے والوں کے لیے عملی نمونہ اور گرتے حوصلوں کے لیے بہترین سہارا ہے۔

چٹانوں کی گواہی:

3- ان حضرات کی ایمان افروز داستان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے حالات کو ہمارے حالات سے خاص مناسبت تھی اور ہے۔ وہ انتہائی بے سروسامان تھے، پھر ان کو جن ناموافق حالات سے سابقہ پڑا، ان کی تفصیل بڑی دردناک اور الم انگیز ہے۔ ایک طرف انگریز اور سکھ تھے۔ دوسری طرف مقامی رؤسا اور خوانین، تیسری طرف نام نہاد مدعیان دین کا گروہ جو اس مقدس جماعت پر مسلسل اتہامات اور الزامات کی بجلیاں گراتا رہا۔ مگر اس سب کے باوجود ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ وہ اللہ کا نام لے کر اٹھے اور اپنی گرمئ نفس سے ایسی تحریک برپا کر دی جس نے پچیس سال تک سکھوں اور سو سال تک برطانیہ جیسی قوتِ قاہرہ کو آتش

زیر پا رکھا۔ بہت سے لوگ معرکۂ بالاکوٹ (1831ء) میں ان کی شکست کو تحریک کی ناکامی قرار دیتے ہیں لیکن انہیں علم نہیں کہ تحریک اس کے بعد بھی بڑے زور و شور سے چلتی رہی اور اس تحریک کے اکابر کی 1866ء میں گرفتاری اور کالا پانی میں ان کی قید (جو اس تحریر کا بنیادی موضوع ہے) اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ انہوں نے اپنے امیر کی شہادت کے بعد اس کے مشن کو رکنے نہیں دیا۔ یہ ان حضرات کا مسلح جہاد ہی تھا جس نے انگریز کو چین کا سانس نہ لینے دیا اور بالآخر اسے یہاں سے نکلنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی آج بہت سے لوگ آزادئ ہند کے حصول کا اعزاز اپنے ساتھ مخصوص کرتے ہیں مگر جزائر انڈمان کی پتھریلی چٹانیں ہمیشہ حقیقت کی گواہی دیتی رہیں گی۔ اور یہ ان اولوالعزم مجاہدین کی قربانیوں کا ہی ثمرہ ہے کہ آج بھی قافلۂ اہلِ حق علم و جہاد کا پرچم تھامے سوئے منزل رواں دواں ہے۔

صدق و اخلاص کے پتلے:

4- سب سے اہم چیز ان حضرات کا خلوص اور للّٰہیت تھی۔ یہ لوگ دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ جاہ و منصب رکھتے تھے اور انگریز کے خلاف جدوجہد میں ان سے سب کچھ چھن جانے کا خطرہ تھا اور کہیں سے بھی انہیں تحسین و ستائش کے دو لفظ سننے کی امید نہ تھی۔ انگریز نے ان کے پیش رووٴں کی جائیداد ضبط کر لینے کے ساتھ انڈمان کے وحشت ناک جزیروں میں عمر قید کی سزا دی مگر یہ حضرات ایسے اخلاص کے مالک اور استقامت کے پتلے تھے کہ ہر جانے والے کی جگہ لینے کے لیے کوئی نیا جانباز آگے آجاتا تھا اور عزیمت و جہاد کے اس سلسلے کو وہیں سے شروع کر دیتا جہاں وہ اس کے پیش رو کی شہادت یا گرفتاری سے رکا تھا۔ آزادی ہند کے قائدین بننے والے بعد کے راہنما جو پھولوں کے ہار پہننے، جلسے جلوسوں اور پانچ کالمی خبروں کا عنوان بننے اور شہرت طلبی اور مادی منفعتوں کے ہنگاموں سے وابستہ تھے، ان کے اعمال کہاں بے نفسی اور للّٰہیت کے ان پیکروں کے برابر ہو سکتے ہیں؟ یہ مقدس بزرگ پاک و ہند کے ایک دور افتادہ گوشے میں بیٹھے اپنے خون سے قوم کی رگوں میں زندگی دوڑاتے اور اپنی قربانیوں سے ان کے روشن مستقبل کے خد و خال سنوارتے رہے۔ ان کی زندگی کی ہر ہر سانس ادائے فرض اور رضائے حق کے لیے وقف رہی۔ ان کی عظمت کا اندازہ ہم لوگ نہیں کر سکتے جو فرض اور وفا کے صحیح مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں۔ بلاشبہ ان کی داستان عزیمت میں ہمارے لیے بصیرت و موعظت کا نہایت قیمتی سرمایہ موجود ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی اگر ہم ان کی یاد کو ان کے شایان شان طریقے سے زندہ رکھیں اور ان کی لہو رنگ قربانیوں کے پیش منظر اور پس منظر سے اپنے لیے ہمت اور ولولہ حاصل کرتے رہیں۔

کالا پانی
(3)

منزل انہیں ملی جو......:

یہ قسط ان حضرات کے تذکرے سے معمور ہے جنہوں نے اسلام کے احیا اور خلافت کے قیام کے لیے ایسی قربانیاں دی ہیں جن کا تصور بھی دلوں پر لرزہ طاری کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ان مجاہدین کے گھربار اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ جاہ و مال عزت و منصب سب کچھ جاتا رہا۔ ان کے ناز و نعم میں پلے ہوئے خاندان کسمپرسی کے عالم میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ انہوں نے جیلوں کی تاریک کوٹھڑیوں اور انڈمان کی بھیانک وحشت ناکیوں میں دن بسر کیے۔ ایک دوسرے سے دائمی جدائی بھی قبول کر لی۔ یہاں تک کہ حقیقی بھائیوں کو پردیس میں قبروں کی یکجائی بھی نصیب نہ ہوئی لیکن اس کے باوجود کبھی ان کی پیشانی پر شکن پڑی نہ پائے استقامت میں لرزش آئی۔ انگریز ایسے ہی لوگوں کی قربانیوں کی بدولت یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا لیکن افسوس کہ جب آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو ؏

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

انگریز کی عدالت سے پھانسی، ضبطی جائیداد یا کالا پانی میں عمر قید کی سزا پانے والے مجاہدین کی پاکیزہ روحیں آج اگر کسی بات پر بے چین ہوں گی تو وہ صرف یہ کہ جس خطۂ ارض کو وہ انگریز کے ناپاک وجود سے پاک کر کے یہاں اسلام کے شجر سایہ دار کو برگ و بار لاتے دیکھنا چاہتے تھے، وہاں سے انگریز تو نکل گیا لیکن اسلام کے نفاذ کی تمنا تا حال تشنۂ تکمیل ہے۔

صادق پور کے علمائے صادقین:

سید احمد شہید رحمہ اللہ سے تعلق رکھنے والے مجاہدین میں سے محلہ صادق پور، پٹنہ کے تین خاندان نہایت ممتاز اور نامور ہیں۔ کالا پانی کے قیدیوں میں سے کئی مشہور ہستیاں انہی میں سے تھیں۔ اس خاندان کے افراد نے جہاد سے وابستگی کے تقاضوں کو جس ہمت اور اخلاص سے پورا کیا اور جیسی عظیم الشان قربانیوں کی توفیق بارگاہِ الٰہی سے پائی، اس کی کوئی مثال ہمارے دورِ زوال میں نہیں ملتی۔ تینوں خاندان عظیم آباد کے امیر ترین شرفا میں سے شمار ہوتے تھے اور سب کے سب کئی پشتوں سے انتہائی فارغ البالی اور راحت و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن امام المجاہدین سید صاحب رحمہ اللہ سے وابستگی کے بعد ان کے طرزِ حیات میں انقلابی تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ ان کو ''علمائے صادق پور'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ صادق پور ان کے محلے کا نام تھا جہاں ان کی آبائی حویلیاں، مساجد اور قبرستان وغیرہ تھے۔ انگریز کو چونکہ ان حضرات کے مجاہدانہ کارناموں سے بہت نقصان پہنچا تھا، اس لیے اس نے ان کی گرفتاری کے بعد ان کے اہل اعیال کو گھروں سے بے دخل کر کے ان کے آبائی مکانات کو مسمار کر کے زمین سے برابر کر دیا تھا۔ یہ حضرات خود کوسوں دور قید تھے اور ان

کے اہل وعیال دربدر تھے۔ ایسی مصیبت کسی پر نہ آئی ہوگی، مگر اللہ کے ان دیوانے دوستوں نے اپنے محبوب کی رضا کی خاطر سب کچھ برداشت کیا اور جہاد سے ایک لمحے کے لیے منہ نہ موڑا۔ یہاں ہم حصول برکت کے لیے ان تینوں خاندانوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں کہ اصل موضوع سے اس کا گہرا ربط ہے۔

(1) پہلا خاندان شاہ محمد حسین تموہیہ کا تھا۔ یہ حضرات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے اور مجاہدین کی جانی و مالی خدمت کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

(2) دوسرا خاندان مولوی الٰہی بخش جعفری کا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے۔ ان کے بیٹوں اور پوتوں نے تحریکِ جہاد کو منظم کرنے اور مجاہدین کے لیے اخراجات مہیا کرنے کے سلسلے میں یادگار کارنامے انجام دیے جن کا تذکرہ ابھی آتا ہے۔

(3) مولوی فتح علی کا خاندان جن کا سلسلۂ نسب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ تحریکِ جہاد کے مشہور راہنما مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی انہی کے فرزند تھے۔ اس خاندان نے میدانِ جہاد میں جوہر شجاعت دکھانے کے ساتھ ہندوستان کے اندر تحریکِ جہاد کو زیر زمین منظم کرنے میں جو خدمات انجام دیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان تینوں خاندانوں کی جانی و مالی قربانی اور بچوں اور عورتوں تک کا جہاد اور مجاہدین سے تعلق ومحبت اور مصائب کے مقابلے میں صبر دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عباسی، جعفری اور زبیری خاندانوں کے یہ لوگ انسانوں کے بھیس میں فرشتے تھے جو ہمارے لیے عملی نمونہ پیش کرنے کی غرض سے دنیا میں آ گئے تھے۔

اب ان چند بزرگ ہستیوں کا تذکرہ جنہوں نے ان ویران جزائر کے بھیانک ماحول میں قید کاٹی۔

(1) مولانا احمد اللہ صاحب:

آپ مولوی الٰہی بخش جعفری کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ 1223ھ/ 1808ء میں پیدا ہوئے۔ والد نے خاندانی ناموں کی مناسبت سے احمد بخش نام رکھا۔ اس میں چونکہ شرک کا شائبہ تھا اور سید صاحب رحمہ اللہ مجاہدین کے عقائد واعمال کی تصحیح کا بہت خیال رکھتے تھے، اس لیے سید صاحب سے تعلق ہو جانے کے بعد انہوں نے احمد اللہ نام تجویز فرمایا۔ آپ قوی الاستعداد عالم دین تھے۔ دینی علوم دوسرے اساتذہ کے علاوہ مولانا ولایت علی سے حاصل کیے۔ بہت ذکی اور ذہین تھے۔ فہم وفراست میں یگانۂ روزگار مانے جاتے تھے۔ علاقے کے رئیس ہونے کے باوجود بہت حلیم الطبع، منکسر المزاج اور صاحب مروّت تھے۔ آپ کی شادی محمد حسین تموہیہ کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ عوام اور حکام ہر دو کی نظر میں نہایت معزز اور ذی وجاہت تھے۔ البتہ عظیم آباد کے انگریز کمشنر ولیم ٹیلر کو آپ سے عداوت اور کدورت تھی۔ آپ کی گرفتاری اور سزایابی میں اس بدبخت کی دیرینہ عداوت کو خاص دخل تھا۔ انہوں نے ایک عرصے تک انگریز کی سی آئی ڈی کے ناک تلے تحریکِ جہاد کو خفیہ طور پر منظم رکھا اور افراد وعطیات تیار وفراہم کر کے سرحد کے آزاد علاقے میں موجود مجاہدین کے مراکز تک بھیجتے رہے۔ مولانا جب گرفتار ہو گئے تو انہیں پہلے ضبطی جائیداد اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ بعد میں پھانسی کو عمر قید میں تبدیل کر کے آپ کو جزائر انڈمان المعروف کالا پانی بھیج دیا گیا۔ آپ 15 جون 1865ء کو عظیم آباد سے کالا پانی کے ایک جزیرے پورٹ بلیر پہنچے۔ سرحد میں برسرپیکار سید احمد شہید رحمہ اللہ کی جماعت

کی اعانت کرنے والوں میں سے آپ پہلے شخص تھے جنہیں یہاں بھیجا گیا۔ آپ سے پہلے 1857ء کی جنگ آزادی میں کئی عظیم المرتبت حضرات گرفتار کر کے یہاں بھیجے گئے تھے، مگر آپ نے 1857ء کی ناکامی سے پست ہمت ہونے کے بجائے تحریک جہاد کو زندہ رکھا اور گیارہ سال بعد گرفتار ہوئے۔

انسانوں کے بھیس میں فرشتے:

(1) اس زمانے میں ایک مسلمان سید اکبر زمان انڈمان کے چیف کمشنر کے میر منشی تھے۔ یہ آگرہ کے فوجی محکمے میں میر منشی تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ یہاں پہنچ کر اپنی قابلیت اور نیک کرداری کی بدولت چیف کمشنر کے میر منشی لگا دیے گئے۔ نہایت شریف اور خوبیوں کے مالک انسان تھے۔ اپنی حیثیت سے مسلمان قیدیوں کو جو بھی فائدہ پہنچا سکتے، اس سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ان کو مولانا احمد اللہ صاحب کے آنے کی خبر ہوئی تو اپنی حیثیت اور مرتبے کی بدولت چیف کمشنر سے بات کر کے مولانا ممدوح کو اپنے مکان پر لے گئے جو روس آئی لینڈ میں تھا۔ کچھ دنوں بعد قریب ہی ایک مکان تلاش کر کے آپ کو دلوا دیا اور چیف کمشنر کی کچہری میں اپنے ماتحت مولانا کو تحریر کا کام دلوا دیا۔ اس طرح ان کی اسیری کے ابتدائی پانچ سال قدرے اطمینان سے گذر گئے۔ چھٹے سال ہندوستان کا وائسرے لارڈ میو انڈمان کے دورے پر آیا تو ایک پٹھان مسلمان قیدی شیر علی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس پر تمام مسلمان قیدیوں سے سختی کر دی گئی۔ آپ کو بھی ایک دور افتادہ جزیرے وائپر آئی لینڈ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایک انگریز مؤرخ بوڈن کلوس نے لکھا ہے کہ اس جزیرے کو ''دوزخ'' کا نام دے دیا گیا تھا اور یہاں نہایت خوفناک قیدی رکھے جاتے تھے۔ یہاں غذا کی ناموافقت، آب و ہوا کی ناسازگاری اور عمر کے تقاضا سے آپ کی صحت گرتی چلی گئی۔ آپ کے بھانجے مولوی عبدالرحیم نے جو آپ کے بعد قید ہو کر آئے تھے، آپ کو اپنے پاس بلانے کی اجازت مانگی، مگر حکومت نے نہ مانا۔ مولانا جب بہت کمزور ہو گئے تو اپنی حالت زار کے پیشِ نظر اپنے بیٹے مولوی محمد یقین کو جو کلکتہ میں تھے، بلا کر ملاقات کرنا چاہی، مگر آپ اپنے علم و شرافت اور نیک چلنی کے باوجود انگریز کی نظر میں ان سہولتوں سے بھی محروم تھے جو تمام قیدیوں کو حاصل تھیں، اس لیے آپ کو اس کی بھی اجازت نہ ملی اور بالآخر ذی الحجہ 1298ھ/ 14 نومبر 1881ء تقریباً سولہ سال قید میں گذار کر آپ نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ آپ کے ملازم کی روایت کے مطابق آپ نے آخری وقت میں ''الا اللہ یا مالک الملک'' کہا اور روح پرواز کر گئی۔ آپ کو ونڈاس پوائنٹ نامی جگہ میں سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر چند قبروں کے ساتھ دفن کر دیا گیا اور یوں ایک عظیم مجاہد کا سفر زندگی مسافری کے عالم میں اختتام کو پہنچا۔ آپ قید کے دوران اپنے کاموں کے بعد سارا وقت ذکر و عبادت اور تبلیغ و تلقین میں گذارتے۔ آپ کے ساتھی قیدیوں میں سے تقریباً ہر شخص موحد، پابندِ سنت اور تہجد گذار بن گیا تھا۔ آج اگر انڈمان جانے کی سہولتیں میسر آ جائیں تو اس مردِ مجاہد کی قبر اور دیگر یادگاریں دنیا والوں کے سامنے پیش کرنا ممکن ہو جائے۔

(2) مولانا یحییٰ علی:

مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ علم و فضل، تقویٰ اور قربانی میں اس خاندان کا درِ نایاب تھے۔ خاصی مدت تک سرحد میں مجاہدین کے ساتھ عملی طور پر سرگرم رہے۔ واپس آئے تو بھائی کی قائم مقامی کرتے ہوئے دعوت و تنظیم جہاد کا پورا نظم ہاتھ میں لے لیا اور آخری دم تک اسی کام کے لیے وقف رہے۔ انبالہ کے ایک مجاہد مولوی محمد جعفر تھانیسری جب گرفتار ہوئے تو

آپ کا راز بھی کھل گیا۔ چنانچہ آپ پر دیگر رفقا سمیت مقدمہ چلا گیا جو ''انبالہ کے مقدمے'' سے مشہور ہے۔ اسے انگریزوں نے ''وہابیوں'' کا سب سے بڑا مقدمہ قرار دیا تھا۔ اور مولانا یحیٰی علی اس کے سب سے بڑے ملزم تھے۔ آپ کو بھی ضبطی جائیداد اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ جب آپ نے شہادت ملنے پر کمرۂ عدالت میں غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا تو انگریز جج سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے پھانسی کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ جس پر آپ نے ایک شعر کہا ؎

مستحقِ دار کو حکمِ نظربندی ملا
کیا بتاؤں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

اس طرح آپ اپنے بڑے بھائی سے ایک سال بعد 1866ء میں انبالہ سے لاہور، ملتان، کراچی، بمبئی کے راستے انڈمان پہنچے۔

مجاہدین کے خیر خواہ سید اکبر زمان نے آپ کو بھی اپنے پاس رکھا۔ اس طرح دونوں بھائی یکجا ہو گئے۔ فرصت کے اوقات میں آپ قرآن و حدیث پڑھانے اور توحید و سنت کی دعوت دینے میں مشغول رہتے۔ تقریباً دو سال بعد آپ بیمار ہو گئے۔ بیماری کے دوران آپ یادِ خدا اور صبر و شکر میں مصروف رہتے اور مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کو وعظ و نصیحت فرماتے رہتے۔ آپ کی عمر اتنی زیادہ نہ تھی اور بیماری بھی تشویش ناک نہ تھی، مگر ایک روز یکا یک طبیعت بگڑ گئی اور آپ 26 شوال 1284ھ/ 20 فروری 1868ء کو دو سال ایک مہینہ اور نو دن کی قید کاٹ کر اپنے بھائی کی بہ نسبت جلد ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔ آپ کی وفات کا تمام جزیروں میں اعلان کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی پہنچ گئے۔ جنازے کے شرکا 4، 5 ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ آپ کو روس آئی لینڈ میں دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ اور بھانجے مولانا عبدالرحیم قریب موجود تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عالمِ مسافری کی اس موت پر ان سب پر کیا گذری ہوگی؟

آپ کی یہ کرامت مشہور ہے کہ انڈمان پہنچنے کے بعد جب آپ کو خبر ملی کہ بدبخت انگریزوں نے آپ کے خاندانی مکانات منہدم کر دیے ہیں تو اس انتہائی صدمے کے وقت آپ کو خواب میں بشارت ہوئی۔ یہ بشاورت آپ نے اپنی اہلیہ کو ایک خط میں لکھ کر بھیجی:

''رات کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روح انور سے لقا کا شرف حاصل ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات کریمہ: ''وبشر الصابرين الذين اذا أصابتهم مصيبة........'' آخر تک تلاوت فرمائیں۔ اس مکاشفے کے بعد دل بالکل مطمئن ہو گیا۔''

بلاشبہ یہ آپ کی بہت بڑی کرامت ہے کہ اتنے جان لیوا مصائب میں استقامت کی دولت پائی اور درج بالا روح پرور بشارت دنیا ہی میں آپ کو ملی۔

(3) مولانا عبدالرحیم:

یہ مولانا احمد اللہ اور مولانا یحیٰی علی کے بھانجے تھے۔ دونوں کے بعد انڈمان پہنچے۔ سید اکبر زمان نے انہیں بھی اپنے پاس رکھا اور گھاٹ پر محرّری کی اسامی دلوادی۔ آپ نے ایک دکاندار سے مل کر تجارت بھی شروع کر دی تاکہ اپنے دونوں ماموں اور

دیگر ضرورت مندوں کی ضروریات کی کفالت کرسکیں۔ لارڈ میو کے قتل پر جب مسلمان قیدی زیرِ عتاب آئے تو آپ کو بھی انڈمان کے مرکز سے ایک دور افتادہ جزیرے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک درشت مزاج انگریز افسر بیمار ہو گیا اور اس کے جسم پر سیاہ داغ پڑ گئے۔ آپ کے علاج سے اچھا ہوا تو خوش ہو کر آپ پر بہت مہربان ہو گیا اور اعلیٰ حکام سے اس دوا کو سرکاری دواخانے میں رکھنے کی اجازت مانگی۔ انگریز اتنے کم ظرف تھے کہ ایک مسلمان قیدیوں کے سب ڈاکٹروں پر فائق ہو جانے کے خطرے سے اس کی اجازت نہ دی۔ آپ تقریباً سوا انیس سال کا طویل عرصہ ان اجاڑ اور ویران جزیروں میں قید رہے۔ یکم جمادی الاولیٰ 1300ھ/ 10 مارچ 1883ء کو مجاہدین کی اعانت کرنے والے قیدیوں کی سزائیں ختم ہوئیں تو آپ بھی رہا ہو کر وطن واپس پہنچے۔ آپ کے آبائی مکانات منہدم کر کے وہاں بلدیہ کا بازار بنا دیا گیا تھا۔ اہل و عیال محمد حسین تموہیہ صاحب کے ہاں زیرِ مقیم تھے۔ پٹنہ پہنچنے کے دوسرے دن اپنے مکانوں کی جگہ گئے تو یہ حسرت انگیز منظر دیکھ کر بے اختیار یہ دردآمیز شعر پڑھے۔ عربی جاننے والے حضرات ان کو پڑھیں تو اس حسرت والم کا مرقع سامنے آجاتا ہے جس سے ان حضرات کو سابقہ پڑا تھا۔ ایسے محترم حضرات ذرا ذوقِ طبع کو آواز دیں اور درج ذیل اشعار مفہوم کا لحاظ رکھتے ہوئے پڑھیں:

یامنزلاً لعب الزمان بأهله
فأبادهم بتفرق لایجمع
إن الذین عهدتهم بک مرة
کأن الزمان بهم یضر و ینفع
أصبحت تفزع من یراک و طالما
کنا إلیک من المعادل نفزع
ذهب الذین یعاش فی أکنافهم
بقی الذین حیاتهم لاتنفع

ترجمہ: ''(1) اے وہ گھر جس کے رہنے والے زمانے کی دست برد کا شکار ہوئے اور انہیں اس طرح منتشر کر دیا گیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں۔ (2) وہ جنہیں کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے نفع نقصان پہنچاتا تھا۔ (3) آج جو تجھے دیکھتا ہے گھبرا اُٹھتا ہے حالانکہ کبھی یہ حالت تھی کہ مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ (4) وہ لوگ تو گزر گئے جن کے سائے میں زندگی زندگی تھی، اب وہ باقی رہ گئے ہیں جن کی زندگیاں کسی بھی کام کی نہیں۔''

وطن واپسی پر جب آپ نے شہر والوں کا رنگ ڈھنگ اور طرزِ معاشرت بدلا ہوا پایا تو رہائی پر افسوس کرتے ہوئے کہا:

''کاش! میں بھی اس جزیرے کا پیوند ہو جاتا تو روزِ حشر اپنے دونوں ساتھیوں (مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی) کے ساتھ اُٹھتا۔''

آپ 10 ذی الحجہ 1341ھ/ 24 اگست 1923ء کو تقریباً 90 سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ اپنے خاندان کے مجاہدین کے حالاتِ زندگی پر ''تذکرۂ صادقہ'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے جو اس موضوع پر سند سمجھی جاتی ہے اور بعد کے حضرات اس سے استفادہ کر کے مجاہدین کی سوانح اور تاریخ مرتب کرتے رہے ہیں۔

(4) مولوی محمد جعفر تھانیسری:

آپ بھی راز کھل جانے پر مولانا یحییٰ علی صاحب کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ انبالہ کے مشہور مقدمے کے دوسرے بڑے ملزم آپ ہی تھے۔ عرصہ دراز تک مجاہدین کے لیے امداد کی ترسیل کا کام انتہائی مستعدی اور کمال ہوشیاری کے ساتھ کرتے رہے۔ گرفتاری پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا، مگر آپ نے کوئی راز بتا کر نہ دیا۔ آخر کار جھوٹی گواہیوں کے ذریعے آپ کو سزا دلوائی گئی۔ تفتیش کار انگریز افسر اپنے تشدد کے بے فائدہ ثابت ہونے اور مولانا کے صبر واستقامت کو دیکھ کر بہت تاؤ میں تھا۔ آپ کو پھانسی کی سزا ہوئی تو آپ نے بے تابانہ خوشی کا اظہار کیا۔ اس پر آپ کو بھی عمر قید کی سزا سنا کر کالا پانی بھیج دیا گیا۔ آپ اپنے دوسرے ساتھیوں مولانا یحییٰ علی اور میاں عبدالغفار کے ساتھ 11 جنوری 1866ء کو انڈمان پہنچے۔ سید اکبر زمان نے آپ کو نائب میر منشی کی نوکری دلوادی۔ ذہین اور فاضل آدمی تھے، انگریزی سیکھ کر انگریز افسروں کو اردو پڑھانے لگے۔ آپ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''تواریخ عجیبہ'' کے نام سے لکھی جو'' کالا پانی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ مجاہدین کے صبر واستقامت اور اولوالعزمی کا پتا دیتی ہے۔ مولانا کا انداز بیاں ایسا دلکش ہے کہ کتاب ایک بار شروع کر دینے کے بعد چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا۔ آج کے ہر مجاہد کو یہ کتاب پڑھنا چاہیے۔ مختلف رسالوں میں قسط وار چھپ چکی ہے۔ آپ بیس سال ان دور افتادہ جزائر میں قید رہے اور دورانِ قید ایک برہمنی قیدی عورت کو مسلمان کر کے اس سے شادی کی جس سے آپ کی اولاد بھی ہوئی۔ 9 نومبر 1883ء کو آپ انڈمان سے رہا ہو کر وطن پہنچے۔ 1905ء میں وفات پائی۔

ان بزرگوں کے علاوہ ہندوستان کی ان مشہور شخصیات نے انڈمان کے جزائر میں قید کاٹی۔

☆ علامہ فضل حق خیر آبادیؒ اپنے وقت کے مشہور فاضل، ادیب اور یگانۂ روزگار عالم تھے۔ معافی کا دھوکہ دے کر گرفتار کیے گئے۔ مقدمے کے دوران ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ بَری ہو جاتے مگر بھری عدالت میں صاف کہہ دیا: ''میں نے ہی جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور آج بھی میری وہی رائے ہے۔'' آخر کار کالا پانی بھیجے گئے اور دردناک تکلیفیں جھیل کر وہیں انتقال کیا۔

☆ مفتی عنایت احمد کاکوروی، ان کے علمی رسوخ کا یہ عالم تھا کہ ایام اسیری میں کئی کتابیں اپنے حافظہ کی مدد سے زبانی لکھیں۔ بعد میں مراجعت کی گئی تو کہیں غلطی نہ تھی۔ علم صرف کی مشہور درسی کتاب ''علم الصیغہ'' بھی انہی کتابوں میں شامل ہے جو آپ نے اپنے حیرت انگیز حافظے کی مدد سے ان کالے جزائر میں لکھی۔

☆ مولوی لیاقت علی، مشہور مجاہد راہنما تھے۔ انگریزوں کو انہوں نے بہت نقصان پہنچایا۔ گرفتاری کے بعد انہوں نے ہی برسرِ عدالت کہا تھا: ''اگر میں چوہا بھی ہوتا تو انگریزوں کی نس نس کاٹ کر رکھ دیتا۔'' 1869ء میں گرفتار ہو کر کالا پانی بھیجے گئے اور وہیں 1892ء میں انتقال کیا۔

☆ مولوی امیر الدین اور مولوی تبارک علی، یہ سب حضرات مجاہدین کے زیرِ زمین نظم کی اعانت کے جرم میں انڈمان بھیجے گئے اور سخت مشقت جھیل کر مجاہدین کے لیے اسیری کی تکالیف کے بارے میں بہترین نمونۂ عمل چھوڑ گئے ع

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

داستان ملت فروشوں کی

نامبارک آدمی:

یہ مضمون ایک ایسے شخص کی روداد جفا پر مشتمل ہے جس نے ہندوستان سے لے کر حجاز تک کے مسلمانوں سے وہ افسوسناک غداری کی جس کا خمیازہ آج تک ہندوستان، ترکی، حجاز، اُردن اور فلسطین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان بھگت رہے ہیں۔ یہ شخص مسلمانوں کے حق میں جتنا نامبارک نکلا، اتنا ماضی قریب میں کم ہی کوئی اور ہوگا۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام جہاں جوان مرد جانبازوں اور خلوص کیش جانثاروں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے وہیں اس میں بعض ایسے بدبختوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور بعض نے تو اپنے مذہب اور وطن سے غداری میں ایسا مذموم اور قابلِ نفرت و ملامت کردار ادا کیا کہ اس کی وجہ سے تاریخ کا رُخ پلٹ گیا اور دُشمنانِ اسلام کو زمانہ طویل تک بے انتہا شر و فساد پھیلانے کا موقع ملا جو ان ازلی بدنصیبوں کے نامہ اعمال میں سیئہ جاریہ کے طور پر لکھا جاتا رہے گا۔ زیرِ نظر مضمون میں ایک ایسے ہی شخص کا تعارف ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ضمیر فروشی اور ملت دُشمنی اس شخص کے خاندان میں اب تک چلی آ رہی ہے اور اس کی اولاد آج تک مسلمانوں سے غداری اور یہود و نصاریٰ سے وفا شعاری کی مرتکب ہو رہی ہے۔ اس خاندان سے گزشتہ سو سال کے دوران عرب و عجم کے مسلمانوں کو ہولناک نقصان پہنچا اور نجانے یہ منحوس سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

مردانِ حریت:

اس داستان کی ابتدا جنگ عظیم اوّل سے ہوتی ہے جب حجاز سمیت سارا جزیرۃ العرب خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگین تھا۔ ترکوں کی اسلام سے محبت حرمین شریفین کی خدمت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے باعث دنیا بھر کے مسلمان ان کے گرویدہ اور معتقد تھے۔ انگریز اپنے مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر سلطنتِ عثمانیہ سے محاذ آرا تھا۔ وہ مسلمانوں کے اتحاد کا یہ مرکز اور ان کی مذہبی و سیاسی قوت کے اس محور کو ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ ایک طرف برصغیر پر اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ رہے اور دوسری طرف جزیرۃ العرب کی قیادت سلاطین آل عثمان کے ہاتھوں سے جاتی رہے تاکہ فلسطین کے اردگرد وہ اپنے من پسند حکمران بٹھا کر صیہونی ریاست کو تحفظ فراہم کر سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ انگریز کے خلاف سیاسی و عسکری انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ صوبہ سرحد کے آزاد علاقے میں موجود اپنے شاگرد علماء اور مریدین کے ذریعے مجاہدین کی جماعت تیار کریں اور ترکی و افغانستان کی مدد سے ہندوستان پر حملہ آور ہو کر انگریزوں کو نکال باہر کریں اور یہاں نظامِ خلافت راشدہ کی علمبردار اسلامی حکومت قائم کریں۔ اس غرض کے لیے آپ نے اپنے شاگردِ رشید مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کو کابل بھیجا تاکہ وہ جماعتِ مجاہدین کو منظم کریں اور خود حجاز

روانہ ہوئے تاکہ سلطنتِ عثمانیہ سے تائیدی خط اور مجاہدین کی امداد کا وعدہ حاصل کرسکیں۔

دودھاری تلوار:

اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوجاتا تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا مگر اس موقع پر وہ حرماں نصیب شخص آڑے آیا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اس کی ہوس جاہ و مال نے مسلمانوں کو یہ بُرا دن دکھایا کہ سرزمین عرب سلاطین عثمانیہ کے مضبوط ہاتھوں سے نکل کر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کمزور اور دنیا پرست حکمرانوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو حرمین کی حفاظت کے لیے یہود و نصاریٰ کے محتاج ہیں اور جن کے زیر انتظام سرزمینِ اسلام کی دولت لٹ لٹ کر نیویارک اور لندن کو آباد کررہی ہے۔ اس شخص کا نام شریف حسین تھا اور یہ مکہ مکرمہ کا والی تھا۔ اس ظالم نے مسلمانوں کے ارمان پر دودھاری تلوار چلائی۔ ایک طرف تو وہ مرکز خلافت کو یقین دلاتا رہا کہ حجاز اور حرمین کے معاملات دیکھنے کے لیے میں کافی ہوں۔ آپ بے کھٹکے اپنی افواج کو انگریزوں کے مقابلے کے لیے محاذوں پر بھیج دیں۔ دوسری طرف انگریزوں کے کہنے پر عربوں کو ترکوں کے خلاف اُکساتا رہا اور انہیں خلافت اسلامیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا رہا۔ تیسری طرف اس کمبخت نے یہ حرکت کی کہ جب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ ترکوں کی طرف سے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے مسلمانانِ ہند اور سلطنتِ عثمانیہ کے جملہ عہدیداران کے نام اپنی حمایت کا خط حاصل کرچکے (جو بعد میں ''غالب نامہ'' کے نام سے مشہور ہوا) نیز خلافت عثمانیہ کے وزیر جنگ انور پاشا سے ملاقات کرکے اسی مضمون کا ایک خط اس سے بھی لے لیا تو اب آپ چاہتے تھے کہ جلد از جلد افغانستان اور وہاں سے آزاد قبائل پہنچ جائیں تاکہ مرکزِ خلافت کی طرف سے تائید و حمایت مل جانے کے سبب جملہ مسلمانانِ ہند آپ کا ساتھ دیں اور آپ مجاہدین کی جماعت لے کر انگریزوں پر حملہ آور ہوں، لیکن مذکورہ بالا شخص نے انگریزوں کے کہنے پر اس نازک موقع میں آپ کو مع رفقا کے گرفتار کرلیا اور پھر آپ کو مصر اور وہاں سے مالٹا بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ نے قید کا طویل زمانہ کاٹا اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان آزاد ہوکر مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ آسکا بلکہ مقاماتِ مقدسہ بھی اسی شخص کی سازشوں سے عثمانی سلطنت کے زیرنگین نہ رہے اور جزیرۂ عرب کے حصے بخرے کرکے اسے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یہاں کی زمامِ کار ان حکمرانوں کے ہاتھوں میں آگئی جو کثیر وسائل اور بے حساب دولت اکٹھی کرنے کے باوجود اپنے پڑوس میں موجود فلسطینی مسلمانوں کے کسی کام آتے ہیں اور نہ دنیا کے دیگر حصے میں بسنے والے مسلمانوں کو ان سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ مانا کہ یہ اسرائیل کی عسکری مزاحمت نہیں کرسکتے لیکن جو فلسطینی مہاجرین پڑوسی ممالک کے کیمپوں میں بستے ہیں، ان کی مالی مدد کرکے ان کو معاشی مسائل سے تو بے پروا کرسکتے تھے تاکہ ان کے نوجوان بے فکر ہوکر جہاد میں حصہ لے سکیں لیکن ان سے یہ بھی نہیں ہوتا۔

بے برکت ہاتھ:

انگریزوں کے اس گماشتے کو لالچ تھی کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسے حجاز کی حکومت مل جائے گی لیکن اس کا یہ ارمان پورا نہ ہوسکا۔ آلِ سعود کے حجاز پر غلبہ پالینے کے بعد انگریزوں نے اس سے نظریں پھیرلیں اور اسے یہاں سے رسوائی کی کالک سمیٹ کر اور ہزیمت اُٹھا کر بھاگنا پڑا۔ اس نے شام جاکر پناہ لی۔ اس موقع پر انگریزوں نے اسے دوسرا

کام سونپا جس کو اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد آج تک پورا کر رہی ہے۔ اس کمبخت نے انگریزوں کی بے وفائی کا مشاہدہ کر لینے کے بعد بھی ان کا آلۂ کار بننا منظور کر لیا اور اس کا خاندان نسل بعد نسل یہ منحوس ذمہ داری پوری کرتا آ رہا ہے جس کے تذکرے سے دل پھٹا جاتا ہے۔ اس مرتبہ اسے یہ ذمہ داری دی گئی کہ فلسطین کے مشرقی کنارے کی، جہاں اُردن واقع ہے، نگرانی سنبھال لے اور صیہونی مفادات کا تحفظ کرے۔ اس علاقے سے نہ فلسطینی مسلمانوں کو کوئی امداد پہنچ سکے اور نہ بیرونی دنیا کا فلسطین سے زمینی رابطہ رہے۔ وہ دن اور آج کا دن یہ شخص اور اس کی اولاد فلسطین کے پڑوس میں وہ سب کچھ کرتی ہے جس سے یہودیوں کو تحفظ ملے۔ گویا کہ اس نے مسلمان ہو کر فلسطین کے گرد ایسا حصار قائم کر رکھا ہے جس کا فائدہ مظلوم اور محصور فلسطینیوں، غاصب اور جابر یہودیوں کو ملے۔ اس کے مرنے کے بعد ایک بیٹا عراق و شام کا اور دوسرا اُردن کا حکمران بنا۔ عراق اور شام کی حکمرانی تو 1958ء میں اس خاندان سے چھن گئی البتہ اُردن ابھی تک ان کے بے برکت ہاتھوں میں ہے۔

بیمار بطخ:

اس کے بیٹے عبداللہ بن حسین نے 30 سال تک (1920ء سے 1950ء) اردن پر حکمرانی کی۔ اسی دوران اسرائیل وجود میں آیا، مستحکم ہوا اور یہ غدارِ ملت تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد شریف حسین کا پوتا طلال بن عبداللہ اردن کا حکمران ہوا لیکن اسے ایک ہی سال حکومت نصیب ہوئی۔ (1951ء تا 1952ء) بعد ازاں دماغی بیماری کی وجہ سے اسے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد اس کا پڑپوتا حسین بن طلال حکمران ہوا جسے دنیا شاہ حسین کے نام سے جانتی ہے۔ اس نے تقریباً نصف صدی تک اُردن کو صیہونیت کے تحفظ کا مرکز بنائے رکھا۔ اسی کے دور میں 1967ء میں اسرائیل نے حملہ کر کے دریائے اردن کا مغربی کنارہ چھین لیا اور اسے ''یہودا'' اور ''سامرہ'' نامی دو حصوں میں تقسیم کیا لیکن فلسطینی مہاجرین سے وحشیانہ سلوک کرنے والا یہ حکمران بیمار بطخ کی طرح مریل آوازیں نکالنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ اسی کے دور میں ملی بھگت سے کی جانے والی ایک مصنوعی جنگ کے بعد بیت المقدس اسرائیل کے حوالے کر دیا گیا اور اس نے بیت المقدس واپس لینے کے بجائے نہ صرف یہ کہ اسرائیل کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا بلکہ اسرائیل کے تحفظ کے لیے امریکا و برطانیہ کو فوجی اڈے بھی فراہم کیے۔ یہود و نصاریٰ سے اس کے خصوصی تعلقات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کے مرنے پر اس نے اُس کی قبر پر حاضری دی اور زار و قطار رویا جبکہ یہودی روایات کے مطابق کسی مسلمان کو یہودیوں کی قبر پر جانے کی اجازت نہیں۔ دوسری طرف جب یہ کینسر میں مبتلا ہو کر صاحبِ فراش ہوا تو یہودی عبادت خانوں میں اس کی صحت کے لیے خصوصی دعائیں کی گئیں۔

ہرے زخم:

یہ ایسا نامبارک شخص تھا کہ صہیونی مفادات کی نگہبانی کے لیے اپنے دینی بھائیوں پر ظلم کرنے سے بھی نہ چُوکا۔ ستمبر 1970ء میں یہودیوں کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کرنے والے 3 ہزار فلسطینی مسلمانوں کو اس کے حکم پر گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ فلسطینیوں نے اس مہینے کو ''کالے ستمبر'' کا نام دیا۔ وہ فلسطینی مہاجرین جو اُردن کے مہاجر کیمپوں سے نکل کر

اسرائیل کے خلاف مظاہرے کرتے تھے ان پر اس نے اتنا تشدد کیا کہ ان کی آواز کو کچل کر رکھ دیا۔ اس کی انہی خدمات کے اعتراف میں دنیا بھر کے چوٹی کے 5 متعصب یہودی اور عیسائی سربراہانِ مملکت سمیت کئی کافر حکمرانوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی اور اسے بُرے انجام کی طرف رخصت کیا۔ فلسطینی مسلمانوں نے اسے بُرے القاب دے رکھے تھے مگر اسرائیل نے اس کے نام پر ایک سڑک کا نام رکھا جو غدارانِ ملت کے لیے جہنم کی طرف راہنمائی کرتی رہے گی۔ آج کل اس کا لڑکا شاہ عبداللہ حکمران ہے۔ اس کی ماں برطانوی عیسائی تھی۔ شاہ حسین کی دو بیویاں تھیں: ایک امریکی یہودی اور دوسری برطانوی عیسائی۔ اس سے بھی یہودی و نصاریٰ کے ساتھ اس خاندان کے قریبی رابطوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاہ عبداللہ کی تربیت خصوصی طور پر غیر اسلامی انداز میں کی گئی ہے اور یہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ سب کچھ کر رہا ہے جس سے فلسطینی مسلمانوں کے زخم ہرے ہوتے رہیں اور انہیں اپنے پڑوس سے کوئی مدد نہ مل سکے۔ دیکھیے کب قدرت کا دستِ انتقام حرکت میں آتا ہے اور یہ خاندان اپنے انجام کو پہنچتا ہے؟

آٹھواں باب

متفرقات

ماضی کی تلاش

اس سفر کی روداد شروع ہونے سے پہلے قارئین چند امور ملحوظ رکھیں:

☆ حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے دور کو گذرے ہوئے تقریباً دوسو برس ہونے کو آئے ہیں۔ ان کی جماعت کے مجاہدین کی سرگرمیاں اختتام پذیر ہوئے بھی تقریباً نصف صدی سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے ان کی جدوجہد کے آثار وباقیات کچھ تو حوادثات زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں اور کچھ صحافیوں اور تحقیق کاروں کی بے توجہی کے سبب غیر معروف وغیر مشہور ہیں۔ کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جنہیں انگریز نے 1857ء کے بعد ضد اور دشمنی سے تباہ و برباد کر دیا اور اپنے تعصب کے سبب ان جگہوں کے آثار کو مٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس واسطے سید صاحب پر لکھی گئی کتابوں میں جن جگہوں اور یادگاروں کا تذکرہ ملتا ہے، ان سب کی سابقہ اصلی حالت تک پہنچنا ممکن نہیں، لہٰذا اس سفر نامے کو ان کی سیرت کے واقعات کے ساتھ مسلسل مربوط کر کے پیش کرنا ہمارے بس میں نہیں، ہم صرف ان مقامات آثار اور احوال وواقعات کا تذکرہ کر سکیں گے جن تک رسائی آج ممکن ہے۔

☆ ہم کراچی شہر کے باسی ہیں، ان علاقوں میں اجنبی اور ناآشنا تھے، شروع شروع میں تو چھوٹی سی چیز تک پہنچنے کے لیے ایسی محنت کرنی پڑی کہ دانتوں پسینہ آ گیا۔ بھری دوپہر میں نامانوس جگہوں میں آثار کی تلاش میں مارے مارے پھرنا اور ان چیزوں میں دلچسپی نہ رکھنے والے عوام کی ناواقفیت کی وجہ سے کوفت اٹھانا کافی حوصلہ شکن تجربہ تھا۔ تاہم بعد ازاں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایسے علمائے کرام کی رفاقت اور راہنمائی نصیب ہوگئی جو نہ صرف یہ کہ مجاہدین کی تاریخ سے نہایت دلچسپی اور گہری واقفیت رکھتے تھے، بلکہ اپنے ذاتی شوق اور عقیدت ومحبت کی وجہ سے اکثر وبیشتر آثار تک خود جا چکے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات کی علمیّت اور تاریخ دانی کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کی اولاد واخلاف اور ان کے گاؤں میں رہنے والے معمر لوگوں سے بھی زیادہ حقائق الامور کی واقفیت رکھتے تھے اور ہم نے ایک سے زائد مرتبہ ان کی فراہم کردہ معلومات کو مقامی افراد کی بتائی گئی باتوں کے تناظر میں تاریخ کی کتابوں میں درج معلومات سے موازنہ کیا تو انہی کی معلومات کو درست پایا۔ ان حضرات نے ہم سے تعاون بھی بہت کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزائے خیر دے۔ یہاں ان باتوں کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس تحریر میں لکھی گئی کسی بات کو اہل علم اور تاریخ سے شغف رکھنے والے حضرات خلاف واقعہ پائیں تو انہیں ہم مسافروں کی ناواقفیت پر محمول کر کے اس کی تصحیح فرمادیں۔ خصوصاً تاریخی مقامات کا موجودہ مشہور قصبوں یا شہروں سے فاصلہ اور ان کے محل وقوع کے متعلق غلطی کا زیادہ امکان ہے۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی راہنمائی خصوصی شکریے کا سبب ہوگی۔

☆ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جتنے بھی سفر نامے لکھے جاتے ہیں ان میں.... چند ایک مستثنیات کے علاوہ...... ساری

گفتگو سفر نامہ لکھنے والے کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ وہ اس سارے قصے کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ ہر مجلس میں خصوصی توجہ کا مرکز بھی وہی ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات دوسروں پر اس طرح غالب رہتی ہے گویا وہ ہر فن مولا ہے اور وہ جہاں جاتا ہے سب اس کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں تعلّی سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس تحریر میں کوشش کی گئی ہے کہ توجہ مقصد کی طرف رہے اور واحد متکلم کا صیغہ کم سے کم استعمال ہو۔

☆ سید صاحب رحمہ اللہ نے سرحد میں جہادی زندگی کے تقریباً پانچ سال گذارے (آپ کی سرحد آمد 1823ء میں ہوئی اور آپ کی شہادت کا واقعہ 1828ء میں پیش آیا) آپ کے بعد آپ کے سلسلے کے مجاہدین نے تقریباً سو سال سے زائد عرصے تک علم جہاد بلند رکھا۔ اس طویل عرصے میں جہاں جہاں سید صاحب کا جانا ہوا یا جہاں ان کے رفقا کی باقیات صالحات ہیں، ان سب کا احاطہ چند دنوں میں ممکن نہ تھا، ہماری کم ہمتی، وقت کی کمی اور سفر میں درپیش بعض مشکلات اس پر مستزاد ہیں، لہٰذا اس مشاہداتی دورے کی رُوداد کو حضرت سید صاحب کی حیات مبارکہ میں پیش آنے والے واقعات کے ساتھ کلّی مطابقت دینے کے لیے لمبا وقت اور کافی محنت درکار ہے۔ اس واسطے موجودہ تحریر نہ سید صاحب کی حیات کو جامع ہے، اور نہ اس کی ترتیب ان واقعات کی ترتیب سے بعینہ موافق ہے جو سید بادشاہ اور ان کے رفقا کو سرحد کے پہاڑوں اور میدانوں میں پیش آئے۔ البتہ اس سفر کا دوسرا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہ کافی حد تک ان احوال کا احاطہ کرے گی جو مجاہدین کو پیش آئے۔ فی الحال آپ اسے چند فقیروں کے پھیرے کی ٹوٹی پھوٹی کارگذاری سمجھ کر پڑھیں۔

☆ اس ساری محنت کا مقصد ضربِ مؤمن کے کالم کا پیٹ بھرنا، قارئین تک معلومات برائے معلومات بہم پہنچانا یا آثار قدیمہ سونگھتے پھرنے والے گوروں کی طرح تجسس کی تسکین یا تفریحی سیاحت نہ تھا، اس کا مقصد ان لوگوں کی اس شاندار جدوجہد کا تذکرہ تازہ کرنا تھا جو زوال کے اس دور میں خلوص وللّٰہیت، ایثار و قربانی اور ہمت و شجاعت کی بے مثال روایات کا زندہ و تابندہ نمونہ تھے اور جن کی جدوجہد ہمارا قابل فخر ماضی اور ہماری قوت عمل کے لیے بہترین محرک ہے، لہٰذا اس روداد کو اسی تناظر میں پڑھا جائے۔

ان چند تمہیدی باتوں کے بعد آیئے دو سو سال قبل برپا ہونے والی اس عظیم الشان تحریک اصلاح و جہاد کی چند جھلکیاں دیکھنے چلتے ہیں جو آج بھی ہمارے ملک کے شمال مشرقی علاقوں میں موجود ہیں اور ان قربانیوں کی یاد دلا رہی ہیں، جو کبھی ہمارے قابل فخر اسلاف نے انجام دی تھیں۔

ہم نے اپنے سفر کا آغاز پشاور سے کیا۔ پشاور وہ شہر ہے جس کو حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قدم بوسی اور جائے سکونت بننے کا شرف کئی مرتبہ حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ تو ایسا موقع بھی آیا کہ یہ شہر اپنے سرکش سرداروں کی سرکشی کے باعث آپ کے ہاتھوں فتح ہوا اور یہاں کچھ دنوں تک اسلامی نظام کی بہاریں دیکھنے میں آئیں، مگر پھر آپ نے بے مثال فقر و استغنا کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرداران پشاور کو بخش دیا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ اپنے موقع پر آئے گی۔ پشاور شہر اور گردونواح میں کئی ایسے آثار و مقامات ہیں جو حضرت شہید رحمہ اللہ کی تحریک کے مختلف واقعات کے گواہ اور امین ہیں لہٰذا ہم نے اپنے اس

مطالعاتی دورے کا آغاز اسی تاریخی شہر سے کرنے کا فیصلہ کیا۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے ذرا سا اس امر کا جائزہ لے لیں کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اصلاحی اور جہادی تحریک کا آغاز سرحد سے کیوں کیا اور کس بنا پر انہوں نے اپنے ہندی رفقا کے ساتھ اس پہاڑی علاقے اور اجنبی دیس کا رخ کیا۔ اس کے بعد ہم پشاور شہر اور گرد و پیش کے ان آثار کا تعارف پیش کریں گے جہاں تک ہماری رسائی ممکن ہوئی۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقصود اصلی تمام ہندوستان کی آزادی اور یہاں حکومت الٰہیہ کا قیام تھا جیسا کہ آپ نے کئی خطوط میں تحریر فرمایا ہے لیکن فوجی مصالح اور سیاسی تدبر کا تقاضا تھا کہ یہ مہم ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے شروع کی جائے، جو طاقتور وپُرجوش افغانی قبائل کا مرکز ہے اور جہاں سے ترکستان تک آزاد مسلمان حکومتوں کی ایک مسلسل زنجیر ہے۔ جغرافیہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کی امداد، ہندوستان کی دوبارہ تسخیر اور ایک طاقتور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے بظاہر اس سے زیادہ موزوں مقام نہیں ہوسکتا۔

سید صاحب رحمہ اللہ کی نگاہ کے سامنے ان لوگوں کا انجام تھا جنہوں نے ہندوستان کے کسی حصے کو اپنی تحریک اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بہت جلد ان کے گرد سازشوں، مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا جس میں وہ جکڑتے چلے گئے اور ان کے ہاتھ پاؤں بندھ کر رہ گئے۔ انگریزوں کی زیرک وپُرفن حکومت ہر حوصلہ مند قائد اور اپنے ہر مخالف کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی تھی کہ اس کی جنگی کارروائیوں اور آزادانہ سرگرمیوں کا میدان تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا اور وہ بہت جلد محسوس کر لیتا کہ وہ ایک قفس میں محبوس ہے اور بالکل بے بال و پر اور بے دست و پا رہ گیا ہے۔ انگریزوں کے ایک مخالف، نواب امیر خان کا سارا معاملہ سید صاحب رحمہ اللہ کی نظر کے سامنے تھا کہ انگریزوں کے جوڑ توڑ سے وہ کس طرح اکیلا رہ گیا اور کس طرح انہوں نے اس کے مختلف سرداروں کو اس سے توڑ لیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ اپنے کو معاہدے اور مصالحت پر مجبور سمجھنے لگا۔ اس سے پہلے ہندوستان کے دور آخر کے سب سے بڑے صاحب عزم امیر ٹیپو سلطان کو انہوں نے کس طرح سب سے کاٹ لیا تھا اور کس طرح اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ آخر اس جواں مرد نے تنہا سرخروئی حاصل کی اور ہندوستان کے کسی والی ریاست یا امیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ سید صاحب رحمہ اللہ کی بہت بڑی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے ہندوستان میں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا جس کے لیے بہت جلد ایک ایسا جزیرہ بن جانے کے قوی امکانات تھے جس کے چاروں طرف مخالفتوں، مزاحمتوں اور سازشوں کا ایک سمندر پھیلا ہوا ہوتا اور جس کو کہیں سے کمک یا رسد ملنے کی کوئی توقع نہ رہتی۔

اس مرکز یعنی ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد دی ہوگی کہ افغانوں (پٹھانوں) کی جواں مردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و بے جگری کی ہندوستان میں بڑی شہرت تھی۔ جو افغانی ہندوستان کے مختلف حصوں میں عرصے سے سکونت پذیر ہو گئے تھے، وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔ اودھ کی فوج کا بڑا حصہ ان پٹھانوں پر مشتمل تھا جو یا تو خود افغانستان و سرحد سے آئے تھے یا ان کے قریبی مورث منتقل ہوئے تھے۔ شاہ اودھ کی فوج انہی پٹھان افسروں کی ماتحتی میں تھی۔ روہیل کھنڈ جو ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی

طاقت اور دینی حمیت کا ایک بڑا مخزن تھا، جو وقتاً فوقتاً مرکز ''دہلی'' کو بھی تازہ خون اور نئی طاقت عطا کرتا رہا، افغانوں سے آباد تھا۔ خود رائے بریلی میں جو سید صاحب رحمہ اللہ کا وطن ہے، جہان آباد کا محلّہ پٹھانوں کا محلّہ تھا اور سید صاحب ان کی مردانگی اور جواں مردی سے خوب واقف تھے۔ ان میں سے کثیر التعداد لوگ سید صاحب رحمہ اللہ سے ارادت اور بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور آپ رحمہ اللہ کی رفاقت کے لیے کمربستہ تھے۔ ان سب کے تعلقات اور رشتے داریاں افغانستان اور سرحد کے قبائل میں تھیں۔ انہوں نے بھی سید صاحب رحمہ اللہ کو اپنے وطن یعنی افغانستان و سرحد کو اپنی دعوت و جہاد کا مرکز بنانے کا مشورہ دیا ہوگا اور اپنے اعزہ اور اہل تعلق کی مدد کی امید دلائی ہوگی۔ ان سب چیزوں نے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ اس افغانی آزاد علاقے کو اپنی مجاہدانہ دعوت و تحریک کا مرکز بنائیں، جس سے آپ کو اپنے مقصد کے لیے بہترین سپاہی، جنگجو اور جنگ آزما رفیق بہت بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں۔

اللہ والوں کا امتحان

مرجھائے پھولوں کی بساند:

بعض اوقات حوادثات زمانہ کی شدت انسان کو اتنا پریشان نہیں کرتی جتنا کہ حالات کی ستم ظریفی اور مضحکہ خیزی اسے دھچکے لگاتی ہے۔ اب اسی بات کو لے لیجیے کہ پاکستان نے ''دہشت گردی'' کے خلاف ''عالمی برادری'' سے تعاون کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ خود امریکیوں کو اعتراف ہے کہ پاکستان نے ان کی توقع سے بڑھ کر تعاون کیا مگر حال یہ ہے کہ ابھی امریکا کی طرف سے پاکستان کو پیش کیے گئے دوستی کے گلدستے میں سجے ہوئے نئی دوستی کے پھول مرجھائے بھی نہ تھے کہ صہیونی فطرت نے اپنا اصل رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ امریکا کی طرف سے شہہ پانے کے بعد وہی بھارت جس کی پاکستانیوں کے ہاتھوں ہزیمت کی داستانیں چونڈہ سے بی آر بی نہر تک پھیلی ہوئی تھیں اور جو ہر میدان میں ہمارے ہاتھوں منہ کی کھاتا تھا، اس کی بلند حوصلگیوں کا عالم یہ ہے کہ پاکستانی سرحدیں چانکیہ کے چیلوں کے ٹرانے سے گونج رہی ہیں اور ہمارے ارباب حکومت کو پرتھوی کے ان شکست خوردہ وارثوں کو رام کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ سوجھائی نہیں دیتا کہ وہ مجاہدین کے خلاف زور وشور سے اقدامات کا اعلان کریں اور بنئے کے سرپرستوں کے مکر وفریب پر مشتمل چالوں سے بچنے کے لیے دینی قوتوں کو محدود کرنے اور انہیں دیوار سے لگانے کی تدبیر کریں۔ لیکن کیا اس طرح یہود وہنود ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے؟ خدا کی قسم! یہ مکار لوگ پیچھا چھڑانے والوں کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتے۔ یہ تو اپنے جامے میں اس وقت آتے ہیں جب ان کی گیدڑ بھبکیوں کا جواب مجاہدانہ شان سے اور لومڑانہ مکاریوں کا سامنا مردانہ آن کے ساتھ کیا جائے۔

پھٹے بانس کی چرچراہٹ:

مجبوری کو جب مصلحت کا نام دیا جائے تو انسان پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا ہٹتا آخر کار گر کر لڑھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم کو بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے لیکن افسوس کہ ہم پھر اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینے پہنچ جاتے ہیں جس کے سبب اس حال کو پہنچے تھے۔ ہمارے ایک سابقہ حکمران پر ''شرافت'' اس قدر حاوی تھی کہ انہوں نے بے سوچے سمجھے بغیر کسی جھجک کے پاکستانیوں کو امریکا کے حوالے کیا اور بدلے میں فحش اور بیہودہ گالیاں سنیں۔ اب ہم پھر افغان بھائیوں اور ان کے عرب مہمانوں کو امریکا کے حوالے کرنے میں مسلسل تعاون کر رہے ہیں۔ لیکن امریکی صدر صاحب ہمیں ''پاکیز'' کہہ کر ہماری توہین کرنے کے ساتھ ہنود کی ہلا شیری کر کے ان کو ورغلا رہے ہیں، چنانچہ ابدالی بابا کے پاؤں دھو کر پینے والوں میں اس قدر جرأت آگئی ہے کہ وہ اپنی زکام زدہ آواز میں مسلسل ایسی دھمکیاں دے رہے ہیں جیسے پھٹا ہوا بانس چرچرا رہا ہو۔

دنیا دار الامتحان ہے:

انسان کا دل اس روح فرسا منظر کو دیکھ کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے کہ امت مسلمہ کے جگر گوشوں کو درندہ صفت یہود ونصاریٰ کے حوالے کیا جا رہا ہے جو ان سے انسانیت سوز ناروا سلوک کر کے اپنے حسد وبغض کی آگ بجھانا چاہتے ہیں مگر وہ بجھائے نہیں

بجھتی۔ اطلاعات کے مطابق امریکی اس بات سے تو مطمئن ہیں کہ پاکستانی حکام ان سے بے لوث تعاون کر رہے ہیں، مگر وہ اس بات سے بہت جلے بھنے ہوئے ہیں کہ یہ کیسے پھر یلے مستک والے قیدی ہیں کہ نہ ان کے سامنے عاجزی وزاری کرتے ہیں، نہ ان کی خود اعتمادی ختم ہوتی ہے۔ جب دیکھو ذکر کر رہے ہیں یا تلاوت میں مشغول ہیں۔ طرح طرح کے منفی حربے آزمانے کے باوجود وہ اب تک ان کو توڑ نہیں سکے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ وقت اللہ والوں پر کڑے امتحان کا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح کی صبر و استقامت کا مظاہرہ اللہ کی خاطر ستائے جانے والے یہ لوگ کر رہے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ کی غیرت کو ضرور جوش آئے گا اور دنیا ایک حیرت انگیز اور غیر متوقع انقلاب کو دیکھے گی۔

سطور کا بین السطور:

آیئے! اس موقع پر تاریخ کے چند بابرکت اوراق پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان میں درج سطروں کے بین السطور کو اگر آپ سمجھ گئے تو دل کو تسلی بھی ہوگی اور حکمت الہیہ کے مختلف پہلوؤں سے آشنائی بھی نصیب ہوگی۔ یہ ساتویں صدی ہجری کی بات ہے۔ شام پر الملک الاشرف کے جانشین ابوالخبش صالح اسماعیل کی اور مصر پر الملک الصالح نجم الدین ایوب کی حکومت تھی۔ ان دونوں کے درمیان چپقلش چلتی رہتی تھی جس کی وجہ سے اول الذکر نے مؤخر الذکر کے خلاف یورپ کے فرنگیوں سے مدد چاہی اور حق الخدمت کے طور پر صیدا اور ثقیف نامی علاقوں اور چند قلعوں کے پروانے لکھ دیئے۔ اس دوستانہ تعلق کی بنا پر پھیکی رنگت والے فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ مصر پر حملے کی تیاریوں کے لیے دمشق شہر میں آکر اسلحہ خریدتے۔ اس زمانے کے علماء میں ایک بہت ہی باعظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (متوفی 660ھ) کی تھی، جو اپنے علم وتقویٰ اور حق گوئی و بے باکی میں نادرۂ روزگار اور قرون اولیٰ کی یادگار تھے۔

حق گوئی و بے باکی:

شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر اور ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں۔ تاجران اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے اس لیے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے۔ شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حمیتی اور اسلام کی اس بے بسی کا بڑا اثر تھا، انہوں نے بادشاہ کے لیے خطبہ میں دعا ترک کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الٰہی! اسلام اور حامیان اسلام کی نصرت فرما، ملحدین و دشمنان دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما اور تمام مسلمان بڑی رقت واثر کے ساتھ آمین کہتے تھے۔ حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک محبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کیے گئے۔

یادگار تاریخی جواب:

اسی اثنا میں سلطان صالح اسماعیل، الملک المنصور والی حمص اور سلاطین فرنگ اپنی افواج وعساکر کے ساتھ مصر پر حملے کے ارادہ سے القدس آئے۔ صالح اسماعیل کے دل میں شیخ عزیز الدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائدین وخواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا، اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا اور انتہائی خوشامد کے ساتھ ان سے

کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آ سکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو محبوس کر دینا۔ امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں اور ان کی تعظیم و تکریم اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا بادشاہ سے نیاز مندانہ مل لیں اور اس کی دست بوسی کر لیں تو یہ قصہ رفع دفع ہو جائے گا اور آپ اضافہ و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آ جائیں گے۔ شیخ نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ انہوں نے فرمایا: ''وَاللّٰہ یا مسکین! ما ارضاہ ان یقبل یدی فضلا عن اقبل یدہ ، یا قوم ! انتم فی واد وانا فی واد، والحمد للّٰہ الذی عافانی مما ابتلا کم بہ''. (طبقات شافعیۃ: ج5، ص 101)

''ارے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے۔ چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں؟ لوگو! تم کسی اور جہاں میں ہو، میں کسی اور جہاں میں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔''

ہر مشکل کے بعد آسانی ہے:

یہ جواب سن کر امیر نے کہا: پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کرلوں۔ شیخ نے کہا شوق سے، جو کچھ تم سے ہو سکے اس سے دریغ نہ کرو۔ امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا۔ شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید پڑھتے رہتے تھے اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! کہا جانتے ہو، یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے، (ھذا اکبر قسوس المسلمین) میں نے اس کو اس لیے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کا قلعہ سپرد کر دینے کے خلاف تھا اور اس پر معترض تھا۔ میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا۔ اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے۔ عیسائی بادشاہوں نے (شیخ کے بلند مقام اور مظلومیت سے متاثر ہو کر) کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کے پیتے۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسماعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں اور شیخ رہا ہو کر صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔ مصر میں سلطان مصر الملک الصالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا خطیب مقرر کیا اور مصر کا عہدۂ قضا اور ویران مساجد کی آبادی کا کام سپرد کیا۔ سلطان نے جب مدرسہ صالحیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کر دی اور انہوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔ (تاریخ دعوت و عزیمت از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ: ج1، ص 291-293)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اور نصرت اس کی خاطر تکلیفیں سہنے والوں کے ساتھ جلد یا بدیر ضرور آتی ہے۔ شرط تقویٰ، صبر اور حوصلہ کی ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ سے کیے گئے وعدے سے نہ پھریں تو باری تعالیٰ اپنے وعدوں سے کبھی نہیں پھرتے۔

امریکا کی دریافت کی کہانی

نادیدہ طاقت کی کارستانیاں:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

امریکا نے اعلان کیا ہے کہ ایران، عراق اور شمالی کوریا خطرناک ملک ہیں، عین اسی وقت جبکہ یہ اعلان ہورہا تھا امریکا کی فوجیں وسط ایشیا میں افغانستان کے کہساروں میں برسرپیکار تھیں اور مشرق بعید میں فلپائن کے ناریل والے ساحلوں پر اتر رہی تھیں تا کہ وہاں ابوسیاف گروپ نامی ایک مبینہ مجاہد جماعت کے خلاف گھیرا تنگ کرسکیں۔ امریکا کی یہ پریشانیاں اور چومکھی لڑائیاں اس کی اپنی پالیسیاں یا اس کے عوام کی حقیقی خواہشات نہیں۔ اکثر امریکی عوام اور لیڈر چونکہ دنیا کی چندروزہ زندگی سے لذت اندوزی کے زیادہ سے زیادہ مواقع اور لمحات کشید کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی حکومت کو اس لیے ٹیکس دیتے ہیں کہ وہ انہیں امن وامان کے دن اور عافیت وتحفظ کی راتیں مہیا کرسکے تا کہ وہ اپنے آپ میں گم رہیں، جان کو کھپائیں مال کمانے کے لیے اور مال کو کھپائیں جان بنانے کے لیے، اس سے زیادہ کی ان کو سوچ ہے نہ حرص، نہ خواہش...... زیادہ سے زیادہ وہ اپنی حکومت کے اس اقدام پر راضی ہوتے ہیں کہ جس طرح انگریزوں نے برصغیر میں سونے کی چڑیا کے پرنوچ کر اپنے برفانی ملک کے خزانے بھر لیے، اس طرح اگر امریکی افواج سرزمین عرب کی تہوں میں دوڑنے پھرنے والا لہو کشید کر کے ان کے چراغوں میں روشنی کا سامان کرتی رہیں تو اتنا ہی کافی ہے۔ ساری دنیا کے پھڈوں میں ٹانگ اڑا کر اس کا ردعمل سہنا اور امریکی عوام کی عیش پرستی اور لمحہ بہ لمحہ لذت کوشی کا مزا کرکرا کرنا ان کے مفاد میں نہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر وہ کون سی نادیدہ طاقت یا پردہ میں چھپا معشوق ہے جو امریکی عوام کی اکثریت کی چاہت کے برعکس خواہی نخواہی امریکا اور اس کی دیوپیکر طاقت کو ان تنازعات میں الجھائے چلا جاتا ہے؟؟؟

دریافت کی کہانی:

اس کا جواب ہمیں امریکا کی دریافت کے واقعے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ امریکا بحراوقیانوس کے اس پار واقع ہے۔ کسی زمانے میں اسے بحرظلمات کہا جاتا تھا کیونکہ اس کے اس طرف رہنے والی دنیا تاحال ایسی بحری سواری ایجاد نہ کرسکی تھی جو اس میلوں لمبے طویل وعریض سمندر کو پار کرسکے۔ حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ نے براعظم افریقہ کی شمالی پٹی فتح کر لینے کے بعد اسی بحراوقیانوس کے مشرقی ساحل پر اپنے گھوڑے کے پاؤں پانی میں ڈال کر وہ تاریخی الفاظ کہے تھے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ اسپین کے مسلمانوں نے ان کی تمنا کی تکمیل کے لیے کام جاری رکھا اور قریب تھا کہ وہ ہسپانیہ کے بعد امریکا کے ساحل پر بھی فاتحانہ انداز میں اترنے میں کامیاب ہوجاتے لیکن شامت اعمال آڑے آ گئی۔

جب 1492ء بمطابق 897ھ میں اسپین کا سقوط ہوا تو اس کے صرف دو سال بعد 1494ء میں ہسپانیہ کے عیسائیوں

نے (پرتگال اس وقت ہسپانیہ کا حصہ تھا) دنیا کے اس طویل وخطرناک (اس دور کے اعتبار سے) بحری شاہراہ کو عبور کر کے امریکا دریافت کرلیا۔(چند سال پہلے 1994ء میں امریکا کی دریافت کا پانچ سو سالہ جشن منایا گیا تھا) دنیا بھر کے تاریخ دان بخوبی جانتے ہیں کہ اس میں ان کا کوئی کمال نہ تھا، انہوں نے ہسپانیہ کے ترقی یافتہ مسلمانوں کی تیار محنت سے استفادہ کیا اور مسلمان جہاز رانوں کی مہارت کے بل بوتے پر اس نئے براعظم کی دریافت کا کارنامہ اپنے نام لکھوایا۔ اس وقت یورپی اقوام جو زیادہ تر قبضہ گیری اور بحری قزاقی کا پیشہ کرتی تھیں، جوق در جوق اس نو دریافت شدہ دنیا میں پہنچنے لگیں اور وہاں کے مقامی قبائل (ریڈ انڈین) کو بزور محکوم بنا کر وسائل سے بھرے اس زرخیز ملک پر قبضہ جمانے لگیں۔ یہ بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ عیسائیت بھی سمندر پار لے گئے اور یوں آج عیسائیت امریکا کا سب سے بڑا مذہب ہے اور اگر صرف دو سال مزید ہسپانیہ کا سقوط نہ ہوتا تو آج امریکا پر اسلام کا پرچم لہرا رہا ہوتا، لیکن ہسپانیہ کے آخری مسلمان حکمرانوں کی نااتفاقی اور بدعملی سے نہ صرف یہ کہ امریکا...... جس نے آگے چل کر جدید دنیا کا قائد بننا تھا...... اسلام کا حلقہ بگوش ہونے سے محروم ہوگیا بلکہ ایک نئی آفت یہ کھڑی ہوئی کہ ہسپانیہ میں بسنے والے یہودی جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں چین وسکون سے رہتے تھے اور عیسائیوں کے غلبے کے بعد بہت تنگ تھے، وہ اس نئی سرزمین کو پناہ گاہ بنانے کے لیے اپنے سرمائے کے ساتھ ساتھ وہاں منتقل ہونے لگے۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی:

رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے مخصوص طرز سیاست اور سودی سرمائے کی بدولت قلت تعداد کے باوجود وہاں کے معاشرے میں مستحکم حیثیت حاصل کرلی اور امریکا کی داخلی لڑائیوں اور انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی سے لاتعلق رہنے کے باوجود وہاں کے اقتدار کے پیش منظر میں اگرچہ ان میں سے کوئی نہیں ہوتا لیکن پس منظر میں تاریخ عالم کی یہی راندۂ درگاہ قوم ہے جس کے ہاتھ میں امریکی اقتدار کی باگ ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس عیار قوم نے لندن میں بھی اپنے اثر ورسوخ کو کم نہ ہونے دیا۔ چنانچہ جب وہ دنیاوی اعتبار سے مستحکم ہونے کے بعد اپنے لیے ایک روحانی اور نظریاتی مملکت قیام کے لیے متفکر ہوئے تو انگریزوں کی سرپرستی میں ان سے سرزمین مقدس میں ایک صہیونی ریاست کی داغ بیل ڈلوائی اور پھر کچھ عرصے بعد جب انگریزوں کے عالمی استعمار کا سورج غروب ہو کر امریکیوں کا ستارہ طلوع ہونے لگا تو فوراً قلابازی لگا کر امریکا کی چھتری تلے سمٹ کر اس کا بغل بچہ بن گئے۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن اسرائیل کے استحکام اور عظیم تر اسرائیل کی طرف پیش رفت کے لیے امریکا کو مسلسل استعمال کرتے چلے جارہے ہیں۔ اس کے صلے میں امریکا کو دنیا بھر میں اپنی مخالفت، شدید ردعمل، امریکی تنصیبات پر حملوں اور دھماکوں کا سامنا ہے مگر صہیونی عفریت نے اس ترقی یافتہ قوم کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس طرح قابو کر رکھا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی کچھ نہیں سمجھ رہی۔

اداؤں پر غور:

چنانچہ امریکا کو شکوہ رہتا ہے کہ اسے دنیا بھر میں اپنے مفادات کے خلاف کارروائیوں کا خطرہ ہے لیکن اس کے تھنک ٹینک اس بات کی وضاحت اپنی قوم کے سامنے نہیں کرتے کہ اس کا سبب کیا ہے کہ شمالی کوریا جیسے بے دین، صومالیہ و یمن جیسے غریب اور عراق جیسے تباہ حال ملک کو امریکا جیسے جن کی چٹکیاں بھر کے اسے اپنے خلاف ورغلانے کا شوق کیوں ہے؟ نہ ہی وہ اپنے لبوں پر یہ

بات لاتے ہیں کہ یہ پسماندہ اقوام امریکی طاقت وترقی کے سامنے اپنی کمزوری اور پسماندگی کے باوجود امریکا کے لیے کیوں ''خطرہ بنے رہنے'' کا ''خطرہ مول'' لیتی ہیں؟ امریکا دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ چاہتا ہے لیکن حال یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں چاروں طرف جہاں بھی انسانی خون گر رہا ہے، اس میں کسی نہ کسی اعتبار سے امریکا کا حصہ ہے۔ افغانستان میں اس کے منظور نظر کمانڈر اپنے بھائیوں کا خون کر رہے ہیں اور ایک مرتبہ شکست کھا کر اب دوبارہ ہولناک جنگ کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ فلپائن میں بھی سرکاری فوج کو آگے رکھ کر مسلمانوں کو کچلنے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ عراق کے معصوم بچے غذا کے بجائے امریکی بارود کے پیکٹ وصول کرنے پر مجبور ہیں۔ پاکستان میں امریکا کا بڑھتا ہوا عمل دخل کسی سے مخفی نہیں۔ ان حالات میں بھی اگر امریکا اپنی اداؤں پر غور کرنے کے بجائے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ''دہشت گردوں'' کو مورد الزام ٹھہراتا ہے تو خون دو عالم بہا کر اس کی اس مشق ناز میں مشغولیت کو کیا نام دیا جائے؟؟؟

دیوانوں کی دنیا

دیوانوں کی دنیا:

آیئے! آج ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو دنیا کی آلودگیوں سے ہٹ کٹ کر، اس عالم ناسوت کے غموں اور فکروں سے بے پرواہو کر، عاشقوں جیسا حلیہ اور دیوانوں جیسے اعمال اپنا کر محبوبِ حقیقی کے در پر حاضر ہیں اور اس سے جنت و مغفرت کے طالب ہیں۔ ان دنوں دنیا بھر سے اللہ رب العالمین سے محبت کا دم بھرنے والے اور محمد رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ رکھنے والے توحید و رسالت کے پروانے اپنے خالق کے حکم کی ادائیگی اور اس کی سچی بندگی کے اظہار کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے پہنچے ہوئے ہیں۔ تلبیہ و تہلیل کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، مالک کے گھر کے پھیرے لگائے جارہے ہیں، اس کے سچے عاشقوں کی پیروی میں عشق و محبت کی اداؤں کی نقالی کر کے اپنے محبوبِ حقیقی کی خوشنودی اور رضا مندی حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ان دنوں عالم اسلام جن جگر خراش حالات سے دوچار ہے اس کا تقاضا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان حجاج کرام کی طرح ہمہ تن اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں اور سب مل کر ایسی آہ وزاری اور رجوع وانابت کریں کہ رب کریم ان کی بگڑی بنانے کا فیصلہ کر دے۔

حدود کے پار:

عین ان دنوں جبکہ ارضِ حرم کی استطاعت رکھنے والے خوش نصیب مسلمان دنیا کی آلائشوں سے دامن بچا کر اپنے روٹھے ہوئے مالک و مولیٰ کو منانے اور اس کے غضب سے پناہ مانگنے میں لگے ہوئے ہیں، ہمارے ملک میں بدقسمتی سے بسنت کا جشن منانے اور رنگ جمانے کی ہوا چلی ہوئی ہے۔ دینی مدارس کی ''اصلاح'' کے لیے اربوں روپے بیرونِ ملک سے مانگنے والے ملک میں شب بھر میں نوٹوں کی گڈیوں کی گڈیاں پتنگیں اور گڈیاں چڑھانے پر اور پھر انہیں کاٹنے کی خوشی منانے پر پھونک دیئے گئے ہیں۔ رقص کی محفلیں سجا کر موسیقی کی تانیں اڑائی گئی ہیں۔ سرکاری سرپرستی میں خصوصی تقریبات منعقد کی گئی ہیں جن میں غیر ملکی مہمانوں کی سہولت کے لیے انہیں ڈور، گڈیاں، پتنگیں، کھانے و دیگر لوازمات مفت فراہم کیے گئے ہیں۔ اس موقع پر نوجوانوں کی ٹولیاں جو اخلاق سوز حرکات کرتی ہیں اس باکمال کارکردگی کو قوم تک پہنچانے کے لیے ٹی وی نے سنسر میں چھوٹ کا دل کھول کر استعمال کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ پاکستان کو ہندوانہ زردی میں ایسا چوکھا رنگ لگایا جائے کہ کوئی شہر لاہور سے پیچھے نہ رہے تاکہ جب ''لہوریے'' حدوں کو پار کر جانے کے بعد کسی قدرتی گرفت میں آئیں تو ان کے لیے بارگاہِ الٰہی میں عفو و کرم کی التجا کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔

اے غازی کے وارثو!:

اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ ''بسنت'' نامی ہندوانہ تہوار میں پتنگ بازی جواب طوفانِ بدتمیزی کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، لاہور کے ایک گستاخِ رسول بت پرست کی اختراع کردہ ایک منحوس رسم تھی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ شہر جو غازی علم

الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسے اسلام کے نامور سپوتوں اور شمعِ رسالت کے جانثار پروانوں کی آخری آرام گاہ ہے، اسی شہر کے باسی آج ایسی رسم کو اپنی پہچان بنا چکے ہیں جو ایک کھتری لونڈے کی توہینِ رسالت کی ناپاک جسارت اور پھر اس کی عبرتناک موت کی یاد میں ایک بدبودار ہندو سیٹھ نے شروع کروائی تھی۔ تاریخی حقائق کے مطابق 1707ء تا 1759ء کے دوران پنجاب کے گورنر زکریا خان کے دور میں سیالکوٹ کے ایک ہندو کھتری مل ری کے بیٹے حقیقت رائے نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شانِ اقدس میں نازیبا الفاظ کہے۔ اس جرم کی تحقیق ہوئی اور جرم ثابت ہوگیا۔ چنانچہ سزا کے طور پر اس گستاخ رسول کو پہلے کوڑے لگائے گئے اور بعد میں ایک ستون سے باندھ کر گردن اُڑا دی گئی۔ یہ 1734ء کا واقعہ ہے۔ تاریخی کتب میں ذکر ہے کہ جس دن حقیقت رائے کو سزائے موت دی گئی وہ ''بسنت پنچمی'' کا دن تھا۔ اس گستاخِ رسول کی یاد میں ہندوؤں نے لاہور کے علاقے کوٹ خواجہ سعید میں ایک سمادھی تعمیر کی۔ مؤرخین کے مطابق ایک ہندو رئیس کالورام نے اس جگہ حقیقت رائے کی یاد میں مندر تعمیر کرایا۔ باقاعدہ بسنت میلے کا آغاز کیا اور پتنگ بازی کو رواج دیا۔ ایک سکھ مؤرخ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کالورام نے حقیقت رائے کی یاد میں بسنت میلے کا آغاز کیا تھا۔ دیکھیے: ''پنجاب آخری مغل دورِ حکومت میں'' از ڈاکٹر ایس پی بنجار: ص 279۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ماخذ میں کچھ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ میلہ ہندوانہ ہے اور اس میں کچھ سے معلوم ہوتا ہے کہ پتنگ بازی تو ایسی شرمناک حرکت ہے جو ایک گستاخِ رسول کی یاد میں شروع کی گئی تھی۔ دیکھیے: تاریخ لاہور از عبداللطیف: ص 260'' نیز ملاحظہ ہو البیرونی کی تاریخ الہند اور فرہنگ آصفیہ میں مادہ بسنت۔

اس وقت سے پہلے:

خطرہ جس بات سے ہے وہ محض یہ نہیں کہ منچلے لاہوری اس رات بے حد اسراف کرتے ہیں، قیمتی جانیں اور املاک ضائع ہوتی ہیں، ہندوؤں کو ہماری تضحیک کا موقع ملتا ہے، غازی علم الدین شہید کی روح اپنی جنت نما قبر میں تڑپتی ہے، بلکہ اندیشہ اس چیز کا ہے کہ جس طرح لاہوری بھائی ہنسی ہنسی میں اس موج میلہ کو اپنی پہچان بناتے جارہے ہیں اور سال بسال اس میں رنگ اور ترنگ آتا جارہا ہے اور نصیحت کرنے والوں کی خیر خواہانہ فہمائشیں صدا بصحرا ثابت ہورہی ہیں، رفتہ رفتہ بعینہ وہ کیفیت بنتی جارہی ہے جس کا شکار نفس شیطان کی ماننے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے منہ موڑنے والی اقوام ہوجایا کرتی تھیں اور لذت کوشی کا یہ خمار ان کے سر سے اس وقت تک نہ اترتا تھا جب تک سیاہ باری ناگہانی آفت کا پیغام لے کر ان کے سر پر نہ آ پہنچتے۔ اس مرتبہ سرکاری سرپرستی میں جس اہتمام سے اسے قومی سے بڑھ کر بین الاقوامی تقریب بنائے جانے کی خبریں آئی ہیں اور سنسر میں نرمی اور آزادی کی انتہا کردی گئی ہے۔ اس کے بعد علمائے کرام اور خیر خواہانِ قوم پر فرض ہوگیا ہے کہ وہ مل جل کر دلسوزی کے ساتھ اس صورتحال کا تدارک اس وقت سے پہلے کرنے کی مربوط اور مضبوط کوششیں شروع کردیں جب تفریح گاہیں غم کدے بن جاتی ہیں، ہنسی اور قہقہے چیخ و پکار میں بدل جاتے ہیں اور واپسی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

جان لیوا مکے:

اِدھر افغانستان کی صورتحال بڑی عبرتناک ہے۔ قبائلی روایات کے حامل اس ملک کے بارود گیر معاشرے میں طالبان نے جس خوبی اور کامیابی سے حکومت کی اس کے عشر عشیر کو بھی موجودہ ماڈرن حکومت اپنے تمام اتحادی سرپرستوں کے تعاون اور

گرم جوش سرپرستی کے باوجود نہیں پہنچ سکی۔ کابل میں ایک وزیر صاحب وزارتی اختیار استعمال کرانے کے شوق میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور اس واقعے کو اتفاقی حادثے کے بجائے منصوبہ بند سازش قرار دے کر جنرلوں سمیت کئی افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اگلے دن ایک دوستانہ میچ میں کئی کابلی اپنے غیر ملکی محافظ دوستوں کے ہاتھوں ہلاک و مجروح ہو چکے ہیں، قندھار میں پہلے امریکی فوجیوں کے ٹھکانے پر میزائل داغا گیا، پھر پراسرار طریقے سے طیارہ تباہ ہوا، پھر لاشیں اٹھانے والوں پر بھی فائرنگ ہوئی۔ امریکی حکام جس انداز میں یہ واقعات چھپا رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہی نہیں، ساری دال ہی سیاہ کالی ہوتی جارہی ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق خانہ جنگی اور لوٹ مار میں 150 ہلاک ہوگئے ہیں اور مقتول افغان وزیر سے متعلق معلوم ہوا ہے کہ انہیں عازمین حج نے نہیں، دفاعی، داخلہ اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے کے جی بی اور ''را'' سے منحرف ہونے کے جرم میں قتل کیا گیا۔ مقتول بھارت و روس اور احمد شاہ مسعود کے درمیان ہونے والے خفیہ عسکری و اقتصادی معاہدہ میں راز دار تھے اور ان کے امریکی کیمپ میں جانے سے خدشہ تھا کہ پنجشیر امریکا کے زیرِ اثر چلا جائے گا۔ قاتلوں نے جہاز میں تین گھنٹے تک خفیہ مذاکرات کے بعد اسے قتل کیا اور ظاہر شاہ کو خونی پیغام بھیجتے ہوئے دھمکی دی کہ مقتول دسویں مکے سے مرگیا جبکہ ظاہر شاہ ایک مکا بھی نہیں کھا سکتا۔ ظاہر شاہ کتنے مکے کھا سکتے ہیں؟ یہ تو وقت ہی بتائے گا مگر امریکیوں اور روسیوں و بھارتیوں کے درمیان افغانستان میں اثر و رسوخ بڑھانے کی چپقلش چل پڑی ہے اس میں یہ لوگ نجانے ایک دوسرے پر کتنے قاتل مکے برسائیں گے۔ اس کا شمار افغان عوام کے لیے دلچسپ مگر جان لیوا مشغلہ بنتا جارہا ہے۔ دیکھیں یہ مکا بازی کیا رنگ لاتی ہے؟؟؟

معتصم! کہاں ہو؟

غیرت مند نسلیں:

بے بس اور مظلوم عورت کی چیخیں جتنی تیز ہوتیں، سنگدل رومی (آج کا مغربی یورپ اس زمانے میں روم کہلاتا تھا) کے قہقہے اتنے ہی بلند ہوتے جاتے تھے۔ اس نے ایک زور کا تھپڑ بھی عورت کے منہ پر جڑ دیا۔ اس سے یہ ذلت برداشت نہ ہوئی تو وہ بے اختیار پکار اٹھی: اے معتصم! تم کہاں ہو؟ اے ہمارے حکمران! ہماری مدد کون کرے گا؟ مرد اس کی یہ بات سن کر اور بھی گلا پھاڑ کر ہنسا کہ اس بے وقوف عورت کو دیکھو بھلا اس کی خاطر خلیفۂ وقت مدد کو آئے گا؟ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمانوں میں ایک جسم ہونے کا احساس باقی تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کسی ایک کو کوئی مشکل، آفت یا دشمن نے گھیر رکھا ہو اور دوسرا اپنی معمول کی زندگی میں بدستور مصروف رہے۔ اسے اپنے بھائی کی مشکل دور ہونے تک چین نہ آتا تھا۔ بغداد کی مسند خلافت پر معتصم باللہ موجود تھا اور یہ مظلوم عورت اس سے سینکڑوں میل دور رومیوں کے علاقے میں واقع ''عموریہ'' نامی قلعے میں قید تھی۔ معتصم باللہ اپنے آباواجداد جیسا کوئی بہت ہی صاحبِ جلال اور باکمال حکمران نہ تھا مگر اس کی رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا تھا۔ اس زمانے کے عام حکمران بھی غیرت وحمیت میں اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے۔ اسے کسی طرح خبر ہوگئی کہ اس مظلوم عورت نے اس کی غیرت کو جھنجھوڑنے والی صدا لگائی ہے۔ اس پر دن کا سکون اور رات کا آرام حرام ہوگیا۔ اس نے خبر لانے والے سے یہ نہ پوچھا کہ اس قلعہ میں کتنی فوج ہے؟ اس کا سوال یہ تھا کہ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ یہ قلعہ ہے کہاں؟ اس کے بعد اس نے صبح شام جنگی تیاریاں شروع کردیں اور آندھی طوفان کی طرح پہنچ کر اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مسلمانوں کی فوج کا غیظ وغضب اتنا شدید اور ان کے حملے اتنے زوردار تھے کہ قلعے کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ دشمن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا اور جب وہ سنگدل شخص جو قیدی عورت پر ظلم ڈھاتا تھا، گرفتار کرکے معتصم باللہ کے سامنے لایا گیا تو اسے علم ہوا کہ یہ قوم واقعی غیرت مند ہے جو اپنے ایک فرد کے بدلے کے لیے بھی اس طرح بے چین ہوتی ہے جیسے انسان اپنی چھنگلی کی تکلیف پر بھی بے تاب ہوجاتا ہے۔

زیادہ دور کی بات نہیں:

مسلمانوں کی یہ قابلِ فخر عادت آج کل غیر مسلموں نے اپنالی ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی ایک بھی امریکی کو کچھ ہوجائے تو وہائٹ ہاؤس پینٹا گون سے سر جوڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس وقت تک اپنا سب کچھ امریکی شہریوں کے لیے جھونک دیتا ہے جب تک ان کو تحفظ کی چھاؤں میسر نہیں آجاتی۔ اس کے برعکس مسلمان ایک دوسرے پر ٹوٹنے والے مصائب کے پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ بھی معمول کے واقعے کی طرح سنتے ہیں اور پھر اپنے کاموں میں مگن ہوجاتے ہیں۔ کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے، کچھ عرصہ قبل بھی یہ عالم تھا کہ اگر کسی مسلمان ملک پر حملہ ہوتا تو عالم اسلام میں دکھ اور فکر کی لہر دوڑ جاتی۔ خوشی کی تقریبات موقوف کردی جاتیں اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے لیے حسب توفیق امداد اور تعاون کی ممکنہ صورتوں پر غور اور عمل کیا جاتا، مگر جب سے

مغربی میڈیا نے غیر مسلم ثقافت کا زہر مسلمانوں کے دل و دماغ میں انڈیل کر انہیں نفس پرستی کا عادی عیش و عشرت کا دلدادہ اور بھوک و جنس کا غلام بنادیا ہے اس کے بعد ان کی بلا سے کہیں کچھ بھی ہوتا رہے، وہ دنیا پرستی کی دھن میں غرق رہتے ہیں۔

شاید......شاید......

فلسطین کی بیٹیوں نے جب دیکھا کہ کوئی حجاج یا معتصم نہیں رہا جو ان کی چیخوں کو اپنے جگر گوشوں کی پکار کی طرح سنے اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ آج کے جدید تعلیم یافتہ حکمران ان کی دلدوز صداؤں پر اتنی توجہ بھی نہ دیں گے جتنی وہ صبح صبح اپنے چہرے کی کھدائی لپائی اور اپنے لباس کے کلف اور کریز پر دیتے ہیں، تو انہوں نے ان سنگدل روشن خیالوں کو پکارنے کے بجائے خود میدان عمل میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ تا دمِ تحریر فلسطین کی تین تعلیم یافتہ اور اونچے خاندانوں کی بچیاں اپنے جسم سے بم باندھ کر دشمن کے لیے قہر بن کر نازل ہو چکی ہیں اور انہوں نے اپنے جسم کے بکھرے ٹکڑوں اور خون کی پھوٹتی چھینٹوں کے ذریعے امت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاید ان معصوم بچیوں کی قربانی دیکھ کر کوئی مسلم نوجوان دنیا کے جھمیلوں سے پیچھا چھڑا کر خود کو مظلوم مسلمانوں کے لیے وقف کر دے۔ شاید کسی کے دل میں غیرت کی کوئی چنگاری شعلہ پکڑ لے۔ شاید......شاید......

بغیر پیندے کے لوٹے:

غضب ہے کہ اسرائیل کے درندہ صفت اقدامات کے باعث جاپان میں مظاہرے اور فرانس میں یہودی املاک پر حملے شروع ہو گئے ہیں لیکن مسلمان ممالک فلسطینیوں کی بے پناہ مظلومیت کے باوجود ان کی مدد سے گریزاں ہیں۔ بزدلی اور منافقت کی انتہا دیکھیے کہ لبنان میں عرب ممالک اور کوالالمپور میں تمام مسلم ممالک جمع ہوئے لیکن خود کچھ کرنے کے بجائے اقوام متحدہ سے مطالبہ کرتے رہے کہ اس نے جس بھیڑیئے کو کھلا چھوڑ رکھا ہے اسے لگام دے تاکہ زخمی فلسطینیوں کی چیخ و پکار سے ان عزت مآب حکمرانوں کے آرام و سکون میں خلل نہ پڑے۔ عالم اسلام کے نمائندہ ان بہادر حکمرانوں سے نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہودیوں کا معاشی بائیکاٹ کریں، نہ وہ اتنی جرأت کرتے ہیں کہ تیل کا ہتھیار استعمال کر کے یہودیوں کے سرپرستوں کی عاجزانہ جی حضوری کی ذلت کو خیر باد کہہ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ نہ انہوں نے کبھی مل کر یہ سوچا ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کی مدد کے لیے کچھ کریں یا فلسطینی مہاجرین کی کفالت کا ذمہ اٹھالیں۔ غضب خدا کا ایک ارب مسلمانوں کے یہ نمائندے چند لاکھ یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا ان کا مقابلہ کرنے والوں کے کچھ کام بھی نہیں آسکتے؟ اگر موت کے ڈر یا شدت پسندی کے الزامات کے خوف سے فدائی مجاہدین کی حوصلہ افزائی ان کے بس میں نہیں تو کیا مہاجر کیمپوں میں پڑے بے بس مسلمانوں کی سرپرستی یا ہسپتالوں میں زخموں سے بے حال بچوں کی خبر گیری بھی ان کے لیے ممکن نہیں؟ سچ ہے غیرت کے بغیر انسان ایسا ہی ہے جیسے پیندے کے بغیر لوٹا۔ جہاں کہیں پڑا رہے یا جو اسے جہاں لڑھکا دے اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

کاش! آج امت میں عمر بن عبدالعزیز نہ سہی، معتصم باللہ جیسے حکمران ہوتے تو فلسطینی مسلمانوں کو اپنی بے بسی کا احساس یوں نہ ستاتا۔

قدرت کی رسی

جنازے کے چار پائے:

بزرگوں سے سنا تھا کہ باطل مردہ ہے اور اس کی دعوت مردے کو لے جانے والے جنازے کی طرح ہے جو چار پایوں پر چلتا ہے: زن، زر، زمین اور عہدہ ومنصب۔ ان چار چیزوں کی لالچ وطمع دلاکر یا ان کی چمک کے جھانسے میں لاکر باطل لوگوں کو اپنا ہمنوا بناتا یا ان سے کام نکالتا ہے جبکہ حق زندہ اور زندگی بخشنے والا ہے، یہ زندوں کی طرح دعوت اور جہاد کے دو ستونوں پر قائم ہوتا ہے اور جب یہ اپنے حاملین میں اخلاص اور جذبۂ قربانی کی روح پھونک دیتا ہے تو وہ دنیا جہان سے بے نیاز ہوکر اپنا سب کچھ اس کی اشاعت واستحکام کے لیے قربان کردیتے ہیں۔ اس کی دعوت خالص روحانیت کی بنیاد پر پھیلتی ہے، اس میں مادی مفادات کی حرص وہوس دینے دلانے کا قطعی کوئی تصور نہیں۔ یہ تو آیا ہی مادیت زدہ لوگوں کو مفاد پرستی کے دلدل سے نکال کر روحانیت کی رفعتوں سے آشنا کروانے کے لیے ہے، چنانچہ اسے پہلے پہل قبول کرنے والے ''غرباء'' (اجنبی و نامانوس) ہوتے ہیں، یہ آخر میں بھی سمٹ سمٹا کر ''غرباء'' میں آجائے گا اور معاشرے میں اجنبی ونامانوس سمجھے جانے والے یہ بلند بخت وخوش نصیب غربا ہی وہ مقبولان بارگاہِ الٰہی ہیں جن کا بابرکت وجود امرا کو ان کی تمام تر عملی غلاظتوں اور فکری کثافتوں کے باوجود تباہی سے بچانے کا سبب ہے، ورنہ ان دنیا پرستوں کی حرکتوں اور کرتوتوں سے تو کرۂ ارض اس قابل نہیں رہا کہ اس پر کسی انسان یا حیوان کی زندگی کا نام ونشان باقی رہ سکے۔

کیا یہ روحانیت ہے؟:

عیسائیت کی تبلیغ کے طریقہ کار کا جائزہ لیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ پادریوں، بشپوں اور کارڈینلوں نے اس کے لیے جو طرز اپنایا ہے وہ ان کے باطل پر ہونے کے بجائے خود ایک بدنما دلیل ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آدمی بزعم خود بلائے تو آسمانی ہدایت کی طرف اور ذریعہ بیچ میں خوراک کے پیکٹوں، دواؤں کے بلوں یا صنف نازک کی خوشامدانہ مسکراہٹوں کو بنائے۔ مسیحی مبلغین دنیاداری کو بیچ میں ڈالنے کے بجائے اگر روحانی قدروں کو اپنی دعوت کی بنیاد بنائیں تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ وہ آسمانی تعلیمات کی رفعتوں کو حرص وہوس کی پستیوں سے آلودہ نہیں ہونے دیتے مگر مری میں لگائے جانے والے سمر کیمپوں سے لے کر تربت ومکران کے ''فلاح خواتین'' اداروں تک انہوں نے عیسائیت کے پرچار کے جو طریقے اپنا رکھے ہیں وہ کسی آسمانی مذہب کے پیروکار ہونے کے مدعیوں کو زیب نہیں دیتے اور جس طرح وہ کراچی کے مشنری اسکولوں سے لے کر پشاور اور ٹیکسلا کے اسپتالوں تک مبہم اور مشتبہ ناموں والے کتابچوں اور فرضی پتوں کے ذریعے کام کرتے ہیں، یہ روح کی گہرائیوں میں حق کے اترنے کی نہیں، دل کے اندر چھپے چور کی نشانی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پوپ پال نے کہا تھا کہ اگلی صدی عیسائیت کی صدی ہے۔ ان کے اس دعوے کے پیچھے وہ اعتماد کارفرما تھا جو ان کو دنیا بھر میں پھیلے اپنے رفاہی اور تعلیمی اداروں اور نام ولبادہ بدل کر

کام کرنے والی عیسائی مشنریوں پر ہے۔اس دعویٰ سے جہاں اس جال کی وسعت معلوم ہوتی ہے جو عیسائی رضا کار پوری دنیا پر تاننے میں مصروف ہیں، وہاں اہل حق کو دعوت و جہاد اور اخلاص و قربانی والے اس راستے پر آنے کی دعوت بھی ملتی ہے جس پر انہیں آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے۔

روئی کا بانس:

عراق پر حملے سے متعلق قرارداد پر نیٹو ممالک کے وزرائے خارجہ نے امریکا کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے لیکن امریکا و برطانیہ اس قدر بے تاب و بے چین ہیں کہ روم، قاہرہ، بیروت اور ڈھاکا جیسے بین الاقوامی شہروں میں زبردست احتجاجی مظاہروں اور مخالفانہ نعروں کے باوجود (اٹلی میں تو برطانوی سفارت خانے کا محاصرہ بھی کیا گیا) امریکی وزیر خارجہ خلیجی ممالک کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بحرین روانہ ہو گئے ہیں یعنی چشم فلک یہ دردانگیز اور حسرتناک تماشا بھی دیکھ رہی ہے کہ کفار ممالک مسلم کشی پر صاد نہیں کر رہے مگر دین کا مرکز سمجھے جانے والے مسلم ممالک سے اس برادر کشی پر حمایت حاصل کی جائے گی۔فرانس اور روس جیسے خونخوار ممالک (اگرچہ روس کی نظریں عراق کے تیل پر ہیں) ہتھیاروں کے معاینہ کاروں کی واپسی پر زور دے رہے ہیں مگر امریکا اقوام متحدہ پر دباؤ ڈال کر ان کی واپسی کو مؤخر کروا رہا ہے تا کہ خلیج کے ذخائر تک اس کی رسائی ممکن ہو سکے۔کہاں ہیں کشمیری اور فلسطینی مجاہدین پر مذاکرات کا زور دینے والے؟ کیا طاقت کا یہ ابلیسی رقص دیکھ لینے کے بعد بھی وہ مذاکرات کے ڈھکوسلوں کو جذبۂ جہاد کے سرد کرنے کے لیے روئی کے بانس پر چڑھاتے رہیں گے؟

دیمک زدہ نسل:

بھارت ''دہشت گردی، دہشت گردی'' کی تان اونچی اڑاتا تھا۔امریکا و برطانیہ جیسے ہمارے ممنون احسان (مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور تحریک بیداری سے سہمے ہوئے مغرب کو القاعدہ و طالبان سے نجات دلانے سے بڑا احسان ان بے مروت گوروں پر اور کیا ہو سکتا ہے؟) بھی اس کی لے میں لے ملا کر ''دراندازی، دراندازی'' کا منتر کورس میں گاتے تھے۔اس مرتبہ مجاہدین پابندِ سلاسل تھے، سرحدوں پر اسرائیل کے فراہم کردہ رڈار نصب تھے، امریکا و برطانیہ کی کانی آنکھ افغانستان پر لیکن بھینگی آنکھ کنٹرول لائن پر تھی، اس کے باوجود مقبوضہ کشمیر کے حالیہ انتخابات کے مختلف مرحلوں نے بھارت کو جس طرح رسوا کیا ہے اتنا خوار تو مراثیوں کی گلی کا کتا بھی نہیں ہوتا۔اب وطن عزیز میں بھی الیکشن ہو رہا ہے لیکن اس مرتبہ اس کی نوعیت بیوہ سہاگن کی بالجبر رخصتی کی سی ہے اور یار لوگ اسے ''الیکشن'' کے بجائے ''سلیکشن'' کہنے پر مصر ہیں۔ان کا اصرار ہے کہ جاگیرداروں، وڈیروں، نوابوں اور سرداروں کی دیمک زدہ نسل کو نئے قواعد و ضوابط کی کچرا کنڈی میں پھینکنے کے بعد انہی کی کمپیوٹرائزڈ نسل کی جو پنیری لگائی گئی ہے وہ جب بااختیار کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے موروثی تجربے میں جدت کی آمیزش سے گل کھلائے گی تو اس کی مہک سونگھنے والی ہو گی۔

رسّی کی درازی:

ان حضرات کے اندیشے کچھ اتنے بے جا بھی نہیں لیکن ہمیں تو رہ رہ کر بھورے بھائی (ہمارے ایک ملنگ صفت دوست) کی وہ بات یاد آتی اور سہما سہما کر ڈراتی ہے جو انہوں نے ترنگ میں آ کر کہی کہ قیامِ پاکستان کے بعد روز اول سے اہل پاکستان

نے آج تک تقریباً وہ سارے کام کیے جو زمانے میں پنپنے کے نہیں ہوتے مگر رب تعالیٰ نے پھر بھی ان کا پردہ رکھا۔ اب انہوں نے اس پردے کو چاک کرنے والے جو کرتوت شروع کر رکھے ہیں اس کو دیکھ کر آسمان بھی پھٹ پڑنے کو تیار لگتا ہے۔ کسی کو آسمان سے اترتے غضب کے بادل دکھائی نہ دیتے ہوں تو سہراب گوٹھ کے مردہ خانے میں رکھی عرب شہزادوں کی لاشوں سے آنے والی فریاد سن لے، یقین آ جائے گا کہ قدرت کی رسّی دوسری قوموں کے لیے جتنی دراز ہوتی ہے اس سے کچھ زیادہ ڈھیل ہمیں دی جا چکی ہے اور اب کوئی انہونی نہ ہو تو اس کا کھینچا جانا ناگزیر ہو گیا ہے۔

آہوں کی شنوائی

ٹرانسپورٹ ادب سے ایک شعر:

ادب کی کئی اصناف ہیں۔ ان میں سے ایک صنف جس نے ہمارے ہاں بہت ترقی کی ہے اور اس کی رنگارنگی اور روز افزوں اضافے کے سبب یہ بہت دلچسپ مانی جاتی ہے "ٹرانسپورٹ ادب" ہے جو گاڑیوں کی اگاڑی اور پچھاڑی میں جنم لیتا ہے، دھوئیں کے مرغولوں اور ہارن کے شور میں پنپتا ہے اور پینٹروں کی دوکان پر بیٹھنے والے منشیوں کی طبع رساں کی ترجمانی کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے بہت ترقی کی ہے اور جس طرح غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی اور آزاد نظم کا اپنا اپنا اسلوب، خصوصیات اور مخصوص میدان ہوتا ہے اسی طرح رکشہ، ٹیکسی، بس، منی بس، ٹرک اور ٹرالروں کے لیے ان کی مناسبت سے اشعار، قافیہ دار جملے، اور چبھتے ہوئے طنزیہ چٹکلے موزوں کیے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں رکشہ (یہ تین ٹانگی سواری ہماری بے ڈھنگی ثقافت کا طرح دار نمونہ ہے کہ دو سواریوں کو اُٹھانے کے لیے اتنی صدائی آلودگی پیدا کرتی ہے جتنی ستاروں سے اگلے جہاں تک جانے والی خلائی گاڑیاں بھی نہیں کرتیں لیکن مجال ہے کہ کوئی اس عذابِ بے سبب سے کراچی کے رعشہ زدہ شہریوں کی گلوخلاصی کرائے) کے پیچھے یہ شعر اکثر لکھا ہوا پڑھنے کو ملتا تھا۔

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

کبھی کبھی پھولے کی چاٹ یا بارہ مسالے والی حلیم کی ریڑھی پر اس شعر کا اندارج دیکھ کر اس کے معنی کی وسعت اور گہرائی کا احساس ہوتا تھا، اگرچہ ہم کبھی اس وسعت کا اندازہ کر سکے نہ یہ گہرائی ہمارے ناپنے میں آئی۔ یہ شعر رفتہ رفتہ ذہن سے محو ہو گیا تھا لیکن دینی سیاسی جماعتوں کی شاندار کامیابی کی اطلاعات نے اسے حافظے کی تختی پر پھر سے نمایاں کر دیا۔ یار لوگوں نے انتخابات کی بساط کس لیے بچھائی تھی اور نتیجہ کیا نکل آیا؟ اللہ تعالیٰ نے بے بس مسلمانوں کی آہیں سن لیں، ان کی مظلومیت پر کڑھنے والوں کو عزت بخشی اور ان کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اپنی بصیرت وفراست سے کام لے کر اسلامیان پاکستان کی دلی آرزؤوں کو پورا کریں اور اس ملک کو اسلامی فلاحی ریاست کا قابل فخر نمونہ بنائیں۔

مسلمان بھی ایسی روایت قائم کریں:

سویڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہوم کے وسط میں ایک سمندری خلیج کے سامنے اسٹاک ہوم کے سٹی ہال کا فلک بوس ٹاور واقع ہے جو نوبل ٹاور بھی کہلاتا ہے۔ دنیا کا مشہور نوبل انعام اسی جگہ دیا جاتا ہے۔ الفریڈ برنارڈ نوبیل دراصل اسٹاک ہوم کا سائنس دان تھا جس نے ڈائنامائٹ ایجاد کیا۔ اس نے کیمسٹری اور انجینئرنگ میں کمال حاصل کیا تھا اور اس کے ذریعے بہت دولت کمائی۔ بالآخر اس نے اپنے انتقال (1896ء) سے پہلے اس دولت سے ایک ٹرسٹ قائم کر کے یہ وصیت کر دی تھی کہ ہر سال کسی ایسے شخص کو اس ٹرسٹ سے عالمی انعام دیا جائے جس نے سائنس، ادب اور معاشیات میں یا قیام امن کے لیے کوئی

نمایاں خدمت عالمی سطح پر انجام دی ہو۔ چنانچہ ہر سال نوبل پرائز کے نام سے چھ انعامات چھ افراد کو دیئے جاتے ہیں جن کا فیصلہ تین سویڈن کے ادارے اور ایک ناروے کا ادارہ مل کر کرتے ہیں۔ یہ انعامات ہر سال 10 دسمبر کو (جو نوبل کی تاریخ وفات ہے) اسٹاک ہوم کے اسی سٹی ہال میں دیئے جاتے ہیں۔ یہ لوگ انعام کے مستحق کا چناؤ بہت غور وخوض سے کرتے ہیں، لیکن یہ الگ بات ہے کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ ایسے امیدوار کے حق میں جاتا ہے جو اس اعزاز کی حیثیت اندھے کی بانٹی ہوئی ریوڑیوں جیسی کر دیتا ہے۔ شاید اس میں بہت کچھ دخل سود کی اس غلاظت کا ہے جس پر اس یک چشم انعام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس مرتبہ امن کے نوبل انعام کے لیے امیدوار یادش بخیر......... حامد کرزئی صاحب بھی تھے لیکن تا حال ان کی خدمات اس درجہ معیاری نہیں ہوسکیں کہ سود کے اس جوہڑ سے چند جرعے کو ان کو مل سکتے لہٰذا ان کو اپنے کارناموں کا گراف بڑھانے کی ہدایت کے ساتھ یہ انعام امریکا کے ایک سابق صدر کو دے دیا گیا ہے۔ جی ہاں! وہی امریکا جس کی ستم گریوں سے کرۂ ارض کا چپہ چپہ گریہ وفریاد کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کی دہائی دے رہا ہے اسی امریکا کے سابق صدر کو امن عالم کے لیے انجام دی گئیں قابلِ قدر خدمات کی بنا پر عالمی اعزاز سے نواز دیا گیا ہے اور ویتنام سے لے کر صومالیہ تک کے مظلوم سسکتے تڑپتے رہ گئے۔ سچ ہے طاقت اندھی بہری ہوتی ہے۔ اس سے انصاف و دیانت کی امید رکھنا فضول ہے۔ مسلمان اہل خیر حضرات کو اس طرح کا انعام عالمی سطح پر خود شروع کرنا چاہیے ورنہ دنیائے کفران کی پسماندگی کا یونہی مذاق اڑاتا رہے گا۔

تیل کی راہ گزر پر:

دنیا میں تیل کی حمل ونقل کے جتنے بھی بحری راستے ہیں، ان میں سے کچھ کا تو منبع ہی اسلامی دنیا ہے اور گذرگاہ تو سب کی ہی اسلامی ممالک کے ساحلوں اور ان کی سمندری حدود سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ تیل کے فوارے ابلنے والی زمین کا مسلمانوں کو مالک بنایا تھا بلکہ دنیا کی وہ نبضیں بھی ان کے ہاتھ میں دی تھیں جن کی حرکت پر موجودہ دور کے انسانوں کی زندگی کا مدار ہے۔ وہ حیوان نما انسان جو مسلمانوں کی سانس گھوٹ دینا چاہتے ہیں، ان کی اپنی شہہ رگ مسلمانوں کے انگوٹھے تلے رکھ دی گئی تھی، مگر مسلمانوں نے کبھی اِس داؤ کا استعمال ہی نہ سیکھا جس کے بعد کسی داؤ کی ضرورت نہ رہتی تھی۔ اگر یہ اس طاقت کا درست استعمال کرتے تو نہ کسی ہوائی اڈے سے کوئی بمبار ان پر موت برسانے اُڑتا، نہ کوئی بحری بیڑہ ان کے شہروں پر زاویہ درست کر کے بارود بھرے پائپ پھینکنے کی مشق کرتا، نہ ان کے نوٹوں پر کمائے گئے سود سے ان کو قرضے دے کر ان کی آزادی اور خود مختاری گروی رکھی جاتی۔ افسوس کے اسلام کے نام لیواؤں کے پاس سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے اور صلیب کے پجاری اپنے برف سے ڈھکے ہوئے ملکوں کی بے جان مٹی کو بھی سونا بنا کر اس کرۂ ارض کے حکمران بنے ہوئے ہیں۔ آخرت جن چیزوں سے بنتی ہے ان پر ہم نے بدعملی کی چادر تان رکھی ہے اور دنیا میں جن اصولوں کے تحت ترقی و کامرانی ملتی ہے ان سے دست کشی اور کام چوری کی عادت ہم میں راسخ ہو چکی ہے۔ کیا دین و دنیا سے یوں بے خبر رہ کر ہم اس عالم اسباب کو فتح کرنا چاہتے ہیں؟ اے مسبب الاسباب! ہمارے راہنماؤں کو حکمت و بصیرت اور ہمارے عوام کو صدق واخلاص کی دولت عطا کر کہ اس کے بغیر ہمیشہ اس وقت کمند ٹوٹ جاتی ہے جب دو چار ہاتھ لبِ بام رہ جاتا ہے۔

شہباز سے ممولے تک

رحم دل بڑھیا، زخمی پرندہ:

اس بڑھیا کا قصہ تو آپ نے ضرور سنا ہوگا جس کی جھونپڑی کے قریب ایک شہباز زخمی ہو کر اُتر آیا تھا۔ بڑھیا بڑی رحم دل اور سمجھ دار تھی۔ اسے اس زخمی پرندے پر بڑا رحم آیا۔ اس نے اس کی خوب خدمت کی۔ اسے اس کے زخموں سے زیادہ اس کے بڑھے ہوئے پنجوں اور باہر کو مڑ کر نکلی ہوئی چونچ کا غم رہتا تھا۔ وہ نہایت دل سوزی سے یہ سوچتی تھی کہ مصیبت کے مارے اس پرندے کو نہ جانے کب سے اپنی تراش خراش کا موقع نہیں ملا، اس کا جذبۂ خیر خواہی اسے مجبور کرتا تھا کہ وہ اس عاجز کو اس کے بے ڈھنگے پنجوں اور بدنما چونچ سے نجات دلائے۔ بالآخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا اور اس نے بے زبان پرندے سے اپنی شفقت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس کو اس اضافی بوجھ سے فارغ کر دیا۔ چند لمحوں کی بات تھی، اونچی فضاؤں میں اُڑنے اور اپنے زورِ بازو سے رزق حاصل کرنے والا پرندہ زمین کی پستیوں کا اسیر بن کر رہ گیا اور اس کی بقیہ زندگی مولوں کی طرح گذری۔ امریکا کو بھی جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن کی فکر دامن گیر رہتی ہے اور وہ ہمدردی کے مارے پاکستان کے ایٹمی پنجوں اور عراق کی کیمیاوی چونچ کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے۔ اس کی خیر خواہانہ آرزو اور ہمدردانہ تمنا ہے کہ یہ دونوں ممالک اپنے اس تکلیف دہ بوجھ کو کم کر لیں اور بڑھیا کے ہاتھ چڑھے شہباز کی طرح بٹیر بن کر بے ضرر ہو جائیں۔ جبکہ دوسری طرف نہ صرف یہ کہ وہ ایٹم بم کو استعمال کرنے والا دنیا کا واحد ملک ہے بلکہ اس نے اسرائیل جیسے دہشت گرد ملک کو بھی اس ہتھیار سے مسلح کر رکھا ہے۔ اب مغربی ممالک اس جن کو اپنی بوتل میں بند دیکھنا چاہتے ہیں اور کسی مسلمان ملک کے پاس اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتے اگرچہ وہ لاکھ یقین دہانیاں کرائے کہ یہ پروگرام دفاعی مقاصد کے لیے ہے یا اس کے پاس سرے سے ایسی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔

کیا یہ کرامت نہیں:

پچھلے دنوں صدر افغانستان ''عزت مآب'' جناب کرزئی صاحب نے ملک پر اپنے کنٹرول اور انتظامی اداروں پر اپنی مضبوط گرفت کے زعم میں افغانستان میں افیون کی کاشت پر ''مکمل'' پابندی عائد کرتے ہوئے اس شغل کے مرتکب کو ''سخت سزا'' اور جرمانے کا اعلان کیا تھا مگر اس کے چند روز بعد ہی ایسی خبر آئی ہے جس نے درویش صفت طالبان کی کرامت کو ظاہر کر دیا ہے۔ کرزئی صاحب کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی متحدہ فوج کی مدد حاصل ہے اور یہ ممالک افغانستان سے براستہ ایران و ترکی، یورپ تک منشیات کی ترسیل کے خوف سے سہمے رہتے ہیں اور ہر قیمت پر اس چمکتے سفید سفوف کی سپلائی پر پابندی لگانا چاہتے ہیں جو ان کی آزاد مزاج نسل کے سفید خون کو سڑا کر سیاہ کالا کر رہا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ ان ممالک کے کاشت کاروں کو ہر طرح کی ترغیبات اور متبادل فصل کے لیے ہزاروں ڈالر دیتے ہیں لیکن اب افغانستان میں ان کی براہِ راست عسکری موجودگی کے باوجود کرزئی صاحب کے اس اعلان کا نتیجہ کس

حد تک مثبت شکل میں ظاہر ہوا ہے اس کا نتیجہ شمالی افغانستان کے شہر امام صاحب سے آنے والی اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے جہاں کرزئی صاحب کے حامیوں کی حکومت ہے اور وہاں ہیروئن تیار کرنے کی لیبارٹری عبوری حکومت کے اقتدار کو چیلنج کرتے ہوئے شب و روز اپنی ''انسانیت دوست'' سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس لیبارٹری کی یومیہ پیداواری صلاحیت 75 پونڈ ہے جبکہ پورے افغانستان میں اس طرح کی سات سو سے زائد چھوٹی بڑی لیبارٹریوں کا انکشاف ہوا ہے۔ کہاں بے سروسامان فقیر خدا طالبان کا ایک حکم اور کہاں متحدہ افواج کی سرپرستی میں کرزئی صاحب کا زوروشور سے جاری کیے جانے والا شاہی فرمان؟ مگر نتائج میں صفر اور سو کا فرق بتا رہا ہے کہ طالبان جسموں پر نہیں دِلوں پر حکومت کرتے تھے اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی کرامتیں اور برکات اس دور میں بھی کھلی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں بشرطیکہ ضد اور تعصب نے انسان کو اندھاپے کے مرض میں مبتلا نہ کر دیا ہو۔

چھلنی ہوتا دل:

گوانتاناموبے کیوبا میں امریکا کی ملٹری پولیس کے سربراہ کو تفتیش میں مداخلت کا الزام لگا کر ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ رک بیکوس کو تفتیش کاروں کی زیرحراست قیدیوں پر بدسلوکی پر اعتراض تھا۔ مصدقہ ذرائع کے مطابق بریگیڈیئر رک بیکوس کئی مرتبہ اعلیٰ افسروں سے الجھے تھے۔ بیکوس کو شکایت تھی کہ تفتیش کار زیرحراست قیدیوں سے نامناسب اور سخت سلوک کرتے ہیں۔ اس سے قبل عراق کے ہتھیاروں کے معاینے کے لیے جانے والی ٹیم میں شامل ایک اعلیٰ امریکی عہدیدار نے بھی اپنی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفا دے دیا تھا، اس سے امریکا کے دماغ پر سوار مسلم دشمنی، انسانیت کی بے احترامی اور خونخواری کی زیادتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوبا میں زیرحراست قیدیوں سے کئی ماہ کی اذیت ناک تفتیش کے باوجود تاحال ان میں سے نہ کوئی اہم انکشاف ہوا ہے نہ ان قابل رحم اور بے بس انسانوں کا امریکا پر حملوں سے کوئی براہِ راست تعلق ثابت ہو سکا ہے مگر انسانی تہذیب کے عروج پر فائز ہونے کے دعویداروں کی طرف سے اخلاقی قدروں کی پاسداری ملاحظہ کیجیے کہ اسے اتنا بھی برداشت نہیں کہ ان مظلوم انسانوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جانے کے بعد کے وہ امریکا کے خلاف حملوں میں ملوث نہیں، ان سے کم از کم وہ سختی ہٹالی جائے جس نے شیطان کے جذبۂ انتقام کو بھی شرما دیا ہے۔ ان لوگوں کا تاحال زیادہ سے زیادہ جرم یہ ثابت ہوا ہے کہ انہوں نے خود پر ہونے والے امریکی حملوں کا دفاع کیا، کیا انسانی حقوق کا راگ الاپنے والے کمزور مغربی ممالک انسانوں کو وہ حق دینے پر یا اسے معاف کرنے پر بھی تیار نہیں جو دنیا کی حقیر ترین مخلوق چیونٹی کو بھی حاصل ہوتا ہے؟؟؟ اے خدا! تیری یہ دنیا ظلم و زیادتی سے اتنا بھر چکی ہے کہ اب تو ظالموں کی رسی کھینچ ہی لے، ان کی حیوانی حرکتوں نے تیرے نام پر فدا ہونے والوں کا دل چھلنی کر چھوڑا ہے۔

پتھر کی لکیر

خودساختہ اسٹیج:

جب ہم چھوٹے سے تھے اور ''الف جبر آ'' جیسے ہجے کر کے قرآن شریف پڑھتے تھے تو ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہمارے مدرسے میں ایک خطیب صاحب تشریف لائے۔ ہم سب ...... تقریر سننے کے شوق میں کم اور سبق سے چھٹی ملنے اور جلسہ دیکھنے کی خوشی میں زیادہ ...... ان کی تقریر سننے کے لیے پنڈال میں جمع ہو گئے۔ اب کچھ یاد نہیں کہ ان کا خطاب کا موضوع کیا تھا مگر ان کا اندازِ خطابت ایسا پرکشش اور دل موہ لینے والا تھا کہ دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا۔ ہم جب واپس آئے تو ہم میں سے ایک بچے نے کچھ تکیے، گدے، اور دریاں جمع کر کے ''اسٹیج'' بنایا اور ہم سب کو خاموش رہنے کا کہہ کر خطیب صاحب کے انداز میں تقریر شروع کی۔ ہمارے اس ہم سبق کا خیال تھا کہ خطیب صاحب تقریر کے دوران جو ہاتھ ہلاتے تھے یا اپنے الفاظ کی مناسبت سے چہرے کے تاثرات میں جو تبدیلی لاتے تھے، تقریر اسی کا نام ہے، لہٰذا وہ ''خودساختہ'' اسٹیج پر چڑھ کر اس وقت تک اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے ''دوستو بزرگو! یہ دیکھیے، محترم سامعین! یہ دیکھیے'' کی گردان کرتے ہوئے اس وقت تک ''تقریر'' کرتا رہتا جب تک جب تک ہم اس کا اسٹیج گرا کر اس کا ''جلسہ'' درہم برہم نہ کر دیتے۔

آگ بھری خلیج:

آج جب یہ اطلاع سنی کہ ہمارے ہاں صدر کے پرنسپل سیکرٹری کے عہدہ کو امریکن انداز میں ''چیف آف اسٹاف'' کا نام دے دیا گیا ہے تو یہ ساتھی طالب علم بے طرح یاد آیا جو ''دوستو بزرگو'' کی تکرار اور ہاتھوں کے مختلف زاویے بنانے میں خطابت کا گر پوشیدہ سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں مقرر کی مقبولیت، محبوبیت، شہرت کا راز چند لفظوں کے بار بار دہرانے، چہرے کے بدلتے تاثرات کے ساتھ دائیں بائیں دیکھنے اور ہاتھوں کی حرکات میں مضمر تھا۔ ہم نے بھی من حیث القوم یہ سمجھ لیا ہے کہ گھڑی کی سوئیوں کو آگے پیچھے کرنے سے ہماری قوت کار ''ضرب دو'' ہو جائے گی، ناظموں کی بھرمار سے شہری نظام سدھار اور ترقی کی راہ پر چل پڑے گا، عہدوں کے بارعب نام رکھ لینے سے ہم باکمال لوگوں کی طرح لاجواب کارنامے انجام دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ وہ ظاہر پرستی ہے جس میں مبتلا شخص یا قوم یہ سمجھتی ہے کہ کوّے اور ہنس میں نسل، رنگ، خوبصورتی اور دلربائی کا نہیں، محض چال کا فرق ہے اور چال چلن کی نقل انہیں لمحے بھر میں نفرت اور پسندیدگی، بدحالی اور پسماندگی کی پستیوں سے اٹھا کر محبوبیت و مقبولیت اور ترقی و خوش حالی کی بلندیوں تک پہنچا دے گی۔ ایسے خوش خیالوں کو کون سمجھائے کہ عزت اور ذلت، ناکامی اور کامیابی کے درمیان محنت اور جدوجہد کی آگ و خون بھری خلیج ہے جو صرف خلوص کے ساتھ کام میں لگے رہنے اور جگر کا خون کر کے کچھ کر دکھانے سے پاٹی جا سکتی ہے۔

کوئی محرومی سی محرومی ہے:

مغرب کی ترقی کا راز پینٹ کو اچھی طرح کس لینے، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی عادت بنا لینے یا لباس کو مختصر سے مختصر

کر لینے میں نہیں ہے۔ انہوں نے برسوں دماغ سوزی کی ہے اور خون جلا دینے والی کڑی ریاضت اور جاں گسل محنت سے گزر کر علوم وفنون میں وہ کمال حاصل کیا ہے جس کی بنا پر آج وہ خلاؤں سے آگے دوسرے جہانوں کی جستجو کر رہے ہیں۔ ان کے نظام مملکت کا استحکام دیکھیے کہ 1789ء میں بننے والا دستور بنیادی طور پر آج بھی لاگو ہے اور پچاس ریاستیں ایک وفاق سے وفاداری نبھاتے ہوئے اپنے عوام کی زیادہ سے زیادہ ترقی اور خوشحالی کے لیے کوشاں ہیں جبکہ ہمارے ہاں آئین کا چند برسوں میں ہی حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا اور اب تو قصابانہ اسٹائل میں اس کی جراحی کی جا رہی ہے اور چار صوبے اکٹھے مل کر اور شیر وشکر ہو کر ایک دوسرے کا دست وبازو بننے کو تیار نہیں، کوئی محرومی سی محرومی ہے۔

خزانے کی تلاش:

اس میں شک نہیں کہ باشندگان مغرب خاندانی نظام کی تباہی، قابل احترام انسانی رشتوں اور انسانی فطرت کو حقیقی تسکین دینے والے جذبات سے محرومی، فحاشی، بے راہ روی اور اخلاقی اقدار کی پامالی جیسے سنگین مسائل سے دوچار ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہم میں سے وہاں جانے والے لوگ ان کی زندگی کے دوسرے رخ سے سبق نہیں لیتے کہ وہ لوگ کام میں محنت ودیانت، اجتماعی ذمہ داریوں کی خلوص ولگن سے ادائیگی، معاشرے میں انصاف ورواداری جیسے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہیں اور یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی ہماری شریعت نے ہمیں تاکید کے ساتھ تلقین کی ہے لیکن ہم شریعت کے ان احکامات سے روگردانی کرنے کے ساتھ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مغرب کو ترقی ان غلط کاریوں کی وجہ سے ملی ہے جن میں وہ اپنی شامیں گزارتے ہیں، جبکہ ان کی ترقی کا راز وہ انتھک محنت ہے جس میں ان کا دن کٹتا ہے۔ اس کج فہمی کا لایا ہوا عذاب ہے کہ ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے اور وہ خلاؤں کو مسخر کر کے وہاں موجود کسی ان دیکھے خزانے یا کسی غیر معمولی دریافت کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ علمی وتحقیقی سرگرمیوں سے لے کر ابلاغی پروپیگنڈوں تک اور سیاسی ہتھکنڈوں سے لے کر میدان جنگ تک انہوں نے ہر شعبے کو اپنی جولان گاہ بنایا ہوا ہے اور چونکہ سیاسی وعسکری طاقت کی لگامیں ان کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا وہ انسانیت کے نام پر شیطانیت کو فروغ دیں یا فطری آزادی کے بہانے حیوانیت کا پرچار کریں، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

پچھلے دنوں جب امریکا نے بین البراعظمی میزائل اور اس کو راستے میں تباہ کرنے والے میزائل کا کامیاب تجربہ کیا تو اگلے ہی دن عراق کے پاس موجود اسلحے کا واویلا کرتے ہوئے بیان داغا کہ اگر اقوام متحدہ کے عراق کے خلاف قرارداد منظور نہ کی تو اس کے پاس دوسرے راستے بھی ہیں یعنی خود تو ان کے تیار کردہ موت کے سندیسے ایک براعظم سے دوسرے تک اڑان بھرتے پھریں ان سے کسی کو خطرہ نہیں لیکن عراق کسی تہہ خانہ میں بھی مشکل وقت کے لیے کوئی نسخہ بچا رکھے تو وہ قابل گرفت ہے۔ آکسیجن کو جذب کر کے فضا کو گیس چیمبر بنانے والے بموں سے لے کر اذیت ناک بیماریاں اور دردناک موت پھیلانے والی گیسوں تک کوئی چیز انہوں نے نہیں چھوڑی جس سے اپنے گودام نہ بھر لیے ہوں لیکن پروپیگنڈے کا کمال دیکھیے کہ وہ اس سب کے باوجود بھی امن کے پیامبر ہیں اور مسلمان ان چیزوں سے تہی دست ہو کر بھی دہشت گرد ہیں۔ اہل مغرب کے جانبدارانہ رویے نے دنیا کو فریب اور ظلم وناانصافی سے اس قدر بھر دیا ہے کہ اب یا تو وہ خود اپنی اس دجالی تہذیب کے ہاتھوں خودکشی کریں گے یا پھر مسلم دنیا سے جنم لینے والا کوئی انقلاب ہوا کا رخ پھیر دے گا۔ یہ بات اب پتھر کی لکیر ہے جو ان شاء اللہ ہو کر رہے گی۔

روحیت اور روحانیت

شکتی کی جستجو:

یوں تو وہ ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے لیکن ان کا اصل فن کچھ اور تھا۔ وہ سال میں سردی کے چار مہینے کراچی میں کلینک کرتے تھے اور باقی ایام سوات کے کلینک میں گزارتے تھے جہاں مریضوں کو دیکھنے کے علاوہ کالج میں لیکچر دینا بھی ان کی مصروفیات میں شامل تھا لیکن ان کی سب سے دلچسپ اور پسندیدہ مشغولیت یہ تھی کہ وہ موسم صاف ہونے پر موقع ملتے ہی اپنی خصوصی طور پر تیار کردہ جیپ میں سامان سفر درست کرتے اور شمالی علاقوں کی طرف ہوتے ہوئے چین کی سرحد کی طرف ان دور دراز علاقوں میں نکل جاتے، جہاں بدھ مذہب کے پیروکار رہتے ہیں اور جدید دنیا کی سہولتوں سے ہٹ کٹ کر گیان دھیان اور دیگر ریاضتوں میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی سادہ زندگی، سادہ غذا اور سخت کوشی کی عادت اور ساتھ میں قسما قسم کی جسمانی تپسیا اور دماغی ریاضتوں سے ان میں کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی تھیں جو عام انسانوں میں نہیں ہوتیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر صاحب تقسیمِ برصغیر سے قبل کچھ ہندو یوگیوں کے ساتھ بھی رہے تھے اور انہوں نے ایک بڑی مہان یوگی کے ساتھ ہمالیہ پہاڑ تک پیدل سفر کیا تھا جہاں مختلف غاروں میں یوگی طرح طرح کے آسن جمائے ''شکتی'' کی تلاش میں مصروف تھے۔ ان میں سے بعض کو اس جستجو میں برسہا برس گزر گئے تھے لیکن وہ نامعلوم منزل مبہم سے مبہم تر اور دور سے دور تر ہوتی چلی جاتی تھی جس کی دھن میں وہ اس ویرانے میں کڑی مشقتیں جھیل رہے تھے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب اس وقت نوعمر تھے لیکن انہیں یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ وہ ان لوگوں میں پائی جانے والی بعض غیر معمولی صلاحیتوں کا راز معلوم کریں۔ ہندو یوگیوں کے ساتھ طویل عرصہ گزارنے اور بدھ مت کے لاماؤں کے ساتھ کئی برس کی رفاقت کے بعد انہیں ایک سچے اللہ والے کی صحبت نصیب ہوگئی۔ ان کا کہنا تھا کہ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ چیز جس کی خاطر میں نے عمر کا طویل حصہ اجنبی ماحول میں، اجنبی لوگوں کی خاطر سیوا کرتے اور ان سے کچھ پانے کی جستجو میں کٹھن مشکلات برداشت کرتے ہوئے گزارا وہ تو مجھ سے ایک سچی نیت کے فاصلے پر ہے۔ وہ نروان جس کی تلاش میں غیر مسلم اپنی جان پر ناقابل برداشت تکالیف اور خود ساختہ پابندیاں لگاتے ہیں، وہ تو ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ وہ ماورائی طاقتیں جن کے لیے اپنے آپ کو اذیت میں ڈال کر نفس کشی کے مصنوعی طریقوں سے روحانیت کے بلند مقامات کے حصوں کی تگ و دو کرتے ہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ نے دین فطرت کے آسان اور سادہ اعمال میں رکھ دی ہیں بشرطیکہ ان کو خلوص نیت اور آداب (مسنون طریقے) کی پابندی کے ساتھ کیا جائے۔ مسنون اعمال کے مطابق زندگی گزاری جائے تو نہ اپنے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ قسما قسم کی ریاضتوں کی، تقویٰ اور اتباع سنت کی برکت ایسی قوی التاثیر ہوتی ہے کہ قرب خداوندی کی منزلیں خود بخود طے ہوتی چلی جاتی ہیں۔ باقی جو کچھ انوکھی صلاحیتیں غیر مسلم اپنی خود ساختہ ریاضتوں اور نفس کشی کے عجیب و غریب طریقوں سے حاصل کرتے ہیں اس کی حیثیت وہی ہے جیسے کوئی کشتی سیکھ کر انوکھی پہلوان بن جائے یا

باڈی بلڈنگ کے ذریعے جسم کے پٹھوں کو خوبصورت اور تنومند بنالے۔ جہاں تک روحانیت کی بات ہے تو وہ ان سے اتنی ہی دور ہوتی ہے جتنی وہ خود اسلام سے دور ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مادی اغراض سے بالاتر ہو کر اللہ تعالیٰ کو صرف اس کی رضا کے لیے چاہنا اور پوجنا روحانیت کا وہ مقام ہے جس کو کوئی دوسرا پہنچ ہی نہیں سکتا۔

خوش نصیب لوگ:

مجھے ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ کچھ کچھ سمجھ آتا تھا اور کچھ میں بغیر سمجھے اپنے آپ کو اچھا سامع ثابت کرنے کے لیے سنتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا: آپ کی اتنی سالہ جدوجہد کا حاصل کیا نکلا؟ انہوں نے کہا، بس یہی سمجھ لینا میرے لیے بڑی سعادت ہے کہ "طریقت، شریعت کے تابع ہے۔" عام لوگ اس بات کی حقیقت کو شاید نہ سمجھ سکیں لیکن میں اپنے عملی تجربات کی بنا پر پورے وثوق اور اعتماد سے سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں کے مطابق پورا کرنے اور کرتے رہنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، اگر کسی کو اس کے بغیر کوئی غیر معمولی صلاحیت حاصل ہوگئی ہے تو وہ اس کے لیے نعمت نہیں زحمت ہے۔ وہ روحیت (روح سے متعلقہ صلاحیتوں کا مظاہرہ) تو ہو سکتی ہے روحانیت (اللہ تعالیٰ کا قرب اور سچی محبت) ہرگز نہیں۔ وہ ایسے دھوکے میں ہے جس سے اس کی آنکھ اسی دن کھلے گی جب ظاہری آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ جب بھی ماہ رمضان آتا ہے تو بندہ کو ڈاکٹر صاحب کی یہ باتیں یاد آتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دین کو کیسا کامل مکمل بنایا ہے کہ ویرانوں میں ٹھکانہ بنا کر تپسیا کرنے کی ضرورت ہے نہ اپنے آپ کو جائز چیزوں سے روک کر نفس کشی کی تکلیفیں جھیلنے کی، ہمارے لیے وہ جانی و مالی عبادتیں کافی ہیں جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اور جہاد کی شکل میں اللہ رب العزت نے ہمیں عطا فرمائی ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ادھر ادھر کے چکروں میں پڑنے کے بجائے اللہ کی عبادت اللہ ہی کے لیے کرتے ہیں اور اس میں کسی اور غرض کا کھوٹ شامل نہیں ہونے دیتے۔ ماہ مبارک کا پیغام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے بتائے ہوئے طریقے سے پایا جا سکتا ہے کسی انسان کے اپنے گھڑے ہوئے طریقے سے نہیں۔

لاہوت، لامکان:

انسان جب آسمانی مذہب کے بجائے اپنی عقل کو راہنما بنالیتا ہے تو اس کو کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اس کا کچھ اندازہ سوویت یونین میں اشتراکیت کی ناکامی سے ہوا تھا اور اس کی یاد چین کے صدر کے حالیہ بیان سے تازہ ہوگئی ہے۔ اشتراکیت نے تقریباً چوہتر سال تک دنیا میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم کرنے کے ساتھ جبر و ستم کا طوفان برپا کیے رکھا۔ اس دوران سرمایہ داریت کے ساتھ اس کی فکری سطح پر معرکہ آرائی بھی ہوتی رہی اور سیاسی و عسکری میدان میں بھی دونوں برسرپیکار رہے۔ اشتراکیت چونکہ فطرت سے نسبتاً زیادہ متصادم تھی اس لیے جلد بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہوئی اور اب سرمایہ داریت اپنے انجام کی منتظر ہے اور یہ انقلاب ظاہر ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام کے ذریعے ہی ممکن ہے لیکن ہوگا یہ کس خوش نصیب کے ہاتھوں؟ یہ تاحال پردۂ خفا میں ہے۔ اشتراکیت نے جس منصوبہ بند قومی معیشت کا نظریہ پیش کیا تھا اس میں ذاتی منافع کے محرک کو بالکل کچل دیا گیا تھا نیز بازار کی قوتیں (رسد و طلب) بھی مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں اس واسطے تاجرانہ مہم جوئی ختم ہوگئی تھی اور مزدوروں کی کارکردگی پر بھی بہت منفی اثر پڑا تھا چنانچہ اس غیر فطری جکڑ بندی اور فطرت سے ٹکراؤ کے سبب اشتراکیت

اپنی اولین تجربہ گاہ میں بھی اس بری طرح ناکام ہوئی کہ صدر یلسن کو کہنا پڑا'' کاش! اشتراکیت کے یوٹوپین نظریہ کا تجربہ روس کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے قصبے میں کرلیا گیا ہوتا تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لیے 74 سال نہ لگتے۔''
یوٹوپیا (UTOPIA) یونانی زبان کا لفظ ہے اس کے معنیٰ ''لامکان'' کے ہیں اور اس سے مراد ایسی خیالی ریاست ہے جہاں کا ہر باشندہ ضرورت کی ہر چیز بلا معاوضہ حاصل کرلیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے اس لیے یہ لفظ خیالی جنت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور جو شخص خیالی منصوبے بنائے اسے ''یوٹوپین'' کہتے ہیں۔

اشتراکیت اور اشتمالیت:

ایک زمانہ تھا کہ اشتراکیت کا بہت چرچا تھا جسے دیکھو سرخ رضا کار بننے کی فکر میں مست اور کامریڈ کہلانے کا شوقین نظر آتا تھا۔ جو شخص نیشنلائزیشن، اشتراکیت (کمیونزم) یا اشتمالیت (سوشلزم، اشتراکیت کی منزل مقصود، ایسا نظام جس کے نافذ ہونے کے بعد ہر چیز پوری قوم کی مشترکہ ملکیت ہوگی اور ہر خواہش بلا قیمت پوری ہوگی) کے خلاف بولتا وہ رجعت پسند یا سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہلاتا تھا لیکن اب یہ سحر ٹوٹ چکا ہے اور چین کے صدر نے چینی کمیونسٹ پارٹی کے سالانہ اجلاس میں ملک بھر سے آئے ہوئے مندوبین کے سامنے کہا ہے: ''ہمیں بازار کی قوتوں سے کام لینا اور جدید نظریات سے استفادہ کرنا ہوگا۔''
یہ دبے لفظوں میں اس جابرانہ نظام کی ناکامی کا اقرار ہے جسے نافذ کرنے کی کوشش میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی جان لے لی گئی تھی۔ اشتراکیت کی اس عبرتناک شکست پر سرمایہ دارانہ نظام کے حامی سامراجی ایجنٹوں نے بہت بغلیں بجائی ہیں۔ ان کے خیال میں اب ثابت ہوگیا ہے کہ قابل عمل نظام صرف سرمایہ داریت ہے حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جن مکروہ خامیوں کی بدولت اشتراکیت ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی جب تک وہ باقی ہیں تب تک اشتراکیت کی ناکامی پر یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ کمیونزم اور سوشلزم سرمایہ داریت کا متبادل نہیں لیکن سرمایہ داریت کے کسی متبادل کی ضرورت نہیں، یہ کہنا صرف جہالت ہی نہیں حماقت بھی ہوگا۔ سرمایہ داریت کے خون آشام نظام کا حقیقی متبادل اسلامی نظام ہے۔ سود، جوئے اور ارتکاز دولت سے پاک عادلانہ اور منصفانہ معاشی نظام جو انسانیت کو سامراجیت کے پنجے سے چھڑا سکتا ہے۔ کاش اس نظام کے حاملین اور داعیان کرام عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس کی اعلیٰ تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔

ایک آنکھ والا تکون

خسارے کا سودا:

یورپی یونین میں شمولیت کے لیے ترکی کی درخواست ایک بار پھر مزید ایک سال کے لیے التوا میں ڈال دی گئی ہے۔ ترکی گزشتہ 15 سال سے اس مقصد کے لیے کوشاں ہے لیکن یہ گوہرِ مقصود جس کے لیے اس نے بہت کچھ تج دیا ہے اسے حاصل ہوکر نہیں دے رہا۔ اس مسلمان ملک نے گزشتہ 50 برس سے نیٹو کے ممبر کی حیثیت سے مغرب کے مفادات کے لیے متعدد قربانیاں دیں، امریکا اور یورپ نے اسے سرد جنگ کے دوران روس کے خلاف فرنٹ لائن اسٹیٹ کے طور پر استعمال کیا، اس کی فوجی طاقت مسلسل مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال ہوتی رہی جس سے اس کی معیشت کا تیا پانچا ہوگیا، افراطِ زر بڑھنے سے ترکی سکّے کی قدر اتنی خوفناک حد تک گر گئی اور آج تک گری ہوئی ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہ تو دنیوی نقصان تھا جس کا ازالہ اگر ترکی کوشش کرے تو ہوسکتا ہے لیکن مغرب کے ساتھ جڑے رہنے اور پسماندہ کالے ایشیا کے بجائے ترقی یافتہ گورے یورپ کا حصہ بننے کے لیے (بلکہ یوں کہیے کہ بدحال مسلمانوں سے ناتا توڑ کر خوشحال و معزز عیسائیوں کے برابر تسلیم کیے جانے کے لیے) اس نے خسارے کا ایسا سودا کیا جس کی تلافی بہت مشکل ہے۔ 600 سال تک دنیائے اسلام کا مرکز بنے رہنے اور 98 فیصد مسلم آبادی والے ملک کو صہیونی گماشتے کمال پاشا نے (جسے بابائے قوم کا لقب دلوایا گیا) سیکولر ملک قرار دے کر فوج کو سیکولرازم پر مبنی آئین اور اقدار کا محافظ ٹھہرا دیا، چنانچہ گزشتہ نصف صدی میں اسلامی ذہن رکھنے والی سیاسی جماعتوں کی سیاسی اور دنیا میں مروج جمہوری طریقوں کے مطابق قانونی جدوجہد کو آئین سے متصادم قرار دے کر مسلسل غیر قانونی ٹھہرایا جاتا رہا۔ مغرب کی خوشنودی کی خاطر اسلامی شعائر اور اقدار کے ساتھ مسلمان کہلانے والے حکمرانوں نے ایسا سلوک کیا کہ کٹر اسلام دشمن ممالک میں بھی ایسی سنگدلی نہیں برتی جاتی لیکن اس سب کے باوجود ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں گزشتہ دنوں ہونے والے یورپی یونین کے سربراہی اجلاس میں 10 نئے ملکوں کو تنظیم کی رکنیت دے دی گئی ہے جبکہ ترکی کی درخواست پر غور کو 2004ء تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر عیسائی یورپ کی متعصبانہ سوچ اور مغربی دنیا کی مہذب منافقت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ جن 10 ممالک کی رکنیت منظور کی گئی ہے ان میں سے مالٹا اور قبرص کے علاوہ دیگر 8 ممالک کمیونسٹ تھے۔ جی ہاں! اسی کمیونزم کے پرچارک جس کے سرخ طوفان سے یورپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ترکی جیسی کثیر آبادی والے ملک نے اس تسلسل سے عسکری خدمات پیش کیں کہ اس کی معیشت پس کر رہ گئی۔ آج وہی کمیونسٹ ممالک یورپی یونین کا حصہ ہیں اور ترکی کو امریکا کے نمائشی دباؤ کے باوجود (امریکا کو عراق کے خلاف ترکی کا تعاون درکار ہے) اس تنظیم کی رکنیت سے محروم رکھا گیا ہے تاکہ اس کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا نہ مل سکے جبکہ ان تمام ممالک نے ترکی کے کئی سال بعد درخواست دی تھی اور ترکی 15 سال سے اس کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا مغرب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں حکمران اب بھی اپنی خوش

فہمیاں دور نہ کریں گے؟

علامتی اشارے کیا کہتے ہیں؟

ترکی سے کہا گیا ہے کہ وہ جمہوری نظام، انسانی حقوق اور اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے اپنے معاملات کو مزید بہتر کرے۔ ممکن ہے ہمارے معزز ترک بھائی ''مزید بہتری'' کی کوشش شروع کر دیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ عیسائی یورپ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ 7 کروڑ کی آبادی رکھنے والا مسلمان ملک یورپی یونین کا حصہ بن کر (جرمنی کے بعد) یورپ کے سب سے بڑے ملک کی حیثیت اختیار کر لے جبکہ مادر پدر آزاد یورپ میں آبادی کی قلت کا یہ عالم ہے کہ شادیاں نہ کرنے کے رجحان کے سبب پہلے شادی شدہ جوڑے کم ہوئے پھر بچے کمیاب ہوئے اور اب نوجوانوں کا کال پڑ گیا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ بعض لوگ امریکا کے یورپی یونین پر دباؤ کو ترکوں کے ساتھ دوستی نبھانے پر محمول کریں لیکن ہمارے یہ خوش فہم دوست اس سے قبل وہ مونوگرام دیکھ لیں جو پینٹاگون کے زیرِ انتظام دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے حال ہی میں قائم ہونے والے محکمہ ''انفارمیشن اوئرنس آفس'' کے لیے بنایا گیا ہے۔ بعض قارئین پر تو اس کو دیکھتے ہی اس کی تمام تر معنویت آشکارا ہو جائے گی لیکن عام قارئین کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ اس میں وہ مشہور علامات شامل ہیں جو بدنام زمانہ عالمی خفیہ صہیونی تنظیمیں اپنے مذموم مقاصد کے علامتی اشاروں کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس ''مونوگرام'' میں اہرامِ مصر کے طرز کی ایک مخروطی شکل کی عمارت ہے جس کے سرے پر ایک آنکھ ہے۔ یہ کانی آنکھ امریکی ڈالر کی پشت پر دیگر چند علامات نامعلوم زبان (جی ہاں! امریکی کرنسی پر نامعلوم اجنبی زبان کے الفاظ! غور کریں کیا وہ نامعلوم المعنی ہو سکتے ہیں؟) میں لکھے گئے الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں وہ علامتیں تو نہیں لیکن یہ اضافہ ہے کہ دجال کی عیارانہ فطرت کی علامت یہ آنکھ نصف کرۂ ارض کی نگرانی کر رہی ہے جس میں جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے تمام بڑے اسلامی ممالک موجود ہیں۔ اس محکمے کو اربوں (کروڑوں نہیں اربوں) ڈالر کا بجٹ اور قانونی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ توانا مسلمان ممالک اور ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے والے دیگر ممالک اس کا ہدف ہوں گے۔ شمالی کوریا سے لے کر یمن تک اور عراق سے ملائیشیا تک یہ اپنی کارروائیاں آزادانہ طور پر انجام دے گا۔ علانیہ گناہ نہ چھوڑنے اور اللہ و رسول سے بغاوت کرنے والے مسلمانو! کب تک اپنے رب کو ناراض رکھ کر کفر کو اپنے اوپر مسلط کیے رکھو گے؟

انکشافات کی دنیا

دلائل آفاقی وانفسی:

اور آخر کار پہلے کلوننگ شدہ بچے کی پیدائش کی خبر آ گئی ہے۔ سائنسی ترقی میں پیچھے رہ جانے والوں میں سے کچھ لوگ جس طرح کل چاند تک انسان کی رسائی کو افسانہ سمجھتے تھے، اسی طرح آج بعض ضعیف العقیدہ مسلمان حیران و پریشان ہیں کہ انسان کی مکمل خصوصیات کے حامل اور اس سے سو فیصد ملتے جلتے بچے کی مصنوعی طریقے سے پیدائش کس طرح ممکن ہے؟ حالانکہ یہ انکشاف کسی اور کے لیے حیران کن اور ہوشربا ہو یا نہ، قرآن کریم کی حامل قوم کے لیے قطعاً باعث تعجب نہ ہونے چاہییں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سچی کتاب میں جابجا اور واضح طور پر فرمایا کہ ہم نے اس کائنات میں تمہارے اردگرد اپنی قدرت، عظمت، الوہیت اور وحدانیت کی نشانیاں بکھیر رکھی ہیں (انہیں مفسرین کی اصطلاح میں دلائل آفاقی کہتے ہیں) بلکہ خود تمہارے جسم کو ایک کائنات بنا رکھا ہے اور اگر تم اپنے آپ میں غور و فکر اور اپنی بناوٹ و ساخت کی تحقیق کرو تو تمہیں تشریح الابدان کی تہہ سے ایسے موتی مل سکتے ہیں جن کی چمک سے تمہیں ہماری ذات و صفات کی معرفت حاصل ہوگی (ان نشانیوں کو دلائل انفسی کہتے ہیں) اب مسلمانوں نے آخرت بنانے والی آسمانی ہدایات پر دلجمعی سے عمل کیا نہ ان قرآنی نصیحتوں کو اپنایا جن سے دنیا میں فلاح و ترقی نصیب ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جن چیزوں سے وہ دہرا فائدہ حاصل کر سکتے تھے......اقوامِ عالم پر سبقت بھی اور اپنے رب کی معرفت بھی......، وہ چیزیں، صلاحیتیں اور وسائل ان کی دسترس میں ہونے کے باوجود یہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں اور غیر قوموں کی ترقی پر حسرت، رشک، تعجب اور بے بسی کے علاوہ ان کے پلے کچھ نہیں۔

تخلیق کیا ہے؟

کلوننگ کے ذریعے انسان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک عظیم نشانی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس سے یہ سمجھنا کہ یورپ کے مادہ پرست اور حیوانیت زدہ انسانوں کو معاذ اللہ صفت تخلیق حاصل ہوگئی ہے، قطعاً غلط اور سخت جہالت ہے۔ ''خلق'' تو اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کے اجزائے ترکیبی اور نمونہ سابق کے بغیر اسے وجود میں لے آیا جائے۔ اب اس کائنات میں کون سا انسان یا جن اس پر قادر ہو سکتا ہے کہ کسی قسم کے عناصر ترکیبی کے بغیر محض اپنے حکم اور ارادے سے کسی چیز کو وجود بخش سکے۔ ڈی این اے کے ذریعے ماں باپ سے سو فیصد مشابہہ بچے کی پیدائش تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں چھپی ہوئی انوکھی خصوصیات کی دریافت ہے نہ کہ ''تخلیق کا کارنامہ''......اس سے تو اس ذات پر مزید ایمان بڑھ جاتا ہے جس نے جسمِ انسانی میں قسما قسم راز دفن کر رکھے ہیں اور پھر قرآن کو لاریب ماننے والوں کو اس کی طرف اشارے دے کر ان میں سے کچھ کی کھوج اور تحقیق کا حکم دیا ہے اور کچھ کے قریب جانے سے منع کر دیا ہے۔ اب مؤمن یا کافر جو بھی ان پنہاں رازوں کی نقاب کشائی کی کوشش کرے گا وہ قدرت کے ان شاہکاروں کو پالے گا بس اتنی بات ہے کہ کافر اس کامیابی کو اپنی سفلی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنائے گا اور مسلمان اسے عظیم

پروردگار کے سچے دین اور اس کے ماننے والوں کی خدمت کا ذریعہ اور اپنی نجات کا توشہ بنائے گا۔

مغرب اور مشرق کی مشکل:

مغربی دنیا کی مشکل یہ ہے کہ وہ مادی ترقی کی معراج پر پہنچ کر بھی اخلاقیات کے اعتبار سے روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہے۔ ہر نیا دن ان کے لیے ایک نئی کامیابی، ایک نئے انکشاف اور ایک انوکھی دریافت کی خبر لے کر طلوع ہوتا ہے مگر وہ اپنی اس کامیابی کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اسے خلقِ خدا کے لیے آزار کا ذریعہ بنائے جا رہے ہیں۔ ان نشانیوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پہچاننے اور اس کی ماننے کے بجائے خود (معاذ اللہ) خدا بننے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے گراں خوابی سے سنبھلنے میں اتنا وقت لگا دیا ہے کہ اس عرصہ میں یورپی اقوام ان سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ اب تکوینی قوانین سے جکڑی ہوئی اس دنیا میں جو چیز صدیوں میں حاصل ہوتی ہے وہ مہینہ یا سال بھر میں ہاتھ آنے سے رہی، ادھر ان کی بے تابی، بے صبری ہے کہ ضبط میں نہیں آ رہی لہٰذا کرۂ ارض ایک عجیب طرح کی کشمکش کا شکار ہے۔ اس میں تیزی سے جغرافیائی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور صرف پچھلے سال میں پیش آنے والے غیر معمولی ماحولیاتی تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو خطرہ لگتا ہے کہ یہ اتھل پتھل کسی عظیم واقعہ کا پیش خیمہ نہ بن رہی ہو۔ اگرچہ سال گزشتہ جنگوں اور حوادث کے لحاظ سے بھی ہنگامہ خیز رہا ہے لیکن کرۂ ارض پر جغرافیائی تبدیلیوں کی غیر معمولی رفتار کچھ زیادہ چونکا دینے والی ہے۔ مغرب اپنے زعم میں تہی دست طالبان سے جدید ترین اسلحہ کے زور پر امارت اسلامیہ چھین لینے کے بعد ایک بڑے خطرے سے پرامن ہو گئے تھے مگر امت مسلمہ نے اس ظلم کو جس شدت سے محسوس کیا ہے اس کے ردعمل میں مغربی املاک اور مفادات ایک نہ تھمنے والے ردعمل کی زد میں آ گئے ہیں۔ اس وقت مسلمان نہ صرف عالمی استعماری اور صہیونی طلسم کاروں سے شاکی ہیں بلکہ وہ ان کا آلہ کار بننے والوں سے بھی بیزار ہیں۔ گروزنی میں روس نواز چیچن حکومت کے ہیڈکوارٹر کو زمین دہلا دینے والے دھماکے کے ذریعے تباہ کر دیا گیا ہے اور اس کے ذریعے روس کو پیغام دے دیا گیا ہے کہ وہ بحیرۂ کیسپین کے ذخائر تک رسائی اور چیچنیا پر قبضے کے لیے خسارے کا ایسا سودا نہ کرے جس کی تلافی کے لیے اس کے پاس کھوٹے سکے بھی باقی نہ بچیں۔ دیکھیں نت نئے انکشافات اور حوادث سے بھری یہ دنیا کس رخ کو جاتی ہے؟؟؟

رحم یا ٹھوکر

ذکر تکمیل اور تخصص کا:

آج کل عام دستور ہوگیا ہے کہ ہمارے نوجوان فضلائے کرام دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تخصص کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں ''فنون'' کی تکمیل کا بہت رواج تھا اور علمی استعداد کی پختگی کے شائق طلبہ چھوٹے دورہ (مشکوٰۃ و ہدایہ آخرین) سے پہلے یا بڑے دورہ (صحاح ستہ) کے بعد علوم عقلیہ اور دیگر فنون مروجہ کی منتہی کتابیں پڑھنے کے لیے ملک کی چند مشہور درس گاہوں میں جایا کرتے تھے۔ یہ مراکز درس دور دراز دیہاتی علاقوں میں ہوتے تھے اور وہاں زندگی کی عام سہولتیں دستیاب نہ ہونے کے باوجود علم کے شوقین ''طالب'' کسب فیض کے لیے جوق در جوق پہنچ جاتے اور قسما قسم کی تکالیف برداشت کر کے اپنے کام میں لگے رہتے اور علم میں رسوخ اور پختگی کی خاطر کڑی ریاضت جھیلتے۔ آج کل تخصص فی الافتاء (بعض حضرات اس کو تخصص فی الفقہ کہتے ہیں لیکن شاید صحیح تعبیر تخصص فی الافتاء ہے کہ اس میں بنیادی طور پر افتاء کی تمرین ہوتی ہے نہ کہ فقہ کی تعلیم و تعلّم) کا رجحان بہت ہے لیکن اس میں عام طور پر دو خامیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں: اول اس کے لیے جو استعداد درکار ہے وہ ایک خاص نوع کی ذہانت و بیدار مغزی کے علاوہ نحو و صرف کے پختہ ضبط و اجراء، درست عبارت خوانی و معنی فہمی اور علوم عالیہ کی پیچیدہ پیچیدہ ابحاث کے مستحضر ہونے پر موقوف ہے جبکہ اس بارے میں ہمارے ہاں کمزوری پائی جاتی ہے، لہٰذا سرپرست و خادمانِ علوم نبوت کو چاہیے کہ تخصص سے قبل تکمیل کو رواج دیں جس میں نوجوان فضلا کی خامیاں دور کر کے انہیں کندن بنا دیا جائے مثلاً اس میں پہلے نحو و صرف کا ضبط اجرا کے ساتھ ہو پھر کسی (ایک یا دو) فنی کتاب کے ذریعے تدریس کی عملی تربیت۔ اور جدید عربی کے محادثہ و کتابت کے ساتھ انگریزی زبان کی بھرپور تعلیم اور لکھنے بولنے کی مشق ہو۔ تھوڑا بہت اردو ادب، خوشخطی اور تجوید بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہوجائے گا۔ پھر اس کے بعد صرف اہل اور مستعد طلبہ کو تخصص کروایا جائے ورنہ تکمیل کی یہ قسم انہیں مضبوط مدرس اور دیگر علمی کاموں کا اہل تو بنا ہی دے گی۔ اسی پر اکتفا کیا جائے۔ دوسرے یہ رسم چل پڑی ہے کہ تخصص میں داخلہ لیتے ہی طالب علم مفتی سمجھا اور پکارا جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد وہ خود بھی اپنے آپ کو مسئلہ بتانے کا اہل سمجھ کر مسائلِ شرعیہ میں سائلین کی راہنمائی بھی شروع کردیتا ہے جبکہ یہ دونوں باتیں نہ صرف بہت خطرناک بلکہ مہلک ہیں۔ تخصص کا مرحلہ اگر کوئی طالب علم کامیابی سے مکمل کرلے تب بھی وہ متخصص ہے نہ کہ مفتی۔ مفتی تو ایک منصب شرعی ہے جو کسی نصاب کی تکمیل سے حاصل نہیں کیا جاسکتا، البتہ کوئی متخصص نصاب مکمل کرنے کے بعد اساتذہ کرام کی زیرنگرانی معتبر عرصے تک مثلاً دس سال تک افتاء کا کام کرے، فقہ اور اصول فقہ پڑھے پڑھائے اور اس کے مشائخ یا معاصر اہل علم گواہی دیں کہ اس میں افتاء کا ملکہ اور صلاحیت پیدا ہوگئی ہے تب اسے گنجائش ہے کہ وہ خود کو مفتی پکارے جانے پر خاموش رہے اور اس اصطلاح شرعی اور لقب علمی کے غیر محل میں استعمال پر کسی کو نہ ٹوکے۔

غیرت کا رنگ:

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ اس ساری بحث کا دیئے گئے نقشوں سے کیا تعلق ہے جو اتفاق سے تینوں کے تینوں ایٹم

سے تعلق رکھتے ہیں؟ لیکن آپ ذرا ٹھہریئے اور بات پوری ہونے دیجیے۔ ہاں تو بات یہ چل رہی تھی کہ ایک دہائی قبل فنون کی تکمیل کے منتہی طلبہ بعض مشہور اہل علم کے پاس جا کر ان کی خدمت میں رہتے تھے اور یہ حضرات اپنی بے مثال مہارت و تجربے سے اللہ تعالیٰ کے ان مہمانوں کو پوری طرح استفادہ کا موقع دیتے تھے۔ ان میں سے بعض کہنہ مشق اساتذہ کرام ایسے بھی ہوتے تھے کہ پیرانہ سالی کے باوجود ایک ایک دن میں 23،23 سبق پڑھاتے تھے اور ان کو اپنے فن پر اتنا عبور اور علمی رسوخ حاصل تھا کہ (درس کی تیاری کی خاطر) مطالعہ کے لیے ایک مرتبہ اس عبارت پر نظر ڈالنا کافی ہوتا تھا جو طالب علم ان کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ خیر اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ان اہل علم میں سے کچھ مقتدر ہستیاں ملک کے قبائلی علاقوں میں ہوتی تھیں جہاں مروجہ حکومتی قوانین نہیں چلتے۔ ان کے پاس زیر تعلیم طلبہ عصر کو ٹہلنے اور تفریحی گشت کرنے کے لیے ادھر اُدھر نکل جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک علاقے میں چھوٹا سا بازار تھا۔ بازار کیا بس چند دکانیں تھیں جن میں ضرورت کی چند چیزیں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک دکان ایک سفید ریش نورانی صورت بزرگ کی تھی جو فقیر منش خدا رسیدہ لوگوں کی طرح (افسوس اب ایسے لوگ کہاں رہے؟ اور ایسی صحبتیں کس کو میسر؟) علماء و طلبہ سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور انہوں نے بعض اکابر مشائخ کی صحبت اٹھائی تھی۔ فارسیات کے عالم تھے اور برصغیر کی آزادی کے لیے جن علماء حق کی مثالی جدوجہد کو قریب سے دیکھ چکے تھے لہٰذا ان کی مجلس ...... جو مسافر طلبہ کے لیے ہر وقت اپنا دامن وشفقت کشادہ رکھتی تھی ...... میں کبھی کبھی اکابر کے تذکرے اور برمحل فارسی اشعار کی خواندگی سے ایسا سماں بندھ جاتا تھا کہ روح شاد و آباد ہو جائے۔ ایک مرتبہ ان کی دکان کے ''تھڑے'' پر مجلس جمی ہوئی تھی کہ قریب میں ایک واقعہ ہوا جو آج شمالی کوریا کا بیان پڑھ کر یاد آ گیا۔ واقعہ کوئی اتنا خاص نہیں لیکن اس میں قبائلی مسلمانوں کی مخصوص غیرتی طبیعت کا ایسا رنگ جھلکتا ہے جس سے صاحب دل قارئین کچھ نہ کچھ لطف حاصل کر سکتے ہیں اور جو ہماری اس طویل تمہید کی بنیاد بن سکتا ہے۔

''کاپروں'' کی جرأت:

ہوا یوں کہ ان بزرگ کی دکان کے ساتھ موٹر مکینک کا ٹھیہ تھا۔ اس پر ایک گاڑی مرمت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں گاڑیوں کی رجسٹریشن وغیرہ کا کچھ تکلف نہ تھا۔ اتنے میں دیکھا کہ کچھ اہلکار اس گاڑی کی طرف آ نکلے اور مکینک سے جاننا چاہا کہ اس کا مالک کون ہے؟ مالک ''فقراء'' کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اہلکاروں کو دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئی تھیں۔ وہیں سے درشتگی کے ساتھ بولا: یہ میرے مہمانوں کی ہے (اس کے پاس کچھ مہمان پناہ گزین تھے اور یہ اس علاقے کا رواج عادی تھا) انہوں نے پوچھا: کون مہمان؟ اس پر اس مہمان نواز قبائلی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جواب کا ایک اور اسلوب اختیار کیا۔ اس نے ہاتھ بغل میں لٹکے پستول کے دستے پر دھرا اور کہا: اس خانہ خراب کو میں ہر وقت یونہی نہیں چمکا کر رکھتا بلکہ ضرورت پڑنے پر اس کی نال دستے سمیت بڑبولوں کے حلق تک پہنچا دیتا ہوں۔ اس کے قفسِ جاں میں بھڑکتی غیرت کی چنگاری، اس کا دوٹوک انداز اور جرأت آمیز گفتگو اتنی حیرت انگیز نہ تھی جتنی اس کے مخاطب کے جذبۂ تجسس کا جھاگ کی طرح بیٹھ جانا۔ آج شمالی کوریا (جو ابھی باقاعدہ ایٹمی طاقت نہیں) جب یہ بیان پڑھا کہ اس نے امریکا کے ساتھ ہونے والے تمام سمجھوتوں کو ختم کر کے میزائل تجربات دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس ''کاپر'' (کافر) ملک کے دس لاکھ

شہریوں نے حکومتی فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے عظیم الشان مظاہرہ کیا ہے اور دوسری طرف سنا کہ ہمارے ہاں (جی ہاں! ہمارے ہاں جو باقاعدہ مسلمہ ایٹمی طاقت ہیں) عرب باشندے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی اولاد ہیں، ان کی گرفتاریوں کا عمل انہی امریکیوں کی نگرانی میں جاری ہے۔ جنہوں نے سقوط ڈھاکا کا جشن بھارتی سفارتخانے میں روسیوں اور بھارتیوں کے ساتھ مل کر منایا تھا اور اب پاکستانیوں کو اتحادی ہونے کا عزو شرف بخش رہے ہیں تو خیال آتا ہے کہ تیمور کے گھرانے سے غیرت کہاں رخصت ہوگئی ہے؟ کیا ہم کتے کا سوپ پینے اور مینڈک کی ٹانگیں کھانے والے کافروں سے بھی گذر گئے ہیں کہ ان جتنی جرأت وحمیت بھی ہم میں نہیں دکھائی دے رہی؟ یا اللہ! رحم فرما اور سچ تو یہ ہے کہ اب ہم آپ کے رحم کے قابل بھی نہیں رہے۔ اب تو کوئی ٹھوکر ہی ہمیں سدھارے تو سدھارے۔ آپ کے فضل وکرم کے سارے سہارے تو ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیئے ہیں۔

قسم ہے قلم کی

ہر چیز میں ہے تو:

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بہت عجیب وغریب بنایا ہے۔ اس میں طرح طرح کے جمادات، نباتات، حیوانات، علویات وسفلیات ہی نہیں، اس میں پیش آنے والے حالات وواقعات بھی ایسے عجیب اور غیر متوقع ہوتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور بے حساب قدرت پر یقین دلوانے کے لیے کافی ہیں۔ قرآن کریم میں جا بجا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کرنے کی طرف جو توجہ دلائی گئی ہے، اس سے مراد محض مظاہرِ قدرت ہی نہیں، احوال گردوپیش بھی ہیں۔ اب اسی واقعے کو دیکھ لیجیے جو نئے ہجری سال کے آغاز کے موقع پر روزنامہ ''اسلام'' اخبار کے 8 مکمل صفحات شائع ہونے کی خبر سُن کر یاد آیا۔ آج سے تقریباً 9، 10 سال پہلے بندہ ایک مؤقر دینی ادارے میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ برادرم مولانا جان محمد شہید رحمہ اللہ تشریف لے آئے۔ (یہ ضربِ مؤمن کے اولین خدام میں سے تھے اور ان تین ساتھیوں میں سے پہلے خوش نصیب تھے جو اب تک اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران شہید ہوئے۔ ''ضربِ مؤمن'' کا یہ بھی ایک اعزاز ہے کہ اس کے صحافیوں کو اللہ رب العزت نے میدان میں شہادت سے نوازا۔ فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر، و مابدّلوا تبديلا٥) ان سے بندہ کی پرانی ملاقات تھی۔ حال احوال دریافت کرنے (بلکہ ان کی واسکٹ کی ایک جیب پھولی ہوئی ہونے کی وجہ سے اس کا سبب دریافت کرنے) سے معلوم ہوا کہ شہید، کوچۂ صحافت کی طرف نکل پڑے ہیں اور اس وادیٔ پُر خار کے واحد خیمہ نشین ہیں جن کا تعلق مدارس کے بوریا نشینوں سے ہے۔ مرحوم نے ملاقات کے دوران اس میدان میں علمائے کرام، دین دار حضرات اور نظریاتی ذہن رکھنے والوں کی کمی بلکہ ناپیدی کی شکایت کی اور بندہ کو ترغیب دی کہ اس طرف آئیں تو وہ ہمہ قسم تعاون کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ مدرسہ اور مسجد کی روایتی مصروفیات میں مشغول انسان کس طرح سے اس شعبے کی طرف جا سکتا تھا لہٰذا بندہ نے ان کے لیے دعا پر اکتفا کیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس میدان میں ترقی عطا فرمائے اور ان کی تقویت کے لیے ایسے رِجال کار فراہم کرے جو اس دینی محنت میں ان کا دست وبازو بن جائیں اور اللہ تعالیٰ کے نام اور دین کے کام کا بول بالا کریں۔

صحرا میں نخلستان:

تب نہ صحافت کی اہمیت کا اندازہ تھا نہ اس شعبے کی سُدبُد تھی، نہ کبھی سوچا تھا کہ اس طرف چلے آئیں گے۔ آج جب نئے اسلامی سال کے آغاز پر روزنامہ ''اسلام'' کے 8 صفحوں کی اشاعت کی صورت میں مکمل اخبار کا اشتہار اور نیا کیلنڈر دیکھا تو برادرم مولانا جان محمد شہید رحمہ اللہ کے ساتھ وہ بیٹھک بے ساختہ یاد آگئی جس میں انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ اس شعبے کی معاشرے پر گرفت، اس سے وابستہ افراد کی ہر جگہ آؤ بھگت اور اس میدان میں دینی ذہن نہ رکھنے والوں سے ہونے والے نقصان کو

بیان کیا تھا۔اس وقت شہید اس میدان میں واحد عالم دین تھے۔آج روز نامہ ''اسلام'' اور ہفت روزہ ''ضربِ مؤمن'' اور دیگر دینی و جہادی روز ناموں اور ہفت واری جرائد سے وابستہ بیسیوں علمائے کرام اور دین کی سربلندی کا جذبہ رکھنے والے اہل قلم دن رات کام میں مصروف ہیں اور اصلاح وارشاد کا یہ سلسلہ ہر روز کتنے ہی لوگوں تک اللہ کا نام اور پیغام پہنچاتا اور ان کی زندگیوں کو بدلتا ہے۔اندازہ تو لگائیے کہ کسی ہفت روزہ کو اوسطاً اگر 5 آدمی اور روز نامہ کو اوسطاً تین آدمی پڑھتے ہیں تو ڈھائی تین لاکھ چھپنے والا ہفت روزہ گویا تقریباً دس لاکھ افراد کے اصلاحی اجتماع اور لاکھ،سوا لاکھ کے قریب چھپنے والا روز نامہ یومیہ تقریباً تین لاکھ افراد کے لیے اصلاحی مجلس کا کام کر رہا ہے۔اگر کوئی عالم دین جمعہ کا وعظ کہتے ہیں تو کتنے ہزار افراد اس میں شریک ہوتے ہوں گے؟ کتنے واعظ زبان شیریں اور جاں پُرسوز رکھتے ہوں گے؟ سامعین پر کب تک اس کا اثر باقی رہے گا؟ جب کہ ہفت روزہ ''ضربِ مؤمن'' اور روز نامہ ''اسلام'' میں ملک کے چوٹی کے قلم کار لکھ رہے ہیں،ان کی تحریروں کے تراشے لوگ سنبھال کر رکھتے ہیں اور ان کے قلم کی جولانیوں نے کتنے ہی لوگوں کو فسق وعصیان کے بھنور سے نکلنے میں مدد دی ہے کتنے ہی اہل دل کے دل میں اپنی ذات سے اٹھ کر امت مسلمہ کے لیے سوچنے اور بے کس و بے بس مسلمانوں کے لیے بساط بھر کچھ کرنے کا جذبہ پیدا کیا ہے آج مولانا صاحب موصوف ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے ہم سبق وہم مکتب اس صحرا میں نخلستان اُگاتے اُگاتے کتنا آگے چلے گئے ہیں اور ان کے لگائے ہوئے بوٹے تناور درخت بن کر گناہوں کے تپتے ریگستان میں فسق وفجور سے جاں بلب ہو جانے والے صحرا نوردوں کو عملِ صالح کا ٹھنڈا سایہ اور تعلق مع اللہ کا سرد وشیریں آبِ حیات فراہم کر رہے ہیں۔

تکمیل اور صحافت:

اگرچہ دینی ونظریاتی صحافت کا شعبہ اپنے قدم جما چکا اور لادینی وتجارتی صحافت کا مقابلہ کرتے کرتے کافی آگے بڑھ چکا ہے لیکن یہ شکوہ آج بھی باقی ہے کہ غلبۂ دین کی محنت کے اصل مسئول ...... مدارس کے تعلیم یافتہ فضلاء .... اس میدان سے دور دور ہیں۔ستم ظریفی ہے کہ ابھی تک بہت سے ساتھی اس شعبے میں اشتغال کو دنیا داری کی ایک صورت یا غیر علمی مصروفیت سمجھتے ہیں جبکہ اس کا فائدہ اور اہمیت کسی بھی اس شعبے سے کم نہیں جن میں نئے فارغ التحصیل ہونے والے فضلا اپنی صلاحیتیں اور محنتیں لگا رہے ہیں۔بعض ساتھی اس طرف متوجہ ہوں بھی تو اوّل وہلے میں صاحب طرز ادیب بننا چاہتے ہیں۔اردو انشا کے قواعد،الفاظ وتعبیرات کا درست استعمال،ضرب الامثال،محاورے،مترادف ومتضاد سے برموقع استفادہ،اساتذہ فن کی تحریروں کا مطالعہ،اپنی مشقوں پر اصلاح لینا اور اغلاط کی درستی کی محنت،ان سب باتوں سے جی چراتے ہیں جبکہ فطری استعداد کے بعد سعی مسلسل اور جُہد پیہم سے ہی قلم کی سیاہی میں خونِ جگر کی نمود ہوتی ہے۔''ضربِ مؤمن'' اور روز نامہ ''اسلام'' کا یہ کارنامہ ''کارِ تجدید'' کی حیثیت رکھتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف بہت سے لکھنے والے ایسے پیدا کیے جو اللہ کے لیے،اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر،اللہ کے بندوں کے فائدے کے لیے لکھتے ہیں،بلکہ اب انہوں نے اسلام آباد میں صحافت کی باقاعدہ تربیت کا ادارہ کھول لیا ہے جہاں پہلی جماعت اپنی تربیت مکمل کر کے عملی طور پر میدان میں قدم رکھا چاہتی ہے۔اب مزید کرنے کا کام یہ ہے کہ فضلائے کرام اور بڑے درجے کے طلبہ کے لیے سالانہ چھٹیوں میں مختلف علوم مثلاً نحو،صرف اور تفسیر ومیراث کے تعلیمی دوروں کی طرح مضمون وخبر نگاری اور عملی صحافت کی تربیت کا 40 یا 60 روزہ دورہ رکھا جائے۔مدارس کے اکابرین اور یارانِ نکتہ

داں کو اس موضوع کی طرف طلبہ کو متوجہ کرنا چاہیے۔ افتاء میں تخصص کے بجائے نحو، صرف، انگلش و کمپیوٹر، تاریخ و ادب میں تکمیل اور صحافت میں یک سالہ تخصص اور مختصر تعلیمی دوروں کو متعارف کروانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس وقت جبکہ عوام الناس میں طلب کا یہ عالم ہے کہ ''بچوں کا اسلام'' اپنی اشاعت کے اولین مہینوں میں چند ہزار سے بڑھ کر لاکھ کے ہندسے کو پار کر کے پاکستان بلکہ اردو کی تاریخ میں بچوں کا مقبول ترین رسالہ بن گیا ہے، اگر داعیانِ دین نے اس میدان میں سستی دکھائی تو یہ اپنے فرائض سے خطرناک غفلت ہوگی۔

نجات کس بات پر ہوگی؟

مشکل یہ ہے کہ ذی استعداد ساتھی اس کوچے میں ٹکتے نہیں، ان کے خیال میں یہ شعبہ ان کی علمی صلاحیتوں کا صحیح مصرف نہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا پیغام گمراہ اور پیاسی انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری اٹھانے والوں کے منہ سے یہ جملہ اچھا نہیں لگتا۔ کیا روزِ قیامت اعلیٰ علمی سرگرمیوں میں مشغولیت پر بخشش کا فیصلہ ہوگا یا نافعیت، ریاضت اور مشقت پر نجات ملے گی؟ ''وبضدها تتبين الأشياء'' کے قاعدے سے اس کام کی نافعیت کو اس سے سمجھیے کہ کفار کے میڈیا پر غلبہ نے مسلمانوں کو کیا دن دکھایا ہے؟ طالبان حکومت نے منشیات کی پیداوار پر پابندی لگائی تو افغانستان جیسے پسماندہ، غربت و بے روزگاری کے مارے ہوئے ملک اور بد نظمی اور خودسری کے عادی عوام نے اس کا جو خیر مقدم کیا، بڑے بڑے ترقی یافتہ ملک کے عوام اپنے مقبول ترین حکمرانوں کے مفید ترین فیصلوں پر ایسا عمل نہیں کرتے، لیکن آج کا میڈیا طالبان پر اُچھالے گئے کنکر، پتھر اور کیچڑ سے اٹا ہوا ہے جبکہ ان کے اس کارنامے نے نہ صرف معاصر دنیا کی تاریخ میں عوامی سطح پر مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا تھا بلکہ اس کا سب سے بڑا فائدہ بھی مغرب کو ہوا کیوں کہ منشیات کی سب سے زیادہ کھپت یورپ و امریکا کے من موجی عوام میں ہے۔ طالبان کو ''گاؤں کے مولوی'' کہہ کر ترقی یافتہ دنیا کی قیادت کا دعویٰ کرنے والے آج اپنے منظورِ نظر افغان حکمرانوں کے ساتھ مل کر خود براہِ راست منشیات کے خلاف آپریشن کر رہے ہیں، لیکن انہیں ایک فیصد بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اس حقیقت کو میڈیا پر کون آنے دے گا؟ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے پاس تیل کی بیش بہا دولت اور علمائے کرام کے پاس منبر اور قلم کی عظیم طاقت ہے۔ قسم ہے قلم کے ربّ کی! اگر دونوں اس کا صحیح استعمال شروع کر دیں تو مغرب کے سیاسی اور نظریاتی غلبے کا توڑ کیا جا سکتا ہے مگر افسوس کہ مسلم حکمران ماچس کی ایک تیلی سے تیل کی قیمتوں کو آسمان پر لے جا کر کفارِ مغرب کو زمین پر اتار سکتے ہیں مگر وہ اس تیلی کو آگ دکھانے کے لیے درکار مسالہ دشمن کے پاس گروی رکھوا چکے ہیں۔ مدارس سے وابستہ اہلِ علم، میڈیا کی جنگ میں ناقابل فراموش کردار ادا کر سکتے ہیں، مگر وہ امت کی فلاح کے لیے خونِ دل میں ڈبو کر لکھنے والا قلم کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔

ایٹمی کنکر کا مستحق:

امریکا کی عسکری طاقت کی ایک جھلک دیکھنے سے لگتا ہے کہ ابرہہ کے ہاتھی چلے آرہے ہیں۔ کیا ہم اس کے توڑ کے لیے ابابیلوں کے کنکری برسانے جیسی کسی کرامت کا (معجزہ اب ظاہر نہیں ہو سکتا، وہ انبیائے کرام کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور نبوت حتمی طور پر ختم ہو چکی) انتظار کرتے رہیں گے؟ کیا قدرت، معطل اور کام چور لوگوں کی مدد کرتی ہے؟ اہل اسلام کو تعلیمی، سائنسی، عسکری اور اقتصادی ہر میدان میں محنت کی ضرورت ہے۔ مغرب نے یہ غلبہ فحاشی اور آزادروی سے نہیں حاصل کیا بلکہ

سالہا سال تک نظم و ضبط کے ساتھ مسلسل اور جی لگا کر محنت کی ہے۔ ان کے حکمرانوں نے قوم کو فلاحی معاشرہ دیا۔ عوام نے ملکی ترقی کے لیے مل جُل کر کام کیا۔ سائنسدان مغز کھپا کر اور دل جلا کر نت نئی ایجادات کے لیے جُتے رہے۔ اہل قلم عوام کو تفریح کے ساتھ کام میں لگنے رہنے کا شعور پیدا کرتے رہے۔ سرکاری اہلکاروں نے ملکی وسائل کو فلاحِ عامہ کے لیے خرچ کیا۔ ہر منصب دار نے ملک و قوم سے جو کچھ لیا اس کا دگنا چوگنا نئی نسل کو لوٹایا۔ ان لوگوں نے نجی زندگی میں بدترین پستی کے باوجود حیاتِ اجتماعی کو انصاف اور مساوات کے چند آفاقی اور فطری اصولوں پر قائم کر رکھا ہے جبکہ ہم نے نجی زندگی میں کسی قدر دین سے تعلق کے باوصف اجتماعی طور پر اسلام کی عادلانہ تعلیمات کو دیس نکالا دیا ہے، اس واسطے وہ خلا کی وسعتیں ناپ رہے ہیں اور ہم گہرائیوں کی طرف لڑھکتے جا رہے ہیں۔ وہ سب کچھ کر کے بھی نہیں تھکے، مزید کی تلاش اور حصول میں سرگرداں ہیں جبکہ ہم سفر شروع کرنے سے پہلے صہیونیت کی پھیلائی ہوئی فحاشی و عریانی میں پڑ کر سانس پھلا چکے ہیں۔ اے اہل اسلام! اللہ سے تعلق کی رسی کو مضبوطی سے تھامو! دنیا کے لیے کچھ کرو تو ایسے سلیقے اور محنت سے جیسے ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ آخرت کے لیے جو کرو تو ایسے جیسے اس فانی دنیا سے تمہیں کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہر چیز میں ترقی کی کوشش کرو، دین اور دنیا میں تفریق نہ کرو، خلوصِ نیت اور حسنِ عمل کی بدولت مسلمان کی دنیا بھی اس کا دین بن جاتی ہے۔ اے پروردگار! ہم بیشک ایوبی کے وارث نہ سہی، امریکا تو ابرہہ کا پیروکار ہے۔ تو اپنی لامحدود قدرت ایک بار پھر دکھا دے کہ ایٹمی کنکر برسائے جانے کا مستحق بلکہ مستوجب ہو چکا ہے۔

تہذیبوں کا معرکہ

حقیقت پر جمی گرد:

تہذیبوں کا تصادم بالآخر تہذیبوں کی جنگ میں تبدیل ہو رہا ہے اور یہ جنگ آہستہ آہستہ زور پکڑتے پکڑتے اب نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ صدر بش کے متعلق اطلاع آئی ہے کہ صبح بیداری کے بعد سب سے پہلے My utmost for nis highest نامی کتاب پڑھتے ہیں۔ یہ اسکاٹ لینڈ کے ایک پادری نے ان فوجیوں کو جان دینے پر ابھارنے کے لیے لکھی تھی جو انیسویں صدی کی ابتدا میں پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانی فوجوں سے برسرِ پیکار تھے اور ان سے فلسطین چھین لینا چاہتے تھے۔ Evangelical نامی متعصب فرقے سے تعلق رکھنے والے اس پادری کا نام Oswald Chambers تھا اور اس نے اس مجموعے میں جوشیلی تقریریں جمع کی تھیں جو محاذِ جنگ پر متعین فوجیوں کو ابال دینے کے لیے سنائی جاتی تھیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے دفتر جاتے ہیں تو سب سے اوپر والی دراز میں رکھی ایک فہرست پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس میں عربستان کے کچھ شہزادوں کے نام درجہ بدرجہ ترتیب وار لکھے ہیں۔ یہ امیر کبیر گھرانوں کے وہ نوجوان ہیں جن کی اضافی دولت پر امریکا کے بینک پلتے اور جن کی بخشش پر مغربی ممالک کے ہوٹلوں کا کاروبار چلتا تھا۔ یہ لوگ اپنے آراستہ پیراستہ محل نما گھروں میں، دنیا بھر سے ملازمت کی تلاش میں آئے ہوئے نوکروں کی فوج کے جلو میں، عیش و آرام کے قسما قسم سامان اور جدید ترین سہولیات سے استفادہ کرتے ہوئے راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے.......... مگر آج کیا ہوا کہ انہیں بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں اور شمالی علاقہ جات کی دشوار گزار گھاٹیوں میں تلاش کیا جا رہا ہے؟ یہ اپنے ملکوں کو چھوڑنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ جنیوا اور روم میں چھٹیاں گذارنے والے کوہ ہندوکش کے خطرناک غاروں میں کیوں فروکش ہوئے؟ جن کے دم سے دنیا کے تفریحی مقامات آباد تھے وہ کس خاطر جان لیوا مشقت سے بھری زندگی اپنانے پر آمادہ ہو گئے اور ہر طرف سے صلیبیوں کی یلغار، دربدر کی ٹھوکریں، طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کر بھی اپنے موقف پر سختی سے جمے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ امریکی میڈیا نے حقیقت پر گرد کی اتنی موٹی تہہ جما دی ہے کہ ان سوالوں کے جواب خال خال ہی کوئی جانتا ہوگا البتہ انہیں دہشت گرد کہہ کر قضیہ نمٹانے پر سب تلے نظر آتے ہیں۔

معرکے کا دھواں:

صدر بش ہر صبح جس کتاب کے مطالعے سے اپنے جذبات کو تحریک دیتے ہیں، جن ناموں اور تصویروں پر نشان لگا کر اپنی مہم کی طرف پیش رفت کا حساب کتاب کرتے ہیں، پھر دن کو جن کارناموں پر شاباش دیتے اور جن ناکامیوں پر پریشانی کا اظہار کرتے ہیں، کیا یہ سب کچھ بش اور صدام کی جنگ یا بش اور اسامہ کا تنازع ہے؟ کیا یہ جھگڑا صدام یا اسامہ کے بعد نمٹ جائے گا؟ صلیبی سورما اس کے بعد اپنے ہتھیار ٹشو پیپر میں لپیٹ کر رکھ دیں گے؟ کعبہ کے ربّ کی قسم! یہ دو افراد کا نہیں دو تہذیبوں کا معرکہ ہے اور صدام و اسامہ کے بعد اس کی آگ ہر اس شخص، ملک اور معاشرے تک پہنچے گی جو اللہ کا نام لیتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ

پڑھتا ہے۔ چاہے وہ خود کو بنیاد پرست کہے یا اس سے شرمائے، مجاہدین سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھے یا جہاد کا نام لیتے ہوئے گھبرائے، عرب شہزادوں کو دہشت گرد سمجھے یا حرمین کا محافظ، اس تک بہرحال اس معرکے کی آگ نہیں تو اس کا دھواں ضرور پہنچے گا اور کل روزِ قیامت بھی اس سے اس کے کردار کے بارے میں سوال ہوگا جو اس نے آج اُس معرکے کو اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے ہوئے دیکھ کر ادا کیا۔ افسوس کہ صدر امریکا روز صبح وہ کتاب پڑھتا ہے جو ''القدس'' پر حملہ آور صلیبیوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن مسلم حکمرانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو اپنی صبح کا آغاز قرآن پاک، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات یا ایوبی کے حالات کے مطالعے سے کرتا ہو۔ ''مقدس صلیبی جنگ'' کی کمان کرنے والے ''القدس'' کے بعد ''حرمین'' تک پہنچنے کے لیے متعصب پادریوں کے جنگی خطبات سے اپنا جی ورغلا رہے ہیں، لیکن حرمین اور القدس کے رکھوالے اپنے فرائض تو کیا ادا کرتے، دہشت گرد کہلوائے جانے کے خوف سے ان مجاہدین کا تعاقب کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے کعبہ اور قبلۂ اوّل کے تحفظ کی قسم کھا کر گھروں سے نکلے تھے اور اب موت کی آنکھوں میں آنکھیں اور پنجوں میں پنجے ڈال کر اسے پورا کر رہے ہیں۔

القدس ہجری کیلنڈر:

اس وقت جبکہ امریکا اور اس کی ''دُمچی'' برطانیہ ہر قسم کے اسباب پر قدرت رکھتے ہیں اور مزید کے حصول کے لیے دنیا بھر کو ساتھ ملا رہے ہیں، مسلمانوں کی بے خبری اور مقاصدِ عالیہ سے لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ ان سب کی اکثریت مسجدِ اقصیٰ کے متعلق الجھن میں ہے کہ اس کا مصداق کیا ہے؟ اس کے صحن میں واقع گنبدِ صخرہ اصل عمارت ہے یا اس میں قبلہ کی جانب موجود نماز کا ہال اصل مسجد اقصیٰ ہے؟ اس طرح کے بہت سے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن کے ساتھ نت نئی تحقیقات اور مضامین کے تراشے ملفوف ہوتے ہیں۔ اس واسطے ''ضربِ مؤمن'' کا نیا کیلنڈر اسی موضوع سے متعلق ہے۔ مسجدِ اقصیٰ یا بیت المقدس دراصل اس پوری چہار دیواری کا نام ہے جو حرم قدسی (اس لفظ کو حرم مکی اور حرم مدنی کے معنی کو ذہن میں رکھ کر پڑھیے) کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس چہار دیواری میں کئی عمارتیں، مدرسے، چبوترے، خانقاہیں، سبیلیں، تہہ خانے اور کتب خانے ہیں جو مسجد اقصیٰ کا ضمنی حصہ ہیں۔ ان عمارات میں سے دو اہم ہیں: قبلے کی جانب (فلسطین کا قبلہ بجانب جنوب ہے) مسجد کی مرکزی عمارت جس میں محرابِ داؤد، محرابِ زکریا اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کا منبر ہے۔ (یہ تاریخی منبر 1969ء میں بدفطرت یہودیوں نے جلا دیا تھا۔ اس مسجد کے صحن میں ذرا بلند جگہ ایک چٹان ہے۔ حجرِ اسود کی طرح یہ صخرہ (چٹان) مسلمانوں کے لیے بھی اہمیت کی حامل ہے نہ کہ فقط یہودیوں کے لیے۔ یہ چٹان جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے قبلہ تھی اسی طرح جناب خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی قبلہ رہی ہے۔ اہل علم دوسرے سپارے کے پہلے رکوع میں آیت کریمہ ''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا'' کے تحت مشہور کتب تفسیر دیکھ لیں۔ اس چٹان پر اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے جسے مسجد نبوی کی توسیع اور دمشق کی جامع مسجد اموی کی تعمیر کے علاوہ مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کا اعزاز بھی حاصل ہے، ایک شاندار گنبد تعمیر کروایا۔ جس طرح توراۃ و انجیل منسوخ ہو کر بھی قابل احترام ہیں اسی طرح یہ صخرہ قبلہ منسوخہ ہو کر بھی ہماری میراث ہے اور ہم اس سمیت مسجد اقصیٰ کی چہار دیواری میں واقع ایک اینٹ یا ایک انچ

زمین سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ یہودی جس طرح مسجد کے ہال کو منہدم کرنا چاہتے ہیں اسی طرح عجائبِ زمانہ گنبد کو بھی ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس کے اندر موجود چٹان کو مرکز بنا کر اس کے اردگرد ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ''ضربِ مؤمن'' کے تازہ کیلنڈر میں مسجدِ اقصیٰ کی عمومی تصویر کے ساتھ مسجد کے ہال اور گنبد کی نشاندہی کر کے مسلمانوں کے اس ورثہ کو اُن کے حافظے میں زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک فرضِ کفایہ:

اس گنبد کی تعمیر کے نگران مشہور تابعی رجاء بن حیوۃ اور یزید بن سلام تھے۔ رجاء بن حیوۃ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ہم نشین ساتھی اور مشہور اہل علم میں سے ہیں۔ انہوں نے جب محنت اور لگن سے تعمیر مکمل کی تو خلیفۂ وقت کو اطلاع دی کہ ایک لاکھ دینار بچ گئے ہیں۔ اس نے ان کو لکھا کہ یہ آپ کی محنت اور دیانت داری کا انعام ہیں، آپ رکھ لیجیے۔ انہوں نے لکھا کہ ہم کو اس اعزاز اور نعمت کے شکرانے میں اپنی بیویوں کا زیور بھی اس عمارت میں لگانا چاہیے نہ یہ کہ ہم اس کے بدلے کچھ لیں۔ اس پر خلیفۃ المسلمین نے حکم دیا کہ اس سونے کو پگھلا کر اس گنبد پر طلاکاری کر دی جائے، چنانچہ اس گنبد پر آج جو لافانی چمک اور خوبصورتی ہے اس میں مسلمانوں کے خون پسینے کی کمائی کے علاوہ ان دو جلیل القدر تابعین کی محبت و اخلاص کا نور بھی ہے۔ مسجدِ اقصیٰ کے عظیم ورثے سے تعارف کی طرح اسلامی قمری تقویم کو ذہنوں میں زندہ رکھنا بھی مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

اسلامی عبادات کا قمری تقویم سے مربوط ہونا شریعت اسلامیہ کے جامع مانع اور ناقابل تحریف و تنسیخ ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے، اس واسطے کہ شمسی تقویم میں رومی و یونانی بادشاہوں نے حسبِ منشا کئی مرتبہ ترمیم کی ہے اور سورج چونکہ ہر مہینے گھٹتا بڑھتا نہیں، سارا سال یکساں رہتا ہے اس واسطے ان تبدیلیوں کی کوئی گرفت نہیں کر سکتا۔ کسی کے پاس دلیل نہیں کہ عیسائی جسے 25 دسمبر کہتے ہیں یہ دن واقعی دسمبر کے مہینے میں ہے یا اگست کو دسمبر بنا دیا گیا ہے جبکہ چاند ہر مہینے گھٹتا بڑھتا ہے ایک ان پڑھ شخص بھی چاند کی حالتوں اور ساتویں، چودھویں اور اکیسویں کی شکل سے قمری تاریخ کا تعین آسانی کر سکتا ہے۔ اگر کوئی دشمن اسلام، اسلامی مہینوں اور تاریخوں میں گڑبڑ کی کوشش کرے بھی تو اس کی سازش اگلے مہینے سے آگے نہیں چل سکتی، لہٰذا قمری تقویم دنیا بھر میں واحد تقویم ہے جو کسی قسم کی ترمیم و تغیر سے قطعی محفوظ ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کی عبادات کے اوقات ہر طرح کی تحریف سے محفوظ ہیں جبکہ موجودہ عیسوی شمسی مہینے نہ صرف یہ کہ دیوی دیوتاؤں کے نام سے موسوم ہیں اور ان میں نجوم پرستی اور بت پرستی کا شائبہ پایا جاتا ہے بلکہ ان میں ایک سے زیادہ مرتبہ ایسی من چاہی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اب کچھ علم نہیں کون سا مہینہ حقیقت میں کب آتا ہے؟ لہٰذا عیسائیوں کے پاس جس طرح اس بات کی سند نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعتاً 25 دسمبر کو پیدا ہوئے تھے اسی طرح انہیں یہ بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ 25 دسمبر کا دن کون سا ہے؟ کئی مغربی محققین اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں۔

عبادات کو قمری مہینوں سے وابستہ کرنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ احکامِ شرعیہ کی تعمیل سال کے تمام موسموں میں ممکن ہوتی ہے کیونکہ قمری مہینے ہر سال گیارہ دن پیچھے آ کر بدلتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی پندرہ سال کی عمر میں روزہ رکھنا شروع کرے اور 50 سال عمر پائے تو ہر موسم میں روزہ رکھنے کی سعادت پا لیتا ہے کیونکہ 33 سال میں موسموں کا ایک پھیر مکمل ہو جاتا ہے، پھر قمری تقویم میں ابہام ہوتا ہے۔ رمضان اور عید الفطر کے موقع پر چاند کے دیکھے جانے اور نہ دیکھے جانے کے امکان سے جو لطف انگیز

کیفیت اور سنسنی خیزی پیدا ہوتی ہے وہ مسرت کا عجب سماں پیدا کرتی ہے۔ اگر عید وغیرہ کا دن شمسی تقویم کے اعتبار سے پہلے سے مقرر و متعین ہوتا تو اس سسپنس آمیز انتظاری خوشی سے لطف اندوز ہونا ممکن نہ تھا۔ مسلمان ہجری تقویم زندہ رکھنے کے ساتھ شمسی تقویم استعمال کر سکتے ہیں کہ سورج بھی ہمارے ربّ کا پیدا کردہ ہے لیکن شمسی مہینوں کے نام ایسے رکھنے چاہییں جو شرک کی یادگاروں سے مبرّا ہوں۔

ایک صلیبی جنگجو کی یادداشتیں

ایک مرتبہ پھر:

ژاوین ویل نویں صدی عیسوی میں ایک فرانسیسی ادیب اور وقائع نگار گزرا ہے۔ اس نے اس وقت کے فرانس کے بادشاہ سینٹ لوئس کے ساتھ ایک صلیبی مہم میں مشرق وسطی کا سفر کیا تھا۔ یہ یورپ کے مجنونانہ جنگی جوش کا زمانہ تھا اور بلغاریہ سے فرانس تک ہر یورپی فرمانروا کو اس وقت کے پادریوں نے باور کرایا تھا کہ تمہاری نجات اسلام کو مٹا دینے میں ہے۔ اس کے لیے جو جتنی کوشش کرے گا، خدا کے ہاں اتنا ہی مقبول ہوگا۔ بادشاہ فرانس کے دماغ کو بھی یہی بخار چڑھ گیا اور اس نے ان "مقدس جنگوں" میں کوئی قابل ذکر کردار ادا کر کے اپنا نام عیسائیت کے خدام میں لکھوانا چاہا، چنانچہ وہ بھی قسمت آزمائی کرنے بحیرۂ روم کے ساحل پر آ پہنچا۔ ژاوین ویل صلیبی لشکر کے ساتھ تھا۔ اس نے نہ صرف جنگی وقائع نگاری کی بلکہ دوڈھائی سال کے بعد جب یہ شکست خوردہ لشکر فرانس پہنچا تو اس نے اپنی یادداشت کی مدد سے سفرنامہ بھی لکھا۔ اس سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یورپ کے لوگوں کی جو پسماندہ حالت تھی وہ آج کے مسلمانوں سے ملتی جلتی ہے اور اس وقت کے مسلمان علم و دانش اور ایجاد و ترقی کی جس بلندی پر تھے آج کے یورپین نے ان کی خالی شدہ جگہ سنبھال لی ہے۔ اس وقت صلیب و ہلال کا جو معرکہ بپا تھا اس میں مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے شعائر اور مقدس مقامات کا باوقار طریقے سے تحفظ کیا بلکہ سیاست کاری سے لے کر میدانِ جنگ تک ہر معرکے میں ایسی شاندار کارکردگی دکھائی جس نے صدیوں تک یورپ کے صلیبیوں کو شکست خوردگی کے احساس سے دوچار رکھا۔ آج پھر یہ صلیبی نئے ارادوں کے ساتھ سرزمین اسلام جزیرۃ العرب میں آ ٹپکے ہیں اور ہلال وصلیب کا معرکہ ایک مرتبہ پھر برپا ہونے لگا ہے، مگر دلخراش بات یہ ہے کہ اس مرتبہ صورتِ حال یکسر الٹ چکی ہے۔ ترقی و کمال میں جو مقام مسلمانوں کا تھا وہ یورپ نے حاصل کرلیا ہے اور جو جگہ یورپیوں کی تھی وہ مسلمانوں نے لے لی ہے اور غضب یہ ہے کہ اُس وقت سارے مسلمان اپنے دین وملت کے تحفظ کے لیے متحدہ ہوگئے تھے، مگر آج بعض عرب ریاستیں امریکا کا یہ اعلان سن کر بھی کہ "وہ مشرق وسطی کی نئی انتظامی تشکیل چاہتا ہے۔" کھلم کھلا اس کا ساتھ دے رہی ہیں بلکہ خدمات کی پیش کش میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں لگی ہوئی ہیں گویا کہ وہ اتنی بے بس ولاچار یا کم عقل وکم نصیب ہو چکی ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو کلی طور پر دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ رکھا ہے، وہ پہلے ان کے پڑوسی کی گردن پر چھری پھیرے یا ان کا قصہ پہلے نمٹائے، انہیں اب اس سے کوئی غرض نہیں رہی۔ اندازہ لگائیے! کیا اس سے زیادہ حسرت ناک وقت مسلمانوں پر آسکتا ہے؟

بے بدل ہتھیار:

ژاوین ویل نے صلیبی جنگجوؤں کی جو کارگزاری لکھی ہے اس میں ہمیں ان حالات کی جھلک نظر آتی ہے جو آج کل ہمیں درپیش ہیں۔ ژاوین کی تحریر فرانسیسی لشکر کی ہی نہیں، اس عہد کی پوری مسیحی دنیا کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسیحی دنیا تعصب اور مجنونانہ

جوش سے بھری ہوئی تھی، اسے علم وحکمت اور سائنس وفنی ترقی سے کوئی واسطہ نہ تھا جبکہ مسلمان علم و دانش اور فنی مہارت کے علمبردار تھے۔ یورپین صلیبی صرف خوش کن تمناؤں اور جوش و جذبے کے سہارے فتح چاہتے تھے جبکہ مسلمان روحانی اور مادی دونوں قوتوں کے ساتھ میدان میں اترتے تھے۔ مسلمان اس وقت نہ صرف علمی و تصنیفی میدان میں سرگرم تھے بلکہ عسکری صلاحیت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی تک انہوں نے ایسی منجنیقیں ایجاد کرلی تھیں جو دشمن پر آتش گیر مادہ پھینک کر اسے اس کے مورچوں میں ہی جلا کر خاکستر کردیتی تھیں جبکہ فرانسیسی فوجوں کے پاس پرانے دستی ہتھیاروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ ہتھیار ان کے بوجھ میں اضافہ تو کرسکتے تھے لیکن اس ''جدید ترین'' منجنیق کے سامنے ان کے کسی کام نہ آسکتے تھے۔ اس دور مار میزائل میں سے آگ کے گولے پھینکنے کے لیے مٹی کا تیل (روغن نفط) کام میں لایا جاتا تھا جبکہ یورپی اس کے اس استعمال سے واقف ہی نہ تھے۔ مٹی کے تیل کا یہ استعمال سب سے پہلے مسلمانوں نے کیا۔ آذربائیجان کے تیل کے چشمے اس زمانے میں بھی مشہور تھے۔ وہیں سے یہ تیل شام اور مصر لایا جاتا تھا۔ فقہائے کرام نے زکوٰۃ الارض کی بحث میں ان چشموں والی زمین پر عشر خراج کے احکام کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھیے: کتاب الزکوٰۃ، باب العشر: شامیہ، ہدایہ، بدائع، عالمگیریہ وغیرہ) آج تیل کے ہتھیار کو آذربائیجان (بحیرۂ کیپسن کے کنارے واقع ملک جہاں تیل کے وسیع ذخائر کا انکشاف ہوا ہے۔) سے لانے کی ضرورت نہیں، مسلمان ممالک میں یہ دولت بافراط پائی جاتی ہے، مگر افسوس کہ کوئی اس بے بدل ہتھیار کے استعمالات تو جانے۔

ابلتی ہنڈیا کا ڈھکنا:

فرانسیسی فوج آئی تو بڑے کرّ وفرّ سے تھی لیکن مجاہدین ایسی چیز ایجاد کرچکے تھے جس کا کوئی توڑ اس کے پاس نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ژاوین کا ممدوح بادشاہ گرفتار ہوا اور فدیہ ادا کرنے کے بعد ہی اسے لوٹ کے گھر جانا نصیب ہوا۔ مسلمانوں سے ٹکرانے والے اکثر صلیبی حملہ آوروں کا یہی حال ہوا اور بالآخر وہ ٹھنڈے ہوکر صبح کے نکلے بدھوؤں کی طرح شام کو یورپ واپس پہنچ گئے۔

صلیبی حملے ختم ہوئے اور مسلمانوں نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن افسوس! کہ اس کے بعد معاملہ برعکس ہوگیا۔ مسلمان لمبی تان کر سوگئے جبکہ یورپی دنیا مسلمانوں کی ترقی کے راز کھوجنے لگی۔ مسلمانوں میں یورپیوں والی بدنظمی، کم علمی اور کام چوری پھیلتی گئی جبکہ یورپی مسلمانوں کے ورثہ کو لے اُڑے۔ اب ایک مرتبہ پھر یہ دونوں فریق آمنے سامنے ہیں، مگر ان کی خصوصیات بدل چکی ہیں۔ صلیبیوں نے اتنا کچھ سامان حرب جمع کرلیا ہے کہ جس کی تفصیل ہی ہیبت ناک ہے۔ غضب بالائے غضب یہ ہے کہ اس مرتبہ صلیبیوں کی پشت پر صہیونی اپنے سودی سرمائے، شیطانی دماغ اور مکروہ سازشوں اور مسلم کش مشوروں کے ساتھ موجود ہیں اور جس طرح تقسیمِ برصغیر کے وقت بڑے پیٹ اور سازشی دماغ کے توندو بنیوں نے پس منظر میں رہ کر سکھوں کے ذریعے مسلمانوں کا قتل عام کروایا تھا تاکہ ''مہابھارت'' کا منصوبہ تکمیل پاسکے، اسی طرح صہیونی منصوبہ ساز صلیبیوں کی مسلمانوں کے ساتھ تاریخی چپقلش کو ہوا دے کر اپنا راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں تاکہ ''عظیم تر اسرائیل'' کی حدود کو فدائی حملوں سے محفوظ کیا جاسکے۔ عیسائی عوام اس جارحیت کے خلاف یک آواز ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان کے ووٹوں سے منتخب ہوکر ان کے ٹیکس پر پلنے والے حکمران جنگ کی اُبلتی ہنڈیا کے ڈھکنے پر چڑھنے کے لیے کیوں بے تاب ہورہے ہیں؟ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں اپنی حالت زار کے تدارک کے لیے کہیں کوئی انقلابی سوچ پائی ہی نہیں جاتی۔ اگر کہیں کوئی بندۂ خدا ایسا عزم لے

کر اُٹھتا بھی ہے تو صہیونیت کے گماشتوں نے مسلمان ممالک میں ایسا اثر ونفوذ حاصل کر رکھا ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنے ہرکارے لگا کر اس کی آواز کو توانا ہونے سے پہلے دبا دیتے ہیں۔ اندھیرا اس قدر بڑھ چکا ہے کہ کہیں سے روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ عیسائی عوام تو ہماری خاطر احتجاج کر رہے ہیں اور ہم خود اپنے ہاتھوں سے اس کے خلاف پاکستان کے تحفظ کی جنگ لڑنے والے مہمان مجاہدین کو گرفتار کر کر کے طاغوتِ اعظم کے حوالے کر رہے ہیں۔ سورۂ حدید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں اتاری تھیں: کتاب اتاری تھی روحانی تربیت وترقی کے لیے، اس سے ہم نے پوری طرح روگردانی کر رکھی ہے۔ لوہا اُتارا تھا دنیاوی ترقی اور برتری کے لیے، اس کے نت نئے استعمال کی تحقیق ہم نے اپنے اوپر ممنوع قرار دی ہے۔ جب روحانیت اور مادیت کے راستے ہم نے اپنے اوپر خود ہی بند کر لیے تو رَبّ تعالیٰ ہماری کیا مدد کرے اور کیوں کرے؟ اب صرف اس کا امت محمدیہ پر یہ خصوصی فضل ہی غیب سے ایسی کوئی صورت پیدا کر سکتا ہے جو صہیونیت کے ورغلائے ہوئے صلیبیوں کی گرمی کا توڑ کر دے۔ اللہ کی بے نیاز ذات چاہے تو کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود سب کچھ کر سکتی ہے۔ اے ضعیفوں کی مدد کرنے والے! بدکردار کافروں کو ہم پر مسلط نہ فرما اور مسلمانوں کو اتنی طاقت عطا فرما کہ وہ بڑبولے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے نیست ونابود کر سکیں۔

طوفان کی دستک

روئیے تو کس کو روئیے!

دنیا بھر کے عوام چیختے چلاتے رہ گئے، عالمی راہنما مذمتی بیانات جاری کرتے رہے، شعرا نے تیرہ ہزار نظمیں کہہ ماریں، اقوام متحدہ اپنی لنگڑی بیساکھیوں پر اچھل اچھل کر ''تشویش'' کا اظہار کرتی رہی لیکن صلیبی طاقتوں نے صہیونی منصوبہ سازوں کی تحریک پر سقوطِ بغداد کے خاکے میں رنگ بھرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے خون اور ان کی مٹی کے تیل کے بھوکے صلیبی، بموں کی برسات، میزائلوں کی بارش، آگ اور دھوئیں کے بادل اور ٹینکوں اور توپوں کی گرج دھمک کے ساتھ مسلمانوں کی مقدس سرزمین پر بزورِ طاقت قبضہ کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ہلاکو خان کا جنگی جنون ان کے سامنے ہیچ ہے اور چنگیز خان کی سفاکیت ان سے شرما رہی ہے۔ بغداد میں قیامت کا منظر ہے۔ اس حسین شہر میں آج آگ اور راکھ ہے، فضا میں بارودی دھماکے ہیں، زمین پر موت اور تباہی ہے، صہیونیت کے اشارے پر امریکا و برطانیہ ابلیسی رقص کر رہے ہیں، شیطانیت برہنہ ناچ رہی ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب کچھ کس کے تعاون اور ''لاجسٹک سپورٹ'' سے ہو رہا ہے؟ اس کویت کی مدد سے جس کے عیاش شیخوخڑے اپنی دولت امریکا و یورپ میں اور امریکا کے فوجی اپنی چھاؤنیوں میں رکھتے ہیں۔ اس بحرین کے تعاون سے جس کے عیش پسند حکمران اپنی راتیں یورپ کے کلبوں میں جاگ کر اور دن نیم اندھیرے میں سو کر گزارتے ہیں۔ اس قطر کی طرف سے اڈے فراہم کرنے کی وجہ سے جس کے نااہل حکمرانوں کی عیش پرستی کے قصے سوئٹزرلینڈ کے ہوٹلوں سے مناکو کے ساحلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ عمان اور امارات کا ذکر چھوڑیئے، وہ کس شمار قطار میں ہیں؟ سعودی عرب نے بھی اپنی فضائیں کھول دی ہیں تاکہ وہاں سے صلیبی جنگجو اُڑن کھٹولوں میں بیٹھ کر خدام حرمین کے سروں پر سے گذرتے ہوئے بصرہ و کوفہ کو تاراج کریں اور پھر ان عیاش حکمرانوں کو یہودیت کے آستانے پر جھکا کر رسوا کریں۔ ترکی نے بھی اپنا فائدہ اسی میں سمجھا ہے کہ وہ ان اتحادی افواج کو راستہ دے دے جنھوں نے اس کے سر سے خلافتِ عثمانیہ کا سایہ کھینچ کر اس کے دست و بازو کاٹ کر اس سے بدترین دشمنی کی تھی۔ روئیے تو کس کو روئیے کہ چمن کے اُجڑنے میں خزاں کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا خود باغبانوں کی کرم فرمائی ہے۔ عراق کے گرد و پیش میں موجود تمام مسلمان ممالک نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کے باوجود کہ وہ امریکا کے خوفناک اسلحے اور ناپاک ارادوں کے سامنے ایک دن کے لیے نہیں ٹِک سکتے، پھر بھی صلیبی حملہ آوروں کا بھرپور ساتھ دیا ہے اور دنیا کو یہ باور کرا دیا ہے کہ وہ آپس میں متحد نہ سہی، اپنے دشمنوں کے ساتھ ضرور متفق و متحد ہیں۔

خون اور آنسو:

مسلمان کا خون اور آنسو دونوں قیمتی ہیں اور جب یہ دونوں مل جاتے ہیں تو اللہ رب العزت کے دربار میں ان کی

قیمت ضرب کھا کر کئی گنا بڑھ جاتی ہے تب اس کی غیبی قوتیں حرکت میں آتی ہیں اور مسلمانوں کی بگڑی بن جاتی ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے ایک دوست، ہم مجلس اور مشیر، قاضی ابن شداد گزرے ہیں۔ انہوں نے سلطان کی وفات کے بعد ان کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کی یادداشتیں قلم بند کی ہیں۔ قاضی صاحب چونکہ بیک وقت راسخ العلم عالم، مجاہد باعمل، صاحب طرز ادیب، اہم حکومتی عہدے پر فائز ہونے کے سبب سلطان کے قریبی اور بااعتماد ساتھیوں میں سے شمار ہوتے تھے اور انہوں نے تمام صلیبی معرکوں کا قریب سے مشاہدہ کیا تھا اس واسطے مؤرخین ان کی یادداشتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کی تحریر کو ایک ثقہ راوی کی معتبر حکایت سمجھا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلطان کو ان صلیبی افواج سے جو بیت المقدس کے گرد جمع تھیں سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس فتح کر لینے کے بعد اس کی حفاظت کی سخت فکر تھی، وہ ہر قیمت پر اس کا دفاع کرنا چاہتے تھے لیکن بیت المقدس کی فتح کی خبر سن کر روم سے انگلستان تک غیظ وغضب کی آگ بھڑک اٹھی تھی) اور یورپ کا کوئی بادشاہ، سپہ سالار اور جنگ آزما ایسا نہ رہا تھا جو فلسطین کے چھوٹے سے ملک پر ابل نہ پڑا ہو۔ ان دنوں سلطان بہت متفکر رہا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سردیوں کا زمانہ تھا، جاڑے کی یخ بستہ راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا۔ ہم دونوں نے تمام رات ذکر و دعا میں جاگ کر گذاری، میں نے اخیر شب میں سلطان سے درخواست کی کہ کچھ دیر آرام کر لیں کیونکہ مسلسل جاگتے رہنے سے ان کے مزاج پر خشکی کا غلبہ اور طبیعت کے ناساز گار ہونے کا خطرہ تھا، مگر انہوں نے آنکھ تک نہ جھپکی۔ ہم پھر نماز و دعا میں مشغول ہو گئے۔ مجھ سے سلطان کی فکرمندی دیکھی نہ جاتی تھی، بالآخر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک بات ڈالی اور میں نے سلطان سے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور گریہ وزاری کے ساتھ اپنی حاجت اور ضرورت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان کر کے معاملہ ان پر چھوڑ دیں۔ انہوں نے پوچھا: ''اس کی کیا ترکیب ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمائیں اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے اور پہلے کسی معتبر آدمی کے ذریعے بالکل پوشیدہ طور پر کچھ صدقہ کریں، پھر اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں۔ ایک حدیث میں اس کی فضیلت اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں:

''خدایا! مادی اسباب اور دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لیے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے آستانہ پر سر رکھ دیا جائے اور تیرے سہارے کو مضبوط پکڑ لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے اور تو ہی میرا حامی و ناصر ہے۔'' مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا۔ سلطان نے ایسا ہی کیا، میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدے میں پڑے ہیں، آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھی تر ہو گئی ہے اور جائے نماز پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انہوں نے کیا دعا کی، لیکن اسی دن سے ان کی دعا کی قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار واضطراب پیدا ہوا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعات آتی رہیں اور یہاں تک کہ دوشنبہ کی صبح تک میدان بالکل صاف ہو گیا۔'' دراصل سلطان کے پاس دو چیزیں تھیں: ''خون اور آنسو'' خون اس نے خدا کی راہ میں پیش کر دیا تھا اور اس میں کسر نہ چھوڑی تھی لہٰذا جب اس نے آنسو بہائے تو رب العزت نے ان کی

لاج رکھ لی۔ افسوس! کہ ہمارا خون حرام خوری کی وجہ سے کام کا نہیں رہا اور ہمارے آنسو دل کی شقاوت اور سختی کی وجہ سے خشک ہو گئے ہیں لہٰذا نہ اللہ تعالیٰ کی مدد اترتی ہے اور نہ غیب سے کوئی کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔ اے اہل ایمان! کیا جب کفار تمہاری عزت پامال کر دیں گے اور تم آنسو بہانے کے قابل بھی نہ رہو گے تب اللہ کی طرف متوجہ ہو گے؟ کیا اتنی مہلت تمہیں اس وقت دشمن دے دیں گے؟

ٹوڈی نواب اور تیلی خان بہادر:

مسلمانوں کے پاس خون اور آنسوؤں کے علاوہ ایک اور چیز بھی نہایت قیمتی تھی جو خالص خدائی عطا تھی اور اگر اسے حکمت اور سلیقے سے استعمال کیا جاتا تو آج بے بسی، بے چارگی اور مظلومیت کے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ یہ بے بہا دولت انہیں بغیر کسی کوشش و محنت کے مل گئی تھی اور انہیں دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا سکتی تھی، مگر اس کا کیا کیجیے کہ وہ اس کے مالک ہو کر بھی مالکانہ حقوق نہیں رکھتے اور اس طاقت کے پاس ہوتے ہوئے بھی وہ کمزور اور لاچار ہیں۔ عرب اور خلیج عرب میں دنیا کے قیمتی اور عمدہ ترین تیل کے لامحدود ذخائر پائے جاتے ہیں۔ دوسروں کی دولت سے اپنا گھر روشن کرنے کے شوقین ڈاکو صفت لٹیرے انگریزوں نے اس چیز کو بہت پہلے تاڑ لیا تھا، لہٰذا جنگِ عظیم دوم کے اختتام پر انہوں نے سرزمین عرب کو آپس میں پائن ایپل کے کیک کی طرح بانٹنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم خود یہاں اپنے سڑے ہوئے وجود کے ساتھ رہیں گے تو اس کی بدبو سے مسلمان مشتعل ہو کر آزادی کی تحریکیں شروع کریں گے اور پھیکی رنگت والی مکار گوری چمڑی کا شکار ان کا محبوب مشغلہ بن جائے گا اور عالم اسلام بھی کبھی اس تسلط کو برداشت نہ کرے گا لہٰذا انہوں نے نو آبادیاتی نظام کے اصول کے تحت برصغیر کے ٹوڈی نوابوں اور تیلیوں کی نسل کے خان بہادروں کی طرح عرب ریاستوں میں سے اپنی مرضی کے افراد کو چنا اور انہیں اس زرخیز زمین کے ٹکڑے بانٹ بانٹ کر دے دیئے۔ دریائے فرات اور دجلہ کی حسین اور سرسبز وادیاں فیصل بن حسین کو اور دریائے اُردن کے زرخیز علاقے عبداللہ بن حسین کو ملے۔ یہ دونوں شریف مکہ حسین بن علی کے ''فرزند ارجمند'' تھے۔ جی ہاں! وہی کم بخت شخص جو شریف حسین کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے اور جس نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو انگریزوں کے حوالے کر کے برصغیر کی خود مختارانہ آزادی کی راہ مسدود کی تھی۔ عبداللہ بن حسین 1920ء سے 9151ء تک اردن کا حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا طلال بن عبداللہ اس کا جانشین ہوا۔ لیکن صرف ایک سال تک ہی انگریزوں کی وفاداری کو طوق گردن پر اٹھا سکا۔ اس کے بعد حسین بن طلال کی حکمرانی کا طویل دور شروع ہوا جو 1952ء سے گزشتہ صدی کے اختتام تک تقریباً 50 برس تک جاری رہا۔ یہ حسین بن طلال مغربی طاقتوں کا وہی بدنام زمانہ ایجنٹ تھا جو شاہ حسین کے نام سے مشہور تھا اور جس نے فلسطینی مجاہدین اور مہاجرین پر زندگی کی راہیں تنگ کرنے اور یہودیوں کو ہمہ قسم سہولت اور تعاون فراہم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس کی موت پر دنیا بھر کے مسلم دشمن حکمران اس کے جنازے پر پہنچے اور اس کے لڑکے شاہ عبداللہ کی تاج پوشی کے بعد رخصت ہوئے۔ اس خاندان کو ہاشمی پکارا جاتا ہے اور ان کی مملکت ''المملکۃ الأردنیۃ الھاشمیۃ'' کہلاتی ہے، مگر شاہ حسین کی ایک بیوی امریکی یہودی تھی اور دوسری بیوی برطانوی عیسائی۔ شاہ عبداللہ اس امریکی یہودن کے بطن سے جنم لینے والا نجیب الطرفین اور

''خاندانی'' ہاشمی ہے۔

گردن گھسّے مرغے:

بات اردن کی طرف پھر گئی حالانکہ موضوع گفتگو عراق ہے۔شریف حسین نامی ننگِ انسانیت غدار کا دوسرا لڑکا فیصل بن حسین 1921ء سے لے کر 1958ء تک عراق کا حکمران رہا۔اس کے بعد حسب دستور غلامی کے آداب سے آشنا اس کی اگلی نسل حکمران ہوتی، مگر صدر صدام 1956ء میں عراق کی سیاست میں داخل ہوئے اور عراق کو اس بکاؤنسل کے گردن گھسّے مرغوں سے نجات دلا دی۔ 1967ء سے آج تک وہ حکمران ہیں۔اس شخص کو اب اس جرم کی سزا دی جارہی ہے کہ اس نے اپنے ملک کو آہستہ آہستہ امریکا اور برطانیہ کے شکنجے سے نکال کر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔اس نے دیگر عرب ریاستوں کی طرح اپنی دولت اشیائے تعیش کی فراوانی پر خرچ کرنے اور کرائے کے فوجی ملازم رکھ کر ان سے چوکیداری کا کام لینے کے بجائے اپنی عسکری قوت کو مضبوط کیا۔امریکا کے حریف روس اور یورپ کے بعض اسلحہ فروش ممالک سے مختلف قسم کا اسلحہ لے لے کر جمع کرنے کے ساتھ اپنے سائنس دانوں کو بھی ہر قسم کی سہولت فراہم کر کے انہیں بہتر سے بہتر کارکردگی پیش کرنے پر آمادہ کیا۔اگر 1973ء میں اسرائیلی پائلٹ امریکی طیاروں میں بیٹھ کر عراق کا ایٹمی پلانٹ تباہ نہ کرتے تو آج عراق ایٹمی طاقت ہوتا اور امریکا کا بغل بچہ اسرائیل، فلسطینی مسلمانوں سے وہ وحشیانہ سلوک نہ کرسکتا جو آج مالدار ترین عرب حکمرانوں کے ناک تلے کر رہا ہے۔ الغرض تیل تو دوسری عرب ریاستوں کے پاس بھی ہے لیکن وہ امریکا کے آگے ایسی ہیں جیسے غریب دیہاتی کسی مُچھڑ تھانیدار کے سامنے پیشی کے وقت ہوتا ہے لہٰذا ان کے پاس جو کچھ ہے وہ پہلے ہی امریکا و برطانیہ نے مل بانٹ کر لوٹا ہوا ہے لیکن عراق اولاً تو ان تیل چوس طاقتوں کو گھاس نہیں ڈالتا، دوسرے وہ اپنے عوام کو عیش پرستی کا عادی بنانے کے بجائے جفاکشی اور حب الوطنی کا درس دیتا رہا ہے۔ فلسطینی مجاہدین کی حمایت اور دامے درمے سخنے ان سے تعاون کا جرم بھی اس کی عادت ہے لہٰذا اب اسے تاریخ کی ہولناک ترین صلیبی یلغار کا سامنا ہے۔

بے نام سی مُردنی:

صلیبی بہت پہلے سے اسلام کے قلب پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں لیکن اس مرتبہ اسلام دشمنی کے ساتھ تیل کی چکناہٹ بھی ان کو ورغلا رہی ہے۔فرانس اور جرمنی پیچھے ہٹے ہیں تو اسپین اور آسٹریلیا نے ان کی جگہ سنبھال لی ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے ساتھ عرب بھر کے مجاہدین اپنی سعادت سمجھ کر جمع ہو گئے تھے اور اس کی ذات ایسی جامع صفات تھی کہ سب اس کی اطاعت میں فخر محسوس کرتے تھے، لیکن اس مرتبہ اول تو عرب ریاستوں نے خوشی خوشی امریکی ٹینکوں کے راستے سے کنکر پتھر ہٹائے ہیں، دوسرے صدر صدام کی شخصیت ایسی معمّا نما اور ان کی کچھ باتیں ایسی پریشان کن ہیں کہ عراق اور مظلوم عراقی مسلمانوں سے ہمدردی کا جذبہ صدر صدام کی کچھ نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کے سبب کچھ دب سا جاتا ہے۔ادھر تیسری طرف غضب یہ ہے کہ امریکا کے دروغ گو پروپیگنڈہ بازوں نے جھوٹی خبروں سے ایسا طوفان مچایا ہے جیسے کرائے کی میراثنیں جمع ہو کر گلا پھاڑ رہی ہوں، مگر اہل اسلام میں نہ کہیں دعاؤں کا اہتمام ہے نہ رجوع الی اللہ کی کیفیت ہے، نہ قنوتِ نازلہ کسی خاص دل سوزی کے ساتھ پڑھی جارہی ہے نہ گناہوں سے توبہ اور ذکر و

استغفار کی فضا ہے، نہ ایمانی حرارت کے مناظر ہیں نہ اخوتِ اسلامی کے جذبے کی گرم جوشی کا مظاہرہ ہے۔ عوام وخواص پر کچھ ایسی مُردنی چھائی ہے کہ نہ اسے کوئی نام دیا جا سکتا ہے نہ اس کا کوئی فوری علاج سمجھ میں آتا ہے۔ اب خدا خبر کہ ہمارے مظلوم عراقی بھائیوں پر کیا گزرتی ہے؟ طالبان نے 35 دن یعنی پورے پانچ ہفتوں تک امریکا کی قیامت خیز بمباری کو نسوار کی سوکھی پیک جتنی اہمیت بھی نہ دی تھی۔ وہ اپنے ایمان، توکل، تقویٰ، اطاعت گزاری اور اتفاق کی بدولت جتنا کچھ کر سکتے تھے وہ انہوں نے بخوبی کیا، لیکن اسباب کی کمی اور باغیوں کی ذلالت کے سبب وہ امریکا کا خاطر خواہ استقبال نہ کر سکے۔ عراق کے پاس اسباب کا کافی حد تک ذخیرہ ہے لیکن ایمانی قوت اور تعلق مع اللہ کی وہ کیفیت تا حال سامنے نہیں آئی جو طالبان میں تھی۔ اس ادھورے پن نے امت کی کشتی کو عین اس وقت منجدھار میں پھنسا رکھا ہے جب صلیبی طوفان عالم اسلام کی دہلیز پر دستک دے رہا ہے۔ دیکھیے کب کوئی ایسی ہستی سامنے آتی ہے جو دونوں صفات کی جامع ہو اور فتح و نصرت کے وہ دن دیکھنے کو ملیں جن کے لیے آسمان کی آنکھیں بھی ترس گئی ہیں۔

ابو جعفر منصور سے صدر صدام تک

جنت سے جنت کی طرف:

مشہور بزرگ ابواسحاق فیروز آبادی نے ایک مرتبہ فرمایا: ''جو بغداد میں ایک مرتبہ اس حالت میں داخل ہوا کہ اس کے سر میں صحیح سالم عقل اور طبیعت میں سلامت روی تھی تو وہ بغداد میں مر کر ہی اس دنیا سے جائے گا یا اس کی حسرت میں مرے گا۔''

ابن مجاہد المقری کہتے ہیں: ''میں نے ابوعمرو بن العلاء کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ انہوں نے فرمایا: ''اس بات کو رہنے دو، جو شخص بغداد میں رہا اور اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے پر قائم رہا تو وہ ایک جنت سے دوسری جنت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔''

یونس بن عبدالاعلیٰ کہتے ہیں کہ مجھ سے امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ پوچھا: ''تم کبھی بغداد گئے ہو؟'' میں نے کہا: ''نہیں۔'' فرمایا: ''تم نے نہ دنیا دیکھی نہ دنیا کے لوگ دیکھے۔''

ابن العمید الکاتب عربی کے شہرۂ آفاق ادیب گزرے ہیں۔ ان کے پاس جب کوئی نوجوان فاضل امتحان کے لیے آتا تو اس سے بغداد کے خواص، محاسن اور جاحظ کی کتابوں کے بارے میں پوچھتے۔ اگر وہ اس بارے میں خاطر خواہ معلومات رکھتا تو وہ اسے کامیاب کر دیتے ورنہ نہیں کیونکہ ان کے خیال میں انسان کے روشن خیال اور صاحب علم ہونے کے لیے اس زمانہ میں یہ دو چیزیں ضروری تھیں۔

ایک مرتبہ ابن العمید کے ایک ساتھی بغداد کے سفر سے لوٹ کر ان سے ملنے آئے تو انہوں نے بغداد کا حال پوچھا۔ اس نے فی البدیہہ کہا: ''بغداد فی البلاد کالأستاذ فی العباد''۔ ''بغداد دنیا کے شہروں میں ایسا ہے جیسے غلاموں کے درمیان ان کا استاد کھڑا ہو۔''

شہروں کا انسائیکلوپیڈیا:

علامہ یاقوت حموی نے یہ سارے اقوال اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''معجم البلدان'' (شہروں کا انسائیکلوپیڈیا) کی پہلی جلد میں لفظ ''بغداد'' کے تحت نقل کیے ہیں اور اسے ام الدنیا، سید البلاد، مدینۃ السلام اور بلدۃ الاسلام کے شاندار الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مؤرخین کے مطابق اس تاریخی شہر کو صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پڑپوتے منصور باللہ ابوجعفر عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب، جو دوسرا عباسی خلیفہ تھا، نے تعمیر کیا۔ ابوجعفر منصور کو دراصل ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں وہ کوفہ والوں کی شورش اور بدعہدیوں سے امن پا کر بارِ حکومت انجام دے سکے۔ اس نے کئی جگہوں کا جائزہ لینے کے بعد دو دریاؤں کے درمیان اس زرخیز اور شاداب جگہ کا انتخاب کیا اور دوسری صدی ہجری کے وسط (145ھ ___ 149ھ) میں اس کی پہلی اینٹ یہ کلمات پڑھ کر رکھی: ''بسم اللہ والحمدللہ، والارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ، والعاقبۃ

للمتقین۔" اس جگہ کے انتخاب میں اس کے پیش نظر یہ بات تھی کہ عام رعایا اور لشکر دونوں کو خوراک وغذا وافر ملے گی اور دشمن سے حفاظت کا خاطر خواہ انتظام رہے گا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ ابوجعفر منصور کی دور اندیشی کو داد دینی چاہیے کیونکہ سرزمین عراق جو کئی ترقی یافتہ اور متمدن تہذیبوں کا مرکز رہی ہے، اس میں جا بجا بکھرے ہوئے قدیم قوموں کے آثار کے درمیان اس سے بہتر کسی جگہ کا انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ بغداد کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس شہر کو دجلہ کے راستے ہندوستان، چین، سندھ، بصرہ اور واسط سے رسد آسکتی ہے، اور فرات کے پُلوں سے شام، فلسطین، مصر اور افریقہ سے سامان پہنچ سکتا ہے۔ آرمینیا اور آذربائیجان مشرق اور موصل و دیار بکر شمال کی طرف سے آمد ورفت کا راستہ بن جاتے ہیں اور اگر دشمن گھیرا ڈال لے تو دجلہ وفرات کے پل اڑا کر سکون وآرام سے اس کی بے بسی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس شہر کی سنگِ بنیاد رکھتے وقت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو بھی تشریف لانے کی دعوت دی گئی تھی اور اس وقت کے مشہور محدث حجاج بن ارطاۃ جن کی روایات حدیث کے طالب علموں میں مشہور ومعروف ہیں، بھی تشریف لائے تھے۔ ابوجعفر منصور نے اسلامی سلطنت کے مختلف شہروں موصل، کوفہ، واسط، مصر وشام وغیرہ سے معمار اور انجینئر بلائے اور اہل علم وفضل اور دیانت دار انجینئروں کی ایک جماعت ان کی نگرانی پر مقرر کی۔ اس وقت شہر کی دیوار نیچے سے 60 ہاتھ اور اوپر سے 20 ہاتھ چوڑی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ تعمیر میں لکڑی کی جگہ بانس استعمال کیے جائیں۔ تمام مکانات کو ہوا، روشنی اور دریا سے چلنے والی نسیم جانفزا کے رخ پر بنایا گیا اور یوں ایک شاندار، پُرشکوہ، آب وہوا اور صحت وصفائی کے لحاظ سے مثالی شہر وجود میں آیا۔

سیاہ پوش فدائی:

آج کل جب اتحادیوں کے آسمان کو چھوتے دعوے اور پھر وہاں سے پلٹ کر ان کے چہرے کو کالا کرتی جھوٹی تاویلیں سننے میں آرہی ہیں تو ابوجعفر منصور کی اس شہر کے لیے کی گئی منصوبہ بندی اور صدر صدام حسین کی منصوبہ بندی میں مماثلت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ صدر صدام حسین اور ان کے جواں مرد بیٹے نے مل کر ایسی فوج کو بذاتِ خود تربیت دے کر تیار کیا ہے جس نے بغداد کے گرد اپنے جسموں سے دفاعی حصار قائم کر کے اس میں جذبوں کی روح پھونک رکھی ہے۔ اتحادی افواج خوش فہمی میں مبتلا ہو کر کھلے علاقے سے بغیر مزاحمت کے گذر کر اندر تک گھس گئیں، مگر جب بغداد کے فدائیوں کی پہنچ تک آئیں تو اب ان سے نہ واپس جایا جاتا ہے، نہ آگے بڑھا جاتا ہے۔ پیچھے جانے میں ذلت ورسوائی ہے اور آگے بڑھنے میں بمبار موت ان کی منتظر ہے۔ اگرچہ گوریلا جنگ میں مدمقابل سے ایک دو شہر چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ یہ تو اس نوعیت کی جنگ کا نقطۂ عروج ہوتا ہے کہ دشمن کو جال کے اتنے اندر آنے دیا جائے کہ پھر وہ باہر نکلنے کے لیے جتنا پھڑکے، جال کے تار اس کے بھڑ پھوس جسم کے اتنے ہی اندر اترتے چلے جائیں...... لیکن اس کے باوجود بغداد کے فدائیوں نے اب تک اتحادی سورماؤں کو قریب پھٹکنے نہیں دیا اور اتحادی حیران ہیں کہ ریت کا طوفان تو ان کے منہ میں باریک مٹی جھونک کر گزر چکا ہے لیکن اس طوفان کا کیسے سامنا کریں جو آگ کی خندقوں کے پار فدائیوں کی شکل میں ان کا منتظر ہے۔ ان سیاہ پوش جانثار فدائیوں کی مختلف جماعتوں کی تشکیل صدر صدام حسین نے جنگ خلیج کے بعد خود کی ہے اور انہیں دیگر فوجیوں سے 40 فیصد زیادہ تنخواہ، بہتر ہتھیار اور ترجیحی مراعات دی جاتی ہیں۔ ان کا انتخاب صدر صدام حسین کے وفادار مخصوص قبائل سے ہوتا ہے اور اس چناؤ میں نہایت سخت طریق کار اپنایا جاتا ہے۔

انہوں نے موت پر حلف اٹھا کر بغداد کے گرد دو دفاعی حصار قائم کر رکھے ہیں اور ہمہ وقت اتحادیوں کے شکار کے منتظر رہتے ہیں، چنانچہ اب تک اتحادی کمانڈروں کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں اور ان کو اتنی ذہانت اور چالاکی سے گھیرا گیا ہے کہ ان سے اگاڑی بچائی جاتی ہے نہ پچھاڑی چھپائی جاتی ہے۔

موت کے اُڑتے لفافے:

صدر صدام حسین کی حفاظتی منصوبہ بندی کی طرح ان کے محلات کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ابوجعفر منصور نے بغداد کے وسط میں جو محل بنایا تھا اس میں چار دروازے تھے۔ مشرق کی طرف سے بابِ خراسان، حجاز کی طرف سے بابِ کوفہ، مغرب کی طرف سے بابِ شام اور فارس، بصرہ، اہواز اور بحرین کی طرف سے بابِ بصرہ کے ذریعے داخل ہوا جا سکتا تھا۔ شہر کی فصیل گول تھی اور اس کے بیچوں بیچ یہ بلند و بالا اور مستحکم و مضبوط محل تھا جہاں ابوجعفر اپنے حفاظتی دستوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ صدر صدام حسین نے بھی کچھ اس قسم کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ ان کے مختلف ہم شکل ایک ہی وقت میں کئی محلات میں داخل ہوتے اور نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب بغداد کے مشرق میں واقع ایک صدارتی محل سے ''صدر صدام'' نکل رہے ہوتے ہیں تو اسی وقت شہر کے مغرب میں واقع محل میں پرچم لگی صدارتی گاڑی اس حال میں داخل ہو رہی ہوتی ہے کہ دروازے پر کھڑے فدائی گاڑی میں بیٹھے اپنے قائد کو سیلوٹ مار رہے ہوتے ہیں۔ امریکا کو انتہائی آسان جیت کی توقع اس بنیاد پر تھی کہ ممنوع اسلحہ کی تلاشی کے بہانے اقوامِ متحدہ کے انسپکٹروں کے روپ میں امریکی جاسوسوں کی ٹیم صدر صدام کے صدارتی محلات کا معاینہ کر چکی تھی اور ان کے ذریعے موصولہ اطلاعات کی بنا پر گلوبل پوزیشننگ سیٹلائٹ سسٹم (GPS) کے ذریعے زمین پر موجود ان اہم اہداف کا تعین کر لیا گیا تھا۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق عراق میں اسلحہ انسپکٹروں کو بھیجنے کا اصل مقصد بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تلاش نہیں بلکہ سیٹلائٹ گائیڈڈ اور کمپیوٹر سے کنٹرول کیے جانے والے نام نہاد ''اسمارٹ ہتھیاروں'' سے نشانہ بنانے کے لیے ضروری اہداف کے درست مقام کا تعین کرنا تھا۔

خالہ جی کے گھر سے:

گزشتہ سے پیوستہ کالم میں عرض کیا تھا کہ صدر بش کی میز کی سب سے اوپر کے خانے میں ایک فہرست رکھی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی فہرست ہے جو 11 ستمبر کے حملوں میں کسی طرح شریک تھے۔ جب بھی ان جانبازوں میں سے کوئی گرفتار یا شہید ہوتا ہے تو صدر بش اس کے نام پر نشان لگا دیتا ہے۔ آج کل صدر بش کو اس دراز میں جھانکنے کی فرصت نہیں کیونکہ ان کے کمرے میں سے جو کھڑکی عراق کی طرف کھلی ہے اس سے آنے والی ہوائیں اور خبریں ان کے حواس کو ''بحال'' رکھنے کے لیے کافی ہیں، لیکن امریکا میں ایک شخص اور ہے جس نے اپنے دراز میں ایک نقشہ دھر رکھا ہے اور وہ آج کل بڑی بے تابی سے اس میں رنگ بھرنے میں مصروف ہے۔ یہ شخص کون ہے اور امریکی سیاست میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اسے ہم بعد میں ذکر کریں گے، پہلے اس منصوبے پر ایک نظر ڈال لی جائے جو اس کے شیطانی دماغ نے ترتیب دیا ہے۔ واضح رہے کہ 108 صفحات پر مشتمل یہ خفیہ ترین دستاویز جس پر اس منصوبہ کی جزئیات درج ہیں، منظرِ عام پر نہ آ سکتی اگر بدنام زمانہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے جاسوس اسے اپنی خالہ جی کے گھر (سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر) سے چُرا کر نہ لے جاتے اور ان

سے ایک عرب صحافی نہ لے اُڑتا۔ اس دستاویز کے مطابق عراق، سعودی عرب، قطر، کویت اور یمن تمام ملکوں کو مزید ٹکڑے کر کے کوریا اور تیمور کی طرح مشرقی و مغربی یا مذہبی و سیکولر یا شیعہ و عرب ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس مکروہ منصوبے کی جزئیات طے کرنے کے ساتھ اس میں کام آنے والے ننگ ملت غدار مُہروں کا تعین بھی کر لیا گیا ہے، چنانچہ جو عرب ممالک آج اتحادیوں کے ''معاون و مشیر خاص'' بنے ہوئے ہیں کل انہی کی گردن پر سب سے پہلے چھری پھرنے والی ہے لیکن وہ چارو نا چار اتحادیوں کے اشارے پر اس طرح چل رہے ہیں جیسے ست بیل تھک ہار کر اپنے آپ کو بے رحم قصابوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

پردے کے پیچھے سے:

یہ شخص جو اس منصوبے کا موجد اور صدر بش کی پالیسیوں کا تانا بانا بُننے کا ذمہ دار ہے، اپنے وسیع سیاسی تجربے اور صدر بش پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کے پیش نظر تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ امریکی صدر کی شخصیت ایک سایہ ہے اور اس کے پیچھے اصل مرکزی کردار اسی پراسرار شخص کا ہے۔ یہ شخص محض 34 برس کی عمر میں ایک سابقہ امریکی صدر کے زمانہ صدارت کے دوران وائٹ ہاؤس کا سب سے کم عمر چیف آف اسٹاف تھا۔ 1991ء کی خلیجی جنگ میں یہ سیکرٹری آف ڈیفنس کے عہدے پر فائز تھا اور اس سے قبل پرائیوٹ سیکٹر میں ایک بڑے امریکی انرجی گروپ کا چیف ایگزیکٹو بھی رہ چکا ہے۔ اُمّ قصر کی بندرگاہ کی تعمیر نو کا ٹھیکہ ''کیلوگ براؤن اینڈ روٹ'' نامی جس کمپنی کو ملا ہے یہ اس کا سربراہ رہ چکا ہے۔ اسی کمپنی کو تیل کے کنوؤں میں لگی آگ بجھانے اور تیل کی تنصیبات کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ شخص امریکا کے کلیدی منصب پر فائز ہونے کے باوجود عام طور پر دکھائی نہیں دیتا، نہ منظر عام پر آنے سے اسے کوئی دلچسپی ہے۔ یہ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہ کر کام کرنا پسند کرتا ہے اور صدر امریکا کی پالیسیوں کی تصوراتی تشکیل اور ان کے عملی اطلاق کے حوالے سے اتنی صفائی اور عمدگی سے ہاتھ دکھاتا ہے کہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے پاتا کہ وہ کابینہ کے دوسرے ارکان کی سرکاری ذمہ داریوں میں مداخلت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ صدر اس کے ساتھ ہفتے میں ایک مرتبہ لنچ کرتا ہے لیکن یہ جب وہاں سے اٹھ کر واپس اپنے دفتر آتا ہے تو اس کے پرائیوٹ سیکرٹری تک کو خبر نہیں ہوتی کہ کن موضوعات پر گفت و شنید ہوئی ہے۔ اس کی طرف سے صدر بش کو دیئے جانے والے تمام مشورے اور تجاویز ہمیشہ صیغہ راز میں رہتی ہیں۔ جب 11 ستمبر کے حملوں کا واقعہ پیش آیا تھا تو دنیا نے سنا کہ صدر امریکا اور یہ شخص دو الگ الگ جگہوں پر منتقل ہو گئے ہیں تاکہ امریکی قیادت سے کسی ایک کے ہلاک ہونے کی صورت میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ جی ہاں! آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ شخص امریکا کا موجودہ نائب صدر رچرڈ بروس ڈک چینی ہے جو اس وقت امریکی سیاست میں نہایت اہم اور طاقتور پوزیشن کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ سے لے کر اقوامِ عالم تک اس کی رائے کو اہمیت اور فوقیت دی جاتی ہے۔ صدر بش نے واضح طور پر اس کو بعض ایسی ذمہ داریاں اور فرائض تفویض کر رکھے ہیں جو آج تک کسی نائب صدر کو نہیں دیئے گئے اور نہ ہی ایسے عہدیدار کو دیئے جاتے ہیں لیکن اس شخص نے اپنے مخصوص حربوں سے امریکی صدر پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے۔ صدر بش کی دیگر سربراہانِ مملکت کے ساتھ ملاقات میں یہ بالکل خاموش رہتا ہے، ایک لفظ نہیں بولتا لیکن وہائٹ ہاؤس میں مشہور ہے کہ اس کی خاموشی اس کی گفتگو سے زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔ اس نے صدر کو باور کرا رکھا ہے کہ وہ اس کے ابدی وفاداروں میں سے ہے، اسے نہ اقتدار کی کوئی خواہش ہے نہ وہ آیندہ صدارتی عہدے کے لیے امیدوار ہے، اس لیے صدر بش اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔

ابھی نہیں تو کبھی نہیں:

یہودیوں کے لیے جو کام یہ "بے نفس" شخص کر رہا ہے اگر بش کا حریف الگور کامیاب ہو جاتا تو کٹر یہودی ہونے کے باوجود اتنا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کابل وقندھار میں امارت اسلامیہ کے سقوط سے لے کر بغداد و بصرہ پر چڑھائی تک ہر جگہ اس صہیونی ایجنٹ کا ذہن کارفرما رہا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد امریکی صدر روز ویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے ریت پر لکیریں کھینچ کر عرب کی مالدار ریاستوں کی حد بندی کی تھی، اب جارج بش اور ٹونی بلیر ان لکیروں کو مٹا کر جونئی حد بندی کرنا چاہتے ہیں اس کا خاکہ اسی شخص کا تیار کردہ ہے۔ عربستان کی تقسیم در تقسیم کا یہ مکروہ خیال صہیونی منصوبہ سازوں نے اپنے خفیہ مقاصد کی تکمیل کے لیے بنا کر اس کے حوالے کیا ہے اور امریکا کے نائب صدر سے صدر اور امریکی صدر سے شروع ہو کر برطانوی وزیر اعظم تک چکر لگانے والی یہ پیچ در پیچ سازش اگرچہ نہایت خوفناک ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عراق کی سرزمین میں فدائی مجاہد موجود ہیں۔ ڈک چینی اپنی میز کی دراز میں رکھے مشرق وسطیٰ کے نئے نقشے میں جو چاہے رنگ بھر لے لیکن عراق کے فدائی مجاہد اپنا خون دے کر اسلام کی تاریخ میں جو چمکدار رنگ بھر رہے ہیں وہ ان شاء اللہ ایسی آب و تاب والا ہوگا کہ اسے دیکھ کر اہل ایمان کے دل ٹھنڈے اور آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ اہل کفر کے سورما خاک وخون میں اور ان کے سیاست باز، ذلت وخواری میں لوٹتے پوٹتے نظر آئیں گے۔ عراقی مجاہدین کے مختلف دستے اپنا اپنا فرض "ابھی نہیں تو کبھی نہیں" کا عزم لے کر پورا کرنے کے لیے میدان میں اتر چکے ہیں۔ دنیا ان شاء اللہ ایک نیا منظر دیکھے گی۔ جو کچھ کفار کی مادیت زدہ عقلیں کبھی تسلیم نہ کرتیں وہ ان کی دیکھتی آنکھیں اور سنتے کانوں کے سامنے برپا ہوگا، مگر کاش! کہ دنیا کا ایک مسلمان حکمران تو ایمانی غیرت کا تقاضا نبھائے۔ کاش! ان میں سے کوئی ایک تو اپنے پیٹ اور شرم گاہ کے چکر سے باہر نکل کر مسلمانوں کی خاطر کچھ سوچے۔ حق وباطل کا یہ معرکہ ان شاء اللہ کفر کش ثابت ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون کون سی سعید روحیں صلیبیوں کی ذلت آمیز شکست میں حصہ ڈالنے کی سعادت حاصل کرتی ہیں؟؟؟

خشکی کے سمندر میں

ایل بی یوڈی:

سندھ میں بدین کے علاقے میں زیادہ تباہی کیوں ہوئی؟ اس چیز کا تجسس ہمیں چین نہ لینے دیتا تھا، ویسے بھی سن رکھا تھا کہ سندھ کے دیہاتی علاقوں میں جہالت خوفناک عفریت کی طرح مسلط ہے، اس کا آنکھوں دیکھا حال جاننے کا بھی شوق تھا شاید کوئی صورت بہتری کی سمجھ میں آجائے لہٰذا تین روز کے وقفے کے بعد ہم پھر بدین میں تھے۔ قطر مسجد کے امام مولانا غلام محمد صاحب پرانے وضعدار لوگوں کی یادگار ہیں۔ سنجیدہ اور پروقار، متین اور بُردبار۔ شہر کی مرکزی مسجد کے امام وخطیب ہونے کے علاوہ علاقے کی معزز اور صاحبِ حیثیت شخصیت ہیں۔ ان کے ساتھ کچہری (مقامی زبان میں مجلس آرائی کے لیے سکّہ بند لفظ) کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ معلومات کے دریا کے پاس پہنچ گئے ہیں، جو چاہو پوچھ لو۔ جیسا برتن چاہے بھر لو۔ ارشاد فرمایا کہ سیم کے پانی کی نکاسی کے لیے جاپانہ کے تعاون سے بنایا گیا۔ ایک بہت بڑا سیم نالہ جو ایل بی یوڈی کہلاتا ہے بدین کے مضافات سے گزر کر زیرو پوائنٹ کے پاس سمندر میں گرتا ہے۔ بہت وسیع وعریض نالہ ہے جو دفاعی اہمیت بھی رکھتا ہے۔

''سیم نالہ کیا ہوتا ہے؟ شہر کا ایک باسی گویا ہوا''

''جس طرح انسان کے جسم میں فاضل مواد کے اخراج کا نظام ہے، اسی طرح زمین میں موجود کھاری پانی کے نکاس کے لیے سیم نالے کھودے جاتے ہیں جو فالتو اور مضر پانی لے جا کر سمندر میں گرا دیتے ہیں۔'' مولانا صاحب نے گفتگو جاری رکھی۔ ''بارشوں کے دن میں سمندر میں طغیانی آئی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ نالے کا پانی قبول نہیں کر رہا تھا۔ جب نالے پر پانی کا دباؤ بڑھا اور نکاسی کی کوئی صورت نہ بنی تو کھوسکی کے قریب شادی لارج کے مقام پر نالے کے مضبوط بند میں شگاف پڑ گیا۔ یہ اضافی پانی کا ریلا علاقے میں پہلے سے موجود پانی کے ساتھ مل کر دیگر کئی نالوں اور نہروں کے چھوٹے بندوں کو توڑتا چلا گیا اور اس وقت بدین کے جنوب میں کوئی نہر یا نالہ ایسا نہیں جس کا بند ٹوٹ نہ چکا ہو۔ نتیجتاً سارا علاقہ خشکی میں سمندر کا نمونہ پیش کر رہا ہے اور بعض جگہوں میں 14، 14 فٹ پانی کھڑا ہے۔ گوٹھوں کو زمین سے اونچا بنایا جاتا ہے لیکن پانی کا زور اس قدر ہے کہ اس وقت ایک گوٹھ بھی ایسا نہیں جو پانی کے ریلے میں تیر نہ رہا ہو۔ سمندر کے قریب کے علاقوں میں تو پانی اتر جائے گا لیکن بقیہ جہاں جہاں پانی پہنچ گیا ہے اس کی سمندر کی طرف واپسی اور نکاسی میں رکاوٹیں ہیں۔ مثلاً: یہی بند اور سڑکیں جو اونچی بنائی جاتی ہیں ان سے پانی دوسری طرف چلا گیا ہے۔ اب واپس سمندر کی طرف نہیں آسکتا۔ گویا کہ پانی کو آنے سے روکنے والی رکاوٹیں اس کو واپس آنے سے روک رہی ہیں۔ یہ پانی سمندر میں نہیں جائے گا، وہیں کھڑے کھڑے سوکھے گا، جس میں بہت دن لگیں گے۔

مسائل کی خوفناکی:

ہر طرف پانی کھڑا ہونے سے کنوؤں میں بھی وہی پانی چلا گیا ہے جس میں جانور اور انسان مَرے تھے۔ نہروں کے پانی

کو حکومت نے پیچھے سے بند کر دیا ہے۔ لہٰذا اب پینے کا صاف پانی علاقے میں میسر نہیں اور بارش کے اثر سے ہر طرف پھیلے گندے تالاب کا پانی پینے سے قسم قسم کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔

پانی سے بڑا مسئلہ خوراک کا ہے۔ جب فصل اترتی ہے تو علاقے کے لوگ گھر کی ضرورت کے مطابق سال، چھ مہینے کا گندم یا چاول ذخیرہ کر چھوڑتے ہیں۔ باقی بیچ دیتے ہیں، گھر کے چولہے کے لیے بازار سے راشن خریدنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ سارا ذخیرہ سڑ کر خراب ہو گیا ہے یا پانی میں بہہ گیا ہے، گنے اور مرچ کی فصل کا موسم تھا وہ ساری جل گئی ہیں چنانچہ اب اگر پانی اُتر بھی گیا تو اس جزیرے میں خوراک کا خوفناک مسئلہ پیدا ہوگا۔ شوگر ملوں میں بھی پانی کھڑا ہے، گنے کا ذخیرہ اور فصل تباہ ہے جس سے مزدوری نایاب ہو جائے گی۔ اللہ اللہ خیر سلاً۔

نالے میں گھر:

''سائیں! اب تم بدین کا عادی ہو جائے گا، لگتا ہے کہ واپس نہ جاؤ گے۔'' خیمہ بستی کا دورہ کرتے ہوئے مولانا غلام محمد صاحب ایک دیہاتی سے گپ شپ کرتے ہیں۔

''نا سائیں نا! گھر کون چھوڑ سکتا ہے؟ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سارے علاقے کا فالتو پانی ہمارے گوٹھ سے گزر کر سیم نالوں اور سمندر کی طرف جا رہا ہے۔ ہم یہاں پڑے ہیں وہاں جا نہیں سکتے تو گوٹھ کا پانی سوکھے گا کیسے؟ وہ تو پانی کی گزرگاہ بنا ہوا ہے۔''

ہندو کونسلر:

بدین کی قطر مسجد سے جب اعلان ہوا کہ صرف کڈھن، مٹھن، سیرانی اور مٹھی وغیرہ کے علاقے کے لوگ شناختی کارڈ کے ساتھ خوراک کا ٹوکن بنوانے آجائیں تو باہر کھڑا ہوا ایک شخص بے اختیار بول اٹھا: ''یار! مولوی لوگوں نے صحیح طریقہ بنایا ہے۔ اصل متاثرین اسی علاقے کے باشندے ہیں، باقی سب تو شوق شوق میں امداد لینے آجاتے ہیں۔''

بندہ کو کسی نے بتایا کہ یہ ہندو ہے اور ایک علاقے کا نام لیا کہ اس جگہ کا کونسلر ہے۔

عوام کی دوڑ مسجد تک:

علاقے میں مولویوں کی خدمات اور مساجد سے لوگوں کو امداد تقسیم ہوتے دیکھ کر وہ محاورہ غلط ہو گیا ہے ''مولویوں کی دوڑ مسجد تک۔'' اب تو عوام کی مسجد کی طرف دوڑ کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے عہدیداروں اور کارکنوں نے علاقے کے عوام کی خدمت کے لیے مخلصانہ جذبے کے تحت کام کیا ہے۔ الرشید ٹرسٹ کے کارکن بھی ڈاڑھی ٹوپی والے ہیں۔

پہلے اور اب:

جو لوگ اپنے علاقے چھوڑ کر دوسری جگہوں میں نہیں گئے ان کی واحد پناہ گاہیں قریبی سڑکیں ہیں جو زمین سے اونچی بنائی جاتی ہیں۔ وہ ان پر ڈیرہ ڈال کر کھلے آسمان تلے کھا پکا کر سو رہتے ہیں۔ جا بجا ایسے خاندان ملے جو پہلے گھر سے روڈ کی ٹریفک تکا کرتے تھے، اب روڈ پر بیٹھ کر گھروں کو ڈوبا ہوا دیکھتے رہتے ہیں۔

کچھوا، نیولا اور کیکڑا:

ایک جگہ راستے کے بیچ میں ایک چمکتی چیز حرکت کرتی نظر آئی۔ ہم سمجھے سانپ ہے۔ قریب پہنچے تو کچھوا تھا۔ درمیانے سائز کا سُنہرا کچھوا۔ اس کے پاؤں کے ساتھ ایسے پردے سے لٹکے تھے جیسے گاڑی کے ٹائر پر پلاسٹک کے کور لٹکے ہوتے ہیں۔ موصوف کو گاڑی کے ہارن یا مسافروں کی آوازوں کی قطعی کوئی پرواہ نہ تھی۔

''مفتی صاحب! اسے پکڑ کر ساتھ لے چلیں؟'' اشرف مدنی پوچھتا ہے جو یہاں آ کر ''مدنی سائیں'' ہوگیا ہے اور علاقے کے دیہاتیوں میں بڑا مقبول ہے۔

''نہ یار! خبر نہیں یہ کیا کھاتا ہے۔ وہاں اسے کون خوراک دے گا۔ ناحق دیہاتی مہمان کی حق تلفی ہوگی۔''

کچھوا حرکت کرتا ہے اور خراماں خراماں چلتا ہوا سڑک کی دوسری طرف گزر جاتا ہے۔ واپسی میں اسی جگہ کے قریب ایک بڑا اور کافی موٹا نیولا سڑک کے کنارے محوِ خواب ہے۔ گاڑی پھر رک جاتی ہے اور مسافر اس سے چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ قریب سے تھر کے صحرا میں چلنے والا مخصوص ہیئت کا ٹرک گزرتا ہے جسے مقامی لوگ ''کیکڑا'' کہتے ہیں۔ جب کچے کے علاقے میں ریت پر چلتا ہے تو اس کے ٹائروں کی ہوا نکال دیتے ہیں۔ پھر ریت کے سمندر میں اس کی روانی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اس میں انسانوں اور جانوروں کی مساوات پر مکمل طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بندے اور بکری کو ساتھ ساتھ سیٹ ملتی ہے۔ سنا ہے یہ راجستھان میں ایک ہفتے کا ٹور لگاتا ہے۔ تین دن جانے میں، تین دن آنے میں، ایک دن وہیں کے ٹھکانے میں۔

پہلے کچھوا، پھر نیولا اور اب دیوہیکل آہنی کیکڑا............ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے؟ تیری ساری مخلوق گھر بار چھوڑ کر سڑکوں پر آ گئی ہے۔ یہ سڑکیں ہیں یا چڑیا گھر کی گشت گاہیں؟ رات کو یہاں شاید شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہوں گے۔

مچھلیوں کا فرار:

علاقے میں کاشت کاری تو ہے نہیں۔ دیہاتی لوگ جال یا کانٹے ڈال کر جگہ جگہ بیٹھے ہیں اور مچھلی پکڑ کر گزارہ کر رہے ہیں۔ روٹی تو کسی طرح کما کھائے ہے مچھندر...... شہری مسافر ہمراہیوں سے پوچھتے ہیں:

''بھائی، دوستو، بزرگو! اس علاقے میں عارضی پانی کے اندر مچھلیاں کہاں سے آ گئیں؟ خود بخود پیدا ہوئی ہیں تو اتنی جلدی بڑی کیسے ہوگئیں؟''

''قریب مچھلیوں کے تالاب تھے۔ پانی زیادہ ہوا تو وہاں کی مچھلیاں اس میں گھل مل گئیں۔'' مقامی ساتھی جواب دیتا ہے۔

''گویا یہ مچھلیوں کا فرار ہے لیکن تالاب سے بھاگیں تو کانٹے کی نوک میں آ پھنسی ہیں۔'' گاڑی میں جملہ بازی ہوتی ہے۔

دیہاتیوں کی چھٹی حس:

اب ہم کھوسکی شہر پہنچ چکے ہیں۔ ایک آدمی گاڑی روک کر بتاتا ہے آپ لوگوں کا کیمپ وہ سامنے لگا ہے سیدھے چلے جائیے۔

''بھائی! اس نے ہمیں کیسے پہچان لیا؟''

''آج کل یہاں ''الرشید'' والوں کو ہر کوئی پہچانتا ہے۔ ویسے بھی دیہاتیوں کی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ وہ بیرونی آدمی کی کھنکھار سے بھی اسے پہچان لیتے ہیں۔

مریض دیکھنے کا ریکارڈ:

کیمپ کے قریب پہنچتے ہیں تو سڑک کے کنارے ''الرشید موبائل کلینک'' کی ایمبولنس کھڑی ہے، گاڑی کے اندر دواخانہ ہے۔ باہر ڈاکٹر صاحب کرسی میز لگائے بیٹھے ہیں، مریضوں میں گھرے ہوئے ہیں اور مزے سے ''کلینک'' کررہے ہیں۔ ایمبولنس کے لاؤڈ اسپیکر سے لوگوں کو وعظ ونصیحت ہورہی ہے۔ دنیا وآخرت کی آفتوں سے بچنے کے لیے گناہوں سے بچنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کتنے مریض روز چیک کرتے ہوں گے؟''

''دو ڈھائی سو کے قریب ہوجاتے ہیں لیکن گوٹھ مٹھن میں ڈاکٹر نعیم صاحب نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ وہ دن بھر میں ساڑھے تین سو کے قریب مریضوں کو دیکھ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر نعیم صاحب کا کچھ تذکرہ قارئین نے پہلے پڑھا ہے۔ آگے ایک دلچسپ قصہ اور پڑھیے گا۔

ایک خوراک، دو خوراک:

اور اب ہمارے سامنے ایک عجیب وغریب منظر ہے۔ ایک پکے مکان کے سامنے دور تک لائن لگی ہوئی ہے۔ پانچ پانچ آدمی اندر جاتے ہیں اور چادر بھر کر سامان لے کر آتے ہیں۔ ایک ضعیف شخص کو اتنا سامان ملا ہے کہ وہ اسے اٹھا نہیں سکتا۔ دوسرا بوڑھا اس کے ساتھ ہاتھ لگا رہا ہے۔ پولیس کا آدمی بھی دروازے پر کھڑا ہے۔ مکان کی پیشانی الرشید ٹرسٹ کا بینر بندھا ہے۔ طویل لمبی قطار کے علاوہ بھی آس پاس دیہاتی لوگوں کی ٹولیاں جمع ہیں جو امداد ملنے کی خواہش مند ہیں لیکن کارکن صرف اسے اندر جانے دیتے ہیں جو اپنے علاقے سے ٹرسٹ کا فارم بنوا کر لایا ہو۔ فارم بردار دیہاتی ایک میز کے گرد جمع ہیں وہاں سے کارڈ بنواتے ہیں اور پھر پانچ پانچ کر کے اندر جاتے ہیں۔ اندر ایک طرف فارم کو شناختی کارڈ سے ملا کر چیک کیا جاتا ہے۔ پھر فارم رکھ کر کارڈ پر انگوٹھا لگوایا جاتا ہے اور سامنے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ سامنے کمرے کے دروازے پر ایک باریش کارکن جس کی ڈاڑھی آٹے سے سفید ہوچکی ہے کارڈ چیک کر کے اندر منہ کیے آواز لگاتا ہے:

''ایک خوراک''، ''دو خوراک''

ایک خوراک کا مطلب ہے دس کلو آٹا تین کلو دال، ایک کلو گھی۔ اس کا مطلب ہے اس کا دگنا۔ جب اندر سے یہ چیزیں رومال یا چادر میں ڈالی جاتی ہیں تو باہر کھڑا ہوا ایک کارکن اس کے ساتھ کپڑوں کا ایک جوڑا بھی ڈال دیتا ہے۔ کمرے کے اندر موجود کارکنوں کا چہرہ اور ڈاڑھی آٹے سے بھر چکی ہے۔

''یہ مکان کس کا ہے؟'' بندہ پوچھتا ہے۔

''یہ چوہدری شہباز کی بیٹھک ہے۔ ہمارے یہاں جب مہمان آتے ہیں تو ہم انہیں اسی بیٹھک میں ٹھہراتے ہیں۔''

علاقے کے امام مسجد مولانا عبداللہ سندھی بتاتے ہیں۔ جو تقسیم کے اس عمل کے نگران ہیں۔ آج کل ہم نے اس کو تقسیم امداد کا مرکز بنا رکھا ہے۔''

کیٹو ولد مٹھو:

''آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' قطار میں کھڑے ایک شخص سے بندہ پوچھتا ہے۔

''گوٹھ سے۔''

''گوٹھ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''آٹھ کلومیٹر۔''

لیکن یہ شخص نظریں چرا رہا تھا۔ بندہ نے کارڈ لے کر نام دیکھا تو لکھا تھا ''کیٹو ولد مٹھو۔ گوٹھ ناتھا خان چانڈیو۔ قوم بھیل۔'' معلوم ہوا کہ ہندو ہے۔ طالبان کو دیکھ کر گھبرا گیا ہے۔

ماہر وصول کنندگان:

ایک رضا کار قریب سے گزر رہا تھا روک کر پوچھا: ''آج کتنے لوگوں میں امداد تقسیم کی جائے گی؟''

''لوگوں کی تعداد کا تو پتہ نہیں، خاندان 1200 ہیں۔''

''اور جن کے پاس فارم نہیں ان کو۔''

''ہم گھر گھر جا کر امام مسجد اور نمبردار کے تعاون سے فارم بنواتے ہیں تا کہ اصل متاثرین کو امداد پہنچ سکے۔ ورنہ تو لوگ ٹرکوں پر کھڑے ہو کر تھیلیاں پھینکتے ہیں جو اکثر ''ماہر وصول کنندگان'' کے ہاتھ میں گرتی ہیں۔ جن کا فارم نہیں ان سے کہا گیا ہے کہ اپنے علاقے میں جائیں۔ سروے ٹیم وہاں آ کر سروے کرے گی۔ فارم بنا کر دے گی پھر ان کو بھی حصہ ملے گا۔''

مذہبی این جی اوز:

باہر نکلے تو ایک صاحب جن کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ مختلف اخباروں کے نامہ نگار ہیں۔ تبصرہ کرتے ہیں:

''اس مرتبہ مذہبی این جی اوز بازی لے گئیں۔ انہوں نے بڑے منظم انداز میں پیشہ ور مستحقین کے بجائے اصل متاثرین تک امداد پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کراچی سے ایک گلوکار کی تنظیم آئی تھی۔ راستہ میں کیمپ لگا کر جوس کے پیکٹ اور نمکو تقسیم کیا۔ بھوکے آدمی کو اس عیاشی سے کیا ہوگا؟ اسے پیٹ بھر دال روٹی ملنی چاہیے۔ شام کو گلوکار صاحب ہیلی کاپٹر میں آئے۔ تصویریں کھینچی گئیں۔ مووی بنائی گئی اور بقیہ امداد ڈاٹسن میں ڈال کر مقامی عہدیدار کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ دیہاتوں میں تو کوئی جاتا ہی نہیں۔ مولوی بڑے سیانے اور جفاکش نکلے۔ یہ خود گاؤں گاؤں پھرتے ہیں، ان کا یہ کیمپ شہر میں ہے لیکن امداد لینے کے لیے قطار میں کھڑے سب لوگ دیہاتی ہیں۔ شہری پیشہ ور اور عادی مستحقین وہ سامنے ٹولیاں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کو کچھ نہیں ملے گا۔''

تیرتی چارپائی:

کیمپ کے اندر اور باہر رش ہے اور بڑی تعداد میں امدادی سامان کی تھیلیاں تقسیم ہو رہی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اتنی مقدار

کوئی لٹا سکتا ہے۔ ہم حیرت آمیز تاثرات کے ساتھ کیمپ سے رخصت ہوتے ہیں۔ آبادی سے باہر سڑک پر آ کر آگے چلنے والی گاڑی ایک جگہ رک جاتی ہے۔ ہم بھی ٹھہر جاتے ہیں اور اس کے رکنے کا سبب جاننے کے لیے اس طرف نگاہ دوڑاتے ہیں جدھر کو وہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظروں کا مرکز ایک چارپائی ہے جو پانی پر تیرتی سڑک کی طرف چلی آ رہی ہے۔

''بھائی، بزرگو! یہ چارپائی کیسے ایک سیدھ میں پانی پر تیر رہی ہے؟''

''جناب غور سے دیکھیے! چارپائی کے نیچے توجہ کیجیے۔''

چارپائی کے نیچے نگاہ جمائی تو ایک انسانی سر نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ ایک دیہاتی گردن تک پانی میں ڈوبا ہوا ہے اور سر پر چارپائی اٹھا کر دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا سڑک کی طرف آ رہا ہے۔

اوہ خدایا! ہمیں تو اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ پانی اتنا گہرا ہو سکتا ہے۔ دیہاتی پانی سے نکل کر سڑک پر آیا تو اس نے اپنی بپتا سنائی کہ گھر میں صرف دو چارپائیاں رہ گئی تھیں۔ ہفتہ بعد اس کو پانی میں گھس کر اٹھا کر لے آیا ہوں تاکہ سڑک پر بچھا کر بیٹھ سکوں۔

''دوسری چارپائی کہاں ہے؟''

''وہ میری بیوی اٹھانے گئی ہے۔ پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔''

''آپ ہمارے ساتھ بدین شہر چلو۔ وہاں آپ کو خیمے میں رہائش دیں گے، کھانا پیش کریں گے، ڈاکٹر صاحب سے دوائی دلوائیں گے۔''

''نہیں صاحب، میں اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''چلو خوراک کا پیکج لے کر آ جانا۔''

''اچھا صاحب! آپ جائیں میں ماموں کے ساتھ آ جاؤں گا۔''

''پیکج کیا ہوتا ہے؟''

''وہیں بتائیں گے''

''اچھا یہ بتاؤ اس دوسری طرف کتنا پانی ہے۔''

''چھتوں سے بھی اونچا صاحب! کشتی کے بغیر آپ لوگ نہیں جا سکتے۔''

اس علاقے میں کشتی کا تصور ایسا ہی تھا جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ان کے کشتی بنانے پر تعجب کرتی تھی۔

ہم نے خشکی پر کھڑے سمندر کو دیکھا۔ گنے کی فصل کہیں کہیں سے پانی سے سر نکال کر گہرائی کی پیمائش بتا رہی تھی۔ واپسی کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ پانی کی کثرت پر حیران رہ گئے۔

ایک ہندوانہ رسم کی اصلاح:

اور اب ہم گوٹھ مٹھن میں پہنچ چکے ہیں جہاں کے دیہاتیوں سے وعدہ کر کے گئے تھے کہ ان کے ہاں ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ بھیجیں گے اور مکمل طبی کیمپ لگائیں گے۔ یہاں دو طرح کے مستحقین ہیں۔ ایک تو گوٹھ کے لوگ جو ہمارے اور دوسرے

علاقے کے متاثرین کے میزبان ہیں۔ ان کے گھر بھی گر چکے ہیں اور دوسرے گوٹھ کی پشت پر واقع بڑی ریتیلے ٹیلے پر خیمہ بستیوں میں پناہ لینے والے غیر مقامی دیہاتی جونشیبی علاقوں سے نقل مکانی کر کے پناہ کی تلاش میں یہاں آئے ہیں اور "الرشید" کے فراہم کردہ خیموں میں رہتے ہیں۔ ان کو ہفتے بھر کا راشن اکٹھا دے دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے پاس کھانے پکانے کا سامان موجود ہے۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا حال ہے؟" ہم ڈاکٹر نعیم جو علاقے کی مقبول شخصیت بن چکے ہیں سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"اور آپ کے مریضوں کا؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"

"سنا ہے مچھروں نے آپ کا خون نہایت لذیذ ہونے کی خبر ساری مچھر برادری میں پھیلا دی ہے۔"

"ہاں! سیلن کی وجہ سے دریوں میں پسّو اور پانی کے جوہڑوں کی وجہ سے فضا میں مچھر بہت ہیں۔"

"آپ کے پاس زیادہ مریض کس قسم کے آتے ہیں؟"

"بخار، ملیریا، پیچش، آنکھوں کی تکلیف، اس کے علاوہ بچوں میں خسرہ، خناق، کالی کھانسی بہت ہے۔ حفاظتی ٹیکوں کی سخت ضرورت ہے۔ چھوٹے بچوں کے ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اور کچھ دن بعد وہ اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ایک چیز کی ضرورت ہے؟"

"وہ کیا؟"

اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے جو تفصیل سنائی اس کا بندہ پر اتنا اثر ہوا کہ جب تک کراچی سے ڈاکٹروں کی خصوصی ٹیم اس کے لیے علاقے میں پہنچ نہیں گئی، ہماری بے سکونی کم نہ ہوئی۔

"میرے پاس گردو پیش کے بیس تیس گوٹھوں کے مریض آئے ہیں۔ اب تک سات آٹھ بچوں کو لا چکے ہیں کہ ان کا ختنہ کر دیں۔ بڑے بڑے سمجھدار بچوں میں کثیر تعداد ایسے بچوں کی ہے جن کا ختنہ نہیں ہوا۔"

"کیوں؟ ختنہ کیوں نہیں ہوا؟ کیا ہندوؤں کے ساتھ رہن سہن کا اثر ہے؟"

"کچھ وہ بھی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ختنے والا ڈاکٹر بدین سے بلانا پڑتا ہے جو 500 روپے لیتا ہے۔ غریب دیہاتی تو سال چھ مہینے کے بعد کہیں پانچ سو کا نوٹ دیکھ پاتے ہیں۔"

"آپ نے کتنی تعداد بتائی؟" ہمیں کچھ مبالغہ محسوس ہو رہا تھا۔

"سات آٹھ سو" ڈاکٹر صاحب "سو" کے لفظ پر زور دے کر بولے۔

"مفتی صاحب! آپ اس پر تعجب نہ کریں۔" شعبہ صحت و فراہمیٔ خوراک کے نگراں سید روید حسین شاہ صاحب بندہ کی حیرت دور کرتے ہوئے بولے۔ "مجھے اب یاد آیا ہے کہ کراچی کے ایک بڑے ڈاکٹر صاحب سندھ میں ختنہ کا کیمپ لگاتے ہیں۔ ہمیں اس پر تعجب ہوتا تھا مگر آج اس کی تصدیق ہوگئی کہ سندھ کے دیہاتی علاقے میں غربت اور جہالت کے سبب کافی عمر کے

بچوں کا ختنہ نہیں ہونے پاتا۔"

بندہ نے بدین پہنچ کر سب سے پہلے کراچی فون کیا اور الحمدللہ کہ وہاں سے بعجلت ممکنہ ڈاکٹروں کی ٹیم ضروری ساز وسامان کے ساتھ علاقہ کی طرف روانہ کردی گئی ہے۔ ممکن ہے آیندہ اس اہم چیز کی خاطر علاقے میں وقفے وقفے سے مستقل کیمپ لگانے کی تجویز طے پا جائے۔ قارئین دعا کریں کہ ان کیمپوں سے دین کی اشاعت بھی ہو محض مادّی خدمات مسلمان سے خیر خواہی اور ہمدردی کے لیے کافی نہیں۔

انہیں ڈاکٹروں کے متعلق معلوم ہوا کہ علاقہ میں اشد ضرورت پڑنے پر ڈلیوری کے دو کیس بھی کر چکے ہیں۔ ایک بچی کے والدین نے اس کا نام ڈاکٹر صاحب کے نام پر نعیمہ رکھا ہے۔

سچی ہمدردی:

اب ہم ریتیلے ٹیلے پر چڑھتے ہیں۔ دور دور تک "الرشید" کے خیمے لگے ہیں۔ گویا جنگل میں منگل ہے۔ دیہاتیوں کے رہنے کا خاص انداز ہے۔ مناسب فاصلے سے خیمے لگاتے ہیں۔ پچھلی بار یہاں آئے تھے تو کچھ لوگوں کو خیمے نہیں ملے تھے۔ اب سب کو مل چکے ہیں۔ کچھ خیموں کے باہر ہانڈی چڑھی ہے، کچھ کے باہر بچیاں بیٹھی "پنج گٹی" کھیل رہی ہیں۔ دیہاتی دوڑے دوڑے آتے ہیں۔ اتنے عقیدت مند ہیں کہ جو کہو مان لیں گے۔ ٹرسٹ کے ذمہ داران نے پچھلی رپورٹ کے بعد یہ مستحسن فیصلہ کیا ہے کہ ہر کیمپ میں ایک "داعی اور معلم" کی مستقل تشکیل کی جائے جو ہر نماز کے بعد تعلیم کرے۔ صبح، شام ایک ایک گھنٹہ لوگوں کو جمع کر کے پہلے دو کلمے، نماز کا سبق، کم از کم چار سورتیں، وضو اور غسل کے فرائض سکھائے۔ مسلمان کو مادی غذا سے زیادہ روحانی غذا کی اور جسمانی بیماریوں سے بچاؤ سے زیادہ روحانی بیماریوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اس سے سچی ہمدردی یہ ہے کہ اسے ایسی امداد دی جائے جو کبھی ختم نہ ہو۔ قبر، حشر میں بھی ساتھ رہے اور اس گھڑی کام آئے جبکہ دوسری کوئی چیز کام نہ آئے گی۔"

مُلّاں والی تنظیم:

بندہ ایک دیہاتی سے ٹوہ لیتا ہے۔ آدھی سندھی اور آدھی اردو میں: "یہ خیمے کہاں سے ہاتھ لگے؟"

"مُلّاں والی تنظیم نے دیئے ہیں، اللہ ان کو ایمان دے۔"

ویران سجدہ گاہیں:

اور اب ہم بُھگیو گوٹھ کے اوطاق کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہاں آنے کی وجہ یہ بنتی ہے کہ گاؤں کی مسجد مکمل طور سے تباہ ہو چکی ہے۔ "ہر کجا پستی آب آں جارود" کا جملہ سنا تو تھا، دیکھا بھی تھا، لیکن اس کا جو منظر یہاں دیکھا وہ شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے۔ مسجد اور قریب کے گھر بالکل تباہ ہو گئے تھے۔ مسجد کا صرف محراب باقی تھا۔ ایک بچے نے پیلو کے درخت سے تازہ تازہ مسواکیں توڑ لائیں تاکہ مہمان مولویوں کی خاطر ہو سکے۔ بہت دل خوش ہوا۔ دل سے دعائیں نکلیں۔ کچھ خدمت کرنی چاہی۔ اصرار کے باوجود قبول نہ کی۔ مسجد کی تعمیر دیہاتیوں کے بس کی بات نہیں۔ ٹرسٹ والوں کو تعاون کرنا چاہیے۔ ورنہ اللہ کا گھر نجانے کب تک غیر آباد رہے۔

پانی میں آگ:

پانی کے متعلق سنا تھا کہ جلاتا ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ جلاتا بھی ہے۔ گاؤں کی فصلوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بارش کا یہ

پانی ''آتش بآب'' کا مصداق تھا۔ مرچیں جل چکی ہیں۔ (سبحان اللہ! ''مرچوں کا پانی سے جلنا'' ایک معنی میں محاورہ بنایا جا سکتا ہے) گنا کانا ہو چکا ہے۔

''گنا بھی کانا ہوتا ہے؟''

ہاں جب یہ خراب ہو تو کہتے ہیں: ''کانا ہو گیا ہے۔''

گھر، گھر ہوتا ہے:

بدین واپسی پر کچھ دیہاتی ملے جو ٹرسٹ کے ذمہ دار دلدار شاہ صاحب سے خیمہ بستی سے گھر واپس جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ شاہ صاحب بیمار پڑے ہیں جب فون آتا ہے یا سروے ٹیم واپس آتی ہے تو اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کام پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے جہاں سے ختم ہوا تھا۔ ٹرسٹ کے اکثر کارکن بیمار ہو چکے تھے صرف شاہ صاحب رہتے تھے۔ آج وہ بھی بیمار ہیں اور اب ان کے لیے ممکن نہیں رہا کہ دوسرے ساتھیوں کی بیماری پر تعجب یا مذاق کر سکیں۔

''بھئی! اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ دن اور رہ لو، پھر چلے جانا۔ ابھی تو وہاں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہے۔''

''سائیں! گھر، گھر ہوتا ہے۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔''

شاہ صاحب ان کے لیے ٹرک کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام متاثرین کو خیریت سے گھروں کو لے جائے۔ ان کے دینی اور دنیاوی تمام مسائل حل کر دے۔ الرشید ٹرسٹ والوں کو ان لوگوں کے گاؤں میں مکاتب کھولنے چاہییں تا کہ ان کی دینی ضرورت بطریقِ احسن پوری ہو سکے۔ رائے ونڈ والے حضرات قربانی والے ساتھیوں کو علاقے میں زیادہ سے زیادہ بھیجیں تو بہت فائدہ ہونے کی امید ہے۔ والسلام

دس نہیں گیارہ

گناہ برباد، عذاب لازم:

ایک زمانہ تھا عید آنے سے پہلے بچوں کے مطالبات شروع ہوجایا کرتے تھے کہ اس مرتبہ ہم دس روپے عیدی لیں گے۔ ان سے کہا جاتا تھا: بیٹا! ہم آپ کو گیارہ روپے عیدی دیں گے۔ یہ سن کر بچے پھولے نہ سماتے تھے کہ ان کا مطالبہ ان کی توقع سے بڑھ کر پورا ہوا ہے اور وہ اس مرتبہ رَج کر موج کریں گے۔ اِدھر ہوتا یوں تھا کہ گیارہ میں سے ایک روپیہ تو بچوں کو عید منانے کے لیے مل جاتا تھا، بقیہ دس روپے دادی جان کے پاس بطور امانت جمع ہوجاتے تھے اور بچے عیدی کا روپیہ خرچ کرنے تک اپنی یہ امانت بھول بھال جاتے تھے۔ اللہ اللہ خیر سَلّا۔ پچھلے شمارے میں اس بات کا تھوڑا سا ذکر چھیڑا گیا تھا کہ سودی نظام کے تحت چلنے والے بینک عوام کو جو قلیل اور حقیر نفع دیتے ہیں وہ ان سے ایک حیلے کے ذریعے واپس اینٹھ لیتے ہیں اور نتیجے میں عوام کے ہاتھوں میں وہ میل بھی نہیں رہتا جو حرام کے ان نوٹوں کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ گویا ''نیکی برباد گناہ لازم'' کے وزن پر ''گناہ برباد عذاب لازم'' یا ''لذتِ گناہ برباد نحوستِ گناہ لازم'' کا جملہ (محاورہ) صادق آتا ہے۔ موجودہ سودی نظام ظلم در ظلم کا ایسا ہلاکت خیز سلسلہ ہے جس میں چت بھی سرمایہ دار کی ہوتی ہے اور پت بھی اسی کی۔ اگر سود پر لیے گئے قرضوں سے سرمایہ دار کو نفع ہوجائے تو وہ اس میں سے بہت تھوڑا سا حصہ سود کی شکل میں بینک کو اور بینک کے واسطے سے امانت دار عوام کو منتقل کرتے ہیں اور پھر یہ حقیر سی مقدار بھی اشیا کی لاگت میں شامل کرکے دوبارہ عام صارفین سے وصول کرلیتے ہیں اور اگر اس کو کاروبار میں نقصان ہوجائے یا کسی حادثے سے دیوالیہ پن کی نوبت آجائے تو اس سرمایہ دار کی اپنی بہت کم رقم ڈوبتی ہے، زیادہ نقصان ان عوام کا ہوتا ہے جن کی بچتوں سے اس نے اپنے لمبے چوڑے کاروبار کی بنیاد رکھی تھی۔ سرمایہ دار تو اس نقصان کی تلافی انشورنس کمپنی سے کروالیتا ہے اور انشورنس کمپنی اسے ہزار ہا عوام سے نچوڑی ہوئی رقم سے دوبارہ اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ ''عوام کی بچتوں کو عوام کے فائدے کے لیے عوامی فلاح و بہبود کے منصوبوں میں'' لگا سکے۔ اس طرح بینکنگ کے موجودہ نظام میں پوری قوم کا سرمایہ چند سرمایہ داروں کی تجوریوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے۔ وہ اسے بینکوں کی وساطت سے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں اور عوام کے ہاتھ اس ڈھول کے علاوہ کچھ نہیں آتا جو سامراج کے ہاتھوں کھلونا بننے کے بعد ان پر بدحالی کی تہہ جماتی جاتی ہے۔

فرضی زر، حقیقی سود:

جس طرح بینکوں کے ذریعے سے چند سرمایہ دار دادِ عیش دیتے ہیں مگر ڈھنڈورا عوام کی فلاح و بہبود اور بے لوث خدمت کا پیٹا جاتا ہے اس طرح خود بینکوں کی پانچوں انگلیاں ہمیشہ گھی میں رہتی ہیں مگر وہ ہمیشہ سوکھے کا رونا روتے اور اپنے ان بھاری بھر کم مفادات پر پردہ ڈالنے رہتے ہیں جو انہیں عوام کی خون پسینہ کی کمائی سے حاصل ہوتے ہیں۔ بظاہر یہ بات

ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ بینک کے پاس جو رقومات جمع ہوتی ہیں ان میں سے بہت سی ایسی رقوم ہوتی ہیں جن پر وہ کسی کو کوئی سود نہیں دیتا اور یہ رقوم آگے سرمایہ کاروں کو دینے سے جو کچھ وہ کماتا ہے سب اپنے ٹھنڈے تنور میں ڈال لیتا ہے۔ بینکوں کے اس کردار کو دو تین چیزوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے پہلی چیز "تخلیقِ زر کا عمل" ہے۔ لوگوں کے پاس جو رقم آتی ہے وہ اس کا بہت تھوڑا سا حصہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور زیادہ بینک میں رکھوا دیتے ہیں۔ بینک جب اسے آگے قرض دیتا ہے تو قرض لینے والے سرمایہ کار قرض کے طور پر منظور شدہ ساری رقم یک مشت ساتھ نہیں لے جاتے بلکہ بینک قرض لینے والے کا اکاؤنٹ کھول کر اسے چیک بک دے دیتا ہے کہ حسبِ ضرورت اس سے رقم نکلواتا رہے اور نکالی گئی رقم بچ جائے تو دوبارہ اس میں جمع کروا دے۔ اب قرضدار کی طرف سے جتنی رقم کا اکاؤنٹ کھولا گیا، بینک کے ڈپازٹ میں اتنا اضافہ ہوا حالانکہ نوٹ اتنے ہی ہیں جو پہلا (حقیقی) اکاؤنٹ کھولنے والے نے رکھے تھے۔ قرضدار کا اکاؤنٹ کھولنے سے بینک کے پاس جو نیا (مصنوعی) ڈپازٹ آیا ہے، بینک اس کو حقیقی رقم کی طرح آگے کسی اور کو قرض دینا منظور کرے گا اور اس پر اس سے سود وصول کرے گا کیونکہ اسے اس بات کا خطرہ نہیں ہوتا کہ قرضہ منظور کروانے والے سب اکٹھے اتنی رقم کا مطالبہ کریں گے جو وہ ادا نہ کر سکے گا اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو ریزرو میں رکھی گئی رقم یا ہنگامی طور پر حاصل کردہ رقم ان کے مطالبات پورے کرنے میں کام آ جاتی ہے۔ اس طرح بینک اپنے پاس جمع شدہ عوام کی رقم کے بل بوتے پر کئی گنا زیادہ رقم تخلیق کر کے اس کو قرض پر آگے دیتا اور لاگت سے محفوظ سود کماتا ہے لیکن عوام کو فقط ان کی اصل رقم کے حساب سے سود دیتا ہے اور انہیں اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا کہ اس نے ان کی رقم کے ذریعے "اعتباری زر" تخلیق کر کے جو کچھ کمایا ہے اس سے انہیں کچھ بھی نہیں دیا۔

بینک کا فلوٹ:

عوام کو کچھ ادا کیے بغیر ان کی رقوم سے بھاری منافع کمانے کی دوسری صورت کو بینکاری کی اصطلاح میں بینک کا فلوٹ (Float) کہتے ہیں۔ یہ وہ رقومات ہیں جو کچھ مدت کے لیے رہتی بینک کے پاس ہیں اور بینک ان سے خطیر منافع حاصل کرتا ہے لیکن اس رقم کے اصل مالکوں کو کچھ بھی سود ادا نہیں کرنا پڑتا۔ ایسا کئی صورتوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً: بینک کی طرف سے دوسرے بینک کو چیک جاری کیا گیا یا بینک نے کسی کو ڈرافٹ دے دیا تو رقم منتقل ہونے اور کیش کرانے تک جتنی مدت لگتی ہے، اس دوران یہ رقم بینک کا "فلوٹ" ہے۔ بیرونِ ملک سے کوئی چیز منگوانے والا جب ایل سی کھلواتا ہے اور مکمل یا جزوی ادائیگی اسی وقت کر دیتا ہے تو بینک چیز بھیجنے والے کو ادائیگی کاغذات آنے پر ہی کرے گا، تب تک یہ رقم بغیر کسی لاگت (Cost) کے بینک کے پاس رہتی ہے۔ اسی طرح بلٹی چھڑانے کے لیے بینک کو جو رقم دی جاتی ہے، وہ بلٹی بھیجنے والے کو تاخیر سے ملتی ہے اور اس دوران بینک کی ان رقومات میں اضافہ کرتی ہے جو بغیر کچھ ادا کیے کمانے کا ذریعہ ہیں۔ حج درخواستوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، جن عازمینِ حج کا نام نہ نکلے، رقم تو انہوں نے بھی جمع کروائی ہے اور جو این او سی کے ذریعے بالکل آخر میں جائیں گے (نئے قانون کے مطابق) رقم انہوں نے بھی پہلے سے ہی دینی ہوتی ہے۔ یہ کروڑہا روپے کئی مہینوں تک بینک کا فلوٹ ہیں جن کی خاطر تمام بینک ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حجاج کرام کی خدمت

کی ''سعادت'' حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک اور صورت یوٹیلٹی بلز ہیں۔ بجلی، گیس، فون وغیرہ کے بل کی رقومات جمع کرنے پر بینک جو سروس چارجز وصول کرتے ہیں وہ ان کا بے جا تکلف ہے۔ وہ اس فیس سے سو گنا زیادہ سود تو ان رقوم سے کماتے ہیں مگر سروس چارجز وصول کرنا اس اندیشے سے نہیں چھوڑتے کہ عوام کی عادت کہیں خراب نہ ہو جائے اور اب تو ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی بینکوں کے ذریعے ہو رہی ہے۔ یہ بھاری بھرکم رقومات ہر ماہ بینکوں کے اس زر کے حجم میں بے تحاشا اضافہ کرتی ہیں جو ان کو بغیر لاگت کے سود کما کر دیتا ہے۔

مفت ذریعہ:

فلوٹ کے بعد تیسری رقم کرنٹ اکاؤنٹ کی ہے جو بغیر کسی لاگت کے سود کمانے کے کام آتی ہے۔ موجودہ نظام کے تحت دیندار مسلمان بھی مجبور ہیں کہ اگر سود نہیں لیتے تو نہ لیں لیکن رقم بہر حال بینک میں رکھوائیں۔ یہ رقم بینک کے مالکان اور بینک سے قرض لے کر بڑے بڑے کاروبار کرنے والے سرمایہ داروں کے درمیان سود لینے دینے کا ''کم خرچ بالانشین'' بلکہ بغیر خرچ بالانشینی کا مفت ذریعہ ہے۔ بینک حجاج کرام کی رقوم کو نہیں بخشتے تو عام دینداروں یا دینی اداروں کی رقوم سے کیسے صرفِ نظر کریں گے؟ لہٰذا اس بہتی گنگا میں مل مل کر ہاتھ دھوئے جاتے رہتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ اگر بینکاری کا موجودہ نظام ختم کر دیا گیا تو ملک میں انارکی پھیل جائے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بظاہر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک اپنی لاگت اور واجبی نفع رکھ کر بقیہ سارا نفع عوام کو دے دیتا ہے یہ حقیقت کے بالکل برخلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بینک کو جو کچھ نفع عوام کی رقوم سے حاصل ہوتا ہے اس کا بہت کم حصہ عوام کو ملتا ہے، اس نفع کا زیادہ تر رخ سرمایہ داروں کی تجوریوں کی طرف ہوتا ہے۔ (بینک خود بھی کسی سرمایہ دار ہی کا ہوتا ہے) چنانچہ پوری قوم کے سرمائے پر چند خاندان پل کر ''امیر سے امیر تر'' ہوتے جا رہے ہیں اور عوام ''غریب سے غریب تر'' ہوتے جانے کو قسمت کا لکھا سمجھ کر صبر کیے بیٹھے ہیں۔

طاغوت کا کھیل:

افسوس یہ ہے کہ جب سے صنعتی انقلاب برپا ہوا اور یہود نے دنیا کو سودی نظام میں ملوث کیا تب سے کوئی ایک مسلمان ملک بھی غیر سودی نظام پیش کر کے دولت کی متوازن تقسیم کا عملی نمونہ دنیا کو نہیں دکھا سکا۔ شرعی نظام میں بینک سرمایہ کار کو رقم سود کی بنیاد پر نہیں، نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر دیں گے۔ اس نظام کے تحت دولت کی تقسیم انتہائی منصفانہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں بینک کو اور بینک کے ذریعے عوام کو تھوڑی سی متعین رقم نہیں بلکہ تمام منافع کا فیصدی حصہ ادا کرنا پڑتا ہے جو طے شدہ فکس سود سے زیادہ ہوتا ہے اور پھر اس نفع کو اشیا کی لاگت میں شمار کر کے عوام سے واپس وصول کرنے کا کھیل کبھی نہیں کھیلا جا سکتا کیونکہ نفع تو چیز بیچنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور چیز بکنے کے بعد جو نفع بینک کے ذریعے عوام کو دیا گیا ہے، اسے ان سے واپس وصول کرنے کا کوئی طریقہ ممکن نہیں۔ گویا کہ سودی نظام میں سرمایہ دار عوام کو دیا گیا قلیل سود بھی طاغوتی حیلے کے ذریعے واپس اگلوا لیتے ہیں جبکہ شرعی نظام میں عوام کو وہ نفع بھی واپس مل جاتا ہے جو اشیاءِ صرف کی خریداری پر سرمایہ کار کو دیا گیا تھا۔ یہ نکتہ شاید قارئین کو پوری طرح سمجھ نہ آیا ہو گا لیکن اگر آپ اس کو بغیر سمجھے عیدی کے گیارہ

روپے والی مثال پہ قیاس کرلیں تو بات کافی حد تک واضح ہو جائے گی۔ بچپن میں کسے سمجھ آتا تھا کہ دس روپے لینے میں زیادہ فائدہ ہے یا گیارہ روپے میں؟ سودی اور غیر سودی نظام میں وہی فرق ہے جو بچوں کے مطالبے اور دادا جان کی سخاوت میں ہے۔ یہ شرعی نظام ہی ہے جس کے تحت دولت کی گردش میں سے عوام اپنے حصے کا ڈول بھی انصاف کے ساتھ بھر سکتے ہیں اور اس منافع میں زیادہ بہتر شرح سے حصہ دار ہوتے ہیں جو ان کی بچتوں کے ذریعے کمایا جاتا ہے۔ کاش! اس قوم سے اسلام کا حقیقی چہرہ چھپایا نہ جائے تو وہ برضا و رغبت، دل و جان سے شرعی نظام کو اپنا نجات دہندہ مانے گی.......... مگر یہاں تو اسلام کو اپنوں اور غیروں نے مل کر اس لیے چھپایا ہوا ہے کہ کہیں طاغوتی نظام کے خلاف بغاوت نہ پھیل جائے۔

رازکا سراغ

پہلی بات:

آج کل عالمی استعمار ہم پر ہمارے جیسے لوگوں کی وساطت سے حکومت کرتا ہے لیکن ایک زمانہ ایسا تھا جب اسے اس ظاہر داری کی ضرورت نہ تھی اور اس استعمار کے کارندے کھلے ڈھلے ہم پر حکمرانی کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک لارڈ میکالے تھا جو ملکہ برطانیہ کی طرف سے متحدہ ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ اس نے دوران حکومت جو کچھ کیا سو کیا لیکن یہ یہودی دانشور ایک کام ایسا کرگیا جس کے نتائج ہم آج تک نسل درنسل سہہ رہے ہیں اور کچھ پتہ نہیں کہ کب تک ناکردہ گناہوں کی یہ کھیتی کاٹتے رہیں گے۔ اس حوالے سے اس کا یہ قول بہت مشہور ہے: ''میں ایسا نظام تعلیم وضع کر جاؤں گا جو ایسے ہندوستانی پیدا کرے گا جن کا جسم کالا ہوگا لیکن دماغ گورے انگریز کی طرح سوچے گا۔'' اس سے ملتے جلتے مختلف پیرایوں میں نقل کیے جانے والے اس قول کی اس کی طرف نسبت خدا جانے کہاں تک درست ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ نتائج کی حد تک یہ بات آج تک حیرت انگیز طور پر سو فیصد درست چلی آرہی ہے۔ بالکل ایسے جیسے دانشوران یہود کے ترتیب دیے ہوئے یہودی پروٹوکولز میں درج منصوبہ نما پیش گوئیاں کہ آپ ان کی لاکھ تردید کریں، من گھڑت اور افسانہ کہہ لیں لیکن اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ آج دنیا میں ہو وہی کچھ رہا ہے جو ڈیڑھ سو سال قبل یہودی داناؤں کے اجلاس میں سوچا اور ترتیب دیا گیا تھا۔ راقم کافی عرصہ تک اس میں الجھا رہا کہ آخر عصری نظام تعلیم میں ایسی کون سی بات ہے جو سرزمین مشرق کے فرزندوں کا دماغ مغربی تہذیب کے لیے مطلوبہ حد تک ایسا ہموار کردیتی ہے کہ کالے ہندوستانی گورے انگریزوں جیسی طبیعت کے ہوجاتے ہیں اور مغرب کی لادین تہذیب کے اثرات بلاجھجک قبول کیے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں ثانوی درجے تک اسلامیات لازمی مضمون کے طور پر شامل ہے اور اختیاری مضمون کے طور پر تو اس میں ''ماسٹر'' اور نجانے کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ تو آخر وہ کون سی چیز ہے جو یہ دشمن ملت بو گیا تھا؟ اور جس نے علی گڑھ کے نظام تعلیم میں وہ عنصر داخل کردیا جس کے بعد ''علی گڑھ اولڈ بوائز'' ہوں یا ''ینگ مین'' سب کی نظریاتی حالت قابل رحم ہوگئی ہے۔

راز کیا ہے؟

بندہ نے اس غرض سے کئی بار مختلف جماعتوں کے نصاب اسلامیات کو ٹٹولا کہ ان کو لازمی طور پر پڑھنے والا بھی آخر کیونکر ''ولایتی مُسلا'' بن جاتا ہے اور اسلامیات پڑھنے کے باوجود کیوں اس میں اسلامیت پیدا نہیں ہوتی؟ ویسے تو یہ موضوع جامع تحقیق کا متقاضی ہے لیکن، بادی النظر میں جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ہمارے اسکول کالج میں رائج اسلامیات کے نصاب کو بڑی ہوشیاری اور چابکدستی سے عبادات اور اخلاقیات تک محدود رکھا گیا ہے۔ چند ایک سورتیں یاد کرانے، عبادات کی گھڑی گھڑائی حکمتیں اور فوائد رٹانے اور وہ چند اخلاقیات سکھانے جو مصنوعی ظاہر داری پیدا کریں، سے زیادہ کوئی خاص تکلف نہیں کیا گیا۔ اس نصاب میں چونکہ معاملات سے متعلق احکام سرے سے شامل ہی نہیں اس لیے اس تکلف کو سو فیصد نبھانے کے بعد بھی آدمی

اسلامیت سے اتنا ہی دور رہتا ہے جتنا اتوار کو چرچ جانے والے عیسائی اپنے مذہب سے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ دین اسلام کے احکام دو طرح کے ہیں: ایک کا تعلق اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کی درستگی اور استواری سے ہے۔ احکام کے اس مجموعہ کو "عبادات" کہا جاتا ہے۔ دوسرے کا تعلق بندوں کے باہمی تعلقات، سماج اور معاشرے کی اصلاح اور فلاحی ریاست کے قیام سے ہے۔ اس مجموعۂ احکام کو "معاملات" کہتے ہیں اور ان کو اپنانے سے سیاست وحکومت، معیشت ومعاشرت اس دین الٰہی کے تابع ہو جاتے ہیں جس کا روئے زمین پر عملی وحقیقی نفاذ وقیام امت مسلمہ کی اولین ذمہ داری ہے اور یہی وہ فرض منصبی ہے جس کی خاطر اس امت کو منتخب اور چنی ہوئی امت کہا گیا ہے۔ یہودی مفکرین کے ہاتھوں روندی ہوئی مسیحی دنیا نے عیسائی مذہب کے اس حصے کو (جو پہلے ہی اقلِ قلیل اور غیر جامع تھا) اپنے اپنے ملکوں سے دیس نکالا دے دیا ہے اور وہاں طے کر لیا گیا ہے کہ مذہب کا عمل دخل صرف چرچ کی حد تک ہوگا۔ چرچ کے باہر رکھے پائیدان سے آگے کی مغربی دنیا اپنی مرضی کی زندگی گزارے گی۔ اور مملکت کے تین ستون (مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ) بائبل کی تعلیمات یا پوپ کی راہنمائی کے نہ صرف یہ کہ پابند نہ ہوں گے بلکہ مکمل طور پر آزاد ہوں گے اور ان سے مذہبی پابندیوں کا مطالبہ بھی نہ کیا جا سکے گا۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان طے پا چکا ہے اور اس کے نتیجے میں مغربی دنیا میں عقل وخواہش پرستی پر مبنی وہ ابلیسی نظام حکومت رائج ہوا جو وحی کی راہنمائی اور اطاعت پر مبنی الٰہی نظام حکومت کے مقابلے میں ترتیب دیا گیا ہے اور اب یہی طرز زندگی مسلم ممالک میں پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس میں مذہب انسان کا نجی معاملہ ہو اور مذہبی احکامات عملی زندگی میں حکمران نہ ہوں۔ ہمارے ہاں کی عیسائی مشنریاں، ان کے ماتحت چلنے والے اسکول اور ان کے فنڈ سے چلنے والی این جی اوز جو خاموش طوفان برپا کیے ہوئے ہیں، اس کا مقصد عیسائیت پھیلانا نہیں، عیسائیت تو چرچ سے باہر پھیل ہی نہیں سکتی کہ چند مذہبی رسومات کے علاوہ اس میں مہربانوں نے چھوڑا ہی کیا ہے؟ کٹر عیسائی ملکوں میں بھی سیاست ومعیشت، سماجیات واقتصادیات میں عیسائی تعلیمات کو بالاتر اتھارٹی بلکہ کسی اعتبار سے اتھارٹی تسلیم ہی نہیں کیا جاتا .... یہ تنظیمیں اور ادارے درحقیقت ہمارے ہاں وہ سیکولر ذہن پھیلانا چاہتی ہیں جو خود ان کے ہاں یہودیوں نے بنایا اور جس کے بعد انسان اللہ کی حاکمیت (چاہے وہ کسی مذہب یا نظریے کی شکل میں ہو) قبول کرنے کے بجائے ابلیسی نظام کا چلتا پرزہ بن جاتا ہے اور "احسنِ تقویم" سے "اسفلِ سافلین" میں جا گرتا ہے۔

مغرب کو ہم سے چڑ کیوں؟

لارڈ میکالے نے درحقیقت ہم سے وہ ہاتھ کیا ہے جو اس کے بڑوں نے پوری عیسائی دنیا کے ساتھ کیا اور اس کو ایسی قابل رحم حالت تک پہنچا دیا ہے کہ فی الواقع انسان کو جناب سیدنا مسیح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے گلّے سے بچھڑی ہوئی ان بھیڑوں پر ترس آتا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہ حیرت انگیز صفت پائی جاتی ہے کہ وہ دنیا داری میں لت پت ہونے کے باوجود اپنے اصل کی طرف لوٹ آنے اور اس سے چمٹ جانے کی فطری صلاحیت رکھتی ہے۔ علمائے حق اور راسخین فی العلم کی راہنمائی اسے کسی فریبی نظریے کا شکار ہونے سے بچائے رکھتی ہے اور جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کی برکت سے وہ حزب الشیطان (شیطانی لشکر جو غیر اللہ کی حاکمیت کو قبول کر کے لادینیت کو دنیا پر مسلط کرنے کے لیے کوشاں ہے) کے حملوں کا کامیابی سے دفاع کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ اگر اس امت مجتبیٰ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل وکرم نہ ہوتا اور اس

میں کتاب وسنت کا راسخ علم رکھنے والے علماء ومشائخ نہ ہوتے جو اسلام کی کیاری میں اگنے والے جھاڑ جھنکار کا بروقت تصفیہ کرتے رہتے ہیں تو اسکا حشر بھی دوسری حامل کتاب اقوام سے مختلف نہ ہوتا۔ مغرب کو اس وقت چڑ اس بات سے نہیں کہ ان کی اتنی کوشش ومحنت اور ثقافتی ونظریاتی یلغار کے باوجود مسلمان مسجد سے تعلق کیوں قائم رکھے ہوئے ہیں؟ مسجدیں بنانے اور ان میں وقتاً فوقتاً جانے کی اجازت تو خود ان کے ہاں بھی ہے اور وہ اس اجازت کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے رہتے ہیں، انہیں زیادہ غصہ اس بات پر ہے کہ اسلامی معاشروں میں مسجد کے باہر بھی اللہ کا نام لینے والے اور اس کی حاکمیت قائم کرنے کی شدید خواہش رکھنے والے اور مغربی تہذیب (جسے ابلیسی تہذیب کہنا چاہیے اور جس کو مغرب کے دانش وروں نے یہود کی کوششوں سے دنیا بھر کے مہذب اور غیر مہذب انسانوں کے درمیان فرق اور معیار بنایا ہوا ہے) کو اپنانے سے انکار کرنے والے اب تک نہ صرف موجود ہیں بلکہ اس اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے اپنی جانیں دینے کے لیے بھی نہ صرف تیار ہیں بلکہ اس کو حاصل حیات سمجھتے ہیں۔ مغرب کو ''دہشت گردوں'' سے اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت میں مست یہ دیوانے اس دور میں بھی انسانیت کو ابلیس اور اس کے کارندوں کی غلامی کی ذلت سے چھڑا کر اللہ کی بندگی کے بلند اور قابل رشک مقام تک پہنچانے کے لیے اسی طرح تن من دھن قربان کرنے پر آمادہ ہیں جس طرح ان کے آباواجداد نے اپنے وقت کے سب سے بڑے طاغوت کے دربار میں اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے کہا تھا: ''الله ابتعثنا لنخرج العباد من عبادة العباد إلى عبادة الله، ومن ضيق الدنيا إلى سعتها، ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام." اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مقصد کے لیے مبعوث کیا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نکال کر احکم الحاکمین کی بندگی کے طور طریقے سکھائیں، لوگوں کو دنیا پرستی کی تنگیوں سے نکال کر خدا پرستی کی وسعتوں کی راہ دکھائیں اور انسانیت کو باطل نظاموں کے ظلم وستم سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔'' (البدایہ والنہایۃ: دارالفکر، ج5، ص107 ...... رستم کے دربار میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سے اقتباس)

1923ء کے بعد:

مغرب کو صرف اس چیز سے خطرہ ہے کہ لارڈ میکالے کے نظام تعلیم سے لے کر زیب جلالی طرز تعلیم تک طویل طاغوتی منصوبوں کے باوجود مسلمان معاشروں میں لوگ اللہ کے نام کی مالا جپ رہے ہیں، اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے بے لوث قربانیاں دے رہے ہیں اور اپنے اس عاشقانہ اظہار محبت سے باز نہیں آتے، اس کی وجہ وہ مولوی، ملّا ہیں جو زمانے بھر کے طعنے سننے اور معاشرے سے عملاً کاٹ دیے اور مسترد کر دیے جانے کے باوجود اپنا فرض نبھانے چلے جارہے ہیں۔ ان کے سر سے اسلامیت کو غالب دیکھنے کا سودا نہیں نکلتا اور وہ اپنے اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ایسے مجنونانہ جوش سے مدہوش ہیں کہ اس کی نظیر روئے زمین پر بسنے والا کوئی طبقہ پیش نہیں کرسکتا۔ اسی ملّا کے دم سے مسجدیں آباد، اصلاح وارشاد کے حلقے قائم اور میدان جہاد گرم ہیں۔ یہ اسی کی کارستانیاں ہیں کہ جمہوریت جیسی چیز یہودی ایجاد کے ذریعے قائم اسمبلیوں میں بھی کلمۂ حق کہا جارہا ہے اور شبرغان سے کیوبا تک لرزہ خیز مظالم کے باوجود ''لا الہ'' کی گواہی بساط بھر ایمانی طاقت کے ساتھ دی جارہی ہے۔ ان مولوی ملّا صاحبان کی نسبت دراصل انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ جڑتی ہے جو طاغوتی نظام کے طلسم کو پاش پاش کرنے کے لیے عزیمت وجہاد کی عظیم سنت کو زندہ رکھنے کے لیے مبعوث کیے جاتے تھے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ واجب

الاحترام اور عظیم المرتبت مُلّا اور مولوی عوام کے ایمان کو مغربیت کے ابلیسی جھکڑوں سے بچانے کے لیے ان میں دین سے تعلق اور جہاد کے جذبے کو ہر قیمت پر زندہ رکھیں تاکہ مسلمان خلافت کے ادارے کو دوبارہ قائم کرسکیں جو 1923ء میں حزب الشیطان نے منہدم کردیا تھا اور جس کے بعد مسلمان کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں غوطے کھا رہے ہیں۔

آخری بات:

اس فرض کی ادائیگی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں ''اسلامی عبادات'' کی طرح ''اسلامی معاملات'' کا تصور اجاگر کیا جائے اور انہیں عملی زندگی میں پیش آنے والے مراحل میں جائز و ناجائز میں فرق اور حلال و حرام کی پہچان کی تعلیم دی جائے تاکہ حزب اللہ میں شامل ایک مسلمان کی زبان و ہاتھ اور قول و عمل، حزب الشیطان میں شامل فرد کے کردار سے جدا ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نکاح و طلاق، خرید و فروخت اور لین دین سے متعلق مسائل کو معیاری عصری اسلوب میں ڈھال کر عوام کو تعلیم دی جائے۔ اس کا ایک نمونہ آپ کو عصر حاضر کے نامور عالم دین شیخ الحدیث جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی تحریروں سے اس ایک اقتباس سے ہوگا جس میں انہوں نے بیع کی تعریف، شرائط اور احکام کو فقہی باریکیوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے مروّجہ عصری اسلوب میں ڈھالا ہے اور بیوع کی نسبتاً مشکل بحث کو دس قاعدوں میں سمو کر فقہ میں رسوخ اور اردو زبان پر عبور کا شاہکار نمونہ تشکیل دیا ہے۔ اہل علم اس کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ٹھیٹھ فقہی اصطلاحات کو کس خوبی سے سلیس اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے، یہ وہ لائق تقلید اسلوب ہے جو علمائے کرام کو ابلاغ عامہ کی زبان میں اپنانا چاہیے۔ ہمارے درس و وعظ میں زبان و بیان کی نزاکتوں کو نہ نبھانے کی وجہ سے پڑھا لکھا طبقہ جو دین سے دور بلکہ بیزار ہوتا چلا جا رہا ہے، اس کوتاہی کا ازالہ کرنا چاہیے تاکہ برسوں پہلے ایک انگریز یہودی دانش ور کے پھیلائے ہوئے جراثیم سے فرزندان قوم کے ذہنوں کی تطہیر کی جاسکے اور ''امٹی ڈمٹی'' پڑھ کر جوان ہونے والی نسل کا دین کی حقانیت اور مذہبی روایات پر ایمان و یقین بحال کیا جاسکے۔ اس طرح کے انداز میں پوری اسلامی فقہ پر کام ہونا چاہیے اور اسے فہم دین کورس کا جز بنا کر مساجد میں جاری کرنا چاہیے۔ آخری بات یہ کہ ''آخری بات'' کے عنوان سے جو پیرا دیا گیا ہے، یہ ہے تو بینک اور بینکاروں سے متعلق لیکن اسے ہر مسلمان کو عملی زندگی میں پہلی بات سمجھ کر اپنانا چاہیے۔ یہ وہی پہلی بات ہے جو آخر میں دوبارہ کہی گئی ہے۔

قیدی جزیرے میں کیا بیتی؟

شدت پسند کون؟

اسلام نے دیگر آسمانی دینوں کے متعلق جو اعلیٰ اخلاقی تعلیمات دی ہیں ان کا اثر ہے کہ مسلمان کبھی بھی دوسرے ادیان کی کتب یا انبیائے کرام علیہم السلام کی بے ادبی نہیں کرتے۔ مغرب کے محققین کے سامنے ہم یہ دعویٰ پورے اعتماد سے کر سکتے ہیں کہ وہ ایک بھی ایسی مثال نہیں دکھا سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک تمام انبیا اور تمام آسمانی کتب پر ایمان لانا فرض اور کسی ایک کا انکار کرنا کفر ہے، گویا مسلمان اس وقت تک مسلمان ہوتا ہی نہیں جب تک دوسری آسمانی کتابوں اور انبیا کو بھی مقدس نہیں مانے گا لیکن افسوس کی بات ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرف سے مستقل یہ شکایت آتی رہتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقدس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کی بے ادبی کرتے رہتے ہیں اور ان کے ہم مذہب اس کو قابلِ اعتراض حرکت نہیں سمجھتے بلکہ اُلٹا مسلمانوں پر زور ڈالتے رہتے ہیں کہ وہ توہینِ رسالت کا قانون ختم کر دیں۔ صرف اس ایک فرق کے موازنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ شدت پسند کون ہے اور اعتدال پسند کون؟ معتدل مزاج کون ہے اور متعصب الفطرت کون؟ حال ہی میں گوانتانا موبے میں امریکی فوجیوں کی طرف سے بے بس قیدیوں کو نفسیاتی کرب میں مبتلا کرنے اور روحانی اذیت دینے کے لیے قرآن کریم کی بے حرمتی کو معمول بنانے کے افسوس ناک واقعات سامنے آئے ہیں۔ رہا ہونے والے چند قیدیوں نے ان افسوس ناک یادوں کو عالمِ اسلام کی عبرت کے لیے دل پر ضبط کا پتھر رکھ کر نقل کیا ہے۔

کاش! ہم اپنے دل پر دھری غفلت کی سِلیں ہٹا کر ان واقعات کے پس منظر میں جھانکیں اور قرآن کریم کے ان حقوق کو پہچانیں جن کی ادائیگی نہ کرنے کے سبب آج ہمیں یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے کہ کتاب مقدس کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود ہم اسے رکوا نہیں سکتے۔ مغرب کے انصاف پسندوں کو بھی ہماری دعوت ہے کہ وہ اپنے رویے پر غور کریں اور یہ بات نہ بھولیں کہ خالق کائنات نے آج تک کسی کو ایک حد سے زیادہ مہلت نہیں دی اور جب وہ حد پوری ہو جاتی ہے تو طاقتور کی ساری طاقت دھری رہ جاتی ہے اور قدرت مظلوم کی حمایت میں وہ کچھ کرتی ہے جس کا نظارہ قلزم کی موجوں سے عاد و ثمود کے ٹیلوں تک کیا جا سکتا ہے۔

قیدی جزیرے میں:

تو آیئے! ذرا دیر کے لیے اپنے مظلوم بھائیوں کے پاس بحر اوقیانوس کے ایک قیدی جزیرے پر چلتے ہیں:

گوانتانا موبے کا نام سنتے ہی ظلم و وحشت میں ڈوبے ایک محصور جزیرے اور انسانی اقدار اور حقوق کی پامالی کے ایک مرکز کا خاکہ ذہن میں آتا ہے، جہاں صبح و شام تشدد اور ذہنی اذیتوں کی نت نئی تراکیب آزمائی جاتی ہیں۔ کچھ سال پہلے تک اس جگہ کی کوئی خاص وجہ شہرت نہ تھی لیکن 9/11 کے بعد اس کو بدنامی کے لباس میں لپٹی لازوال شہرت نصیب ہوئی۔ جب یہاں کے

قیدیوں کو دی جانے والی جسمانی وروحانی اذیتوں کی خبریں چھپتے چھپاتے بھی عالمی میڈیا تک پہنچنے لگیں اور غیر جانبدار دنیا ان پر ہونے والے ہوشربا ظلم سے واقف ہوئی تو امریکا کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والے احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رعونت وتکبر کی تصویر بنا امریکا شاید بیرونی احتجاج سہہ بھی جاتا لیکن آفرین ہے اس مرکز کے ستائے ہوئے قیدیوں پر جن کی ''بے تیغ حکمت عملی'' اور بھوک ہڑتال نے انتظامیہ کو بہت سے فیصلے واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ خصوصاً قرآن کریم کے معاملے میں انہوں نے کمال ایمان کا مظاہرہ کیا اور انتظامیہ کو یہ قانون پاس کرنے پر مجبور کر دیا کہ قرآن کریم کو کوئی غیر مسلم نہ چھوئے گا۔ بلاشبہ یہ ان کی بڑی کامیابی تھی لیکن امریکی فوجیوں کی جانب سے اس قانون کا بالکل احترام نہ کیا گیا اور قیدیوں کو موقع بموقع قرآن مقدس کی توہین کر کے روحانی اذیت میں مبتلا رکھا گیا۔ گزشتہ دنوں ان کی ہمت اتنی بڑھی کہ گوانتاناموبے میں شب وروز دہرائے جانے والے اس گستاخانہ عمل کو ایک دوسرے درجے کے اخبار کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلا دیا گیا۔ آج پوری اسلامی دنیا سراپا احتجاج بن چکی ہے لیکن ان کا اتنا اثر بھی نہیں ہو رہا جتنا ان قیدیون کے احتجاج کا ہوا تھا اور امریکا مختلف حیلے حربوں سے اس واقعہ سے جان چھڑانے کے درپے ہے۔ ایسے میں ہم گوانتاناموبے سے آزاد ہونے والے بعض قیدیوں کے آن دی ریکارڈ انٹرویوز کے تراشے ذکر کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اسلامی شعائر کا استہزا کسی شخص واحد کی کارروائی نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کو مادی طور پر تباہ کرنے کے بعد اب روحانی تباہی سے دوچار کرنے کی ایک منظم سازش ہے۔

اسٹیپلر سے جڑے اوراق:

معظم بیگ نامی ایک قیدی اپنی یادوں کو کُریدتے ہیں: ان جیلوں میں قیدیوں کی مشترکہ متاع؛ ایمان کو ہدف بنایا جاتا ہے۔ میں نے جو باتیں نوٹ کیں وہ یہ تھیں: (1) اذان کا مذاق (2) زبردستی ڈاڑھی کاٹنا (3) دورانِ تفتیش جنسی حربوں کا استعمال (4) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین (5) رمضان میں کھانا نہ دینا (6) تلاوت قرآن پاک پر پابندی (7) اذان اور باجماعت نماز نہ پڑھنے کا پابند رکھنا (8) باجماعت نماز کے دوران قیدیوں کو دوسری جیل منتقل کرنا۔

ان تمام واقعات کے رہائی پانے والے قیدی خود شاہد ہیں۔ قرآن کی بے حرمتی تو بالکل ابتدا ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ ان دنوں قندھار میں یہ واقعہ کافی مشہور ہوا کہ ایک امریکی فوجی نے قرآن پھاڑ کر اس کے اوراق گندگی کے ڈبہ میں ڈال دیے۔ اس سال بگرام میں میں نے ایک ایسا واقعہ دیکھا جس نے ہم میں اشتعال پیدا کر دیا کہ قرآن مجید کے بہت سے نسخے ایسی جگہ رکھے گئے جو لٹرین کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ جب وہ ہمارے عقوبت خانوں میں داخل ہوئے اور ہماری تلاشی لی تو میں نے خود دیکھا کہ ایک قیدی سے قرآن چھین کر زمین پر پٹخ دیا گیا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب ہمارے قید خانوں میں قرآن دیے جا رہے تھے تو ایک امریکی اسے پھینک کر جیسا کہ کوئی ہاکر اخبار پھینکتا ہے، پکار رہا تھا: ''آؤ اپنا قرآن لو اور سیکھو کیسے امریکیوں کو مارنا ہے۔'' گوانتاناموبے میں میرے آخری ماہ کے دوران میں ایک ایسے قیدی کے ساتھ تھا جسے ایسا قرآن دیا گیا تھا جس کے اوراق اسٹیپلر سے بے ڈھنگے انداز سے جڑے تھے اور جان بوجھ کر اس میں بہت ساری چیزوں کو حذف کیا گیا تھا۔ تمام پارے اور سورتیں بدلی ہوئی تھیں۔ دورانِ حراست کئی فوجیوں اور تفتیش کاروں نے عیسائیت کی تبلیغ کرنے کی کوشش کی۔ باوجود یہ کہ UK میں میری اسلامی کتب کی ایک دکان تھی اور میں بائبل کا تنقیدی مطالعہ کر چکا تھا، میں نے ان کی بات بڑے غور سے سنی اور ان سے

بائبل کی ایک کاپی بھی لی۔ میرے ہاتھ میں بائبل کو تھامے جس قیدی نے بھی دیکھا تو بحیثیت مسلمان اس کے دل میں اس کی تعظیم کا خیال آیا کیونکہ اس میں خدا کے کہے ہوئے الفاظ ہیں۔ باوجودیکہ وہ ساری کی ساری مصدقہ نہیں لیکن پھر بھی ہم اس کی عزت کرتے تھے۔ ہم یہ بات صاف محسوس کرتے تھے کہ ہم ان عیسائیوں کی نسبت بائبل کا زیادہ عزت واحترام کرتے ہیں۔ یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایک امریکی عہدیدار رچرڈ باؤچر نے بیان دیا ہے کہ ہم نے گوانتاموبے والے عملے کو خاص تربیت سے گزارا ہے تاکہ قیدیوں کے بارے میں وہ ان کے بنیادی حقوق کا خیال رکھیں اور ان کے مذہبی جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے مناسب سلوک کریں۔ اس تمام تر نام نہاد تربیت کے بعد ایسی رپورٹیں عام ہیں کہ وہ بغیر کسی قصور و گناہ کے قیدیوں کے ساتھ بالکل توہین آمیز معاملہ کرتے ہیں۔

واحد مونس وغم خوار:

فیروز عباسی بھی ان افراد میں شامل ہیں جنہیں طویل عرصے تک بلا جرم قید کاٹنے کے بعد رہائی ملی، وہ کہتے ہیں: کیمپ ایکسرے میں 11 جنوری 2004ء سے 28 مارچ 2004ء تک ہمیں کوئی قرآن مجید نہیں دیا گیا۔ کچھ بھائیوں نے پنجروں میں لمبے وقت کاٹنے کے لیے قرآن کریم حاصل کرنے کی کوشش کی اس لیے کہ یہ ہمارا واحد مونس وغم خوار ہے۔ اس وقت ہم تمام وقت سوائے تفریح کے چند منٹوں کے، پنجروں میں گزار دیتے اور تفریح بھی کیا تھی، وہ بھی صرف 15 منٹ کنکریٹ کی دیوار کے اندر کنکریوں پر چہل قدمی، 5 منٹ نہانا اور وہ بھی بیڑیوں میں، لہٰذا کچھ ساتھیوں نے مطالبہ کیا تو انتظامیہ نے ان لوگوں کو پاکٹ قرآن واپس کر دیے جو اُن سے ضبط کیے تھے۔ ایک بھائی جو کہ میرے ہی سیکشن میں تھا جہاں مجھے بریو (Bravo) کہا جاتا تھا۔ اس کا فاصلہ مجھ سے 10 میٹر سے زیادہ نہ تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے قرآن کی کاپی دوسرے بھائی کو دے جس کا فاصلہ اس سے 5 میٹر تھا اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ MP کے نزدیک کھڑے گارڈ سے مدد لے، اس نے قرآن کی کاپی اس کے حوالے کر دی۔ اس شخص نے قیدی سے پاکٹ سائز قرآن لیا اور اپنے اُلٹے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر سیدھے ہاتھ سے چماٹیں مارنی شروع کر دیں۔ ''تم کیوں اس گند کو پھیلانا چاہتے ہو؟'' دوسری دفعہ کہا: ''تم کیوں اس گند کو پھیلانا چاہتے ہو؟'' (نعوذ باللہ) اس نے دو دفعہ کہا۔ کیمپ ایکسرے گوانتاناموبے میں ہماری پہلی بھوک ہڑتال کی وجہ ایک فوجی کا قرآن مجید پر کھڑا ہونا بنی۔ یہ واقعہ دوسرے سیکشن میں ہوا اور مجھے کچھ ایسے اشارے ملے جس سے یقین ہو چلا کہ واقعی اس قسم کا واقعہ ہوا ہے۔ ہماری بھوک ہڑتال کی وجہ سے گوانتاناموبے میں یہ قانون پاس ہوا کہ قرآن مجید یا اس کے ترجمے کو کوئی غیر مسلم ہاتھ نہیں لگائے گا۔ صرف مسلمان ہی اس کو ہاتھ لگا سکتے ہیں لیکن اس قانون کی بڑی ہی منظم انداز میں دھجیاں اُڑائی گئیں۔ قرآن مجید کو بیت الخلا کے ڈبوں میں ڈالنے پر ہماری ایک اور بھوک ہڑتال ہوئی۔ مجھے ایک عرب ساتھی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ قندھار کے جس قید خانے میں ہمارے ساتھی قید تھے (جہاں پر مجھے بھی رکھا گیا تھا) انہیں کہا گیا: ''(نعوذ باللہ) لیٹرین کے ڈبے میں خالی کریں۔'' وہ خبیث قرآنِ کریم کے ڈبوں کے لیے اسی طرح گھٹیا لفظ استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے عثمانی قرآن مجید (غالباً تفسیر عثمانی مراد ہے: راقم) کا ایک نسخہ غلاظت میں پڑا ہوا دیکھا۔ یقیناً یہ حرکت کسی امریکی فوجی نے کی تھی۔ جس بھائی نے ہمیں بتایا اس نے انتہائی لاچارگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم بہت بے اختیار اور کمزور ہونے کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

سزا کا حصہ:

سال کے شروع میں ایک تبدیلی رونما ہوئی جب میری قید کا ایک سال مکمل ہوا۔ اس وقت تفتیش کاروں کو ہم سے ہر طرح کی تفتیش کرنے کے اختیارات مل گئے اور اس وقت لیول سسٹم متعارف کیا گیا۔ جن قیدیوں کو امریکی بہت زیادہ پسند کرتے تھے انہیں خاصی سہولیات دی گئیں، جن میں امریکی قیدی بھی شامل تھے اور انہیں لیول 1 قیدی کہا جاتا تھا اور اسی طرح لیول 4 تک درجہ بدرجہ سہولیات کم کرتے چلے جاتے تھے اور لیول 4 والوں کے پاس صرف ایک کمبل اور ایک ہلکا سا بچھونا تھا اور یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے لیول 4 والوں سے قرآن مجید بھی چھین لیے تھے۔ امریکیوں کا خیال تھا کہ قرآن کے ذریعہ قیدیوں کو ذہنی سکون ملتا ہے لہٰذا قرآن کریم نہ دینا بھی سزا کا حصہ تھا۔ تفتیش کار قرآن مجید کو بطور ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں جب وہ خوش ہوتے تھے تو ایک کمبل کی مانند دیتے تھے جب ناخوش ہوتے تھے تو ایک بوتل کی مانند لے لیتے تھے۔ عرب بھائیوں کی اکثریت حالات سے سمجھوتہ اور قرآن مجید کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے انتظامیہ کے حوالے کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن انتظامیہ قرآن مجید کو منتقل نہیں کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دنیا کے سامنے ان کی ساکھ متاثر ہو، وہ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ہم قیدیوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کر رہے ہیں اور ان کے مذہبی حقوق کا خیال اور احترام کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے پاس قرآن مجید کے نسخے نہ ہوتے تو وہ یہ دعویٰ نہ کرتے کہ ہم ان قیدیوں کے مذہبی حقوق کی پاسداری کر رہے ہیں لہٰذا انہوں نے قرآن مجید واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اس مسئلے کا حل پہلی بھوک ہڑتال کے بعد سامنے آیا جب قیدیوں نے ہڑتال کے ذریعے یہ بات تسلیم کروائی کہ کوئی بھی غیر مسلم قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ انتظامیہ یہ کہتی تھی کہ وہ قرآن مجید کی تلاشی کے دوران ضرور چیکنگ کرے گی تاکہ اس میں کوئی اسلحہ نہ چھپایا جا سکے تاہم ہڑتال کے بعد قرآن مجید کی بے حرمتی کے بغیر تلاشی کا عمل مکمل کیا گیا۔

ردِ عمل کا خوف:

اس کے بعد انتظامیہ نے ایک شرط عائد کی کہ جو قیدی قرآن کی تلاشی نہیں دے گا (جو کہ اس وقت لی جاتی تھی جب قیدی اپنے پنجرے چھوڑ کر پندرہ منٹ کی چہل قدمی کے لیے جاتے تھے) تو اس سے تفریح کی سہولت واپس لے لی جائے گی۔ وہ قیدی جو اس ''نافرمانی'' کے مرتکب تھے (جو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری تھی) انہوں نے یہ سوچا کہ پندرہ منٹ تک دائرے میں چہل قدمی اور نہانے سے قرآن کی اہمیت یقیناً زیادہ ہے تو انہوں نے قرآن کی اہمیت کی خاطر پنجروں میں بند رہنے کو ترجیح دی۔

میں نے ایک سے زیادہ فوجی اہلکاروں سے سنا کہ ایک خاتون فوجی اپنی تعیناتی کے آخری وقت میں قرآن مجید کو دو مرتبہ فرش پر پٹخنے کی مرتکب ہوئی۔ اس کی یہ حرکت قیدیوں کے بلاک میں ہنگامے کا باعث بنی۔ اس خاتون کا ایک علامتی نام تھا۔ جیل میں تمام فوجیوں کے نام علامتی تھے اور اصلی ناموں کے بجائے علامتی ناموں سے معروف تھے تاکہ کوئی قیدی رہائی کے بعد ان ظالم فوجیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس بدذات فوجن نے اپنا علامتی نام نعوذ باللہ ''اللہ'' رکھا تھا۔ جب یہ فوجی خاتون قیدیوں کے بلاک میں چلتی تھی اپنے سینے پر اس نے یہ نام لکھا ہوتا تھا۔ یہ معلومات ہمیں ایک بہت باوثوق شخص (ایک سارجنٹ) سے ملیں جو ہمارا احترام کرتا تھا۔

مرچوں کا اسپرے:

ایک اور قیدی طارق ورغول کہتے ہیں: قرآن مجید، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تفتیش کے دوران غلط زبان استعمال کرنا تفتیش کاروں کا معیاری طریقہ تفتیش سمجھا جاتا تھا۔ یہ توہین صرف زبانی حد تک نہیں تھی۔ قندھار اور گوانتانا موبے میں قرآن کو پھاڑا گیا، ٹوائلٹ میں پھینکا گیا اور فرش پر پٹخا گیا۔ قرآن مجید کو امریکی فوجیوں کی بے حرمتی سے بچانے کے لیے تین سو قیدیوں نے احتجاجاً اپنے اپنے قرآن مجید واپس کر دیے۔ قیدیوں کے مذہبی جذبات اور ان کی عبادات کی تذلیل کرنا ملٹری پولیس کا ایک حربہ تھا۔ ایک افسر سے جب پوچھا گیا کہ تم قرآن کریم کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تو اس نے جواب دیا کہ تمہاری تو تفتیش ہو رہی ہے لیکن قرآن کے ساتھ ہم وہ کریں گے جو ہم چاہیں گے۔ تین سو قیدیوں نے بھوک ہڑتال اس وجہ سے کی۔ ایک تفتیشی افسر سوال کرتے ہوئے قرآنِ کریم کے ایک نسخے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہم نے کئی دنوں تک نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ اکثر قیدی نقاہت سے گرنے لگے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ انہیں انتظامیہ کی جانب سے غذائی انجکشن لگائے گئے۔ صورتِ حال اس وقت مزید بدتر ہو گئی جب چند امریکیوں نے کیمپ سے جاتے ہوئے کئی قرآن مجید میں ناقابلِ بیان فحش کلمات لکھ دیے۔ اس واقعہ کے بعد مزید قیدی بھوک ہڑتال میں شریک ہو گئے۔ جب اس پر بھی انتظامیہ نے کوئی توجہ نہ دی تو قیدیوں نے تعاون نہ کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کر لی۔ بیڑیاں لگوانے سے انکار کیا اور کسی بھی صورت میں اپنے پنجروں سے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ ان کا یہ انکار انتظامیہ کو ناگوار گزرا۔ اس نے ایکسٹریم ری ایکشن فورس تشکیل دی۔ ایک ازبک قیدی تھا جس کی عمر 18 سال تھی۔ یہ قیدی مارشل آرٹس کا ماہر تھا۔ گروپ جب اس کے پنجرے کی طرف بڑھا تو ازبک قیدی نے اکیلے ہونے کے باوجود اس گروپ کے پانچوں اہلکاروں کی شدید ٹھکائی لگائی۔ یہ گروپ دوبارہ اس کے پاس آیا۔ اس بار بھی ان کے ساتھ یہی حشر ہوا۔ تیسری مرتبہ انہوں نے مرچوں کی تین چار بوتلوں کا اسپرے کیا جس سے وہ ازبک قیدی پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

پانچ وقت کا کھیل:

امریکیوں کو قرآن مجید کے ساتھ قیدیوں کے تعلق اور لگاؤ کی کیفیت معلوم ہونے کی وجہ سے اس کی توہین کو قیدیوں کے لیے بطورِ سزا استعمال کرتے تھے۔ قرآن مجید کے صفحات کم ہوتے یا غلط چھپے ہوتے تھے۔ قیدیوں کو ان سیلوں میں منتقل کرتے جہاں قرآن مجید کے نسخے نہیں ہوتے تھے۔ جب ہم نے پوچھا: ہم اپنے قرآن کیوں نہیں لے جا سکتے جبکہ یہ سہولت ہمیں شروع میں دی گئی تھی؟ اس نے بات کا جواب دینے سے لاپروائی سے انکار کیا اور کہا کہ ہمیں اوپر سے حکم ہے۔ ایک گارڈ نے مسلمانوں کی توہین کی اور اللہ اور اس کے رسول کو نعوذ باللہ ملامت کیا۔ ایسے کئی واقعات دیکھنے کی وجہ سے میں نے بھی احتجاجاً قرآن مجید کے ساتھ اس سلوک کے خلاف بھوک ہڑتال میں شمولیت اختیار کی حالانکہ لاؤڈ اسپیکر جو کہ اعلانات نشر کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے ان کے ذریعے اذان کا بھی مذاق اُڑایا گیا۔ وہ پانچ وقت یہ کھیل کھیلتے تھے وہ اس طرح کا کھیل خصوصیت سے نماز کے اوقات میں کھیلتے تھے۔ راحیل نامی ایک قیدی اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ ایک احتجاج کیمپ ایکسرے میں شروع ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک گارڈ قیدی کے سیل میں چلتا ہوا آیا اور قرآن مجید کی تلاشی لی اور اسے فرش پر پھینک دیا۔ ایک قیدی نے اسے کہا کہ اسے اُٹھاؤ اور اسے اس کے جزدان میں رکھو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس گارڈ نے فرش پر پڑے قرآن کو دیکھا اور کہا: ''یہ'' اور پھر زور سے لات ماردی، نعوذ باللہ! اس کے خلاف ہم نے چلانا

اور دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ گارڈ وہاں سے بھاگ گیا۔ آدھے دن تک ہمارا کیمپ لاک رہا۔

حد سے آگے:

محمد مظعون، ایک معذور قیدی ہیں، انہوں نے داستانِ کرب سناتے ہوئے کہا: میں چاہوں گا کہ دنیا کو امریکا کی جانب سے ہمارے بنیادی اُصولوں کا استحصال اور انہیں پامال کیے جانے سے آگاہ کروں۔ یہ تعلق رکھتا ہے قرآن مجید کی بے حرمتی سے، امریکیوں کی طرف سے اس کے ساتھ وہ کچھ کیا گیا جس کی کوئی حد نہیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے قینچیوں سے کاٹا، اس پر (غلاظت) لٹرین کی اور پھر اسے ہمارے چہروں پر ملا گیا۔

جی ہاں! یہ سب کچھ مسلم امہ سے کہنا چاہیے کہ امریکیوں میں اس کی نفرت کس درجہ کی ہے اور کس حد تک ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اس کی یہ نفرت اس حد تک کیسے پہنچی؟ ایک دفعہ ہمارے سامنے ریڈ کراس کی موجودگی میں قید خانے کے تمام قرآن مجید کے نسخوں کو پھاڑ دیا۔ انہوں نے اس کتاب کے ساتھ اس طرح سے سلوک کیا گویا کہ یہ گندی چیز ہے۔ جب ہم لوگوں نے احتجاج کیا تو ہمیں بہت تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جب بھی قرآن مجید کے ساتھ اس طرح کا عمل کیا ہم نے احتجاج کیا اور اس کے جواب میں ہمیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور یہ ایک ظالمانہ عمل تھا۔

ایک اور قیدی عبدالرحمٰن احمد کہتے ہیں: کوئی بھی منظر اس سے زیادہ غمناک نہیں ہے کہ قرآن مجید کو غلاظت میں لت پت دیکھا جائے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے ساتھ ہر طرح کا تشدد برداشت کرسکتا تھا لیکن یہ منظر میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ امریکی فوجی قرآن مجید پر کھڑے ہو کر رقص کرتے تھے۔ احمد بگرام بیس کے ایک واقعہ کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک امریکی فوجی عورت ہمارے سیل میں تلاشی کے لیے داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔ تلاشی کے دوران اس نے کتے کو قرآن مجید سنگھایا۔ احمد کہتا ہے کہ مجھ سمیت 70 دوسرے قیدیوں کو پنجگانہ نماز اور تلاوت سے کافی عرصہ تک روکا گیا۔

انجام کا سفر:

برادرانِ اسلام! یہ ہیں وہ حالات جن کی وجہ سے یہ زمین دہکتا تنور بن گئی ہے اور کوئی وقت جاتا ہے کہ یہ تنور اُبلنے لگے گا اور اس سے بننے والا طوفان، طوفان نوح کی طرح ظالموں کو کہیں پناہ نہ دے گا۔ امریکا اس وقت براہِ راست اللہ پاک سے ٹکر لے رہا ہے اور یہ وہ آخری غلطی ہے جس کے بعد تاریخ بتاتی ہے کہ مزید غلطیوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ بس بات لمبی اس لیے ہو رہی ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کو سینے سے لگایا ہے انہوں نے اسے اپنے کردار میں بسایا نہیں ہے۔ اگر دشمن جس طرح اس سچی کتاب کی قول و فعل سے توہین کر رہا ہے، قرآن کے غلام اور خادم اپنے زبان و عمل سے اسی درجے کا اکرام شروع کر دیں تو انجام کا سفر تیزی سے سمٹ سکتا ہے۔

''بھاگ'' کے نصیب

گرم حمام، پُر فضا چمن:

ہم جب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ گرم تنور کی طرح دہک رہا تھا۔ یہ رات ایک بجے کا وقت تھا ہم وادی بولان کے سنگلاخ پہاڑوں میں تھکا دینے والا سفر کر کے ریاست قلات کے سابقہ سرمائی دارالحکومت ''بھاگ'' پہنچے تھے۔ راستے میں کوئٹہ اور اس کے مضافات کی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف لیتے ہوئے اندازہ نہ تھا کہ بولان کے سب ڈویژن بھاگ میں انگارے سلگ رہے ہوں گے۔ ہمارے میزبانوں نے کمرے میں فرشی نشست کو اہتمام سے سجایا ہوا تھا لیکن حبس کا یہ عالم تھا کہ دم گھٹا جا رہا تھا، دیواروں سے تپش خارج ہو کر چہرے کو تپائے دے رہی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے لوہا پگھلانے والی آگ کی بھٹی کے دہک رہی ہو اور ہمیں ہاتھ اور چہرہ سینکنے کے لیے اس کے قریب پہنچا دیا گیا ہو۔ اس سے قبل کہ میزبان اندر آ کر روایتی انداز میں حال احوال پوچھتے، ساتھیوں کی قوت مدافعت جواب دے گئی اور وہ بے تاب ہو کر کمرے سے باہر صحن میں نکل آئے۔

یہ ''دارالعلوم بھاگ'' نامی مدرسے کا صحن تھا اور قطار میں بچھی چارپائیوں پر طلبہ مزے سے سو رہے تھے۔ ہم نے خواہش ظاہر کی کہ ہمیں بھی صحن میں کہیں جگہ بنا دی جائے۔ ہمیں علم نہ تھا کہ میزبان حضرات نے کھانے کا انتظام کمرے میں اور سونے کا صحن میں کر رکھا ہے۔ صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ کر یوں محسوس ہوا جیسے گرم حمام سے نکل کر پُر فضا چمن میں آ گئے ہوں۔ جس علاقے میں نصف شب کو حبس اور تپش کا یہ عالم ہو وہاں دن کے وقت کیا گزرتی ہوگی؟ اور جہاں بیٹھ کر آدمی کھانا نہ کھا سکے وہاں سبق کیسے پڑھتا پڑھاتا ہوگا؟

یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی جیسا کہ ہمیں یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ انسان اور جانور ایک ہی جوہڑ سے کیسے پانی پیتے اور آبی ضروریات پوری کرتے ہیں؟ لیکن ''بھاگ'' آ کر معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ بھی تعجب کی باتیں ہمارے ملک کے دور دراز خطوں میں روزمرہ کا معمول ہیں۔ انسان اور حیوان ایک ہی تالاب سے اس وقت تک استفادہ کرتے ہیں جب تک وہ سوکھتا نہیں، جب کچھ عرصے بعد بارش کے پانی سے بھرنے والے یہ تالاب بھی سوکھ جاتے ہیں تب کیا ہوتا ہے؟ اس کا تصور ہی دل دہلا دینے والا ہے۔

چند گز زمین:

''بھاگ'' نام کا علاقہ بلوچستان کے ضلع بولان میں واقع ہے۔ یہ ریاست قلات کے زمانے میں خوانینِ قلات کا سرمائی دارالحکومت تھا۔ خان آف قلات گرمیاں قلات میں اور سردیاں بھاگ میں گزارتے تھے۔ ہمارے محترم دوست قاضی محمد انور صاحب کی بدولت ہمیں اس علاقے سے آشنائی ہوئی۔ موصوف ملک کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل اور بلوچستان کی مشہور علمی شخصیت اور نامور عالمِ دین قاضی حبیب اللہ صاحب رحمہ اللہ کے فرزند ہیں۔ بھاگ ان کا آبائی

علاقہ ہے جہاں دارالعلوم بھاگ کے نام سے ان کا قائم کردہ دینی ادارہ علاقے میں معیاری علمی و اصلاحی خدمات کا واحد ذریعہ ہے۔ دارالعلوم کی مسجد ڈھائی سو سالہ قدیم ہے اور یہ وہ تاریخی مسجد ہے جہاں قاضی صاحب موصوف کے آبا و اجداد سالہا سال سے مجلس قضا قائم کرتے اور لوگوں کے درمیان شریعت کے مطابق فیصلے کرتے چلے آئے ہیں۔

ہمارا قاضی صاحب سے یارانہ گزشتہ سال سے قائم ہوا جب جامعۃ الرشید میں دورۂ قضا کے سلسلے میں ہم کسی ایسے شخص کی تلاش میں نکلے جو علوم شرعیہ میں رسوخ رکھنے کے ساتھ قضا کا عملی تجربہ بھی رکھتا ہو اور جامعہ کے اساتذہ کرام اور متخصصین کو نظامِ قضا کے حوالے سے لیکچرز دے۔ سُن رکھا تھا کہ بلوچستان میں اب بھی شرعی قضا کا نظام نافذ ہے اور وہاں ایسے علمائے کرام موجود ہیں جو قدیم فقہی ذخیرہ سے واقفیت رکھنے کے ساتھ جدید طریقہ کار سے بھی واقف ہیں۔ گزشتہ دو تین سال سے کسی ایسی شخصیت کی تلاش جاری تھی جن کے ذریعے اس مٹے ہوئے فریضے کو زندہ کرنے کی مہم آگے بڑھائی جا سکے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد سے لے کر آج تک روئے زمین پر چند گز زمین بھی ایسی نہیں رہی جہاں اس کائنات کے خالق و مالک کا حکم جاری ہو۔ مسلمان خلافت اسلامیہ کے قیام کی جدوجہد سے تو غافل ہیں ہی، نظام قضا کے جاری رکھنے میں بھی...... اللہ معاف کرے اور بے ادبی سے بچائے...... ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد دوسرے تمام شعبے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے علمائے کرام نے سنبھال لیے اور دین اسلام کے گلشن کا کوئی پودا ایسا نہیں جس کی آبیاری ان اولوالعزم ہستیوں نے نہ کی ہو۔ بس صرف ''قضاء شرعی'' کا شعبہ ایسا ہے کہ جو تاحال محتاج توجہ ہے۔

لکھا ہوا نصیب:

بھارت کے علمائے کرام نے بعض علاقوں میں نظام قضا کو منظم کیا ہے اور ان کی کوششیں لائقِ تحسین ہیں لیکن وطنِ عزیز میں اس عظیم فن کی تعلیم و تربیت کی کوئی شکل اب تک سامنے نہیں ہے۔ مدارس میں دارالتفسیر، دارالحدیث اور دارالافتا موجود ہیں لیکن ''دارالقضا'' کسی مدرسے میں بھی آپ کو نہیں ملے گا۔ سالانہ چھٹیوں میں دورۂ تفسیر، دورۂ صرف، دورۂ نحو، دورۂ میراث وغیرہ ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن دورۂ قضا کا کہیں نام و نشان دیکھا نہ سنا، جبکہ یہ ہمارے اللہ کی شریعت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا وہ اہم ترین حصہ ہے جس کے ذریعہ پورے دین کا عملی نفاذ اور قیام ہوتا ہے۔

اس فکر اور کڑھن میں گزشتہ کئی سالوں سے اندھوں بہروں کی طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کوشش اور تلاش جاری تھی۔ خود ہمارے حضرت والا (شیخ المشائخ مفتی رشید احمد صاحب) رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگردوں میں سے کئی حضرات محکمہ قضا بلوچستان میں اونچے عہدوں پر فائز ہیں اور ان کا اس شعبے میں بڑا نام ہے جیسے قاضی ہارون صاحب اور قاضی عبدالخالق صاحب حفظہم اللہ تعالیٰ لیکن بوجوہ ان کے لیے وقت دینا ممکن نہ تھا۔ کرتے کرتے ایک دن قاضی انور صاحب تک رسائی ہوگئی۔ اب محسوس ہوا جیسے قدرت نے ہمارا نصیب ان کے ساتھ لکھ دیا تھا، چنانچہ بغیر کسی سابقہ شناسائی کے موصوف سے بات آگے بڑھتی گئی۔

ان کے علم و تقویٰ، اخلاص اور کام سے لگن کے نتیجے میں گزشتہ سال جامعۃ الرشید میں ششماہی امتحان کے دورانیے میں

پندرہ روزہ ''تربیتِ قضا کورس'' منعقد ہوا۔ اس سال اس کو مزید منظم انداز میں منعقد کرنے کے لیے قاضی صاحب موصوف کے ساتھ قاضی عبدالوہاب صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں۔ اللہ کرے کہ اس دورہ کا نصاب ونظام کسی منظم شکل میں سامنے آجائے تو دوسرے علمی کورسز کی طرح اسے بھی مدارس کی سالانہ تعطیلات میں بڑے پیمانے پر منعقد کیا جاسکتا ہے، نیز تخصص فی الافتا کی طرح ''تخصص فی القضا'' نامی شعبے کی بنیاد بھی ڈالی جاسکتی ہے۔

ایک گھونٹ کے لیے:

قاضی انور صاحب نے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں تذکرہ کیا کہ کبھی آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں تو پاکستان میں دیہاتی زندگی کا وہ رنگ دیکھیں جس کا تصور شہر میں رہ کر نہیں کیا جاسکتا۔ بلوچستان کے دوسرے علاقوں کی طرح قاضی صاحب کے علاقے ''بھاگ ناڑی'' میں فراہمی آب کی صورتِ حال انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ واٹر سپلائی کا پانی آٹھویں دن آتا ہے اور آدھ گھنٹے کے لیے باری لگتی ہے۔ زمین کے نیچے پایا جانے والا پانی سمندر کے پانی سے کئی گنا زیادہ کھاری اور کڑوا ہے۔ قاضی صاحب نے ذاتی زمین میں ایک بورنگ کروا رکھی ہے جس سے علاقے کے لوگوں اور مدرسے کے طلبہ کو نہانے دھونے کے لیے کسی قدر تری میسر آجاتی ہے لیکن پینے کے لیے لے دے کے ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہیں شہر میں جگہ جگہ بنے ہوئے آٹھ چھوٹے اور ایک بڑا تالاب۔

علاقے میں اگر بارش ہوجائے تو گردوپیش کے پہاڑوں سے آنے والا پانی ان میں ذخیرہ کرلیا جاتا ہے اور یہ بدبودار، گدلا اور جراثیم سے آلودہ پانی کچھ عرصہ انسانوں اور حیوانات کی مشترکہ ضرورت پوری کرتا ہے اور جب یہ بھی ختم ہوجاتا ہے تو پھر ایک ایک گلاس اور ایک ایک گھونٹ کے لیے کیا کچھ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟ اس کو یہاں بیان کیا جانا مبالغہ محسوس ہوتا ہے اور لگتا نہیں کہ ہمارے ملک میں ہم وطنوں کو پانی جیسی بنیادی چیز کے لیے اس قدر دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اور شدید گرمیوں میں جب شہری علاقوں کے لوگ ٹھنڈے ٹھار مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں، ہمارے باقی ہم وطن کس طرح گھونٹ گھونٹ پانی کو ترستے ہیں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مردہ بغیر کفن دفن کے چوبیس چوبیس گھنٹے تک یونہی پڑا رہتا ہے اور بالٹی بھر پانی دستیاب نہیں ہوتا کہ پانی کے لیے ترسے ہوئے اس وجود کو گیلا کرکے سفرِ آخرت پر روانہ کیا جائے۔

افغانی تنور میں:

پہلے دن جب ہم نصف شب کے قریب طویل سفر کرکے اپنے میزبانوں کے پاس پہنچے تو حبس اور تپش کے یہ عالم تھا گویا افغانی تنور میں سر دے دیا ہے۔ رات تو جیسے تیسے گزری سو گزری، دن کو شدید گرمی میں ہونٹ خشک ہوکر حلق میں کانٹے سے چبھتے تھے لیکن پانی اس لیے نہ مانگتے تھے کہ اس پانی کا تصور کرکے ہول آتا تھا جو وہاں پیا پلایا جاتا ہے۔ جو پانی کئی ہفتوں سے کچی مٹی کے کھلے تالاب میں کھڑا ہوا اور جس کا رنگ گدلا ہونے کے ساتھ ذائقے میں بھی ایسی ہیک ہو کہ گھونٹ بھرنے کے بعد ابکائی آنے لگے، سمجھ میں نہ آتا تھا اسے حلق سے کیسے اُتارا جائے؟

اگلے دن علاقے کا بڑا تالاب دیکھنے گئے۔ وسیع وعریض تالاب کے کنارے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بیچ میں جابجا

جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف مختلف جگہوں سے گدھا گاڑیوں کے پیچھے لگے ڈرم بھرے جا رہے تھے جن سے گرنے والا پانی واپس تالاب میں بہ رہا تھا۔

گدھا تو آخر گدھا ہے، اسی حالت میں پیشاب بھی کر دیتا تھا اور یہ پیشاب پانی کا حصہ بننے کے بعد دوبارہ ڈرم میں پہنچ جاتا تھا اور بلا تکلف نوشِ جان کیا جاتا تھا۔

''جنابِ من! آپ دیکھ نہیں رہے یہ گندا پانی اور پیشاب جو ہڑ میں جا رہا ہے؟''

''قبلہ حضور! یہ تو گدھے کا پیشاب ہے، اگر گدھا خود اس میں مر جائے تو بھی ہم یہی پانی پئیں گے کہ اس کے علاوہ ہمارے پاس جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔''

گائے کے آنسو:

قاضی انور صاحب نے فرمایا کہ جب میں کراچی سے نیا نیا پڑھ کر آیا تو اس پانی سے وضو وغسل میں مجھے اشکال ہوا کہ رنگ بو مزہ سب کچھ بدلا ہوا ہے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ کوئی فیصلہ کرنے یا مسئلہ بتانے میں جلدی نہ کرنا۔ ہم نے ایک مرتبہ فتویٰ دیا کہ اس پانی سے وضو جائز نہیں ہے پھر وہ وقت آیا کہ یہ پانی پینا پڑا۔ گزشتہ سالوں میں خشک سالی سے یہ تالاب سوکھ چکا تھا۔ گائے بیل آسمان کی طرف دیکھ کر آواز لگاتے تھے...... برسبیل تذکرہ بھاگ ناڑی کے بیل کی نسل پورے پاکستان میں مشہور ہے۔ گزشتہ سال یہاں کا ایک بیل کراچی کی بقر عید منڈی میں ساڑھے چار لاکھ کا بکا تھا جو ایک خاتون نے خریدا تھا۔ یہ نسل آواز نہیں لگاتی البتہ فریزن نسل کی گائے پیاس کی شدت سے بلبلاتی تھی...... گائے کی آنکھوں سے آنسو بہتے صاف دیکھے جاتے تھے لیکن کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ایک پیاسا کتا دوپہر کے وقت ہانپتا ہوا آیا لیکن پانی کے قریب پہنچ کر گرمی کی شدت سے بے حال ہو کر گرا اور مر گیا۔ یہ کتا جوہڑ کے آخری چند ڈرم پانی کے ایک طرف مرا ہوا پڑا تھا اور دوسری طرف سے لوگ بچا کھچا پانی بھر کر لے جاتے تھے کہ وہ ابھی جینا چاہتے تھے۔

گزشتہ سال قاضی صاحب کے مدرسے کے طلبہ نے عصر کے وقت ناظم صاحب کو بتایا کہ ایک غیر مقامی طالب علم جو علاقے میں نووارد تھا، کی حالت غیر ہو چکی ہے۔ ہونٹ سفید ہو چکے ہیں اور اگر اسے فوراً پانی نہ ملا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ناظم صاحب نے پوچھا: ''آخری مرتبہ پانی کب پیا تھا؟''

''دوپہر بارہ بجے۔''

''کب تک صبر کر سکتے ہو؟''

''مغرب تک۔''

ناظم صاحب یہ سن کر گھبرا گئے اور مقامی طالب علم کو لے کر ایک آدھ جگ پانی کی تلاش میں نکلے۔ محلے کے لوگوں کو پتہ چلا تو کچھ نے جگ لایا کچھ نے آدھا جگ اور طالب علم کی جان مشکل سے بچائی گئی۔

ہندو کا تالاب:

قارئین کرام! یہ وہ حالات ہیں جو قصہ کہانی محسوس ہوتے ہیں لیکن ہم نے خود اپنی آنکھوں سے علاقے کا مشاہدہ نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی یقین نہ آتا۔ ''بھاگ'' کسی زمانے میں علاقے کا علمی وثقافتی مرکز تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں اس کا

تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے وہاں کا انار کھایا جو نہایت میٹھا تھا۔ آج بھی یہ علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ مٹی نہایت جاندار ہے لیکن اس کو نم کرنا بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں جو پانی آتا تھا وہ سبی کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور اب یہاں فقط دھول اُڑتی ہے۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ نے احیائے خلافت بذریعہ جہاد کے مشن کے دوران سندھ و بلوچستان کے مختلف علاقوں کا جو سفر کیا تھا، اس میں وہ بھاگ بھی تشریف لائے تھے۔ ان کے سفرنامہ میں لکھا ہے: ''یہاں کے قاضی صاحب نے سید صاحب اور ان کے چار صد ہمراہیوں کی دعوت کی۔''

یہ قاضی صاحب ہمارے ممدوح قاضی انور صاحب کے آباو اجداد میں سے تھے۔ افسوس ہے کہ جہاں ابن بطوطہ نے انار کھایا تھا اور جہاں سید صاحب رحمہ اللہ کے چار سو ہمراہیوں کی ایک وقت میں دعوت کی گئی تھی وہاں آج پانی کا ایک ہی بڑا تالاب ہے جسے لوگ ''ہندو کا تالاب'' کہتے ہیں، اس لیے کہ ایک زمانے میں یہاں ایک ہندو نے تالاب کے کنارے پختہ کروادیے تھے۔ چاروں طرف جنگلہ لگوایا تھا اور مختلف جگہوں پر سیڑھیاں بنوا کر پانی بھرنے کا بہترین انتظام کیا تھا۔ جب پہاڑوں سے پانی بہہ کر سیلابی ندیوں میں اور وہاں سے تالاب میں آتا تو پہلے تالاب کی گندگی بہا کر لے جاتا، پھر پانی روک لیا جاتا۔ آج جنگلہ غائب ہے، پشتہ ختم ہو چکا ہے، صفائی کا نام ونشان نہیں، دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہیں، سالہا سال سے تالاب کی مرمت نہ ہونے کی وجہ سے پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش کم ہو چکی ہے لیکن کیا اس ہندو کے بعد کوئی مسلمان ایسا نہیں جو یہ کام کروا سکے؟

اس بڑے تالاب کی صفائی اور مرمت کا خرچ ہے ہی کیا؟ دو سے تین لاکھ کے درمیان لیکن اس سے تقریباً پچاس ہزار افراد استفادہ کریں گے۔ ایک جگر کو تر کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفرت کا ذریعہ بن سکتا ہے تو گرمی اور پیاس کے مارے ہوئے ہزاروں افراد کو اتنا پانی پلا دینا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا اور پلانے والے کے لیے دُعا کرسکیں کس قدر اجر کا باعث ہوگا؟ اس کا اندازہ اس جملے سے کریں جو آخر میں رخصت ہوتے ہوئے ہم سے کہا گیا:

''مفتی صاحب! اگر یہ تالاب بن جائے تو الرشید ٹرسٹ کا یادگار کارنامہ ہوگا، یہ ہماری نسلوں پر احسان ہوگا۔''

''صاحب! اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ یہ آپ پر احسان نہیں، خود اپنے ساتھ بھلائی ہے۔ ہم اپنی طرف سے کوشش کریں گے کہ کسر نہ چھوڑیں، آگے اللہ مالک ہے۔ آزمائشیں اور مشکلات بھی اسی کی طرف سے آتی ہیں اور مشکلات کے بعد آسانیاں اور آسائش دینے والا بھی وہی ہے۔''

اس غرض کے لیے اس سے قبل جو اشتہار دیا گیا تھا، اس کے ذریعے آمدہ عطیات سے کام شروع کروایا جا چکا ہے لیکن اس کی تکمیل اصحابِ خیر کی توجہ چاہتی ہے۔ آسمان اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ رب العزت ہی ہے اور وہی اپنے بندوں کی جملہ ضروریات کا کفیل ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ دیکھیے ''بھاگ'' کے نصیب کب جاگتے ہیں؟؟؟

☆......☆......☆

چٹائی کا تنکا

مدرسہ کے ساتھ ایک قدیم عمارت تھی۔ معلوم ہوا کہ خان آف قلات کے زمانہ کی جیل ہے۔ یہاں جو مجرم بند ہوتے تھے وہ قاضی صاحب سے اجازت لے کر شہر میں چائے وغیرہ پینے بلا تکلف چلے جایا کرتے تھے لیکن قاضی صاحب کا ان پر ایسا

رُعب تھا کہ مجال نہ تھی فرار ہوسکیں۔ معلوم تھا ریاست بھر میں کہیں پناہ نہ ملے گی۔ یہ تو مجرموں کا حال تھا۔ ملزموں پر اس قدر دبدبہ تھا...... اور یہ رعب وَدبدبہ قاضی صاحبان کے علم و دیانت وانصاف پسندی کی بنا پر ہوتا تھا...... کہ جب مدعی پیش ہوکر دعویٰ کرتا تو مدعی علیہ کو حاضر کرنے کے لیے نہ سمن بھیجنے پڑتے نہ سرکاری ہرکارے دوڑائے جاتے۔ قاضی صاحب جس چٹائی پر بیٹھتے تھے اس کا ایک تنکا توڑ کر مدعی کو دے دیتے کہ مدعی علیہ تک پہنچا کر کہہ دو فلاں دن حاضر ہوجائے۔ قاضی صاحب کی چٹائی کا یہ تنکا اپنے اندر اس قدر وزنی پیغام رکھتا تھا کہ مدعی علیہ کو حاضری کے سوا چارہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

صرف صاف

علاقے کے ایک شخص سے ہم نے کہا: ”اگر یہ تالاب صاف بھی کروادیے جائیں تو بھی ان میں کھڑا ہونے والا پانی تو گدلا اور گندا ہوتا ہے اس سے آپ کا کیا بنے گا؟“

کہنے لگا: ”جناب! یہاں گندا پانی نہیں ہوتا، یہاں صرف صاف پانی ہوتا ہے۔“

اس کے خیال میں گندا پانی صرف وہ ہے جو شہر کے گٹروں اور دیہات کی گندی نالیوں میں بہتا ہے۔ باقی سب صرف اور صرف ”صاف“ ہوتا ہے۔

نظام میں تبدیلی کیسے؟

''میں بہت دور سے صرف آپ کی ملاقات اور چند سوالوں کی نیت سے حاضر ہوا ہوں۔''نوجوان نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ چہرے بشرے سے وہ کسی اچھے خاندان کا، سلجھا ہوا، سمجھدار اور باوقار فرد دکھائی دیتا تھا۔

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، نہ تمہید باندھتے باندھتے آپ کو پریشان کروں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ نظام میں تبدیلی کیسے آسکتی ہے؟''

نوجوان کی آنکھیں جتنی ذہانت چھلکا رہی تھیں اس کی گفتگو اس سے کہیں زیادہ سنجیدگی و متانت کی غمازی کر رہی تھی۔

''اتنی اہم بحثوں میں حصہ لینے کا بندہ اہل نہیں، البتہ آپ اتنی دور سے محض اس خاطر تشریف لائے ہیں تو کچھ نہ کچھ عرض کیے دیتا ہوں۔ اس سوال کے جواب میں بہت ساری فلسفیانہ لفاظی کی جاسکتی ہے اور طویل لیکچر جھاڑا جاسکتا ہے .... لیکن میں صرف وہ بات کروں گا جو ہم عملاً کر سکتے ہیں۔ آج سے بلکہ ابھی سے اس کا آغاز کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم میں سے .... تمام مسلمانوں میں سے ہر ایک فرد .... اپنے اپنے حصے کا کام دیانت داری اور فرض شناسی سے انجام دینا شروع کر دے۔''بندہ نے اس سوال کے حجم کے مطابق جواب کو سمیٹتے ہوئے جو کچھ پونجی میں تھا، ماحضر کے طور پر پیش کر دیا۔

''کیا مطلب؟ کیا انفرادی کوششوں سے سامراجی نظام بدل سکتا ہے؟ اجتماعی طور پر جدوجہد کے بغیر بھی تبدیلی آسکتی ہے؟''نوجوان کو اتنے فضول جواب کی توقع نہ تھی، وہ بددل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے خیال میں اس سوال کے جواب میں زبردست قسم کی فلسفیانہ لفاظی اور طویل ہوائی لیکچر سننے کو ملنا چاہیے تھا۔

''یہ انفرادی کوشش کیسے ہوئی؟ فرد معاشرے کی اکائی ہے اور جب ہم میں سے ہر فرد اپنی ذمہ داری ٹھیک ٹھیک انجام دینے کی کوشش کرے گا تو اجتماعی طور پر سدھار اور ترقی کی شکل خود بخود وجود میں آنے لگے گی۔''

''کیا آپ اس جملے کی کچھ تشریح کر سکتے ہیں؟''نوجوان کے لہجے سے اشتیاق اور دلچسپی عیاں تھی۔

''ہاں کیوں نہیں! دراصل خلافت عثمانیہ کے سقوط اور اسلامی ممالک پر استعماری طاقتوں کے تسلط کے بعد ہمارا وجود ایسے زخمی کی مانند ہو چکا ہے جس کو بلندی سے پستی تک تیزی سے لڑھکنے اور بغیر رکے لڑھکتے چلے جانے کی وجہ سے جگہ جگہ اندرونی و بیرونی چوٹیں آچکی ہوں۔ اب دماغ کا ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کے سر کی چوٹوں کا علاج کیا جائے ورنہ اس کے دماغ میں فتور آنے کا خطرہ ہے .... دل کا طبیب بتاتا ہے کہ مریض خطرے میں ہے، اس کے سینے کو فوراً کھولا جانا ضروری ہے .... نظامِ تنفس کا ماہر پھیپھڑوں کو شدید متاثر ہونے کی اطلاع دے کر تشویش کا اظہار کر رہا ہے اور نظامِ ہضم کو تشخیص کرنے والا اس کی اصلاح کی اہمیت جتاتا ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک درست کہہ رہا ہے .... لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک عضو کی صحت کے انتظار میں دوسرے کو معطل نہیں چھوڑا جاسکتا، اس لیے بہت احتیاط اور صبر کے ساتھ ہر عضو پر توجہ دینے اور اس کے فعال ہونے کا انتظار کرنے کی

ضرورت ہے۔ اسی طرح اصلاحِ احوال اور فلاح امت کی جتنی تجاویز دی جائیں وہ اپنی جگہ کچھ نہ کچھ وزن ضرور رکھتی ہیں، مگر سب کا حاصل یہی ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کو پہچانے، انہیں اچھی طرح ادا کرے اور اپنے نفس اور اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کی فکر کے ساتھ اللہ، اس کے دین اور اس کے بندوں (امتِ مسلمہ) کا حق ادا کرنے کی صحیح صحیح اور بساط بھر کوشش کرے۔''

''اس طریقے سے کامیابی حاصل کرنے کی کوئی مثال؟''

''آپ یہود کو لے لیجیے۔ دنیا کی بزدل ترین، بخیل ترین اور مجمع الرذائل قسم کی قوم ہے............ مگر آج وہ اس لیے ترقی پر ہیں کہ ان میں سے ہر فرد چاہے وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، صہیونی تحریک کا عہدیدار ہو یا عام قسم کا چپڑ اسی .... لیکن بہرحال وہ جہاں کہیں بھی ہے یہودیت کے لیے حسبِ استطاعت وحسبِ حیثیت کام کر رہا ہے حتیٰ کہ اسرائیل کی پہلی اینٹ رکھنے والا صہیونی منصوبہ ساز ڈاکٹر تھیوڈور ہرٹزل جب بیت المقدس پر تسلط کے بعد دیوارِ براق کے پاس پہنچا تو وہ صحافیوں کے سامنے اپنے آئندہ کے منصوبے بیان کرتے ہوئے خنزیر کے گوشت کے سموسے کھا رہا تھا۔ اب آپ سوچیے کہ اس شخص کی محنت سے چار ہزار سال بعد یہود کو دیوارِ براق کے پاس جمع ہو کر رونے دھونے اور آنسو بہانے کا موقع ملا لیکن اس کی یہودی مذہب سے ''وابستگی'' کا یہ عالم تھا کہ وہ اس تاریخی موقع پر بھی اپنے مذہب میں حرام قرار پانے والی چیز چبا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو یہودیوں کا خادم اور یہودی اس کو اپنا محسن اور لیڈر مانتے ہیں۔ ہم کو ان کی جیسی حرام کاری تو ہرگز نہیں کرنی چاہیے لیکن ہمارے لیے اب کام چوری کی گنجائش بالکل بھی باقی نہیں رہی۔''

''لیکن اس طرح تو سدھار کی رفتار بہت سست ہوگی۔ نجانے کب اچھے دن دیکھنا نصیب ہوں گے؟'' نوجوان مسلمانوں کے اچھے مستقبل کے لیے فکرمند تھا لیکن آج کل کے نوجوانوں کی طرح کسی قدر عجلت پسندی کا شکار تھا۔ بندہ اس کی بے قراری اور بے تابی کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے گویا ہوا:

''اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو ''تدریج'' کے تکوینی قانون میں جکڑ رکھا ہے وہ یکدم ظہور پذیر نہیں ہوسکتیں۔ ان کے لیے دھیرے دھیرے کام کرتے رہنے اور صبر وحوصلے کے ساتھ نتائج کا انتظار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سالوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی ماضی کی غلطیوں کا کفارہ دیئے بغیر............، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ''سنت غیر متبدلہ'' کے خلاف ہے اور اس قانون سے متصادم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جاری فرما رکھا ہے۔ جس طرح زرخیز زمین میں عمدہ بیج بونے، اعلیٰ قسم کی کھاد ڈالنے، وافر مقدار میں میٹھا پانی دینے اور خوب دیکھ بھال کرنے کے باوجود پودے کے اُگنے، اس میں شگوفہ پھوٹنے اور قابلِ استعمال چیز کے ہاتھ آنے میں وقت لگتا ہے، اسی طرح کسی قوم کو اپنی حالت درست کیے بغیر حالات کے موافق ہونے کی امید نہ رکھنی چاہیے اور زوال پذیر قوم کی حالت طویل دورانیے والی بیماریوں میں مبتلا مریض کی طرح ہوتی ہے، اس کو ''ڈبل ڈوز'' دے کر راتوں رات تندرست نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے صبر آزما استقامت کے ساتھ ہر شعبے کو سدھارنے کی پیہم جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور وہ تب ممکن ہے جب ہر فرد میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ اسے اپنا کام صحیح صحیح کرنا چاہیے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر کی جانب کامیاب پیش رفت تبھی ممکن ہوتی ہے جب کسی مرحلے پر کوئی جھول نہ چھوڑا جائے۔''

''مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کا دور کیسے شروع ہوسکتا ہے؟'' نوجوان بندہ کے چپ ہوتے ہی اگلا سوال کر بیٹھا تھا۔

''اس عالمِ ناسوت کا ضابطہ ہے کہ یہاں بہتر کا نتیجہ بہتر اور بہترین کا نتیجہ بہترین ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو بہتر کی نہیں، بہترین کی تلاش میں جُت جانا چاہیے۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک معیاری مشروب، ایک عمدہ صابن یا اچھا برگر نہیں بنا سکے۔ اعلیٰ سائنسی ایجادات کو چھوڑیے، باورچی خانہ یا بیت الخلا میں کام آنے والی اشیا بھی وہ غیروں سے خریدنے پر مجبور ہیں۔ ان حالات میں نظام کی تبدیلی اور نشاۃِ ثانیہ کی باتیں کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ ''سوکھے'' کے مریض سے اولمپک دوڑ میں کامیابی کی توقع باندھی جائے۔ ہم لوگوں کو زبان بند کر کے ہاتھوں کو حرکت میں لانا چاہیے۔ تمناؤں، آرزوؤں سے کنارہ کش ہو کر، شکوہ اور شکایت کو ایک طرف رکھ کر، حسرتوں اور ارمانوں سے قطع نظر کر کے کام شروع کر دینا چاہیے۔''

''کون سا کام؟ تحریکی، انقلابی؟'' نوجوانوں کا ذہن مخصوص رخ پر سوچنے کا عادی تھا۔

''ہر وہ کام جو انسان کو اس عالم اسباب میں کرنا پڑتا ہے، اسے اچھے سے اچھا اور شاندار سے شاندار کرنا چاہیے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے: ''اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔'' نیز ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ جب تم میں سے کوئی کچھ کام کرے تو اسے خوب اچھی طرح کرے۔'' ہمیں ہر کام میں ظاہری خوبصورتی اور معنوی پائیداری دونوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس دنیا میں قدر صرف کمال کی ہے۔ اگر کوئی شخص درزی یا موچی ہے تو اسے اس خوبی سے ٹانکا لگانا چاہیے کہ دیکھنے والے دیکھ کر کہہ اٹھیں کہ یہ فلاں کے ہاتھ کا لگایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہر شخص اپنے پیشے، منصب اور ذمہ داریوں کے تقاضوں کو پہچان کر دیانتداری اور خلوص کے ساتھ اجتماعی ترقی میں اپنا حصہ ڈالے تب جا کر بیرونی زخموں اور اندرونی چوٹوں کا مارا ہوا یہ جسم صحت وطاقت کی طرف گامزن ہوگا۔''

اس نوجوان کے ساتھ گرمیوں کی ایک شام کو جمنے والی یہ مجلس خالص نجی نوعیت کی تھی .... مگر جو کچھ اس کے ذہن میں خلجان پیدا کر رہا تھا وہ بہت سے لوگ پوچھتے رہتے ہیں اس لیے اس گفتگو کو ان چند سطروں میں سمو کر ان صاحب دل حضرات کی نذر کیا جاتا ہے جو اس موضوع پر کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے ہیں۔

لبیک یا بنتی!

وقت وقت کی بات ہے اور وقت کی باتیں فی الواقع بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ آج کی مجلس کو ایسی ہی ایک بات اور اس بات کو سن کر بے اختیار بہنے والے آنسوؤں سے نم کرتے ہیں۔

یہ آج سے تقریباً 1300 سال قبل کا ذکر ہے، بحرِ ہند میں جزائر سراندیپ (سیلون، سری لنکا) کے قریب ''جزیرۃ الیاقوت'' نامی ایک جزیرہ تھا۔ یہاں مسلمان تاجروں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ یہ تجارت پیشہ مسلمان اپنی دیانت و امانت، اعلیٰ اخلاق، و کردار اور لین دین کے کھرے پن کی وجہ سے مقامی باشندوں میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ مقامی لوگوں کے لیے ان کا لباس و حلیہ، ان کی نشست و برخاست، ان کی سخاوت و مہمان نوازی سے زیادہ ان کی مخصوص عبادات اور دل میں اتر جانے والی باتیں دلچسپی اور دلکشی کا باعث تھیں۔ بحرِ ہند کے پار واقع جزائر، ملائیشیا، انڈونیشیا، برونائی، فلپائن اور بحرِ ہند کے وسط میں واقع جزائر مالدیپ وغیرہ میں مسلمانوں کی عسکری بحری مہمات نہیں پہنچیں، یہاں مسلمان تاجروں کی سچائی اور دیانت داری کے سبب اسلام کا بول بالا ہوا ہے۔ قرآن شریف میں بتایا گیا ہے کہ سمندری نقل و حمل بین الاقوامی تجارت کا بہترین نفع بخش اور آسان ترین ذریعہ ہے۔ جو قوم اپنی معیشت و اقتصاد کو ترقی دینا چاہتی ہے اسے آبی شاہراہوں پر کنٹرول اور ان کے استعمال کا بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ مسلمان اس راز سے واقف تھے کہ عسکری قوت بننے کے لیے اقتصادی حیثیت کا مستحکم ہونا ضروری ہے اور اقتصادی حیثیت کے استحکام کے لیے قومی اور بین الاقوامی صنعت و تجارت میں اہم حصہ حاصل کیے بغیر چارہ نہیں اور بین الاقوامی تجارت کا سستا اور آسان ترین ذریعہ سمندری گزرگاہیں ہیں، چنانچہ اس دور کے مسلمانوں میں جہاز رانی کے بڑے بڑے نام ملتے ہیں اور مسلمان اس صنعت میں بھی دنیا کے امام مانے جاتے تھے، وہ اس فن میں مہارت کے باعث تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ کی شکل میں دین و دنیا دونوں کے فوائد سمیٹتے تھے۔ جزیرۃ الیاقوت بھی انہی جزائر میں سے تھا جہاں مسلمان تاجر آتے جاتے تھے۔ اس جزیرے کے قدرتی حسن، قسما قسم کی نباتات، پھلوں کی بہتات اور فطری مناظر کی وجہ سے عرب کے کچھ صحرا نشینوں نے اسے اپنا مسکن بنالیا تھا اور مقامی آبادی کی محبت و احترام کی وجہ سے یہاں خوشی خوشی رہتے اور سمندری راستوں سے تجارت کرتے تھے۔ اتفاقاً ان میں سے چند خاندانوں کے سربراہ ایک سمندری حادثے میں انتقال کر گئے اور ان کے اہل خانہ دیارِ غیر میں تنہا رہ گئے۔ اس جزیرے کے سردار کو اپنے مہمانوں کے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کا نہایت رنج تھا، وہ دلی طور پر ان کی خوبیوں کا معترف تھا اور انہیں اپنے جزیرے کے لیے باعث خیر و برکت سمجھتا تھا، اس نے ان کے اہل خانہ سے ہمدردی اور ان کے اصل وطن عراق کے حاکم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (جی ہاں! ایک زمانہ تھا کہ غیر مسلم ہمارے عام مسلمانوں کی عزت کرتے اور ہمارے حکمرانوں کی خوشنودی اور توجہ حاصل کرنے

کے متمنی ہوا کرتے تھے) فوت شدگان کے ورثا کو ان کے آبائی وطن بھیجنے کے لیے ایک جہاز حاصل کیا اور اس میں ان کو عزت واکرام کے ساتھ رخصت کردیا۔ اس جہاز کی منزل عراق کی بندرگاہ بصرہ تھی۔ سمندری رخ کے مطابق یہ جنوبی ہند کے ساحل سے گزر کر سندھ اور بلوچستان (کراچی، گڈانی، سونمیانی، اور ماڑہ، پسنی، گوادر، جیوانی، چاہ بہار، بندرعباس) کے سامنے سے گزرتا ہوا درۂ ہرمز کے راستے خلیج عرب میں داخل ہوکر موجودہ امارات اور پھر بحرین وقطر وکویت کے ساحلوں سے ہوتا ہوا بصرہ جا پہنچتا۔

راستے میں سندھ کے متعصب ہندوؤں کا ایک لٹیرا گروہ سرگرم تھا جس کو اس وقت کے متعصب برہمن حکمران کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ بحری ڈاکو خصوصیت سے مسلمانوں کی کشتیوں کو لوٹا کرتے تھے اور مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ان سرکشوں کی طرف متوجہ ہوکر اس خطے کو بدامنی سے پاک کردیں۔ ان لٹیروں کی بدقسمتی اور اس علاقے کی خوش قسمتی کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو لے جانے والی اس کشتی پر بھی ہلہ بول دیا اور سوگوار خاندانوں کو جو اپنے سرپرستوں کی دیارِ غیر میں وفات کی وجہ سے پہلے ہی حزن وملال کا شکار تھے، قید کرلیا۔ جب یہ بے رحم ڈاکو ان کو گرفتار کررہے تھے اس وقت ان میں سے ایک عورت اپنے آبائی وطن کے حاکم کو جسے وہ اپنا محافظ اور سرپرست سمجھتی تھی، یاد کر کے چلائی: ''حجاج! اے حجاج! تم کہاں ہو؟ تیرے ہوتے ہوئے تیری ایک بیٹی پر ہاتھ ڈالا جارہا ہے۔'' خبر پہنچانے والوں نے انہی الفاظ میں مسلمانوں کے اس حاکم کو جو مسلمانوں میں کچھ اتنا مقبول نہ تھا، یہ خبر پہنچادی کہ اس مظلوم عورت کی آخری چیخیں کن الفاظ پر مشتمل تھیں۔ یہ حکمران جو مسلمانوں کی تاریخ میں بدنامی کی حد تک مشہور ہے، جو اپنے افعال وکردار کے لحاظ سے اتنا بھی نہیں سمجھا جاتا کہ کوئی اس کے نام پر اپنے بچے کا نام رکھے، جی ہاں! اسی بدنام ترین حکمران حجاج بن یوسف کی غیرتِ اسلامی کا اندازہ لگائیے کہ یہ اس بات کی اطلاع ملتے ہی غصے کی شدت اور غیرت کی انتہا سے مغلوب ہوکر اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اور وفورِ جذبات میں اس خاتون کی صدائے مظلومانہ کے جواب میں بے اختیار کہا: ''لبیک یا بنتی! لبیک یا بنتی!'' (اے میری بیٹی میں حاضر ہوں، تیری عزت کی حفاظت اور تیرے انتقام کے لیے دل وجاں سے حاضر ہوں۔)

اس نے پہلے تو اس علاقے کے بدطینت حکمران کو پیغام بھیجا کہ میرے عوام میں سے بچے اور عورتیں چھڑوا کر بھجواؤ، لیکن جب اخلاقیات سے محروم اس مغرور برہمن کی طرف سے ڈاکوؤں کی سرپرستی کا عندیہ پایا تو ان عورتوں پر ظلم کا بدلہ لینے تک اپنی اوپر دنیا کی لذتوں کو حرام کرلیا۔ منقول ہے کہ ان دنوں اس کو سوائے اس انتقام کے کسی چیز کا خیال یا پرواہ نہ رہی تھی۔ ان عورتوں کی بازیابی اور انتقام کے لیے بھیجے جانے والے لشکر کی تیاری کا اسے اس قدر اہتمام تھا کہ اس نے اپنی وفادار شامی افواج میں سے 6 ہزار کا خصوصی دستہ ساتھ بھیجا اور مجاہدین کے ذاتی استعمال کے لیے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام کیا، حتیٰ کہ سوئی دھاگے بھی ساتھ بھیجے۔ سندھ کے موسم کے لحاظ سے مجاہدین کی خوراک کے لیے سرکہ ساتھ بھیجنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ بہت ساری روئی کو گاڑھے سرکہ میں بھگوکر رکھ لیا کہ اسے بوقتِ ضرورت پانی سے بھگوکر نچوڑ لیا جائے تو سرکہ اصل حالت میں دستیاب ہوجائے گا۔ عراق سے سندھ اور سندھ سے عراق کے فاصلے کا تصور کیجیے، اتنے طویل فاصلے کی خبر اسے تین دن میں پہنچ جاتی تھی۔ اسے اس مہم کی کامیابی کی اس قدر فکر تھی اور وہ ایک مسلمان عورت کی پکار

پر اتنا بے چین تھا کہ اس نے اس دور کا تیز ترین مواصلاتی نظام قائم کیا جو اسے میدانِ جنگ میں بیتنے والے لمحہ لمحہ کی خبر دیتا تھا، جن کا تجزیہ کر کے وہ میدانِ جنگ کے کمانڈر کے لیے فوری ہدایات اور حالات کے مطابق حکمت عملی تجویز کرتا تھا۔ جب دیبل کے متعصب ہندو حکمران کے قلعے کے گرد فیصلہ کن معرکہ لڑا جا رہا تھا اس روز مسلمانوں کی از حد کوشش تھی کہ کسی طرح اس قلعے کے بڑے مندر کے اوپر لہراتا جھنڈا گرالیں۔ ان کی جدید توپوں (منجنیقوں) نشانہ ذرا سے فرق سے خطا جا رہا تھا۔ اس کی عسکری مہارت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس کو جب یومیہ کارگزاری میں اس امر کا پتہ چلا کہ مجاہدین کی مشہور منجنیق جس کا نام ''عرس'' تھا صحیح نشانہ نہیں لگا پا رہی تو اس نے میدانِ جنگ کے نقشے کا اپنی جگہ پر بیٹھ کر جائزہ لیا اور اپنے فیلڈ کمانڈر محمد بن قاسم کو ہدایت بھیجی: ''انصب العرس، واقصر منها قائمة، ولتكن مما يلي المشرق.'' (فتوح البلدان للإمام أبي الحسن البلاذري، طبع المكتبة العلمية بيروت لبنان۔ اس مضمون کی دیگر تفصیلات خصوصی جزیرہ یاقوت کے باسیوں کا واقعہ بھی اس کتاب سے لیا گیا ہے جبکہ عام مؤرخین اسے سراندیپ سے منسوب کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ قریب میں موجود بڑا جزیرہ یہی تھا۔) ''عرس'' نامی منجنیق کو آگے لا کر نصب کرو، اس کو تم نے جس زاویے پر متعین کر رکھا ہے اس میں سے مشرق کی طرف کا زاویہ کم کرو۔'' میدانِ جنگ سے سینکڑوں میل دور بیٹھ کر نکالی گئی یہ پیمائش اس قدر درست تھی کہ پہلے نشانے پر جھنڈا زمین پر آ رہا اور لٹیرے ہندوؤں کو اس ناحق ظلم کا حساب دینا پڑا جو انہوں نے کمزور عورتوں کو لاوارث اور بے بس و مجبور سمجھ کر کیا تھا۔

تو اے معزز قارئین کرام! ذرا سوچیے! ایک وقت وہ تھا جب ایک مسلمان عورت کی پکار پر پورا اسلامی معاشرہ لرز اٹھتا تھا، نوجوان رضا کار بے تاب ہو کر بھرتی کے لیے اپنا نام پیش کرتے تھے، صاحبِ حیثیت لوگ مجاہدین کی ضروریات کے لیے روپوں اور اشیائے ضرورت کا انبار لگا دیتے تھے، مسلمانوں کا حکمران! جی ہاں ظالم و سفاک سمجھا جانے والا نامقبول ترین حکمران اتنا غیرت مند تھا کہ ایک عورت .... میں دہراتا ہوں .... صرف ایک عورت کی پکار پر اپنے اوپر دنیا کی زندگی کا عیش و آرام اس وقت تک حرام کر لیتا تھا جب تک وہ اس کا انتقام نہ لے لیتا۔ آج اسی حکمران کے وطن کی بیٹیوں کے سر سے آنچل چھینا جا رہا ہے، کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تو کجا ان پر رونے والا بھی نہیں۔ سندھ کے جن باسیوں کو لٹیرے حکمرانوں سے نجات دلانے کی خاطر اس حکمران نے اپنا چین و سکون حرام کر لیا تھا، انہی کی عملداری سے اس حکمران کے وطن سے آنے والی بیٹیاں مسلمان حکمرانوں کے حکم پر، مسلمان اہلکاروں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر، مسلمان کہلانے والی انتظامیہ کی نگرانی میں، دنیا کے غلیظ اور متعصب ترین کافروں کے حوالے کی جا رہی ہیں۔ کیا وقت آ گیا ہے کہ جن کے صدقے ہمیں اسلام نصیب ہوا، یہ ملک نصیب ہوا، ان کی پاک دامن اور سیدہ بیٹیاں تحفظِ ملت اور جہاد فی سبیل اللہ کا حلف اٹھانے والے ہاتھوں قیدی بن کر غیر مسلم حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے، ان کی ایک دھمکی سے بچنے یا تھپکی لینے کی خاطر، ان کے حضور پیش کی جا رہی ہیں۔ دنیا والے ماہِ صیام میں اللہ کی رحمت کے منتظر و امیدوار ہیں، میں ڈرتا ہوں کہ ہمیں اس جرمِ عظیم پر ندامت بھی نہیں، ہم کہیں مغفرت کے بجائے عذابِ الیم کے اور رحمت و نجات کے بجائے لعنت و پھٹکار کے مستحق تو نہیں ہو گئے؟ سوچیے! آپ بھی سوچیے! میں بھی سوچتا ہوں، ہم نے اپنے محسنوں کے

ساتھ کیا سلوک کیا؟ ہم نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے شہزادوں اور شہزادیوں سے کیا سلوک کیا؟ وہ ہماری عزتوں کے محافظ تھے ہم ان کی عزتوں کے سوداگر بن گئے۔ ہمارے جو بھائی روضۂ رسول پر حاضری دینے گئے ہیں ان کو وہاں سے اگر یہ جواب ملے کہ صلوٰۃ وسلام سے پہلے تم ان عزتوں کا حساب دو جن کی میزبانی کا تمہیں شرف بخشا گیا تھا مگر تم نے خیانت اور غداری سے ان کو کرب وبلا کے موقع پر ناپاک دشمن کے حوالے کردیا۔ تو ان کے پاس کیا جواب ہوگا؟ سوچیے! کہ ابھی سوچنے کی مہلت ختم نہیں ہوئی، ابھی ندامت کے آنسو بے قیمت نہیں ہوئے، ابھی تلافی کا وقت اور کفارے کا موقع باقی ہے۔

چادر پوش کا راز

یہ قندہار، کابل شاہراہ پر واقع زابل شہر کے باہر مسافروں کے قیام وطعام کے لیے بنائے گئے ایک ہوٹل کی تصویر ہے۔ عام قارئین کے لیے اس میں شاید اس کے علاوہ دلچسپی کی کوئی بات نہ ہو کہ اس میں ایک عوامی طعام گاہ میں سنت کے مطابق دستر خوان بچھا ہوا ہے جو افغانستان کے اسلام پسند معاشرے کی عکاسی کر رہا ہے مگر در حقیقت اس میں بہت کچھ ہے۔ یہ ایک ایسی یادگار تصویر ہے جس میں بیک وقت کئی طبقوں کے لیے ایک زبردست نصیحت، جاندار پیغام اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو بہترین سامانِ عبرت موجود ہے۔ سب سے پہلے تو اس میں ہماری انتظامیہ، ناظمین حضرات اور ہوٹل مالکان اور بس ڈرائیوروں کے لیے ایک شاندار عملی مثال ہے۔ اس کے ساتھ ہی طالبان پر انواع واقسام کے جو تبصرے بھانت بھانت کی بولیوں میں سننے میں آتے رہتے ہیں، اس سادہ سی طعام گاہ کی تصویر میں، ان میں سے بہت سوں کا جواب ہے اور انصاف پسندوں کے لیے ایک ایسے منظر کی حقیقی جھلک ہے جو انہیں حق و باطل میں فرق اور پہچان کروا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ''ضربِ مؤمن'' کے مشہور زمانہ سیار نمایندے اور کہنہ مشق عکاس مولوی محبوب الرحمٰن کی یہ عام سی کاوش مفتیانِ کرام کو ایک عوامی مسئلے کی تحقیق اور اس کے شرعی حکم تک پہنچنے میں مدد بھی دے سکتی ہے۔

قندہار سے کابل یا کابل سے قندہار جانے والے مسافر جب اس ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے رکتے تو انہیں اس میں ایک کونے پر چادر اوڑھے ہوئے ایک مجہول سا شخص بیٹھا دکھائی دیتا۔ اس نے افغانوں کے مخصوص انداز میں چادر کی بُکل مار رکھی ہوتی جس کی وجہ سے اس کا پورا چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے غیر محسوس انداز میں ایسی جگہ نشست جمائی ہوئی تھی کہ جب کاؤنٹر پر پیسوں کے ادائیگی کے لیے کوئی گاہک آئے تو اسے ان کے درمیان ہونے والا لین دین کا معاملہ پوری طرح دکھائی سنائی دے۔ مسافر آتے اور جاتے رہتے، دستر خوان پر برتن سجتے اور سمٹتے رہتے لیکن یہ شخص دنیا و مافیہا سے لاتعلق ایک طرف بیٹھا چادر کے اندر اپنی تسبیح پھیرتا رہتا، البتہ جب بھی کسی گاڑی کے مسافر اور ان کا ڈرائیور کھانے کے پیسوں کی ادائیگی کے لیے ہوٹل مالک کے پاس پہنچتا تو اس کا سارا وجود، ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں اور کانوں میں جمع ہو جاتیں اور وہ پوری مستعدی اور چوکنے پن سے اس بات کو جانچنے کی کوشش کرتا کہ ان کے درمیان کیا لین دین ہوا ہے؟ ہوا بھی ہے یا نہیں؟ پنج وقتہ نماز کی ادائیگی کے لیے آتے جاتے ہوئے بھی وہ اس بات کا خیال رکھتا کہ اسے اس بات کا پورا پورا علم ہو کہ اُن کی غیر موجودگی میں جو گاڑی پہنچی ہے اس کے مسافروں کے ساتھ کیا گزری؟

''ضربِ مؤمن'' کے سیار نمایندے مولانا محبوب الرحمٰن صاحب جب ایک روز پھرتے پھراتے وہاں پہنچے تو ان کی عقابی نظروں سے اس شخص کی مخصوص سرگرمیاں چھپی نہ رہ سکیں۔ اس دن وہاں یہ کیفیت تھی جیسے دو شکرے ایک دوسرے کو تاڑ رہے ہوں۔ اس شخص کے پیچھے چھپے راز کو جاننے کے لیے ایک شب اس سرائے میں گزارنے کی قربانی دینی پڑتی جوان کے لیے کوئی مشکل نہ تھی۔ رات کو جب مسافر سو گئے تو بے تکلفانہ گپ شپ کے دوران معلوم ہوا کہ یہ چادر پوش پراسرار شخص طالبان کے خفیہ

ادارے کا رضا کار ہے۔ طالبان سے پہلے یہاں پر رواج تھا کہ ڈرائیور لوگ ہوٹل مالکان سے ملی بھگت کر کے گاڑیاں ان کے ہوٹل پر ٹھہراتے تھے جس کے عوض انہیں اور ان کے دوستوں، مہمانوں کو اعلیٰ قسم کا کھانا مفت ملتا تھا اور اس کی وصولی مسافروں کی کھال اتار کر کی جاتی تھی۔ شاہراہ کے کنارے چند گنے چنے ہوٹل ہوتے ہیں جن کے علاوہ کہیں سے مسافروں کو کھانا نہیں مل سکتا۔ مسافروں کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ہوٹل مالکان من مانی قیمتیں وصول کرتے اور گھٹیا قسم کی خوراک فراہم کرتے تھے۔ طالبان نے اس کے سدباب کے لیے اپنا آدمی مقرر کر دیا تھا جو خود پیسے ادا کر کے سادہ قسم کا کھانا کھاتا اور مسافروں کے لیے معیاری کھانا اس قیمت پر دلوانے کا بندوبست کرتا جس قیمت پر شہر کی طعام گاہوں میں ملتا ہے۔ قیمتوں پر کنٹرول اور کھانے کے معیار کی نگہداشت بعض اوقات اچھی خاصی ترقی یافتہ حکومتوں کے بس کی بات نہیں ہوتی لیکن طالبان کے ایک رضا کار نے پورے اڈے کے ہوٹلوں کو کنٹرول کیا ہوا تھا۔

ہمارے ملک میں آج کل عید کی وجہ سے بسوں پر مسافروں کا رش ہے۔ ملک کی مرکزی شاہراہوں کے کنارے واقع ہوٹلوں کی یوں تو سال بھر چاندی رہتی ہے لیکن آج کل تو پانچوں گھی میں ہیں۔ ڈرائیور حضرات، ان کے معاون عملے اور ایک آدھ یار دوست یا مہمان کو الگ بٹھا کر وہ مسافروں سے ان کی مجبوری کا خراج وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سڑے ہوئے ٹماٹر، گلی ہوئی سبزیاں، باسی گوشت، گریس جیسا سالن اور پھر فی کس وصول کی جانے والی ''مسافر نچوڑ'' قیمتیں .... ہائی ویز کے مسافروں کا مقدر ہیں اور وہ انہیں قسمت کا لکھا ہوا سمجھ کر صبر کرنے پر مجبور ہیں۔ انتظامیہ کو چاہیے کہ انہیں اس ''جبری ضیافت'' کے سلسلے سے نجات دلوائیں جس میں پھنس کر وہ ڈرائیور حضرات اور ان کے معاون عملہ کے کھانے کی قیمتیں ادا کر کے بھی ہوٹل مالکان کے ہاتھوں یرغمال بن کر مہنگا کھانا کھانے پر مجبور ہیں۔

ملک بھر کے دارالافتاء میں اس قسم کے سوال آتے رہتے ہیں جن میں ڈرائیور حضرات کے مفت کھانے کا حکم پوچھا جاتا ہے۔ ان کا جواب دیتے وقت اس پہلو کو مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ اس کھانے کی قیمت کے عوض مسافروں کو غیر معیاری کھانا مہنگے داموں فروخت کر کے وصول کی جاتی ہے اور یہ ڈرائیور حضرات کی ملی بھگت نہ بھی ہو تو بھی ''عرفِ عام'' یہی ہے، جس کے بعد گاڑی روک کر ہاتھ دھونے کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سب کچھ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔ ڈرائیور بھائیوں اور ہوٹل مالکان کو چاہیے کہ اس طریقے سے اجتناب کریں جو مشکوک ہے اور خود ان کے دل میں بھی کھٹکتا رہتا ہے۔

اب ذرا اس تصویر کو دوبارہ دیکھیے: طالبان نے مسافروں کو ناجائز منافع خوری سے نجات دلانے کے ساتھ طعام گاہوں کو روایتی فحش تصویروں اور گانے بجانے کی شیطانی آوازوں سے بھی پاک کر دیا تھا اور لوگ قریب کی مسجد میں نماز پڑھ کر یہاں کے پرسکون ماحول میں سنت کے مطابق کھانا کھانے میں قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے تھے۔ یہ وہ خوشگوار حقیقت ہے جو افغان عوام کے دلوں سے کھرچی نہیں جاسکتی۔ مؤرخ کا قلم اس حقیقت سے اگر صرفِ نظر کر بھی لے، افغانستان کے عوام طالبان کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتے۔ زابل کی اس ہوٹل پر رکنے والی ہر گاڑی، اس میں سوار ہر وہ مسافر جو آج پھر دگنی ادائیگی کرنے کے ساتھ فحش تصویروں کی قیمت اور انڈین موسیقی بجانے کی اجرت بھی بالجبر دے رہا ہے، طالبان کو یاد کرتا ہے اور اس وقت تک کرتا رہے گا جب تک دنیا میں سچائی اپنی کسی بھی شکل میں باقی ہے۔

مغربی دنیا سے چند سوالات

میڈیا کی پُرکاری اور انسانی ذہنوں کو مخصوص رُخ دینے کی غیر معمولی اور زبردست صلاحیت کا کچھ اظہار پوپ جان پال دوم کی وفات اور اس پر سامنے آنے والے تبصروں سے ہورہا ہے۔ ان کے انتقال پر پوری دنیا میں سوگ اور رنج والم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کی آخری رسوم میں دوسو عالمی راہنماؤں سمیت لاکھوں افراد نے شرکت کی ہے اور لوگوں نے انہیں سینٹ (Saint) کا درجہ دیا ہے۔

دنیا کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے ممالک نے دنیائے عیسائیت سے اظہارِ افسوس کیا ہے۔ ان کی عالمی خدمات پر مختلف حلقے مختلف انداز میں روشنی ڈال رہے ہیں۔ انہیں امن ومحبت کی جہدِ مسلسل کی علامت اور ان کی افکار ودانش کو انسانوں کا مشترکہ ورثہ قرار دیا جارہا ہے۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے دنیا سے کوئی ایسی شخصیت اُٹھ گئی ہے جو پیار ومحبت کا سرچشمہ اور انسان دوستی وغیرِ جانبداری کا زندہ نمونہ تھی اور اس کی ساری زندگی مادہ پرستی اور خودغرضی کے خلاف جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ میڈیا کی اس سحر انگیز اور فسوں خیز مہم کا تجزیہ ہم ذرا بعد میں کریں گے پہلے پوپ کے منصب اور ویٹی کن کی مذہبی ریاست کے بارے میں کچھ معلومات ہوجائیں۔

عیسائیوں کے اس وقت تین بڑے فرقے ہیں: کیتھولک، آرتھوڈوکس اور پروٹسٹنٹ۔ مؤخر الذکر فرقہ ہمارے مطالعہ کا خصوصی محور رہا ہے اور اس کی ذیلی شاخوں کے متعلق بھی کسی حد تک ان صفحات میں معلومات آچکی ہیں کہ یہ عیسائیوں کے دیرینہ مذہبی حریف یہود کی طرف سے عیسائیت پر ایک بھرپور وار کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ پہلے دو فرقوں میں سے کیتھولک رومی چرچ کا اور آرتھوڈوکس یونانی چرچ کا نمائندہ ہے۔ ان تینوں فرقوں کی کشاکش کے علی الرغم کیتھولک ہی وہ فرقہ ہے جو اس وقت عیسائی دنیا کا سوادِ اعظم ہے۔ اس فرقے کے عقیدے کے مطابق پوپ، جناب پطرس کا اور ان کے واسطے سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خلیفہ ہوتا ہے۔ جناب پطرس جن کو بائبل کی زبان میں "Saint Peter" کہا جاتا ہے، عیسائی روایات کے مطابق سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے تھے۔

رومن کیتھولک عقیدہ انہیں اعظم الحواریین اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نائب قرار دیتا ہے۔ عیسائی تاریخ اور مذہبی روایات کے مطابق وہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر...... صحیح سالم جسمانی طور پر اُٹھائے جانے کے بعد...... (یہ دراصل مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور یہاں تاریخی حقیقت کی تصحیح کے طور پر لکھا گیا) ان کے دین کی تعلیم وتبلیغ میں مصروف رہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دور دراز ممالک کے سفر بھی کیے۔ فلسطین جہاں یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف بدتمیزی اور گستاخی کا بازار گرم کیا ہوا تھا، سمندر کے کنارے ہے۔ اس سمندر کے پار روم کا ملک واقع ہے۔ اس وجہ سے اس سمندر کو رومیوں کا سمندر (بحرِ روم)، گوروں کا سمندر (بحرِ ابیض) اور بیچ کا سمندر (بحرِ متوسط) بھی کہتے ہیں کہ یہ ایشیا وافریقہ اور

یورپ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا ہے۔

جب سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کم نصیب یہودی اپنے زعم کے مطابق پھانسی دے چکے (ذرا سوچیے! پوپ پال دوم کی آخری تقریب میں اسرائیلی صدر اور یہودی راہنما کس منہ سے شریک ہوئے ہوں گے؟) تو ان کی دشمنی کا مرکز جناب پطرس ہو گئے اور اب انہیں ''برائی کا محور'' قرار دے دیا گیا۔ وہ ہجرت کر کے سمندر پار روم چلے گئے۔ روم میں اس وقت بت پرستی رائج تھی۔ یہاں کے لوگوں نے روایتی بت پرستوں کی طرح ان کی شدید مخالفت کی، انہیں قید کیا، تکلیفیں دیں اور بالآخر سولی پر چڑھا دیا۔ جس جگہ انہیں پھانسی دی گئی یہ وہی جگہ ہے جو آج ''ویٹی کن سٹی'' کہلاتی ہے اور یہیں جناب پطرس کی طرف منسوب وہ پُرشکوہ اور عالی شان چرچ ہے جو سینٹ پیٹرس باسیلیکا کہلاتا ہے۔ باسیلیکا انگریزی میں ایک خاص طرز کی عمارت کو کہتے ہیں۔

آپ اسے ''حویلی'' کہہ لیجیے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا چرچ ہے اور ہے تو توحید کی دعوت دینے والی شخصیت کی طرف منسوب، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک مقبرے کے گرد قائم ہے اور اس سے بڑھ کر تضاد اور کیا ہوگا کہ یہ بتوں اور مجسّموں سے بھرا ہوا ہے۔ گویا عیسائی حضرات نے یادگار تو تعمیر کی ہے اس شخصیت کی جس نے بُت پرستوں کو توحید کی دعوت کی پاداش میں جان دی لیکن اس یادگار کو اس دعوت کے قطعاً مخالف مظاہرے سے اس طرح اَٹ دیا ہے کہ کسی بت خانے میں بھی اس قدر نفیس بت اتنی تعداد میں نہ ہوں گے۔

اسے دیکھنے سے ایسا لگتا ہے گویا یہ جناب پطرس کی نہیں، ان کو پھانسی دینے والے بت پرست مشرکوں کی یادگار ہے۔ برسبیل تذکرہ عیسائی حضرات مسلمانوں کو بُت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں لیکن ہمارے ممدوح پوپ صاحب جو اس تحریر کا مرکزی کردار ہیں اور جن کا اصل نام ''کیرل جوزف ووتی وا'' تھا لیکن جو جان پال دوم کے نام سے مشہور تھے اور دنیا نے انہیں بعد از مرگ سینٹ کا درجہ دیا، وہ بھی روزی کمانے کے لیے سنگ تراشی کرتے رہے تھے۔

اس کے علاوہ 1934ء میں تھیٹر کے اسٹیج پر بھی نمودار ہوئے اور ان کے دوستوں کا کہنا تھا کہ وہ بہت اچھا گاتے تھے۔ اس سے قبل انہوں نے ''اسٹوڈیو 38'' جوائن کیا تھا جس سے انہیں اچھی آمدنی ہوتی تھی اور وہ اس کے سہارے (یعنی تھیٹر کے ڈراموں کی آمدنی کے سہارے) پادری کی تعلیم جاری رکھ سکے تھے۔ یہ بات طنز کے طور پر نہیں کہی جارہی، یہ ایک حقیقت ہے جس پر دو سو عالمی راہنماؤں کی نظر شاید نہیں گئی اور اس کوتاہ نظری کا شاخسانہ ہے کہ آج پوری دنیا اس طرح کے تضادات سے اٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

ویٹی کن سٹی ایک خود مختار ریاست کے طور پر کیسے وجود میں آئی؟ یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے اور اس کو آپ اگر ہمارے استاذ محترم، عالمِ اسلام کی مشہور شخصیت اور کئی علمی حوالوں سے معروف نامور عالم دین شیخ الحدیث حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے شیریں، دلکش اور حقیقت نگار قلم سے لکھے گئے الفاظ میں پڑھیں تو آپ کو صحیح لطف آئے گا۔ ملاحظہ ہو آپ کا مشہور سفر نامہ ''دنیا مرے آگے'': ص 358-362

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ رومی حکمرانوں کے عیسائی مذہب اختیار کر لینے کے بعد وہی خطہ جہاں جناب پطرس کو پھانسی دی

گئی تھی، عیسائیت کا گہوارہ بن گیا لیکن جیسا کہ حکمرانوں اور جاہ ومنصب کے حامل افراد کی عادت ہوتی ہے وہ مذہبی تعلیمات کے اس حد تک قائل ہوتے ہیں جتنے سے ان کے کاروبار مملکت چلنے میں آسانی ہو اور مذہبی شعائر کا اس وقت تک احترام کرتے ہیں جب تک وہ ان کے اقتدار سے مزاحم نہ ہوں۔ جہاں ان کے اقتدار کو ذرا ٹھیس پہنچی وہ مذہب کی عظمت کے آگے سر جھکانے کے بجائے مذہبیوں کا سر کاٹے جانے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ عیسائی مذہب کا عیسائی حکومتوں سے یہ تصادم کچھ زیادہ ہی شدید تھا اس لیے کہ عیسائیوں کے ہاں پوپ کا درجہ عملاً خدائی اختیارات کا حامل تھا۔ پوپ اگرچہ انسان تھا لیکن وہ معصوم اور غلطیوں سے پاک (Infallible) سمجھا جاتا تھا۔

اس کا حکم گویا خدا کا حکم تھا جو انسانی کمزوریوں سے مبرّا اور ہر حال میں واجب العمل تھا۔ اس کے احکام عیسائی مذہب کے شارح (Intepprettor) کی حیثیت سے نہیں بلکہ شارع اور قانون ساز (Legislator) کی حیثیت سے جاری ہوتے ہیں اور بادشاہ سمیت سب کے لیے واجب التسلیم ہوتے ہیں۔ (یہاں قرآن کریم کے طلبہ کو سورہ بقرہ کی آیت نمبر 64 بخوبی سمجھ آسکتی ہے جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ یہود نصاریٰ سے اس بات پر معاہدہ کر سکتے ہیں کہ فریقین میں سے کوئی کسی انسان کو خدا نہ بنائے گا۔) اب آپ سمجھیے کہ بادشاہ پوپ کو ''مقدس باپ'' کا درجہ تو دے سکتے ہیں، اس کے ہاتھ بھی چوم سکتے ہیں، نذرانے بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے اور خود کو کسی کا تابع بنانا یا اسے اپنے حدود واختیار میں مداخلت کا مجاز سمجھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ لہٰذا سیاسی سربراہ اور مذہبی سربراہ میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی اور ان کی یہ کشمکش ریاست کی یکجہتی کے لیے زبردست خطرہ رہتی تھی۔ عیسائیت کی تاریخ رومی حکمرانوں اور پوپ صاحبان کی اسی کشاکش سے پُر ہے۔

بالآخر 11 فروری 1929ء کو اسی شکل کا حل ایک معاہدے کی صورت میں نکالا گیا جسے Lateran Treaty کہتے ہیں۔ اس معاہدے کی رُو سے پوپ کو رام کرنے کے لیے روم کے دارالحکومت کے اندر دارالحکومت بسایا گیا او ویٹی کن کے علاقے کو ایک مستقل اور خود مختار ریاست تسلیم کیا گیا جس کا سربراہ پوپ ہوگا اور جس کی فوج، کرنسی، بینکنگ، سسٹم، ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی فون، پوسٹ آفس اور اندرونی نظم ونسق اٹلی کی حکومت کے بجائے پوپ کے تابع ہوگا۔ اس ''خود مختار ریاست'' کا رقبہ جتنا محدود ہے اس سے زیادہ اس کا اختیار ''لامحدود'' ہے۔ (دیکھیے: کتاب کے آخر میں صفحہ نمبر 500 پر دیا گیا نقشہ) لیکن پوپ صاحب نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی تسکین اقتدار کے لیے بطور حیلے کیے جانے والے اس فیصلے کو قبول کر لیا حالانکہ اس کا لازمی مطلب یہ تھا کہ آج سے سیاست، معیشت اور معاشرت مذہبی پابندیوں بلکہ راہنمائی سے بھی آزاد ہوگی اور خدا کی حکمرانی صرف چرچ تک محدود ہوگی۔

معاذ اللہ! دنیاوی مفاد کی قیمت پر اپنے فرائض منصبی کو تج دینا بلند حوصلگی سے کس قدر میل کھاتا ہے؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہی علمائے، ربانیین اور احبار ورہبان کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ آگے حد ادب...... الغرض اس معاہدے کے نتیجے میں ریاست کے اندر ریاست کی شکل میں دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست وجود میں آگئی جہاں حکمران تو مذہبی شخصیت ہے لیکن اس کے رہائشی محل کی طرف جانے والے راستے کے دونوں طرف سوئس گارڈ (آنجہانی پوپ کی فوج سوئس گارڈ کہلاتی تھی)

کے باوردی دستے اس شاہانہ انداز میں کھڑے ہوتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا اس شان وشوکت کا مذہبی سربراہی سے کیسے جوڑ بٹھایا جائے؟ اے دنیا والو! شاہی میں فقیری کی شان تمہیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ نہ ملے گی لیکن تم بایں دعوائے علم ودانش میڈیائی پروپیگنڈے اور علمی حقائق میں فرق کیوں نہیں کر پاتے؟

بہرحال! پوپ صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔ ہماری تمنا ہے کہ جب وہ روزِ قیامت جناب سیدنا حضرت عیسیٰ مسیح اللہ علی نبینا علیہ السلام کے سامنے پیش ہوں تو انہیں کسی قسم کی شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے...... مگر اس تمنا کا پورا ہونا مشکل ہے۔ عیسائی دنیا کے اہلِ علم سے درخواست ہے کہ وہ ہماری مدد کریں اور از راہِ کرم اس اُلجھن کا جواب دیں کہ روزِ اول سے آج تک عیسائی حضرات کا عقیدہ چلا آتا تھا کہ سرکش اور شرارتی یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر سرکارِ وقت سے ان کے قتل کا حکم حاصل کیا اور پھر انہیں اذیت ناک طریقے سے پھانسی دی۔ پوپ صاحب نے اس تاریخی حقیقت میں جو آج تک عیسائی دنیا کے نزدیک متفقہ ومسلمہ اور ناقابلِ انکار تھی، ترمیم کرتے ہوئے یہودیوں کو اس سے بری قرار دے دیا تھا۔

پوچھنا یہ ہے کہ مذہبی احکام میں ترمیم وتنسیخ کا حق تو پوپ صاحب کو جس بنیاد پر ملا سو ملا، لیکن تاریخی حقیقت میں ترمیم کا کون مجاز ہوسکتا ہے؟ وہ یہودیوں کا یہ جرم معاف کر دیتے تو اس پر اتنا اشکال نہ ہوتا کہ انہیں ''خدائی اختیارات'' کا دعویٰ تھا لیکن اس جرم کی یہودیوں کی طرف نسبت کی نفی نقل وعقل کے کس پیمانے پر پوری اُترتی ہے؟ یہ وہ معمّا ہے جو سمجھنے کا ہے نہ سمجھانے کا۔ پھر پوپ کی 26 سالہ مذہبی پیشوائی میں عیسائیت کے علمبرداروں نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں جس میں ایک ایسی دودھاری تلوار سے جس کی ایک دھار پر امن اور دوسری پر محبت درج تھا، لاتعداد انسان رات دن مقتول ہوئے۔

صلیب کے محافظ پوپ صاحب تھے لیکن حال ہی میں ''صلیبی جنگ'' کا باقاعدہ نام لے کر کتنے ہی انسانوں کو (وہ مسلمان تھے لیکن انسان بھی تو تھے) اس کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ ہمارے پوپ صاحب نے اس دعوے کے علی الرغم کہ یہ صدی عیسائیت کی صدی ہے، نہ صرف یہ کہ اس مشقِ ستم میں دخل اندازی نہ کی بلکہ عراق میں امریکی اور اتحادی کارروائیوں کے جواز پر سندِ تصدیق ثبت کرتے ہوئے متعدد ایسے بیانات دیے جن میں ''دہشت گردی'' کے خلاف مہم کی تحسین کی گئی تھی۔

یہ بیانات ریکارڈ پر موجود ہیں اور محض صحافیوں سے بات چیت کی نہیں، ویٹی کن کے سرکاری بیان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پوپ صاحب غیر جانبدار ہی رہتے تو نہ صرف یہ کہ ان کے پیامِ امن ومحبت کا بھرم رہ جاتا اور آج ان کی افکار ودانش کو ایک غیر جانبدار راہنما کے اقوال کا وزن ملتا بلکہ ہم بھی یہ سطور لکھنے کے ناخوشگوار مرحلے سے نہ گزرتے لیکن ان کے بیانات ان لوگوں کو جو انتہا پسندی اور مذہبی تفریق پر یقین نہیں رکھتے، یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اگر عیسائیت کا سب سے بڑا مذہبی راہنما عراق کے مظلوم عورتوں اور بچوں کے خون کو جائز قرار دے سکتا ہے اور پھر بھی وہ دنیا بھر کا ''مقدس باپ'' قرار پاتا ہے تو مسلمان اپنے مظلوموں کی کٹی پھٹی لاشیں اُٹھا کر کہاں جائیں اور اپنا زخمی زخمی وجود کسے دکھائیں؟

مغربی دنیا کا دعویٰ ہے کہ مذہب اور حکومت الگ الگ ہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ مذہب سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے

لیکن کیا وجہ ہے کہ پوپ صاحب کی تدفین کے موقع پر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس دعوے کی دھجیاں بکھیر دی گئیں اور حکومتی وسائل کے بل بوتے پر عیسائیت کو دنیا کا افضل ترین مذہب قرار دینے کی کوشش کی گئی۔

مسلم دنیا کے لیڈر پوپ صاحب کی آخری تقریب میں خصوصی طور پر شریک ہو کر دنیا کے سامنے اپنا غیر متعصب رویہ ثابت کر چکے ہیں۔ کیا عیسائی دنیا بھی مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں سے براءت کا اظہار کرے گی؟

یہ وہ چند سوالات ہیں جن سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ فقط حقائق کی طرف توجہ مبذول کروانا مطلوب ہے۔ اتنی باتوں سے بھی اگر کسی کی دل آزاری ہوتی ہے تو وہ عراق سے افغانستان تک نہ سہی...... بوسنیا کی اجتماعی قبروں سے تیمور کی سر کٹی لاشوں تک ایک نظر ڈال لے، اسے ہماری اس گستاخی کے اسباب اور بے ادبی کے اعذار معلوم ہو جائیں گے۔

سمجھ کا فرق

(شب براءت کی ہنگامہ خیزیوں پر)

مشہور یہودی دانشور لارڈ میکالے کے وضع کردہ نظامِ تعلیم کی وجہ سے چونکہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی دین کی بنیادی باتوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہمارے ہاں دوطرح کا دین پایا جاتا ہے: ایک عربی اسلام اور ایک ہندی اسلام۔ ایک تو وہ خالص اسلامی تعلیمات ہیں جو اللہ رب العالمین نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کی ہدایت اور نجات کے لیے اُتاریں اور دوسرے وہ مخلوط اور ملغوبہ قسم کی مذہبی رسوم ہیں جو ہم نے خود ہی گھڑ مڑ کر اسلام کے سر تھوپ دی ہیں۔ اب ہندی سماج اور ہندوانہ معاشرت کی پیداوار ان عجمی رسوم کا اسلام سے کوئی تعلق ہو نہ ہو، ہمارے ہاں یہ اہم ترین مذہبی اعمال بلکہ دین داری اور بے دینی پرکھنے کا معیار سمجھے جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل بندہ کے پاس ایک صاحب آنے جانے لگے۔ انہوں نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا: "صاحب! جب سے ہم نے آپ کا مدرسہ دیکھا ہے سچ پوچھیے دین اسلام سے محبت اور مولوی حضرات سے تعلق ہو گیا ہے۔ میرا پکا ارادہ ہے کہ اب رجب کے کونڈے اور شب براءت کا حلوہ کبھی قضا نہ ہونے دوں گا۔"

دیکھا آپ نے! دین داری کا معیار اب ہمارے ہاں یہ چند میٹھی میٹھی رسوم رہ گئی ہیں، حالانکہ یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اگر اپنی ڈگریاں گنوانے بیٹھتے تو "اے بی سی" سے "ایکس وائی زیڈ" تک سارے حروف تہجی آگے پیچھے کر کے ایک سانس میں نمٹا دیتے لیکن ان کے ذہن میں مذہب کا تصور کتنا خالص اور راسخ ہے، اس کا اندازہ آپ خود کر لیجیے۔ سچ ہے کہ ہم نے علی گڑھ کے کونڈے کھاتے کھاتے خود اپنا کونڈا کر لیا ہے۔

پھر یہ رسوم تو خیر سے "امن پسندانہ" ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ بسیار خور چٹوروں کے ہاضمے کو نقصان پہنچ سکتا ہے...... سو یہ فقط اک پیٹ کا نقصان ہے جو کوئی ایسا نقصان نہیں...... لیکن خرابے والی بات وہاں سے شروع ہوتی ہے جب ہم "دہشت گردانہ" قسم کی رسوم کو بھی کارِ ثواب سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ ایک نہیں کئی خطرناک اور کبیرہ گناہوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔

شب برات میں حلوے کی پرات سجانا بے ضرر قسم کی رسم ہے لیکن انواع واقسام کی خطرناک آتش بازی اور جذبۂ پیروئ اسلام کے ساتھ رات بھر آگ کا کھیل کھیلنا تو اسلام کی کئی بنیادی تعلیمات کی نفی ہے اور پھر اسے ثواب سمجھنا یا دین کا حصہ قرار دے کر کرتے چلے جانا تو معاذ اللہ شریعت سے مذاق کے مترادف ہے۔ گناہ کرنا اور چیز ہے اور اسے ثواب سمجھ کر کرنا قطعاً دوسری بات ہے۔ یہ خودسری تو بغاوت کے زمرے میں آتی ہے۔

آیئے! ذرا ایک نظر شبِ برات میں رائج ان کاموں پر ڈالیں جو فرداً فرداً کبیرہ گناہ ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر جب ان کو ملا کر "آتش دستہ" بنایا جاتا ہے تو وہ گناہوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ثواب کا ذخیرہ سمجھا جانے لگتا ہے۔ اکائی اور مجموعے کا یہ فرق

ہماری سمجھ کا پھیر ہے۔ اللہ کرے کہ ہمیں دین کی صحیح سمجھ نصیب ہو جائے۔

شبِ براءت کی آتش بازی مندرجہ ذیل کبیرہ گناہوں پر مشتمل ہوتی ہے:

❶...... **اسراف یعنی فضول خرچی:** اس وقت جبکہ بیروزگاری اور فاقوں کے سبب ملک کے طول و عرض میں خودکشیاں ہو رہی ہیں، ہزاروں لوگ خطِ افلاس سے نیچے کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن بسنت کی پتنگوں اور شب برات کی پھلجھڑیوں پر لاکھوں کروڑوں روپے اڑانے والے جیالوں کو سمجھانے والا کوئی نہیں۔

❷...... **جانی و مالی نقصان:** آتشیں مادے کی تیاری اور استعمال سے المناک حادثات مسلسل رونما ہوتے ہیں۔

❸...... **تکلیف رسانی:** بعض پٹاخوں کی آوازیں اتنی خوفناک ہوتی ہیں کہ لوگ بالخصوص مریض دہل کر رہ جاتے ہیں۔ دل کے مریضوں کے لیے یہ دھماکے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

❹...... **غیر مسلموں کی نقالی:** اس رسم کا اصل پس منظر دیکھا جائے تو یہ ہندوانہ رسموں کے مقابلے میں اسلام کو دلچسپ اور پُرکشش بنانے کے لیے ایجاد کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بچگانہ خیر خواہی کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

❺...... **عبادات میں خلل:** برکت والی رات میں خود بھی عبادت نہ کرنا اور دوسروں کی عبادت میں خلل ڈالنا سخت محرومی اور کم عقلی ہے۔

❻...... سب گناہوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گناہ کو ثواب سمجھ کر کرتے جانا بہت خطرناک گناہ ہے۔

لہٰذا اس سلسلے کو روکنا ہر مسلمان پر حسبِ حیثیت فرض ہے۔ یعنی:

❖...... حکومت کو چاہیے کہ آتش بازی کے سامان کی تیاری اور خرید و فروخت روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرے اور سختی سے کرے۔

❖...... بڑوں کو چاہیے کہ اپنے گھر کے چھوٹوں کو اس غرض کے لیے پیسے فراہم نہ کریں اور انہیں اس کے نقصانات سمجھا کر باز رہنے کی تلقین کریں۔

❖...... علمائے کرام تحریر و تقریر میں اس کے مفاسد گنوائیں اور وعظ و تذکیر کے ذریعے تیزی سے بڑھتے ہوئے اس سلسلے کو روکنے کی کوشش کریں۔

❖...... محلہ کمیٹیوں کے سربراہ اور محلے کے بزرگ اپنی حدود میں اس سامان کا اسٹال لگانے اور استعمال کرنے سے روکنے کے لیے اپنے اثر و رسوخ کا بھرپور استعمال کریں۔

آہ! بعض بزرگوں کے کہنے کے مطابق وہ بھی کیا زمانہ ہوتا تھا کہ محلے کا ''دادا'' (غنڈہ) سارے محلے کی عزت کا محافظ اور غلط حرکتوں کا احتساب کرنے والا ہوتا تھا۔

یاد رکھیے! برائی سے نفرت ''أضعف الایمان'' ہے۔ کم از کم ایمان کے اس آخری درجے کو مضبوطی سے تھام لیجیے۔

دو متضاد تصویریں

عروج کی بھی کیا شان ہوتی ہے اور زوال کے دنوں میں شکست خوردہ لوگوں سے کیسی بھونڈی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں؟

آیئے! ذرا اپنی تاریخ میں جھانک کر پہلی اور گریبان میں جھانک کر دوسری تصویر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ زیادہ دور کی نہیں، ابھی ماضی قریب کی بات ہے کہ مسلمانوں میں غریب اور مفلوک الحال افراد بھی ایمان کے ایسے مضبوط اور یقین کے اتنے کامل ہوتے تھے کہ ان کو دیکھ کر کفار اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کی اسلام سے محبت کے قائل ہو جاتے تھے۔

پاکستان کے مشہور بیوروکریٹ جناب قدرت اللہ شہاب صاحب ہالینڈ میں بیتے دنوں کی یادیں چھیڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک روز میں آرنہم کے وسیع و عریض جنگل میں گھوم رہا تھا۔ تھک کر درختوں کے جھنڈ میں ایک بینچ پر بیٹھا تو قریب کے بینچ سے دھیمی دھیمی خوش الحان آواز میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت کی آواز آئی۔ ایک نہایت خوش پوشاک، فرنچ کٹ سفید ڈاڑھی والا ڈچ آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر سورۂ رحمٰن کی قرأت کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اٹھ کر السلام علیکم کہا۔ اس نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ کر جواب دیا۔

''کیا آپ ڈچ مسلمان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا نام عبداللہ ڈی ہُوگ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا وطن پاکستان ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب ہوا تھا۔ وہ پہلے ڈچ نیوی میں اعلیٰ افسر تھا۔ وہاں سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے وہ مرچنٹ فلیٹ میں شامل ہو گیا اور ایک کارگوشپ کا کپتان بن گیا۔ یہ جہاز مشرقی بندرگاہوں اور یورپ کے درمیان سامان ڈھوتا تھا۔ 1948ء میں ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر کچھ سامان لدوانے کے لیے رکا۔ گرمی اور حبس کا موسم تھا۔ سامان لادنے والے مزدور پسینے میں شرابور تھے۔ جہاز کے عملے نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا، تو سب نے پینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کا روزہ تھا۔ ایک بوڑھے مزدور پر ڈی ہوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی، حبس اور سامان کے بوجھ تلے بدحال ہو رہا تھا۔ دوسروں کی نظر بچا کر وہ اس بڈھے کو اپنے کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس کا گلاس دے کر اشارے سے کہا کہ یہاں پر اسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ وہ چپکے سے اسے پی لے۔ بوڑھے مزدور نے نفی میں سر ہلا کر جوس کا گلاس واپس کر دیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اللہ اللہ کہتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ ان دیکھے خدا کی ذات پر اس قدر مکمل، بے ابہام اور غیر متزلزل ایمان دیکھ کر ڈی ہوگ کا دل تو اسی وقت مسلمان ہو گیا تھا لیکن اس کے دماغ نے یہ تبدیلی ایک برس کے بعد قبول کی۔

اس ایک برس کے دوران اس نے اپنے جہاز کے عملے میں ڈچ زبان جاننے والا ایک انڈونیشی مسلمان عالم بھرتی کر لیا، اس سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا، حدیث سے واقفیت حاصل کی اور پھر قاہرہ کی ایک مسجد میں جا کر باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ دو برس اور مرچنٹ فلیٹ میں رہا لیکن اپنا اسلام خفیہ رکھا۔ اب ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ آرنہم کے قریب ایک گاؤں

میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی بھی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی لیکن دو بیٹے جو ترک وطن کر کے آسٹریلیا میں آباد ہو گئے ہیں، اس نعمت سے محروم رہ گئے تھے۔"

(شہاب نامہ: ص549-550)

دیکھا آپ نے! ایک غریب مفلوک الحال مزدور کی قوت ایمانی کا کرشمہ کہ ایک غیر مسلم شخص کے دل کو پسیج ڈالا۔ دوسری طرف آیئے خالص مسلم زادوں کا حال ملاحظہ کیجیے!

پاکستان کے ایک مشہور کالم نگار نے (جو خیر سے عالم زادے بھی ہیں) اپنے کالم میں یہ خط چھاپنے کی سعادت حاصل کی ہے کہ رمضان میں چونکہ ہوٹل بند رہنے سے ہوٹلوں سے وابستہ عملے کو بے روزگاری اور پھر قرض داری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے رمضان المبارک کے احترام میں پردے لٹکا کر ہوٹل کھولنے کی اجازت دی جائے کیونکہ اسلام خیر خواہی کا دین ہے۔ اس کا مقصد کسی کو بیروزگار یا قرض دار بنانا نہیں۔ واہ قاسمی صاحب! واللہ جو بات کہی لاجواب کہی۔ رمضان میں تو مؤمن بندے کا رزق بڑھ جاتا ہے۔ عام انسان کو وہ کچھ کھانے کو ملتا ہے جس کا سال بھر پکنک پارٹی کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ آج تک تو یہی سنا تھا کہ رمضان میں لوگ دگنا کماتے ہیں اور چوگنا کھاتے ہیں آج آنجناب نقل فرما ہیں کہ رمضان میں لوگ بے روزگار اور مقروض ہو جاتے ہیں اس لیے احترام رمضان میں پردہ لٹکا کر ہوٹل کھولنے کی اجازت دی جائے۔

اول تو یہ سمجھ نہیں آیا کہ پردوں کے پیچھے جو کچھ ہوگا اس کے بعد احترام رمضان کیونکر باقی رہے گا۔ چلیے! مان لیا کہ ہوٹل کے عملے کو تو بے روزگاری کا اندیشہ ہے (جبکہ ایسا کبھی نہیں ہوا، رمضان میں ہوٹل والے بھی افطاری سے سحری تک اپنے نصیب کا لکھا رج کر کما لیتے ہیں) لیکن جو لوگ وہاں روزہ خوری کے مرتکب ہوں گے کیا وہ سب جاں بلب مریض ہوں گے جن کے جان سے جانے کا اندیشہ ہے؟؟؟ یا ہٹے کٹے مسٹنڈے وہاں عذاب الٰہی کو دعوت دیں گے؟؟؟ دوسرے یہ کہ ہم پر اپنے اعمال کے سبب پہلے ہی بے برکتی اور نحوست چھائی ہوئی ہے، کبھی زلزلے کبھی سیلاب تو کبھی کیا اور کبھی کیا...... ماہِ مبارک میں کھلے عام روزہ خوری شروع ہوگئی تو پھر خدا جانے کیا دن دیکھنے کو ملے؟ ہوٹلوں پر لٹکا پردہ کہیں ہماری عقل پر تو نہیں پڑ گیا۔

کمال ہے ہم لوگ تو اس یہودی سے بھی گئے گزرے ہوگئے جس نے روزہ خوری پر اپنے بیٹے کو تھپڑ مارا تھا تو اسے مرنے سے پہلے ایمان نصیب ہو گیا تھا اور اس کا حشر مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنت نصیب ہوئی۔ ہم تو لگتا ہے کہ ان حرکتوں کے سبب مرنے سے پہلے...... خدانخواستہ...... ایمان کی رمق سے محروم نہ کر دیے جائیں۔

سرکاری صوفی ازم کی حقیقت

ڈاکٹر.......... صاحب ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔ ویسے تو ان کی ساری تعلیم دینی مدارس میں ہوئی ہے اور وہ ایک دن کے لیے بھی کسی عصری تعلیمی ادارے میں زیرِ تعلیم نہیں رہے لیکن جب سے انہوں نے پی ایچ ڈی کی، اس وقت سے ان کا لقب ''ڈاکٹر صاحب'' ہوگیا۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے بلا کا ذہن، غضب کا حافظہ اور مشاہدے کی بے پناہ قوت عطا کی ہے۔ میری اور ان کی دوستی کی بنیادی وجہ ان کا دردمند دل اور نظریاتی سوچ ہے۔ موصوف کا خاص وصف یہ ہے کہ اپنے لیے نہیں، اُمت کے لیے سوچتے ہیں اور اسی فکر میں ہر وقت غلطاں رہتے ہیں۔ ایسے لوگ آج کی دنیا میں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ عملاً حرماں نصیب مسلمانوں کی غلطیاں گنوانے، کمزوریوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کرنے اور حاضرین کی حوصلہ شکنی کے ساتھ خود بھی بے عملی کے گرداب میں پھنسے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا دماغ بھی روشن ہے اور ضمیر روشن تر۔ ان کے ساتھ نشست ہمیشہ روحانی مسرت اور آگہی کا باعث ہوتی ہے۔ ویسے تو ان کی تمام گفتگو ہی دانش اور دوربینی کا مرقع اور معلومات کے شیرے میں گندھی ہوئی ہوتی ہے لیکن کچھ باتیں فی الواقع چونکا دینے والی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک بات کو ہم نے حال ہی میں پیش گوئی سے حقیقت بنتے دیکھا تو یہ چند سطریں لکھنے پر مجبور ہوئے ورنہ ارادہ تھا کہ اگلے چند شماروں تک افغانستان میں برپا بے نظیر و بے مثال جدوجہد پر کچھ لکھا جائے کہ جنگ عظیم اول و دوم کے بعد اتحادی ممالک کی طرف سے جس طرح کا ''عسکری ادب'' وجود میں آیا تھا اس سے کہیں زیادہ نادر و نایاب اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل واقعات افغانستان پر عالمی افواج کی چڑھائی اور اس کے مقابلے میں طالبان کی بے مثال عزیمت سے جنم لے چکے ہیں۔ لیکن افسوس پوری انسانیت کے لیے سبق آموز تاثیر رکھنے والے ان سچے اور حقیقی واقعات کو محفوظ کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ واقعات اگر جمع ہو جائیں تو لازوال اور بے مثال ''عسکری ادبیات'' وجود میں آئیں گی جن کے حروف کی روشنی سے آنے والے دن میں مجاہد کا کردار منور اور تاباں ہوتا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اکثر و بیشتر مختلف ممالک کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ صرف گزشتہ رمضان، وہ چھ مرتبہ بیرون ملک گئے۔ دنیا بھر کے اہل علم سے ان کی ملاقات اور گفتگو رہتی ہے۔ پچھلی ملاقات میں انہوں نے ایک حیرت انگیز بات بتائی جسے پورا ہوتے ہوئے ہم خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: ایک مرتبہ ایک یورپی ملک میں سیمینار کے دورن میرا روم میٹ ایک گورا اسکالر تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں ایک ایسے ادارے میں ملازم ہوں جو عالمِ اسلام کے بارے میں ایک خاص پہلو سے تحقیق کرتا ہے۔ آگے کی گفتگو ڈاکٹر صاحب کی زبانی سنیے:

......''خاص نوع کی تحقیق سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

......''ہم یہ تحقیق کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں دین کے نام پر بددینی کیسے پھیلائی جائے گی۔''

......"دین کے نام پر بد دینی؟ اوہ! یہ تو عجیب بات ہے۔"

......"آپ جیسے آدمی کے لیے کیسے عجیب ہو سکتی ہے؟ ہمارے ہاں کچھ اداروں کو اس غرض کے لیے فنڈ ملتا ہے کہ وہ دنیا پرستی کے ذریعے بے دینی پھیلائیں اور ہمیں اس مقصد کے لیے لامحدود وسائل فراہم کیے جاتے ہیں کہ دین پسندی کے ذریعے بے دینی پھیلائیں۔"

......"اچھا تو آج کل آپ کس موضوع پر کام کر رہے ہیں؟"

......"ہم عالمِ اسلام میں تصوف کے ذریعے بے دینی پھیلانے پر کام کر رہے ہیں اور اس حوالے سے ہم ایک واضح خاکے تک پہنچ چکے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے بندہ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ اس گورے نے ہمیں بتانا تھا اور نہ میں نے پوچھا لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ان کا منصوبہ کس نوعیت کا ہوگا؟

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب!" بندہ نے کچھ دیر سوچ کر عرض کیا "تصوف تو انسان کے باطن کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ اس کی ابتدا اخلاص سے اور انتہا احسان پر ہوتی ہے۔ جو تصوف شریعت کے تابع اور ماتحت ہے وہ اسلامی تصوف ہے اور جہاں طریقت کے نام پر شریعت کے احکام کو ہلکا سمجھا گیا وہ جاہلی اور بدعتی تصوف ہے۔ جہاں تک میرا ذہن جاتا ہے عنقریب ہمارے ہاں بے دینی کی اشاعت کے لیے مسخ شدہ اور منحرف رسومات، صوفیت کے نام پر پروان چڑھائی جائیں گی اور اس پر اتنا پیسہ بہایا جائے گا کہ نفس پرستوں کے ٹھٹھ لگ جائیں گے۔"

بات آئی گئی ہو گئی لیکن ایک دن اخبار میں پڑھا کہ دہلی میں صوفی ازم پر ایک کانفرنس ہوئی ہے جس میں صوفیائے کرام کے حالات وواقعات اور طرزِ زندگی (جس میں عفوودرگزر اور نرم خوئی ورحم دلی پر زیادہ زور ہے) کو اجاگر کیے جانے کی خبر گرم تھی۔ ظاہر ہے اس کا مطلب مسلمانوں کو جذبۂ جہاد اور نظریۂ شہادت سے محروم کرنا تھا۔ اس سے چند دن بعد سوالات کا تانتا بندھ گیا کہ آج کل مختلف چینلوں پر عجیب طرح کی نعتیں اور صوفیانہ کلام پڑھا جا رہا ہے جس میں نعت خوانی کے مروّجہ اسلوب (جس میں کافی حد تک تقدس اور آداب تو ملحوظ رکھا جاتا تھا) موسیقی کے صوتی تاثر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں اللہ کا پاک اور مبارک نام ایسے انداز میں لیا جاتا ہے کہ میوزیکل افیکٹ کریئیٹ ہوتا ہے۔ پڑھنے والوں کا لباس انتہائی عجیب وغریب بلکہ یوں کہیں کہ ماڈلنگ کی ایک نئی قسم وجود میں آگئی ہے جسے "مذہبی ماڈلز" کہا جا رہا ہے۔ جن مناظر کو بیس منظر میں رکھ کر کلام ریکارڈ کروایا جاتا ہے...... اللہ معاف کرے...... ان کو آپ فلموں کی نقالی کہہ سکتے ہیں۔ باڈی لینگویج، چہرے اور ہاتھ کی عجیب وغریب حرکات وسکنات بھی پہلی بار دیکھنے میں آرہی ہیں اور یہ سب کچھ مل کر روحانیت کی نمو کے بجائے اس عادت کی کسی حد تک تسکین کرتا ہے جو دوسرے چینل میں دوسری چیزیں دیکھ کر لگ چکی ہوتی ہے۔ بس صرف دھمال اور رقص کی کمی ہے باقی سب کچھ "حاضر" ہے۔ ابھی ان سوالات کے جواب پر غور ہی کیا جا رہا تھا کہ بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ اس مرتبہ خبر کچھ یوں تھی کہ وطن عزیز میں تصوف کی ترویج کے لیے سرکاری سطح پر صوفی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو "صوفی کلچر" کو فروغ دے گی۔" اس کونسل میں جن "صوفیائے کرام" کے نام شامل ہیں وہ سننے اور

بار بار سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ زمین کے اس ٹکڑے میں جس میں ہم بستے ہیں، شریعت کے آخری سہاروں کے انہدام کی کوشش کا اعزاز پانے والے اب قوم کو طریقت کے مقامات رفیعہ پر فائز کرنے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس ملک کا نام بتایا جس سے اس گورے دانش ور کا تعلق تھا نہ اس کا نام اور قومیت...... لیکن اس کا اندازہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ نام نہاد صوفی ازم کی یہ سحر کاری جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کی گرم بازاری کے خاتمے کے لیے ہے اور ان چیزوں سے سب سے زیادہ خائف اور ان کے خاتمے کے لیے سب سے زیادہ سرگرم دنیا میں ایک ہی قوم ہے جو رنگ بدل بدل کر ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ قرآن کریم کی شہادت ہے: ''اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب میں ہی سے ایک گروہ کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان لے آنے کے بعد بھی کافر بنا دیں گے۔'' اہل کتاب کا یہ گروہ وہی تھنک ٹینک ہے جس نے برصغیر کے نصاب سے اسلامی احکام کی تعلیم ختم کی، مرزا قادیانی کو جہاد کی منسوخی کے فتویٰ کے عوض آج تک سیٹلائٹ ٹیکنالوجی بلا معاوضہ فراہم کر رہا ہے، جس نے گوہر شاہی جیسے ملحد کی تربیت کی، جس نے سعودی عرب کے نصاب سے آیات و واقعات جہاد کے اخراج کا اس لیے مطالبہ کیا کہ ان کو پڑھ کر سعودی نوجوان ارض حرمین میں موجود یہودی افواج کے خلاف مشتعل ہو سکتے ہیں، جو جہاد سے تعلق کو جرم بنانا چاہتا ہے اور جو یہ بحث چھیڑتا ہے کہ جہاد ریاست کا فریضہ ہے یا عام مسلمان پر فرض ہے؟ جو جہاد کے لفظ کو بے معنی و بے مقصد اور غلط مفہوم میں استعمال کر کے اس کی حرمت و تقدس کو کم کرنا چاہتا ہے۔

کیا یہ نہیں جانتا؟

تصوف، دل سے غیر اللہ کو نکالنے کی مشق ہے اور جب سالک کے دل سے غیر اللہ نکل جاتا ہے تو اسے اپنے اللہ کے لیے جان دینے سے زیادہ کوئی چیز لذیذ محسوس نہیں ہوتی۔

تصوف، خانۂ دل میں موجود بتوں کو توڑ کر ایک اللہ کی یاد میں گم ہونے کا نام ہے۔ اور انسان جب اپنے خالق میں گم ہو جاتا ہے تو اس دنیا کا ایک ایک لمحہ اس پر بھاری ہو جاتا ہے۔ اسے تو شہادت کے بغیر چین نہیں آتا۔

تصوف، توحید و سنت اور تقویٰ و طہارت کو اپنانے اور شرک و بدعت اور رسومات و منکرات کو چھوڑنے کا نام ہے۔ جس نے یہ منزل سر کر لی اسے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق ہر لمحے تڑپائے رکھتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ شہادت کا راستہ رب تعالیٰ کے دیدار کا قریب ترین اور یقینی راستہ ہے۔

آج تک جتنی جہادی تحریکیں اُٹھیں...... آپ سید بادشاہ کی تحریکِ آزادی ہند سے لے کر لیبیا و الجزائر کی سنوسی تحریک کا مطالعہ کر لیجیے۔ شیخ عمر مختار سے شروع کیجیے اور شاہ اسمٰعیل کو پڑھ لیجے۔ سوڈان کی مہدوی سے ابتدا کیجیے اور مراکش سے گھوم آیئے۔ یہ ساری جہادی تحریکیں صوفیائے کرام کی سربراہی میں ان کے مریدین نے برپا کی تھیں اور ان کا مرکز خانقاہیں تھیں۔ بندہ پچھلے دنوں سرحد کے بعض دور افتادہ علاقوں میں کچھ بزرگوں کے آثار کی تلاش میں نکلا جب ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے مرقد تک پہنچا تو اللہ کی عجیب شان دیکھنے میں آئی۔ یہ سب صوفیا تھے اور دن بھر کڑی جہادی مشقت کے بعد رات سجدوں اور مراقبوں میں گزارتے تھے۔ اس سفر کی کچھ روداد ان شاء اللہ عنقریب آئے گی۔ یہ باصفا لوگ دل کی صفائی کے بعد اس کائنات کو طاغوتی جراثیم سے پاکیزہ کرنے نکلے تھے۔ طریقت، شریعت کے تابع ہے اور شریعت کی

''چوٹی'' جہاد ہے تو صوفی کا تاج بھی یقیناً شہادت ہے۔ جس تصوف میں یہ کچھ نہ ہوگا اسے کیمرے کے سامنے، اسٹیج کی تیز روشنیوں، رنگارنگ ملبوسات اور قسما قسم مناظر کے سہارے بدعات و رسومات پھیلانے کا ذریعہ تو بنایا جا سکتا ہے، روحانیت کا اس سے دور کا واسطہ بھی نہ ہوگا اور جو دینی کام روحانیت سے محروم ہے وہ خالص نفسانیت ہے اور نفسیات چند دن کی بڑھک کے بعد اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

معرکۂ کربلا: آزمائش کا نشان

پروپیگنڈے کی دھول کیسی کیسی حقیقتوں کو دھندلا دیتی ہے؟ کربلا سے بڑھ کر اس کی مثال شاید ہی کوئی ہو۔

راہِ حق کے رہبروں پر آزمائشوں اور مشقتوں کا آنا سنتِ الٰہیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ باطل کے سنگ دلانہ مظالم کے مقابلے میں اہلِ حق کی ہمت اور استقامت کا تذکرہ فرشتوں کے سامنے کرتے اور اس پر فخر فرماتے ہیں۔ اہلِ بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ کربلا کے میدان میں گزرا یہ اس عادتِ الٰہیہ کا ظہور تھا جو اس کائنات میں بارہا ظاہر ہوتی رہی ہیں اور جس کے ذریعے اللہ اپنے مقرب بندوں کی آزمائش منفرد انداز میں کرتا اور اس پر انہیں اپنے قربِ خاص کے اعلیٰ درجات سے نوازتا رہا ہے۔

صبر و طاعت کے ذریعے رب تعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنا بھی نفس پر گراں اور مشکل ہے لیکن حق کی حمایت میں آنے والے مصائب پر صبر وہ نیکی ہے جو بلند نصیبوں کے حصے میں ہی آتی ہے۔ اگر اصحاب عزیمت واستقامت نہ ہوتے تو اس کائنات میں بہت سی ان چیزوں کا ظہور نہ ہوسکتا جن کے لیے یہ عالم ناسوت سجایا گیا ہے لہٰذا مشیت الٰہیہ یہی ہے کہ قدسی صفت ہستیاں اللہ رب العزت کے مقدس نام پر یہ ہزار رنگ قربان ہوتی جائیں اور اپنے پیچھے ایسی تاریخ چھوڑ جائیں جو رہتی دنیا کے لیے مثال ہو اور اس کے تذکرے سے فدائیانِ حق کو ہر لحہ عزمِ نو کا پیام ملتا رہے۔

واقعۂ کربلا ایسی ہی آزمائش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر اپنے پاک نام پر مقدس جانوں کی بھینٹ کے لیے مقدس ترین لوگوں کا انتخاب کیا اور ان ہستیوں نے اس سج دھج سے مقتل کو آباد کیا کہ اس انتخاب کی لاج رکھ لی۔

کربلا سراسر آزمائش و امتحان تھا۔ پیش آنے سے لے کر آج تک اور آج کے بعد سے قیامت تک جب اہلِ بیت کا ہی ایک فرد (حضرت مہدی) طاغوتِ اکبر (دجال مسیح) کے خلاف جہادِ عزیمت کا علَم بلند کرے گا اور آخری اور حتمی فتح ہونے تک اسے نیچے نہیں رکھے گا۔

☆ یہ امتحان یزید کے لیے بھی تھا۔ سیدنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وارضاہ نے مسندِ خلافت کے لیے اس کا انتخاب کرکے اس پر جو اعتماد کیا تھا یہ اس کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کی موجودگی میں اسے ثابت کرنا تھا کہ وہ مسلمانوں کی قیادت اپنے پیش رووں کے طرز پر کرے گا اور اسلامی لشکروں کا وہ سیلاب جو فارس و روم کی سرحدیں روند چکا ہے، اسے آگے سے آگے اور دور سے دور تک لے جانے میں کامیاب ہوگا۔ جنگِ قسطنطنیہ میں اس کی شرکت اس آزمائش میں سرخ روئی کا پتہ دیتی ہے اگر کربلا کے روز وہ جنگ ٹل جاتی جو ہرگز ناگزیر نہ تھی تو بار خلافت نبھانے میں اس سے کوئی اتنی بڑی چوک بھی نہ ہوئی تھی کہ اسے یوں مطعونیت کا استعارہ بنالیا جاتا۔ یہ جنگ ہرگز کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی ورنہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ ابن زیاد کے سامنے تین شرائط میں سے یہ شرط ہرگز نہ رکھتے کہ مجھے دمشق جانے دو۔ یزید اور میں اس معاملہ کو خود طے کرلیں گے۔ اسی طرح یہ مبالغہ آرائی بھی کسی طرح درست نہیں کہ اسلام ہر کربلا کے بعد زندہ

ہوتا ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو جنابِ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جنگ نہ ہونے دینے کے لیے متبادل تجاویز کیونکر دیتے؟ کیا وہ معاذ اللہ اسلام کے زندہ نہ ہونے پر راضی تھے؟ نیز ایسا سمجھنے اور کہنے سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دوسرے بھائیوں اور دیگر اہلِ بیت جو قافلۂ حسین میں شامل نہ تھے، کے بارے میں پھر کیا کہا جائے گا؟ اعتدال وتوازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو افراط وتفریط کے ایسے ہی نمونے وجود میں آتے ہیں۔

☆ کوفہ والے بھی اس آزمائش کے اہم شرکا تھے۔ عربوں کی روایت تھی کہ اگر وہ کسی عام آدمی کو بھی زبان دیتے تو اس پر قائم رہتے تھے۔ جان چلی جاتی پر ہاتھ سے ہاتھ نہ چھوٹتا۔ زمانۂ جاہلیت میں سموٴال بن عادیا جیسے لوگوں نے یہ اعلیٰ انسانی اقدار قائم کیں کہ آنکھوں کے سامنے جوان اولاد ذبح ہونا تو گوارا کیا لیکن وفا اور عہد پر آنچ نہ آنے دی۔ تاریخ میں ان لوگوں کا نام امر ہوگیا۔ آج تک ان کا نام ایفائے عہد کی علامت ہے اور رہتی دنیا تک ان کی مثالیں دی جاتی رہیں گی۔

اہلِ کوفہ نے تو خانوادۂ رسول کو بغیر ان کے مطالبے کے خود سے زبان دی تھی اور وہ بھی ایک نیک مقصد کو عنوان بنا کر...... انہیں تو خون کی ندیاں عبور کرنی پڑتیں یا آگ کا دریا ننگے پاؤں پار کرنا پڑتا، کسی صورت میں آلِ رسول کو تنہا نہ چھوڑنا چاہیے تھا۔ حیدر کرار سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے ان کی روداد جفا ودغا کم نہ تھی کہ آلِ علی سے بھی بے وفائی اور عہد شکنی کا داغ انہوں نے اپنے نام کرلیا۔ کربلا میں بے سہارا خانوادۂ رسول عالمِ مظلومیت میں جان سے گزر گیا اور ان میں سے کسی نے اپنی آرام گاہ سے نکلنے کی زحمت بھی نہ کی۔

سچ تو یہ ہے اے اہلِ کوفہ! کہ اس دن تم اعزاز وافتخار کی لازوال ستائشیں اپنے نام کروا سکتے تھے مگر تم نے یہ موقع گنوا کر اسلام کی تاریخ میں ایک خونچکاں حادثے کا اضافہ کرنے کے ساتھ اپنے لیے بھی ناقابلِ رشک تذکروں کا ابدی سامان کر دیا۔

☆ اس زمانہ میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ موجود تھے، کربلا ان کے لیے بھی ایک آزمائشی نشان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو صائب مشورہ دیتے ہوئے جس خیر خواہی اور دلسوزی کا مظاہرہ کیا اور صورتِ حال کو ان کے حق میں لانے کے لیے جو کوششیں کیں وہ ان حضرات کی نیک نفسی اور پاک طینتی پر شاہد عدل ہیں۔ اہلِ مدینہ نے تو واقعۂ حرہ میں جانوں کی بے تحاشا قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ان پاکباز ہستیوں نے حسبِ استطاعت، حسبِ توفیق اور حسبِ معذرت جو بن سکا، آلِ رسول کے نذر کر دیا...... سلام ہو ان مقدس ہستیوں پر۔

☆ سب سے کڑی آزمائش کا سامنا جگر گوشۂ رسول اور ان کے رفقا کو تھا۔ تاریخ دور کھڑی تک رہی تھی کہ وہ اس لازوال روایت کا تسلسل کیونکر قائم رکھتے ہیں جو آتش نمرود میں بے خطر کود نے سے شروع ہوئی تھی اور کربلا کے گھاٹ سے پانی کی بندش تک لکیر کھینچتی چلی آرہی تھی۔ وہ لکیر جسے عبور کرنا ابدی سعادت کے حامل بلند بخت اہلِ عزیمت کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ آسمان وزمین، شمس وقمر، شجر وحجر اور انس وجن سب شاہد ہیں کہ اس دن اہلِ بیت رسول نے بلا جھجک اور بلا تردد وہی کچھ کیا جو اُن کے شایانِ شان تھا اور جس نے سربلندی اور سرفرازی کی وہ نیک نامیاں ان کے نام کیں جو کبھی نہ مٹ سکیں گی۔ دنیا میں جب تک غیرت ووفا نام کی چیز کا تذکرہ آئے گا کربلا کا واقعہ اس کا مرکزی عنوان ہوگا اور جب تک حق پر استقامت کا تذکرہ ہوگا، آلِ رسول کی قربانیاں اہلِ اسلام کا خون گرما کر انہیں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے آمادہ کرتی رہیں گی۔

☆ کربلا کے حوالے سے ایک اور آزمائش بھی قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اس کا تعلق عزم وہمت سے بھرپور اس داستان سے ملنے والے بے شمار سبق ہائے عبرت وموعظت کے تذکرے سے ہے۔ یہ آزمائش کچھ یوں ہے کہ کون اہل بیت سے اس محبت کے اظہار میں اعتدال وتوازن کو ملحوظ رکھتا ہے جو ہر مسلمان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور کون اس جنگ کے حقیقی اسباب اور پس منظر کو سمجھے بغیر مخالفین کی تنقیص میں مبالغہ آرائی کرتے ہوئے حد سے گزرتا ہے۔ کربلا دودھاری تلوار ہے۔ رفقائے حسین جس پامردی سے اس پر سے گزرے وہ انہی کا حصہ تھا لیکن پیچھے آنے والے اظہارِ عقیدت ومحبت میں اسوۂ حسنی وحسینی کی پیروی اور افراط وتفریط پر مبنی غیر معتدل رویوں سے احتراز واجتناب میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں؟ یہ نہایت نازک امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہر وقت مانگنی چاہیے ورنہ یہ وادیٔ خارزار بہت سوں کا دامن تارتار کر چکی ہے۔

معرکۂ کربلا کی اصل حقیقت جیسی کچھ تھی، افسوس داستان طرازی کی گرد اسے دھندلا نہ دیتی تو اخلاق ونظریات کی تربیت، حوصلہ وہمت کی آبیاری اور عبرت وموعظت کے ہزارہا سبق اس کی تہہ میں پوشیدہ تھے مگر کچھ لوگ پَر جلنے کے خطرے سے لہو گرمانے والی نظریاتی محفلوں میں بھی سرفروشی وجانبازی کی اس لازوال داستان کے تذکرے سے مہر بلب رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور کچھ اس کی ایسی پُرکار تصویر کھینچتے ہیں جو اس مقصد کی ہی نفی کر دیتی ہے جس کے لیے گلشن زہرا کے پھولوں نے کربلا کے تپتے ریگزار کو اپنا مقدس خون دے کر ٹھنڈا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ عقلِ سلیم عطا فرمائے اور اسوۂ حسنی وحسینی کی پیروی کرتے ہوئے اس معرکے کی تیاری کی توفیق دے جس کے خاکے میں اہلِ ایمان، ایک حسنی فرزندِ ارجمند (حضرت مہدی جناب سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے اس نیکی کا انعام ہے جو انہوں نے اتحاد بین المسلمین کی خاطر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی صورت میں کی تھی) اپنے گرم لہو سے رنگ بھر کر حق کو دائمی سربلندی عطا کریں گے۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے کے شوشوں نے پھر سے سر اُٹھا کر اس معرکے کے قریب آتے قدموں کی چاپ تیز تر کر دی ہے، جس کی تیاری کے لیے کربلا کی سرفروشانہ داستان، عزمِ نو کا پیام ہے۔

ایک یادگار محفل

یہ قصہ کراچی کی ایک گرم شام میں سمندر کی پشت پر منعقد ہونے والی محفل کا ہے۔ میزبان اور مہمان چنیدہ لوگ تھے۔ اصحابِ علم، اہلِ فکر و دانش۔ روشن چہرے، چمکتی آنکھیں۔ نظریں مہمان کے چہرے پر، کان ان کی دل میں اترتی آواز پر۔ سننے والوں کی خواہش تھی کہ اس شخصیت کو آنکھوں سے تو دیکھ لیا جس نے ایک لافانی تصنیف لکھ کر راتوں رات شہرت جاوداں حاصل کی اور اہل السنۃ والجماعۃ کی آنکھوں کا تارا بن گئے، اب سماعت کو بھی ان کی عالمانہ گفتگو سے فیضیاب کریں۔

''حضرت! آپ کو اس تصنیف کا خیال کیسے آیا؟'' گفتگو حسب معمول اسی سوال سے شروع ہوئی جو تقریباً ہر محفل میں ان سے کیا جاتا تھا۔

بحیرۂ عرب کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بولنے والا صاحبِ علم بھی تھا صاحب زبان بھی۔ پرکیف فضا، دلکش گفتگو۔ سننے والوں کا اشتیاق اور توجہ کا یہ عالم کہ لانچ کی سیٹیں چھوڑ کر حضرت کے قدموں میں فرش پر آ بیٹھے۔

''مجھے شروع سے علمائے دیوبند سے بہت زیادہ محبت وعقیدت تھی۔ اس وارفتگی کی وجہ یہ کہ میں اپنے مطالعہ اور مشاہدے کی بنا پر یہ سمجھتا تھا کہ برصغیر میں دین اسلام کا احیا و تبلیغ اور جہاد وحریت انہی حضرات کے مرہون منت ہے۔ ان کے اہلِ حق ہونے کی ایک یہی وجہ میرے نزدیک بہت تھی لہٰذا کوئی ان کے خلاف بولے تو مجھے اس کی حماقت اور جہالت پر نہایت افسوس ہوتا تھا۔''

حضرت نے تمہید باندھ لی تھی اور اب ان کی گفتگو میں دھیرے دھیرے روانی اور توجہ قلبی کا عکس گہرا ہو رہا تھا۔

''ہمارے ہاں یوپی میں ایک جگہ ہے ''گھوسی''۔ وہاں کے ایک نہایت قابل فاضل تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں دوران تعلیم ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل کی۔ پھر کچھ نوجوانوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی مدینہ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ وہاں پڑھنا پڑھنا تو کچھ ہوتا نہیں ہے۔ برصغیر کے درس نظامی کی ساخت اور سانچہ ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں کا فارغ التحصیل عالم دینی علوم میں اتنی مہارت اور رسوخ کا حامل ہوتا ہے کہ اسے کہیں اور کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دنیا بھر میں اس نصاب کی کوئی مثال کہیں پیش نہیں کی جاسکتی۔ بس ایک چل چلاؤ اور دنیا دیکھنے کا شوق ہے جو ہمارے طلبہ دوسروں کی دیکھا دیکھی عرب ممالک کی یونیورسٹیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مولوی صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ کچھ عربی کا شین قاف درست کیا، کچھ پوزیشنیں حاصل کیں اب واپس وطن آنا چاہتے تھے۔ سعودی حکومت نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور اب یہ خوش وخرم، کامیاب وکامران وطن لوٹ رہے تھے کہ وہ حادثہ پیش آ گیا جس کی بنا پر یہ تالیف وجود میں آئی۔''

حضرت گفتگو میں تجسس پیدا کرنے کے ماہر تھے۔ یہاں تک پہنچ کر دم بھر کو رک کے پھر بات آگے بڑھائی:

ہوا کچھ یوں کہ جب ان کے کاغذات آخری دستخط کے لیے سعودی آفیسر کی میز پر پہنچے اس نے ان کو بلا کر پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: الحمدللہ! دیوبندی ہوں۔ اس کی میز پر اس زمانے میں تازہ تازہ چھپی ہوئی کتاب ''الدیوبندیہ'' رکھی تھی۔ اس میں علمائے دیوبند کے خلاف ایسا بے سروپا مواد جمع کیا گیا تھا اور ایسے بے جا رکیک الزامات لگائے گئے تھے کہ اس نے ان سے کہا: ''تم مشرک ہو۔ قبوری اور وثنی ہو۔ (قبوری: قبر پرست۔ وثنی: بت پرست) تمہارا وظیفہ منسوخ کیا جاتا ہے۔''

یہ خاموشی سے اُٹھ کر آ گئے۔ باہر آ کر یہ کتاب خریدی جو مجھ سے گفتگو کے وقت ان کے ہاتھ میں تھی اور مجھے بتلایا کہ اس کتاب میں ایسے بے جا الزامات ہیں کہ ان کا جواب دیتے ہوئے بھی انسان شرماتا ہے۔ یہاں سعودیہ میں ایک خاص طبقہ اس پر خوب بغلیں بجا رہا ہے۔ ہمارے ساتھی ان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کتراتے ہیں کہ خدا جانے کیا فتنہ بنے؟''

یہاں تک پہنچ کر حضرت پھر رُک گئے۔ ان کی گفتگو سے سماں بندھ چکا تھا۔ ایک تو لہجہ خوبصورت، دوسرے نستعلیق قسم کی اردو، تیسرے آپ بیتی سنانے کا مخصوص انداز۔ سب پر محویت کا عالم طاری تھا۔ حضرت پھر گویا ہوئے:

''مجھ سے رہا نہ گیا۔ ان سے کتاب لی اور سیدھا گھر چلا آیا۔ مجھے اس وقت وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ میں اس کا جواب لکھوں گا۔ وہ جواب اس کے پرخچے اُڑائے گا اور سعودی عرب اور خلیجی ممالک سے اس کے پھیلائے ہوئے جراثیم کا نہ صرف صفایا کر ڈالے گا بلکہ تاریخی شہرت پا جائے گا۔ میں نے کتاب دیکھنی شروع کی۔ خدا کی پناہ! علمی بددیانتی اور تحقیقی خیانت کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ میں کتاب پڑھتا گیا اور حیران ہوتا گیا کہ ''اصحابِ توحید''، ''عاملین بالحدیث'' اس حد تک گر بھی سکتے ہیں؟ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ میں جس کتاب سے حوالے کی مراجعت کرنا چاہتا، وہ کمیاب ہونے کے باوجود معمول کے خلاف جلد ہی ہاتھ لگ جاتی۔ اپنے کتب خانے کی الماریوں کے قریب گزرتا تو کتابوں کی قطار میں سے وہ کتابیں گویا جھانک جھانک کر مجھے تاکتیں اور اپنی طرف متوجہ کرتیں جن سے کوئی مفید بات ہاتھ لگ سکتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی مجھے اس کا جواب لکھنے پر اُبھار رہا ہے۔ میں نے قلم ہاتھ میں لیا تو وہ بگٹٹ بھاگتا چلا گیا۔ دماغ میں ابھی پوری طرح سوچ آ بھی نہ پائی ہوتی کہ قلم کھینچ کھینچ کر اسے کاغذ پر منتقل کرتا چلا جاتا۔ تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ عربی میں کتاب تیار ہو گئی اور ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوئی جو اس میدان کا شناور ہی نہ تھا۔ نام بھی مجھے خوب سوجھا: ''**وقفة مع اللامذهبية**'' (کچھ دیر غیر مقلدوں کے ساتھ) میں سمجھتا ہوں یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ کمزوروں سے ایسے کام لے لیتا ہے جن کا تصور بھی وہ نہیں کر سکتے۔''

سب سامعین کو یقین تھا یہ حضرت کی تواضع ہے ورنہ عربی زبان پر ان کی گرفت کے ساتھ تحقیق اور تدقیق میں جیسی دسترس ان کو حاصل ہے، معاصرین میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

''جب علمائے دیوبند پر الزامات کا پلندہ ''الدیوبندیہ'' کی شکل میں آیا تھا تو کچھ حضرات سعودیہ میں مقیم فضلا کو کہتے سنے گئے کہ اس کا جواب ان کو وہاں سے لکھنا چاہیے۔ جبکہ سعودیہ میں مقیم حضرات وہاں سے اس کتاب کے نسخے پر نسخہ بھیجتے کہ یہاں سے اس کا جواب لکھا جائے۔ یہ کشمکش زوروں پر تھی کہ میں اپنی کتاب کا مسودہ لے کر شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے صاحبزادے اور جانشین، حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں جا پہنچا۔ روداد سنائی اور

کتاب پیش کی۔ حضرت دیکھ کر متعجب ہوئے اور فرمایا کہ ابھی حضرت مہتمم صاحب حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند تشریف لاتے ہیں ان کو دکھا کر مشورہ کرتے ہیں۔ میں نے عرض کی: ''حضرت! میں اپنے حصے کا کام کر چکا اب آگے کا مشورہ وغیرہ آپ ہی کیجیے اور مجھے دعاؤں کے ساتھ اجازت دیجیے۔ میں مصافحہ کر کے چلا آیا۔ کتاب دیکھی گئی تو پسند آئی۔ پہلا ایڈیشن اگرچہ طباعت کے لحاظ سے زیادہ معیاری نہ تھا لیکن ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اثر پذیری کا یہ عالم کہ ''الدیوبندیه'' کی اشاعت پر خوشی سے بغلیں بجانے والے حضرات یہ کہتے سنے گئے: ''ہم نے ''الدیوبندیه'' چھاپ کر نہایت غلطی کی۔'' اس کتاب کی تصنیف و مراجعت کے دوران ایک اور کتاب خود بخود ساتھ ساتھ تیار ہوگئی ''مسائل غیر مقلدین''۔ پہلی کتاب دندانِ شکن جواب تھی تو یہ جارحانہ اقدام کہلائی۔ دونوں کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ملک کے نامور ادیب مولانا ابن الحسن عباسی صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''عربی سے اردو ترجمہ آپ کے ہاں سے ابن الحسن عباسی صاحب نے ''کچھ دیر غیر مقلدین کے ساتھ'' کے نام سے کیا۔ خوب کیا اور خوب چلا۔ (عباسی صاحب محفل میں تشریف فرما تھے۔ سن کر زیر لب مسکراتے رہے۔)

کچھ عرصے بعد اس مخصوص طبقے نے پینترا بدلا اور یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ میری کتاب میں دیے گئے حوالے درست نہیں۔ لوگوں نے مجھ سے سوالات شروع کر دیے۔ میں نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ یہ تو انہی سے پوچھا جائے کہ کس صفحے کا کون سا حوالہ درست نہیں؟ میں کیا پوری کتاب کے ایک ایک حوالے کی وضاحت کرتا رہوں گا۔ لوگوں نے مان کے نہ دیا تب میں نے مجبور ہو کر ''صور تنطق'' (بولتی تصویریں یا بولتے عکس) کے نام سے تیسری کتاب لکھی اور اس میں تمام حوالوں کا عکس چھاپ دیا۔ اب گویا پوری لائبریری ہر ایک کے ہاتھ میں آ گئی۔ جو چاہے تسلی کرے اور جو چاہے مخالفین کا کامیاب تعاقب کرے۔ اب تو میں جہاں جاتا لوگ مجھے ''مناظرِ اسلام'' کا خطاب دیتے حالانکہ میں نے ایک مناظرہ بھی نہ کیا تھا۔ اس پر میں نے یہ طریقہ شروع کر دیا کہ پہلے آدھا گھنٹہ بیان کرتا پھر آدھا گھنٹہ حاضرین کو سوالات کا موقع دیتا۔ یہ طریقہ بہت مقبول ہوا۔ بہت سے لوگوں کی اصلاح ہوئی۔ بہت سوں کو حقیقت، احناف اور فقہ حنفی کی حقانیت پر کامل ایمان نصیب ہوا۔ جوان شاء اللہ میرے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ اب پورے خلیج میں میری یہ کتابیں گھر گھر پڑھی جاتی ہیں اور مخالفین کے پھیلائے ہوئے زہر کے تریاق کا کام دیتی ہیں۔''

حضرت کے ٹھہر ٹھہر بولنے کا انداز، ہندوستانی حضرات کے لب و لہجے کا مخصوص رچاؤ، روداد کی دلچسپی اور افادیت، سمندری ہوا کے خوشگوار جھونکے، سمندر کی اٹھکیلیاں کرتے موجوں پر جمی محفل، سچ پوچھیے تو لطف ہی آ گیا۔

''اس کے بعد میں نے اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کتابیں لکھیں۔ میں سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اکابر سے عقیدت و محبت کے صدقے یہ موضوع میرے لیے آسان کر دیا ہے۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں:

1...... **وقفة مع معارضي شيخ الاسلام.** (کچھ دیر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مخالفین کے ساتھ)

قارئین کرام! آپ کو یقیناً اشتیاق ہوگا کہ ان شخصیت کا نام جانیں۔ آپ میں سے بہت سوں نے تو اس مضمون کے ساتھ لگے سرورق سے ان کا نام تو پڑھ بھی لیا ہوگا۔ جی ہاں! ان کا نام نامی حضرت مولانا ابوبکر غازی پوری ہے۔ جو ایک مخصوص

طبقے کی طرف سے علمائے دیوبند اور احناف پر اعتراض کا ترکی بہ ترکی جواب دینے میں ہندو پاک میں بہت بڑا نام سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت گزشتہ ہفتے انڈیا سے پاکستان تشریف لائے تو متعدد محفلوں میں ان سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ غازی پور کے تو وہ ہیں ہی، ماشاء اللہ تن و نوش سے بھی غازی معلوم ہوتے ہیں۔ بے تکلفی، برجستہ گوئی اور خوش مزاجی تو آپ پر ختم معلوم ہوتی تھی جس کی بنا پر حضرت کی صحبتیں یادگار رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی صحت و معمولات میں برکت نصیب فرمائے اور ان کے فیض کو عام و تام فرمائے۔ آمین

ماسٹر مائنڈ

ایک سوال جس کی بازگشت بہت زیادہ سنائی دے رہی ہے یہ ہے کہ اس واقعے یا المیے کے پیچھے نادیدہ ہاتھ کس کا ہے؟ گھوم پھر کر بات وہاں جا کر روک دی جاتی ہے جہاں تک پہنچانے کے لیے یہ سارا قصہ شروع ہوا تھا۔

وہ کون سی نادیدہ طاقت تھی جس نے مولانا عبدالعزیز کو یہ باور کروایا کہ آپ حق پر ہیں اور اکابر علمائے کرام جو بات کہہ اور سمجھا رہے ہیں یہ ان کی اپنی سوچ ہے جو اپنی جگہ درست ہوسکتی ہے لیکن جو صورتِ حال آپ کو درپیش ہے اور جو امکانات آپ کے سامنے ہیں ان کے سامنے نہیں۔ اس لیے آپ ان کی بات نہ مانیں تو بھی کوئی ضرر نہیں۔ یہ نافرمانی اور بے ادبی کے زمرے میں نہیں آتا۔

اس خفیہ ہاتھ کو بھی پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیے جس نے مولانا عبدالعزیز کو مستقل یہ اطمینان دلائے رکھا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن نہیں کیا جائے گا۔ آپ کے خلاف آپریشن ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی یہ وجہ ہے، یہ وجہ ہے اور یہ وجہ بھی ہے۔ لہٰذا آپ بے فکر رہیں اور جو کچھ کریں کھل کر کریں۔ کوئی اندیشہ ہے نہ خطرہ، غم ہے نہ رکاوٹ۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔

اس پر بھی غور وفکر ہونا چاہیے کہ جب یہ معاملہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا تو اسے پھونکوں سے پھر کیوں گرم کیا جاتا تھا؟ مثلاً لائبریری قبضے سے آنٹی شمیم کو توبہ تائب کروانے تک بیچ میں اچھا خاصا وقفہ تھا پھر آنٹی صاحبہ کے واقعے سے چائنیز خواتین تک بھی معاملات کافی دھیمے رہے۔ چند روز خاموشی کے بعد وقفے وقفے سے جو طوفان اُٹھتا تھا اس کا محرک کون تھا؟ وہ کون سی طاقت تھی جو بھولائی گئی باتوں کو پھر سے یاد کرواتی اور سوئے ہوئے فتنے کو دوبارہ جگاتی تھی۔

آپریشن کا غلغلہ وقفے وقفے سے بلند ہوتا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو معاملہ ایک گولی چلائے بغیر حل ہوسکتا تھا، اس کو خونریز تصادم تک کون لے گیا؟ ایک مختصر رقبے میں محدود طلبہ وطالبات کو بحفاظت باہر نکالنے، جن میں اکثریت عسکری اُمور سے نابلد تھی، کیا مشکل تھی؟ آپریشن کی صبح ناشتے تک سے محروم طلبہ کو جنگ کی تیاری یا آپریشن کا سامنا کس طرح کر سکتے تھے؟ بات جب بن جاتی تھی تو اسے کون بگاڑتا تھا اور جب بگڑنے لگتی تھی تو آخری حد تک جانے سے پہلے کون اسے اتنا بنا دیتا تھا کہ معاملہ طول کھینچ جائے اور حالات وحقائق پر اسرار کا ایسا دبیز پردہ پڑ جائے کہ مخمصے سے کوئی نکل نہ پائے۔

اور وہ معمّٰی جو حل ہو کے نہیں دے رہا، یہ ہے کہ بین الاقوامی میڈیا پر 5 بجے شام مولانا عبدالعزیز کی گرفتاری کی خبر نشر ہوگئی تھی۔ جرمنی سے پاکستانی وقت کے مطابق ٹھیک پانچ بجے ایک صاحب کا فون آیا کہ ہمارے میڈیا کے مطابق مولانا تو گرفتار ہوگئے ہیں۔ اب بہت سے سوالوں کا ایک سوال یہ ہے کہ اندھیری ویڈیو میں مغرب کے بعد گرفتاری ظاہر کیے جانے والے مولانا صاحب کو کس شخصیت نے فون پر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خفیہ طریقے سے آزاد علاقے کی طرف نکل جائیں اور وہاں مرکز بنا کر

تحریک کو زندہ رکھیں۔ آپ کے بھائی یہاں سے تحریک چلائیں گے اور آپ وہاں سے قیادت کریں گے۔ آخر وہ کون سی شخصیت تھی جو اس طرح سے مقدس جذبات کو استعمال کر رہی تھی؟ پھر جب مولانا اس بات کی معقولیت کی بنا پر باہر نکلنے پر آمادہ ہو گئے تو گرفتاری کے کئی گھنٹے بعد انہیں ٹی وی پر انٹرویو کے لیے پیش کیا گیا تو اس وقت برقع اوڑھائے رکھنے کی کیا تک تھی؟ کیا یہ وہی ہدف تھا جس کی خاطر یہ نادیدہ ہاتھ مولانا کو کشاں کشاں مخصوص رخ پر لے جانے کے لیے کوشاں تھے؟

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تحریک ریشمی رومال سے لال مسجد تحریک تک ایسے عناصر جو اسلامی تحریک کو کامیاب ہوتا دیکھنا نہیں چاہتے، مختلف شکلوں میں تحریک کے اندر جگہ بناتے ہیں اور پھر نادیدہ ہاتھ ان سے جو کچھ کروانا چاہے وہ ڈوری لیے لپٹے لٹو کی طرح وہی کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کو باہر سے زیادہ اندر پر اور سامنے سے زیادہ گرد و پیش پر توجہ دینی چاہیے۔

دنیا والو! مخلص لوگوں کو کیوں الزام دیتے ہو؟ عقل اور ہمت ہے تو ان خفیہ ہاتھوں کو بے نقاب کرو۔ یہ سارا کیا دھرا ان کا ہے جو سب کچھ کر کے ''ماسٹر مائنڈ'' کسی اور کو قرار دلواتے اور خود چلمن کے پیچھے چھپے، اپنے آخری انجام سے بے خبر قہقہے لگاتے ہیں۔ آخر تو وہ دن بھی آنا ہے جب سب پردے اُٹھ جائیں گے۔ جب زبان پر مہر لگ جائے گی۔ جب ہاتھ پیر بولنا شروع کر دیں گے۔ جب کوئی چیز چھپائے نہ چھپ سکے گی۔ آؤ! حقیقت جانے بغیر کسی کو الزام دینے کے بجائے اس دن کا انتظار کریں جب خیر چھپی نہ رہے گی اور شر بچ نہ سکے گا۔

مردانہ وار جی...

جاپان جب امریکا کے ایٹمی قتل عام کی بنا پر جنگ عظیم دوم ہار گیا تو اس جناتی قوم کے راہنماؤں نے مل بیٹھ کر سوچا کہ انہیں آئندہ زندہ رہنے کے لیے کیا کرنا ہے؟ سب کا جواب تھا ''کام، کام اور کام'' چنانچہ جاپانی قوم کام میں لگ گئی اور مسلسل محنت کے ذریعے شکست کے ویران کھنڈرات پر معیشت کا عالیشان محل تعمیر کر دکھایا۔ اس کے مقابلے میں ہم نے بھی آزادی کے بعد ترقی کے سفر پر روانہ ہونے کا عہد کیا تھا لیکن ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں پچاس سال پہلے تھے اور یہ صرف ہمارا ہی نہیں تقریباً پوری اسلامی دنیا کا مسئلہ ہے۔ حال ہی میں ایک برطانوی اخبار فنانشل ٹائم نے 2002ء میں دنیا کی سرفہرست پچاس تجارتی کمپنیوں اور 50 ممتاز تاجروں کی فہرست جاری کی ہے۔ جس میں کوئی ایک مسلمان کمپنی یا مسلم تاجر........ بندہ دہراتا ہے: کوئی ایک مسلمان تاجر یا مسلم ملک کی کمپنی شامل نہیں ہے۔ 50 کمپنیوں میں ہماری طرح بھارت کی کوئی کمپنی نہیں لیکن 50 شخصیات میں بھارت کے تین افراد جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ بھارت کی ایلائنس کمپنی کے مکیش امبانی 33 ویں نمبر اور ٹاٹا گروپ کے رتن ٹاٹا 50 ویں نمبر کے علاوہ الفوسم ٹیکنالوجی کے نندن موہن بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق امریکن اور یورپی کمپنیوں اور تاجروں میں اکثریت یہودیوں کی ہے جو اپنی آمدنی کا کچھ فیصد اسرائیل کی ترقی کے لیے مختص کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہندو سرمایہ دار شدت پسند ہندو تنظیموں کے اخراجات پورا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں سے کوئی ایسا قابل ذکر ادارہ یا فرد اب تک سامنے نہیں آیا جو دینی مقاصد کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی خاطر اپنے کاروبار کو ترقی دے اور پھر آمدنی میں سے کچھ حصہ دینی کاموں کے لیے مخصوص کر دے۔ لے دے کر زکوٰۃ کی ادائیگی ہے جس کے سہارے دینی کام چل رہے ہیں لیکن سرمایہ داروں کی اکثریت اس سے بھی غافل ہے۔ صوبہ پنجاب پاکستان کا زرخیز ترین صوبہ ہے لیکن ''زکوٰۃ الارض'' (عشر یا نصف عشر) زمین کی پیداوار میں سے 10 یا 5 فیصد زکوٰۃ نام کا وہاں کوئی خاص رواج ہی نہیں۔

اس کام چوری اور فرائض سے غفلت کے ساتھ جب ہم مسلمانوں کی دعاؤں اور نعروں کو سنتے اور انہیں مقبول نہ ہوتے دیکھتے ہیں تو تعجب کا موقع باقی نہیں رہتا۔ جو قوم صرف تمناؤں اور امیدوں پر جینا چاہتی ہے وہ فطرت سے جنگ کر رہی ہے اور تکوینی قوانین سے بکڑی ہوئی اس کائنات میں فطرت سے جنگ کر کے کوئی پنپ نہیں سکتا۔ اگر آپ کو اس دنیا میں عزت سے رہنے کی تمنا ہے تو کچھ کر کے دکھائیے۔ ایسا کچھ کر کے دکھائیے جو آپ کے بعد بھی آپ کی یاد دلاتا رہے۔

ناکام ہے تو کیا، کچھ کام پھر بھی کر جا		مردانہ وار جی مردانہ وار مر جا
اس بحر بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا		کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

چوہدری صاحب، شرفو اور امریکا

چوہدری صاحب نئے نئے شہر میں آئے تھے۔ چھوٹے چوہدریوں نے ضد کر کے ان کو مجبور کیا تھا کہ ایک آدھ بنگلہ شہر کے پوش علاقے میں بھی ہونا چاہیے۔ گاؤں میں جب سوکھا ہو یا پالا پڑے تو موڈ درست کرنے کے لیے ہفتہ مہینہ دیہات کی خاموشی سے نکل کر شہر کی روشنیوں میں گزار لیا جائے۔ چنانچہ دیکھ داکھ کر ہزار گز کی ایک ''چھوٹی'' سی کوٹھی پسند کر لی گئی اور چوہدری صاحب کلاہ، حقہ اور کھسّے لیے ہوئے اس کو رونق بخشنے کے لیے شہر دے وچ آوارد ہوئے۔ شہری زندگی پہلے تو انہیں اجنبی محسوس ہوئی پھر رفتہ رفتہ ان کا جی رنگینیوں سے رنگتا گیا اور یوں وہ ایک نئی زندگی سے روشناس ہو کر اپنے قیمتی وقت کے نئے نئے مصرف تلاش کرنے میں مشغول ہو گئے۔

ایک دن وہ شام کو اپنی چند گاڑیوں میں سے ایک کو پسند کر کے اس کی پچھلی نشست پر چوڑے ہو کر پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ آؤٹنگ کا موڈ ہو رہا تھا۔ شرفو اس دن گنڈیریاں بیچتے بیچتے کچھ اور ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ کب وہ چوہدری صاحب کی گاڑی کے سامنے آ گیا اور ڈرائیور کے بریک لگاتے لگاتے گاڑی نے اسے پہلے اچھالا اور پھر دور پھینک دیا۔ چوہدری صاحب کے منہ سے مغلظات کا طوفان برآمد ہو گیا۔ وہ چیختے دھاڑتے اترے اور شرفو کی تکلیف کی پرواہ کیے بغیر اس پر برسنے لگے کہ اس نے ان کا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ گاؤں ہوتا تو بات دب جاتی۔ کمی کمینوں کو کون پوچھتا ہے۔ ان کی زندگی کیا اور موت کیا؟ لیکن یہ شہر تھا۔

یہاں چوہدری صاحب کے ڈیرے کے علاوہ اور بھی بہت سے ڈیرے ہوتے ہیں اور تھانیدار صاحب کے پاس بات پہنچنے اور دبنے سے پہلے اور بہت سے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں مجمع لگ گیا۔ قریب ہی کالج بھی تھا، وہاں کے لڑکے بالے چھولوں کی چاٹ اور کریم والی آئسکریم کھانے باہر آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی آ پہنچے۔ ان میں ایک سماجی کارکن کا بیٹا بھی تھا۔ کالج یونین کے سیکریٹری اور اس سماج سدھار نوجوان نے ڈرائیور کو گھیر لیا کہ شرفو کو اٹھائے اور قریبی ہسپتال لے چلے۔ ڈرائیور ابھی انہیں چوہدری صاحب کے مقام و مرتبے اور حیثیت و تعلقات سے ناواقفیت پر ڈانٹنے ہی والا تھا کہ اوپر سے کمبخت رپورٹر آ ٹپکے۔ چوہدری صاحب تو منہ سے نکلتا جھاگ پونچھنے کے لیے ٹشو پیپر لینے کے لیے گاڑی میں آئے پھر ان کی ہمت نہ ہوئی کہ دوبارہ مجمع کی طرف جا سکیں۔

رپورٹروں کو ڈرائیور کی زبانی چوہدری صاحب کا شجرۂ نسب جو انگریزوں کے دور کے بعد وجود میں آیا تھا، معلوم ہوا اور انہوں نے چوہدری صاحب کی سیاسی شہرت، سماجی خدمات کے دعوؤں اور غریب شرفو کے ساتھ اس بے رحمانہ سلوک کا بچشم خود ملاحظہ کیا تو انہیں شام کے پرچے کے لیے زوردار چٹپٹی خبر ہاتھ لگ گئی۔ اگلے دن کے اخبارات حادثے کی تفصیلات، چوہدری صاحب کی سنگدلی، چند سماجی راہنماؤں اور چوہدری صاحب کے ایک دو مخالفین کے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔

چوہدری صاحب حیران تھے کہ شرفو جیسے کتنے ہی مزارع ان کی زمینوں پر موجود گھنے درختوں کے جھنڈ میں دفن کر دیے گئے ۔ گاؤں کے نمبر دار سے لے کر تھانیدار تک کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان سے غصے کا سبب بھی دریافت کر سکتا ۔ یہ شہر والوں کو کیا ہوا کہ ایک لونڈے کی خاطر اتنا دلا پا رہے ہیں؟ قصہ مختصر، بڑی مشکل سے اخبار والوں کا منہ اور شرفو کے زخم بند کیے گئے اور چوہدری صاحب نے طے کیا کہ چھوٹے چوہدریوں کو شہر میں رہنے کا شوق ہو تو وہ خوشی سے اسے پورا کریں وہ خود آئندہ شہر کی طرف نہ آئیں گے جہاں کے کمین بھی اب ان کے منہ لگنے لگے ہیں۔

چوہدری صاحب کو یہ بات تو شرفو کے رِستے لہو اور گرد کھڑے شہری بابوؤں کے تبصرے سے سمجھ میں آ گئی مگر امریکا کو تا حال اس حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکا کہ دنیا اب اس کے رعب میں آنے پر تیار نہیں۔ جس طرح خود امریکیوں نے طویل جدوجہد کے بعد بالآخر برطانوی استعمار سے آزادی حاصل کر لی تھی اسی طرح دنیا کی دیگر اقوام میں امریکا کے تسلط سے آزادی کی خواہاں ہیں اور اس کی چوہدراہٹ شمالی امریکا کی پچاس ریاستوں میں تو چل سکتی ہے مگر "گلوبل ولیج" کے باسی اس کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

افسوس ہے کہ امریکی اس حقیقت سے نظریں چرا کر دنیا بھر میں اپنے فوجی اڈے بڑھانے اور چوہدریانہ اسٹائل میں ہر معاملہ حل کرنے پر مصر ہیں۔ یہاں تک کہ اب یورپی اقوام بھی ان کی اس خُو سے بددل ہونے لگی ہیں اور فرانس کے وزیر خارجہ ہیوبرٹ ویڈرائن نے پیرس میں خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکا نے دنیا کو خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔

عالمی معاملات میں دوسرے ممالک سے مشورہ کیے بغیر اپنے طور پر فیصلہ کرنے کے امریکی طرزِ عمل سے عالمی امن کو سنگین خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ امریکا اسرائیل کی حمایت کر کے بھی سنگین غلطی کر رہا ہے۔ یورپ اس معاملے میں امریکا سے متفق نہیں۔

اکیلے ایک شرفو کے تجربے نے چوہدری صاحب کو گاؤں واپس لوٹ جانے اور اپنی حدود میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہاں امریکا ہزاروں مسلمانوں کی جان لینے اور اس کا سنگین ردعمل سہنے کے باوجود واشنگٹن واپس لوٹنے کے بجائے اپنے اڈے بڑھاتا ہی جا رہا ہے۔ چوہدری صاحب کے درست فیصلے سے ان کا بڑھاپا شہر میں رُلنے سے بچ گیا، دیکھیں امریکا نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا تو اس پر کیا گزرتی ہے؟؟

دوغلی دنیا

یہ دنیا کتنی زبردست منافق، دوغلی اور دہرے پن کا شکار ہے۔ اس کا کچھ اندازہ آپ کو قیدیوں کی دو رہائش گاہوں کے درمیان کیے گئے اس موازنے سے ہوگا جو اس مضمون کے ساتھ دیے گئے دو نقشوں کی مدد سے کیا گیا ہے۔ پہلے میں سابقہ یوگوسلاویہ کے بدنام زمانہ جابر و قاتل حکمران میلا سووچ کی وہ کال کوٹھڑی جو عالمی عدالت نے اسے اور اس کے دوسرے ان ساتھیوں کو فراہم کی ہے جو مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بوسنیائی مسلمانوں کی نسل کشی کے لیے بدترین جنگی جرائم کا ارتکاب کیا، انہوں نے زندہ مسلمانون کی آنکھیں نکالیں، کھال اتاری، سینکڑوں کو زندہ دفن کیا، ہزاروں کو اجتماعی قبر میں گاڑا، عورتوں کی عصمت دری کی، معصوم بچوں کو ذبح کیا اور تعصب و ظلم کی وہ داستانیں اپنے پیچھے چھوڑیں کہ یورپ کا ضمیر بھی چلا اٹھا اور عالمی ادارے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اس درندہ صفت شخص پر مقدمہ چلا کر اپنی غیر جانبداری کو ثابت کریں اور حقوق انسانی کا بھرم باقی رکھنے کی کوشش کریں۔

یہ شخص اپنے بھیانک جرائم کا اقرار کر چکا ہے اور اقرار نہ بھی کرے تو بوسنیا کی سرزمین آئے دن اپنا سینہ کھول کر اجتماعی قبروں میں دفن اس کے مظالم کا ثبوت فراہم کرتی رہتی ہے۔ لاتعداد انسانوں کے وحشیانہ قتل عام جیسے سنگین جرم کے مرتکب اس شخص کو مقدمہ چلانے اور سزا سنانے کے بعد قید کے دوران جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں وہ آپ پہلے نقشے میں دیکھ رہے ہیں۔

اب آیئے دوسرے نقشے کی طرف! (کتاب کے آخر میں 520 پر دیا گیا نقشہ دیکھیے) اس میں طالبان اور القاعدہ کے ان خطرناک قیدیوں کو رکھا گیا ہے جو افغانستان سے گرفتار کیے گئے یہ لوگ کسی امریکی پر حملے یا قتل میں ملوث نہ تھے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے میں جہاز کو عمارتوں سے ٹکرانے والے زندہ نہیں بچے تھے۔ لہٰذا ان میں کسی ایسے شخص کا ہونے محال ہے جس کا امریکیوں پر حملے میں ملوث ہونے کا ادنی سا احتمال ہو۔ مگر یہاں پر مغرب کا دوسرا چہرہ ہمیں نظر آتا ہے۔ انتہائی بھیانک اور مکروہ۔ ان قیدیوں پر نہ تو مقدمہ چلایا گیا، نہ انہیں کسی عدالت میں پیش کیا گیا، نہ انہیں اب تک ان کا جرم بتایا گیا ہے، ان کا جرم محض یہ ہے کہ وہ امریکا کو بغیر ثبوت اس کے طلب کیے گئے افراد حوالے کرنے پر تیار نہ تھے اور مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق بغیر ثبوت کے کسی ملزم کو مجرم تصور کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

ان قیدیوں سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ آپ دوسرے نقشے میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ میلا سووچ جیسا جدید دور کا چنگیز خان جب اپنے سیل میں نرم بستر پر لیٹ کر کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، جب وہ ہالینڈ کے خالص مکھن و دودھ سے لذت کام و دہن کو تسکین بخشتا اور دور جدید کی تمام سہولتوں سے استفادہ کرتا ہے تو عین اس وقت کیوبا کے جزیرے میں موجود آہنی پنجروں کے ننگی فرش پر انسانیت سسک رہی ہوتی ہے۔ وہاں گرفتار قیدیوں کو جانوروں سے بھی بدتر حالت کا سامنا ہوتا ہے۔ کسی جانور کو آج تک دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے سے روکا نہیں گیا لیکن ان لوگوں سے ایسا وحشت ناک سلوک ہو رہا ہے کہ جسے سن کر رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ دماغ کی رگیں پھول جاتی ہیں اور زمین کے پھٹ پڑنے یا آسمان کے آپڑنے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ ان لوگوں کی آنکھیں، کان، منہ بند کر کے کسی چیز کے ہاتھوں سے چھونے پر پابندی لگادی گئی ہے اور ان کے حواس خمسہ معطل کر کے انہیں اذیت ناک بے حسی کے ماحول میں رکھا جا رہا ہے۔ ایذا و تکلیف کا یہ طریقہ اس سے پہلے بنی نوع انسان نے دیکھا نہ سنا۔

ان دونوں نقشوں کا موازنہ کرنے سے مغرب کے دورُخے پن اور دوغلے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رسی دراز ضرور ہوتی ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کوئی نہیں سکتا۔ آج مغرب نے اپنے وسائل کے بل بوتے پر جو برتری حاصل کی ہے وہ اس کا جی بھر کر ناجائز استعمال کرے۔ جلد ہی ایک دن ایسا آئے گا جب حالات کا دھارا پلٹا کھائے گا اور قدرت کے تکوینی قوانین دنیا کا منظر نامہ بدل کر رکھ دیں گے۔

خودسوزی

آپ نے مضمون پڑھنے سے پہلے وہ تصویر دیکھ لی ہوگی جس میں ایک دیوار کے سائے میں دو افراد چادر تلے سر جوڑے بیٹھے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ اس میں کیا دکھائی دے رہا ہے؟ ضرور سمجھ آ گیا ہوگا کیونکہ ایسے مناظر ہمارے ملک کے بڑے شہروں کی بعض سڑکوں کے کنارے واقع فٹ پاتھوں اور اجڑے پارکوں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ وہ نوجوان جو کبھی ہمارے معاشرے کے کار آمد اور مؤثر فرد تھے، ان کے گھر والوں کو ان سے اچھی اچھی امیدیں تھیں، وہ خود بھی اپنے بارے میں بہت پر امید تھے اور انکی آنکھوں نے شاندار مستقبل کے بہت سے خواب دیکھ رکھے تھے، اچھے گھرانوں کے ان نوجوانوں کی زندگی کی روٹین ایسی تھی کہ اگر وہ اس پر چلتے رہتے تو یقیناً اپنی صلاحیتوں سے اپنے لیے اور اپنے خاندان اور معاشرے کے لیے بلکہ امت اور ملت کے لیے بہترین اور کار آمد سرمایہ ثابت ہوتے، لیکن ناس ہو حرص و ہوس کے مارے ہوئے دولت کے ان پجاریوں کا جنھوں نے چند ٹکوں کی خاطر ان نوجوانوں کو ایسی پڑیاں پکڑا دیں جو ان کے خیال میں ان کو غموں سے نجات دلاتی ہیں یا سرور کی دوسری دنیا میں لے جاتی ہیں، لیکن در حقیقت ان کے جسم و دماغ کو چاٹ جاتی ہیں اور انہیں تنہائی، خواری اور تباہ حالی کے ان گڑھوں میں دھکیل دیتی ہیں جہاں ان سے نفرت تو سب کرتے ہیں لیکن ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

یہ نوجوان جب چادر تان کر گہرے سوٹے لگا رہے ہوتے ہیں تو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوتے ہیں، ان کی بلا سے کوئی جیے یا مرے، ان کو وقتی سہارا دستیاب ہو چکا ہوتا ہے۔ شاید ان کا یہ بھی خیال ہوتا ہو کہ چادر کی اوٹ لے لینے کے بعد انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا، لیکن در حقیقت ان کو سب ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں، البتہ دیکھنے والوں کا تاثر الگ الگ ہوتا ہے، بچے انہیں حیرت سے دیکھتے ہیں، سفید پوش افسوس اور رنج کے ملے جلے جذبات سے اور مراعات یافتہ طبقہ اشرافیہ انہیں حقارت سے دیکھتا ہے اور نظر پھیر کر چلا جاتا ہے۔ قانون کے رکھوالوں کے ناک تلے یہ نوجوان اپنی جوانی، اپنی صلاحیتیں، اور اپنی زندگی دھویں کی نذر کر رہے ہوتے ہیں مگر خودکشی پر قدغن عائد کرنے والے اور اپنے ہاتھوں اپنی جان ختم کرنے والے کے گھر والوں سے مہینوں عذاب ناک کی تفتیش کرنے والے پولیس مین صاحبان ان نوجوانوں کے ہاتھوں سے پڑیا لینے اور پھر اس پڑیا کو تیار کرنے والے سے لے کر لپیٹ کر بیچنے والے تک پہنچنے اور اس کو اس کی شقاوت کی سزا دینے کو اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ہماری قوم کا قیمتی سرمایہ، زرخیز دماغ اور توانا جسم رکھنے والے ہونہار نوجوان اپنے ہاتھوں اپنا سب کچھ چنگاریوں سے جلا جلا کر بھسم کر رہے ہیں، لیکن وہ ان کی ''خودسوزی'' کے عمل میں رخنہ ڈالنے یا ان چنگاریوں کو بجھانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے جو ان نادانوں نے خود اپنے دامن میں بھر رکھی ہیں۔

ہمارے ملک میں جب کوئی نئی حکومت آتی ہے یا نئے عوامی نمایندے منتخب ہو کر آتے ہیں تو وہ بہت سی چیزوں کی اصلاح کرنے اور بہت سی گندگیوں کو صاف کرنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں مگر ان کی نیت کمزور ہوتی ہے یا عمل میں اخلاص نہیں ہوتا کہ وہ

خود بگاڑی کی ایک نئی قسم کے موجد بن کر گندگی کے نئے ڈھیر جمانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کاش! کوئی منتخب نمایندہ اس طرف بھی توجہ دے اور شہر کے مصروف چوراہوں، مشہور سڑکوں کے درمیانی فٹ پاتھوں، بس اسٹاپ کی خلوتوں اور پارکوں کے بنچوں پر پڑے ہوئے علی الاعلان خودسری کرنے والے ان دنیا بیزار نوجوانوں کے غموں، شکووں اور بے راہ رویوں کا مداوا بن جائے۔ حیرت کی بات ہے کہ اگر کوئی غموں کا مارا ہو یا احتجاج میں آپے سے باہر ہونے والا اپنے کپڑوں یا جلد کو آگ لگائے تو سب اس کو روکنے کے لیے دوڑتے ہیں مگر کوئی نوجوان اپنے دل ودماغ اور جگر واعصاب کو مہلک کیمیکل کے ذریعے سلگانا، آگ لگانا اور آنچ دے دے کر جلانا شروع کر دے تو کوئی اس کی مدد کو نہیں آتا۔ ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے ان تضادات نے ہماری منزل کھوٹی کر رکھی ہے اور اس وقت تک ہماری ترقی اور خوشحالی کی بند راہیں نہ کھلیں گی جب تک ہم ان تنی ہوئی چادروں کے نیچے سلگنے والے المیوں کا ادراک کر کے اور انہیں اپنا مسئلہ سمجھ کر ان کے حل کے لیے جُت نہیں جاتے۔

فطرت سے ٹکرانے والے

دنیا کے مختلف ممالک مختلف خصوصیات کے حوالے سے مشہور ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف اقوام وقبائل کو مختلف امتیازات سے نوازا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں کی جغرافیائی خصوصیات اور مختلف اقوام کے نسلی امتیازات اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ہیں جو اس نے اس کائنات میں ظاہر کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ایک جگہ انسانوں کو مخاطب کر کے پھل پھولوں کی مختلف اقسام کی طرح پہاڑوں کے مختلف رنگوں میں بھی تفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ کیا عجب کہ اس سے مراد محض پہاڑوں کی قدرتی ساخت اور ظاہری ہیئت نہ ہو بلکہ ان کی وہ دیگر خصوصیات بھی ہوں جو قدرت نے ان میں ودیعت کی ہیں اور تاریخ عالم پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ پہاڑوں کی اپنی ہی ایک الگ دنیا ہے۔ کسی خطے کے پہاڑ اپنی حیرت انگیز اور جداگانہ نوعیت کی ساخت کے حوالے سے سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتے ہیں تو کچھ پہاڑ ایسے ہیں جن کی برف پوش چوٹیاں اپنے اندر مہم جوؤں کے لیے مقناطیسی کشش رکھتی ہیں۔ لیکن افغانستان کے سنگلاخ اور بے رحم پہاڑوں کا معاملہ سب سے جدا ہے۔ یہاں سیاحوں کے لیے کوئی کشش ہے نہ مہم پسندوں کے لیے کوئی دلچسپی، یہاں بیرونی حملہ آوروں کے لیے جا بجا بکھرے ہوئے موت کے پھندے ہیں جن میں ایک بار غلطی سے کوئی داخل ہو جائے تو وہ آگے کے بجائے واپسی کا راستہ ڈھونڈتا ہے مگر وہ اس سے گم ہو چکا ہوتا ہے۔ آئیے! ایک نظر افغانستان کی انوکھی سرزمین کی جغرافیائی و تاریخی خصوصیات پر ڈالتے ہیں کہ آج کل یہ موضوع تھنک ٹینکوں سے لے کر دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھنے والوں تک، سب کا دلچسپ موضوع ہے۔

افغانستان کی سرزمین کسی غیر کی یلغار کو اجازت نہیں دیتی:

مہمانوں کے اکرام کے لیے مشہور افغانستان اپنی زمین پر حملہ آور ہونے والے کے ساتھ زمین پر سب سے زیادہ غیر مہمان نازسلوک کرتا ہے۔ یہاں کی زمین برفانی تودوں سے ڈھکے ہوئے 20,000 فٹ بلند پہاڑی، تنگ گھاٹیوں اور صحراؤں پر مشتمل ہے جو ہندوکش پہاڑوں کے جنوب مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی جگہوں پر آب وہوا گرمیوں میں نہایت گرم اور سردیوں میں انتہائی سرد ہوتی ہے۔ ابھی تک افغانوں نے کئی حملہ آور افواج کا مقابلہ کیا ہے۔ الیگزینڈر دی گریٹ کی افواج سے لے کر روسی افواج تک حملہ آوروں میں سے اکثر نے چین کے زمینی راستے سے حملہ کیا یا سیاسی طور پر ہر ممکن راستہ استعمال کیا، لیکن ہر حملہ آور نے منہ کی کھائی اور اسے حملوں کے عوض بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

واخان: انگریز، روس سرحدی کمیشن نے یہاں پر گزرگاہ بنائی تاکہ بھارت اور روس کو الگ کیا جائے۔

سالانگ میں ریل سرنگ:

یہ ہندوکش کے 11 ہزار سے بلند پہاڑ پر روسی امداد سے بنایا گیا ہے۔ یہاں پہنچنے والی سڑکیں اور دیگر گزرگاہیں بھی روسی امداد کے تحت بنائی گئی ہیں۔

افغانستان پر حملہ کرنے والے حکمرانوں کا حشر اور ان کے اسباب:

الیگزینڈر دی گریٹ: 329 قبل از مسیح: یہ افواج مغرب کی نسبتاً دوستانہ جانب سے حملہ آور ہوئے لیکن اس کی افواج کے سخت سردی کے باعث اعضا شل ہوگئے اور کاوی کی گزرگاہ میں سیلاب اور گرمی کا سامنا کرنا پڑا۔ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے افغانستان کے حق میں دشمنوں سے دفاع کیا۔

چنگیز خان: 1220ء: یہ بہت کامیاب حملہ آور تھا جس نے تیرہویں صدی کی کئی اہم ترین اور شاندار تہذیبیں تباہ کیں لیکن اسلام محفوظ رہا اور منگولوں کے دور میں اسلامی ثقافت پروان چڑھی۔

برطانوی مہمات: 19ویں صدی: برطانیہ نے افغانستان کو فتح کرنے اور وہاں پر اپنی آبادکاری کرنے کی تین کوششیں کیں۔ 1842ء میں سترہ ہزار کی انگریزی فوج کابل سے پسپا ہوئی لیکن ساری فوج سخت موسم کے باعث ہلاک ہوئی یا انہیں مقامی مجاہدین نے ہلاک کیا۔

روسی تجربہ: 1979ء تا 1989ء حملہ آور روسی افواج کی بدترین شکست یہاں کی گہری وادیوں میں ہوئی اور مزاحمت کرنے والے مجاہدین نے روسی افواج کو بری طرح رگید کر ہلاک کیا۔ روسی افواج نے دس سال کی جنگ میں تقریباً پندرہ ہزار افواج کا نقصان برداشت کیا اور افغانستان سے پسپائی اختیار کی۔

یہ ہیں وہ تلخ تجربات جن سے ماضی کی دو عظیم طاقتیں دوچار ہوئیں اور اب حال کی ایک سپر طاقت کو ان پہاڑوں میں مہم جوئی کا شوق چڑھ آیا ہے۔ اب یہ تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کہ اس مرتبہ بھی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی یا امریکی اپنے دوپیش روؤں کی بنسبت جداگانہ نتائج حاصل کر پائیں گے؟ مگر سیانوں کی یہ بات سب کو یاد رکھنی چاہیے کہ بعض علاقوں اور قبائل کی قدرتی خصوصیات بدلا نہیں کرتیں، البتہ ان کو بدلنے کے لیے فطرت سے سر ٹکرانے والے خود مٹ جاتے ہیں۔

ننھی شہزادیو! تم کہاں ہو؟

یہ لال مسجد ہے۔ اب تک دیواروں پر کیے گئے لال رنگ کی وجہ سے لال مسجد کہلاتی تھی اب فرش پر بکھرے خون اور درودیوار پر چپکے گوشت کے لوتھڑوں کی وجہ سے لال مسجد کہلایا کرے گی۔ اس کے مقدس درودیوار چھلنی ہیں۔ چھتوں میں بھی سوراخ ہیں۔ سمجھ نہیں آتا یہ کیسے ہوئے؟ فضا میں بارود اور خون کی بو ہے۔ اس غضب کی آتش باری کی گئی ہے کہ پنکھوں کے پَر پگھل کر لٹک گئے ہیں۔ مسجد کے مینار ٹ س ہیں۔ ان میں اندر سے اوپر چڑھا نہیں جا سکتا لیکن کہا گیا ہے کہ ان پر چڑھ کر فائرنگ ہوتی تھی۔ مسجد کے اندر قرآن شریف بکھرے پڑے ہیں۔

ایک صحافی کہتا ہے: ''میں نے خود قرآن پاک کا ایک نسخہ اُٹھا کر چوما اور الماری میں رکھا۔''

فورسز والے بوٹ پہنے ٹہل رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ صفائی کی مہم کے دوران انہوں نے قرآن کریم کو اُٹھا کر الماری میں کیوں نہ رکھا؟ احترامِ قرآن نہ سہی، صفائی مہم کے زمرے میں تو یہ آتا تھا۔

ایک کمرے میں اسلحہ سجایا گیا ہے۔ کچھ تو ایسا ہے جس کا مسجد میں محصورین کے لیے استعمال ناممکن تھا۔ اس کو انہوں نے آخر لایا ہی کیوں؟ کچھ ایسا ہے جو سات دن تک آگ اور دھوئیں کے کھیل میں استعمال ہونے کے باوجود ایسا نو انکور ہے جیسے پیکنگ کی سیل ابھی توڑی گئی ہو۔ ایک صحافی ایک کلاشن کوف جس پر ٹیپ لپٹا ہوا ہے، اُٹھا کر نال سونگھنا چاہتا ہے۔ اہلکار اسے منع کرتے ہیں کہ ''یہ زندہ بارود ہے۔'' صحافی اسے واپس رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ خبریں تو زندہ مردہ ہوتی ہیں لیکن بارود زندہ و مردہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اور اب آیئے! جامعہ حفصہ کی طرف چلتے ہیں۔ روئے زمین کی پاکیزہ ماؤں بہنوں کا مسکن جنہوں نے پورا ایک ہفتہ بھوک پیاس، زخمیوں کی کراہوں، شہدا کی تڑپتی لاشوں، برستے گولوں اور دھوئیں کے مرغولوں میں ایسی استقامت سے گزارا، گویا گوشت پوست کے انسان نہیں، فولاد میں ڈھلے ہوئے وجود ہیں۔ میراتھن میں دوڑنے والیاں کہاں ہیں؟ اگر انہیں موقع ملے تو ان پاکیزہ ہستیوں۔ کے پاؤں چھو کر منہ پر مل لیں۔ شاید اسی سے ان کی سیاہ بختی کچھ کم ہو جائے۔

تعجب ہے سیکڑوں طلبہ و طالبات گرفتار ہوئے۔ ایک نے بھی محاصرے کی سختی کا شکوہ نہیں کیا نہ کوئی ایک اندر موجود ''یرغمالی دہشت گردوں'' کے خلاف بیان دینے پر تیار ہوا۔ لے دے کے ایک نامعلوم نوعمر لڑکے سے چند بے ربط جملے سرکاری ٹی وی پر کہلوائے گئے اور پھر اسے نجی چینلوں کے سامنے پیش کرنے سے مکمل احتراز کرتے ہوئے خاموشی سے گھر بھیج دیا گیا۔

آخری وقت میں اندر سے جو خواتین گرفتار ہوئیں، انہوں نے ایک ہی تمنا کا اظہار کیا: ''شہادت'' اور انہوں نے ایک ہی چیز سنبھال کر رکھی ہوئی تھی، ''نفاذِ شریعت کا وصیت نامہ۔'' ایک چھوٹی بچی کو اس کے والد نے والدہ کی بیماری کا کہہ کر باہر بلایا۔ اس پر وہ شدید غمزدہ تھی بلکہ قدرے برہم کہ اسے شہادت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ دین حنیف پر مر مٹنے کے اس بے پایاں شوق کی

ایسی مثال اس دور میں شاید ہی پیش کی جا سکے۔

جامعہ حفصہ کے اندر داخل ہوں تو عجیب منظر سامنے ہے۔ کاپیاں، کتابیں، چوڑیاں، کنگھیاں، پنسلیں اور ربڑ۔ روٹی کے خشک ٹکڑے، آنسو گیس سے بچنے کے لیے بالٹیوں میں ڈبوئے ہوئے ڈوپٹے۔ دیواریں چھلنی ہیں گویا پوری پلٹن نے چاند ماری کی ہے اور اس وقت اندر داخل ہوئی ہے جب کلی تصفیہ کا یقین ہو چکا تھا۔ چھتیں دھوئیں سے سیاہ ہیں۔ پلروں کا پلستر فائرنگ کی شدت سے ادھڑ گیا ہے۔ معصوم بچیوں کے سامان رکھنے کی الماریاں اپنی شکل وصورت کھو کر ٹھوس لوہے کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ہر چیز بکھری پڑی ہے سوائے اس اسلحے کے جس سے امنِ عالم کو خطرہ تھا اور ہر چیز موجود ہے سوائے ان دہشت گردوں کے جن سے فساد فی الارض کا اندیشہ تھا۔

سوال یہ ہے کہ جو طالبات گرفتار ہوئیں اگر وہ گھروں کو چلی گئی ہیں تو ان کے لواحقین کیوں مارے مارے پھر رہے ہیں؟ اور جو شہید ہوئی ہیں ان کی لاشیں یا قبریں کہاں ہیں؟ اتنی محدود جگہ میں اتنی زبردست فائرنگ سے سیکڑوں نہیں تو بیسیوں طالبات تو ضرور شہید ہوئی ہیں۔ ان کی لاشیں یا ان کا اتا پتا کیوں نہیں؟ بہت سے لوگ ایسے دکھائی دیے جو اس سانحہ کی المناکی پر رونا چاہتے تھے، رو دینے کے قریب تھے مگر جب انہوں نے سنا کہ زندہ طالبات گمشدہ ہیں اور شہید طالبات کی لاشوں کا اتا پتا نہیں تو ان کی نمناک آنکھیں دہکتے انگارے بن گئیں۔ ان کے بہتے آنسو رک گئے۔ آنسو کا قطرہ ایسی چیز ہے اگر بہہ جائے تو غم ورنج سب کچھ بہالے جاتا ہے۔ اگر رک جائے تو آتش فشاں بن جاتا ہے۔ طالبات کے بارے میں غیر یقینی اطلاعات کی وجہ سے ایسے بہت سے آتش فشاں دہک رہے ہیں، نجانے کب ان سے لاوا بہنا شروع ہو جائے۔ خدا جانے اربابِ اقتدار کو اس کا احساس ہے یا نہیں؟

اور یہ تو کسی شیرنی کی جنی ہوئی لگتی ہے۔ ذرا کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سوچیے! سسر اور ساس دونوں شہید، شوہر اور دونوں کمسن بیٹیاں گرفتار، جوان، اکلوتا بیٹا اور دیور شہید اور سب سے بڑھ کر سات سو سے زائد طالبات جو اس کی اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ عزیز تھیں، لاپتہ ہیں، زخمی ہیں، آنکھوں کے سامنے جان دے رہی ہیں...... لیکن مجال ہے کہ اس کے لہجے کے طنطنے، آواز کے دبدبے اور چال کے رُعب، وقار میں کوئی کمی یا فرق آیا ہو۔ اتنا حوصلہ، ایسا ظرف، اس قدر برداشت اور اتنا جگر تو سیدہ خنساء رضی اللہ عنہا کا سنا اور پڑھا تھا جس نے کھڑے کھڑے چار جوان جہان بیٹے کٹوا دیے اور پھر اس سعادتِ سرمدی پر جذبۂ شکر گزاری سے لبریز سجدہ ریز ہو گئی۔ جنازہ دیکھ کر تو اچھے اچھوں کے قدم جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ جانے کس مٹی کی بنی ہے کہ خواتین سیکیورٹی اہلکاروں کے آگے چلتے ہوئے ایسے لگ رہی ہے جیسے شیرنی جارہی ہو۔ ساتھ چلنے والی سیکیورٹی کی خواتین تو میمنیاں لگتی ہیں حالانکہ وہ فتح کے نشے سے سرشار اور یہ گرفتارِ غم والم ہے۔

شنید ہے کہ جب فورسز اندر داخل ہوئیں تو اس نے زوردار نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ساتھ موجودہ بچیوں اور استانیوں نے جواب میں بھرپور ساتھ دیا۔ اسلحہ بردار لمحے بھر کو پیچھے ہٹ گئے۔ اتنے میں عقبی دیوار گولہ لگنے سے اڑ گئی۔ نہتی خواتین کے پاس تھا تو کچھ نہیں۔ وہ چاروں طرف سے نرغے میں تھیں لیکن اس وقت میں بھی بچیوں کا اپنی معلّمہ (آپا جی) سے اور معلّمہ کا بچیوں سے وفاداری کا منظر لازوال اور انمٹ ہے۔ اے گندی اور حقیر دنیا! تو نے تو ختم ہو ہی جانا ہے۔ یہ باتیں البتہ کبھی ختم نہ ہوں گی۔ یہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں جو رہتی دنیا تک اور ہمیشہ کی آخرت میں جگمگاتے رہیں گے۔

غازی جیسا شخص بھی کسی ماں نے کیا جنا ہوگا؟ قدرت نے کیسا اعلیٰ دماغ اور کتنی مؤثر زبان دی تھی؟ تن تنہا دنیا بھر کے میڈیا سے بھی نمٹ رہا ہے۔ ڈیڑھ دو ہزار محصورین جس میں نصف سے زیادہ خواتین ہیں، کو بھی سنبھال رہا ہے۔ بجلی بند ہے، پانی ختم ہے، گیس منقطع ہے، بھائی گرفتار ہے، ماں گود میں آخری ہچکیاں لے رہی ہیں۔ راشن اتنا نہیں کہ بچیوں کو کچھ کھلا سکے۔ دوائیاں نہیں کہ زخمیوں کو عارضی تسکین فراہم کی جاسکے۔ موت سر پر ہے۔ ساتھیوں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے ہیں۔ باہر بیٹھ کر خبریں سننے والوں کے اعصاب ریزہ ریزہ ہوگئے ہیں مگر کیا مجال کہ اس کے لہجے کی کاٹ یا آواز کے دبدبے میں فرق آیا ہو۔ وہی خود اعتمادی وہی بے خوفی۔ انسان تھا یا فولاد! کاش اس کی صلاحیتوں سے استفادہ کرلیا جاتا؟ اس کا جرم کوئی ایسا بھی تو نہ تھا کہ اکابر اور مقتدر ترین علمائے کرام کی مصالحتی جماعتوں کو یوں خالی ہاتھ لوٹا دیا جاتا۔

اور یہ دو تصویریں ہیں۔ ایک میں ایک فوجی جوان وکٹری کا نشان بنا رہا ہے اور دوسری میں برقع میں ملبوس چند خواتین ہیں۔ یہ بھی فتح کا نشان بنارہی ہیں۔ فوجی جوان چاق وچوبند اور اسمارٹ لگ رہا ہے۔ ساتھ بیٹھے دوسرے اہلکار بھی شکل سے تیز طرار اور دھواں دار قسم کے دکھائی دیتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے یہ کمانڈوز کا دستہ ہے۔ برقعے میں ملبوس خواتین پولیس کی تحویل میں ہیں۔ شکست خوردہ، رنج والم زدہ ہیں۔ کسی کا بھائی شہید کسی کا شوہر یا باپ گرفتار ہے۔ کمانڈوز کا نشان فتح بنانا تو سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ دیا ہوا ہدف پورا کر کے جارہے ہیں۔ اگرچہ اپنی تاریخ کے برخلاف انہیں اعلان کردہ چار گھنٹے کے بجائے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت لگا لیکن یہ خواتین اس عالم میں جب نظریں اوپر نہیں اُٹھتیں، فتح کا نشان کیوں بلند کررہی ہیں؟ عقل والو! یہ اعجوبہ تو حل کر کے دو۔ دونوں طرف فتح کا دعویٰ ہے۔ اس کی حقیقت تو روزِ قیامت واضح ہوگی۔ البتہ دنیا میں تو یہ ہوا ہے کہ غازی کا جنازہ ملک کے دور دراز علاقے میں اُٹھایا گیا...... سخت گرمی اور پانی ندارد...... لیکن شرکا تھے کہ ٹوٹے پڑرہے تھے اور ایک جنازہ لاہور جیسے زندہ دلوں کے شہر میں بھی اُٹھا لیکن اس میں ڈیڑھ سے دو صفیں پوری ہو کے نہ دیں۔

قدرت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان بہت سے واقعات بھلا دیتا ہے۔ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی یادیں اسے عمر بھر تڑپائے رکھتی ہیں۔ یہ واقعہ بھی لوگوں کو شاید بھول جائے مگر یہ بات نہ بھولے گی کہ جامعہ میں کم از کم ہزار سے ڈیڑھ ہزار طلبہ وطالبات تھے اور ان میں سے 73 شہید اور 102 کے قریب زخمی ہوئے تو بقیہ طلبہ وطالبات کہاں ہیں؟ کہاں گئے؟ ان کا اتا پتا کیوں نہیں؟

کوئی بتائے تو سہی! اے میری بہنو! تم کہاں ہو! بتاؤ تو سہی! اے ننھی شہزادیو! جگر پارہ پارہ ہورہا ہے۔ زندگی لعنت کا طوق بنتی جارہی ہے۔

خدارا! بتاؤ تو سہی تم کہاں ہو؟

اسلامی دنیا میں آزادی کی جدوجھد کا خاکہ

عالم اسلام پر یورپی استعمار کی یلغار ایک نظر میں

کاروانِ شہداء کے نقوشِ قدم

شمال

ترکی

قبرص

شام

لبنان

فلسطین

کربلا

ایران

کویت

بحرین

مغرب

مشرق

مصر

سعودی عرب

امارات

صحراء ربع خالی

بحر احمر

سوڈان

عمان

جزیرہ نمائے عرب

یمن

جنوب

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ	
ولادت:	سن ۴ھ
مدت صحابیت:	پانچ سال
شہادت:	10 محرم، 61ھ
کل عمر:	54 برس

سفر شہادت	
مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ روانگی:	27 رجب 60ھ
مکہ مکرمہ آمد:	4 شعبان، 60ھ
مکہ مکرمہ سے کوفہ روانگی:	8 ذی الحجہ 60ھ
کربلا میں آمد:	2 محرم 60ھ

مغربی دنیا میں عیسائیت کیسے پھیلی؟

بحر روم کی موجوں پر تیرتے قافلے نے یورپ تسخیر کرلیا، پھر یورپ کی استعماری طاقت طول و عرض میں پھیل گئی

دنیا کے تین خطے

بحر شمال
بحر بالٹک
برطانیہ
بحر اوقیانوس
یورپ
بحر کیسپین
کوہ قاف
دریائے ڈینوب
بحر اسود
مقدونیہ
ایشیا
ساسانی سلطنت
شام
دجلہ
فرات
افریقہ
دریائے نیل
جزیرہ نمائے عرب

یورپ میں مسلمانوں کی تعداد: حالیہ احتجاجی مظاہروں میں ان مغرب زدہ مسلمانوں نے مغرب کو [illegible] کر دیا

ملک	تعداد
فرانس	5,500,000
المانیہ	3,224,000
برطانیہ	1,500,000
اٹلی	1,000,000
اسپین	700,000
ہالینڈ	700,000
بلجیم	400,000
ناروے	350,000
سویڈن	250,000
آسٹریا	200,000
یونان	140,000
ڈنمارک	117,000
ہنگری	70,000
سلوینیا	20,000
کروشیا	20,000
فن لینڈ	15,000
پرتگال	12,000
لکسمبرگ	9,000
پولینڈ	7,500

مذاہب عالم 2004ء میں

- عیسائی: 33%
- مسلمان: 20.1
- کمیونسٹ: 14.4
- ہندومت: 13.3
- دیگر: 13
- بدھ مت
- یہود: 2

مسلم دنیا کی دولت دُشمنانِ اسلام کے قبضے میں

غنی! روز سیاہ پیر کنعاں راتماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

عراق 1.6
کویت 1.9
لیبیا 1.3
قطر 0.7
الجیریا 0.9
ایران 3.4
نائجیریا 2.0
متحدہ عرب امارات 2.0
سعودی عرب 7.7
انڈونیشیا 1.1

تڑپ اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری، نہ مرگ ناگہاں میری

مسلم ممالک "تیل بم" کا دھماکہ کب کریں گے؟

دنیا میں تیزی سے بڑھتی ہوئی اقتصادی طاقت

پہلے بیس ممالک میں سے ایک بھی مسلمان نہیں

2006

1. امریکا
2. ہانگ کانگ
3. سنگاپور
4. آئس لینڈ
5. ڈنمارک
6. آسٹریلیا
7. کینیڈا
8. سوئٹزرلینڈ
9. لکسمبرگ
10. فن لینڈ
11. آئرلینڈ
12. ناروے
13. آسٹریا
14. سویڈن
15. ہالینڈ
16. بلغاریہ
17. جاپان
18. تائیوان
19. چین
20. اسٹونیا

IMD

مقابلے کا گراف

اقتصادی کارکردگی — کام میں مہارت

حکومت کی کارکردگی — بنیادی صنعتیں

آج کا دور اقتصادیات کا دور ہے۔ دنیا کا ہر ملک اقتصادی ترقی کے لیے کوشاں ہے البتہ اسلامی ممالک اس سلسلے میں بہت پیچھے ہیں۔ دیے گئے نقشے میں دنیا کے پہلی بیس اقتصادی طاقتیں دکھائی گئی ہیں جن میں سے ایک بھی مسلمان نہیں۔

عراق

ارض حرمین کے خلاف صیہونیت کے عزائم میں آخری رکاوٹ

خلیج کی دولت پر قبضے کے لئے بے تاب طاقتوں کا ہدف

صدام حسین

28 اپریل، 1937ء: پیدائش
150 کلومیٹر شمالی بغداد
1957ء:
تنظیم "البعث" میں شمولیت
1968ء:
نائب صدر
1979ء:
صدر
1980-1988ء:
جنگ ایران عراق
اگست، 1990ء:
کویت پر حملہ
1991ء:
جنگ خلیج

تیل کی پیداوار

1.2
ملین بیرل یومیہ
اگست، 2002ء

تیل اسٹاک
112
ارب بیرل

عراق کو لاحق ہونیوالے خطرات

ترکی
کرد
سنی
شیعہ
دیگر اقوام 3 فیصد
کرد 17 فیصد
سنی 20 فیصد
شیعہ 60 فیصد
موصل
اربل
کرکوک
سلیمانیہ
شام
حدیثہ
ایران
نجف
اردن
سعودی عرب
بصرہ
غیر جانبدار علاقے
کویت

عراقی فوج

فوج: 424000	جنگی طیارے: 316
ٹینک: 2200	جنگی ہیلی کاپٹر: 100
بکتر بند گاڑیاں 3700	طیارہ شکن میزائل: 6000
بحری جہاز: 11	"سام" ٹائپ کے میزائل: 1500

ایٹمی، کیمیائی اور بیالوجی خزانے

عالمی ادارہ برائے اسٹریٹجک اسٹڈی کے مطابق

ایٹمی
کیمیائی
بیالوجی

شام
موصل
شرقاط
کرکوک
حدیثہ
سامرہ
قائم
بغداد
ایران
عکاظ
فلوجہ
اردن
محمودیہ
کویت
عمارہ
سعودی عرب
ناصرہ
بصرہ
غیر جانبدار علاقے

عراقی بحران

16 جنوری، 28 فروری، 1991ء:
جنگ خلیج
3 اپریل: بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے عراقی ہتھیاروں کے خلاف اقوام متحدہ کی قرارداد

17 جنوری، 1996ء:
اقوام متحدہ کا پروگرام: تیل برائے خوراک

1997ء:
اقوام متحدہ کے انسپکٹرز اور بغداد کے درمیان متعدد مذاکرات

11 نومبر، 1998ء:
اسلحہ انسپکٹرز کی بغداد سے واپسی
16-19 دسمبر:
امریکی اور برطانوی فوجی حملہ

26 جنوری، 2000ء:
بغداد نے اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹرز کی دوبارہ آمد مسترد کردی

16 ستمبر، 2002ء:
عراق کی اسلحہ انسپکٹرز کی واپسی پر غیر مشروط رضامندی
صیہونیوں کی شہ پر امریکا کی حملے کے لئے بے قراری

عراق کے معدنی ذخائر: بندر بانٹ کے لئے سلامتی کونسل کی بے چینی

سلامتی کونسل کے ارکان فرانس، روس اور چین نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ امریکا کا عراق میں فوجی کارروائی کا مقصد پہ جھگڑے میں ان کے تیل سے وابستہ مفادات کے لئے خطرہ ہے۔ جبکہ اب تک ان کے اس خطے میں ۳۸ ارب ڈالر کے معاہدے طے پاچکے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق امریکی آئل کمپنیوں کے سربراہان نے صدر صدام کی حکومت کے خاتمے کے بعد نیا انتظام حکومت قائم کرنے کے لئے عراق اپوزیشن سے ملاقاتیں شروع کر دی ہیں۔

عراقی میزائل امریکا کے لئے پریشان کن کیوں؟

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے

پرانا نام: ابابیل 100
نیا نام: الصمود

زمین سے زمین پر مار کرنے والا
1981ء میں 8 مختلف تجربوں کے بعد مکمل تیار ہوا
عراق کے مطابق اس کی مار 149 کلومیٹر تک ہے

اقوام متحدہ کی طرف سے عراقی میزائلوں کے لئے مقرر کردہ حد

ترکی
شام
ایران
بغداد
عراق
اردن
مصر
کویت
سعودی عرب
امارات
500 کلومیٹر

اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر: 687-1991ء

عراق پر لازم ہے کہ:

- ☆ ایٹمی، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار نہ بنائے۔
- ☆ 150 کلومیٹر سے زائد رینج والے میزائل تیار نہ کرے۔
- ☆ اگر ایسے میزائل موجود ہیں تو انہیں تباہ کردے۔

ان معصوم بچوں کا قاتل کون ہے؟

ایران میں جوہری توانائی کے مراکز

اس نقشے میں ایران میں موجود جوہری توانائی کے مراکز دکھائے گئے ہیں۔ امریکا کی طرف سے جاری کردہ کئی سیلائٹ تصاویر میں بھی یورینیم پلانٹ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

داستان فلسطین فروشوں کی

سعودی عرب

سمندر میں چھپا راز

شاہ عبدالعزیز اور روزویلٹ کی خفیہ ملاقات

خدائی کے دعویداروں کا فرعونی پروپیگنڈہ

امریکا کی خارجہ پالیسی سے متعلق میگزین "Foreign Policy" میں ایک انتہائی اہم ادارے "Fund for Peace" کی رپورٹ میں پاکستان کو "ناکام ریاستوں" میں شمار کیا گیا ہے۔ پچھلے سال کی ناکام ممالک کی رپورٹ میں پاکستان 34ویں نمبر پر تھا اور تازہ ترین رپورٹ میں 9ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ نقشے میں دیگر "ناکام ممالک" بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کیا واقعی پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ پاکستان کا ہر نیا دن اس کی ترقی اور بقا کی ضمانت دیتا ہے۔ قابل فکر ہیں وہ لوگ جو ملک کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں اور قوم کو دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

اندھادھند یہودی بستیاں تعمیر کرنے کے خلاف حماس کا دھماکہ خیز احتجاج

شیرون معاہدہ امن کی آڑ میں بستیاں بنائے چلا جارہا تھا — شیرون کے دور سے پہلے بنائی گئی بستیاں

مغربی کنارہ: 160 بستیاں جن میں دو لاکھ 20 ہزار یہودی رہتے ہیں۔

مشرقی القدس: 12 بستیاں جن میں دو لاکھ یہودی رہتے ہیں۔

حماس کے فدائی حملوں نے یہودی بھیڑیوں کو اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔

اندھا دھند بنائی گئی بستیاں

116
اس میں چند سو یہودی خاندان رہتے ہیں۔
86 شادی شدہ
30 غیر شادی شدہ

ان میں سے نصف سے زیادہ شیرون کے برسر اقتدار آنے کے بعد بنائی گئیں۔

آخری رات ہے یہ، سر نہ جھکانا لوگو
عہد وفا کی قسمیں نہ بجھانا لوگو
انتہا ظلم کی ہوجائے وفا والوں پر
غیر ممکن ہے جذبوں کو مٹانا لوگو

زیر تعمیر باڑہ: اسرائیل کا غاصبانہ توسیعی منصوبہ

اسرائیل اور اس کے جمہوریت پسند حمایتیوں کو حماس کی جمہوری حکومت ہضم نہیں ہو رہی۔ اسی وجہ سے اس نے تمام مسلمہ جمہوری اور اخلاقی اصولوں کو پس پشت ڈال کر فلسطینی عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ جب تک مسلم ممالک حماس کی پُرامن کوششوں کی طرف داری نہ کریں گے اسرائیل کو اس دہشت گردی سے باز رکھنا ممکن نہ ہوگا۔

تحریک انتفاضہ: عزم وہمت کی لازوال داستان

1

جب غلیلوں کے پتھر ٹینک کے گولوں کے مقابل آ گئے
اور جذبوں کی طاقت نے مادی طاقت کو خاک چٹا دی

فلسطینی شہداء

۱,۸۷۲

ان شہداء میں اکثریت نہتے عوام، بوڑھوں، بچوں اور خواتین کی ہے

گزشتہ دو سال کے دوران
جانبین کے جانی نقصان کا تناسب

تحریک انتفاضہ سے قبل ۱۰ کے بدلے ایک
تحریک انتفاضہ کے بعد ۳ کے بدلے ایک

غاصب اسرائیلی

۶۱۴

بیرونی ممالک کے شہری

۵۱

اسرائیل کی بے قابو درندگی

اسرائیل امریکا کی فراہم کردہ طاقت کے نشے اور پشت پناہی کے بھروسے پر بے قابو ہو گیا ہے اور ایسی درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی لیکن اس کھلم کھلا ظلم و دہشت کے خلاف ان حکمرانوں میں سے کسی ایک کی زبان نہیں کھلتی جو مسلمان ممالک پر مسلط ہیں اور عالم اسلام پر حکمرانی کی سب سے زیادہ اہلیت کے دعویدار ہیں۔

متحدہ افواج عراق میں

جاپان نے عراق سے اپنی فوج واپس بلالی

عراق میں منتشرہ غیر ملکی افواج

امریکا	برطانیہ	جنوبی کوریا	آسٹریلیا	رومانیہ	ڈنمارک	سلواڈور
130 000	7 200	3 200	900	860	530	380

طے شدہ پروگرام انخلا

پولینڈ (2007)	اٹلی (2006)	جاپان (جولائی 2006ء)
1 600	900	600

وہ ممالک جو اب تک اپنی فوجیں واپس بلا چکے ہیں: نکاراگوا، ہسپانیہ، جمہوریہ ڈومینیکن، ہنڈراس، فلپائن، تھائی لینڈ، نیوزی لینڈ، ہالینڈ، پرتگال، یوکرائن، جارجیا، ٹونگا، میلڈونا

ایران
بغداد
عراق

پاکستان: شمالی علاقہ جات میں اسماعیلی ریاست کے قیام کی تیاریاں عروج پر

گوانتاناموبے کے قیدی

امریکی وزارت دفاع نے ان کے نام شہرت اور معلومات شائع کردی

قیدیوں کی قومیت

کل 558

تاجکستان 6
ازبکستان 7
عراق 6
شام 9
اردن 5
افغانستان 125
پاکستان 13
مغرب 11
فرانس 9
الجزائر 25
لیبیا 11
سوڈان 9
چین 22
کویت 12
سعودی عرب 132
یمن 107
بحرین 6

1		2	3	4
لبنان	آذربائیجان	آسٹریلیا	فرانس	مصر
مالدیپ	بنگلہ دیش	سری لنکا	[illegible]	برطانیہ
قطر	بوسنیا	ایران	موریتانیہ	
روس	کینیڈا	صومالیہ	مغربی جادہ	
یوگنڈا	چاڈ	ترکی		
	ایتھوپیا	متحدہ عرب امارات		

گوانتاناموبے میں واقع دہشت گردی کے خلاف [illegible] میں چند ایک قیدیوں کے سوا صرف مسلمان قیدیوں کا تختۂ مشق بنایا گیا اس جنگ کے مذہبی ہونے کا ثبوت نہیں دیتا؟

سمندر کی سطح پر تیرتا جنگی اڈہ
مسلمان دہشت گردی کے طعنے کے خوف سے سہمے رہے اور کفار نے دنیا کی تباہی کا سامان کر لیا
نمٹنر کلاس طیارہ بردار جہاز پر
نشتی ریڈار
متحرک کرین
آئلینڈ کنٹرول سینٹر
فضائی ریڈار
اسکواڈرن ریڈی روم
جیٹ بلاسٹ ڈی فلیکٹر
فیلنکس ڈیفنس ویپن سسٹم
عملے کے کوارٹرز
جہاز کو اڑانے والی مشین کی پٹڑی
جہاز کو اڑانے کے لیے دباؤ مہیا کرنے والی مشین
ایئر کرافٹ ہینگر
نگرانی کا نظام
لینڈنگ
انجن روم میں دو جوہری ایکٹر ہالٹ
"سی اسپیرو" نامی طیارہ شکن میزائل
فلائٹ کنٹرول سینٹر
کپتان کا برج
ایر کرافٹ ھینگر
انجن روم
اس طیارہ بردار کا گروپ 10 حملہ آور جہازوں پر مشتمل ہوتا ہے
امریکی بحری بیڑا ایک نظر میں
لاجسٹک سپلائی کا جہاز
طیارہ بردار جہاز
سپرنس کلاس تباہ کن جہاز
ٹائی کونڈیروگا ٹائپ کروزر
اولیور پیری کلاس لڑاکا جہاز
لاس اینجلس کلاس کی جوہری قوت کی حامل تیز رفتار حملہ آور آبدوز
ای ٹو سی ہاک آئی طیارہ فضا سے نگرانی کرتا ہے۔
آرلے برک کلاس کا تباہ کن جہاز
کون سا طیارہ بردار جہاز کہاں ہے؟
خلیج کی طرف رواں دواں
(CVN-68)
خلیج میں موجود
(CVN 72)
(CV-64)
(CV-63)
بحر متوسط میں
(CVN-71)
بحر الکاہل میں
(CVN-75)

امریکی بحری بیڑہ: ابرہہ کے بدمست ہاتھیوں کا غول

اسامہ بن لادن کی تلاش

مہلک ہتھیاروں کے تباہ کن اثرات

نام نہاد یافتہ ممالک نے نوع انسانی کو حشرات الارض بنانے کی تیاری کر رکھی ہے

کیمیائی گیسیں اور ان کے اثرات

کیمیائی ہتھیاروں کی تخفیف سے متعلق معاہدہ

188 ممالک جنہوں نے معاہدے کی منظوری دی

نیوکلیائی ہتھیاروں کی تیاری

ایٹم کا پھیلاؤ

روس
برطانیہ
فرانس
امریکا
اسرائیل
ایران
شمالی کوریا
چین
تائیوان
لیبیا
پاکستان
بھارت
برازیل
جنوبی افریقہ
ارجنٹائن

- بڑی ایٹمی طاقتیں
- دیگر چھوٹی ایٹمی طاقتیں
- وہ ممالک جو اب ایٹمی طاقت بننا چاہتے ہیں
- جو اب تک ایٹمی دھماکے کر چکے ہیں

یورینیم کی افزودگی

آج کل یورینیم کی افزودگی کا بہت چرچا ہے۔ اوپر دیے گئے خاکے میں اس کو افزودہ کرنے کے مختلف مراحل کی وضاحت کی گئی ہے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کی ہولناک تباہیوں کی طرف بڑھتے قدموں کی کہانی۔ ان دونوں میں لمحہ بھر میں ۱۰ لاکھ سے زائد افراد ہلاک اور معذور ہو گئے تھے جسے انسانی تاریخ کا ہولناک ترین واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔

میزائل ٹیسٹ کے پانچ مرحلے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

امریکا

بحر الکاہل

آسٹریلیا

مارشل آئی لینڈ میں امریکی اڈا

زمین پر نصب کیا گیا ریڈار

نظام شمسی کا دسواں سیارہ

"ناسا" کے ٹیلی اسکوپ کے ذریعہ معلوم کیے جانے والے سیارے کو "کسیتا" کا نام دیا گیا ہے۔ ناسا کے مطابق اس کا حجم "پلوٹو" سے بڑا ہے
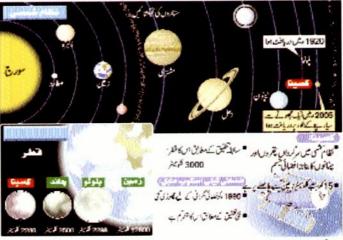
نظام شمسی میں گزشتہ سال دریافت ہونے والا دسواں سیارہ کسیتا جو حالیہ تحقیق میں قدرے کم حجم کا ثابت ہوا ہے۔ نظام شمسی ہماری کہکشاں کے اندر ایک ذرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اس جیسی اربوں کہکشائیں کائنات میں موجود ہیں۔ جب انسان کائنات کی ان وسعتوں اور تنظیم کو دیکھتا ہے تو ایک خدا کی حمد وثنا از خود اس کی زبان سے جاری ہو جاتی ہے۔

دنیا کو غربت کا سامنا

فقر کے سد باب کے لیے عالمی کاوشیں

سرمایہ دارانہ نظام کا جادو... تو بھر رہا ہے لیکن دنیا کی ایک تہائی آبادی ایک ڈالر سے بھی کم پر گزارہ کرنے پر مجبور ہے۔

دنیا کی دس سب سے بڑی غیر القومی کمپنیوں کی آمدنیاں

بحرالکاہل: ایشیا میں ایڈز کا پھیلاؤ

چین
بھارت
گینیا
کمبوڈیا
آسٹریلیا

متبلا لوگ : (49-10)

1.5 اور 2% کے مابین
1 اور 1% کے مابین
0.5 اور 1% کے مابین
0.1 اور 0.5 کے مابین
0.1% سے کم

ایشیائی ممالک میں یورپ سے آئی ہوئی فحاشی اپنے ساتھ وہ عذاب بھی لا رہی ہے جو حرام لذتیں لوٹنے والوں کا مقدر ہیں۔

کلوننگ شدہ انسان کیسے پیدا ہوتا ہے؟

اریلین فرقہ کلوننگ شدہ بچے کی پیدائش پر مصر ہے جبکہ ابھی اس دعوے کی مکمل تصدیق نہیں ہو سکی

مصنوعی طریقے سے بچے کی پیدائش کے پانچ مراحل:

۱ وہ شخص جس کی کلوننگ کی جائے گی

خلیہ لیا جاتا ہے

عورت سے بیضہ لیا جاتا ہے

۲ خلیہ سے تخم حاصل کیا جاتا ہے

این ڈی اے حاصل کیا جاتا ہے

۳ مرد کے خلیہ کا عورت کے بیضہ کے ساتھ اختلاط

بیضہ مخصوص جینیاتی نظام کا حامل ہو جاتا ہے

۴ خلیہ نشو ونما پاتا رہتا ہے یہاں تک کہ بچے کی ابتدائی شکل بن جاتی ہے

۵ اس لوتھڑے کو رحم مادر میں ڈال دیا جاتا ہے

۶ ماں باپ کی مکمل وراثتی خصوصیات کا حامل بچہ پیدا ہوتا ہے

دنیا میں افیون کی پیداوار اور کھپت

اقوام متحدہ کی تازہ ترین رپورٹ

متبادل زراعت نے افیون کی پیداوار میں خاطر خواہ کمی نہیں کی

2004	2003	2002	2001	2000	1999	1998	1997	1996	1995

5 000
4 000
3 000
2 000
1 000
0

یورپ	آسٹریلیا	ایشیا	مشرق وسطی	افریقہ	شمالی امریکا	جنوبی امریکا
0.53	0.5	0.48	0.41	0.27	0.23	0.16

افیون ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ دنیا کی تمام اقوام اس کی پیداوار، ترسیل اور استعمال کے خاتمے کے لیے متفق ہو کر کوشاں ہیں مگر ہر دن ان کی ناکامی کی خبر لاتا ہے۔ شاید اس موقع پر دنیا والوں کو وہ بوریا نشین حکمران یاد آتے ہوں گے جنہوں نے ایک جنبش قلم اس کے خاتمے میں مکمل کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ابھی حال ہی میں خبر آئی ہے کہ افغانستان دنیا میں سب سے زیادہ منشیات پیدا کرنے والے ممالک میں شامل ہو گیا ہے۔ یاد رہے کہ افغانستان سے افیون کی برآمدات 2.5 ارب ڈالر تک پہنچ چکی ہیں۔ پہلی تصویر میں ایک افغان باشندہ دوڑتے ہوئے گزر رہا ہے۔ دوسری تصویر میں ایک برطانوی فوجی پوست کی کھڑی فصل کا بغور معاینہ کر رہا ہے۔

افغانستان میں افیون کی پیداوار پھر زوروں پر

روزہ: بے لگام خواہشات پر قابو پانے کی عملی مشق

سچی روحانیت کے سفر کا آزمودہ راستہ

۵ نومبر سے پہلی کے چاند آنے پر ماہ رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہوا

۲۴ نومبر/ ۲۰ رمضان سے آخری اور اہم ترین عشرہ شروع ہوگا

یکم دسمبر ۲۷ رمضان المبارک کو لیلۃ القدر، وہ مقدس شب جس میں قرآن کریم نازل ہوا

۴ دسمبر کو رمضان المبارک کی آخری تاریخ

NOVEMBER

SUN	MON	TUE	WED	THU	FRI	SAT
					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

DECEMBER

SUN	MON	TUE	WED	THU	FRI	SAT
	1	2	3	4	5	6	7
8	9		11	12	13	14
	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	31				

روزانہ کا معمول

- رمضان کو اکابر کے معمولات کے مطابق گذارا جائے تو اس کی برکت سے سارا سال انسان کو طاعت پر مداومت اور منکرات سے بچنے کی توفیق ملی رہتی ہے۔
- ماہ رمضان کے روزے بالغوں پر فرض ہیں، مریض اور مسافر سے روزے چھوٹ جائیں تو ان کو کسی دوسرے ماہ میں بطور قضا رکھ سکتے ہیں

 غروب آفتاب کے بعد افطاری

طلوع سورج سے قبل ہلکے کھانے سے سحری کرنا

- دن میں کھانے پینے یا جنسی تعلقات سے باز رہنا اور حسب توفیق ساتھ ساتھ عبادات کرنا
- عشاء کے بعد نماز تراویح ادا کرنا